ایک مکمل ماہ نامہ
دسواں سال ● چوتھا شمارہ

پیکر

اپریل ۱۹۷۱ء

مدیر:
اعظم راہی

سرورق:
محمد اقبال

عنوانات:
غوث محمد

کتابت:
محمد غالب
مسعود جاوید

قیمت سالانہ:
بارہ روپے

فی شمارہ
ایک روپیہ

صدر دفتر:
۲۱۴-۶-۳ حمایت نگر حیدرآباد-۲۹
دیگر دفاتر:
● دوسری منزل۔ راج پال ہاؤز
پندرھویں روڈ۔ کھار۔ بمبئی ۵۲
● ۶۵۔ بی۔ دوسرا بلاک
راجہ جی نگر بنگلور-۱۰

پیکر میں شائع ہونے والے افسانوں،
خاکوں وغیرہ میں نام، مقام، کردار اور
واقعات فرضی ہیں،
اور ان سے کسی بھی قسم کی مطابقت
محض اتفاقیہ ہے۔

اعظم راہی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے
پرنٹو پریس
میں چھپوا کر ۲۱۴-۶-۳ حمایت نگر حیدرآباد-۲۹
سے شائع کیا۔

پچھلے چند برسوں میں ادبی رسائل اور عوام
میں ایک خلیج سی حائل ہو گئی
ہے ـــــ کیا یہ خلیج پاٹی جا سکتی ہے؟
رسائل جو فن کاروں
کو عوام سے روشناس کروانے میں ایک اہم کڑی ثابت
ہو سکتے ہیں ـــــ کیا واقعی ایسا ہو رہا ہے ـــــ؟
فن کاروں کا راست یا بالواسطہ عوام سے ربط ہونا چاہیے یا نہیں
اگر ہونا چاہیئے تو کن بنیادوں پر؟
یہ چند ایسے سوال ہیں جن پر ہمیں سنجیدگی سے غور
کرنا نہایت ضروری ہے
اس بارے میں ہم آپ کی رائے جاننے کے خواہش مند ہیں

اعظم راہی

جمہوریت میں فرد کی آزادی

ڈاکٹر عابد حسین

جمہوریت حکومت کے اس طریقہ کا نام ہے جسے ہم بول چال میں عوامی حکومت کہتے ہیں اس سے مراد ہے ایسی حکومت جس میں کوئی ایک شخص یا چند آدمی اپنی من مانی نہ کرتے ہوں بلکہ دیس کے سب رہنے والے مل کر اپنے نمائندوں کو ایک مدت کے لیے چنتے ہوں کہ وہ قانون بنائیں اور راج پاٹ کی نگرانی کریں۔ عوامی حکومت دو طرح کی ہوسکتی ہے ایک وہ جس میں ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہوسکتی ہے کہ قانون کے دائرے میں جس طرح چاہے اپنے عقیدے اور ضمیر کی روشنی میں زندگی بسر کرے۔ جہاں چاہے رہے جو چاہے پیشہ اختیار کرے۔ دوسری وہ جس میں فرد ریاست کے بنائے ہوئے جال میں اس طرح جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ اس کی آزادی بہت محدود ہوجاتی ہے۔ جہاں حکومت کہے رہنا پڑتا ہے اور جو کام وہ بتلائے کرنا پڑتا ہے۔ یوں تو دونوں طرح کی حکومتیں جمہوری ہونے کا دعوی کرتی ہیں۔ اگر دنیا کے نوے فیصد لوگ صرف پہلی قسم کی حکومت کو جس میں فرد کی پوری آزادی ہوتی ہے جمہوریت مانتے ہیں۔ دوسری حکومت کو کلی حکومت کہتے ہیں یعنی ایسی حکومت کو جو سماجی زندگی کے کل شعبوں میں دخل دیتی ہے اور فرد کے عمل پر بلکہ اس کے خیال

پر بھی پابندی لگاتی ہے۔ آج کی بات چیت میں ہم جمہوریت کا لفظ اسی حکومت کے لیے استعمال کر رہے ہیں جو فرد کو قانون کے دائرے میں خیال، قول اور عمل کی آزادی دیتی ہے۔

آیئے! اب ذرا یہ دیکھیں کہ جمہوریت کی داغ بیل، شروع میں کس طرح پڑی اور پھر جمہوری ریاست کی پوری عمارت جس شکل میں ہم دیکھ رہے ہیں رفتہ رفتہ منزل بہ منزل کس طرح بن کر کھڑی ہوئی۔

انسانی سماج کے بڑھنے کی تاریخ کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض ملکوں میں جن میں ہمارا ہندوستان بھی شامل ہے، جب لوگ مل کر رہنے لگے تو ہر ایک گاؤں میں لوگوں نے آپس کے جھگڑوں کو نبٹانے اور گاؤں کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کے لئے پنچایتیں بنا لیں۔ اپنی پنچایتوں کو جمہوری حکومت کی پہلی منزل سمجھنا چاہئے۔ دوسری منزل دو ڈھائی ہزار سال پہلے یورپ کی شہری ریاستوں، یونان کی ریاست ایتھنس اور پھر اٹلی کی ریاست روما میں نظر آتی ہے جہاں غلاموں کو چھوڑ کر شہر کے سارے باشندے اکٹھے ہوتے تھے اور کچھ لوگوں کو چن کر حکومت کا کاروبار سپرد کرتے تھے۔ اس کے بعد جب یونان

جب لوگ آپس میں مل کر رہنے لگے تو ہر ایک گاؤں میں لوگوں نے آپس کے جھگڑوں کو نبٹانے اور گاؤں کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کیلئے پنچایتیں بنا لیں۔

سولھویں صدی میں جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آکر لوگ بادشاہ کے سائے میں پناہ لینے لگے۔

اٹھارھویں صدی میں امریکہ نے جو انگلستان کی ایک کالونی تھی، سامراجی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے لڑائی لڑی تو لوگوں میں اپنے مقصد پر یقین و اعتبار اور اخلاقی جوش پیدا کرنے کے لئے قدرتی انسانی حقوق اور جمہوری اقتدار اعلیٰ کے نظریوں سے کام لیا گیا

اور روما کا سورج ڈوب گیا تو سارے بیچ
کے زمانے میں سیاست کی دنیا میں اندھیرا
چھایا رہا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے
چودھویں صدی عیسوی تک یورپ میں
جمہوری حکومت کی روشنی کہیں نظر نہیں
آئی۔ یہ جاگیرداری عہد تھا جس میں چھوٹے
بڑے جاگیردار برائے نام بادشاہ کے تحت
کہلاتے تھے۔ مگر اپنے اپنے علاقے میں خود
مختار تھے۔ رعایا کو اپنا غلام سمجھتے تھے اور
اس پر من مانی حکومت کرتے تھے۔ چودھویں
صدی میں اٹلی میں عوام نے شہروں میں جمہوری
ریاستیں بنالیں جیسی سیکڑوں سال پہلے
یونان اور روما میں بنی تھیں۔ سوئٹزرلینڈ
میں دیہاتی علاقوں میں کسانوں اور دست
کاروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی حکومتیں
بنائی تھیں۔ آگے چل کر ہالینڈ اور جرمنی کے
تجارتی مرکزوں میں ہر قسم کی شہری ریاستوں
کی بنیاد پڑی

سولہویں صدی میں جاگیرداروں کی لوٹ
کھسوٹ سے تنگ آکر لوگ بادشاہ کے
سائے میں پناہ لینے لگے اور اس کی حکومت
کو مضبوط کرنے لگے تاکہ جاگیرداروں کا زور
ٹوٹے۔ اس سیلاب میں جاگیرداروں کی حکومت
شہری ریاستیں بھی بہہ گئیں اور سب ملکوں
میں بادشاہ کا ڈنکا بجنے لگا۔ اب یہ دلچسپ
کہانی سنئے کہ بادشاہوں نے کس طرح آپ
ہی اپنی حکومت کی بربادی کا سامان کرکے
جمہوریت کے لئے راستہ صاف کردیا۔ اکثر
ملکوں میں بادشاہ امراء اور تاجروں سے ملکی
امور میں مشورہ کرتے تھے انگلستان میں پارلیمنٹ
جس کے ممبران ان دنوں زیادہ تر امرا اور
تاجر ہوا کرتے تھے، محصول وصول کرنے اور اصلاح
کرنے کے معاملے میں بادشاہ پر پابندی بھی
لگا سکتی تھی مگر عام طور پر حکومت کے
سارے اختیارات بادشاہ کے قبضہ میں
تھے۔ اور ان میں کوئی ان کا شریک نہ تھا۔
لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہ کو حکومت
کا خداداد حق حاصل ہے۔ اسی طرح جیسے
اور اس کے سردار پوپ کو روحانی ہدایت
اور رہنمائی کا۔ چنانچہ بادشاہ ایک حد تک کلیسا
کو اپنا حریف سمجھتا تھا۔ سولہویں صدی کے
وسط میں جب بعض ملکوں میں اصلاح مذہب
کی تحریک نے فرد کو کلیسائی تقلید سے آزاد

آزاد کر کے یہ حق دلایا کہ بائیبل کی تعلیم کی روشنی میں اپنے عقیدے و عمل کی راہ خود متعین کرتے تو پروٹسٹنٹ جماعتوں میں مذہبی تنظیم کا کام افراد کے آزاد گروپ کے مشورے سے کرنے لگے۔ بادشاہ نے کلیسا اور پوپ کے اقتدار کی بیخ کنی کرنے کے لیئے اس تحریک کی حمایت کی مگر یہ نہ سمجھے کہ وہ خود اپنے اقتدار کی بھی جڑیں کھود رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لوگوں نے سوچا کہ اگر پوپ کو خدا کی طرف سے رہنمائی کا حق نہیں ملا ہے تو بادشاہ کو بھی حکومت کا خداداد حق حاصل نہیں ہے۔ اگر ہم خود مل کر مذہبی امور کی تنظیم کر سکتے ہیں تو آخر سیاسی اور معاشی امور کی کیوں نہیں کر سکتے۔ غرض جس طرح پادریوں کی دینی حکومت کے خلاف اصلاح مذہب کی تحریک اٹھی تھی اسی طرح بادشاہوں کی دنیاوی حکومت کے خلاف جمہوریت کی تحریکیں اٹھنے لگیں ان کے خداداد حقوق کا جو نظریہ چلا آتا تھا۔ اس کے توڑ کے لئے قدرتی انسانی حقوق کا نظریہ قائم کیا گیا۔

اٹھارھویں صدی میں امریکہ نے جو انگلستان کی ایک کالونی تھی سامراجی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے لڑائی لڑی تو لوگوں نے اپنے مقصد پر یقین واعتبار اور اخلاقی جوش پیدا کرنے کے لئے قدرتی انسانی حقوق اور جمہوری اقتدار اعلیٰ کے نظریوں سے کام لیا گیا۔ امریکی انقلاب سے متاثر ہو کر فرانس میں روسو نے "عمرانی معاہدے" کا نظریہ مرتب کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہر انسان کو قدرت نے آزاد پیدا کیا ہے۔ بادشاہوں کو حکومت کا حق لوگوں نے ایک معاہدے کے ذریعے سے کچھ شرطوں پر دیا ہے جن سے ان کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ اگر بادشاہ ان شرطوں کو پورا نہ کریں تو جمہور کو ان کے خلاف بغاوت کر کے اپنی مرضی کی حکومت بنانے کا حق حاصل ہے۔ اس طرح کے تصورات نے انقلاب فرانس کے لئے جس کے اور بھی کئی سیاسی اور معاشی محرک تھے اخلاقی جواز پیدا کر دیا۔ امریکہ اور فرانس کی ریپبلک کا قائم ہونا جمہوریت کی تیسری منزل تھی۔ جس میں

بادشاہ یا امرا کا وجود ہی باقی نہیں رہا عوام
کے نمائندے نہ صرف ریاست کے قوانین
بناتے تھے بلکہ چند سال کے لئے صدر ریاست
کا انتخاب بھی کرتے تھے اور وہ وزیروں
کا تقرر بھی کرتا تھا جو حکومت کا کام انجام
دیتے تھے۔ انگلستان نے بادشاہ کے منصب
کو برائے نام قائم رکھا لیکن جمہوریت کی
راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی کابینہ
کی حکومت کا طریقہ نکالا جو پارلیمنٹ
کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے اس طرح عوام
کی نمائندہ پارلیمنٹ نہ صرف قانون سازی
کا کام کرتی ہے بلکہ حکومت کے روزمرہ کے
کاروبار پر بھی نگرانی رکھتی ہے۔ اس کی تقلید
ایک حد تک اور ملکوں میں بھی کی گئی۔ جمہوریت
کی ترقی کی چوتھی منزل یہ تھی کہ انیسویں صدی
کے وسط میں آئین ساز مجالس کے انتخاب
میں رائے دینے کا حق صرف اس طبقے کو تھا
جس کے پاس املاک ہوں۔ صدی کے
آخر میں انگلستان میں یہ حق ملک کے بالغ
مردوں کو آگے چل کر عورتوں کو بھی مل گیا۔ آج
ہندوستان اور بہت سی دوسری جمہوریتوں
میں ووٹ کا حق بالغ مردوں اور عورتوں کو
حاصل ہے مگر بعض ملکوں میں یہ حق ابھی تک
مردوں ہی تک محدود ہے۔ اب جمہوریت کی
توسیع دو سمتوں میں باقی ہے۔ ایک یہ کہ جس طرح
ملک کے کل باشندوں کو بنیادی سیاسی
حقوق حاصل ہیں اسی طرح بنیادی معاشی
سہولتیں بھی حاصل ہو جائیں اس لئے کہ
لوگ سیاسی آزادی کا پورا فائدہ اور پورا
لطف اس وقت تک نہیں اٹھا سکتے جب
تک انہیں معاشی فراغت نصیب نہ
ہو دوسرے یہ کہ جیسے ایک ملک کے باشندے
آپس کے جھگڑوں کو بات چیت کے ذریعے
طے کرتے ہیں اسی طرح قومیں بھی کرنے لگیں۔
یہ نہ ہو کہ جہاں کسی معاملے میں خصوصاً سرحد
کے بارے میں اختلاف ہوا اور فوج لیکر
ہمسایہ ملک پر چڑھ دوڑے۔

ہمارے دیش نے آزادی کے بعد جو آئین
بنایا ہے وہ جمہوریت کی سب سے زیادہ
ترقی یافتہ تصویر پیش کرتا ہے اور فرد کو قانون
کے دائرے کے اندر سب سے زیادہ آزادی دیتا ہے
اسی لئے ہم اپنی اس اخلاقی دولت کو جمہوریت اور
آزادی کے دشمنوں سے بچانے کیلئے قربانی دینے کیلئے
تیار ہیں۔ یہ آئین ہماری آن ہیں اور ہمارے دل کی ہمار
روح کی یہ آواز ہے کہ جان جائے پر آن نہ جائے ●

دو شعر

بچھڑی ہوئی یادیں بھی ہیں بھولے ہوئے غم بھی
تنہائی کے دروازے پہ کیا بھیڑ لگی ہے
ہر شخص کو جو دولت غم بانٹ رہا ہے
کیا نام ہے اس شہر میں وہ کون سخی ہے

خورشید احمد جامی

پیکر حیدرآباد - ۹

تم سے غلطی ہوئی
تم نے آبادیاں چھوڑ دیں
اور دیہات میں آکے تم بس گئے
تم نے ذمّہ لیا
شہر میں جلتے دوزخ میں بجھنے نہ دو
تم خدا تو نہ تھے
کس خرافات میں پھنس گئے!
شہر بڑھتے گئے
شہر عفریت تھے
ارتقا کی نئی ریت تھے
ان کے نیچے شگفتہ زمینوں میں تھے
ان کے سر آسمانوں پہ چڑھتے گئے
شہر بڑھتے گئے
ارتقا کا تو کردار ہوتا نہیں
جو کرے فتح وہ یار ہوتا نہیں
تم کو معلوم ہو
یا نہ معلوم ہو
شہر آقا ہیں تم ان کے محکوم
تم سے غلطی ہوئی
تم نے آبادیاں چھوڑ دیں

حکیم یوسف حسین خان

ایک مسافر اپنا وطن چھوڑ کر چل پڑا۔
میں نے اپنے ہی سے سوال کیا۔
یہ شخص اپنا وطن کیوں چھوڑ رہا ہے!
میں یہی سوال اس مسافر سے بھی کر
سکتا، تو وہ مجھ سے پوچھتا۔
اس لئے کہ میں اپنے وطن میں بھی کیا
مسافر نہیں ہوں؟ ——

ساتھ ہو گئے۔

میں نے سوچا اس سے جھوٹ موٹ کہوں کہ
نہ جاؤ۔

لیکن اتنے کھلے جھوٹ کی میری صفائی بھی
متحمل نہ ہو سکی۔

۳ پتھر ڈھونے والا مسافر

اقبال متین
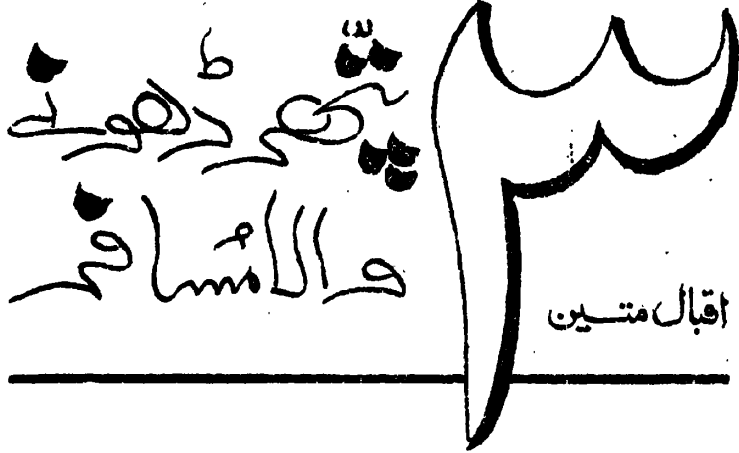
اور کیا عجب وہ کچھ نہ پوچھتا۔ لیکن اگر پوچھ
بیٹھتا۔ تو اس کے بعد کیا ہوتا، میں اسے
کیا جواب دیتا۔

میں نے ایسا کوئی سوال اس سے نہیں کیا۔ اس
نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اور مجھ سے جدا ہو
گیا جب وہ چلنے لگا تو دو آدمی اس کے

میرا ضمیر مر چکا تھا —— اور میں
اپنے ضمیر کی موت پر مطمئن تھا۔

جی چاہا اس سے اتنا تو پوچھ ہی لوں ——
مسافر، عمر کی اس منزل میں تم آخر کس شے
کی تلاش میں نکل پڑے ہو۔
لیکن میں اس مسافر کو جنم جنم سے جانتا ہوں

______ مجھے معلوم ہے وہ میرے اس سوال
کا جواب بھی کیا دے گا۔

وہ مجھ سے کہتا ______ محبت کی تلاش
میں سادھو کیا عجب وہ کچھ بھی نہ کہتا بس مسکراتا۔

مسکرانا اس مسافر کی زبان تھی ______
بے اعتنائی سے کوئی پیش آتے تو وہ مسکرا
دیتا تھا۔ اس کے اپنے ہی اس سے بیزاری
کا مظاہرہ کرتے تو وہ مسکرا دیتا تھا ______
سوال یہ ہے کہ اس کے اپنے تھے کون ______
سب ہی تھے ______ اور کوئی بھی
تو نہ تھا ______ جب تک سب اسکے
دست نگر تھے سب اسکے تھے اور اس نے سب کو
آنکھوں میں بٹھا کر رکھا ______ اور
جب مسافر کو سب کی ضرورت ہوتی تو سبھوں
نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا ______
انہیں ایک دوسرے کے چہرے پہچانے
نہیں جا رہے تھے۔ آخرش سبھوں نے ایک
دوسرے کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں
اس ڈر سے کہ ایک دوسرے کے جرم سے
آشنا نہ ہو جائیں۔ اور ایسے میں اس مسافر نے
ایک زخمی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر کھینچ لی۔

میں اس کا راز داں تھا ______ اس کی
مسکراہٹ کی زبان جانتا تھا لیکن اس
زبان میں بات کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

______ وہ سارے لفظ جو ادا نہیں
ہوتے ہیں لیکن زبان بن جاتے ہیں۔ میں نے
لفظوں کا سہارا لے کر انہیں جھٹلا دیا۔ میرے
لئے یہ موقع کتنا آساں بھی تھا کتنا جان لیوا
بھی ______ سب کچھ سمجھ لو لیکن
یوں ظاہر کرو جیسے کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔
کون تم سے پوچھے گا کہ آنکھوں کی نمی کیا
ہوتی ہے ______ کون تم سے پوچھے گا
اتنی زخمی مسکراہٹ کو کس طرح تم نے نہیں
پہچانا ______ اور پھر وہاں آنکھوں
کی نمی تھی۔ کہاں ______ صرف مسکراہٹ
تھی ______ ایسی مسکراہٹ جو
آنسو بن جانے کو اپنی اہانت سمجھتی تھی اور
میں نے اس مسکراہٹ کو مسکراہٹ سمجھنے
ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

یہاں تک کہ وہ مسافر مجھ سے جدا ہو گیا
اور جب وہ جا چکا تو میرے دل نے مجھ
سے کہا اب یوں گھٹ گھٹ کر رونے سے فائدہ۔

لیکن میری عقل میرے دل کی منفی اڑا رہی
تھی ۔۔۔ اور یوں کچھ ہی دیر میں اپنی
عقل کے ساتھ ہو گیا تھا اور اس کے
ساتھ ہو کر بڑا مطمئن مطمئن سا تھا ۔۔۔
کسی جھوٹ سے عقل سمجھوتا کرے تو آدمی
کامیاب اور ناکام بھی تو سکتا ہے ۔ لیکن
جب کوئی دل کسی جھوٹ سے سمجھوتہ کرتا ہے
تو زندگی کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہوتا ۔
۔۔۔ لیکن میں ان فلسفیانہ خرافات
میں خود کو الجھانا نہیں چاہتا تھا ۔۔۔
مسافر جا چکا تھا ۔۔۔ میں خوش
نہیں تھا پر مطمئن تھا ۔

اف وہ مسافر کیسا آدمی تھا ۔۔۔
وہ تو دو ماہ بعد ہی لوٹ آیا ۔۔۔
میں جب گھر سے چلا تھا تو وہ نہیں تھا ۔
میں جب رات گئے گھر لوٹا تو وہ منتظر تھا ۔
اپنی نظریں گیٹ پر جمائے ، اپنی آنکھیں
راستے میں بچھائے ۔۔۔ وہ اس طرح
میرا انتظار کر رہا تھا جیسے میں اس کا منتظر
رہا ہوں ۔۔۔ وہی دو آدمی اُس
کے ساتھ تھے ۔

جی چاہا اس سے پوچھوں کتنی محبتیں
بٹور لائے ہو ؟
لیکن میں اپنے ہر سوال کا جواب
جانتا تھا ۔

وہ مجھ سے کہہ سکتا تھا میں نے کچھ بھی نہیں
بٹورا ۔ لیکن محبتیں مجھ پر نچھاور کی گئیں ۔
۔۔۔ میں تو محبتیں اس سرزمین پر
بٹورنا چاہتا ہوں جس زمین کو میں اس طرح
چھوڑ گیا تھا جیسے اس زمین سے میرا کوئی
رشتہ نہیں ہے ۔۔۔ اور دیکھو میں
لوٹ آیا ہوں ۔ اس کے باوجود کہ مجھے
محبتیں ملیں ۔ پھر بھی میں لوٹ آیا ہوں ۔
اس لئے کہ میرا اس زمین سے کچھ رشتہ ہے ۔

میں ڈر رہا تھا ۔۔۔ اگر وہ مجھ سے
یہ بھی کہہ دے تو ۔۔۔ کہ میں تمہارے لئے
لوٹ آیا ہوں ۔۔۔ میرا تم سے بھی
کچھ رشتہ ہے لیکن اس نے ایسی کوئی
بات نہیں کی ۔۔۔ اس لئے کہ ایسی
کوئی بات وہ زندگی بھر نہیں کر سکتا تھا ۔
۔۔۔ اگر ایسی کوئی بات الفاظ بن کر
اس کی زبان تک آسکتی تو وہ اپنی مسکراہٹ

چاند اور چاند نمیلے ——— اور مسکراہٹ کی اس
زبان کا سہارا لیتا تھا جسے میں سمجھ سکتا تھا
اور جسے میں نے سمجھ کر ہی اسے وداع کیا تھا
جب وہ جا رہا تھا۔

میں اپنی سوچ میں گم سم اسے تکتا رہا۔ نہ میں
نے بات کی نہ اس نے۔ اور ہم دونوں دیر
تک خاموش رہے

اس مسافر کے دو ساتھی زندہ روحوں کی
طرح ہمیں تکتے رہے اور میں ڈھونڈھتا رہا
کہ اس کی مسکراہٹ کی وہ زبان کہاں ہے
جسے میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن اب اس کے ہاں
کوئی زبان بھی نہ تھی۔

میں بھاگ کر اپنے آپ میں کہیں
چھپ گیا۔

اس نے کوشش بھی نہیں کی کہ مجھے
اپنے آپ سے نکالے اور اپنے
مقابل کرے۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ بس ایک
دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔

یوں دیکھ رہے تھے جیسے ایک دوسرے
کے لئے اجنبی ہوں۔

یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہم ایک
دوسرے کے کچھ ہوں بھی تو ایک
دوسرے کو دیکھتے دیکھتے تھک گئے تھے
یوں دیکھ رہے تھے جیسے کچھ بھی
نہیں دیکھ رہے ہیں۔

اور اس وقت اس مسافر نے اپنے
ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیر دی۔

اور میں اس مسکراہٹ میں اس کی اور
اپنی زندگی تلاش کرنے لگا۔ لیکن زندگی جانے
کہاں چھپی بیٹھی تھی۔

اور اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا
——— کیوں نہ اس شخص کو قتل کر دوں
جو مجھے چین سے جینے دیتا ہے نہ چین سے
مرنے اور جو خود چین سے جی نہیں سکتا۔
اس لئے کہ وہ مجھے چھوڑ کر کچھ بھی نہیں کر
سکتا ——— میرے بغیر نہ اس کو ڈھنگ
سے مرنا آتا ہے نہ ڈھنگ سے زندہ رہنا۔

جب میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے قتل
کر دوں گا۔

تو میں نے بڑی محبت سے اسے اپنے پاس
ٹھہرا لیا۔

راحتوں کے نام پر اسے زمانے بھر
کی بے قراری دی۔

[illegible]۔ حیدرآباد

ایک بار جب اس نے کہا کہ یہ پڑھو
اور اپنی تحریر آگے بڑھا دی تو میں اس تحریر
کو کبھی قریب کر کے دیکھا کبھی دور کر کے
لیکن مجھ سے کچھ پڑھا نہ گیا۔
اس نے مجھ سے کہا عینک حاضر ہے
اور اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کر میرے آگے
اپنی عینک بڑی محبت سے پیش کی۔
لکھا تھا ـــــ مجھے وہاں دفنانا
جہاں تم دفن ہونا چاہتے ہو۔
میں نے کبھی مسافر سے کہا تھا۔
وہ جگہ اس کی ہوگی جو پہلے جائے گا۔

لیکن ایسی کوئی بات میں نے مسافر سے اس
بار نہیں کی ـــــ اور اس لئے نہیں
کی کہ شاید میں جانتا تھا کہ کون خوشی سے
پہلے جائے گا۔ کیونکہ مسافر کی عینک میری
آنکھوں پر چڑھی ہوئی تھی اور میں اس کے
دل کو اسی کی آنکھوں سے پڑھ رہا تھا۔
میں نے بات کی اہمیت کو گھٹانے
کے لئے صرف اتنا کہا
وقت فیصلے خود کر لے گا۔

بس ایک مسکراہٹ ایک پوری شخصیت
بن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور
اس مسکراہٹ نے کہا تمہیں اپنا سب
کچھ بیچ کر پالا پوسا تھا اور اب تمہارے
انتظار میں ہوں کہ تم کیا کرتے ہو!
اور یہ بات ان مسافروں نے بھی
سن لی جو اس کے ساتھ تھے۔
اور اس کے ساتھ جو دو مسافر تھے
ان میں ایک میری ماں بھی اور ایک میری
اپاہج بہن
اور اس کی مسکراہٹ کی زبان
میرے سوا دوسروں نے بھی سمجھ لی تو میں
نے اس مجرم کو اپنے اندر کھوجنا شروع کیا
جو مسافر کے قتل کا درپے تھا۔ لیکن وہ
مجھے کہیں نہیں ملا ـــــ وہ اس بار
پھر کہیں چھپ گیا تھا۔
میں تو یہ چاہتا تھا کہ یہ زبان میرے
سوا کوئی اور نہ سمجھ سکے
لیکن اب یہ زبان دھیرے دھیرے
عام ہو رہی تھی ـــــ جو مجھے شاید گوارہ
نہ تھا۔
میں اپنی سوچ میں گم ہو گیا ـــــ
اور سوچ کی یہ عمر میری اپنی عمر سے کہیں طویل ہے
اور جب اپنی سوچ سے ابھر کر میں چونکا

تو میں نے دیکھا کتنے ہی قاتلوں کو زمانہ
سینے سے لگائے رکھتا ہے ۔ ان کے
آگے جھکتا ہے ۔ انہیں قاتلوں میں سے
میں بھی ایک ہوں ۔

میں نے ہی اپنے بے پناہ چاہنے والے باپ
کو قتل کیا ہے ۔ اس اعتراف جرم کے
بعد بھی کونسی عدالت ہے جو مجھے سزا
دے گی —— اتنی بڑی عدالت کوئی ہے
بھی ؟ —— اور اگر ہے تو میں کہوں گا
ان حالات کو بھی شریک جرم ٹھہراؤ
جنہوں نے میرے باپ کے قتل میں میری
اعانت کی ۔ ان حالات کے سر دو آدمیوں
کا خون ہے —— میرا بھی میرے
باپ کا بھی ۔

میں اپنے باپ کو جنھیں میں بابا جان کہہ کر
پکارتا تھا اپنے بڑے بیٹے کے برابر
دفنا آیا ہوں ۔ لیکن ان سفاک حالات
نے مجھے قتل کر کے دفنانے کی بھی توزحمت
نہیں کی اور مجھ کو ہر موڑ پہ زندگی سے
آنکھ چرا کر نکل جانے کے لیے چھوڑ دیا ۔
لیکن وہ مشتاق قریشی مجیب تھا

—— جاتے جاتے وہ مجھے تین پتھر سونپ
گیا —— چھوٹے کے وہ پتھر جو آنگن
میں پڑے ہیں اس کی مسافرت کی آخری نشانی ۔
سوچتا ہوں ۔
ایک پتھر میری ماں کی قبر کے لئے ہے ۔

ایک پتھر میری ایاہج بہن کی قبر کے لئے
اور ایک پتھر میری اپنی قبر کے لئے
لیکن کیا معلوم زمانہ ہمیں یہ پتھر بھی
دے گا کہ نہیں ۔ ●●

چال اک ایسی چلی ہر شخص سیدھا ہو گیا
بات بس اتنی کہ میں تھوڑا سا ترچھا ہو گیا
لوگ بولے: اب نیا ہو جا، پرانا پن اتار
میں بھی کیا کرتا، سرِ بازار ننگا ہو گیا
اس جنم میں پھر مجھے ویسی ہی بدنامی ملی
اتفاق ایسا کہ پھر اس گھر میں پیدا ہو گیا
ٹوٹ کر تارے گرے کل شب کسی دہلیز پر
اس کی بھی آنکھیں گئیں اور میں بھی اندھا ہو گیا
چھ دنوں تک شہر میں گھوما وہ بچوں کی طرح
ساتویں دن جب وہ گھر پہونچا تو بوڑھا ہو گیا
دو دنوں میں ہم ذرا کچھ اور لمبے ہو گئے
قد ہمارے دوستوں کا اور چھوٹا ہو گیا
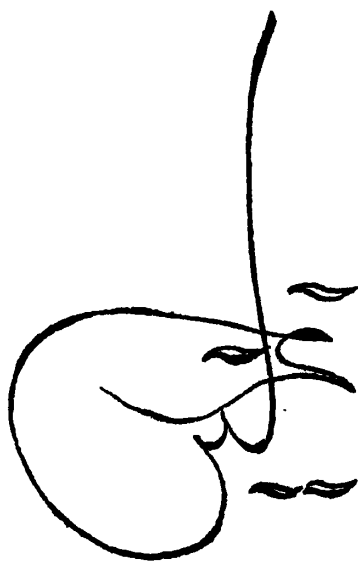
ہے تا حدِّ نظر نیلا سمندر
بدن میں پھڑپھڑاتا ہے کبوتر

اب اس کا نام تک باقی نہیں ہے
وہی جو جی رہا تھا میرے اندر

بتا اے دل! مرے بجھتے ہوئے دل!
یہ کس آسیب کا سایہ ہے تجھ پر

معانی کا ہے باطن سے تعلق
بہت کچھ کہہ گئے چپ چپ سے منظر

مری دہلیز پر چپکے سے پاشی
یہ کس نے رکھ دی میری لاش لاکر

کمار پاشی

بظاہر زبان اور ادب ایک دوسرے کے
لئے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے
ان دونوں میں فوقیت بہرحال زبان کو حاصل
ہے اور ادب زبان کے وجود کا رہینِ منت
ہے۔ ادب کے بغیر تو زبان قائم رہ سکتی ہے، بولی
بھی جا سکتی ہے مگر بغیر زبان کے ادب کا تصور

زبان یا ادب

رشید الدین

نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ادب زبان کا پابند
ہے۔ زبان ادب کی پابند نہیں۔ ہندوستان میں
زبانیں یا بولیاں ایسی ہیں جو آج بھی دیہاتی
پہاڑی علاقوں میں وسیع پیمانے پر بولی اور
جاتی ہیں۔ لیکن جن کا کوئی رسم الخط نہیں ادب
کی بات سنئے مثلاً مرہٹواڑہ (ریاست
سابق حیدرآباد

مہاراشٹرا) کے دیہی علاقوں میں بولی جانے
والی بھیل اور بنجاری دو ایسی زبانیں (یا جنھیں
آپ لسانی اصطلاح میں بولیاں بھی کہہ سکتے
ہیں) جن کا کوئی رسم الخط نہیں لیکن بھیل اور
بنجارے ہمیشہ آپس میں انہیں زبانوں میں بات
کرتے ہیں۔ ان زبانوں میں ان کی کہاوتیں
ہیں۔ ضرب المثلیں ہیں اور گیت ہیں۔ یہ زبانیں
ہزارہا سال سے برابر بولی اور بھی جا رہی ہیں
اور آگے بھی بولی جائیں گی۔ جب تک بھیل اور
بنجاروں کی قومیں آباد رہیں گی اس وقت
تک ان زبانوں کا مستقبل تاریک نہیں ہو سکتا
یہ جاندار زبانیں کہلاتی ہیں۔ کیونکہ ان کے
بولنے والے زندہ ہیں۔ یہ عوامی زبانیں ہیں کیونکہ
انہیں عوام کا تعاون حاصل ہے۔

ایک طرف ہندوستان کی ایسی چھوٹی غیر معروف
اور محدود پیمانے پر بولی جانے والی غیر ترقی
یافتہ زبانوں کی جانداری کا یہ حال ہے کہ
ہزارہا سال سے برابر بولی جا رہی ہیں اور
آج بھی جن کا مستقبل تاریک نظر نہیں آتا
اور دوسری طرف اردو ایسی بڑی، معروف اور
ترقی یافتہ زبان ہے جس کے بہی خواہ اور دوست
(ان کی اپنی دانست میں) کھلے بندوں تقریروں
اور تحریروں میں یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ زبان

اُردو داں افراد کے لیے لمحۂ فکریہ

مرچکا ہے۔ غور فرمایئے اگر مر رہی ہے بھی کہا جاتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ مگر یہاں تو صاف موت ہو گئی کا خود ساختہ فتویٰ صادر کیا جا چکا ہے ہندوستان میں اس کا مستقبل بے حد تاریک ہے۔ (دیکھئے صاحب! پہلے ہی جملے میں اس کی موت کا اعلان اور دوسرے جملے میں اس کے مستقبل کا کیا سوال؟) مانا کہ اُردو زبان کی ہندوستان میں وہ حالت نہیں رہی جو تقسیم سے پہلے تھی۔ (اور وہ بھی کیسے ہو سکتی ہے جب کہ آپ اس ملک کا ایک علاقہ مذہب زبان اور کلچر کے نام پر الگ کر لیں اسے صرف مسلمانوں کی زبان کہا جا رہا ہے (پاکستان میں کسی بھی صوبے کی زبان نہ ہونے پر جب اردو کو وہاں کی سرکاری زبان بنایا گیا تو اسے مسلمانوں کی نہیں تو کس کی زبان کہیں گے) ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم جدید میں اسے ہندوستان میں کوئی بھی علاقہ نہیں دیا گیا۔ (اُردو دستور ہند کی چودہ مسلمہ زبانوں میں سے ایک ہے اگر اس کے ساتھ اس ضمن میں ناانصافی ہوتی ہے تو آپ اسے ثابت کیجئے ملک کی عدالتیں ہر وقت کھلی ہوئی ہیں) اُردو مدرسوں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے (اگر آپ کو اپنی زبان اور کلچر سے پیار ہے تو اپنے مدرسے خود قائم کیجئے۔ حکومت پر کیوں تکیہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکول حکومت نہیں عیسائی مشنریاں چلاتی ہیں) آج اُردو جاننے والے اور بولنے والے ہندو اور غیر مسلم بھی اس سے انکار کر رہے ہیں (تو کیا آپ زبردستی کسی سے اپنی زبان کا لوہا منوانا چاہتے ہیں) ——— یہ چند ایسے سوالات اور نکات ہیں جو اردو کے تعلق سے اکثر سننے میں آتے ہیں۔ اور ان سوالات اور نکات کے پیش کرنے والے زیادہ تر (بلکہ تمام تر کہئے) قدیم نقطۂ نظر رکھنے والے معمر مسلمان ہیں جن کو یہ تو گوارا تھا کہ تقسیم سے قبل مسلم حکمرانوں کی دیسی ریاستوں میں تمام لوگ بہ جبر اُردو سیکھیں۔ مگر اب یہ گوارا نہیں کہ اکثریت

پیکر حیدرآباد۔ ۹

کی زبان اقلیت کے لوگوں کو سیکھنا چاہیئے
یہ طبقہ جس نے کچھ حد تک نوجوان طبقے کو بھی
متاثر کیا ہے۔ اردو کے تعلق سے اپنا مخصوص
زاویہ نظر رکھتا ہے۔ مثلاً ان کی آنکھوں کے
سامنے (عقل تو بیچارے استعمال ہی نہیں کرتے
بلکہ یہ کام بھی وہ آنکھوں ہی سے لینا چاہتے
ہیں) ہمیشہ یہ رہتا ہے کہ تقسیم سے پہلے ہندوستان
میں اردو بولنے والوں کی تعداد اتنی تھی اب
اتنی رہ گئی۔ تقسیم سے پہلے یہاں اردو میڈیم
کی یونیورسٹی تھی اب نہیں۔ تقسیم سے پہلے اردو
کے اسکول اتنے تھے کہ اب اتنے نہیں یا تقسیم
سے پہلے ہندو بھی اردو کو اپنی زبان کہتے تھے
آج نہیں کہتے مگر وہ ان تبدیلیوں کے وقوع پذیر
ہوتے ہیں جن حالات اور واقعات کا ہاتھ تھا
ان کا تجزیہ نہیں کرتے۔ جب مسلمانوں کی
ایک قابل لحاظ تعداد تقسیم کے بعد پاکستان
چلی گئی تو پھر کس طرح یہاں مسلمانوں اور اردو
بولنے والوں کی تعداد کم نہ ہوگی۔ آپ چند لڑکوں
کی زبان کسی یونیورسٹی میں تمام لڑکوں پر
تھوپ کریں۔

یہ ایک جمہوری ملک میں کس طرح ممکن ہوگا
تقسیم کے بعد اردو کے اسکولوں میں جو کمی ہوئی
وہ تو ہونی ہی چاہیئے تھی۔ ایک تو بہت سے
اردو داں حضرات پاکستان چلے گئے اور دوسرے
[illegible]۔ پیکر حیدرآباد

اس زمانے میں غیر ضروری اردو کے اسکول
بھی قائم تھے۔ ایک جمہوری اور سیکولر حکومت
کیوں کر یہ نقصان برداشت کرے گی۔ اگر
ہندو اردو کو اپنی زبان نہیں مانتے تو جانے
دیجئے۔ آپ کیوں اصرار کرتے ہیں۔ ایسی چیزیں
ظاہر ہے زبردستی یا بہ زور نہیں منوائی جا سکتیں
آپ نے بھی انگریزوں کے دور میں انگریزی
کو اپنایا تھا۔ اور گلے لگایا تھا۔ اس وقت آپ
کو ہندی یا کوئی دوسری ہندوستانی زبان
کیوں یاد نہیں آئی تھی۔ یہ تو ہر دور میں ہوا ہے
انسان کو جس زبان میں سہولتیں اور مراعات
ملتی ہیں وہ اس زبان میں تعلیم حاصل کرتا ہے
اور اسی کو مانتا ہے۔

ایک طرف ان لوگوں کے اردو کے تعلق سے
یہ خیالات ہیں اور دوسری طرف وہ اردو کے
سرمایہ ادب پر نازاں بھی ہیں۔ جہاں بھی ذکر
آتا ہے اردو کی فصاحت بلاغت، عمومیت
وسعت اور شیرینی و نزاکت کا یہ ذکر چھیڑ بیٹھتے
ہیں۔ لہک لہک کر غالب اور میر کے اشعار
سناتے ہیں اور اردو کے ضخیم نثری کتابوں کے
پیراگراف کے پیراگراف سناتے نہیں چوکتے
مگر ان پر آج اردو زبان کے تعلق سے جو
ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کی طرف ان
کی نگاہ نہیں جاتی۔ وہ صرف اپنے علمی ادبی

سرمائے پر ہی منحصر نظر آتے ہیں۔ حالانکہ صرف
ادب ہی سے کچھ نہیں ہوتا۔ ادب الماریوں
میں بند رہتا ہے جبکہ زبان گلی کوچوں اور شہروں
دیہاتوں میں بولی جاتی ہے اس طرح زبان
کو ادب پر برتری حاصل ہے۔ اگر کسی زبان
کے بولنے والے ہی نہ رہیں تو اس زبان کے بیش بہا
ادب سے فائدہ؟ سنسکرت، یونانی اور لاطینی
زبانوں کے ادب سے الماریاں کی الماریاں
بھری پڑی ہیں۔ مگر پھر بھی وہ مردہ زبانیں
کہلاتی ہیں کیونکہ ان کے بولنے والے ہی
موجود نہیں۔

ان لوگوں کا ایک اور محبوب مشغلہ ہے اور وہ
ہے درجہ بندی۔ ادب کی درجہ بندی زبان
کی درجہ بندی، علاقائی بنیادوں پر زبان بولنے
والوں کی درجہ بندی۔ ادب میں جاسوسی ادب
فلمی ادب، سنجیدہ ادب، اور تجارتی ادب
کی اصطلاحیں ان دنوں بے حد عام ہیں۔
حیدرآباد کا رہنے والا کسی ضلع کے رہنے والے
کی زبان کو غیر فصیح سمجھتا ہے اور دہلی اور
لکھنو کا رہنے والا حیدرآباد کی زبان کو قابل
اعتنا نہیں تسلیم کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ
جاسوسی ادب تعمیری ادب نہیں ہوتا۔ اس میں
جرم کے موضوع کو ہوا دی جاتی ہے لیکن اکثر
لوگ اسے تفریح کے لئے پڑھتے ہیں۔ اور بہت
شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہی حال فلمی ادب کا بھی
ہے، ہندوستان اور پاکستان میں جتنے رسالے
اردو کے چھپتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ
تعداد اشاعت دہلی کے ایک فلمی ماہنامے کی
ہے۔ ان دنوں اردو میں کئی جاسوسی اور فلمی
ماہنامے نکل رہے ہیں۔ انہیں عام پڑھے
لکھے (جن میں خاصی تعداد غیر مسلموں اور غیر
اردو داں افراد کی ہوتی ہے) بڑے شوق سے
خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ اب سنجیدہ حضرات
اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں
دیکھتے کہ اس زمانے میں جبکہ اردو کی ایسی نازک
حالت میں یہ رسالے یہ ادب اسے عوامی زبان
بنائے رکھنے میں کتنی مدد دے رہے ہیں۔ اس سے
میرا مطلب ہرگز نہیں کہ اچھے اور سنجیدہ ادب
کو چھوڑ کر باضابطہ اس ادب کا مطالعہ شروع
کر دیا جائے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس ادب
کی کتنی مانگ ہے اور لوگ اسے کتنے ذوق
و شوق سے پڑھتے ہیں۔ مانا کہ اس قسم کے رسالوں
میں ٹھوس اور سنجیدہ ادب نہیں ہوتا لیکن آج
ادب سے زیادہ زبان کا مسئلہ درپیش ہے
ایسی صورت میں اگر سنجیدہ ادب کی بجائے
فلمی اور جاسوسی ادب زبان کی خدمت انجام
دے رہا ہے اور اسے عوامی زبان برقرار

رکھ رہا ہے تو کیا بُرا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں کافی وسیع النظر ہونا چاہیئے۔ اور زبان کی طرف زیادہ اور ادب کی طرف کم دھیان دینا چاہیئے جب اردو کا یہ عبوری دور ختم ہو جائے گا اس وقت سنجیدہ ادب آپ اپنی جگہ بنا لے گا۔

اردو کے ان بہی خواہوں کی نظر میں (جو نا انصافی کے جذبے سے سرشار اپنا کیس ہی غلط طور پر پیش کر رہے ہیں) جاسوسی اور فلمی پرچوں سے زیادہ اعتراض ان اردو پرچوں پر ہے جو تقسیم کے بعد نکل رہے ہیں۔ اور جنھیں زیادہ تر غیر مسلم یا کم عمر اور جدید نظریات کے حامل اردو داں نکال رہے ہیں۔ یہ پرچے قطعی ادبی نہیں ہوتے اور نہ ان کے نکالنے والوں کو یہ دعویٰ ہے کہ کوئی انہیں ادبی تسلیم کرے مگر انہوں نے وقت کی نبض کو ضرور پہچانا ہے اور اردو کو عوامی اور عام فہم زبان برقرار رکھنے میں ان پرچوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ پھر بھی آئے دن اس قسم کے پرانے فرسودہ خیالات رکھنے والے اردو داں اشخاص ان کی زبان پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ آگے اردو کی ہندوستان میں یہی شکل رہے گی۔ ابھی قریب ہی کی بات ہے کہ ہندوستان میں انگریزی کے کثیر الاشاعت ہفت روزہ بلٹز نے بمبئی سے ہندی کے بعد اپنا اردو ایڈیشن بھی دس ہزار کی اشاعت سے انتہائی فخر سے۔ یہ بات ان اردو ادبی رسالوں کے مدیران کے لئے جو اپنے پرچوں کی سلور جوبلیاں اور گولڈن جوبلیاں مناتے ہیں مگر ایک ہزار کی اشاعت تک نہیں پہنچ سکتے) شائع کرنا شروع کیا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں اردو کے مشہور ادیب، صحیفہ نگار اور فلم ساز خواجہ احمد عباس نے اردو کے تعلق سے چند امید افزا اور حقیقت پر مبنی کلمے لکھے تو اردو کے ان نادان دوستوں میں کھلبلی مچ گئی (حالانکہ یہ کھلبلی، اردو کے دشمنوں میں مچنی چاہیئے تھی) اور فوراً ان لوگوں نے اخباروں اور رسالوں میں لے دے شروع کر دی تھی کہ یہ عباس صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ اردو زبان تو مر چکی ہے گویا جس زبان پر انہوں نے فاتحہ پڑھ دی اسے یار لوگ پھر زندہ کہہ رہے ہیں اور نہ صرف کہہ رہے ہیں بلکہ اس کا عملی ثبوت اس دس ہزار کی اشاعت سے اخبار نکال کر دے رہے ہیں (کس قدر عجیب لوگ ہیں یہ بھی —!) صرف یہ لوگ اس پر خاموش نہیں ہو گئے بلکہ اردو بلٹز کے دفتر پر خطوں کی ڈور لگا دی کہ اس کی زبان معیاری اور ادق بنائیے یہ کیا کہ آپ اس میں ہندی اور انگریزی کے الفاظ ٹھونس رہے ہیں حالانکہ اس میں پہلے ہی سے جو عربی اور فارسی کے

الفاظ ٹھنسے ہوئے ہیں یہ ان لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ آخر واجد علی شاہ حضور نظام والی رام پور یا بیگم صاحبہ بھوپال کے زمانے والی عربی اور فارسی آمیز سنگلاخ، ادق اور بوجھل اردو کب تک ہندوستان کی عوامی زبان رہ سکتی ہے۔ ان لوگوں کا نزلہ صرف جاسوسی فلمی اور غیر ادبی پرچوں پر ہی نہیں گرتا بلکہ فلم بھی ان کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ وہ فلم والے جنھوں نے راس کماری سے کشمیر تک اور گوا سے آسام تک اُردو کا ڈنکا بجا دیا ہے۔ یہ لوگ انہیں بھانڈ سمجھتے ہیں اور بھلا بھانڈ کسی زبان کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ یہ کام تو صرف سرکار دربار سے وابستہ ہے۔ دربار تو اب رہے نہیں اور سرکار اب اُردو کے معاملے میں بہری ہو گئی ہے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

بہرحال ضرورت اس کی ہے کہ اُردو کے تعلق سے ہم اردو داں افراد اپنا نقطۂ نظر تبدیل کریں۔ وسیع النظر بنیں۔ پدرم سلطان بود کی گرداں چھوڑ کر نئے زمانے کے ساتھ چلیں اور ادب ادب کی رٹ چھوڑ کر زبان کے مسائل کو سمجھیں اور وقت کا ساتھ دیں۔

ایک نظم

کانٹے، چھالے، تپتا میداں
گرمی، لو
اور پیاس کی شدت
کوسوں چشمہ
اور نہ سایہ
لیکن منزل میری منزل
ساتھی
سست قدم آرام طلب
مجھ سے پہلے
منزل پہ پہنچے
ان کا وصف خاص تھا
راہوں کی ــــــ برداری

میر احمد علی قادری

زرد بیڑ کی ٹھنڈک سے اٹھتے ہوئے
جھاگ کے کھوکھلے قہقہوں کی سطح سے
اُبھر آئیں

شائستگی کی لکیروں میں
جکڑے ہوئے
بند کمرے کی سطحِ گرانی کا اسکیل
جب لذتوں کے مثلث کو
خواہش کے خطِ عمودی سے
تقسیم کرنے بڑھے گا

الف

جہاں زاویہ قائمہ
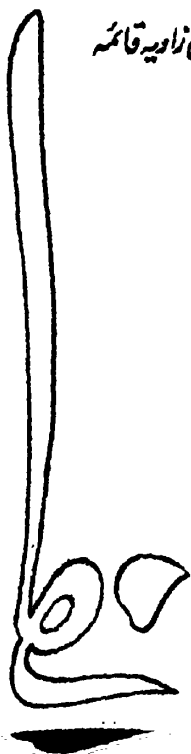
تاج مہجور

بلڈنگوں کی چھتوں سے اُترتی ہوئی
دھوپ کو
نیلگوں وسعتوں میں ابھرتے ہوئے
شہر کی تیز رفتار نے
روند کر
گرد کی شکل دیدی
اندھیرا اجالا تو بس ایک روایت ہے
پس ماندگی کی
مجھے تو!

نظر کو تھکا دینے والی چکاچوند میں
مسخ چہروں سے لٹکے ہوئے جسم کی
گدلی پرچھائیاں
کالی سڑکوں پہ ہر سمت بہتی ملیں
یا کسی بار میں

جگدیش بمل

رادھا اور رانی دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ دونوں ایک ساتھ کھیلیں، ساتھ ساتھ پڑھیں اور جوان ہوئیں پھر دونوں کی شادی ہوگئی اور حالات نے دونوں کو ایک دوسرے سے کئی سو میل پرے پھینک دیا۔ اپنی دوستی اور محبت کو وہ آج تک خط و کتابت کی ڈور سے باندھے چلی آرہی تھیں۔ اسی لیے دوستی کی یہ ندی اب تک حالات کے ریگستان میں اپنا وجود نہ کھو پائی تھی۔ ورنہ لڑکیوں کی دوستی ہی کیا قسمت نے ایک شہر میں اکٹھا رکھا اور خاوند اچھے اور آزاد مل گئے تو آپس کا ملنا جلنا بنا رہا۔ نہیں تو برساتی ندی کی طرح لڑکیوں کا پیار سسرد یاں آتے ہی یا تو بالکل سوکھ جاتا ہے یا اپنی گھر گرہستی اور بچوں کی پرورش میں یہ ندی اپنی گذرگاہ تبدیل کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں سچی لگن اور پیار ستاروں کی گردش کو بھی بدل دیتے ہیں۔

———— رادھا اور رانی کی لگن سچی تھی یا محض یہ ایک حادثہ ہی تھا جس سے

رانی کے پتی کا ٹرانسفر جب اس شہر میں ہوگیا تو ان دونوں نے ایسا محسوس کیا جیسے قسمت کے بجھے ہوئے ستاروں کو خدا نے پھر سے روشنی بخش دی ہے ——— اسٹیشن پر دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ملیں جیسے اس جنم میں پہلی بار ملی ہوں۔ رادھا کے پتی شری ناتھ نے اپنی بیوی کے چہرے پر مسرت کی ایسی لکیریں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ بڑی پیاری نظروں سے رادھا کی طرف دیکھتے رہے۔ شری ناتھ جی ایک دبلے پتلے اور سادہ سے آدمی تھے لیکن فراخ پیشانی کے نیچے دو گہری اور چمکتی ہوئی سنجیدہ آنکھوں کو دیکھ کر ان کی غیر معمولی شخصیت کا اندازہ ہر ملنے والے کو پہلی ہی نظر میں ہو جاتا۔

رانی نے شری ناتھ جی کو میٹھی میٹھی نظروں سے رادھا کو دیکھتے ہوئے پاکر اس کے کان میں کوئی ایسی بات کہی جس سے رادھا کا سارا چہرہ حیا سے سرخ ہوگیا۔ پھر دونوں ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر ہنسی کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ رانی شری ناتھ جی کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

"بھابی جی۔ میں رانی ہوں ——— !" تو شری ناتھ نے پوچھا ——— "کس کی؟"
اسی وقت رانی کے پتی کرشن موہن جی آگئے

"میں ہی وہ راجہ ہوں، غلطی سے ماں باپ نے میرا نام کرشن موہن رکھ دیا ہے لیکن آپ گھبرائیں نہیں میں کرشن ہوتے ہوئے بھی آپ کی رادھا پر کوئی Claim نہیں کرونگا۔" قہقہہ مار کر وہ ہنس پڑے۔ شری ناتھ جی اسی طرح مسکرا رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

رانی کے پتی کرشن موہن ایک بڑے آفیسر تھے یہاں تبدیل ہو کر آئے تو پہلے سے ان کے مکان کے لئے آفس کی طرف سے بندوبست ہو چکا تھا۔ پانچ چھ آدمی ان کی سواگت کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کا سارا سامان پلک جھپکتے ہی اتار لیا گیا اور سامان کی ذمہ داری آفس کے ایک کلرک کو سونپ کر وہ ٹیکسی پر بیٹھ کر اپنے نئے گھر چلے گئے۔

رادھا اتوار کے لئے رانی اور اس کے پتی کو گھر بلا چکی تھی اور وہ ان دونوں کے سواگت

کے لئے اس طرح تیاریوں میں لگی ہوئی تھی جیسے گھر میں لڑکی کی شادی ہو۔ لیکن سنیچر کی دوپہر ٹیلی فون پر رانی نے اسے اطلاع دی کہ وہ اتوار کو وہاں نہ آسکیں گے۔ ایک ضروری کام کے لئے کرشن موہن جی صبح سے شام تک گھر سے باہر رہیں گے اور پھر گھر میں سارا سامان بکھرا پڑا ہے۔ اس حالت میں گھر چھوڑ کر آنا اچھا نہیں لگتا ——"

رادھا کو مایوسی ہوئی اس نے پوچھا: "کیا تم لوگ رات کے کھانے پر نہیں آسکتے؟"

"اوہ نو ——" پھر کچھ سوچتے ہوئے رانی نے کہا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ یہیں میرے پاس جیجا جی کو لیکر آجانا۔ گھر کو سجانے کے لئے میرا ہاتھ بھی بٹانا اور ہم اکٹھے مل کر سارا دن گزاریں گے۔"

شری ناتھ اور رادھا جب رانی کے وہاں پہنچے تو انہیں حیرت ہوئی۔ سارا گھر پہلے ہی سے سجایا جا چکا تھا۔ رادھا نے شکایت سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم بہت جھوٹی ہو۔"

"نہیں بھئی میں تو چیزوں کی ترتیب میں کل ہی سے جٹی ہوئی تھی۔ تم تو جانتی ہو نہ مجھے بے ترتیب چیزوں سے نفرت ہے۔ اب کام جلدی ہو گیا تو میں جھوٹی ہو گئی!"

پھر ایک ایک کرکے مکان کے سبھی سجے سجائے کمرے رانی نے انہیں دکھائے۔ نوکر نے ٹیبل پر چائے اور ناشتے کا سامان رکھ دیا تھا۔ انہوں نے مل کر ناشتہ کیا اور ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے۔ شری ناتھ جی نے کتابوں کی الماری دیکھی تو اٹھ کر الماری کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔

"آپ کے راجہ کو اتنا کچھ پڑھنے کی فرصت مل جاتی ہے؟"

رانی کی بجائے رادھا نے جواب دیا "ان کے راجہ کو اپنی آفیسری سے فرصت کہاں ملتی ہوگی یہ سب تو رانی کے شوق کی بدولت ہیں۔"

شری ناتھ نے پلٹ کر رانی کو ایک نظر دیکھا۔ رادھا مسکرادی اور رانی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جانے یہ سرخی حیا کی تھی یا

ہر انسان کی اپنے آپ کو سونپ لینے کے بعد جو مسرت ملتی ہے یہ اس مسرت کی لہر کا اثر تھا ——————

شری ناتھ نے کہا ۔ "شادی کے بعد اپنے آدرش اور شوق کو سنبھالے رکھنا عورتوں کے لئے ایک بہت بڑی بات ہے ۔"

ایک بار رادھا کی طرف انہوں نے گہری نظروں سے دیکھا پھر کتابیں دیکھنے میں مشغول ہو گئے ۔ رانی نے رادھا کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔

"اور رادھے تیرے شوق کا کیا ہوا —— تیرا وہ سنگیت اور —————— ؟"

رانی بولتے بولتے یکایک رک گئی ۔ شری ناتھ نے چور نگاہوں سے رادھا کی طرف دیکھا پھر اپنی آنکھوں میں حیرت بھرتے ہوئے انہوں نے پوچھا ۔

"رادھا اور سنگیت —— یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ۔۔ ؟"

"ارے واہ ! یہ بھی خوب رہی ، کیا آپ نہیں جانتے ، سنگیت تو رادھا کی جان ہے !"

رادھا کی جیسے جان ہی نکل گئی ۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ——۔ رانی نے پلٹ کر رادھا کی طرف دیکھا ۔ "کیوں ری تیرا ستار کہاں ہے ؟" پھر ہنس کر بولی ۔ "تیرے اور ان کے ستار بہت ملتے ہیں ۔ یہ بھی کبھی کبھی ستار بجا لیتے ہیں ۔ چلو آؤ ۔ بہت دنوں کے بعد تمہاری انگلیوں کے جادو ——— "

رانی کہہ کر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی ۔

"رانی ——" بات کاٹتے ہوئے رادھا نے کہا ۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگا تھا رانی کو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا ۔

"کیا بات ہے رادھے —— تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نہ ؟"

"ہاں !" چھوٹا سا جواب دے کر رادھا نے اپنا سر جھکا لیا ۔

شری ناتھ کتابوں کی الماری کے پاس سے چلتے ہوئے رادھا کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے ۔ اس عرصہ کے دوران رادھا نے اپنے اندر کے ابلتے ہوئے طوفان پر قابو پا لیا ۔

"کیا بات ہے ۔ ؟" شری ناتھ نے رادھا کی پیشانی کو چھو لیا ۔ رادھا کے قریب ہی وہ صوفے پر بیٹھ گئے ۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ؟"

"ہاں ! "

رانی بت بنی سامنے کھڑی تھی۔ شری ناتھ نے کہا۔

"میرے لئے یہ نئی خبر ہے کہ رادھا کا سنگیت سے کوئی رشتہ ہے۔ آج اس رشتے کی گہرائی کو میں بھی دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں۔

کہاں ہے موہن جی کا ستار ؟"

رادھا نے جھجکتے ہوئے شری ناتھ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر کوئی غیر معمولی کیفیت نہ تھی یہ تو رادھا کے دل کا چور ہی تھا جو وہ شری ناتھ کے چہرے پر شک کی پرچھائیاں ڈھونڈ رہی تھی۔

شری ناتھ نے رادھا کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے سے اٹھا لیا۔ رادھا نے ایک بار پھر تلاش کرنے والی نظروں سے شری ناتھ کی آنکھوں میں جھانکا۔ لیکن وہاں صرف پیار اور محبت کی چمک تھی اور کچھ بھی نہ تھا۔ ایک لمحہ کے لئے رادھا کے دل میں شری ناتھ کے لئے ایک عجیب سا پیار امڈ آیا۔ شری ناتھ کے ہاتھ کو اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسی لئے اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

رانی ستار وہیں لے آئی اور رادھا کے آگے رکھ کر اس نے کہا۔

"رادھا کا سنگیت سن کر آپ اس کے دیوانے ہو جائیں گے۔"

پیار بھری نظروں سے شری ناتھ نے رادھا کی طرف دیکھا۔

"میں تو پہلے ہی اس کا دیوانہ ہوں۔"

رادھا کے سینے میں نہ جانے کیسی اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ غالیچے پر ستار سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ستار کے تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔ تار جھنجھنا اٹھے اور ایک لمحہ کے لئے رادھا کو محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے سینے کے زخموں پر خود ہی اپنی انگلیاں رکھ دیں —— ستار کے تاروں پر اس کی انگلیاں چلنے لگیں۔ اور فضا میں اس کے زخموں کا درد پھیل گیا لمحے کی دھڑکنیں رک۔ گئیں اور کمرے کے ماحول میں زندگی کی متحرک لہروں کے رنگ

میں زخموں کے خون کی سرخی شامل ہوگئی۔
رادھا کے ہاتھ جب ستار کے تاروں پر رُکے
تو اُسے شری ناتھ کی طرف دیکھنے کی ہمت
نہ ہوئی۔ شری ناتھ اُٹھ کر رادھا کے پاس
آگئے۔

"رادھے میری اتنی بڑی خوش قسمتی پر تم نے
کیوں اندھیرے پردے ڈال رکھے تھے؟"
رادھا نے پُرنم آنکھوں سے شری ناتھ کی
طرف دیکھا پھر ستار کے تاروں پر اپنا سر
رکھ کر وہ سسک اٹھی۔

سارا دن سورج آگ برسا کر اب اپنی کرنوں کو
سمیٹ رہا تھا۔ باہر سارے ماحول کو جیسے
کسی نے خون کے چھینٹوں سے رنگ دیا۔
شری ناتھ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگے کتنی ہی
دیر گرمی سے جھلسے ہوئے ماحول کو دیکھ رہے
تھے۔ ساتھ کی میز پر کچھ اوراق بکھرے
ہوئے تھے اور خاموش سے کمرے کے ماحول
میں پنکھا چلنے کی دھیمی دھیمی آواز ایک عجیب سا
سناٹا پیدا کر رہی تھی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر
کر شری ناتھ سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔
میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں کو انہوں نے
یوں ہی اٹھا لیا ــــــ یہ ایک خط تھا جو
ان کی شادی کے تین ماہ بعد ہی رما کانت
نے انہیں لکھا تھا۔ رادھا کی شادی سے پہلے
رما کانت رادھا کو ستار سکھایا کرتا تھا۔
کہتے ہیں، فن، آرٹ اور موسیقی دل کی اتھاہ
وادیوں سے نکل کر ذہن اور جسم کے سب سے
حساس حصوں کو اپنی گرفت میں کس لیتے ہیں۔
اسی لیے آرٹ کی دنیا میں عورت اور مرد کے
تعلق کی سماجی بندشیں ذہن سے کنارا کر لیتی
ہیں ــــــ خدا نے انسان کو ضبط کے
مادے بھی دیئے ہیں لیکن ان سے اپنے آپ کو
الگ کر کے فنکار بہہ جانے میں زندگی کا سکون
ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے نزدیک طوفانی کیفیتیں
عارضی اور وقتی ہوتی ہیں۔ وہ انسان کی اصلی
حالت اس کے نارمل ذہنی رجحان کو مانتے ہیں۔
ــــــ لیکن سماج ہماری رگوں اور ذہن کی
جڑوں میں اتنا دور چلا گیا ہے کہ صرف خالی
خولی خیالات ہی ہمیں ردعمل اور بعد کے اثرات
سے محفوظ نہیں کر سکتے۔ رما کانت اور رادھا
کے ملنے جلنے میں کوئی ایسی ہی بات ہو گئی تھی۔
جس سے نہ تو وہ ایک دوسرے سے صحیح معنوں
میں محبت کر سکے اور نہ ہی غیر معمولی حادثے کے
اثرات سے اپنے ذہنوں کو بچا سکے ــــ اور

محبت جو انسان کے سینے میں روشن ہو کر
اسے بلندیاں بخشتی ہے۔ رما کانت ان
بلندیوں سے محروم رہ گئے —— اپنی
مایوسیوں کا بدلہ لینے کے لئے رادھا کی
شادی کے تین ماہ بعد ہی اس نے شری ناتھ
کو خط لکھ کر اس واقعہ کی اطلاع دیدی۔
—— شادی ہونے کے تین ماہ بعد تک
شری ناتھ رادھا کی اداسی کا کارن اتنا
سوچنے پر بھی نہ جان پائے تھے۔ اس خط سے
وہ بھی کچھ سمجھ گئے۔ بہت دنوں تک وہ
رادھا سے بات بھی نہ کر سکے اور اپنے اندر
ہی اندر ایک عجیب سی آگ میں جلتے رہے۔
اسی آگ نے ان کے دل میں بلندیوں اور
نیکیوں کی روشنی دے دی۔ انہوں نے اس
خط کو تہہ کر کے چھپا دیا تھا اور رادھا کی
اداسیوں کے زخموں پر اپنی مہربان محبت
کے پھاہے رکھ دیئے۔ اسی چھوٹے سے
عمل نے انہیں ایک غیر معمولی انسان بنا دیا۔
اور ان کی فراخ پیشانی پر ذہانت کی لکیریں
اور آنکھوں میں چراغ روشن کر دیئے۔

لیکن آج پانچ برس کے بعد رادھا کی بچپن
کی سہیلی نے ان کی زندگی کے پرسکون تالاب
میں کنکریاں پھینک کر لہروں کی ہلچل مچا دی
تھی —— رادھا چار پانچ روز سے بخار
میں جل رہی تھی۔ یکایک سینے کے اوپر پتھر کا
وزن کسی کی یادوں سے دوگنا چوگنا ہو گیا اور
اپنی ذہنی کشمکش سے نڈھال ہو کر وہ چارپائی
پر گر گئی۔ ان چار پانچ دنوں میں شری ناتھ
نے شہر کے چار پانچ بڑے ڈاکٹروں کو
جمع کر لیا۔ علاج میں کوئی کسر نہ رہی
لیکن رادھا کے سینے کے پتھر کو کوئی بھی نہ
ہٹا سکا۔ اس پتھر کو ہٹانے کے لئے شری ناتھ
نے آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی
لئے انہوں نے آج رما کانت کا خط نکالا
تھا۔ رادھا ان سے رما کانت کی بات کو
چھپا کر جس وزن کو اندر ہی اندر محسوس کر
رہی تھی، اسے کیا خبر تھی کہ شری ناتھ کو
اس بات کا پہلے ہی سے علم تھا۔

"بی بی جی جاگ گئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔"
نوکر نے کمرے میں آکر اطلاع دی۔ شری ناتھ
نے خط کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور
دوسرے کمرے میں رادھا کے پلنگ کے

قریب آکر کھڑا ہو گیا ـــــ رادھا کے چہرے
پر تازگی اور سکون دیکھ کر سری ناتھ کا دل
خوشی سے لہرا اٹھا۔ وہ رادھا کے قریب ہی
پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اس کی پیشانی پر اپنا
ہاتھ رکھ کر بولے
"آج تو تمہاری طبیعت ٹھیک لگتی ہے۔"
"ہاں !" رادھا کے چہرے کی زردی میں
ایک سرخی سی چمکتی ہوئی لہرا گئی۔
سری ناتھ رادھا کے بالوں پر اپنا ہاتھ پھیرنے
لگے وہ سوچ رہے تھے کہ اس بات کو کیسے
شروع کریں۔ اسی وقت رادھا نے کہا۔
"اچھا اگر ـــــ اگر زندگی میں میں نے ـــــ
کوئی بہت بڑی بھول کر دی ہو تو ـــــ
تو کیا آپ ـــــ آپ مجھے معاف کر دیں گے؟"
رادھا کی آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے۔
سری ناتھ نے جھک کر اپنے ہونٹ رادھا
کی بہتی ہوئی آنکھوں پر رکھ کر انہیں چوم لیا۔

"رادھے یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری زندگی
مجھ سے الگ کہاں ہے۔ تمہارا ماضی، تمہارا
مستقبل کیا صرف تمہارا ہی ہے؟ یہ سب
کچھ تو تم نے اسی دن مجھے دے دیئے تھے
جب اس گھر میں داخل ہو کر میری زندگی کی
باگ ڈور سنبھالی تھی۔ اور تم اپنی کسی بھول
سے اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ کیا دنیا
میں ایسا ایک بھی انسان ہے جس نے کوئی
بھول نہ کی ہو؟"
رادھا کی آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے۔ روتے
ہوئے اس نے کہا۔

"مجھے اپنے سینے میں چھپا لیجیے۔ مجھے آپ
کے پیار کی ان وسعتوں کی بڑی سخت ضرورت
ہے۔ آپ ـــــ آپ نہیں جانتے میں نے
ـــــ کیسی بھول کی تھی۔ اس بھول کو کوئی
بھی معاف نہیں کر سکتا۔ میں خود بھی اپنے آپ
کو معاف نہیں کر سکتی۔"
"نہیں رادھے، ایسا مت سوچو۔ محبت کی
دنیا میں معاف کرنے نہ کرنے کی بات کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں کوئی
کسی کا جسم، دل اور آتما بن کر رہ جاتا ہے
پھر تم ہی بتاؤ کون کس کو معاف کرے گا۔"

رادھا نے کچھ کہا نہیں۔ سری ناتھ کے
سینے کے ساتھ وہ لگی روتی رہی۔ اور جب اس

کہ ذہن سے مطلع صاف ہو گیا تو اس
نے شری ناتھ کو رما کانت کے ساتھ
گذرے ہوئے حادثے کی بابت بھی کچھ
بتا دیا۔ آخر میں اس نے کہا۔
"وہ بہت بڑا کلاکار تھا اور ساتھ ساتھ
بہت ہی نیک انسان تھا۔ اس کے پاس
انسانیت سے دھڑکتا ہوا ایک عظیم دل
نہ ہوتا تو شروع کے دنوں میں وہ ہماری
گھریلو زندگی خراب کر سکتا تھا لیکن اس
نے ایسا نہیں کیا۔"
شری ناتھ نے جیب میں جلتے ہوئے
اپنے ہاتھ کو بہت ضبط کر کے روک لیا۔
پر سکون لہجے میں انہوں نے کہا۔

"مجھے اس بات کا رنج نہیں رادھے کہ
کوئی ایسا واقعہ شادی سے پہلے تمہارے
ساتھ ہو چکا ہے، رنج اس بات کا ہے
کہ اتنی معمولی سی شے کے لئے تم اپنے آپ
کو خواہ مخواہ ہلکان کرتی رہیں۔"
جھک کر انہوں نے رادھا کی پیشانی چوم
لی اور اٹھتے ہوئے بولے۔
"اچھا اب تم آرام کرو۔"

شری ناتھ جب وہاں سے چلے گئے تو
رادھا کی تیز دھڑکنوں میں سکون آگیا
اسی سکون نے پہلی بار رادھا کے ذہن
میں اس بات کی روشنی بخش دی کہ آرٹ
اور فن کتنے بھی بڑے ہوں وہ انسان
سے کبھی بھی بڑے نہیں ہو سکتے ــــــ
آرٹ، فن، سچائی یہاں تک کہ دنیا
کے سبھی مذاہب انسان کے لئے بنائے
گئے ہیں، انسان ان کے لئے نہیں بنایا گیا
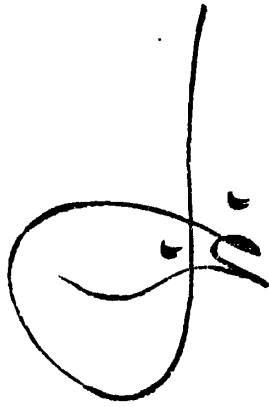
صبحوں کا رنگ شام کا آئینہ بھی تو ہے
پیلی سی دھوپ گرد میں لپٹی ہوئی تو ہے

سہمی ہوئی سڑک پہ سسکتا ہے کوئی شخص
راہوں کا درد بانٹنے والا کوئی تو ہے

راتوں کا جگمگاتا بدن ہے دھواں دھواں
دھندلی سہی اداس سہی چاندنی تو ہے

بجھ تو گئے کبھی کے سبھی اسٹریٹ بلبس
کمرے میں اس کے دھیمی ہری روشنی تو ہے

کوئی جواب ہی نہیں! صدیاں گذر گئیں
میں نے خود اپنے آپ سے بھی بات کی تو ہے

مسعود عابد

۳۴۔ پیکر سعید آباد

ندا فاضلی

نہا گئیں ڈالیں کھجوروں کی
بھیگ گئے پتھر پہاڑوں کے

بالوں کو بکھرائیں، کپڑے بگاڑیں
مٹی میں ڈبے دھنسے پتھر اکھاڑیں
جی چاہا ——!
دوڑ پڑیں
چیخیں دہاڑیں
سنور گئے چھجے جھروکوں میں
موسم گنڈیری سنگھاڑوں کے

چاندی کی لڑیوں سی بھگون کی ڈاریں
ہاتھوں میں تیر کسے اڑتی پھواریں
کس سے لڑائی کریں!
کس کو پکاریں ——!
بھرے بھرے مٹ میلے بادل کے دل
جیسے گٹھیلے اکھاڑوں کے

نہا گئیں ڈالیں ——!
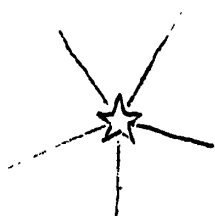
جب تمہاری یاد آئی
انگلیوں کو جنبش دی
سال، ماہ اور ہفتے
دن، پہر، گھڑی لمحے
انگلیوں پہ گن ڈالے
اور دل کو سمجھایا
اتنے سال بیتے ہیں، اتنے سال باقی ہیں
اور پھر تسلی دی
اتنے سال بیتیں تو ان سے پھر ملن ہوگا
لیکن
اب کہاں ممکن اور دل کو بہلانا
مٹ گئی ہیں، گھس گھس کر
انگلیوں کی ریکھائیں

اکمل حیدرآبادی

سپریم کورٹ نے جوں ہی پریوی پرس کیس
میں اپنے فیصلہ کا اعلان کیا، لوک سبھا میں
بعض نام نہاد اصل ممبران نے مطالبہ کر دیا کہ
ججوں کے سربراہ اس فیصلہ کے لئے ذمہ دار ہیں
ان لوگوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ طریقہ کار کے
اصولوں کو فوری طور پر کالعدم قرار دیدیا جائے
بعض ممبران کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ سپریم
کورٹ کے فیصلہ کے باوجود بنیادی حقوق سے

ان مطالبات کی مزاحمت کرنے کے لئے نام
نہاد رجعت پسند اپوزیشن پارٹیوں نے وزیر اعظم
کے فوری استعفے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ حزب
مخالف کی مخلوط حکومت بنا دی جائے ایوان
میں سخت ہیجان برپا تھا اسپیکر یا تو اپنے
اختیارات کو استعمال کرنے سے معذور تھے
یا وہ اس بات پر نا رضا مند تھے، حسب معمول
ایوان کی لیڈر ہیجان کے دوران بالکل خاموش

عدلیہ اور پارلیمنٹ

- ایک جائزہ

متعلق آرٹیکل پر فوری نظر ثانی کی جائے تا کہ
حکومت سابق والیان ریاست کو دی جانے
والی مراعات کو ختم کرنے کے لئے اقدامات کر سکے
کچھ لوگوں نے چاہا کہ پورے آئین کو ریزہ ریزہ
کر دیا جائے اور ایک نئی قانون ساز اسمبلی
بلائی جائے تا کہ نیا آئین بنایا جا سکے۔

رہیں۔ انہوں نے اپنی رائے آخر میں دی۔ کوئی
بھی شخص حکمراں کانگریس کے ممبران پارلیمنٹ
کے غصہ کو سمجھ سکتا ہے وہ جو بھی فیصلہ کریں اگر
اس کے خلاف کچھ ہو گا اور انہیں غصہ نہ آئے
گا تو وہ برسر اقتدار پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ
کس طرح کہے جائیں گے لیکن حزب مخالف

کا جھگڑا اور ان کی طرف سے وزیر اعظم کے استعفا کا مطالبہ ناپسندیدہ ہے۔

فیصلہ کن مسئلہ

جمہوری حکومت کے فیصلوں کو عدلیہ اکثر کالعدم قرار دیدیتی ہے ضروری نہیں ہے کہ حکومت اس پر استعفا دیدے وہ صرف اس وقت استعفا دے سکتی ہے جب پارلیمنٹ میں اسکے خلاف

طور پر یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اس مسئلہ پر حکومت سے استعفے کا مطالبہ کر سکتی۔

ایوان میں چھائے ہوئے ہیجان کے دوران میں نے کئی مرتبہ اسپیکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی لیکن اگر کوئی شخص بہت زور سے چلا سکتا ہے تو اسپیکر کے کانوں کو تو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے لیکن اسکی آنکھوں

آج کا موضوع

اچاریہ جے پی کرپلانی

عدم اعتماد کی تجویز منظور ہو جائے یا وہ مالی بجٹ منظور کرانے میں ناکام ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ سابق حکمرانوں کی مراعات کے خاتمہ کو وزیر اعظم نے ایک فیصلہ کن مسئلہ بنا لیا تھا لیکن استعفا دینے یا نہ دینے کا اختیار پھر بھی انہیں حاصل تھا۔ حزب مخالف کو آئینی

کو متوجہ نہیں کر سکتا۔ آخر کار میں اسپیکر کی بدلتی ہوئی آنکھوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس پر بھی اس سے قبل کہ مجھے بولنے کی اجازت ملتی، مجھے متعدد بار اپنی سیٹ پر بیٹھنا پڑا۔ میں نے ایوان کو بتایا کہ ہم نے صرف سپریم کورٹ کا فیصلہ سنا ہے مفصل فیصلہ

کے متعلق ہمیں علم نہیں ہے، اور ہم نہیں جانتے کہ سپریم کورٹ نے فیصلہ کرتے وقت کن چیزوں کو نظر میں رکھا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت تفصیلی فیصلہ سپریم کورٹ میں پڑھ کر سنایا جا رہا تھا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ ایوان میں عدلیہ کے متعلق سخت اور غیر تعریفی کلمات کہے گئے ہماری سب سے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے زمانہ سے اب تک برابر ایسا ہوا ہے۔ خود انہوں نے سپریم کورٹ کے بعض فیصلوں پر بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ بعض ممبران پارلیمنٹ سپریم کورٹ سے کیا کرانا چاہتے تھے سپریم کورٹ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے آئین کی تشریح کرے۔

عدلیہ قانون نہیں بنا سکتی اگر عدلیہ قانون کی تشریح نہیں کرے گی اور قانون کے مطابق فیصلے نہ کرے گی تو سماج میں یہ اہم اور نازک کام کون انجام دے گا؟

یہاں تک کہ پرانے سماج میں بھی ایک ادارہ ایسا ہوتا تھا جو دو افراد کے جھگڑے کو نبٹایا کرتا تھا اور فیصلہ دیا کرتا تھا۔ یہ فیصلے سماج دشمن عناصر کے خلاف ہوا کرتے تھے جس سے سماج کا ڈھانچہ تباہ ہو سکتا تھا۔

تنازعہ

یہاں تک کہ ایک خاندان میں بھی ایک شخص کو جھگڑوں کا حق فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے کیا انسانی سماج میں دو گروہوں یا افراد کے درمیان تنازعات سے احتراز کیا جا سکتا ہے؟ کسی صنعتی سماج میں زرعی سماج سے زیادہ آسانی کے ساتھ جھگڑے ہوتے ہیں، ان جھگڑوں کی تعداد ان سے زیادہ ہوتی ہے جو زمانہ قدیم میں ہوا کرتے تھے صنعتی سماج میں معاملات اور مسائل زیادہ الجھے ہوئے ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ جمہوریت کے اندر شہریوں اور کسی حکومت کے درمیان کوئی تنازعہ ہوتا ہے۔ اس لئے نہ صرف قانون کی تشریح کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ آئین کی وضاحت کی بھی ضرورت ہوتی ہے خواہ وہ تحریر کیا ہوا ہو یا غیر تحریر کردہ۔

ان تمام چیزوں کی وجہ سے ضروری ہو جاتا ہے کہ جو لوگ قانون اور آئین کی تشریح کریں وہ جانچیں اور مختلف تنازعی امور پر فیصلے کریں وہ ان موضوعات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آجکل کے ماحول میں یہ علم بہت محنت کے بعد اور برسوں سینیئر وکیلوں و ماہرین قانون کے ماتحت کام کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے ان میں سے

بہم۔ سپیکر حیدرآباد

بعض کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا جاتا ہے۔

ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اگر ماہر عدلیہ سول، اور
مجرمانہ معاملات کا فیصلہ نہیں کرے گی اور قانون
و آئین کی تشریح نہیں کرے گی تو یہ نازک اور
الجھا ہوا کام اور کون انجام دے گا۔؟

اس کام کے لئے سخت مہارت اور تجربہ کی
ضرورت پڑتی ہے کہا جاتا ہے کہ خود عوام کو
منصف ہونا چاہیئے کیونکہ ملک کے اصلی
فرمانروا وہی ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ کیا چیز
ان کے لئے بہتر ہے اس کا مطلب یہ ہوا عدلیہ
کا انتظام آسانی سے عوام کے حوالہ کیا جا سکتا
ہے جو خواہشات اور جذبات کے بندے
ہیں عوامی عدالتیں بنانے کا کام کمیونسٹوں
نے اپنی طاقت مقرر کرنے سے پہلے کیا تھا تاکہ
وہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کو ایک جیسا
کر سکیں لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہیں
باقاعدہ قانونی عدالتیں بنانی پڑیں اور
قانون کا نظام متعارف کرانا پڑا۔ جن لوگوں
نے پہلے فیکٹریوں اور زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا
انہیں ان کی جائداد سے محروم کر دیا گیا اور
حکمرانوں نے جو کچھ بہتر سمجھا وہ کیا۔ نئی عدلیہ
کو طے کرنا پڑا کہ کمیونسٹ پارٹی کن عوامل
کو سماج دشمن سمجھتی ہے یہ سوال کہ نیا نظام قانون
پہلے نظام سے بہتر تھا یا اس سے خراب تھا
جمہوریت اور کمیونزم کے درمیان ایک متنازعہ
سوال ہو سکتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ
عدلیہ کو منظم کیا گیا اور نئے نظام کے تحت
وکیلوں اور ججوں کی تربیت کے لئے ادارے
کھولے گئے۔ یہاں تک کہ جب برطانیہ کے
ایوان بالا سے ایک اہم شخصیت کو سزا دینے
کے لئے یا اہم معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے
کہا جاتا ہے تو ایک خصوصی عدالتی کمیٹی بنائی
جاتی ہے جو ان لارڈوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ماہرین
قانون ہیں اس لئے ایک آزاد اور علیحدہ عدلیہ
کے قیام سے مفر نہیں ہے۔

اگر عدلیہ کا کام نہ عوام کر سکتے ہیں اور نہ
قانون ساز کر سکتے ہیں تو کیا یہ کام خود انتظامیہ
کرے گی؟ ملک اور شہریوں کے درمیان کسی تنازعہ
میں علم کی کمی سے قطع نظر اگر انتظامیہ یہ کام کرے
گی تو وہ بیک وقت وکیل بھی ہو گی، جج بھی ہو گی
اور جیوری بھی۔ امکان ہے کہ اس طرح فیصلہ
غلط ہو گا جو لوگ اقتدار پر ہوتے ہیں ان کے
اندر خود کو ہر معاملہ میں صحیح سمجھنے کا رجحان پایا
جاتا ہے۔ انہیں کبھی تب بھی نہیں ہوتا کہ وہ
جذبات کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ معمولی
افراد کے لئے بھی خود کا تجزیہ کرنا بہت مشکل کام
ہے یہ کام اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے

پیسکر حیدرآباد - ۳۱

جب لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار ہوتا ہے
حصول آزادی سے قبل کے دور میں عدلیہ کو
انتظامیہ سے علیحدہ کرنے کا سخت مطالبہ کیا
جا رہا تھا لیکن یہ مطالبہ صرف مجسٹریٹوں کے لئے
تھا۔ بڑی عدالتیں برطانوی دور میں بھی انتظامیہ
سے علیحدہ ہوتی تھیں۔

انتظامیہ عدلیہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتا
ہے۔ بہر حال کانگریس کے دور اقتدار میں حکومت
نے اس وقت قانون تبدیل کرانے میں بھی
ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا ہے جب اس
نے دیکھا کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت
نے اس کے فیصلہ کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ محض
معدودِ چند معاملات میں اس کام کو حق بجانب
قرار دیا جا سکتا ہے جب عدلیہ کے فیصلہ سے
حکومت کی پوری پالیسی پر اثر پڑے۔ صرف
اس وقت حکومت قانون سازوں سے قانون
تبدیل کرا سکتی ہے۔

بعض مرتبہ لوک سبھا میں عدلیہ پر عوام کی رائے
کا احترام نہ کرنے پر نکتہ چینی کی گئی ہے یہ اس
وقت ہوا جب لوک سبھا کے پاس کردہ قانون
کو عدلیہ نے رد کر دیا۔ کیونکہ لوک سبھا عوام
کی نمائندہ اور ترجمان ہے اس لئے اس کی
رائے کا لحاظ نہ کرنے کا عدلیہ پر الزام عائد
۴۴ - مسیکر جہیا ہو

کیا گیا۔ عدلیہ پر ایسی نکتہ چینی جس کا مقصد
عدلیہ کے اختیارات کو کم کرنا ہو نا قابل تعریف
ہے۔ بدقسمتی سے یہ عادت ہمارے پہلے وزیر
اعظم جواہر لال نہرو کی شروع کردہ ہے وہ خود
بھی ججوں پر نکتہ چینی کرنے سے نہیں ہچکچاتے
تھے اور کہتے تھے کہ عدلیہ صحیح اصطلاحی معنی
میں ترقی پسند نہیں ہے۔ اور حالات کو جوں کا
توں باقی رکھنا چاہتی ہے۔

نیا نعرہ

اب عدلیہ کے بارہ میں ایک نیا نعرہ ایجاد کیا
گیا ہے اس نعرہ میں کہا گیا ہے کہ عدلیہ کو
"پابند" ہونا چاہیئے عدلیہ کو کس پارٹی کا
پابند ہونا چاہئے یہ واضح نہیں ہے قدرتی بات
ہے کہ یہ پابندی جمہوری حکومت میں برسر اقتدار
پارٹی کی ہی ہو سکتی ہے۔

اگر ایسا ہے تو جب بھی برسر اقتدار پارٹی تبدیل
ہو گی۔ اقتدار پر آنے والی پارٹی کے نظریات
کی پابندی کرنے کے لئے عدلیہ کو خود کو تبدیل
کرنا پڑے گا۔ اس طرح ان اصولوں کا کوئی تعین
نہیں ہو سکے گا جن کی بنیادوں پر عدلیہ فیصلے دے
گی۔

ہو سکتا ہے کہ مسلسل اقتدار پر آنے والی حکومتیں

یہ کہ نظریات میں اختلاف ہو اور ہر ادارہ مختلف
اصولوں پر عدلیہ کے فیصلوں کی طلب گار
ہوں۔ اگر ہم عدلیہ کی کارروائیوں کا مطالعہ
کریں تو یہ خیال بالکل بیکار معلوم ہوگا۔
عدلیہ کا کام قانون اور آئین کی تشریح کرنا
ہے اور اس قانون کے تحت اپنے سامنے
لائے جانے والے مختلف معاملات میں فیصلے
دینا ہے۔ نہ تو عدلیہ قانون بناتی ہے اور
نہ آئین۔ یہ کام قانون سازوں کا ہے۔
قانون اور آئین میں دی گئی دفعات کی
تشریح کرتے وقت عدلیہ کو زبان کی تشریح
تک محدود ہونا پڑتا ہے۔ عدلیہ عوام کے
ایک طبقہ یا قانون سازوں کے خیالات
کے مطابق بھی خود کی رہنمائی نہیں کر سکتی
عدلیہ کو اس طرح کا اختیار دینا قانون سازوں
کا کام ہے۔

اگر عوام یا ان کے نمائندے کسی خاص قانون
سے مطمئن نہیں ہیں یا آئین یا اس کے کسی
حصہ سے مطمئن نہیں ہیں تو وہ اپنی ذمہ داری
عدلیہ کو نہیں سونپ سکتے اور اس فرض کو
پورا نہ کرنے کے لئے ان پر الزام نہیں لگا سکتے
جمہوریت اسی وقت کام کر سکتی ہے جب معروف
طریقہ ہائے کار اور ڈسپلن اپنایا جائے۔ ایسا
کرنے میں جمہوریت بالکل کسی کھیل کی مانند
ہے جسے بعض اصولوں اور ضابطوں کے تحت
کھیلا جاتا ہے۔

ہر کھیل کے لئے ایک ریفری کی ضرورت ہوتی
ہے جس کا فیصلہ کسی بھی ہونے والے جھگڑے
کو نپٹانے کے لئے حتمی خیال کیا جاتا ہے۔ ریفری
بہرحال انسان ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ تمام
اوقات میں ان کا فیصلہ صحیح نہ ہوتا ہو لیکن
اگر کھیل کو خوبصورتی کے ساتھ ختم کرنا ہے تو
خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔

ریفری کو یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے
علیحدہ اصول گھڑے اسے فیصلہ انہیں اصولوں
اور ضابطوں کے تحت کرنا پڑتا ہے جو پہلے
سے موجود ہیں اور جنہیں سب لوگ تسلیم کرتے
ہیں۔ ان کا ذاتی فیصلہ صرف اسی وقت سامنے
آتا ہے جب واضح اور صاف اصول و ضوابط
نہ ہوں۔ جمہوری ملک میں ججوں کی بھی یہی
حیثیت ہے انہیں اصول بنانے کا حق نہیں
ہوتا بلکہ صرف اصولوں کی تشریح کرنے کا حق
ہوتا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ایک جمہوری ملک میں
ایک آزاد اور علیحدہ عدلیہ کے قیام سے
فرار ممکن نہیں ہے آئین کو چلانے جس طرح

(باقی ص۱۲۳ پر)

الفاظ کے صحرا میں بڑا شور بپا تھا
میں سوچ کے خاموش سمندر میں کھڑا تھا

تخلیق کے ہر کرب سے میں پوچھ رہا تھا
کس رات مرے دل میں یہ طوفان اٹھا تھا

میں بھول گیا خود کو ترے شہر میں آکر
اب یہ بھی نہیں یاد کہ کیا نام مرا تھا

کچھ لوگوں نے جس لفظ کا مفہوم نہ سمجھا
اس لفظ کی آواز سے میں چونک پڑا تھا

جس شہر کا آوازوں کے صحرا میں ہے چرچا
برسوں میں اسی شہر میں آوارہ پھرا تھا

نغمہ تھا، کوئی ساز تھا، دھن تھی کوئی لے تھی
کچھ تھا جو ان آنکھوں میں اجالا سا ہوا تھا

اس شخص کا مجھ سے تو تعارف نہیں لیکن
تنہائی میں کل اس نے بڑا ساتھ دیا تھا

تاریخ کی مانند پلٹ آیا ہوں ورنہ
میں وقت کے ہمراہ بہت دور گیا تھا

دنیا نے انہیں غور سے دیکھا نہیں باذل
ہر اک ورقِ گل پہ مرا نام لکھا تھا

باذل عباسی

۴۴ ۔ پیکر حیدرآباد

سوندی مٹی کی خوشبوئیں
گرما کی ٹھنڈی پروائی میں ——
اور مہکتی ہیں
پیڑ تلے جھولوں کی لمبی پینگیں ——
آگے ہی بڑھتی ہیں
گیتوں کی رنگ بھری پچکاری چھوٹی
پھاگن میں کیسر گھولے رادھا،
بھر بھر لائے جھولی!
آج نہ جانے کونسی آندھی چل نکلی ہے
دور تلک اک تیز کسیلی بدبو کے جھونکے
سانجھ بھئے، لمبے تیڑھے میڑھے سائے
گھومیں ناچیں
اپنے آپ میں جلتی جائیں
جانے کب تک شہروں کی آبادی میں
پت جھڑ کے دیوتا راس رچائیں
جانے کب تک
اگنی کے بادل منڈلائیں
بیتے موسم لوٹ نہ آئیں!!

رؤف خلش

شور بڑھتا جا رہا تھا۔

اور اب ——— وہ دوڑ نہیں رہا تھا۔ بمشکل گھسٹ رہا تھا۔ اس کے پیر چھلنی تھے ——— پنڈلیوں میں سوئیاں چبھ رہی تھیں اور ——— ناخن لہولہان تھے ——— خالی پیٹ پچکا ہوا تھا ——— سرد ہوا پھٹی ہوئی قمیص میں پھڑپھڑا رہی تھی ——— اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس سینے میں چیخ رہی تھی

وہ پتہ نہیں کتنے گھنٹوں سے اسی طرح دوڑ رہا تھا۔

وہ کون تھا ——— ؟ وہ کیوں دوڑ رہا تھا ——— ؟ یہ کیسا شور تھا۔ جو اس کا پیچھا کر رہا تھا ——— اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا ——— اس کا دماغ ایک سرد گھڑے کی طرح اس کی کھوپڑی کی اندرونی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اور درد کی ٹیس اس کے سر سے اتر کر اس کی ٹوٹتی ہوئی رگوں میں تیر رہی تھی

جب شور نے اس کا پیچھا شروع کیا ——— تو کہاں تھا وہ؟ کہاں تھا؟ حافظے کے کسی گوشے

سے ایک کرن سی ابھری۔ وہ ـــــ شاید ایک مسجد تھی ـــــ پرسکون ـــــ خنک مقدس ـــــ سنگ مرمر کا فرش دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے حسین مینار بادلوں میں چھپے ہوئے تھے ـــــ اذاں کی دلکش آواز فضا میں تیر رہی تھی ـــــ اور وہ ـــــ تھکا ماندہ ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ـــــ اس کا پیٹ خالی تھا ـــــ لیکن ـــــ مسجد کی فضا میں بسی ہوئی ہلکی ہلکی خوشبو اور مقدس خاموشی نے اس کے اعصاب کے تناؤ کو کم کر دیا تھا۔

کہ اچانک

ایک شور ابھرا ـــــ سکوں درہم و برہم ہو گیا' مینار کانپنے لگے ـــــ سنگ مرمر کا سفید فرش سرخی مائل ہو گیا۔ تقدس کی جگہ فضا میں تعفن ـــــ اور قہر سرایت کر گیا ـــــ

نعیم زبیری

اور ـــــ اور ـــــ اس کے ناخن لہولہان تھے۔ اس کے گھٹنوں میں جیسے پگھلا ہوا سیسہ بھرا تھا ـــــ اور وہ گھسٹ رہا تھا ـــــ گھسٹ رہا تھا۔

اور شور بڑھتا جا رہا تھا۔

"مارو ـــــ ختم کردو ـــــ زندہ باد ـــــ مردہ باد ـــــ اللہ اکبر ـــــ جے بجرنگ بلی ـــــ تلنگانہ ـــــ مہاراشٹرا ـــــ ٹکڑے کردو ـــــ مردہ باد ـــــ جے بجرنگ بلی ـــــ اللہ اکبر ـــــ"

وہ دوڑ رہا تھا ـــــ لیکن کیوں ـــــ ؟ وہ پھر بھول گیا تھا۔ وہ کہاں سے اٹھا تھا کیوں دوڑ رہا تھا

شاید وہ مندر کی سیڑھیوں پر سویا ہوا تھا ـــــ پیٹ کی آگ جلتے جلتے بجھنے سی لگی تھی۔

پیکر حیدرآباد ـــ ۴۷

مندر کے گھنٹوں کی آواز اور سر سے بھجن کی ابھرتی ڈوبتی آواز اسے لوری دے رہی تھی۔ اس کے سر سے کچھ دور ــــــ پھول پڑے تھے جن کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی ــــــ کہ اچانک ــــــ
ایک دھماکہ ہوا ــــــ اور پھولوں کی دھجیاں بکھر گئیں اور ایک شور ابھرا ــــــ

"کاٹو ــــــ ٹکڑے کر دو ــــــ مردہ باد ــــــ اللہ اکبر ــــــ جے بجرنگ بلی ــــــ مارو ــــــ
جے بجرنگ بلی ــــــ مردہ باد ــــــ اللہ اکبر ــــــ"
وہ دوڑ رہا تھا ــــــ

وہ ایک عظیم الشان عمارت میں ایک وسیع و عریض میز کے سامنے ــــــ ایک کتاب میں کھویا ہوا تھا۔ شور نے اسے دھکا دے کے نیچے گرا دیا ــــــ
وہ دوڑ رہا تھا ــــــ
وہ ایک حسین رقص دیکھ رہا تھا ــــــ اس کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ تھی ــــــ وہ آنتوں کی خواہش بھولا ہوا تھا ــــــ کہ اچانک شور بلند ہوا۔ "مارو ــــــ دھجیاں بکھیر دو" اور وہ دوڑنے لگا شور اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ سڑکوں پر اندھیرا تھا۔

سارے بلب اندھے تھے ــــــ سڑکوں پر کانچ کی کرچیں بکھری ہوئی تھیں ــــــ دوکانوں کے شوکیس اجڑے ہوئے تھے ــــــ وہ ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا ــــــ فٹ پاتھ پر وہ عورت پڑی تھی جو برسوں شوکیس میں کھڑی رہی تھی ــــــ اس کے ٹوٹے ہوئے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی ــــــ ایک بس دھڑا دھڑ جل رہی تھی ــــــ اور کنڈکٹر کی لاش پاس ہی پڑی تھی۔ ریزگاری اور ٹکٹ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے ــــــ وہ ــــــ دوڑ رہا تھا۔
شور اس کا پیچھا کر رہا تھا ــــــ فضا میں ایسی بدبو تھی ــــــ خون کی ــــــ جلتے ہوئے گوشت کی ــــــ بارود کی ــــــ پھول اجڑے ہوئے تھے ــــــ حسن مرجھا چکا تھا ــــــ
بدصورتی قہقہے لگا رہی تھی ــــــ زندگی نالی میں پڑی تھی ــــــ موت رقصاں تھی ــــــ موسیقی کھو چکی تھی۔ ــــــ

"وحشت ناک شور ــــــ ہیبت ناک قہقہے ــــــ گولیوں کی آوازیں ــــــ شور ــــــ شور ــــــ

شور ـــــ اللہ اکبر ـــــ مردہ باد ـــــ جے بجرنگ بلی ـــــ جے ـــــ ۔

قریب تھا کہ وہ ہمت ہار دیتا کہ اس کا دل ـــــ اللہ کی ایک نئی طاقت سے بھر گیا
وہ لانک ٹیلے پر مستقل کھڑا تھا ـــــ ننھا ـــــ معصوم ـــــ اس کے کاندھے پر کتابوں
کا بستہ لٹکا ہوا تھا ـــــ اور ایک ہاتھ میں گلدستہ تھا ۔

اس نے پوری طاقت سے دوڑنا شروع کر دیا' شور بڑھتا جا رہا تھا۔ زمین پر پھیلی ہوئی کانچ
کی کرچیں اس کے زخمی تلوؤں میں چبھ رہی تھیں ـــــ جلتی ہوئی بس کا دھواں اس کے نتھنوں
میں گھس رہا تھا۔ اور اس کے پھیپھڑوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی ۔ خوف اور امید کی کشمکش نے
اس کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی تھی۔
ـــــ وہ آنکھیں بند کئے دوڑ رہا تھا ـــــ ننھا وہ ٹیلے پر کھڑا تھا ـــــ اس کی امیدوں کا
واحد سہارا ـــــ اس نے پوری قوت سے ٹیلے پر چڑھنا شروع کیا ـــــ شور بدستور
اس کا پیچھا کر رہا تھا ـــــ ۔
کاش وہ ٹیلے کی اونچائی پر پہونچ جائے ۔ وہ لڑکھڑاتا ـــــ گھسٹتا بالآخر اوپر پہنچ گیا اور اس
نے ـــــ اپنی جلتی ہوئی آنکھیں کھول دیں ۔
ننھے نے گلدستہ پھینک دیا تھا ـــــ
پھول خون میں بھیگے ہوئے تھے ـــــ بستہ دور پڑا تھا۔ کتابیں پھٹی پڑی تھیں ـــــ
اس کے ہونٹ پیچھے کی طرف کھنچے ہوئے تھے ـــــ اور ـــــ دو لمبے ـــــ نوکیلے دانت
باہر جھانک رہے تھے۔
اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا پتھر تھا ۔

ہم جان بچانے کو بلندی پہ کھڑے ہیں
سانپوں کی طرح راہ میں انسان پڑے ہیں

فرسودہ رسومات کا پھیلا ہے تعفن
صدیوں کی روایات کے ناسور سڑے ہیں

اجداد کو قبروں سے نکالو تو یہ پوچھیں
کس سنہ میں مرے اور وہ کس سنہ میں گڑے ہیں

اس شخص نے اب ہم سے لڑائی کی ہے ٹھانی
جس شخص کی تائید میں غیروں سے لڑے ہیں

خودساختہ و کہنہ اصولوں میں گرفتار
پتھر کی طرح لوگ انگوٹھی میں جڑے ہیں

رگ رگ میں لئے زہر وفا گھوم رہا ہے
مقصود پہ احباب کے احسان بڑے ہیں

جاوید مقصود

دوہے

کلّوں کے سر پر دیر سے پڑتا تھا انسانی ہات
آخرکار اگل دی اس نے اپنے دل کی بات

تنہا ہو کر میں کیوں سوچوں ایسا بیج بجریا
ایک بوند کو کبھی نہ پوچھے لہریں لیتا دریا

بیجاپور کے دو گنبد کا ایک سماں تناؤ
یہیں کہیں جل بجھے ہیں لوگو جانے کتنے الاؤ

لکھی کتابوں کی ہر لائین برہتی کاٹ گئی
ہر اک بیتیج کی بات کو دیمک منہ سے چاٹ گئی

ٹھہرے ٹھہرے جل کے اوپر جمی ہوئی ہے کائی
اوپر سے کیا سمجھے دنیا ندیا کی گہرائی

احمد وصی

اکرام جاوید

رات چاند اور ہم

کل جو تھا وہ آج بھی ہے۔

رات ہے، چاند ہے، میں ہوں، تم ہو اور چاروں طرف وقت کا بیکراں بے کنار سمندر پھیلا ہوا ہے۔ زندگی مجھے ایسی منزل پہ لے آئی ہے جہاں گذرے ہوئے اور گذرتے ہوئے وقت کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ کوئی شئے نہیں بدلتی۔ رنگ و روپ کا میک اپ اترتا ہے یا چڑھتا ہے چہرے یا اشکال بدلتے ہیں مگر دنیا وہی رہتی ہے۔ میں وہی رہتا ہوں، تم وہی رہتی ہو۔ سب کچھ وہی رہتا ہے!

نسرین میری بات کا یقین نہ آئے تو خود دیکھ لو۔ نیل ساگر کی خوبصورت پہاڑیوں، حسین وادیوں اور سرسبز و شاداب نظاروں میں آج کی رات وہی رات ہے۔ آسمان کی نیلی وسعتوں میں پونم کا پورا چاند تمہارے حسین چہرے کی مانند روشن ہے۔ ستاروں میں تمہاری مستی بھری آنکھوں کی چمک وہی ہے ہمیشہ کی طرح سفید اجلی چاندنی تمہارے وجود کی لطافت، نزاکت اور رعنائی لئے کائنات پہ چھائی ہوئی ہوئی ہے۔ پہاڑی راستوں پہ تمہارے قدموں کے نشان تازہ ہیں۔ ہوا کے سبک خرام جھونکوں میں تمہاری رفتار کا آہنگ بھی ہے اور سانسوں

کی خوشبو بھی ـــــ تمہاری قربت کی نرم نرم
آنچ آج بھی دل کو اسی انداز میں پگھلا رہی ہے۔
سوز و گداز اور گداخت کا عالم وہی ہے۔ آم
اور املی کے گھنے درختوں میں نیل ساگر کے
ڈاک بنگلہ کا رومانی ماحول وہی ہے۔ میں
سیاہ پتھر کی اسی چٹان پر بیٹھا ہوا ہوں جو
نیچے سے دیکھنے پر زمین اور آسمان کے درمیان
معلق دکھائی دیتی ہے اور جس پر ہمیشہ ہم بیٹھا
کرتے اور خود کو زمین اور آسمان کے درمیان
گویا تخت سلیمان پر بیٹھا ہوا محسوس کرتے تھے!

رات وہی ہے چاند وہی ہے۔ موسم اور
ماحول وہی ہے۔ جھومتی فضا، ناچتی زمین
اور گاتا گنگناتا ہوا آسمان۔ خاموش رومانی
تنہائیاں، پیار بھری مستی بھری انگڑائیاں
سب کچھ وہی ہے۔ میں وہی ہوں۔ اور تم۔
سیکڑوں میل دور ہوتے ہوئے بھی تم
میرے پاس ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان
کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ کوئی حجاب، کوئی رکاوٹ
نہیں ہے جو تم ہو وہی میں ہوں۔ میرا اپنا
کوئی اکیلا وجود نہیں ہے ـــــ!

نسرین۔ میں تمہارے لئے اب ایک بھولی
بھولی کہانی ہوں۔ ایک قصۂ پارینہ۔ دنیا میں
جس طرح ہوتا چلا آیا ہے وہی کچھ ہوا۔ لوگ
جس طرح ایک دوسرے سے ملتے ہیں ہم
بھی ملے۔ ہماری ملاقات کوئی غیر معمولی بات
نہ تھی۔ جب ہم پہلی بار ملے تھے تو بہت جواں
تھے، بہت حسین تھے، بے حد جذباتی تھے
ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوتے ہوئے
بھی اجنبی نہیں تھے۔ صد ہزار عشق میں کرچکا
تھا اور ناکام محبت کی ایک کہانی تمہارے
ساتھ بھی تھی۔ غم کی آگ میرے عزم کو کٹھنی
کا امتحان لے رہی تھی اور نارسائی اور ناآسودگی
کے شعلوں میں تم جل رہی تھیں۔ تمہاری زندگی
کے مسائل بہت الجھے ہوئے تھے۔ وقت کے
بے رحم جادوگر نے مجھے پتھر کا ایک بت بنادیا
تھا۔ خواب دیکھنا ایک سنگین جرم تھا۔ مجھے سزا
ملی۔ وادی سنگ میں ناتراشیدہ اصنام سہم کر
رہ گئے۔ آذر وقت خود پتھر کا ایک بت بن گیا
تھا۔ ایسے میں تم آئیں تو اس طرح جیسے نسیم
سحر چمن میں آتی ہے۔ میری آنکھوں کی بند کلیاں
کھل گئیں۔ ایک خوشبو اڑی، ایک نغمہ ابھرا
اور میرا سنگ بستہ وجود زندہ اور متحرک ہوگیا
میں ایک بار اور خواب دیکھنے لگا۔ دنیا کو حسین

سے حسین تر بنانے کے خواب۔ تمہیں ایک حسین
دنیا اور خوبصورت زندگی کی ضرورت تھی۔
اور میں نے دل کی تمام تر صداقتوں سے
دنیا کو تمہارے قابل بنانے کا ارادہ کر لیا۔ میں
نے کھیتوں میں گیہوں اور چمن میں گلاب
اگائے۔ آتش و آہن کو رام کیا۔ سنگِ مرمر کو
تاج کی شکل جمیل بخشی۔ نصرت کے دلدل
سے کنول کے پھول کھلائے۔ امن و محبت
کے رنگ میں دنیا کو رنگنے کی سعی کی۔ کائنات
پر کمندِ تسخیر پھینکی۔ ایک تمہارے لئے صرف
تمہارے لئے۔

ایک تمہاری محبت نے کائنات کے ذرے
ذرے کو میرا محبوب بنا دیا۔ محبت کا ادنیٰ
کرشمہ تھا کہ دنیا میری مٹھی میں آگئی۔ ایک
مشتِ خاک غبار بن کر عالمِ ہستی پر چھا گئی
ایک خوشبو زمینوں اور آسمانوں کو مست و
مخمور کر گئی۔ خوشبو جس کے اظہار کی خاطر
شاخ پر گل اور صفحۂ ہستی پر انسان ابھرتے
ہیں ———— !

پھول کھلتے ہیں مہکتے ہیں۔ شاخِ گل سے جدا
ہو کر خاک میں مل جاتے ہیں۔ خوشبو مگر کبھی نہیں
مٹتی۔ اس حقیقت کا مجھے علم تھا۔ لیکن جذبۂ
دل ابھی خام تھا۔ پھول کے بغیر میں ابھی
خوشبو کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ جسم کے بغیر
میں تمہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی محسوس کر
سکتا تھا۔ اس لئے اکثر بے قرار ہو کر کہتا ——
"نسرین اتنی محبت اور اس قدر قربت کے باوجود
مجھے محسوس ہوتا جیسے لمحہ بہ لمحہ تم مجھ سے دور
ہوتی جا رہی ہو۔ کوئی فاصلہ ہمارے درمیان ابھر
رہا ہے۔ اس احساس سے میرا دم گھٹنے لگتا
ہے کہ ایک دن تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گی!"
تم حیرت و خوف سے کہہ اٹھتیں۔ "ایسا مت
کہو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ !"

اور تم نے دیکھ لیا کہ زندگی میں ہی ایسا ہو گیا۔
آج تم بھی زندہ ہو۔ میں بھی زندہ ہوں اور فیروزہ
بھی زندہ ہے۔ فیروزہ جو فاصلہ بن کر ہمارے
درمیان ابھرا اور دیوار بن کر ہم دونوں کے
درمیان حائل ہو گیا ———— !

فیروزہ تمہارا ماضی تھا، جس کو تم بھول جانا چاہتی
تھیں اور بھول بھی گئی تھیں۔ فیروزہ تمہارے

بچپن کا ساتھی تھا، تمہارا قریبی عزیز تھا اور تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ کبھی وہ تمہارے دل میں رہتا تھا۔ لیکن تم کو زندگی میں سب سے زیادہ پیار اپنی آزادی سے تھا۔ اور فیروز تمہیں پابند بنانا چاہتا تھا۔ وہ تمہیں سمجھ نہ سکا۔ ذہنی سطح پر تمہارا ساتھ نہ دے سکا۔ تم پر اس نے شک کیا۔ تمہارا دل ٹوٹ گیا۔ دل شکستہ ہو کر تم نے اس سے قطع تعلق کر لیا اور جب میں تم سے ملا تو ماضی کا ہر نقش تمہارے ذہن سے مٹ چکا تھا۔ تمہارا ذہن کسی کورے کاغذ کی طرح صاف تھا

ماضی کی محبتوں، نفرتوں اور ناکامیوں کو عمر، سماجی پوزیشن اور خاندانی زندگی کی ذمہ داریوں کو ہم نے بھلا دیا تھا۔ اور محبت کے ایک نئے راستے پر چل پڑے تھے

!______

سر بازار کیا۔ مجھے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ میرے لئے الجھنوں اور بے سکونی کے طوفان بپا کئے۔ مجھے احساس دلانے کی سعی کی کہ خاندانی ذمہ داریوں کو بھول کر میں ایک خطرناک جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ میں ایک پابند اور بیوی بچوں والا آدمی کبھی بھی تمہیں خوش نہ رکھ سکوں گا۔ کہ میں تمہارا خیال دل سے نکال دوں اور جب میں ٹس سے مس نہ ہوا مر بھی نہ سکا تو فیروز نے خود اپنی زندگی کو ختم کر دینا چاہا۔ اور عین اسی وقت مجھے اس حقیقت کا علم ہوا کہ وہ تم سے واقعی محبت کرتا ہے اور تمہارے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور یہ کہ ترک تعلق کے باوجود تم اُسے فراموش نہیں کر سکی ہو۔ شرم ندامت اور احساسِ گناہ سے میری حالت عجیب ہو گئی — !

تم سے دور ہونے کے بعد فیروز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جدائی اس کے لئے دردناک عذاب بن گئی۔ وحشت اور جنون کے عالم میں وہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ مجھے بدنام اور رسوا

فیروز کے درد کو میں بہتر سمجھ سکتا تھا میرا۔ دل تو بارہا ٹوٹا ہے ایک بار اور سہی۔ دل کو ٹوٹ جانے دو۔ پھول کو شاخ گل سے جدا ہو جانے دو______

چاندنی تو میری ہے۔ خوشبو مجھ سے کہاں جدا
ہو سکے گی ــــــ؟
اور میں نے فیصلہ کر لیا ــــــ!
اور تم نے دیکھ لیا کہ محبت کرنے والے نفرت
بھی کر سکتے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار ہی
تمہیں مجھ سے نفرت ہو گئی۔ شدید ناقابل
بیان نفرت ــــــ ایک جھوٹے،
فریبی، دغا باز اور بے وفا آدمی سے نفرت
ہی تو کی جاتی ہے۔ دنیا کا پرانا دستور ہے
زمانے کی پرانی ریت ہے۔ میں تمہاری نفرت
اور دلی کرب سے بے پروا۔ ہو کے ایک
آوارہ جھونکے کی طرح تمہاری دنیا سے
نکل گیا اور تم نے فیروز کو اپنا لیا ــــــ
اس طرح قصّہ گل تمام ہوا۔ میرے لئے
طلسم جسم ٹوٹ گیا ــــــ!

ــــــ زندگی کہاں اتنی مختصر ہے
زمین پر پیدا ہونے والے پہلے انسان سے
لے کر زمین پر مرنے والے آخری انسان،
تک زندگی کا سلسلہ دراز ہے اور محبت
کا سلسلہ تو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ محبت
جو مجھے تم سے ہے۔ اس دنیا اور اس کی
آبادیوں سے ہے۔ یہ محبت مجھے تنہا اور
بے کارکب رہنے دیتی ہے۔ تم یوں ہی
میرے دل میں روشن رہو۔ رگوں میں
جاری وساری رہو۔ طاقت و توانائی
کا سرچشمہ بنی رہو۔ وادیٔ سنگ میں ابھی
ناتراشیدہ اصنام بہت ہیں۔ مجھے اس
کائنات رنگ وبو میں کام بہت ہیں ــــ!

رات وہی ہے۔ چاند وہی ہے اور تم وہی
ہو۔ میں اکیلا اور نا کام کہاں ہوں ــــ!

تم اب مجھ سے سیکڑوں ہزاروں میل
دور سمندر پار ایک خوبصورت مغربی ملک
میں کسی محفلِ غیر میں ہو پھر بھی میرے پاس
ہو۔ مجھ سے اتنے قریب ہو کہ ایک سانس
کا فاصلہ بھی درمیان نہیں ہے ــــــ
محبت کے لئے زندگی کہاں مختصر ہے نسرین
۵۶۔ ہیکر حیدرآباد

گہرا ناخواندہ سناٹا

ایک اجنبی سازش

ذہنوں کی

کالی تنہائی کیا ہے

کیوں یہ مرغولے

پیلے کہرے میں لپٹے

چکراتے ہیں

ساکت چہرے متحرک تصویریں

خوابوں پر ابھری لہریں ہیں

یا زینوں پر لیٹی ہے

سنہری دھوپ

بے جان لکیریں   بولتے رنگ

آپس میں گڈمڈ

لڑتے جھگڑتے ہیں

یا اُجلے کاغذ پر تھوپے ہیں

مرے دل نے کالے جھوٹ

حسن فرخ

بیسلر حیدرآباد ۔ ۵۷

تعلیم کے تصور کے ساتھ ہی ذہن میں موٹی موٹی کتابیں آجاتی ہیں جن میں آرٹ اور سائنس، ادب اور فلسفہ کو دو واضح خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ ایک خانہ میں ایسا ادب ہے جس میں انسان کی زندگی کی بناوٹ میں حصہ لینے والی بنیادی خواہشات جذبات، اور ایسے ہی تجربات کو وفاداری کے ساتھ ظاہر کرنے والی اقدار ہیں جو انسان کو متحرک کرتی ہیں اور دوسرے خانے میں سائنس اور فلسفہ وغیرہ کی کتابیں ہیں جن کے ذمہ کائنات کے مظاہر کی ماہیت اور حقیقت کو بتلانا ہے۔ ہمیں یہ بات بھی پڑھائی جاتی ہے کہ ادب اور آرٹ کا کام یہ ہے کہ ہمارے جمالیاتی ذوق کو تسکین پہونچائے جس کی وجہ سے ہی وہ لازوال ہے جبکہ سائنس اور فلسفہ میں ہر نئی تحقیق کے ساتھ پرانی کتابیں پرانی ہوجاتی ہیں اور نئی کتابوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے وغیرہ —

"Croce" نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آرٹ وجدان کا دوسرا نام ہے۔ جو ہمارے ہیجان کو زبان عطا کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ مگر ہمارے علم کی دنیا کا ایک اہم انقلابی سوال ابھی ادھورا ہی ہے کہ آیا سائنس اور فلسفہ جیسی تخلیقات میں جمالیاتی ذوق اور وجدان کا دخل نہیں ہے! اور کیا ایسا ممکن ہے کہ جمالیات کے اعلیٰ ذوق کے بغیر کائنات کی حقیقت کا اعلیٰ

حاصل ہو؟ علم کا یہ ادھوراپن غالباً اس لئے ہے کہ ہم انسان کے عمل اور ردِ عمل کی بنیاد کے بارے میں کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں رکھتے یا مختلف نقاطِ نظر کو جوڑنے کی بجائے ان

مجیب الرحمان

کے وجود سے جھلا کر نیم منفی نیم مثبت نقطۂ نظر
رکھتے ہیں۔

انسانی سماج کی قوت تحریک (MOTIVATION)
کو سمجھانے کے لئے ہمارے سامنے مختلف نقاط
نظر ہیں۔ میک ڈاگل، اور اس کے ہم خیال لوگوں
کا جبلتوں کا نقطۂ نظر، فرائڈ کا نفسیاتی تجزیاتی
طریقہ، مارکس کا جدلی اور تاریخی مادیت کا طریقہ
اور ڈبلیو۔ آئی۔ ٹامس کا انسانی خواہشوں کا
نقطۂ نظر۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سارے
اور ایسے دوسرے خیالات میں، جو بنیادی باتیں
ہیں، ایک مشترک اصول ہی کو بتاتی ہیں۔ اور وہ
ہے زندگی کی بقا کے لئے کشمکش کا اصول۔ اس
طرح ان سارے اصولوں کو جوڑنے کے باوجود
بھی ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا انفرادی
انسان کے عمل اور ردعمل، گھٹن، اور نفسیاتی الجھاؤ
میں جمالیاتی ذوق کی عدم تسکین بھی سبب کا مقام
رکھتی ہے۔

میرے خیال میں جمالیاتی ذوق بھی ایک اہم
جبلت ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک بنیادی مزاج کا
کام کرتی ہے۔ جو انسان کے نامیاتی نظام میں
ایک قسم کی جذباتی تحریک پیدا کر کے اسے ایک
مخصوص ماحول میں ایک مخصوص عمل کے لئے
اکساتی ہے۔

میک ڈاگل، نے جملہ چودہ جبلتیں بتائی ہیں جنہیں
تین خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ نو ذاتی جبلتیں ہیں
(۱) فرار (۲) نفرت، (۳) عاجزی، (۴) اظہار خودی
(۵) تجسس (۶) حصول (۷) غذا کی تلاش (۸)
تعمیر اور (۹) [illegible] ہے۔ پھر جنس کے خانے میں اس
نے دو جبلتیں بتائی ہیں (۱) جنسی تعلق (۲) پدرانہ
اور مادرانہ شفقت۔ اس جماعت گروہ کے خانے میں
(۱) اپیل اور (۲) اپیل جواب کی جبلت بتائی ہے
ظاہر ہے چونکہ یہ ساری جبلتیں سب جانداروں
میں یکساں طور پر نہیں پائی جاتیں اور یہ چونکہ انسان
کے بارے میں ہیں اس لئے ان میں ایک ایسی جبلت
کی کمی محسوس ہوتی ہے جو عملی زندگی میں اقدار کو
مثبت اور منفی رویہ دینے والی حیثیت رکھتی
ہے۔ انصاف، بہادری، حب الوطنی، انسانی
رنگ، روپ، اور دوسرے پسندیدہ مظاہر کے
بارے میں مثبت ردعمل اور ناانصافی، بزدلی، بھی
غداری، بدصورتی اور دوسرے ناپسندیدہ مظاہر میں
منفی ردعمل [illegible] کے پیچھے [illegible] جبلتوں کے
علاوہ ایک [illegible] جذباتی تحریک بھی کام کرتی
ہے جسے [illegible] جبلت [illegible] کہہ سکتے ہیں۔ اس کے
برخلاف دوسرے جانداروں میں مثلاً مادہ [illegible]
جنسی تعلق سے پہلے جبلی طور پر ایسا گھر زندہ بناتی ہے
جس میں اس کے پیدا ہونے والے انڈے اور اس
سے پیدا ہونے والے بچے کی غذا کے لئے مارے
ہوئے کیڑے کے لئے کافی جگہ ہو۔ اس جاندار کے

شروع سے آخر تک کے پورے عمل میں تعقل کا
کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف انسان ہر
ایسے عمل میں واجبیت اور غیر واجبیت اچھائی
اور برائی کے پہلو پر سوچتا ہے۔ یہ خصوصیت انسان
کی ساری جبلتوں کے رد عمل کو پرکھنے میں مدد دیتی

سائنس والوں نے تجربہ کیا ہے کہ جب کتے کی
ڈر یا غصہ کی جبلت متاثر ہوتی ہے تو اس
وقت اس کے منہ سے رال کا بہنا بند ہو جاتا
ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی جبلت خصوص
ماحول سے ٹکراتی ہے تو اس جاندار کا سارا نامیاتی
نظام متاثر ہو جاتا ہے۔ گویا نامیاتی نظام میں
جسمانی ہیئت کا تعلق اس کی خصوصیات سے
بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس مثال میں کتے کی رال
کے بند ہو جانے سے ظاہر ہونے والی ہیئت
کی تبدیلی کتے کے اس وقت کی نامیاتی کمیت
اور خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔

اسی طرح ہم انسان کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ کسی
پسندیدہ شئے کو دیکھتا ہے تو وہ بے انتہا خوش
ہوتا ہے۔ اور کسی مکروہ شئے کو دیکھتا ہے تو اس
کی جذباتی حالت مختلف ہوتی ہے۔ اس سے
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے جمالیاتی جذباتی
اور نفسیاتی رد عمل کے پیچھے کوئی جبلی طاقت
کام کرتی ہے جس کا کوئی حیاتی مقصد ضرور ہوگا

اس طرح ہم جمالیات کے جبلی مقصد کے اصول
کے سوال سے روشناس ہوتے ہیں۔

جمالیات کے جبلی مقصد پر بحث کرنے سے پہلے ہم
جمالیاتی عدم آسودگی کا بھی مختصر جائزہ لیں تو
بہتر ہوگا۔

سگمنڈ فرائڈ نے انسان کے نفسیاتی تجزیہ کے
سلسلہ میں بتایا ہے کہ اس کی ساری جبلتیں دو
گروہ میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک گروہ نوع انسانی
کی پیدائش کے لئے کام کرتا ہے تو دوسرا گروہ اس
کی بقا کے لئے مختص ہے۔ اور جب دو جبلتوں کے
ان دو گروہوں میں یعنی جنس اور خودی میں ٹکراؤ
پیدا ہوتا ہے اور جب انسان اس ٹکراؤ کی تکلیف
کو ناگوار سمجھ کر بھلا دیتا ہے تو اس سے مختلف نفسیاتی
بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ شعور کے محاسبہ سے بچنے
کے لئے ٹکراؤ کا یہ اظہار مختلف بہروپیے انداز میں
خود کو ظاہر کرتا ہے۔

مگر ولیم میک ڈوگل نے فرائڈ کے خیال میں ترمیم
کرتے ہوئے کہا ہے کہ خودی اور جنس کی جبلتوں
کے علاوہ پدرانہ اور مادرانہ شفقت کی جبلتوں سے
ٹکراؤ ممکن ہے۔ گویا ساری نفسیاتی بیماروں کی
ایسی مثالیں نہ ملتیں جن میں ان تینوں جبلتوں کی
تسکین کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہم کئی ایسے لوگوں کو

دیکھتے ہیں جو سماج میں اونچا مقام حاصل کر کے خودی کے جذبہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور بیاہی زندگی گزارتے ہوئے جنسی اور پدرانہ و مادرانہ جذبہ کی آسودگی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی نفسیاتی گھٹن کے شکار ہوتے ہیں۔ پھر وہ کونسی گھٹن ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں یہ چوتھی گھٹن جو سب سے زیادہ عالمگیر ہے وہ ہے جمالیاتی ذوق کی گھٹن۔ انسان جبلی طور پر نہ صرف اشیاء کا مادی طلبگار ہے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ان کا حصول ایک خاص ڈھنگ کا ہو۔ پیٹ بھرنے کے لئے وہ نہ صرف غذا چاہتا ہے بلکہ اس کے پسند کی ایک خاص ڈھنگ کی غذا ملے۔ نہ صرف وہ رنگوں کو ہی پسند کرتا ہے بلکہ ایک خاص رنگ کو اولیت دیتا ہے۔ وہ نہ صرف خوشبوؤں کو پسند کرتا ہے بلکہ ایک مخصوص خوشبو کو اپنی روح سے مطابق پاتا ہے نہ صرف وہ زندگی کے لئے فلسفہ چاہتا ہے بلکہ ایک خاص فلسفہ ہی اسے زیادہ پسند ہوتا ہے۔ نہ صرف وہ انسانوں کو پسند کرتا ہے بلکہ ان میں سے چند لوگوں سے مل کر وہ زیادہ خوش ہوتا ہے۔ اور چند لوگوں کی صورت سے ہی اسے تعصب ہوتا ہے۔ چھوٹے بچے اس کی بہترین مثال ہیں وہ ان جانے لوگوں میں چند کے پاس بالکل نہیں جاتے اور چند لوگوں کے پاس بے اختیار چلے جاتے ہیں۔ کیا اس بے اختیار دلچسپی کا کوئی اصول نہ ہوگا اور کیا اس کا کوئی مقصد نہ ہوگا۔

حسن کی تعریف کرتے ہوئے این۔ جی۔ چرنیشفسکی نے کہا ہے کہ "زندگی ہی حسن ہے"۔ اور اس لئے زندگی کی تعمیر کی امنگ میں حسن کی تخلیق کی امنگ پوشیدہ ہے۔ اور زندگی کا پایا جانا حسن کا پایا جانا ہے۔ اور اس لئے حسن کی تخلیق کے لئے زندگی سے پرے کوئی علاحدہ صنعت گری کی حاجت نہیں ہے مثلاً شہد کی مکھیاں اپنی زندگی میں مگن بغیر کسی سوچے سمجھے منصوبے اور تیاری اور شعور کے جو شہد کا چھتہ بناتی ہیں وہ کتنا حسین اور جیومیٹری کی صحت کا نمونہ ہے یہ سب جانتے ہیں

اس سلسلہ میں انسان کے جسمانی پیکر اور اس کی خصوصیت کے بارے میں کی گئی تحقیقات اس کے جمالیاتی راز کو سمجھانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ آج سے (۲۳۰۰) برس پہلے کے یونانی حکیم ہپاقریطس کی تحقیقات پر ڈاکٹر کرشمر (DR. E. KRETCHMER) نے انسان کو اس کے جسم اور خصوصیات کے مطابقت میں بنیادی طور پر دو حصوں میں بانٹا ہے۔ ڈاکٹر کرشمر نے یہ بھی بتایا کہ عام انسان ان دونوں خصوصیات کا مرکب ہوتے ہیں اور اس طرح دونوں کے امتزاج سے جسمانی اعتبار سے انسانوں کے کئی ٹائپ وجود میں آتے ہیں جیسے

		جسمانی اعتبار سے گول چہرے اور جسم کا انسان	جسمانی اعتبار سے لمبوترے چہرے اور جسم کا انسان
نام ٹائپ		پکنک (PYKNIK)	لیپٹوسیم (LEPTOSOME)
		حقیقت پسند	سوز و گداز کا دلدادہ۔ تنہائی پسند
۱	شاعر	مزاح نگار	رومانی، ہیئت پرست
۲	تجربہ کی دنیا والے	مشاہدہ کرنے والا، تذکرہ نویس تجربہ کا دلدادہ	سخت قسم کا منطقی، نظم و ضبط پسند کرنے والا مابعد الطبیعیات سے دلچسپی رکھنے والا
۳	لیڈرس	مسرت آگیں کاموں کی تنظیم سے دلچسپی رکھنے والا (اسپورٹس وغیرہ) صلح کرانے والا	یکا تصوریت پسند، مطلق العنان، جنونی بے رحم، تخمینہ باز

اس طرح جمالیات کے جبلی مقصد کو ڈھونڈنے میں اس خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے عرض کیا ہے کہ (۱) بنیادی طور پر سارے جسمانی ٹائپ کے انسان اپنے ہم قبیل ٹائپ کے انسانوں سے ہی دلچسپی اور کشش رکھتے ہیں (۲) لیکن اگر کسی مخصوص قبیل کے انسان میں اس کی نسل کو آگے بڑھانے کی ترقی پذیری ختم ہوگئی ہو تو وہ اپنی مخالف سمت کی ٹائپ کی خصوصیات حاصل کرنا چاہے گا اس لئے وہ مخالف سمت کی ٹائپ کے جسم میں کشش محسوس کرے گا کیونکہ اس کی مستقبل کی نسل کے لئے مخالف ٹائپ کی خصوصیات درکار ہیں

(۳) چونکہ مختلف ٹائپ کے وجود کی وجہ سے مختلف حسن کے معیار متعین ہوتے ہیں اور ہر ٹائپ اپنی ہی قسم کے لئے کشش رکھتا ہے اسی لئے تغیر پذیر ٹائپ میں اپنے خاندان سے روگردانی کرتے وقت اسکی ہیئت میں ایسی ظاہری تبدیلی آجاتی ہے کہ وہ اس کی پسندیدہ ٹائپ کے لئے قابل قبول ہو جاتا ہے یعنی کسی لمبوترے چہرے کے فرد میں اپنے خاندان میں ترقی پذیری نہ نظر آئے تو بنیادی ساخت میں وہ لمبوترا ہونے کے باوجود گوشت پوست کے اضافہ سے خود کو ایسا تبدیل کر لیتا ہے کہ وہ بالکل گول مول معلوم ہوتا ہے۔ اور "پکنک" فرد سے شادی بیاہ کرنے یا نفسیاتی ہم آہنگی پیدا کرنے میں کشش پیدا کرے گا۔

(۴) جمالیاتی حس افراد کی شخصیت کی تعمیر اور نسل انسانی کی بقا کے لئے ضروری خصوصیات کے حاصل کرنے میں اتصال کے ذریعہ کا کام کرتی ہے۔ حسن چونکہ انسان کو ہیئت میں نظر آتا ہے، ہیئت چونکہ ایک کمیت کی حامل ہوتی

ہے اس لئے حسن ایک مخصوص انسانی شخصیت
اور کیفیت کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے

(۵) مختلف ٹائپ کی ان کی اپنی خصوصیات
کی تصدیق کے لئے ہم آہنگی کے اصول کا استعمال
کیا جاتا ہے۔ اگر کسی مخصوص ٹائپ، اور اس
کی مخصوص خصوصیت میں ہم آہنگی نہ ہو تو ایسا
ٹائپ اپنے ماضی سے فرار اختیار کر لیتا ہے
اور مخالف سمت کی جانب بڑھتا ہے چنانچہ
اگر کسی لمبوترے چہرے کے فرد میں گول چہرے
والے ٹائپ کی خصوصیت ملیں تو ہم یہ فرض
کر سکتے ہیں کہ یہ لیپٹوسیم تغیر پذیر ہے اور پکنک
کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے فرد کو گول چہرے
والے لوگ اور گول ساخت کی چیزیں ہی پسند
آتی ہیں۔

گویا انسان کی جمالیاتی دلچسپی میں اسکے پسندیدہ
ہیئت کے پردہ میں وہ مخصوص کیفیت چاہتا ہے
اور جب اسے اس سے، مختلف ہیئت کی شئے
نصیب ہوتی ہے تو کڑھتا ہے۔ اور اس غم کو نہ
سہہ کر نفسیاتی بیمار رہتا ہے۔ اس طرح نفسیاتی
بیمار زیادہ تر حسن کا بیمار ہی ہوتا ہے۔

آخر میں آرٹ اور سائنس کے فرق کے بارے
میں جمالیاتی تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ آرٹ
کی چیزیں اس لئے زیادہ دیرپا ہوتی ہیں کہ ان
میں جمالیاتی ذوق کی تسکین پنہاں ہوتی ہے اور
سائنس اور فلسفہ کی اقدار اس لئے بدلتی رہتی ہیں کہ ان
میں جمالیاتی ذوق کی تکمیل کے لئے سامان سے
بحث ہوتی ہے اور چونکہ تمدنی ترقی کے ساتھ
ساتھ اس کی دریافت کے طریقہ کار میں روز
بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لئے سائنس
اور فلسفہ کی بدلتی ہوئی اقدار کے ارتقا میں بھی
جبلتوں کی مکمل جمالیاتی جبلت کی ہی حکمرانی
ہوتی ہے ●●

باقی عدلیہ اور پارلیمنٹ
تبدیل کر دیا جائے لیکن اگر ملک میں جمہوری
نظام حکومت قائم ہے تو آزاد عدلیہ کا قیام
لازمی ہے۔

اس لئے ان تمام سیاستدانوں اور سیاسی
پارٹیوں کو جو جمہوریت میں دلچسپی رکھتے
ہیں چاہیے کہ عدلیہ اور قانون ساز یا
انتظامیہ کے درمیان تنازعہ نہ ہونے دیں۔

جواب طلب امور کیلئے ۲۰ پیسے کے
ٹکٹ روانہ کیجئے۔

وریندر

اور جب ہم نے سر اٹھایا تو وہاں کچھ نہیں
تھا۔ ہمیں خود اس بات پر حیران ہونا چاہئے
تھا اور کسی ایسی حرکت کا سہارا لینا چاہئے
تھا جو ظاہر کرتی کہ ہمیں اس طرح کے مذاق
کی عادت نہیں مگر ہم نے حرکت کے نام
پر محض سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور
مڑ کر چل دیئے، مگر تھوڑی دیر بعد ہم نے
دیکھا کہ ہم وہیں کھڑے ہیں اور چلنا محض
ایک تصور تھا۔ ہم نے چیخ کر کہا ہمیں ایسے
مذاق کی عادت نہیں اور چلنے کا ارادہ ترک
کر دیا اور یوں کھڑے رہے کہ دوسرے دیکھنے
پر لگے کہ ہم اس کے منتظر تھے۔ ہمیں کھڑے
ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ بار بار گھڑی
دیکھنا ہمارے لئے چٹکلا بن کر رہ گیا۔ اس
بات پر کچھ دیر تو ہنسا جا سکتا تھا، مگر اس
بات کا بھولنا ہمارے لئے دشوار۔

لڑکیوں نے ہلکے رنگوں کے کپڑے پہن
رکھے تھے اور لڑکوں کے کپڑوں کا رنگ
گہرا تھا۔ رنگوں کا یہ انتخاب غالباً انہوں نے
اپنے والدین کی رائے کے مطابق ہی کیا تھا کہ
ان کے لئے بغیر کسی رائے کے کوئی کام کرنا ایک
بچکانی بات ہوتی جس کے لئے کہ وہ قطعی
تیار نہیں تھے۔ ہم نے ان سے بہت ساری

باتیں کیں اور ہر بار انھیں اس بات کا احساس
دلانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی جگہ سو فیصدی
درست تھے اور انہیں ان تمام لڑکیوں سے
کورٹ شپ کی چھوٹ مل جانا چاہئے جو
کہ اب تک کسی ذاتی مجبوری یا دماغی
کمزوری یا جسمانی مصروفیت کے باعث
ان کے بچوں کی ماں بننے سے پرہیز کرتی
رہیں۔ لڑکے بہت خوش دکھائی دیتے تھے
انہوں نے اظہار مسرت کے لئے ایک شکر
نعرہ بلند کیا تھا، جس میں ان کی انفرادیت
محض ایک خیال ہو کر رہ گئی تھی اور ہمیں
اس بات پر خوشی بھی ہوئی تھی کہ اسی طرح
ہم لڑکیوں میں بھی مقبولیت حاصل کر
سکتے ہیں۔ مگر اس کا خیال تھا کہ ہمارے
اندر اب بھی وہ سب کچھ زندہ ہے، جسے ہماری
پیدائش کے فوراً بعد یقیناً مر جانا چاہئے تھا۔
ہمیں اس کی باتوں پر یقین لانے میں اکثر دیر
لگتی ہے۔ ہم نے اس بات سے انکار کیا
اور راستے منہ چڑھاتے ہوئے دوسرے راستے
پر چل پڑے۔

"وہاں پہنچنے پر تمھیں ان سیڑیوں کا استعمال
کرنا پڑیگا۔ جن کے تم عادی نہیں۔"

اس نے کہا تھا وہ ہوا بھی کمبخت نہ جانے
کیوں اب تک سچ بولتا چلا آ رہا ہے۔ اگر
وہ چاہتا تو بآسانی کوئی ایسی بات کہہ سکتا
تھا، جو وقتی طور پر ہمارے لئے تفریح ثابت
ہوتی اور بعد میں اس تفریح کے زیر اثر ہم ان
سیڑھیوں کو یاد کرتے ہوئے وہاں پہنچنے
میں کامیاب ہو جاتے اور ہمیں راستے کی
طوالت کا قطعی علم نہ ہوتا۔ اس سے کم سے
سے کم یہ تو ہوتا کہ ہماری عظمت کا احساس
اس وقت تک ہمارے ساتھ رہتا، جب
تک کہ ہم از خود اسے فالتو چیزوں میں شمار
نہ کرنے لگتے۔ مگر سیڑھیوں کو دیکھ کر ہی ہمیں
اکتاہٹ ہونے لگی۔ اور ہم نے وہاں تک
پہنچنے کا خیال چھوڑ ہی دیا۔

"حرام زادہ کہیں کا۔"!

"گالی دینا ایک مزیدار بات ہے ہم نے دوہرایا
اور صفحات پر مسلسل گالیاں تحریر کرتے رہے۔
اور جب ہم نے پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا
کہ ہمیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک
ایک حصہ چٹخارے لے کر گالیاں پڑھ
رہا تھا اور دوسرا حصہ ملعون سا کھڑا ہوا
اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہم نے
اس بات کے بارے میں کبھی قیاس نہیں

کیا تھا، لہذا اس حالت سے اور بھی لطف
اندوز ہو سکتا ہے، اس طرح کہ کوئی بات
سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلسلہ
اس قدر رنیا تھا کہ ہم اسے اس وقت تک جاری
رکھنے کے حق میں تھے جب تک کہ ہمیں یقین
نہیں ہو جاتا کہ دیگر دلچسپیاں بھی حاصل
ہو سکتی ہیں۔

دلچسپیوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات
کہنا شاید اپنے آپ میں مضحک ہو اس لئے
ہم اس لڑکی کے بارے میں بات کریں گے
جو کہ ایک ویران اور سنکرے راستے سے آ
رہی تھی اور دفعتاً اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان
سر پر کسی کا گٹھر لادے اور ایک ہاتھ میں
کوئی گٹھڑی سی دبائے خاموش خاموش
چلا آ رہا تھا۔ لڑکی کے دل میں خدشہ پیدا
ہوا کہ یہ مجھے چھیڑے گا۔ اس لئے نوجوان پر
بھی ظاہر کر دیا۔ نوجوان نے کہا چھیڑنے کا
سوال اسی لئے نہیں اٹھتا کہ اس کے دونوں
ہاتھ آزاد نہیں ہیں۔ لڑکی نے معصومیت سے
کہا کہ وہ گٹھڑی کو پہلے سر سے اتارے گا،
پھر گٹھری کو نیچے رکھ دے گا اور پھر چھیڑ دیگا
اس کے بعد کی بات ہمیں بھی معلوم نہیں ہے

بہر حال کبھی کبھی ایسی باتیں سنکر ہم نے سوچا
تھا کہ زندہ رہنا اتنا بھی آسان اور پر لطف
ہے جتنی کہ جنوری کی سرد راتوں میں رم کی
ایک چھوٹی سی بوتل لیکن اس کا خیال تھا
کہ زندگی کا رم سے مقابلہ کرنا ایک گھسی
پٹی اور روایتی مثال ہے اور اس سے بہتر
مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ہماری ناراضی
ایک لازمی جواز عمل تھا ہم نے اس سے
اسی وقت نگاہوں سے دور ہو جانے
کے لئے کہا تھا اور وہ صرف ہنستا رہا۔
تھا ویسے ہم جانتے تھے کہ وہ اندر ہی اندر
جل بھن کر خاک ہو چکا اور اس کا یہ ہنستے
رہنا محض ایک دکھاوا ہے۔ ہم نے اس
کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہا
مگر اس کے قبل ہی وہ جا چکا تھا۔ اس
کے جانے کے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ ہم
اس کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنی
جلد بازی پر افسوس ہونے لگا۔ مگر
افسوس سے حاصل کیا تھا! ہم نے اسے
آوازیں بھی دیں، مگر سب بیکار، ہم نے
خود کو بے چارہ محسوس کیا۔ اس بے چارگی
نے ہم میں ایک نئی جان پھونک دی اور
ہم نے تہیہ کر لیا کہ بغیر اس کے بھی کام

دہکاتے رہیں گے۔ ہم نے قدم بڑھائے تو
وہ مردود نہ جانے کس سمت سے نکل کر سامنے
آگیا۔ ہم نے اس کی جانب حقارت آمیز نظروں
سے دیکھا اور ایک زہریلی مسکراہٹ پھینکتے
ہوئے چلے گئے۔

اس واقعہ کا اس گاؤں والے سے کوئی تعلق
نہیں ہے جو کہ ٹرین میں بیٹھے ہوئے بھی اپنی
بیوی بچوں کے بارے میں سوچے جا رہا تھا اور
نہ ہی اس کا تعلق اس عورت سے ہے جو اپنے
شوہر کی موت پر صرف اس لئے رو رہی جا رہی
تھی کہ اب اس سے شادی کون کرے گا۔
کہ اب اس کی عمر ڈھل چکی ہے۔ اس واقعہ
کا تعلق اور بھی بہت سارے لوگوں سے نہیں
ہے، مگر جن سے بھی ہے، وہ خود اس بات
سے بے خبر ہیں کہ ان کا اس سے کوئی تعلق
بھی ہے ہم نے ایک بار اس مسئلہ پر غور کیا تھا
اور چاہا تھا کہ کسی طرح انہیں باخبر کر دیا جائے
مگر نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہمیں کلاؤن سمجھنا
شروع کر دیا اور ہمارے احباب کا حلقہ وسیع
تر ہوتا چلا گیا وہ ہماری ہر بات پر کھل کر
داد دیتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہمیں بھی اس
مقصد فراموش کر دینا پڑا اور پھر وہاں رہنے

کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔

اس شہر سے چلے جانے کے بعد ہمارے بارے
میں افواہیں اڑ رہی ہیں اور جب جب ہم کوئی
افواہ سنتے ہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے
کہ ہم زندہ ہیں۔ ہم نے ایک دن ڈائری میں
لکھا کہ زندگی کے احساس سے ہمیشہ دوچار
رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے میں افواہیں
اڑتی رہیں۔ اس دن کے بعد ہم ہمیشہ دربدر گئے
جس شہر میں رہے، لوگوں کو متاثر کرتے
رہے اور کسی دن چپکے سے وہاں سے غائب
ہوتے رہے اور بعد میں اپنے بارے میں اڑائی
گئی افواہوں کو سنتے ہوئے باقاعدہ زندہ
رہے۔

ایسی بات نہیں کہ وہ پھر کبھی ہمارے سامنے
نہ آیا ہو۔ وہ ہر دفعہ ہمیں ہدایت کرتا اور ہم
ہر مرتبہ اسے مطعون کرتے۔ ایک دن اس
نے اپنی غلطی تسلیم کر کے شرمندگی اختیار
کر لی اور ہمارے لئے مشکل ہو گیا کہ اس کی
موجودگی سے پرہیز کرنا جاری رکھ سکیں۔ ہم
نے اسے معاف کر دیا۔ بس اسی دن سے ہمارے
لئے افواہوں پر زندہ رہنا مشکل ہوتا چلا گیا۔

ہم سہمے سہمے مرتے چلے گئے وہ گن گن کر بدلہ
لیتا رہا اور اس طرح اس کی شیطانیت
کھل کر ہمارے سامنے آتی رہی۔

اس دن جب ہم نے سڑک پر پڑے
ہوئے بٹوے میں اپنی معشوقہ کی بہت پرانی
تصویر دیکھی تو پہلی بار احساس ہوا کہ اب
وہ دو تین بچوں کی ماں بن چکی ہوگی اور اسے
یقیناً ہماری یاد تک نہ آتی ہوگی۔ دو تین
بچوں کے بارے میں ہم نے اس لئے سوچا
کہ اس سے زیادہ بچوں کی ماں کی صورت
میں اس کا تصور اتنا بھونڈا لگا کہ اندیشہ
ہوا کہ کہیں ہمیں کسی زمانے میں عشق کرنے کے
خیال سے شرمندگی نہ ہونے لگے۔ لگا کسی نے
نیند سے جگا دیا ہو۔ مگر اب اتنی دیر ہو چکی
تھی کہ کچھ نہیں ہونا جانا تھا۔ اسی رات ہم
نے اسے قتل کر دیا اور اپنے شہر لوٹ آئے
سالوں بعد جب ہم نے اپنے کمرے کا
دروازہ کھولا تو دیکھا کہ فرش دھول
سے اٹا پڑا تھا اور جا بجا مکڑیوں کے
جالے پھیلے ہوئے تھے اور وہ سب سے
بے نیاز کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی اخبار پڑھ
رہا تھا۔ ہم دبے پاؤں اس کی پشت پر
جا پہنچے۔ تبھی ہماری نگاہ اخبار پر پڑی
اور ہم چونک اٹھے۔ اخبار میں ہمارے
قتل کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ اس نے پلٹ
کر دیکھا اور مسکرایا ——
"خوش آمدید"۔

●

صہل پرویز

ایک قدیم فن جو نوابوں کے زمانے میں بہت مقبول
تھا اور موسیقی کی یہ صنف جو کسی زمانے میں حسین اور
مدھر انداز میں ٹھمری کے نام سے گائی جاتی تھی دورِ
جدید میں اپنے اصلی اور مصدقہ فنی روپ سے
منحرف ہو گئی ہے۔ پھر بھی یہ موسیقی سے دلچسپی رکھنے
والوں میں ہر جگہ مقبول ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ٹھمری گانے کا
طریقہ اتر پردیش کے مشرقی حصے میں گائے جانے
والے موسمی اور تہوار کے موقعوں کے لوک گیتوں
جیسے ہولی، چیتی، ساون، کجری، دادرا وغیرہ
سے اخذ کیا گیا ہے۔ بعض عالموں کی یہ رائے
دلچسپ اور قابل غور ہے کہ موسیقی میں ٹھمری اور

رقص کی کتھک طرز لکھنؤ کے نواب واجد علی
شاہ کے دور کی پیداوار ہیں۔ بعض اس نظریہ
کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اور
درست بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ٹھمری بھی اتنی قدیم
اور فنی ہے جتنا کہ دھمار اور یہ کہ ٹھمری اور کتھک
دونوں نے اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت کو اپنی
موجودہ شکل میں نواب واجد علی شاہ کے زمانہ
میں پھر سے حاصل کیا۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ مشہور دھرو پدیے، برندابن
کے ہری داس سوامی (تان سین کے استاد)
نے بھگوان کرشن اور رادھا کی مدح میں بیشمار
دھمار تیار کیے اور گائے تھے۔ موجودہ دور

میں بھی مشہور گائیک متھرا والے، چندن چوبے
نے اپنے آپ کو دھمار اور ٹھمری کے لئے وقف
کر دیا۔ دھروپد گائیگی کے بول زیادہ تر بھگوان شیو
اور مغل بادشاہوں کی تعریف میں یا قدرت کی
عظمت کے بیان پر بنائے جاتے تھے اور دھمار
یا ہوری کے بول بھگوان کرشن کی زندگی کی مختلف
کہانیوں پر۔ ٹھمری کی نمایاں خصوصیت اسکا جذباتی
مضمون ہے جس میں بالخصوص بھگوان کرشن اور
رادھا کی پریم کہانیوں کا بیان ملتا ہے۔ ٹھمری کو
ویشنواؤں کی موسیقی بھی کہا جا سکتا ہے۔

ماہرین موسیقی نے دھروپد کے معنی دھروا پد اور خیال
کے معنی نظریہ، تخیل، یا تصور بتاتے ہوئے
تفصیلی وضاحت کے ساتھ ان اصطلاحات
کا بیان رقم کیا ہے۔ ٹھمری کی اصطلاح کا مفہوم
ابھی تک کسی نے بیان نہیں کیا ہے۔ تاہم متعلقہ
کے ویشنوا شاعروں کی تخلیقات (بالخصوص بنگال
کے کیرتن) اور روایتی ہوری، دھمار اور ٹھمری
کے مطالعہ سے اس باب میں قابل لحاظ مدد
ملتی ہے اور اسی سے یہ تیقن حاصل
ہوتا ہے کہ ٹھمری کی اصطلاح "ٹھم" اور "ری"
دو لفظوں سے مرکب ہے۔ یعنی ٹھمکنا چال (یا حرکت)
جو رادھا جی کی تھی اور ری کا دامت (پسندیدہ
اور بلند) جو بھگوان کرشن کی روح اور دماغ تھا
ٹھمری کے مضمون کے لحاظ سے بھی یہ تعریف بہت

چست اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس عنوان
پر مزید کوئی تحقیق موجود نہیں ہے، اور ماہرین موسیقی
کے لئے بہت مناسب موقعہ ہے کہ وہ اس کی
فنی گہرائیوں اور مضمون کی خوبصورتی کے پہلو کو
بے نقاب کریں۔ بعض رجعت پسند ماہرین فن
عام طور پر ٹھمری اور ٹپہ کو بھی گرا ہوا فن سمجھتے ہیں
یہ نظریہ بھی خلاف حقیقت معلوم ہوتا ہے اس
لئے کہ دیگر ملحوظات کے علاوہ اگر کسی صنف
موسیقی یا فن کو جو وقت اور عوام کے امتحان کی
کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ قدیم فنون کے زمرہ میں
شامل کیا جاتا ہے تو پھر ٹھمری اور ٹپہ طرز کی
گائیکی بھی جیسا کہ اوپر صراحت کی گئی ہے اس
معیار سے گری ہوئی نہیں ہو سکتی۔

ٹھمری گانے کی خوبصورتی فنکار کی اس صلاحیت
میں مضمر ہے کہ وہ گیت کے الفاظ کو موسیقی کے
مختلف اسلوب کے ذریعہ مناسب اور ممکن معنی
و مفہوم میں ظاہر کرے۔ ٹھمری کی روح اس کے
بول ہوتے ہیں (مختلف اور مناسب کیفیات یا
اس کے ذریعہ کسی لفظ کی ترجمانی اور اس کا اظہار)
جسکا کرادا کرنا مزاج اور کیفیت کا عطیہ ہے
اس لئے گانے سے پہلے گائیک کے لئے ضروری
ہے کہ وہ گیت کے ہر لفظ پر غور کر کے اس کے
خیال کی گہرائی کو سمجھے۔ اس کو ڈرامہ کے ایک
حصہ کی طرح ہونا چاہیئے جس کا مرکزی خیال اا سمتہ

آہستہ ابھرتا ہے۔ اور تال و سُر کے ذریعہ اظہار کرتا ہے بہ الفاظ دیگر اسے نزاکت اور فنی صلاحیت کے ساتھ گائیکی کی روح کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

ٹھمری کے دو خاص اسلوب ہیں ایک لکھنؤ طرز دوسرے بنارسی طرز ساتھ ہی گیا اور پنجاب کے ٹھمری گانے کے طریقوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔ اس صدی کے ابتدائی حصہ کے بہترین ٹھمری گانے والوں میں گوالیار والے بھیا صاحب گنپت راؤ اور استاد معز الدین خاں گذرے ہیں۔ ان کے پیش رو ٹھمری گانے والوں میں لکھنو دربار کے قادر پیا اور للن پیا مشہور رہیں۔

ٹھمری فنی نمونہ کی ایک خوبصورت بندش ہوتی ہے۔ جہاں تک راگوں کی ترکیب اور ان کے گانے کا تعلق ہے ٹھمری کو خیال سے زیادہ آزادی حاصل ہے۔ اس فن کا سیکھنا مشکل ہے۔ ہمکو بہت سے مشہور خیال گانے والے ٹھمری کو اسکی فنی خوبیوں کے ساتھ گانے میں اکثر ناکام رہتے ہیں ـــــ

صحیح اور نمائندہ طریقہ پر ٹھمری گانے والے موجودہ نمایاں چند فنکار رسولن بائی یا صدیقی نور بائی۔ بنارس والی لکھنو کی بیگم اختر۔ کلکتے کے ضمیر الدین خاں اور پیارے صاحب گیا والی ڈھیلا بائی۔ پنجاب کے بڑے غلام علی خاں ہیں جن کے سنگیت اچاریہ گرما تسنکر چکرورتی جی کی چند برس پہلے بے وقت موت ہو گئی، بھیا صاحب گنپت راؤ اور معز الدین خاں جیسے مشہور اساتذہ کے ڈھنگ کی ٹھمری کو برقرار رکھنے اور اس کو مقبول کرنے کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ ٹھمریاں زیادہ تر ہارمونیم کی سنگیت میں گائی جاتی تھیں جس کے ماہر بھیا صاحب گنپت راؤ گوالیار والے، سوہنی جی مہاراج گیا والے اور راجہ نواب علی لکھنو والے گزرے ہیں

یہ بڑی بدبختی ہے کہ مشہور موسیقاروں کی بڑی تعداد نے فن کی اس نازک اور پاکیزہ صنف کے استعمال میں اس کے مضمون کی گہرائی کا مطالعہ کئے اور خصوصیت کو پہچانے بغیر بہت ناروا آزادی سے کام لیا ہے۔ اور اس طرح اس کی حیثیت اور عظمت کو قابل لحاظ حد تک مسخ اور تباہ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس فن کے ماہرین ایسا اقدام کریں جس سے یہ تحفظ حاصل ہو سکے کہ گانے کی اس حسین صنف کی مزید غلط ترجمانی نہیں ہو سکے ــــــ اور اس طرح اس کے اصلی روپ اور صحیح طریقہ کی اشاعت اور حفاظت ہو تا کہ یہ فن آئندہ ترقی اور توسیع کر سکے۔

ملیں جانے والے کی طرف زیادہ دھیان
نہیں دیتا۔ البتہ آنے والے کا استقبال ضرور
کرتا ہوں۔ اسی لئے میں نے زری جب صدر دروازے
سے نکل کر بازار کی طرف روانہ ہو گئی تو میں نے
اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ البتہ سامنے
سے آتی ہوئی ٹری زا کو بغور دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں
چند سفید کپڑوں کے ٹکڑے لئے چھوٹے وارڈ
میں داخل ہو رہی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا سا اسکرٹ
کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اور جسم کے کل پرزے
بے جان سے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے اندر
جانا مناسب نہیں سمجھا۔ باہری دالان میں کرسی
پر بیٹھے بیٹھے بڑے بھائی کا انتظار کرنے لگا۔
دراصل آپریشن انہیں کا تھا لیکن اتنا بڑا بھی
نہیں تھا کہ میں اپنا چہرہ پھلائے ڈاکٹر کی آمد کا
انتظار کرتا۔ ڈاکٹر سے ابھی تک فیس کا معاملہ
طے نہیں ہوا تھا۔ معاملہ کچھ عجیب سا تھا۔ سفارشی
ہر وہ روپے کم لیتا اور بغیر سفارش والوں کی جیبوں
پر ڈاکہ ڈالتا۔ اس لے دے کے معاملوں میں
میں بالکل ناکارہ ہوں، اس لئے اکثر لوگ مجھ سے
روپیہ لے جاتے ہیں اور کبھی واپس نہیں کرتے۔
میں مروتاً دے دیتا ہوں اور اخلاقاً ان سے طلب
نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے کہ مہینے کے اواخر میں
روپیوں کی ضرورت محسوس ہوتے ہی بھائی جان
کے ہاتھوں ناکارہ ٹھہرا جاتا ہوں۔ اس وقت اگر
میں داخل ہوتا تو ضرور وہ بات جو صرف ڈیڑھ سو
میں طے ہو گئی، میں دو سو سے اوپر دینے کے لئے
تیار ہو جاتا۔ باہر آتے ہی بھائی جان نے کہا۔
"تم یہیں کیوں اڑے رہے، اندر چلے آتے لیکن
یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ نہیں آئے، ورنہ بات دو سو
سے اوپر جا چکی ہوتی۔ ہاں! اپنی سفارش کا کام

نور پرکاش

آ گئی"۔ اسی وقت ڈری نوا سنے ابھر آ کر ہم دونوں کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی بھائی جان سے پوچھا ـــ "کیا یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔؟" بھائی جان نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ "بلکل تمہارے مافق لگتا۔ تم ذرا موٹا اور وہ پتلا، کچھ جاستی فرق نہیں۔ اچھا اب ہم چرچ جاتا۔ گڈ بائی" میں نے اور بھائی جان نے ایک ساتھ گڈ بائی کہا۔ ڈری نوا چرچ گئی۔ یسوع مسیح کے سامنے اس نے اپنے سینے پر صلیب بنائی ہوگی۔ پھر ایک زانو جھک کر لینے لئے اور اپنے کنبے کے لئے ڈھیر ساری دعائیں مانگی ہونگی اور آخیر میں کسی اچھے سے چھوکرے کی تصویر کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ کر کہا ہوگا:" او گاڈ! ہم اسی کو مانگتا، کسی اور کو نہیں۔ بس اسی کو...!"

دوسری صبح بھائی جان کا آپریشن تھا۔ بواسیر کی تکلیف کی وجہ اکثر خون گرا کرتا اور بہت ساری ادویات کے استعمال کے باوجود بھی اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے خاندانی ڈاکٹر کی رائے کے مطابق اب آپریشن کے سوائے اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے رات میں انہیں اسپتال میں رہنا ضروری تھا۔ میں گھر واپس آ گیا اور اس وعدے کے ساتھ کہ کل سویرے ہی اسپتال پہنچ جاؤں گا۔ دوسری صبح جب میں صدر دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا، ڈری نے دھیرے سے گڈ مارننگ کہا ـــ میں نے بھی جواباً گڈ مارننگ کہتے ہوئے پوچھا ـــ "کہاں سے آ رہی ہیں آپ؟"

"ہم چرچ گیا تھا۔ مارننگ پریئر کے واسطے آج تم بھی تو موسک MOSQUE گیا ہوگا تمہارے بھائی کا آپریشن ہے نا؟"

میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔ اسے دن رات چرچ جانے اور مسیح کے سامنے گڑگڑانے کے سوائے اب کوئی کام نہیں بچا تھا۔ تین بچوں کی ماں تھی۔ شوہر دارو پیتے پیتے مر گیا تھا۔ اب وہ بنی تھی سو بچوں کا بوجھ ڈھونے کے لئے اسپتال میں نرس ہو گئی تھی۔ البتہ وہ اسپتال میں کم اور چرچ میں زیادہ رہتی۔ بوروَلی سے لیکر چرچ گیٹ تک سارے چرچ اور ان چرچوں کے سارے فادرس اس سے واقف تھے۔ اس کی ایک بہن گوریگاؤں چرچ میں سسٹر بھی بن گئی تھی۔ اس لئے اس میں اور ڈری نوا میں اکثر جھگڑا بھی ہوا کرتا۔ چونکہ اس کے بار بار چرچ جانے کی وجہ اس کا کام بھی ڈری نوا کو ہی کرنا پڑتا۔ وہ اسے کوستی اور جب بہت ہی زیادہ غصّے میں آ جاتی تو تو تڑاک کر کہتی ـــ "اب تم کو اس اتنے AGE میں ہسبنڈ کا ہے کو مانگتا؟"

ڈری جسم سے بہت موٹی تھی اور رنگ سے کالی

لیکن یقیناً اس کے یہ خدوخال جوانی میں غضب
کے رہے ہونگے۔ میں اس کے ساتھ وارڈ میں
داخل ہو گیا تو ٹری زا میرے بہت ہی قریب
آ گئی اور اس نے کہا" رات ہم تمہارے بھائے
کے ساتھ بہت بات بولتا ہوتا۔ بولتے بولتے اس
کے پاس ہی سو گیا۔ فجر میں ہمارا آنکھ کھلا تو ہم حیران
ہو گیا۔ لیکن تمہارا بھائے بہت اچھا۔ بہت اچھا
ادھر کا ادھر نہیں ہوا۔ ہم ۔۔۔۔ ہم ابھی PRAYER
پورے اور کر کے آتا ۔ ۔ ۔ آج اس کا اپریشن
ہے نا!"

ٹری زا کے واپس آنے تک سے ری نے پورا
بائیبل ختم کیا۔ " تمہارا بھائے کتنا پڑھا ہوتا؟"
"ایم - اے"
"تو پھر اس کو اچھا سروس ہونا مانگتا"
"اس کو کوئی لڑکی دیکھا ہوتا؟"
میں نے کہا "نہیں" اور نہ ہی فی الحال ان کی
شادی کرنے کا کوئی ارادہ ہے۔ زندگی میں
ابھی بہت سارے کام کرنے باقی ہیں۔ جب
سارے کام پورے ہو جائیں گے تو وہ شادی
کریں گے۔ شادی بھی تو ایک کام ہے، لیکن وہ
کام سب سے آخر میں کیا جائے تو ترقی کے
راستے بند نہیں ہوتے۔" اس نے مجھے
اس انداز سے دیکھا، گویا کہہ رہی ہو "تم نمبر
ایک کا گدھا ہے، اور شادی اور چھوکری کا بات
ہے۔ پیکر حیدرآباد

تمہارے منہ میں نہیں آئیں گا۔ تم ابھی چھوٹا
ہے، بہت چھوٹا، ہمارا لیبے بی مافق!"

اسی وقت ٹری زا اندر داخل ہو گئی۔ اس نے
سے ری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم اکھا کا
اکھا بات بنایا ہوگا ادھر۔ اور کام کون کرے
گا؟ ابھی ڈاکٹر آنے کو مانگتا۔"

سے ری نے پانی گرم کر لیا۔ اور بہت سارے
سفید ٹکڑے ٹرے میں رکھ کر بھائی جان کو
دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہا۔ ٹری زا
بھی اس کے ساتھ ہولی۔ ان دونوں نے مل کر
ڈاکٹر کی تاکید کے مطابق بھائی جان کے پچھلے
حصے کے سارے بال نکال دیئے اور انہیں
اپریشن کے لئے تیار کر لیا۔ ڈاکٹر کے آتے ہی
کمپاؤنڈر نے سامان منگوا لیا اور تھیٹر کا دروازہ
بند کر دیا۔ سے ری موقع پاتے ہی باہر آ گئی اور
پھر میرے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف
ہو گئی۔ پھر دھیرے دھیرے وہ میرے ساتھ
یکھا اتنی گھل مل گئی کہ "سالا لوفر" کے سوائے
بات نہ کرتی۔ اپریشن ہونے کے بعد کچھ چار
روز تک اسپتال ہی میں رہنا پڑا۔ اس
دوران ٹری زا بھائی جان سے بہت قریب
آ گئی تھی۔ ان کے کھانے پینے کا خرچ خود ہی
برداشت کرتی۔ اور سے ری کسی نہ کسی طرح

مجھے اپنے ساتھ چرچ لے جاتی اور مسیح کے سامنے دوزانو بٹھا کر لمبا چوڑا پڑھے اور دعا کرتی رہتی۔ اگر کسی وقت میں جانے سے انکار کرتا تو کہہ اٹھتی: "تم تو سالا اکھلا اکھا لوفر ہے۔ نہ چرچ جاتا ہے اور نہ ہی موسک"۔ اتنا ضرور ہے اس کی بدولت میری کچھ فادرس سے اچھی خاصی پہچان ہو گئی اور میں چرچ کے آداب سے بخوبی واقف ہو گیا۔

میں تو سمجھ رہا تھا اسپتال سے گھر جاتے ہی بات ختم ہو جائے گی۔ ہم جو بھی چاہتے ہیں اگر وہ یوں ہی اسی طرح ہو جائے تو یقیناً اب تک سے ری کو کوئی شوہر مل چکا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گھر آتے ہی تیسرے روز سے ری، ٹری زا دونوں ایک ساتھ گھر آ گئیں۔ ہمارے گھر پر ہم دو بھائیوں کے علاوہ ایک باورچی ہے، یعنی ہم تینوں کے سوائے اور کوئی نہیں۔ گھر آتے ہی ان دونوں نے باورچی کا ہاتھ بٹایا اور جلدی جلدی کھانا تیار کر لیا۔ پھر اکثر ایسا ہی ہوتا ـــــ اور پھر کبھی کبھار یوں بھی ہوتا کہ ٹری زا آ جاتی تو سے ری نہیں اور سے ری آ جاتی تو ٹری زا نہیں لیکن دونوں کسی نہ کسی وقت گھر ضرور آ جاتیں اتفاق سے ایک روز سے ری نہ آ سکی اور ٹری زا کے اصرار پر میں اس کے ساتھ چرچ چلا گیا۔ چرچ سے جب واپس آ گیا تو سے ری کو گھر پر منتظر پایا۔ اپنا منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی چیخ اٹھی: "تم سالا لوفر ٹری زا کے ساتھ چرچ کیوں گیا؟ ہم بولا تھا نا ـــ ہم آنے کو مانگتا۔"

میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا: "ٹری زا لے گئی تھی مجھے۔"

اس نے ٹری زا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم اس کو کیوں لے گیا۔؟"

"اس کا بھائی نہیں آتا۔ اس لئے ہم ۔۔۔!"

"ٹری زا تم کو ہمارا لاسٹ وارننگ۔ یا تم اس کے بھائی کے ساتھ موسک میں چلی جاؤ یا پھر اس کو چرچ میں لے آؤ۔ نہیں تو سالا لپھڑا والا بات ہو جائے گا۔"

دراصل ہوا یوں کہ ٹری زا یہ چاہتی تھی کہ بھائی جان کسی طرح اس کے مذہب کو اپنا لیں اور بھائی جان اس بات پر ضد کر رہے تھے کہ وہ ان کا مذہب اختیار کر لے۔ بات پھر بھی ادھوری رہ جاتی تھی اور سے ری کی نظر میں معقول راستہ یہی تھا کہ دونوں ہی ایک دوسرے کے مذہب کو قبول نہ کرتے ہوئے سول میرج کر لیں۔ چونکہ

بھائی جان سے اچھا اس کے لئے کوئی ازر بر ملنا ناممکنات میں سے تھا۔ اور ٹری زا کو شادی سے زیادہ ہونے والے بچوں کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ کس کمیونٹی کے کہلائے جائیں گے؟ بات بڑھ جاتی اور کبھی پوری نہ ہوتی۔ سب کی اپنی اپنی رائے اور الگ الگ نتائج، کبھی کامیاب، کبھی ناکامیاب۔ نہ کوئی آگے بڑھتا اور نہ ہی کوئی پیچھے ہٹتا۔ اپنے اپنے راستے اور پھر بھی اپنے اپنے اجنبی!

اسپتال میں غالباً کام بڑھ گیا ہوگا۔ اسی لئے ہفتہ بھر نہ ے زی آئی اور نہ ہی ٹری زا۔ بھائی جان کی دوائیاں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ شام کو دفتر سے واپس ہوتے وقت میں نے سیدھے اسپتال کا رخ کیا۔ دونوں وارڈوں میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑ پڑیں۔ "ہم بولا تھا نا ٹری زا بڑا نہیں آئیں گا، سالا چھوٹا ضرور آئیں گا۔" مجھے دیکھتے ہی دونوں بہت مسرور ہوئیں اور مجھے کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے راضی نہ ہوئیں۔ رات بھر مجھے مجبوراً اسپتال ہی میں رکنا پڑا۔ سونے کے لئے جگہ کی قلت تھی۔ وارڈ پورا بھر گیا تھا۔ کہیں کوئی کاٹ خالی نہیں تھا۔ ان کے سونے کے کمرے میں بھی صرف ایک ہی کاٹ تھا اور ہم تین تھے۔ میں نے ان سے کہا: "میں باہر کوچ پر

[illegible] سے حیدرآباد

سو جاؤں گا۔ آپ دونوں کے لئے یہ کاٹ کافی ہو گا۔" "گرمی سخت بڑھ گئی ہے۔ ایسی حالت میں اگر الگ الگ تین بستر کر لئے جائیں تو اور بھی مناسب بات ہو گی۔" لیکن ے زی اس بات پر بالکل راضی نہیں ہوئی، اور ے زی کی کہی ہوئی بات کو ٹالنا یا غلط ثابت کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ نہ ہی میرا اور نہ ہی ٹری زا کا!! مجبوراً ہم تینوں کو ایک ہی کاٹ پر سونا پڑا۔ ایک طرف ٹری زا

[illegible]

تھا! زیادہ گرمی کی وجہ مجھے نیند نہ آسکی۔ میں بار بار یہ کوشش کرتا کہ ان دونوں کے درمیان سے کسی طرح اٹھ جاؤں اور کوچ پر جا کر سو رہوں لیکن جونہی اٹھنے کی کوشش کرتا ے زی کہہ اٹھتی — "تم سونے کو نہیں مانگتا۔ سب کا سب پیشنٹ لوگ اٹھ جائیں گا، دیکھیں گا تو کیا کہیں گا؟ ابھی کے ابھی رات کھلاس ہوتا" ٹری زا بار بار میری پیٹھ تھپتھپاتی اور سلانے کی کوشش کرتی۔ لیکن ہر بار میں جاگ اٹھتا۔ کئی رات تک جاگتے رہنے کی وجہ صبح میں دیر تک پڑا سوتا رہا۔ پتہ نہیں وہ دونوں کب کی چرچ جا کر واپس آ چکی تھیں۔ تیسرے روز پھر وہ گھر پر آ دھمکیں اور بھائی جان سے کہنے لگیں: "تمہارا بھائی بھی ایکدم تمہارا ماتق۔ اکھا رات ہمارے ساتھ سویا — ادھر کا ادھر

نہیں ہوا۔"

"ٹری زا نے اپنا ہوسپٹل بدل دیا۔

بھائی جان نے پہلے میری طرف دیکھا، پھر ٹری زا کی طرف اور نے ری کی طرف اور اس کے فوراً بعد ٹری زا پر اتنے برس پڑے کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ روتے ہوئے کہہ اٹھی: "تم کہاں شک کھاتا۔ تم کہاں ہم پر نہیں اکھا کر بھی کمیونٹی پر شک کھاتا۔ نہ سب دار ویتا ہے نہ سب چرچ جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا سب کا سب بھنگا ہوتا ایک دم اچھا ہوتا۔ تم ہمارا دل نہیں سمجھا، ہمارا لوگ کیا سمجھیں گا۔؟" پھر اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور مسیح سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "او گاڈ ہم کو معاف کرنا اگر کوئی گناہ کیا ہوتا!"

پتہ نہیں اس کے بعد کیا ہوا کہ ٹری زا نے دھیرے دھیرے ہمارے گھر آنا بند کر دیا۔ البتہ نے ری اکثر آتی رہتی اور کبھی باندرہ اور کبھی میم (راہم) کے چرچ میں لے جاتی یا پھر کبھی اپنی بہن سے ملنے گورے گاؤں چلی جاتی۔ اس دوران نے ری آ بھی جاتی تو پہلے کی طرح کھل کر کوئی بات نہ کہتی۔ ایک آدھ بار اگر میں جانے سے بھی انکار کر دیتا تو پہلے کی طرح گالیاں نہ دیتی، اور چپ چاپ اپنا راستہ لیتی۔ ایک روز دوڑی دوڑی آ کر کہنے لگی

میں نے پوچھا۔ کیوں؟

اس کا دل نہیں لگتا اب وہاں پر۔ اس لئے وہ وہاں سے چلا گیا۔ اب ہم بھی جائیں گا۔ تم مڈن لوگ بہت دھوکا دیتا ہے۔ اس کے پہلے بھی ایک اور جو کرسے نے ٹری زا کو دھوکا دیا تھا۔

کون تھا وہ؟

"وہ بھی مڈن!"

"کیا تم نے بھائی جان کو اس سے متعلق بتلا دیا تھا؟"

"ہاں! اس کو سب بات معلوم ہوتا۔"

تم کو بھی مڈن سے لو کیسا ہو جاتا؟

نے ری نے پہلی بار اپنائیت کی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: "تمہارا ہمارا ایک ہی کتاب تمہارے اور ہمارے ریلجن "RELIGION" میں جاستی فرق نہیں۔ شادی میں بھیڑا نہیں ہو سکتا۔۔"

اس نے اس کو بھی ہر بار مڈن سے ہی۔۔۔" میں

نے جملہ مکمل کر دیا۔

پھر بہت روز تک مے ری نہیں آئی۔ اس نے میں خود اسپتال چلا گیا۔ وہاں پتہ چلا مے ری بھی اسی اسپتال میں گئی ہے جہاں ٹری زا کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ میں نے نئے اسپتال کا پتہ حاصل کر لیا اور اس کی جانب چل پڑا۔ میرے لئے جگہ بالکل نئی تھی۔ اس لئے اسپتال تک پہنچنے میں کافی دیر لگی۔ اس نئے اسپتال میں نہ کہیں دالان تھا اور نہ ہی ویٹنگ روم۔ صرف ایک ہی وارڈ تھا اور وہ بھی لمبائی میں زیادہ اور چوڑائی میں کم۔ یکایک میری نظر ان پر جا پڑی۔ دونوں کسی مریض کے سامنے بیٹھیں محو گفتگو تھیں میں ان کے پاس ہی جا کھڑا ہوا۔ مے ری سے مخاطب ہو کر ٹری زا کہہ رہی تھی: "ہم رات کو بہت بات بولتا ہوتا اس کے ساتھ، پھر بولتے بولتے اس کے ساتھ ہی سو گیا۔ لیکن یہ بہت اچھا آدمی بہت اچھا ۔۔۔ ادھر کا ادھر نہیں ہوا مے ری ہم .... ہم ابھی چرچ جا کے آتا۔"

جونہی وہ جانے کے لئے مڑی۔ اس نے مجھے اپنے پاس ہی کھڑا پایا۔ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "تم کب آیا ہوتا؟"

میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ آپ دونوں کا پتہ پرانے اسپتال سے حاصل کر لیا اور ملنے کے لئے چلا آیا۔

"تم بہت اچھا کیا ہوتا" مے ری نے کہا۔ "اچھا ادھر کو ہمارے ساتھ آؤ۔"

میں مے ری کے ساتھ ہو لیا۔ وہ ایک کونے میں مجھے لے گئی اور اس نے مجھ سے عاجزی کرتے ہوئے کہا: "ہم ہاتھ جوڑتا تمہارے سامنے۔ اس کو کوئی بات نہیں بولنا۔ تم بھی ہم کو ہمارا بے بی مافق، ٹری زا بھی ہمارا بے بی مافق۔ اس کا شادی ہو جائیں گا تو ہم سمجھیں گا ہمارا ایک بے بی کا شادی ہو گیا۔ گاڈ سیک GOD SAKE کوئی بات نہیں بولنا ۔۔۔ ورنہ اس کا شادی کبھی نہیں ہوا ں گا۔"

میں نے مے ری کو یقین دلاتے ہوئے کہا: "کوئی فکر نہ کرو مے ری۔ ٹری زا کی شادی ہو جائے گی تو میں بھی بہت خوش ہو جاؤں گا۔ خدا کرے وہ اس بار کامیاب ہو جائے۔ تم مجھ پر بھروسہ رکھو، بچہ اپنی ماں کو کبھی دھوکا نہیں دیتا...!"

اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا: "تھینکس گاڈ، ہم کو ڈر اس لئے لگتا ہوتا کہ وہ پہلا چھوکرا بھی پر دس کیا ہوتا کہ ہم کوئی بات تمہارے بھائے کو نہیں بولیں گا۔

لیکن وہ سب بات بتلادیا اور اسی لئے تمہارے بھانجے نے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ اس بار اس کا کام ہو جائیں گا تو ہم جرور چرچ میں بہت سارا کینڈل (CANDLE) جلائیں گا۔"

اچھا اب تم جاؤ۔ آج اس کا اپریشن ہوتا شادی کی بات پکا ہوتے ہی ہم تم کو ملنے آجائیں گا۔ گڈ بائی ۔۔۔!

میں نے مے ری کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اس میں سچائی اور مجبوری کے سوائے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں ہر وقت ہر وقت ہی مسیح کے سامنے موم بتیوں کے مانند جلتی رہتی ہیں اور اپنے شوہر کے جلد مرنے کی شکایت کرتی رہتی ہیں۔ اور ٹری زا کے لئے ایک اچھا سا بر ملنے کی پرارتھنا کرتی رہتی ہیں

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنے ہی دل میں کہا۔ "او گاڈ اس کی آواز کو سن لے یہ خود تو کب کی مر چکی ہے۔ لیکن اب تو وہ صرف دوسروں کے لئے زندہ ہے۔

میں نے مے ری سے گڈ بائی کہا اور اپنے گھر چلا آیا ــــــ بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ ان دونوں نے پھر اپنا اسپتال بدل دیا تھا!!!

بیان و تفصیل ملکیت

ماہنامہ پیکر حیدرآباد

تحت دفعہ ۸ رجسٹریشن آف نیوز پیپر رول سنٹر ۱۹۵۹ء

مقام اشاعت
۲۱۴-۶-۳ حمایت نگر حیدرآباد۔۲۹

۲- وقفہ ہائے اشاعت
ماہانہ

۳- پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر
اعظم راہی

۴- مالکان
اعظم راہی،
عالیہ خاتون
ہادیہ شبنم

۵- قومیت ہندوستانی

میں اعظم راہی اقرار کرتا ہوں کہ میرے یقین و معلومات کی حد تک تفصیلات بالا صحیح ہیں۔

دستخط اعظم راہی

کونپل

بیتے ہوئے وقت پر لوگ فقرے کس رہے
ہیں۔ میں بھی کوئی امکانی جواز تلاش کر رہا ہوں
تمام چہروں پر خوف غالب ہے۔ شبہات
نے سب ہی کو ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے
جہاں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا جیسی ٹوٹی ہوئی
کرچیں میں نے مٹھیوں میں بند کر لیں۔ جانتا ہوں
کہ پرواز کی ہر کوشش محض فریب کے اور کچھ
نہیں، اگر مجھ میں ذرا بھی جرأت ہوتی تو اپنی
فعالیت کو اس طرح ٹوٹتا، بکھرتا اور تڑپتا کیسے
دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ان تمام خوف زدہ چہروں
پر کلونچیں ملنا شروع کر دی ہیں۔ چاہتا ہوں
کہ میری مسخ شدہ شخصیت کا کوئی حل ہی
سامنے آ جائے۔ مگر حل اور پھر تعاقب اور پھر تلاش
یہ سب مجبوریوں کے الٹ پلٹ بہروپوں کے
سوا اور کیا ہیں۔ کیا جو کچھ میں نے سوچا ہے
وہ سب کچھ صحیح ہے، یا کسی حد تک صحیح
ہے۔ یہ ایک دھوکا ہے، جو "حل" اور "ہے"
کے بیچ معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ ٹھیرا ہی ٹھیرا، جیسے برف
کی سل میں وقت کی تھکی ماندی سانسیں منجمد۔

پڑ چکی ہیں اور اندھے لوگ اس مجہول حقیقت
کا راز اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ ان کے کلونچوں
سے آئے ہوئے عجیب چہرے — جنہیں چہرے
کہنا بھی غلط — بغیر آوازوں کے ٹوٹے
پھوٹے اور بے ترتیب الفاظ پھینک رہے
ہیں۔ کہانیاں سب ختم ہو چکی ہیں۔ قصوں میں
کوئی رومانیت نہیں رہی۔ ذہنوں کے
تہہ خانوں میں سوائے حبس کے اور کوئی چیز نہیں
جسے تاریخی ودیعت کا نام دیکر اہم ترین کا لقب
دیا جا سکے۔ یہ حبس جو کہ ناگزیر حصہ بن گیا ہے۔
ہمارے ناپیدا احساس پر لعنت سا بن گیا ہے
میں اپنے چاروں طرف پانی تلاش کر رہا ہوں
اور بے آواز بہاؤ — بہاؤ کے باوجود بے حس
اور بے نام — اپنی معنویت کا یقین دلانا
چاہتا ہے۔ مگر میرے مجہول اعضا کو ریت کے
چمکتے ہوئے ذرات نہیں چاہئیں۔ اپنی انتہا
پیاس موت، ہونٹوں کی پپڑیاں بار بار کھنچتی
ہیں اور بار بار ٹوٹ کر دھرتی کی سوکھی چھاتیوں
پر بکھر جاتی ہیں۔ چہروں کے گم شدہ الفاظ۔ مجھ

۸۰۔ نبیکر حیدرآباد

عتیق اللہ

احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اشیاء کی لایعنی سیاق و سباق
میں گرتا چلا جا رہا ہوں۔ فرار کی سمت گہرے
دھندلکوں میں اٹ چکی ہے۔ تمام عجیب اور ناگوار
چہروں پر تھکاوٹ کے آثار بڑھتے جا رہے ہیں۔
شدید جذبات ذہن پر حاوی ہوتے جاتے ہیں۔
تبھی ایسے ارتسامات اور واضح ہونے لگتے
ہیں۔ میں نے اپنے فرد کو جھنجوڑا — کوئی آواز
کچھ نہیں۔ پھیلتا، گھٹتا ہوا میرا اندرون میرے
سمت کچھ معنی ڈھکیل رہا ہے۔ فرد جسے میں
نے اپنا ہمزاد تصور کیا تھا — ایک دیو
ہیکل شخصیت بن کر سامنے آیا۔ اس نے مجھے
بالوں میں اپنی کالی اور لمبی آنکھیں گاڑھ کر
اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ گویا ہر آسمان
ایک ایک کر کے میرے راستے سے ہٹتا چلا جا رہا
ہے۔ اور میں اس ناگہانی قوت کے قریب کار
ذہنیت کو سمجھنے لگا ہوں۔ کسی سچ کو سمجھنے
میں ایک بہت بڑا عرصہ درکار ہوتا ہے۔
جھوٹ کی حقیقت اپنی جگہ محفوظ سہی
مگر سچ کی اثبات تک کسی کتاب کے لفظیاتی
تشکیلوں کے ذریعہ نہیں پہنچا جاتا بلکہ ایسی
قدروں کے عرفان کے لئے بھی کسی نہ کسی
سراب کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر سراب اندر
سراب آگے چل کر ایک بڑے عرصہ کی شکل
میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ صداقت کی اس سے
ہٹ کر اور کوئی تاویل یا تصدیق ممکن ہی نہیں
میں چاہتا ہوں اپنے تحفظ کو اخیر حد۔ ۔ تک
محفوظ رکھ سکوں مگر فرد کی ناگہانی قوت نے
مجھے ہی نہیں بلکہ تمام عجیب چہروں کو حیران کر دیا
ہے میرا کھینچتا ہوا جسم الجھے ہوئے دھاگے
کی طرح گٹھڑی سا بن گیا ہے۔ تمام چہرے میری
چاروں طرف چھٹ گئے ہیں۔ عجیب طرح کی
کھچاوٹ اور زہرناکیوں نے مجھے نحیف کر دیا ہے

"پانی" ———

"نجات — — — نجات"

"پانی محض ایک دھوکا ہے اور نجات — ایک
خوش نما لایعنی افراد کا ایک ذریعہ اور بس —"

"فرار ہی سہی   لیکن یہ ذریعہ بھی اگر میسر
نہیں تو کیا۔ ؟"

"تو بس تمہاری ایک نئی زندگی کا آغاز۔ نئی زندگی
کے ساتھ ہی میں نے اپنے میں ایک نئی طرح کی
حرارت محسوس کی یہ خوش فہم تیزی اور تحریک
"اس نئے آغاز کا مطلب نجات یا کرب"

جان وین

مسئلہ حل

اب وہ ایکی نہیں تھا بلکہ ایک بھرپور لڑکا بن چکا
تھا اس کی عمر چھ برس کی ہو چکی تھی۔ اب وہ
بھورے رنگ کی علیحدہ بیلٹ اور بغیر
الاسٹک والی فلالین کی پتلون پہننے لگا تھا
اس کا نام ایرک تھا۔ صرف یہی تبدیلیاں وقت
کے ساتھ ہوئیں اور بقیہ سب وہی تھا جس
کا ممی نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ شب و روز
وہی تھے۔ سوائے اس کے کہ اب گھر میں
ڈیڈی کی بجائے ڈونالڈ رہتا تھا۔ وہ ڈونالڈ
کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس کی گھر میں موجودگی
کا مطلب بھی سمجھتا تھا۔ اسے ڈیڈی کے
چلے جانے کا بے حد افسوس تھا۔ وہ جب کبھی
بستر پر لیٹتا تو سوچتا کہ ڈونالڈ کی موجودگی اس
کے باپ کی غیر حاضری کا سبب کیوں بنی
جبکہ گھر کافی بڑا تھا اور کوئی بھائی بہن بھی
نہ تھے۔ اگر ہوتے حتیٰ کہ کوئی شیر خوار بھی
جس کی دیکھ بھال زیادہ مشکل ہے تب بھی
ان کو اپنے کمرے میں جگہ دینے پر اعتراض نہ
تھا کہ گھر کا اکیلا زائد کمرہ ڈیڈی کے استعمال
میں رہے۔ اس کو اپنے ڈیڈی سے بہت محبت
تھی۔ پچھلے سرما میں آخری بار یہ کمرہ استعمال
میں رہا جبکہ نسبتاً وہ چھوٹا تھا۔ اس میں
ٹھیرنے والی تھی۔ ایک ہنس مکھ خاتون اور
وہ بھی تین شب گذار کر چلی گئی۔ بڑوں کی ان
حماقتوں پر اسے بڑا غصہ آتا اور افسوس بھی ہوتا۔
یہ جو حماقتیں نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور

ان میں مبتلا رہکر رنجیدگیاں مول لیتے ہیں۔
بجائے ہنسی خوشی زندگی گذارنے کے ان لوگوں
کے دلی تاثرات کا جاننا بہت مشکل کام
ہے اور یہ جاننا ممکن نہیں کہ کس بات کا
کیا مطلب نکلے گا جیسا کہ جیز نے ہفتہ بیشتر
ڈیڈی نے اسے ایک ریل دلائی اور اس کے
ڈبوں کو آپس میں جوڑنے کا طریقہ بھی سکھایا۔
اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسے بیٹریاں بھی
بعد میں لادیں گے۔ لیکن وہ کہیں چلے گئے۔
کیا کوئی عقلمند آدمی ایسا کرسکتا ہے؟

ڈونالڈ کا رویہ اس ریل کے لئے بہت اچھا
ثابت ہوا۔ اس نے ریل اور بیٹریاں لادیں۔
پہلے تو یہ بیٹریاں بیکار ثابت ہوئیں۔ کیونکہ
ریل کے پہیئے بہت قریب تھے اور ان پٹریوں
پر نہیں بیٹھ سکتے تھے جیسا بڑے جب کوئی
چیز لادیتے ہیں تو اس کی طرف سے مکمل
بے اعتنائی برتتے ہیں مگر ڈونالڈ نے ایسا
نہیں کیا اور اسی سہ پہر یہ بیٹریاں بدل کر لادیں۔
اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ وہ بھی گھر چھوڑ
رہا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا

سب کچھ تو وہی تھا۔ وہ صرف ابھی نہیں
بلکہ اریک بن چکا تھا۔ سمجھدار اور بڑا ۔۔۔۔
یہ تو محض اس کا تصور تھا جو وہ ہر شئے کو اجنبی
سمجھتا اور بلا وجہ بہت سی چیزوں سے خوف
زدہ رہتا جبکہ آسانی سے اپنا خوف دور کرسکتا
مثال کے طور پر بگ مین جس سے وہ بہت پریشان
اور خوفزدہ رہتا ہمیشہ اس کا سامنا کرنے سے
پرہیز کرتا بگ مین، اس کی طرح بڑوں کے
لئے قابل توجہ نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو اپنے گھر
کی چاردیواری میں رہ کر اپنے گھر کے پچھلے دروازے
سے اسے دیکھ سکتا اور اپنا خوف دور کرسکتا
لیکن ہمیشہ اسے نظرانداز ہی کرتا رہا کیونکہ اس
کے ذہن کے مطابق اسی میں اس کی بہتری
تھی۔ وہ ہمیشہ اسکے بارے میں سوچا کرتا۔ یہ بات
اس کے بہت سے الجھاؤں میں سے ایک تھی
کبھی کسی نے بگ مین سے بچنے کی تاکید بھی نہیں
کی تھی اور کسی طرح خوف بھی نہیں دلایا تھا لہذا
بگ مین باوجود بے ضرر تھا کیونکہ جب کوئی
چیز نقصان رساں ہو تو لوگ محتاط رہنے
کی تلقین کرتے ہیں۔ مثلاً سڑک کی ٹریفک
مگر لوگ اس کا تذکرہ یوں ہی کیا کرتے ہیں
اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ گھر میں اس
کی ماں اکثر کہا کرتی کہ آج بگ مین کے آنے
کا دن ہے یا سامنے بگ مین اب آنے ہی والا ہے

میں نے کچھ بھی نہیں نکالا۔ جب وہ بھی اس قسم کے جملے کہتی ایرک سر دپڑ جاتا کیوں کہ فوراً بعد وہ کہتی: "ایرک" ذرا یہ (چھلکے یا جو کچھ بھی ہوتا) لے جاؤ اور بکٹ میں ڈال آؤ۔ بکٹ عقبی دروازے سے پچاس گز دور رکھی ہوتی۔ اس کے پڑوسی بھی اسے استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پگ مین سے خوفزدہ نہیں تھا۔ لوگوں کے اس رویہ پر اسے حیرت ہوتی کہ وہ اس کے لئے دکھی رہتے ہیں اس کے کھانے کے لئے چائے کی پتی انڈے کے چھلکے، باسی کھانا اور دوسری چیزیں رکھتے ——— کیا وہ انہیں گھر لے جا کر پکاتا ہے اور کھانے کے قابل بنا لیتا ہے کیونکہ بعض وقت ان میں بو بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا پگ مین بہت ہی غریب ہے؟ کیا اسے بھی اپنی حالت پر افسوس ہوتا ہے؟ یا وہ مطمئن ہے؟ وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟ کیا اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور چپٹی تھوتھنی ہے؟ کیا وہ چوپایہ ہے یا پھر آدمیوں کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں ہیں۔

ایرک اکثر سنجیدگی سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہتا پگ مین کی بکٹ میں ایک ہینڈل تھا وہ سوچتا کہ وہ انسانوں کی طرح اسے ہاتھ میں لٹکا کر لے جاتا ہے یا چوپایوں کی طرح منہ سے پکڑ کر ——— اس کا امکان زیادہ نہیں ——— کیونکہ اگر وہ اس طرح لے جاتا تو اس میں اور ایک عام سور میں کیا فرق رہ جاتا ——— جب اسے پگ مین کہا جاتا ہے تو اس مناسبت سے وہ لباس بھی پہنتا ہوگا ——— کیا وہ بات کر سکتا ہے؟ یا اس کی آواز سور کی گھوں گھوں جیسی ہے۔ ———؟ وہ اپنی پسندیدہ غذا لوگوں سے کس طرح مانگتا ہے ——— ایرک نے اپنے ڈیڈی سے اس بارے میں کیوں نہیں پوچھ لیا تھا یہ اس کی غلطی تھی۔ ڈیڈی سب کچھ بتا سکتے تھے۔ مگر ——— اب تو وہ جا چکے ہیں ——— !

ایرک نے خواب سا دیکھا کہ ڈیڈی اور پگ مین ایک ریل میں جا رہے ہیں، اس نے انہیں پکارا لیکن لوگوں نے نہیں سنا ——— اور ریل انہیں لے کر چلی گئی ——— "ڈیڈی" اس نے چیخ کر کہا ——— "آتے وقت پگ مین کو مت لائیے ——— پگ مین کو مت لائیے" اس کی آواز سن کر ممی کمرے میں آئی اور اسے چمکارنے لگی ——— اور وہ سو گیا ———

صبح اسکول، دوپہر میں جھولے اور بہت سی
مصروفیتیں جن میں وہ پگ مین اور اس سے
متعلق باتیں بھول گیا ——— انہیں ہنگاموں
میں کئی دن گزر گئے مگر اچانک ایک دن ——

————— !!!

ہوا یہ کہ شام کی چائے کے بعد ایک اپنی
ریل اور پٹریوں سمیت آ موجود ہوا، وہاں
آتش دان روشن تھا۔ کمرہ قدرے گرم تھا
اور ترش کھیل کے موزوں تھا۔ رونالڈ گھر
آگیا تھا۔ ڈیڈی کی کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھتے
ہوئے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ ممی سامنے
باورچی خانے میں تھی۔ دونوں کمروں کے دروازے
کھلے ہوئے تھے۔ رونالڈ اور ممی ایک دوسرے
سے کچھ نہ کچھ کہتے بھی جاتے تھے۔ ان کے
درمیان بہت کم فاصلہ تھا ——— دن کا
یہی حصہ ایرک کو بہت پسند تھا سونے کا
وقت ابھی بہت دور تھا ——— وہ ریل کے
ڈبوں کو جمانے اور انہیں گھمانے میں مگن اور
منہمک تھا۔

"ایرک، پیارے بیٹے" تبھی ممی کی آواز آئی۔
"یہ کچرا ایگ مین کی بکٹ میں ڈال آؤ۔ میرے
ہاتھ آٹے میں ہیں۔" اگرچہ اسٹ بیسن بھی صاف

کر دینا۔" ایرک کھیل میں اسی طرح لگا رہا۔ جیسے
کہ اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو ——— رونالڈ
نے گھورتے ہوئے اس سے کہا۔ "چلو اٹھو،
کیا تم بوڑھے ہو گئے ہو —— !
اُف —— پگ مین آنے والا ہے ——— !"

یہ لوگ ایسے وقت مجھے باہر بھیجنا چاہتے ہیں
جبکہ دن کا اجالا بھی نہیں رہا۔ اور پگ مین سے
سامنا ہونا بھی یقینی ہے۔
"ہاں اسی لئے۔" رونالڈ نے دوبارہ اخبار
کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
"اسی لئے! کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ پگ مین
سے میرا سامنا ہو۔

وہ تھکے قدموں سے باورچی خانے میں گیا۔
وہاں ممی نے ٹوکری کی طرف اشارہ کیا جس میں
آلو کے چھلکے اور کچرا رکھا ہوا تھا۔ اس نے ٹوکری
اٹھائی عقبی دروازے کی طرف چلا گیا۔

اگر میں بھاگ کر جاؤں بکٹ کا ڈھکن اٹھا کر
کچرا ڈال دوں اور واپس بھاگتا ہوا آجاؤں
تو اس کے لئے صرف دس تک کی گنتی کا وقت
کافی ہوگا۔

ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ ——— وہ رک گیا

بکٹ وہاں نہیں تھی، ایرک نے چاروں طرف

دیکھا وہ جا چکا تھا، سات، آٹھ، نو، دس ———

وہ خوشی خوشی ڈگ بھرتا ہوا آگیا۔ یہاں پیل اور

آتش دان کی گرمی اس کی منتظر تھی۔

"ممی بکٹ نہیں ہے۔ پگ مین چلا گیا" اس نے

کہا، وہ پڈنگ بنا رہی تھی۔ ہاں وہ چلا گیا ہوگا۔

اس کی آہٹ سن کر ہی میں نے تمہیں پکارا تھا۔

ایرک نے کچرے کی ٹوکری چپکے سے وہاں رکھ دی۔

"اگر تم بھاگتے ہوئے جاؤ تو وہ مل جائے گا۔ میں

یہ کچرا اب گھر میں رکھنا نہیں چاہتی"

"اس کے پاس جاؤں" ایرک نے دروازے میں

رک کر حیرت سے کہا

"ہاں" اس بار ممی کی آواز قدرے درشت

تھی وہ جانتی تھی کہ کس وقت شفقت برتنا

چاہیے اور کس وقت نہیں"۔ وہ ابھی زیادہ دور

نہیں گیا ہوگا" جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی ایرک

دروازے کے باہر تھا۔ وہ دوڑنے لگا۔ یہ تو

اندھے کنویں میں کودنے کے برابر ہے پگ مین

اسے پکڑ لے گا اور زبردستی اپنے گھر لے جائے گا

——— چلو اچھا ہی ہے ایسے جینے سے

ٹوکری ہاتھ میں لٹکائے وہ اور تیزی سے دوڑنے

لگا۔ پگ مین کی پشت دکھائی دینے لگی،

جو اس کے بتائے ہوئے ذہنی خاکے سے ملتی

جلتی تھی

وہ آہستہ آہستہ ڈولتا جا رہا تھا اس کے کاندھے

ڈھلکے ہوئے تھے، سر پر ایک بوسیدہ ہیٹ

جھکی ہوئی تھی (شاید وہ اپنے کان اس میں

چھپائے رکھتا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک

گھڑا تھا، یہ تھکاوٹ، اور اضمحلال ———

اس کی مکاری ہے تاکہ جب کوئی کمسن لڑکا

یا کوئی اچھی چیز اس کے قریب آئے تو اچانک

اسے جھپٹ کر پکڑ لے، پگ مین چڑیاں کھاتا

ہے یا بلیاں ——— ایرک رک گیا

اس نے پکارنا چاہا مگر ایک باریک سی

آواز کے سوا منہ سے کچھ نہ نکلا۔ اس کا دل

تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اعصاب سرد ہوگئے۔

"عالی جناب"۔ اس مرتبہ آواز قدرے صاف

اور اونچی تھی۔ متحرک بوڑھا سایہ رک گیا۔

اور اس کی جانب پلٹا، ایرک اسے واضح

طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر دیکھنا بھی تھا،

بے تابی اس کے خوف پر غالب آگیا، وہ آگے
بڑھا۔ اس کے نزدیک ہوتے ہوئے ہر قدم
کے ساتھ پگ مین کا چہرہ واضح نظر آنے لگا۔
اس کے خط و خال واضح ہونے لگے، وہ تو
ایک عام بوڑھا تھا۔ "کیا ہے بابا؟" اس نے
شفقت سے کہا۔ میرے خوک پیکروں کے
لئے کچھ لائے ہو؟"

ایرک نے کچرے کی ٹوکری دے دی۔ "کون
خوک پیکر؟" یہ کون ہیں؟ ——

اس نے بکٹ نیچے رکھ دی ڈھکن اٹھا لیا۔
اس کے ہاتھ عام آدمیوں کے سے تھے۔
ایرک نے کچرے کی ٹوکری اس کی طرف بڑھا
دی۔ اس کے ہاتھ، بوڑھے ہاتھوں سے
ایک سکنڈ کے لئے مس ہوئے۔ رگوں میں
ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ پگ مین نے بکٹ
میں کچرا انڈیل کر ٹوکری اسے واپس کردی۔
"شکریہ بابا" بوڑھا بولا۔

"یہ کس کے لئے ہے؟" ایرک نے ڈرتے
ڈرتے مگر پر اشتیاق لہجہ میں سوال کیا:
بوڑھا مسکرایا —— مگر بالکل انسان

انسان کی طرح۔ "میرے لئے نہیں۔" اس
کی مسکراہٹ قہقہہ میں بدل گئی۔ اس نے
ڈھکن لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ خوک پیکروں
کے لئے ہے۔ یہ ان کی مرغوب غذا ہے سڑے
میووں کے چھلکوں کے کیونکہ اس سے ان
کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔"

اُسے پگ مین اس لئے کہا جاتا تھا کہ اس
کے پاس بہت سے سور تھے وہ ان کی دیکھ
بھال کرتا تھا —— "شکریہ" ایرک
نے کہا۔ "خدا حافظ"

"خدا حافظ بابا" پگ مین نے جو بوڑھا اور
بالکل عام آدمیوں جیسا تھا۔ جواب دیا۔
اس کی آواز بھی آدمیوں جیسی ہی تھی۔
ایرک کے ذہن میں آیا کہ ادھر ادھر کی بات سے
خوف زدہ ہونے کی بجائے اس کا سامنا
کرنا چاہیے۔ جیسا کہ اب اس نے کیا ہے
دروازے کے قریب پہونچتے پہونچتے اس
کی رفتار سست ہوگئی۔ اس نے سوچا
اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے یا کوئی سوال
جس کا جواب اسے مطلوب ہو تو پوچھ لینا

لینا چاہیے۔ یہی بہتر طریقہ ہے۔ یہ بات اس
کے ذہن میں بیٹھ گئی کیونکہ وہ اسی طریقہ
سے ہگ مین والا معمہ حل کر چکا ہے۔ گھر
کا دروازہ بھیڑا ہوا تھا۔ اس کی ساندوں
سے روشنی دکھائی دے رہی تھی اس نے
دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ ممی میز کے
قریب کھڑی کیک بنانے میں مصروف
تھی اس نے ایرک سے واش بیسن اور چمچے
صاف کرنے کے لیے کہا۔ مگر ایرک کے ذہن
میں اس سے بھی اہم بات تھی۔ اس نے
کھڑے کی ٹوکری رکھ دی اور ممی کے پاس گیا۔

"ممی ہمارے ساتھ ڈیڈی کیوں نہیں رہتے
میرا مطلب یہ ہے کہ ڈونالڈ کے ساتھ
ڈیڈی کیوں نہیں رہ سکتے۔"

وہ پلٹی نل کی طرف گئی اور ہاتھ دھونے
لگی۔ "ڈارلنگ" اس نے پکارا۔
"کیا ہے ـــــ" ڈونالڈ کی آواز آئی۔

تم نے ایرک کی بات سن لی ہے ـــــ"
ـــــ "کیا ـــــ؟"

"اس نے جو کچھ ابھی کہا ہے ـــــ"
ممی نے نل بند کیا، ہاتھ تولیہ سے خشک کئے
وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ جیک ہمارے
ساتھ کیوں نہیں رہ سکتا۔" وہ ڈونالڈ کی
طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر
ڈونالڈ نے نہایت آہستگی سے کہا۔
"یہ بہت مشکل ہے۔"

"تم یہ بیسن صاف کرو" ممی نے یہ کہتے
ہوئے اُسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے
لگی، اس کے گالوں سے اپنے گال رگڑے
"بے چارہ ایکی" اس نے تمسخرانہ انداز میں
کہا اور ایرک کو نیچے اتار دیا ـــــ

وہ پڈنگ بیسن کو صاف کرنے لگا۔
اس کے ذہن میں صرف یہی بات تھی۔
بڑے بے وقوف اور خود غرض ہوتے ہیں، وہ
وہ انہیں ہمیشہ ناپسند کرتا ہے۔ ہمیشہ
ہمیشہ ہمیشہ ـــــ

پروڈیوسرز گلڈ کی علاحدگی

فلمی صنعت کی عمل درآمد کمیٹی کے
غیر لچکدار اور انتہا پسند رویہ سے تنگ
آکر پروڈیوسرز گلڈ نے جس کے سربراہ
فلم ساز بی۔ آر۔ چوپڑہ ہیں اس کمیٹی
سے علاحدگی اور بے تعلقی کا اعلان کیا ہے
یہ کمیٹی جو پروڈیوسرز گلڈ، امپا اور نیشنل
سنے سرکٹ ایسوسی ایشن کے نمائندوں
پر مشتمل ہے دو مہینے پہلے قائم کی
گئی تھی۔

مرنیل سین کی آئندہ فلم

ایک ادھوری کہانی

مشہور ڈائرکٹر مرنیل سین نے جن کی پچھلی فلم
"بھون شوم" سنجیدہ فلمی حلقوں اور تماشائیوں
میں بے حد پسند کی گئی تھی اپنی آئندہ فلم جو
ہندی میں بنی ہے صرف ۱۲ دنوں میں مکمل کرلی ہے
یہ فلم جو پورے بائیس دنوں کی آؤٹ ڈور
شوٹنگ میں مکمل کی گئی ہے بہار کے دیہات
کے پس منظر میں فلمائی گئی ہے اور اس کا
نام "ایک ادھوری کہانی" رکھا گیا ہے۔

"بھون شوم" کے شہرت یافتہ اداکار اتپل دت
کے علاوہ اس میں دو نئے فنکاروں دویک
چیٹرجی اور آرتی بھٹاچاریہ نے بھی کام کیا
ہے۔ سبودھ گھوش کی بنگالی کہانی "گوتراانتر"
پر مبنی اس فلم کے فوٹو گرافر کے۔ کے۔ مہاجن
اور موسیقار وجے راگھو راؤ ہیں۔

شکتی سامنت کی آئندہ

فلم میں وشال آنند

پروڈیوسر ڈائرکٹر شکتی سامنت نے اپنی آئندہ
فلم کے لئے جو ایک بنگالی فلم سے اخذ کی گئی

ہے۔ دیوآنند کے بھتیجے وشال آنند کو لیا
ہے۔ وشال آنند نے جو شکل وصورت
کے لحاظ سے دیوآنند سے بہت ملتے ہے۔
حال ہی میں دیوی شرما کی فلم "ہمارا ادھیکار"
میں کام کیا ہے جس کی ہیروئن کمد چگانی ہے

ہالی ووڈ کی فلم "دی پارٹی"

کی نمائش پر پابندی

حال ہی میں اسٹرلنگ سینما میں ہالی ووڈ

کی فلم "دی پارٹی" کی نمائش کے موقع پر شیو سینا کے کارکنوں نے مظاہرہ کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس فلم کا مرکزی کردار ایک ہندوستانی اداکار بتایا گیا ہے جسے تہذیب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ جن سنگھ کا کہنا ہے کہ اس طرح اس فلم کے ذریعے ہندوستانیوں اور انکی تہذیب کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔ ان مظاہروں کے نتیجے میں اسٹرلنگ سنیما میں اس فلم کی نمائش منتظمین نے روک دی ہے مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات نے اس فلم کے منظر نامے کی ایک نقل اور پرنٹ فلم کے پروڈیوسروں سے طلب کی ہے

فلمی خبریں

● آزادی سے پہلے کی مشہور ہیروئین ہنر (عشرت جہاں) کا حال ہی میں کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۶۵ سال کی تھی اور وہ عرصے سے بیمار تھیں۔

بتو جنھوں نے پہلی بار فلم "رنگیلا راجپوت" میں کام کیا تھا کئی فلموں کی ہیروئین رہی ہیں جنھیں قابلِ ذکر "دری مل" "من موہنا" وغیرہ ہیں۔ انہوں نے جے۔ راج، ماسٹر نثار، سہگل اور موتی لال کے مقابل کئی رول ادا کئے تھے

● بھی سونی کے اسسٹنٹ ست پال بھی اب ڈائرکٹر بن گئے ہیں۔

راجیش کھنہ کو عدالتی چارہ جوئی کی دھمکی

پروڈیوسر ڈائرکٹر ایچ۔ ایس رویل ہمیشہ من مانی کرنے کے عادی رہے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں راجیش کھنہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ ان کی زیر تکمیل فلم "محبوب کی مہندی" کی شوٹنگ کے لئے وقت نہیں دے رہا ہے کہ اگر راجیش آئندہ شوٹنگ کے لئے نہ آئے تو وہ کسی اور کے ذریعے بقیہ شوٹنگ کی تکمیل کروالیں گے۔

خیام — ایک مدت کے بعد

خیام ان چند موسیقاروں میں سے ہے جو موسیقی کے نام پر شور و شر برپا کرنے والوں کے اس دور میں اپنی غیر معمولی تخلیقی اپج اور صلاحیت کے بل پر اپنی غیر فلمی دھنوں کے ذریعے فن نواز حلقوں کی دلبستگی کا سامان کرتا رہا ہے حال ہی میں ایک عرصہ کے بعد انہیں "ٹوکل اسٹار فلمز" کی رنگین فلم "سنگلپ" میں موسیقی دینے کا موقع ملا ہے۔ اس فلم کے پروڈیوسر اور ہدایت کار رمیش بہگل ہیں۔

● مشہور ہندی کوی بچن کا لڑکا امیتابھ بچن خواجہ احمد عباس کی فلم "سات ہندوستانی" میں ابتدائی اداکاری سے تماشائیوں اور فلم سازوں کو متاثر کرنے میں کافی کامیاب رہا ہے۔ اسکا نتیجہ آج کل فلم ساز (راجیش کھنہ کی طرح) اپنی فلموں میں اُسے ہیرو بنانے کے لئے بے تحاشہ دوڑ رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حالیہ چند فلموں والی پابندی کے باوجود امیتابھ کے پاس اب ایک درجن سے زیادہ فلمیں ہیں۔

● اینگل فلمز کی زیر تکمیل فلم "لال پتھر" کے لئے پچھلے دنوں نئے گیت نگار دیو کوہلی نے ایک گیت لکھا جسکی دھن شنکر جے کشن نے بنائی تھی۔ اسے کشور کمار نے گایا "لال پتھر" کے اداکار ہیں راج کمار، ہیما مالنی راکھی اور ونود مہرہ گیت نیرج، حسرت اور دیو کوہلی کے لکھے ہوئے ہیں۔ مکالمے درجیندر گوڑ کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔

● حال ہی میں چند موسیقاروں نے شیو سینا کے تحت کام کرنے والے فلمی صنعت سے متعلق اداروں میں شرکت کی ہے۔ ان میں شنکر جے کشن، لکشمی کانت، پیارے لال، کلیان جی آنند جی، ایس ڈی برمن۔ آر۔ ڈی۔ برمن سونک اومی اور دتا رام قابل ذکر ہیں۔

● راجندر کمار اور ہیما مالنی کی فلم کا نام "گورا اور کالا" ہے

۹۲ پیکر حیدرآباد

چوپڑا اور جوہر میں

شدید اختلافات

ہندوستانی فلم انڈسٹری کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ کبھی اس کی سرکردہ تنظیموں کے نمائندوں میں اتحاد پیدا نہ ہو سکا اس کی تازہ مثال پروڈیوسرز گلڈ کے سربراہ بی۔ آر۔ چوپڑہ اور داسپا کے صدر آئی ایس جوہر کے درمیان شدید اختلافات ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آئی۔ ایس۔ جوہر جو اپنی ظریفانہ طبیعت کے اعتبار سے ہمیشہ سنسنی خیز خبروں کے مرکزی کردار رہنے کے عادی ہوتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں جمہوری ہدایت کے انتخابات کے لئے شیو سینا کی مدد حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جس کے لئے انہوں نے شیو سینا کی حمایت فلمی صنعت کے مسائل کے لئے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی کہا جاتا ہے کہ بی۔ آر۔ چوپڑہ نے ان کی ان کوششوں پر سخت بیزارگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

غیر جانبدار فلمی تبصرے

اے آر صدیقی

پورب اور پچھم

منوج کمار کی نئی فلم "پورب اور پچھم" "اپکار" کے بعد اُنکی دوسری کوشش ہے۔ موضوع کے لحاظ سے منوج کمار نے اس بار لندن میں بس جانے والے اُن ہندوستانیوں کو اپنی فلم کے مرکزی کرداروں کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو ہندوستان اور اس کے تہذیبی ورثے سے قطعی نابلد ہو چکے ہیں۔

ہندوستانی فلموں میں یہ موضوع یقیناً نیا اور اچھوتا ہے اس لحاظ سے منوج کمار بجا طور پر تعریف کے مستحق ہیں۔ لیکن اس موضوع کی اہمیت اور نزاکت کا انہوں نے فلم بناتے وقت پوری طرح شاید احساس نہیں کیا اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ہندوستانی فلموں کے باکس آفس فارمولوں سے بھی گریز کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موضوع کے اچھوتے پن کے باوجود وہ موضوع سے پوری طرح انصاف نہیں کر پائے ہیں اور مغرب زدہ کرداروں کے بارے میں اُنکا نقطۂ نظر سطحی اور پامال رہا ہے۔

پورب اور پچھم کی کہانی جو انتہائی کمزور ہے ایک ہندوستانی محب وطن کے لڑکے بھارت (منوج کمار) کے گرد گھومتی ہے جو سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن جاتا ہے۔ وہاں وہ ایک مغربیت زدہ ہندوستانی خاندان سے متعارف ہوتا ہے اور اُسی خاندان کی لڑکی پریتی (سائرہ بانو) سے پیار کرنے لگتا ہے۔ پریتی لندن کے سوسائٹی حلقوں کی پروردہ ہے اور اپنے ماں باپ کے سامنے سگریٹ اور شراب پینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی۔ پریتی چاہتی ہے کہ بھارت اُس سے شادی کر کے لندن ہی کا ہو رہے۔ لیکن بھارت کو یہ منظور نہیں۔ وہ بجائے پریتی کے سامنے

یہ شرط رکھتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہندوستان
چلے اور وہاں کچھ دن رہ کر یہاں کے حالات
اور تہذیب کا مطالعہ کرے۔ اس کے بعد پریتی
کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے ہندوستان میں
رہے یا لندن میں۔ اس کے لندن واپس
ہونے کی صورت میں بھارت کو بھی لندن
واپس آجانا پڑے گا۔

پریتی یہ شرط منظور کرتی ہے۔ اور ہندوستان
آنے کے بعد وہ لندن جانے کا ارادہ ترک
کر دیتی ہے اور بھارت سے شادی کرنے
پر راضی ہو جاتی ہے۔

اگر کہانی کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح
ہو جاتی ہے کہ کہانی میں ڈرامائی عنصر بہت کم
ہیں اور غیر ضروری کرداروں کی کثرت کے
باعث فلم کے واقعات میں وہ تسلسل پیدا نہیں
ہو سکا جو ایک بھرپور موضوعاتی فلم کے لئے
ضروری ہے۔

منوج کی ہدایت کاری کا کمال اس میں ہے
کہ اس نے فلم کی رفتار تیز رکھی ہے اور بعض
جگہوں پر بڑے خوبصورت ٹچز دیئے ہیں
مثال کے طور پر پریتی کا بھارت کے ہندوستان

دینے کے لئے اصرار پر جھنجلاہٹ کا اظہار، شرما
صاحب (مدن پوری) کا کے۔ سی۔ ڈے کے
گانے لگا کر اپنے بھولے ہوئے ماضی کو آواز
دینا، برف میں گرودیو (اشوک کمار) کی تدفین
کا منظر، آزادی سے پہلے کے مناظر کو بلیک
اینڈ وائٹ عکاسی میں پیش کرنا ایک بالغ
ہدایت کار کے ذہن کے غماز ہیں لیکن کردار
نگاری کے معاملے میں ہدایت کار الجھ کر رہ گیا ہے
نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بھی کردار پوری طرح نکھر کر سامنے
نہیں آنے پاتا۔ پریتی کا ہندوستان آنے کے
بعد محض چند مناظر، مقدس مقامات، اور قابل دید
جگہوں کو دیکھنے کے بعد ہندوستان میں رہ
جانے کا فیصلہ کر لینا عجیب لگتا ہے اور پھر اس
کا منی اسکرٹ پہننا چھوڑ کر ساڑی پہن لینا ہی
ظاہر ہے اسکی تبدیلی INDIANISATION
کو پوری طرح اجاگر نہیں کرتا۔ اس طرح یہ تبدیلی
محض سطحی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح بھارت کا ہندوستان
چھوڑ کر بھاگتے وقت اپنے بچے کو بھی لندن لے
جانا بعید از قیاس لگتا ہے۔ جو آدمی اتنا بے حس
اور بے ضمیر ہو کر اسے اپنے وطن سے غداری کرتے
اور اپنی بیوی سے جدا ہونے میں عار نہ محسوس ہو
اس کا اپنے بچے کو ساتھ لے جانا بالکل غیر حقیقی
ہے۔ ایسے مجرم ضمیر شخص کے لئے تو ایک نام
نہاد "نئی زندگی" شروع کرنے میں ایک بچہ ایک

وجہ ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پریم چوپڑا کا
کردار ایک قطعی فضول اور ایک عام ہندوستانی
فلم کے ولین کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ پردے
پر اسے دیکھنے کے بعد کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا
کہ یہ شخص کبھی بھولے سے بھی مغرب میں رہا ہو۔

تعجب یہ ہے کہ مغرب کے برے پہلو بتاتے
وقت منوج نے مغرب کے اچھے پہلو (جو یقیناً
مغربی تہذیب میں موجود ہیں) یکسر نظر انداز
کر دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ برطانوی قوم کی
تہذیب محض نائٹ کلبوں اور جوئے خانوں
تک محدود نہیں ہے۔

اداکاری میں پران ایک الجھے ہوئے کردار کے
باوجود متاثر کرتا ہے۔ منوج اور سائرہ بانو
بس ٹھیک ہیں۔ اشوک کمار کو ایک چھوٹے
سے رول میں ضائع کیا گیا ہے۔ پریم چوپڑا
نے محض دانت پیس پیس کر مکالمے ادا
کرنے اور گلا پھاڑ کر چیخنے کو اداکاری
سمجھ لیا ہے۔ اس کا میک اپ بھی انتہائی
ناموزوں اور بے ہنگم ہے۔ برطانوی اداکارہ
باربرا کی اداکاری اچھی ہے۔

فلم کی فوٹوگرافی بہت خوبصورت ہے اور
فلم کی اہم خوبیوں میں سے ایک ہے۔ برف
کے مناظر، لندن کے پارکوں کے سین اور
بلیک اینڈ وائٹ حصے دی۔ ایم ریڈی کے
کمال فن کا ثبوت ہیں۔ مکالمے اچھا لکھا گیا
ہے لیکن مکالمے اتنے اچھے اور ایک موضوعاتی
فلم کے شایان شان نہیں ہیں۔ ایڈیٹنگ اور
ساؤنڈ ریکارڈنگ معمولی ہے۔ لیکن موسیقی
بالکل معمولی ہے۔ دھنیں بہت مانوس اور
پھیکی سی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیان
جی آنند جی گیت پہلے لکھے جانے پر دھنیں
اچھی بنا ہی نہیں سکتے۔ گیتوں میں کوئی خاص
کشش نہیں جھلکتی ـــــ

مجموعی طور سے "پورب اور پچھم" ایک اوسط سے
زیادہ اونچے درجے کی فلم ہے جو اپنے اچھے
موضوع کے باوجود باکس آفس فارمولوں کو
سامنے رکھ کر بنائی گئی ہے۔

گیمبلر

"گیمبلر" دیو آنند کی کئی پرانی فلموں اور خصوصاً
"بازی" کا چربہ ہے۔ "گیمبلر" کا مرکزی کردار
دیو آنند کے مقبول نہج پر تشکیل دیا گیا ہے اور
حسب معمول فلم کے ہر شعبے کو دیو آنند کی فلمی
شخصیت کے دائرہ اثر میں ہی رکھا گیا ہے۔

دیو آنند اپنی شکل و صورت کے نقطۂ نظر سے یقیناً آج بھی ایک منفرد شخصیت رکھتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ دیو آنند کی ہر فلم میں دیو آنند فلم کا مرکزی کردار نہیں بلکہ دیو آنند ہی کی صورت میں نظر آتا رہا ہے۔

چونکہ دیو آنند کی زیادہ تر فلمیں اُس کے قریبی دوستوں کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں اس لیے زیادہ سے زیادہ (FOOTAGE) اُن کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔

"گیمبلر" کا بھی یہی حال ہے۔ پوری فلم دیو آنند کے گرد گھومتی ہے حتیٰ کہ ہیروئین بھی بغیر دیو آنند کے شاذ ہی پردے پر نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دیو آنند ایک پرکشش شخصیت کا مالک ہے لیکن کب تک کوئی محض اُس کے پرکشش خد و خال ہی کو دیکھتا رہے۔ ظاہر ہے کہ فلم محض ایک (FASHIAN PARADE) تو ہے نہیں۔ اور پچھلے بیس برسوں میں دیو آنند کی اداکاری (اگر اسے واقعی اداکاری کہا جا سکتا ہے) ایک تنگ دائرے میں گھومتی رہی ہے۔ نہ اس میں کوئی کرداروں کے مطابق تبدیلی ہی نظر آتی ہے اور نہ کوئی خوشگوار ترقی ہی۔

"گیمبلر" ویسے ایک تیز رو فلم ضرور ہے لیکن کہانی نام کی کوئی چیز ذرا مشکل ہی سے اس میں ملے گی۔ ہدایت کاری بے حد خام ہے۔ اتنے زیادہ کردار فلم میں بھر دیئے گئے ہیں کہ فلم ایک مجموعۂ اضداد بن کر رہ گئی۔ ویسے بعض مناظر (مثال کے طور پر جوئے خانے میں لڑائی کا منظر) اچھے فلمائے گئے ہیں لیکن زیادہ تر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ہدایت کار کیمرے کے پیچھے موجود نہیں ہے یا پھر وہ الجھنوں کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

زاہدہ نے اچھی اداکاری کی ہے لیکن اگر اس کی صحت کا یہی عالم رہا تو جلد ہی وہ ہیروئین بننے کے قابل ہی نہ رہے گی۔ نئی اداکارہ ظاہرہ خوبصورت ہے لیکن اداکاری میں اُس نے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔ جیون، ممتاز بیگم، سپرو اور منورما ٹھیک ہیں۔ افتخار کو ضائع کیا گیا ہے۔ شتروگھن سنہا خوب ہے اور اُس سے آئندہ بڑی اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ کشور ساہو کی اداکاری (؟) صبر آزما ہے۔

کوشل بھارتی کے مکالمے انتہائی معمولی ہیں برمن کی مایوس کن دھنوں کو اور بھی کمزور کر دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر "گیمبلر" ایک معمولی فلم ہے۔

ایک مکمل ماہنامہ

دسواں سال ● ساتواں شمارہ

پیکر

جولائی ۱۹۷۱

مدیر:
اعظم راہی

سرورق:
محمد اقبال

عنوانات:
غوث محمد

کتابت:
مسعود جاوید

قیمت سالانہ:
بارہ روپے

فی شمارہ:
ایک روپیہ

صدر دفتر:
۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد-۲۹

دیگر دفاتر:
● ۳۱۸-۱ اردن چیمبر
مین روڈ۔ تاردیو بمبئی
فون: 373647
● ۶۵-بی- دوسرا بلاک
راجہ جی نگر بنگلور-۱۰

پیکر میں شائع ہونے والے افسانوں، خاکوں، وغیرہ میں نام، مقام، کردار، واقعات فرضی ہیں اور ان سے کسی بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے

اعظم راہی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے بزنس پریس کے لئے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر ۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد ۲۹ سے شائع کیا

اس شمارے میں

زاویئے

اداریہ

"آج ـــــــ!" یہ لفظ موجودہ فن کار کے ذہن میں ایک
سوالیہ نشان بن کر چپک گیا ہے۔ آج ــــ غم بھی ہے، خلا بھی ہے اور تلاش بھی۔ لیکن
یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہو پایا کہ اس مثلث
میں ہمارا احساس آخر کیا چاہتا ہے؟ ہمارے ادب، زندگی اور سماج
کی پیاس کیا ہے۔ یہ چند ایسی
باتیں ہیں جن پر ہمارا غور کرنا بے حد ضروری ہے۔ کیا
ہم واقعی غیر یقینی حالات کا شکار ہیں؟
یا ـــــ یہ ایک نام نہاد کیفیت ہے جس کے پیچھے ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں
کیا اچھے ادب کی تخلیق کے لیے
ضروری ہے کہ جذبوں کی پیاس میں محرومی بھی کارفرما ہو اگر یہ محرومی ایک
حقیقت ہے تو پھر اس کا کیا حل
ہے اپنے آپ میں کڑھتے رہنا، خود کو فنا کر دینا، کیا ہم
اس طرح سماج کو بدل
سکتے ہیں، یہ ایک سوال ہے جو "آج" ہمارے ذہنوں
سے چپکا ہوا ہے۔
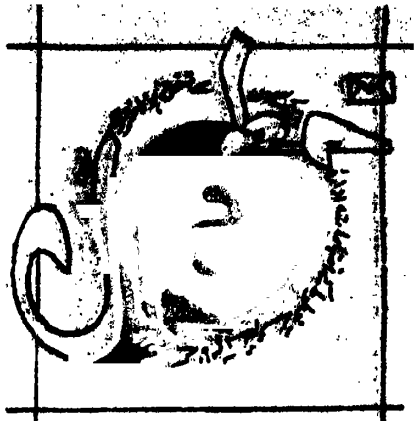
راشد آذر، حیدر آباد۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس دور میں، جب کہ خود اردو والے اپنے بچوں کو اردو کی بجائے ہندی کی تعلیم دلا رہے ہیں، اردو کا اتنا خوبصورت رسالہ نکال رہے ہیں۔ خوبصورت صرف دیکھنے میں نہیں بلکہ مضامین، نظموں اور غزلوں کے اعتبار سے بھی۔

رؤف خلش، حیدر آباد۔ پیکر بہت خوب جا رہا ہے۔ لگتا ہے بہت لمبی اڑان لینا چاہتے ہو۔ بھلا ہو کرشن چندر کا، جن کی کہانی "ذرا سی بنگڑی" نے تمہیں پابند کر دیا ہے کہ تم کم از کم آئندہ چند شمارے وقت پر نکالا کرو۔

مظفر حنفی، بھوپال۔ مئی کے شمارے میں مطبوعہ میری غزل کے ایک مصرعے میں غلطی رہ گئی تھی۔ مصرعہ یوں ہے ؎

آبلہ گردی کریں صحرا نوردی چھوڑ کر

وہاب دانش، رانچی۔ پیکر پہلے ہی کی طرح تر و تازہ ہے اور اپنے وجود کی جاذبیت منوانے پر مصر ہے۔ خدا کرے یہ اتنا خوبصورت رسالہ

کیف احمد صدیقی۔ سیتاپور۔ مئی کے شمارے میں میری نظم میں طباعت کی غلطیوں کی وجہ سے مفہوم خبط ہو کر رہ گیا ہے۔

● کیف احمد صدیقی کی یہ نظم آئندہ کسی شمارے میں دوبارہ شائع کر دی جائے گی۔

اختر یوسف۔ رانچی۔ میری نظم "دھنک" کمیں گھا پڑھ کر کافی لوگ ناراض ہوں گے کہ "دھنک" تانیث ہے لیکن میں نے اسے مذکر کیوں رکھا۔ ہندی قواعد کے مطابق یہ لفظ مذکر ہوتا ہے۔ لیکن اردو کے مطابق اگر میں اسے تانیث ہی رکھتا تو نظم میں ایک خاص موسیقی لہر شروع سے لے کر آخر تک قائم نہ رہ سکتی۔

تاج مہجور، حیدر آباد۔ کرشن چندر نے اپنی کہانی میں بہت بڑے مسائل کو سمیٹنے کی بہت اچھی کوشش کی ہے۔ یہ تو خیر پہلی قسط پڑھنے کے بعد کا تاثر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کہانی کے اختتام تک وہ اس انداز کو برقرار رکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ بہرحال پہلی قسط پڑھ کر اتنا تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ "دروازے کھول دو" میں انہوں نے جس موضوع کو چنا تھا اب اسی موضوع کو تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر میں تجربہ کر رہے ہیں۔ رؤف خلش، حکیم یوسف حسین خاں، غیاث متین کے ساتھ ساتھ ساجدہ اعظم کی تخلیقات بھی بے حد پسند آئیں۔

سلطانہ شمیم۔ اورنگ آباد۔ پیکر اس قدر ترقی کر جائے گا یقین نہیں آتا۔ اس ماہ کا پیکر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ہزاروں دعائیں پیکر کے ساتھ ہیں۔

شبنم قیوم۔ سری نگر۔ ایک طویل عرصے کے بعد "پیکر"

[illegible] افسانہ ذکر کے قابل ہے
[illegible] کامیاب نہیں ۔

شفیق حیدرآبادی ۔ بمبئی ۔ "پیکر" کی تخلیقات بہت معیاری و توجہ طلب ہیں۔ لیکن بعض شاعر زبان سے بڑا ناروا سلوک کرتے ہیں۔ نظموں کی بات تو چھوڑیے بعض غزلوں کے مصرعے بھی لفظوں اور بحروں کی شکست و ریخت سے محفوظ نہیں ہیں۔ کیا آپ اس کے اسباب کا پتا لگائیں گے

شکیل رضوی ۔ کٹک ۔ "پیکر" کا تازہ شمارہ ظاہری و معنوی دونوں لحاظ سے خوب ہے اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ ترتیب و تزئین آپ کی خوش سلیقگی اور ادبی بصیرت کی مظہر ہے۔

روشن آرا نسیم ۔ بھاگلپور ۔ آپ کی پالیسی سے نئے لکھنے والوں کو کافی اچھا سہارا ملے گا اور نئے لکھنے والے جوان اردو ادب کے لئے ہر طرح کی قربانی دیتے ہیں جوان پیکر کے لئے بھی بہت کچھ کرنے تیار ہو جائیں گے۔

علی ظہیر ۔ حیدرآباد ۔ معنوی اور صوری حیثیت سے آپ کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ علی الدین نوید، رؤف خلش، حکیم یوسف حسین خاں اور غیاث متین نے خاص طور پر متاثر کیا۔

خاطر حافظی ۔ لکھنؤ ۔ کرشن چندر کی طویل کہانی کے بعض حصے بڑے جاندار ہیں۔ دعوتِ غور و فکر دینے والے۔ نظموں میں حکیم یوسف حسین خاں۔ رؤف خلش احمد وصی۔ سید احمد شمیم اور اختر یوسف اور غزلوں میں مہدی بہتاب گنڈوی۔ علی الدین نوید، سلیم جہانگیر پسند آئے۔ مضمون "کیا جینا سارا ایک ہے؟" [illegible] ہے۔ ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے۔

حمید آرمعدی ۔ حیدرآباد ۔ واقعی پیکر خوب اس دور میں انفرادیت قائم رکھتے ہوئے اردو پرچہ نکالنا بڑا کٹھن کام ہے لیکن آپ کے عزم اور حوصلے سے توقع ہے کہ یہ پرچہ پابندی سے نکلتا رہے گا۔

اکبر سکندر پوری ۔ ہوڑہ ۔ ادبی رسالوں کے جو مسائل ہیں پیکر کو دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ اب تک بہت سارے رسائل دیکھنے میں آئے مگر جو بات پیکر میں ہے وہ کسی میں نہیں۔

خورشید نکہت ۔ پونا ۔ مجھے یقین ہے کہ پیکر بہت جلد صفِ اول کے رسالوں میں شمار کیا جائے گا۔ اس میں شائع ہونے والے تمام افسانے، نظمیں اور غزلیں بڑی دلچسپ ہیں۔

ڈی۔ کے۔ کنول ۔ بہری نگر ۔ سرورق اتنا دلکش اور جاذبِ نظر ہے کہ بس اسی سرورق نے میرا من موہ لیا۔ کرشن جی کی "دراسی نگری" کی پہلی قسط بہت پسند آئی۔ ●

خوش خبری

★ پچھلے دنوں نوجوان افسانہ نگار رفعت صدیقی ازدواجی زندگی سے منسلک ہو گئے۔

★ جواں سال شاعر غیاث متین کی شادی خانہ آبادی رؤف خلش کی ہمشیرہ کے ساتھ انجام پائی۔

★ ادارہ پیکر حیدرآباد کے ان دونوں ادیبوں کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

کرشن چندر

ذرا سی

بارش کا دن تھا۔ پہلے بڑے بڑے اولے پڑے پھر چھوٹے چھوٹے۔ آخر میں کنکریوں ایسے اولے گرنے لگے۔ پھر بارش آگئی اور بارش کے ساتھ دھند۔ اور بار کا کھتائی پس منظر بادلوں میں ڈھک گیا سو بھی بڑھ گئی تھی۔ اسی حساب سے ڈرنک کے آرڈر بڑھ گئے تھے۔

وہ لوگ جن اور لائم پی رہے تھے۔ یعنی کنول اور سوم ناتھ زتشی اور جولی۔ مائیکل صرف جن پی رہا تھا۔ اسے شراب میں میٹھاس یا کھٹاس پسند نہ تھی۔ جن سے ایک خاص طرح کی بیک سی آتی ہے۔ جو شال کے طور پر کنول اس بیک کو دور کرنے کے لئے خاص جن کے بجائے گملٹ زیادہ پسند کرتا ہے۔

وہ سرخ لیش لڑکی ایک کونے میں اپنی سکیچ بک کھولے

[illegible] حیدرآباد

کچھ سکیچ کر رہی تھی۔ یکایک وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور ہمارے ٹیبل پر آکے سیدھے جولی سے مخاطب ہو کے کہنے لگی۔

"میں انگرڈ ہوں۔ شاک ہوم میں رہتی ہوں۔"

جولی نے کہا: "میں جولی ہوں۔ جولی سکینہ۔ یہ میرے شوہر ہیں کنول سکینہ یہ سوم ناتھ زتشی۔ یہ مائیکل پارکنسن امریکی مصنف۔"

انگرڈ بولی۔ "میں تمہاری تصویر بنانا چاہتی ہوں۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو۔ تو میری ٹیبل پر آجاؤ۔"

جولی انگرڈ کے ساتھ اس کے ٹیبل پر چلی گئی۔ ان کے ٹیبل سے پرے اس امریکی کا ٹیبل تھا جس کے سنگ ناچنے سے جولی نے انکار کر دیا تھا۔ نیگرو لڑکی میگی ایشلی اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا اونی سویٹر پہن رکھا تھا۔ اور اس کے نیچے گہرے پیلے رنگ کا دھاری دار سکرٹ میگی کی ٹانگیں بلحد

دوسری قسط

سڈول تھیں۔ اور کسے ہوئے نیلے جمپر میں اس کی چھاتیوں کے ابھار بے حد نمایاں تھے۔ اور وہ جب گفتگو کرتے ہوئے اپنے سینے کو جھکاتی تھی تو اس کے سینے کی وادیاں گھاٹیوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔

مائیکل پارکنسن سوم ناتھ زتشی سے مخاطب ہو کر بولا۔
"یا مجھے ہورائزن میں آنا تھا میں نے تمہاری کہانی کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ اور کہانی بھی اچھی ہے مجھے معلوم نہیں تھا تم افسانے بھی لکھتے ہو۔ میں تمہیں صرف ایک وکیل سمجھتا تھا۔
"وکالت تو میرا پیشہ ہے۔" زتشی بولا۔" لیکن ادب میری پیاس ہے۔ در اصل میں ادیب بننا چاہتا ہوں۔"
"تو کیوں نہیں بنتے۔ ہمارے ملک میں ایک اچھے ادیب کی بڑی عزت اور قدر ہے۔"
"میں تو کیا۔" زتشی بولا۔" میں اپنی مادری زبان کشمیری ہی میں لکھتا ہوں۔ لیکن میرے افسانے اور ناول ترجمہ ہو کر ہندوستان کی دوسری زبانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور بہت داد پاتے ہیں۔"
"تب تو تم ایک اچھے اور مشہور ادیب ہو گئے۔"
"ہاں ایسا ہی سمجھا جاتا ہوں۔"
"تو پھر وکالت چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اپنی زندگی دو خانوں میں کیوں بانٹ رکھی ہے۔ وکالت چھوڑ دو۔ اپنی ساری زندگی ادب کے لئے وقف کر دو۔ جیسے میں نے کر رکھی ہے۔
"یہاں کے حالات دوسرے ہیں۔" زتشی نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر چند تانیے چپ رہنے کے بعد پوچھنے لگا۔ تمہیں ہارڈر اور رٹلیجن نے اس کتاب کے لئے کیا دیا ہے۔؟"
"ابتک پچاس ہزار ڈالر دے چکے ہیں۔" مائیکل بولا۔ دو سال سے میں ہندوستان میں ہوں۔ انہوں نے

مجھے کمیشن کیا ہے کہ میں بدلتی ہوئی ہندوستانی تہذیب
پر ایک تفصیلی کتاب لکھوں۔ اس کے علاوہ میں ایک
ناول بھی لکھ رہا ہوں۔"

"دونوں کتابیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں؟" زرتشی
نے پوچھا۔

"ہاں بھی اور نہیں بھی۔"

"یہ کیسا جواب ہے۔"

"صحیح جواب ہے۔ ناول تو میں لکھ ہی رہا ہوں۔
بدلتی ہوئی ہندی تہذیب کے نوٹس لے رہا ہوں۔ یہ
کتاب میں امریکہ جا کے لکھوں گا۔ ایک سال لگ [illegible]
لوں گا۔"

"اور ناول ---؟"

"ناول تو اس سال مکمل ہو جائے گا۔"

"ناول کا موضوع کیا ہے؟" کنول نے پوچھا۔

"ایک باپ ہے اپنی حقیقی بیٹی سے عشق کرتا ہے۔"

"کیا ایسا کرنا ممکن ہے۔" زرتشی نے حیرت سے پوچھا۔

پارکنسن نے کہا: "میں جب لندن کے ہاسپٹل میں
ڈاکٹر تھا۔ ایسے کئی کیس ہمارے ہاں آئے۔ اسقاط
کے لئے۔ لڑکیوں نے خود اقبال کیا۔"

"چھی چھی۔" زرتشی غصے سے بولا۔ "موضوع عجیب و غریب
ہے۔ گندہ بھی ہے ابنارمل کہنا چاہیئے۔"

"ادب میں نارمل بات کا مزا کیا ہے؟" مائیکل مسکرا کر بولا
"نیبوکوف نے گیارہ بارہ سال کی نابالغ لڑکی لولیتا کا
قصہ لکھا۔ دیکھو کتنا مقبول ہوا۔ لاکھوں کی تعداد میں
کتاب بک گئی۔ سیدھے سادے رومانس کو کون پسند
کرتا ہے۔ یہ رومانس تو ہر گلی کے نکڑ پر دکھائی دے

[illegible] جاتا ہے لڑکی کا [illegible]
[illegible] سیکس [illegible] ایک باپ [illegible]
کہ سوتیلی بیٹی کے عشق کی داستان لکھ ڈالی۔

"ہاں۔" کنول نے کہا: "تم شاید THE LIE کا ذکر
کر رہے ہو۔"

مائیکل نے اثبات میں سر ہلایا: "وہ قصہ بھی بہت مقبول
ہوا۔ مگر میرا ناول تو اس سے بھی زیادہ بک جائے گا۔
تمہیں معلوم ہے مجھے اس کا کتنا معاوضہ ملے گا؟"

زرتشی نے سر ہلایا: "نہیں!"

مائیکل بولا: "اس کے لائبریری ایڈیشن اور پاکٹ
بک ایڈیشن اور فلمی حقوق اور ٹیلی وژن کے حقوق سب
کی بابت ملا کر مجھے کل چالیس لاکھ روپیہ ملے گا۔"

"چالیس لاکھ --- ؟ ایک کتاب کے لئے۔"

"اور یہ کچھ نہیں ہے۔ میں دوسرے درجے کا ادیب
سمجھا جاتا ہوں۔ صف اول کے ادیبوں کو اس سے
دگنا بلکہ سہ گنا معاوضہ ملتا ہے۔ گور وڈال کو میں اپنی
ہی طرح کا ادیب سمجھتا ہوں۔ اسے اس کے ناول "مایا
میکرا برج" کے لئے اب تک ساٹھ لاکھ روپے سے
زیادہ معاوضہ مل چکا ہو گا میں سمجھتا ہوں۔

"حالانکہ دو سو صفحے سے کم کی کتاب ہے۔ اور اس
کا موضوع وہی ہے۔ جو عصمت چغتائی کے لحاف کا ہے"
زرتشی بولا۔ "اور اگر ایمان کی کہی جائے۔ تو عصمت
چغتائی کا افسانہ لحاف گور وڈال کے ناول پر بھاری
ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں۔ عصمت چغتائی کو اس کے
افسانے پر سو روپے بھی مشکل سے ملے ہوں گے۔"

"صرف سو روپے؟" مائیکل نے حیرت سے سر ہلایا۔

"پرسوں ان کا گھر بھی نیلام ہو گا۔" زتشی نے زرد ہو کر کہا۔ "کیونکہ جن زبانوں میں صحت نے لاف کا تحفہ آتی ہے انہیں زبانوں میں افسانوں پر معاوضہ دینے کی روایت ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ بس گزشتہ دس سال سے افسانوں پر معاوضہ ملنے لگا ہے۔ وہ بھی ہر رسالہ نہیں دے سکتا۔ صرف چند تجارتی رسالے جو نیم ادبی نیم فلمی ہوتے ہیں کسی قدر معاوضہ ادا کر سکتے ہیں ورنہ جہاں تک ادبی رسالوں کا تعلق ہے۔ اُن کا ہر ماہ جینا اور چھپتے جانا ہی ایک معجزہ ہے۔"

"پھر بھی زیادہ سے زیادہ معاوضہ کیا ملتا ہے۔"

"مجھے تو بیس روپے ایک افسانے کے ملتے ہیں بہت ہوا تو پچاس۔ انگریزی سے البتہ سو روپے کے قریب مل جاتے ہیں۔ کیونکہ انگریزی ادب اور صحافت کے معاوضے کا معیار دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ مگر میں جیسا کہ میں نے کہا دوسرے درجے کا ادیب ہوں۔ لیکن جن ادیبوں کا شمار صفِ اول میں ہوتا ہے۔ انہیں بھی ہندوستانی زبانوں سے ایک افسانے کے سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں ملتے۔ انگریزی میں سب سے زیادہ معاوضہ ایک آرٹیکل یا افسانے کا تین سو روپے ہیں۔ یہ گویا حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کے مترادف ہے۔"

"تم ایک سال میں کتنے افسانے لکھ لیتے ہو۔"

"مہینے میں ایک یا ڈیڑھ افسانے کا اوسط ہے۔ اس اعتبار سے مہینے میں افسانوں سے کچھ تر روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔"

"اور ناول۔"

"ناول آج کل ہمارے ہاں بہت مقبول ہو رہا ہے مگر مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کوئی ناول ابھری ایڈیشن میں پانچ ہزار سے زیادہ چھپ نہیں سکتا۔ عام طور پر ایک ہزار یا دو ہزار کا ایڈیشن نکلتا ہے۔ اور چار سال میں بکتا ہے۔ یعنی اگر بہت اچھا لکھا گیا ہو ورنہ سات آٹھ سال میں ایک ایڈیشن فروخت ہوتا ہے۔ اور اس پر بھی بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آج کل صفِ اول کے ادیب ادب سے لاکھوں روپے کما رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ادیب ادب سے جو کماتا ہے اس سے وہ اپنے بال بچے کا تو کیا اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا۔

"اجی اس سے تو ایک چڑیا کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا۔" مائیکل ہنس کر بولا۔ "ایک تو آپ لوگ اُس حالت میں ہیں جہاں ہم سو سال پہلے تھے۔"

"اس میں کیا تعجب ہے۔ زتشی بیزار ہو کے بولا۔ "اس لئے جو لوگ صرف ادب پر اکتفا کرتے ہیں۔ بالآخر بھوکے مرتے ہیں۔ بمبئی میں ایک ادیب تھا۔ نام نہ لوں گا۔ بے چارے کا انتقال ہو گیا۔ اس کے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہ تھی قبرستان میں رہتا تھا۔

نو... نو۔ مائیکل نے حیرت سے سر ہلایا۔

"یس یس۔" زتشی غصے سے بولا۔

"میں ایک اور ادیب کو جانتا ہوں۔ جو افسانے لکھ لکھ کر بھوک اور بے روزگاری سے اندھا ہو گیا۔ کبھی کبھی ہم لوگ اس کی مدد کر دیتے ہیں۔ مگر اب اس کی آنکھیں تو اس کو نہیں مل سکتیں۔ ابھی حال ہی میں ایک بہت اچھے شاعر کا کینسر سے انتقال ہو گیا۔ جی تو بہت

چاہتا تھا کہ اُسے اس کے علاج کے لئے یورپ یا امریکہ بھجوا دیں۔ تاکہ اس کا اچھا علاج ہو سکتا۔ مگر روپیہ کہاں سے لاتے۔"

کنول نے کہا: "زتشی یہ مت بھولو۔ کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے۔"

"میں کب کہتا ہوں۔ امیر ہے۔ لیکن پھر بھی اس ملک میں ڈاکٹر، وکیل، انجینئر سرکاری ملازم۔ کارخانے دار حتیٰ کہ کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کے لئے بھی ماہانہ روزی روٹی کا انتظام ہے۔ بونس ہے بھتہ ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ ہے پنشن ہے۔ ادیب کے لئے کیا ہے۔ فاقہ! اس پر کچھ سر پھرے لوگ اس ملک میں ایسے موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ادیبوں کو اپنے ادب کا معاوضہ روپے کی صورت میں وصول نہ کرنا چاہیئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کام کرنے والے انسان کو اس کی محنت کا صلہ ملتا ہے اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ مگر ادیب؟ اُسے تو ہوا پر جینا چاہیئے۔

زتشی نے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ آنکھیں بند کیں۔ ہونٹ بند کئے۔ پھر دوسرا گھونٹ لیا۔ آنکھیں کھولیں۔ ہونٹ کھولے اور بولا۔

"اسی لئے میں وکالت کرتا ہوں۔ اور فرصت کے اوقات میں ادبی شغل کرتا ہوں۔ اور جتنے بھی ہمارے ادیب ہیں اپنی روزی روٹی کے لئے ادب کے بجائے کوئی دوسرا دھندا اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ کوئی پروفیسر ہے۔ تو کوئی وکیل۔ کوئی ڈاکٹر ہے۔ تو کوئی انجینئر۔ کوئی سرکاری افسر ہے تو کوئی کسی فرم میں ملازم ہے۔ کوئی فلموں میں گانے لکھتا

۱۲۔ سکندر آباد

ہے یا ڈائیلاگ، بہرحال صرف ادب پر قناعت کر کے کوئی ادیب زندہ نہیں رہ سکتا۔ چاہے وہ صف اول کے ادیبوں میں سے پہلا ادیب ہی کیوں نہ ہو۔ ادب کے سہارے سرکاری ادیب زندہ رہ سکتے ہیں۔ جن کی کتابیں سکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہو سکتی ہیں۔

"ایسا نصابی ادب کیا ہو گا۔؟" مائیکل بولا۔

"اس گُڑ کی طرح میٹھا اور بے ضرر ہو گا۔ اور ہونا بھی چاہیئے۔ ورنہ نصاب میں شامل کیسے ہو سکے گا؟" زتشی طنزاً مسکرایا۔ "مگر جب تک ادب میں گہرائی شامل نہ ہو۔ دن رات اس پر محنت نہ کی جائے۔ ادیب جب تک صرف اس میں ڈوبا نہ رہے۔ ادب کو وہ عظمت کیسے حاصل ہو سکتی ہے جو مثال کے طور پر ٹالسٹائے کے "وار اینڈ پیس" کو حاصل ہے۔" ٹالسٹائے ایک کاؤنٹ تھا۔" زتشی بولا۔ "روپے کی اُسے پرواہ نہ تھی کئی برس اس نے "وار اینڈ پیس" لکھنے میں صرف کر دیئے سترہ دفعہ اس پر نظر ثانی کی۔ بالزاک کو بھی اتنے پیسے مل جاتے تھے رائلٹی سے کہ اس نے پیرس میں اپنی محبوبہ کے لئے ایک محل تعمیر کیا تھا۔ شولوخوف کو بھی لکھنے کے لئے مکمل فراغت نصیب ہے۔ ہمنگ وے کے پاس پانچ ہوائی جہاز تھے۔ ذاتی۔ اور ابھی ایک انگریز خاتون کو اس کے ناول کا معاوضہ ایک لاکھ پاؤنڈ ملا ہے۔ ذرا سوچئے ایک لاکھ پاؤنڈ۔ میں گزشتہ سات سال سے ایک اہم موضوع کو لئے بیٹھا ہوں۔ جس پر میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر اس ناول کو لکھنے کے لئے مجھے کم سے کم تین سال چاہیئے۔ تین سال بھی میں

میں اور کوئی کام نہ کروں۔ سوچتا ہوں اگر تین سال
ناول کو دیدوں۔ تو بلاشبہ وہ ایک شاہکار ہوگا۔ مگر
پھر سوچتا ہوں۔ ان تین سالوں میں اپنے بعد اپنے بیوی
بچوں کا پیٹ کیسے پالوں گا۔ اس لئے ہر روز کچہری جاتا
ہوں۔ اور جب کبھی فرصت ملتی ہے ایک آدھ افسانہ
گھسیٹ دیتا ہوں۔" زنتشی نے جام اُٹھایا۔ اور ایک
ہی جلے میں جام خالی کردیا اور گلاس کو میز پر زور سے
رکھ دیا۔

کنول نے کہا۔ "خفا ہونے کی بات تو اس قدر نہیں ہے
ہندوستانی کی بدلتی تہذیبی قدروں میں سے ایک
صورت حال یہ بھی ہے گو یہ کربناک ہے کہ ہمارے
بدلتے ہوئے سماج نے اپنے ادیب کی اہمیت اور
حیثیت کا احساس نہیں کیا ہے۔ لیکن سوچا جائے ابھی
تو ہم نوآبادیاتی نظام سے نکل کے آئے ہیں۔ ابھی نیا
معاشرہ بنا بھی نہیں ہے۔ انگریزوں کو کیا ضرورت تھی
کہ وہ ہندوستانی ادب کی ترقی اور ترویج کے لئے کوشش
کرتے۔ پھر ملک کے بہترین دماغوں کی کاوشیں آزادی
حاصل کرنے میں صرف ہوگئیں۔ آزادی کے بعد جو
سماج پیدا ہوا اس پر کارخانے والوں۔ زمین داروں
ٹھیکے داروں اور بیوپاٹ کوٹھے والوں کا قبضہ ہوگیا۔
ایسے ماحول میں ادب کیسے پنپ سکتا تھا؟" میں نہیں
مانتا۔" زنتشی نے کہا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے
اشاعتی" اور اخباری ادارے کا سالانہ منافع تو کروڑ
روپے ہے۔ کیا یہ لوگ اپنے ادیبوں کو اچھا معاوضہ
نہیں دے سکتے۔ دوسرے نمبر والا جو صحافتی ادارہ کہلاتا ہے
اس کی آمدنی چھ کروڑ ہے۔ اور تیسرے نمبر والے کا منافع
چار کروڑ ہے۔ ان لوگوں کے لئے اچھا معاوضہ ہرگز مشکل
نہیں ہے۔ کم سے کم اس حد تک تو دے سکتے ہیں جس
حد تک یوروپ کے چھوٹے ملک دیتے ہیں۔ مگر وہ دیں
گے نہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں ایک تصوری یہ بھی رائج
ہے۔ کہ ادیبوں کو اُن کی شایان شان معاوضہ نہیں
لینا چاہئے۔ بلکہ بالکل ہی نہیں دینا چاہئے۔ مگر یہی بات
ڈاکٹر۔ سائنس دان۔ انجینئر۔ اور دوسرے صداقی پیشے
والے انسانوں کے لئے روا نہیں رکھی جاتی۔ صرف ادیبوں
ہی کو فاقہ زدگی کی تلقین کیوں کی جاتی ہے۔

کنول بولا۔" میرے خیال میں ایک بیچ والا پیمانہ تو ہونا
چاہئے۔ معاوضے کے معیار کا۔ یعنی اوسط درجے کا۔
امریکہ والا معیار اگر بے حد بلند ہے۔ تو ہندوستانی
معیار بے حد پست ہے۔ معاوضے کا ایک ایسا معیار تو
ہونا ہی چاہئے۔ جس سے ایک عام ادیب بھی اوسط
درجے کی خوشحالی زندگی گزار سکے۔ ورنہ یہاں جو صورت
حال ہے۔ اس میں ایک خالص ادیب یعنی ایسا ادیب
کی آمدنی پھر یہ بھی سوچو کہ ہندوستان میں پڑھے لکھوں
کی تعداد کس قدر کم ہے۔ اور اُن میں کتنے ایسے لوگ
ہیں جو کتابیں خرید سکتے ہیں"۔

"یہ مت کہو" زنتشی نے بیزار ہو کے کہا۔" ہندوستان
کی آبادی بہت بڑی ہے۔ اس میں تیس فیصدی کے
قریب پڑھے لکھے ہیں۔ اور وہ لوگ کتابیں بھی خریدتے
ہیں۔ مگر اپنے ادیبوں کی نہیں۔ انگریزی زبان کی کتابیں
خریدتے ہیں۔ اور انگریزی ادیبوں کی۔ ابھی اُن کے ذہن
سے باہر کی غلامی کا جوا اترا نہیں ہے۔ ورنہ مجھے وکالت
کرنے کی ضرورت کیا تھی؟

مائیکل نے زتشی کے لئے ایک گلاس اور آرڈر کی تو زتشی
کہنے لگا "میں تو ایک معمولی سا ادیب ہوں۔ لیکن ایک
دفعہ میری ایک کہانی چیکوسلواکیا کی چیک زبان میں
چھپی تھی۔ انہوں نے مجھے اُس ایک کہانی کا ڈھائی
ہزار روپیہ بھیجا تھا۔ چیکوسلواکیہ کتنا چھوٹا سا ملک
ہے۔ کیا ہندوستان اس کے برابر بھی اپنے ادیبوں کو
معاوضہ نہیں دے سکتا؟ یہ جو ادب کے سوائے اور
کوئی کام نہیں کرتے ان کے لئے ریاست کیا کرتی
ہے؟"

"کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" امیش سکسینہ
بھی ہم سب لوگوں کی گفتگو میں حصہ لینے کی خاطر
آن پہنچے تھے۔ "ادیب ادب اور خالص ادب پیدا
کرتا ہے۔ ملک اور قوم کی خدمت کا کام کرتا ہے۔
اُسے اپنی تخلیق کا مول نہیں لگانا چاہئے۔ جناب
میں ایک دفعہ روس گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات مشہور
روسی ادیب بورس پولی وائی سے ہوئی۔ بورس پولی وائی
کو تو آپ جانتے ہوں گے؟" امیش سکسینہ نے مائیکل
کی طرف دیکھ کر استفسار کیا۔

"ہاں" مائیکل بولا "ذاتی تعارف تو نہیں ہے۔ لیکن
میں نے اس کی کتاب "TH STORY OF A REAL
MAN" پڑھی ہے۔ اچھی کتاب ہے کچھ کچھ جیک لنڈن
کا رنگ جھلکتا ہے۔"

"ہاں، بورس پولی وائی" میں نے اس سے پوچھا "میں
آپ کی تحریر کا عاشق ہوں۔ لیکن THE STORY
OF A REAL MAN. کے بعد ایک عرصے سے
آپ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔" وہ بولا۔

۱۴ بیگم حیدرآباد

"اس کتاب کے اب تک اٹھارہ ایڈیشن چھپ چکے
ہیں اور آمدنی کا یہ حال ہے کہ اب تک صرف
دو ایڈیشنوں کی رائلٹی ختم کر سکا ہوں۔ آخر آدمی
کتنا کھا پی سکتا ہے؟"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔" مسٹر تاتھ زتشی بولا۔

"اسی لئے میں کہتا ہوں۔" امیش بولا "کہ ادیبوں کو معاوضہ
ضرور ملنا چاہئے۔ اور اچھا بھی ملنا چاہئے۔ لیکن اتنا
بھی نہیں جتنا کہ بورس پولی وائی کو ملتا ہے کہ اسے
لکھنے کے لئے تحریک بھی نہ ہو۔"

"یوں نہ کہو" مائیکل بولا "اس نے اس کے بعد بھی
دو کتابیں لکھی ہیں۔ گو اُن میں وہ زور نہیں ہے۔ جو
اس کی پہلی کتاب میں ہے۔ پھر بھی شدت احساس کی کمی
نہیں۔ اور فنی قدروں پر بھی پوری اترتی ہیں۔ اسے جہاں
تک خرچے کا تعلق ہے۔ ہمارے LAS VEGAS میں
آ جائے۔ ایک ہی رات میں اٹھارہ ایڈیشنوں کی
آمدنی نہ خرچ کرا دیں تو ہمارا ذمہ۔"

سب ہنسنے لگے۔ زتشی بولا "کیا کہا جائے ——
LAS VEGES ایسے عظیم الشان جوا خانے اور رنڈیوں کے
کیبرے روس میں نہیں ہوتے۔"

⁂ ⁂ ⁂

انگریزی بولی سے باتیں بھی کرتی جاتی تھی اور اس کی تصویر
بھی بناتی جا رہی تھی کہہ رہی تھی۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو کنول سے شادی کر لی۔"

"کس طرح سے اچھا کیا۔"

میرا مطلب ہے۔ عورت کو جلد شادی کر لینی چاہئے
عملی معاملات میں کچھ پرانے خیال کی لڑکی ہوں۔ میرا
خیال ہے کہ عورت کی دلکشی اور حسن کے چند ہی سال
ہوتے ہیں۔ پھر وہ جلدی مرجھانے لگتی ہے۔"

جولی بولی "لیکن یہی بات مرد کی جوانی کے بارے میں
بھی کہی جا سکتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" انگرڈ بولی۔ "مرد کی جنسی تخلیق کی
مدت عورت سے دراز ہوتی ہے۔ تقریباً دگنی۔ وہ
بڑھاپے میں بھی بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ عورت نہیں کر سکتی
عورت کو فطرت نے پھول کی طرح بنایا ہے۔ اُسے
اگر شادی کرنی ہے تو جلد کر لینی چاہئے۔ ورنہ کیریر کو
اپنانا چاہئے۔"

"تمہاری شادی ہو چکی ہے؟" جولی نے پوچھا۔

"نہیں۔" انگرڈ بولی۔ "ہونے والی تھی۔ اس سے
ایک بچہ بھی ہوا۔ لیکن بچہ تولد ہونے کے بعد میرا محبوب
نیویارک بھاگ گیا۔"

"کہاں ہے وہ آجکل؟"

"گرین ویچ گاؤں میں۔ وہ پاپ آرٹسٹ ہے۔ سنا ہے
وہاں کسی لڑکی کے ساتھ ہے جو حاملہ ہو چکی ہے۔"

"تم نے اس کا پیچھا کیا ہوتا۔"

"میری غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ پھر وہ دوسری لڑکی ---"

"لڑکیاں تو مردوں کی زندگی میں آتی رہتی ہیں۔ مرد کو
تو شادی کے بندھن سے باندھ کے رکھنا پڑتا ہے۔"
جولی بولی۔

"کبھی کبھی یہ رسی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔" انگرڈ بولی۔
"جب اس کا دل ہی مجھ سے ہٹ گیا تو ---" وہ چپ
ہو گئی۔

بہت دیر تک دونوں چپ رہیں۔ پھر جولی نے پوچھا
"کیا تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو؟"

"ہاں۔" انگرڈ بے بسی سے بولی۔ "میرا باپ امیر آدمی
ہے۔ میں ملکوں ملکوں گھوم رہی ہوں۔ بہت سے دوست
بھی بنا ڈالے۔ اس عرصہ میں کئی مردوں کے ساتھ سو
بھی چکی ہوں۔ مگر جانے کیا بات ہے۔ جو بات اس
میں تھی وہ کسی میں نہیں۔ دوسرے مرد کی باہوں میں بھی
مجھے اس کی باہیں یاد آتی ہیں۔ یہ ملک ملک گھومنا
دراصل ایک طریقہ ہے اسے بھلانے کا۔ مگر کچھ زیادہ
کامیاب نہیں رہا۔"

"تو اس کے پاس چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

"وہ کیوں نہیں آجاتا میرے پاس۔ کبھی کبھی رات کی
تنہائی میں مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میرے دل کی آواز
اس تک پہنچ رہی ہے۔ کیا تم ٹیلی پیتھی میں یقین رکھتی ہو۔
میں رکھتی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے۔ جیسے میری آواز
اُس تک پہنچ رہی ہے۔ ایک دن وہ میرے پاس
لوٹ آئے گا۔"

"کیوں آئے گا وہ۔" جولی بولی۔ "جب تک اُسے نت
نئی لڑکیاں ملتی رہیں گی۔ وہ کیوں آئے گا۔ مرد ورائٹی
کا بھوکا ہوتا ہے۔"

"اور عورت؟"

"عورت؟ --- عورت ایک بچے کی یا شاید ایک درجن
بچوں کی۔ اس بارے میں وہ مجبور ہے۔ شاید فطرت
نے اسے ایسا ہی بنایا ہے۔"

"تمہارے بچہ کیوں نہیں ہوا؟" انگرڈ نے پوچھا۔

"ہو گا بھی نہیں۔" جولی نے سر ہلا کے کہا۔
"کیا تم چاہتی نہیں ہو کہ ..."
"چاہتی تو ہوں، مگر ڈاکٹروں نے کہا ہے۔ نہیں ہو سکتا"
وہ چپ ہو گئی۔ کمال سکون کے ساتھ اس نے بات کہہ دی تھی۔
"مگر آج کل کی عورت بھی تو ویرائٹی چاہتی ہے۔"
"آج کل کیا ہر ایک کی عورت کے دل میں بھی چاہ ہوتی ہے۔ مگر اُسے موقع نہیں ملا۔ موقع ملتے ہی۔"
وہ دونوں ہنسنے لگیں۔
جولی بولی: "تمہارے خیال میں عصمت، عفت، پاکبازی کا تصور جھوٹا ہے؟"
"جھوٹا تو نہیں ہے ..... کروڑوں عورتیں اس میں یقین رکھتی ہیں ان میں سے کتنی یہ یقین رکھنے پر مجبور ہیں۔ کتنی ایسی ہیں جو واقعی سچے دل سے؟ میرے خیال میں اُن کی تعداد بہت کم ہو گی۔"
"تمہارا کیا خیال ہے؟"
"میں ٹائم تھیوری میں یقین رکھتی ہوں۔" انگرڈ بولی۔ "اگر میرا محبوب پانچ سال تک میرے ساتھ رہتا تو اس کے بعد میں اس سے اُوب جاتی۔"
"پانچ سال کیوں؟"
"مجھے ایک سویڈش ڈاکٹر نے بتایا تھا۔ کہ شادی شدہ مرد اور عورت کے درمیان چاہت کی لہر دراصل دو متضاد برقی لہروں کا سنگم ہے۔ جس سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ کشش پانچ سال تک قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد یہ کشش کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی دونوں متضاد برقی لہریں ایک دوسرے کو نیوٹرل کر دیتی ہیں۔"
"لیکن اس کے بعد بھی لاکھوں کروڑوں شادی شدہ جوڑے ایسے ہیں جو مسرت آمیز ازدواجی زندگی گزارتے ہیں۔"
"وہ ایک طرح کی منافقت ہوتی ہے۔ حالات کے ساتھ بچوں کی وجہ سے۔ مالی مجبوریاں۔ ایک طرح کی عادت۔ سماج کا ڈر۔ مذہب کا خوف۔ بہت سی باتیں اس بندھن کو مضبوط رکھتی ہیں۔ مگر وہ برقی لہر پانچ سال کے بعد غائب ہو جاتی ہے۔"
"تو پھر تمہیں گلہ کیا ہے اپنے محبوب سے؟"
"یہی کہ وہ میرے ساتھ پانچ سال تک تو رہتا؟"
"ممکن ہے اس کی برقی لہر تمہارے ملنے سے پہلے سال ہی میں نیوٹرل ہو چکی ہو۔"
"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔"
"پھر محبت کا کیا مطلب ہے؟ محض ایک برقی لہر؟"
"مجھے نہیں معلوم!" انگرڈ نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔
جولی نے پوچھا: "تمہاری اس سیاحت کے دوران میں جیسا کہ تم نے کہا کئی مرد دوست بنائے۔ کیا تمہیں وہی برقی لے محسوس ہوتی تھی۔"
"ہاں۔ مگر اس شدت سے نہیں۔ کہیں پر کوئی خلاء کا احساس رہا۔"
جولی نے کہا: "وہی خلاء کا احساس محبت کے خلاء کا احساس، شاید ہو سکتا ہے۔" انگرڈ بولی: "کبھی کبھی میں اس کے بعد روئی بھی ہوں۔"
جولی نے ہمدردی سے انگرڈ کے ہات پر ہات رکھ دیا

دونوں دیر تک چپ رہیں۔ انگرڈ نے سگریٹ کو بجھا کر چھوڑ دیا تھا۔

جولی بولی: "شاید یہ کھو جانے کی حس ہو جو تمہیں اداس کر دیتی ہے۔ شاید ملکیت کی حس سے مشابہ ہو۔ مجھے دیکھو۔ جب تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے بچہ نہیں ہوگا۔ مجھے بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے ہمیشہ انہیں ایک طرح کی پریشانی سے تعبیر کیا۔ لیکن جب سے معلوم ہوا ہے۔ کہ میرے بچہ نہیں ہوگا۔ مجھے بچے اچھے محسوس ہونے لگے ہیں۔ بڑی حسرت سے دوسروں کے بچوں کو دیکھتی ہوں۔ کبھی کبھی اُن سے پیار بھی کر لیتی ہوں۔ اُن کے لئے سوئٹر بنا دیتی ہوں۔"

"کیا یہ سوئٹر بھی کسی بچے کے لئے ہے؟"

"یہ سب سے بڑے بچے کے لئے ہے۔ اپنے شوہر کنول کے لئے۔ کبھی کبھی میں سوچ لیتی ہوں۔ کہ کنول بھی ایک بچہ ہے۔ دراصل جو چیز انسان سے کھو جاتی ہے۔ یا اس کے ملنے کا امکان نہیں رہتا۔ اس کے لئے وہ اس قدر پریشان ہوتا ہے۔ اور اس پریشانی کو محبت کا نام دیتا ہے۔ ممکن ہے اگر تمہارا محبوب تمہارے پاس رہتا۔ تو اب تک تم اُس سے اوب چکی ہوتیں۔"

"ہو سکتا ہے۔" انگرڈ ہنس کر بولی۔ "ممکن ہے اس کے چلے جانے سے کہیں میرے دل میں بے عزتی کا احساس رہا ہو۔ اور اس کو میں نے محبت سے تعبیر کر لیا ہو۔ اس کا علاج ایک ہی ہے۔"

"کیا؟"

"گروپ میرج ہونی چاہئے۔" انگرڈ بولی۔ "ہمارے سویڈن میں آجکل گروپ میرج کو بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں آپس میں ایک گروپ کی طرح رہتے ہیں۔ کوئی کسی ایک کی بیوی نہیں، کوئی کسی ایک کا خاوند نہیں۔"

"یہ تو بہت پرانا طریقہ ہے۔" جولی بولی۔ "آج بھی کئی وحشی قبائیلیوں میں یہ طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ مگر میں اسے دقیانوسی سمجھتی ہوں۔ گروپ کی شادی میں وہ INTIMACY نہیں ہو سکتی جو دو کے درمیان پیدا ہو سکتی ہے۔ جب جنسی عمل دو تک محدود ہو جاتا ہے تو اس میں ایک عجیب طرح کی شدت پیدا ہوتی ہے ایک دوسرے سے پیار کرتے وقت دو ہونٹوں کا مخصوص خم۔ ماتھے کی رگ۔ کان کی لو کی مخصوص شکل تک پیاری معلوم ہوتی ہے۔ یہ شدت میں سمجھتی ہوں گروپ میرج میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے"۔

"سوال یہ ہے۔" انگرڈ بولی۔ "کیا اچھا ہے۔ INTI-MACY یا DIFFUSION — گروپ میرج سے جو ڈی فیوژن پیدا ہوتا ہے۔ اس میں بھی کئی اچھائیاں ہیں۔ بچے گروپ کی ذمے داری ہوتے ہیں۔ مالی حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ سیکس کی حس ملکیت غائب ہو جاتی ہے۔"

"پھر محبت بھی تو باقی نہ رہتی ہوگی۔" جولی بولی۔

"ہاں۔ تم کسی گروپ سے محبت نہیں کر سکتیں۔ محبت کے لئے کسی ایک اور صرف کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔"

"صرف ایک کا ایک وقت میں! جولی۔"

"اور وقت بدلنے کے ساتھ۔"

"وقت اور حالات اور شدت احساس بدلنے کے

ساتھ جذبات بدل سکتا ہے۔ ایسے میں سوچ سکتی ہوں۔" جولی بولی۔ "یہ مرد کے لئے بھی ممکن ہے اور عورت کے لئے بھی۔"

"مرد کے لئے زیادہ۔" انگرڈ بولی۔ "عورت کے لئے کم۔ اُسے فطرت نے ٹھہرنے کے لئے بنایا ہے۔ مرد کو گھومنے کے لئے۔ عورت کو گھر بسانے کے لئے۔ بچوں کی لمبا سال پرورش کرنے کے لئے۔ اس کے لئے ایک جگہ ٹھہرنا۔ ایک پر قناعت کر لینا مرد کے مقابلے میں آسان ہے! شاید میں اسی کو محبت سمجھ بیٹھی ہوں۔"

"نہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنسی اعتبار سے تمہارا محبوب دوسرے ان مردوں کے مقابلے میں زیادہ پرکشش رہا ہو جو تمہاری زندگی میں آئے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔" انگرڈ بولی۔

"ہو سکتا ہے۔ جب کوئی اس سے بہتر مرد تمہاری زندگی میں آئے تم اُسے بھول جاؤ۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"کیا میں آ سکتا ہوں۔؟"

دونوں عورتوں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ڈیوڈ گوڈز جائیلڈ تھا میگی کا منگیتر۔

وہ قریب آ کے مودبانہ جھکا۔ مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب طنزیہ تبسم تھا۔ اس نے جولی کو مخاطب کر کے کہا۔ "جب آپ نے میرے ساتھ ڈانس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لنگڑی ہیں۔ اور اس لئے آپ ڈانس نہیں کر سکتیں میں غصے میں تھا۔ اور اس لئے آپ کو لنگڑا کر چلتے دیکھ کر میں ہنسا تھا۔ مگر بعد میں میگی نے مجھے سمجھایا۔ تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کہ مجھے آپ کے غصے پر ہنسنے کا کوئی حق نہ تھا۔ کوئی بھی لنگڑی عورت قابل معافی ہے۔"

اس نے معافی مانگتے ہوئے اتنی بار جولی کو لنگڑی کہا۔ کہ جولی کو غصہ آ گیا۔ اُسے یقین ہو گیا۔ کہ وہ معافی کے پردے میں اس پر چوٹ کر رہا تھا۔ اور پھر اس کے لنگ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ جولی کچھ بولی نہیں۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور جب وہ ایک دفعہ پھر مودبانہ جھک کر واپس چلا گیا۔ تو انگرڈ نے غصے سے کہا۔

"بدتمیز آدمی ہے۔ تم نے اسے چانٹا دیا ہوتا۔"

جولی کے سینے کا زیر و بم کہے دیتا تھا۔ کہ وہ اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔ مگر ہمت کر کے وہ اپنے آنسو پی گئی۔

رات کو سوتے وقت جولی نے کنول کے گلے میں بانہیں ڈال کے کہا۔

"میری ایک بات پوری کرو گے؟"

"کہو۔۔"

"پہلے وعدہ کرو۔"

"معلوم ہو جائے تو وعدہ کروں۔"

"نہیں پہلے وعدہ کرنا ہو گا۔"

"مجھے ایک لمبا بوسہ دو۔ تو بتاؤں۔"

جولی نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ملا دیئے اور زبان سے زبان۔ اور زور سے اس کا نازک بدن کنول کے بدن سے لپٹ گیا۔ یہ بوسہ صرف

[illegible] سنا عرصے
پانی تک ہو گیا۔ [illegible] ساحل پہ پانی پھیلے اور
دونوں شراب سے بھر جائیں۔ اور ساتھ ساتھ لگے
ملے [illegible] کے پیوند [illegible] ایسا ہو کہ [illegible] ہی شاخوں
کی ڈالیاں ایک دوسرے سے بندھی ہوئی۔ [illegible]
کی شاخ ایک دوسرے پر ڈال دیں۔ اور یہ معلوم کرنا
مشکل ہو جائے کہ یہ پتہ کس شاخ کا ہے اور یہ شاخ کس پیڑ
کی ہے۔ اور وقت کا بھیگتا ہوا نرم نرم جوبن [illegible]
سے آیا ہے؟

یکایک وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر ان
ہونٹوں کے چاروں طرف گونج رہے تھے۔ اور ان کے
بدن لرزتے ہوئے جیسے بھیگ چکے تھے۔ ذرا دیر
دونوں بے سدھ پڑے رہے۔ پھر جولی بولی۔

"اور اب؟"

"ہاں اب؟" کنول نے پوچھا۔

جولی نے اپنا سر جھٹک کر جیسے ان لمحوں کو اپنے
سے دور کرنا چاہا۔ پھر بولی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم میگی اشیلے سے محبت کرو۔"

کنول ایک دم چونک گیا۔ چند لمحے حیرت سے جولی کی
طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب صاف ہے۔ میں ڈیوڈ گوڈز چائیلڈ کو زک
دینا چاہتی ہوں۔ اور زک دینے کے لئے اس سے
بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہے کہ میگی تمہارے جال میں
پھنس جائے۔ میں کوئی بہت بڑی محبت تھوڑی چاہتی
ہوں۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ تم میگی سے التفات ظاہر
کرو۔ وہ تمہاری طرف مائل ہوتی دکھائی دے۔ تو
اس ڈیوڈ گوڈز چائیلڈ کو جو تکلیف پہنچے گی اس
سے مجھے بڑی راحت ملے گی۔"

"مگر تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟"

"کیونکہ اس نے آج پھر مجھے لنگڑی کہا۔ اور بظاہر
معافی مانگتے ہوئے تین چار بار لنگڑی کہا۔ میں اسے
چانٹا مار سکتی تھی۔ لیکن میں اُسے اس سے بھی زیادہ
اذیت پہنچانا چاہتی ہوں۔"

"تم مجھے بتاؤ میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

"اُس کی پٹائی میں مجھے اتنا مزا نہیں آئے گا۔ جو اس
کی منگیتر کو دوسرے کے بازوؤں میں دیکھ کر ——
جس طرح سے وہ تڑپے گا اس سے میرا دل ٹھنڈا
ہوگا۔"

"یہ اچھی بات نہیں۔" کنول بولا۔ "بعض اوقات مذاق
مذاق میں جو بات شروع ہوتی ہے۔ وہ کبھی اس قدر
سنجیدہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم محبت کی ایکٹنگ کرتے کرتے
کہیں سچ مچ میگی سے محبت نہ کرنے لگو؟"

"نہیں۔" کنول نے کہا۔ "مجھے اس کے ساتھ سونا برا نہیں
لگے گا۔ لیکن محبت نہیں کر سکوں گا۔"

"مگر میگی سے الفت جتانے کے بعد کہیں اگر میگی
سچ مچ تم سے ——"

"تو اور بھی اچھا ہوگا!" جولی مسکرا کر بولی۔ "اس سے
ڈیوڈ اور جلے گا۔ اور میں اس حرامی کو جلا کر خاک
کر دینا چاہتی ہوں۔"

"مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔" کنول نے کہا۔ "کہ میگی

میرے التفات کا جواب التفات سے نہ دے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" جولی بولی۔

"تمہیں کیسے یقین ہے؟"

"اس لئے کہ میں نے اس کی نگاہیں پڑھ لی ہیں۔ جس وقت تم اس کے سنگ ناچ رہے تھے۔ جس طرح تمہاری بانہوں میں گھل گئی تھی۔ جس طرح وہ تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ رہی تھی۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ غلط ہو۔" کنول نے کہا۔

جولی بولی: "ایسے معاملوں میں عورت غلطی نہیں کرتی۔ تم ہاں کردو۔ کہو۔ ہاں۔"

"ہاں۔" کنول نے دوبارہ اس کے ہونٹ چوم کر کہا۔

"اور ایک بار پھر ہاں۔ تمہیں خوش کرنے کے لئے تو میں دنیا بھر کی حسین عورتوں سے محبت کرسکتا ہوں۔"

"مگر یہ سب ہنسی مذاق ہوگا۔" جولی نے تہدیدی انداز میں کہا۔ سنجیدگی کے ساتھ مگر مکمل ہوش کے ساتھ...

جولی نے کنول کا کان کھینچ کر کہا: "اگر ایسا تم نے کیا —

تو —"

"تو کیا؟"

"گلا گھونٹ ڈالوں گی!"

کنول ہنسنے لگا..... پھر بولا: "میڈم گھبرائیے نہیں کل ہی سے کام پر لگ جاتا ہوں۔" ■■

تیسری اور آخری قسط
اگلے شمارے میں ملاحظہ کیجئے

کبھی سوچتا ہوں شرارت میں بچپن سے بدنام تھا میں
کبھی سوچتا ہوں جوانی میں مسجودِ خوباں رہا ہوں
مگر بات کیا ہے
کہ اب میں نہ بدنام ہوں اور نہ مسجودِ خوباں
نہ اب انگلیاں اٹھ رہی ہیں کسی کی
نہ خوش پوش، گل رنگ
لچکیلی شاخوں پہ کھلتے ہوئے پھول جیسی
جواں لڑکیاں میری جانب
نگاہیں اٹھاتی ہیں
نہ مسکرا کے مجھے دیکھتی ہیں
مگر آج بھی نوجوانوں کی محفل میں ہے مانگ میری
مرے تجربے' میری ہمدردیاں اور مرے قہقہے
مرے جسم کی یہ تپش آج بھی
نوجواں اپنے دامن میں بھر بھر کے خوش ہو رہے ہیں

پہیلی

راشد آذر

'تمنا' راج بھون روڈ سوماجی گوڑہ۔ حیدرآباد۔۴

تجھ جیسا کی کم سنی بہت ہے
دو روز کی زندگی بہت ہے

تجھ ایسے حبیب باوفا کی
مل جائے تو دوستی بہت ہے

آہات کریں، گئے دنوں کی
ہنس لینے کو رات ابھی بہت ہے

اے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھنے والے
احساس کی تشنگی بہت ہے

اتنا بھی کسے نصیب ہوگا
چاہا ہے تجھے یہی بہت ہے

ہم تیرہ نصیب ہیں تو کیا ہے
اُمید کی روشنی بہت ہے

اک شہر بھی کم نہیں جہاں میں
اک شہر میں اک گلی بہت ہے

میدانِ جدیدیت میں یارو
سمجھو تو اک اشک بھی بہت ہے

بمل کرشن اشک
شعبۂ انگریزی۔ پنجاب یونیورسٹی۔
پوسٹ گریجویٹ ریجنل سنٹر۔ روہتک

غزلیں

ارشد صدیقی
کوشش کدہ تورانی مسجد روڈ۔ بھوپال

نقشِ شب ہوتے کیا رو خون ارماں دیکھئے
تم گر کہتے تو روشن مشعلِ جاں دیکھئے

جب مقدر ہی جنوں ٹھہرا تو پھر اہلِ جنوں
رقص کرتے یا درِ دیوارِ زنداں دیکھئے

زخم خوردہ پھر رہے تھے سب یہی احساس تھا
چاک کر کے آپ کس کس کا گریباں دیکھئے

اہلِ وحشت تو بچا بھی لے گئے دامن کی
رہ گئے اہلِ خرد سے گریباں دیکھئے

نکہتِ گل ایک مرکز پر ٹھہرتی ہی نہ تھی
اہلِ گلشن کس طرح نبضِ بہاراں دیکھئے

میرے غم کی تابناکی پر ہے جن کو اعتراض
تو وہ پلکوں پر کبھی کر کے چراغاں دیکھئے

ہاں ہمیں ہیں موردِ الزام لیکن دوستو
کب تک انسانیت کا رقصِ عریاں دیکھئے

آپ کیسے چارہ گر ہیں؟ آپ کا تو فرض تھا
زخم کا مرہم لگانے سے پہلے نمکداں دیکھئے

باغبانوں کی یہ خواہش تھی سرِ بازار کہ ہم
فصلِ گل کے ختم پر عنوانِ بہاراں دیکھئے

۲۲ پیکر حیدرآباد

ایک لمحہ
ایک دن
اور اک صدی میں
فرق کیا ہے
چند سانسوں کی مسافت کے سوا
جسم کے جادہ کو
آخر ٹوٹنا ہے
دیر کیا
اور جلد کیا
سوچ لو
ہنس کے سمجھوتہ کرو . . . !

غزل

ٹوٹے ہوئے ہیں اک عالم سے کتنے ہی بیچارے لوگ
کہنے کو تو ایک جان ہیں اک قالب میں سارے لوگ

لگتا ہے اس شہر کا جیسے چپہ چپہ ان کا ہے
یوں فٹ پاتھ پہ سوتے ہیں ٹھاٹ سے پاؤں پسارے لوگ

آئینے میں اپنا چہرہ دیکھیں تو پہچان نہ پائیں
جانے کیسے کھوج رہے ہیں پھر بھی چاند ستارے لوگ

نسلوں کی بھٹی میں پگھلے رنگوں کے شعلوں میں جلے
یہ دکھ درد کے ملبے انساں یہ حالات کے مارے لوگ

وقت کی جلتی دھوپ میں ان کے دل کملا جاتے ہونگے
ورنہ کیوں پتھر بن جاتے اتنے پیارے پیارے لوگ

تاج مہجور
20-2-522 سرائے بجاپیر
حیدرآباد ـ ۲

جغرافیہ تو بگڑا ہی تھا، انگریزوں کے جانے کے بعد ہم نے اپنی تاریخ بھی بگاڑ لی ہے

دو سال پہلے بمبئی میں ہندی مزاح نگاروں کا ایک اجتماع منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع میں مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ چوپاٹی سے قریب ایک مقام پر سارے مزاح نگار خوش گپی بات چیت کے لئے جمع تھے۔ کچھ تاجر قسم کے اصحاب بھی وہاں موجود تھے بلکہ وہی میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مزاح نگاروں کی بڑی آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ میں اور ہندی کے مشہور مزاح نگار شرد جوشی اس محفل کے ایک کونے میں ملنگوں کی طرح بیٹھے باتیں کم کر رہے تھے، قہقہے زیادہ لگا رہے تھے کہ اچانک کسی نے میرا تعارف کا تعارف کروایا گیا ہے وہ آڑھتوں کا بیوپار کرتے ہیں یا کسی تجارتی کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ مگر جب محفل میں بات چیت شروع ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تاجر صاحب بڑی ذہانت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور بات بات پر برجستہ ہوئے فقرے کس رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر اس ملک کے سارے تاجر اتنے ذہین اور باشعور ہوں تو ملک میں سوشلزم کا آنا یقینی ہے۔ میں ابھی سوشلزم کے مستقبل سے مطمئن ہونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کملیشور کسی صاحب کے ساتھ چلے گئے۔ میں نے اپنے

کملیشور سے مجتبیٰ حسین کی بات چیت

ناکہانی بھی ایک کہانی ہے

ایک صاحب سے کروایا کہ ان سے ملئے یہ کملیشور ہیں۔ میں نے اپنے آدھے قہقہے کو روک کر ان سے مصافحہ کیا، انہیں یہ اطلاع دی کہ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور پھر بقیہ آدھا قہقہہ لگا کر شرد جوشی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کملیشور اس محفل میں نہ صرف یہ کہ "تاجر" قسم کے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے بلکہ انہوں نے لباس بھی کافی "تاجرانہ" پہن رکھا تھا، لہٰذا میں یہ کیسے جان سکتا تھا کہ یہ وہی کملیشور ہیں جو ہندی کے چوٹی کے افسانہ نگار مانے جاتے ہیں۔ جنہوں نے کئی معرکتہ الآرا ناول لکھے ہیں اور جو "ساریکا" جیسے معیاری رسالہ کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے تو یہی سمجھا تھا کہ جن کملیشور صاحب میزبان سے پوچھا "یہ سیٹھ جی بڑی ذہین باتیں کر رہے تھے آخر کس کمپنی کے مالک ہیں۔" میرے میزبان نے کہا۔ "ارے صاحب! آپ تو غضب کرتے ہیں، یہ کملیشور ہیں۔ کملیشور۔ ساریکا والے۔ ہندی کے مہان لیکھک آپ انہیں نہیں جانتے؟"

میں نے کہا "میں کہانی والے کملیشور کو جانتا ہوں لیکن آپ نے پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ یہ وہی کملیشور ہیں جو تاجروں کا کاروبار نہیں بلکہ الفاظ کا کاروبار کرتے ہیں" کملیشور نکل کر جا چکے تھے اور میں صرف [illegible] تھا میں یہی سوچتا رہا کہ انہوں نے نہ جانے میرے بارے

میں کیا ملنے تاثر کی ہوگی کیوں کہ میں نے ان کے ساتھ
واقعی بڑی بے نیازی برتی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں
نے کوئی سکھی کمائی ہو۔ دو سال سے میں اس سکھی کو کھونا
چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہ ملا۔ گذشتہ دنوں تلگو ادیبوں
کی کل ہند کانفرنس میں کملیشور مہمانِ خصوصی کی حیثیت
سے حیدرآباد بلائے گئے تو مجھے مناسب موقع ہاتھ آیا
میں اس ارادے سے کملیشور کے پاس گیا تھا کہ چند منٹ
اُن سے ملوں گا اور زندگی میں کبھی انہیں "ناجز" سمجھنے کی
معافی مانگ لوں گا۔ مگر یہ ملاقات اتنی طویل اور دلچسپ
رہی کہ کملیشور نے اپنے سارے پروگرام منسوخ کر دیئے
اس گفتگو میں جو "ہوٹل ہردوار" کے کمرے سے نکل کر

پہنچا۔ "ہوٹل ہردوار" میں میرے پہنچتے ہی کملیشور نے
شکایت کے انداز میں کہا۔ "بھئی! حیدرآباد بہت
اچھا شہر ہے لیکن ایک شکایت یہ ہے کہ جب سے
یہاں آیا ہوں میں گرم چائے اور ٹھنڈا کوکا کولا پینے کے
لئے ترس گیا ہوں۔ جب بھی چائے منگوائی تو وہ ٹھنڈی
نکلی اور جب بھی کوکا کولا منگوایا تو وہ گرم نکلا۔" میں
نے پوچھا "اس وقت آپ کیا پینا چاہتے ہیں؟"
بولے: "ٹھنڈا کوکا کولا۔"
میں نے فوراً بیرے کو آواز دی اور کہا: "کملیشور جی
کے لئے چائے لے آؤ۔"
بولے: "یہ کیا بات ہوئی؟"

زبان کی تلاش تک

حیدرآباد کی سڑکوں پر چہل قدمی کے دوران ہماری
زبان ادب کے کئی دلچسپ اور غیر دلچسپ موضوعات
زیرِ بحث آئے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کملیشور سے
اپنی اس بات چیت کو قلمبند کر لوں تاکہ سند رہے اور
وقت بے وقت کام آئے۔

گرم کوکا کولا ٹھنڈی چائے

اس بات چیت کا آغاز ہی بڑے خوشگوار انداز میں

میں نے کہا: "بڑی سیدھی سی بات ہے۔ جب آپ کوکا کولا
پینا چاہیں تو چائے منگوائیں کیونکہ یہ ٹھنڈی ہوتی ہے
اور جب آپ چائے پینا چاہیں تو کوکا کولا منگوائیں کیونکہ
یہ گرم ہوتا ہے۔ آپ کو تو سردی اور گرمی سے مطلب
رکھنا چاہئے۔ چائے اور کوکا کولا سے نہیں۔"
کملیشور نے قہقہہ لگایا اور کوکا کولا یعنی چائے پینے
میں مصروف ہو گئے۔
میں نے پوچھا: "کملیشور جی یہ بتایئے ANTI STORY

اسلام کی زبان اُردو نہیں ہے، جیسے ہندو مت کی زبان ہندی نہیں ہے

ایک تخلیقی ادیب کو زبانوں کے جھگڑے سے سروکار نہیں رکھنا چاہئے

تحریک یعنی "ناکہانی" تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال
ہے؟ کیوں کہ جب کہانی میں کہانی نہ ہو تو پھر کیا ہو؟ اور
یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آدمی تاجر تو ہو مگر اس میں بیوپار
موجود نہ ہو۔"

کیلشور بولے: "ہندوستان میں اینٹی اسٹوری تحریک کو ہمیشہ
غلط سمجھا گیا۔ مغرب میں جب یہ تحریک چلی تو وہاں اس
کے لئے ایک پس منظر موجود تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے
دوران اور اس کے بعد جو تہذیب سامنے آئی تھی یعنی جنگ
کی تہذیب" اس کی نفی کرنے کے لئے وہاں کے ادیبوں
نے یہ تحریک شروع کی تھی کیوں کہ وہاں رشتے منتشر ہو گئے
تھے۔ زندگی کے دھارے کے بہاؤ کے لئے ایک ربط کی
جو ضرورت ہوتی ہے وہ مفقود ہو چکا تھا۔ مغرب کے
معاشرے میں خود فرد کی پہچان دشوار ہو گئی تھی۔ افراد کے
خونی رشتے تک مشکوک ہو گئے تھے جنگ نے باپ اور
بیٹے کی پہچان کو بھی مسخ کر دیا تھا۔ ایسے میں احتجاج کا ایک
شدید رجحان ادیبوں اور فنکاروں میں پیدا ہو گیا تھا۔
وہ اپنی تحریروں کے ذریعے جنگ کی بے ہنگم تہذیب کا انحراف
کرنا چاہتے تھے اور اسی انتشار نے اینٹی اسٹوری تحریک
کو جنم دیا۔ ادیبوں نے ایک متوازی دنیا پیدا کرنے کی
کوشش کی۔ اس تحریک میں جو شدید انتشاری رجحان
ملتا ہے وہ مغرب کے سیاسی اور معاشرتی حالات کے خلاف
ایک فطری احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے
ادیبوں نے جب اس تحریک کو اپنانے کی کوشش کی تو
ان کے پاس وہ سیاسی اور سماجی حالات نہیں تھے
جو مغرب میں موجود تھے۔ لہٰذا ہمارے بہت سے
ادیبوں نے اس انتشاری رجحان کا رخ موت کی
طرف موڑ دیا اور نتیجہ میں اینٹی اسٹوری تحریک بڑی حد
تک (ANTI HUMAN) غیر انسانی ہو گئی۔

ادیب اور باتھ روم

کیلشور نے کہا: "ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادیب
کو اپنے انتشاری رجحان کے اظہار کی آزادی ملنی چاہئے
بشرطیکہ یہ رجحان کسی شدید فطری جذبے کی پیداوار ہو۔
زندگی کے رویے ہر جگہ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کا
رویہ اپنے ڈرائنگ روم میں مختلف ہوتا ہے لیکن
آدمی جب باتھ روم میں جاتا ہے تو اس کا رویہ بدل
جاتا ہے۔ ایسے رویے کا اظہار بھی ہونا چاہئے۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا: "تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ
ادب میں "باتھ روم" کے لئے بھی گنجائش فراہم کی جائے؟"

وہ بولے: "جب گھر میں باتھ روم ہوتا ہے تو پھر ادب
میں کیوں نہیں ہونا چاہئے؟"

میں نے کہا: "مگر ایسے ادیبوں کے بارے میں آپ کا
کیا خیال ہے جو ہمیشہ ادب کے باتھ روم میں رہنا پسند
کرتے ہیں اور پانچ دس منٹ کے لئے ادب کے
ڈرائنگ روم تک چلے آتے ہیں؟"

کیلشور نے کہا: "ایسے ادیبوں پر ترس کھانا چاہئے۔
ان کے سوائے کیا سلوک کیا جا سکتا ہے؟"

میں نے کہا: "مگر کیلشور جی بہت سے نئے ادیب

اور شاعر ایسے ہیں جو جان بوجھ کر ادب میں گندگی اور غلاظت اچھالنا چاہتے ہیں۔"

کملیشور ہنستے ہوئے بولے۔ "سچ پوچھئے تو ایسے ادیبوں کے مسائل کا تعلق ادب سے نہیں ہوتا بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ہم ایسے ادیبوں کا پتہ میونسپل کارپوریشن والوں کو بتا دیں کہ گندگی اور غلاظت ہٹانے کا کام اسی محکمہ کے تفویض ہوتا ہے۔ میری نظر میں تو ان سے نپٹنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔"

میں نے کہا: "میونسپل کارپوریشن والے جب سڑکیں ہی ٹھیک ڈھنگ سے صاف نہیں کرتے تو پھر ادب کی صفائی کا مزید بوجھ اس محکمہ پر ڈالنا بیکار ہے۔"

کملیشور نے کہا: "بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب ایسے ہیں جو کوئی سماجی اور سیاسی شعور نہیں رکھتے انہیں یہ تک نہیں معلوم کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ حکومت آئے دن جو قوانین بناتی جا رہی ہے وہ کس طرح عوام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مغرب کا ادیب اپنے حالات اور ماحول سے یوں بے نیاز نہیں رہتا۔ ہمارے کئی نوجوان ادیب صرف "INTELLECTUAL SNOBS" بننا چاہتے ہیں وہ ایک مخصوص سی فضا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ یوں کہیے کہ ایک قسم کی رومانیت پسندی کو اپنے سارے وجود پر مسلط کر لیتے ہیں۔ بال بڑھائیں گے، بہت دھیرے سے بولیں گے، مخصوص انداز میں چلیں گے، یوں ظاہر کریں گے جیسے وہ سب سے الگ تھلگ ہوں، یہ اصل میں ایک ادھ کچرے ہونے کے لوگ ہوتے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "آپ ایسے ادیبوں کو کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں؟"

کملیشور بولے: "انہیں ایک حد تک ضرور برداشت کرنا چاہیئے کیوں کہ ایسے ادیب جب ادب میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ادب کے اچھے قاری بن جاتے ہیں، اور کسی ادب کی ترقی کے لئے صرف اچھے ادیب ہی سب کچھ نہیں ہوتے بلکہ اچھے قارئین کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔"

میں نے پوچھا: "ملک کے نوجوان ادیبوں کے غم و غصہ اور شدید ردعمل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

کملیشور بولے: "مجھے ان پر پیار آتا ہے اس لئے کہ یہ ادیب ہر طرح مایوس کئے گئے ہیں۔ ادب کے میدان میں آج ایک ستناٹا سا طاری ہے۔ پچھلے چند برسوں میں ملک میں جو کچھ ہوا ہے اس کے باعث نئی نسل نہ صرف اضطراب سے کٹ گئی ہے بلکہ آس سے اس کے مستقبل کے خواب بھی چھین لئے گئے ہیں۔ حکومت نے سوشلزم کی آمد کا بار بار اعلان کر کے نوجوان نسل کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن ملک میں سوشلزم کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری حکومت نے صرف سوشلزم کو ٹالنے کے لئے سوشلزم کے نعرے کو اپنایا۔ ۱۹۶۲ء تک ہی میں نوجوان نسل سوشلزم کی آمد سے مایوس ہو گئی اور وہ انتظار کے کرب سے عاجز آ گئے۔ اس بیزاری نے ادیبوں کی نئی نسل میں شدید انتشاری رجحان پیدا

اُردو کی قدیم و جدید شاعری، ہندی کی شاعری سے کافی آگے ہے

جب جن سنگھ کی سوچ، میری سوچ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، اس وقت مجھے بڑا ڈر لگتا ہے کیا اور وہ سرے سے زندگی کی نفی کرتے گئے۔"

تاج محل کا نیلام

میں نے پوچھا "کیلشور جی! زندگی کو سرے سے مسترد (REJECT) کرنے اور اس کی نفی کرنے کے رجحان کو آپ کہاں تک درست سمجھتے ہیں؟"

وہ بولے "جب تک زندگی کو تسلیم نہ کیا جائے اس وقت تک اُسے مسترد کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ اگر کوئی شخص زندگی کو تسلیم کرتا ہے تو پھر اسے مسترد کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟"

وہ بولے "آپ میری بات سمجھ نہ سکے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پہلے ہم اپنی عقل اور ادراک کے بل بوتے پر یہ تسلیم کریں کہ ہم آج جو زندگی گزار رہے ہیں وہ ایک حقیقت ہے، ہمیں تو اسی ماحول میں سانس لینا ہے، اس سے فرار ممکن نہیں۔ پھر اس کے بعد ہم اپنے شعور کی بنیاد پر زندگی کے اُن پہلوؤں کو مسترد کریں جو ہمیں نامنظور ہیں۔ ہم اگر زندگی کو ایک اٹل حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتے تو پھر اس کو مسترد کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ میں اس صورتِ حال کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے ایک لطیفہ سناتا ہوں کہ تین دوست تاج محل کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ایک دوست نے جو سوشلزم کا حامی تھا کہا کہ تاج محل بادشاہوں کے جبر و استبداد کی تہذیب کی یادگار ہے اسے محفوظ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا بس چلے تو میں تاج محل کو ایک سوپر بازار میں تبدیل کر دوں گا۔ جہاں عوام کے لئے سستے داموں اشیاء فروخت کی جائیں گی۔ دوسرے دوست نے جو سرمایہ دار تھا کہا کہ میں تاج محل کو ایک خوبصورت عالیشان ہوٹل میں تبدیل کر دوں گا۔ جہاں صرف اونچے طبقہ کے لوگ ٹھہر سکیں گے اور دولت عیش دے سکیں گے۔ تیسرے دوست نے جو بڑی خاموشی سے ان دونوں کی بات چیت سن رہا تھا کہا کہ مگر یار! تم دونوں اپنے منصوبوں پر اس وقت عمل کر سکو گے جب میں تاج محل تم لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر دوں گا۔ جب میں تاج محل بیچوں گا ہی نہیں تو پھر سوپر بازار کھولنے یا ہوٹل قائم کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔"

کملیشور بولے "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب ہم زندگی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتے تو پھر ہمیں اس کی نفی کرنے کا کیا اختیار حاصل ہے۔ یہ بات اس لطیفہ جیسی ہے کہ آپ تاج محل کے مالک ہی نہیں ہیں مگر پھر بھی تاج محل میں سوپر بازار یا ہوٹل قائم کرنے چلے ہیں۔ ہمارے نئے ادیبوں میں کسی شعور یا ادراک کے بغیر زندگی کی اقدار کو مسترد کرنے کا بیمار رجحان بڑھتا جا رہا ہے یہ رجحان انہیں صرف زندگی سے فرار کی جانب ہی لے جا سکتا ہے زندگی کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں بنا سکتا۔"

ادب اور سیاست

میں نے پوچھا "کیلیشوری! یہ بتلائیے ادیب کی سیاسی وابستگی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

کیلیشور بولے: "ادیب کو سیاسی طور پر باشعور ہونا چاہئے اور کسی عقیدے سے اس کی وابستگی کوئی نا پسندیدہ بات نہیں ہے۔ بلکہ میں تو اسے اچھی بات سمجھتا ہوں۔ لیکن میرا اصرار ہے کہ ادیب کی وابستگی کسی سیاسی عقیدے (IDEOLOGY) سے ہونی چاہئے نہ کہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ میں شخصی طور پر مارکسسٹ ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں دائیں یا بائیں بازو کی کمیونسٹ پارٹی کا ادیب ہوں۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ سیاسی نمائندے کوئی نظریہ سوچ کر ادیبوں کے حوالے کریں۔ آخر ادیب بھی تو سوچ سکتے ہیں۔ میں کارل مارکس کو دنیا کا سب سے بڑا فلسفی مانتا ہوں اور یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ یکم جولائی ۱۹۷۱ء (انٹرویو کی تاریخ) تک بھی دنیا نے کوئی ایسا فلسفی پیدا نہیں کیا جو کارل مارکس سے بڑا ہو۔ کارل مارکس کا عقیدہ آج بھی ہماری عملی زندگی سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں مارکسسٹ پارٹی یا کمیونسٹ پارٹی کا ادیب ہوں۔ میرے اپنے سیاسی نظریات اور خیالات ہیں اور اکثر اوقات میں سیاسی معاملوں میں ملک کی ایسی سیاسی جماعتوں سے بھی متفق نظر آتا ہوں جو رجعت پرست کہلاتی ہیں۔ مثلاً ہندی کے بارے میں جن سنگھ کی سوچ میری سوچ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اس وقت مجھے بڑا ڈر ہوتا ہے کہ یا تو میں غلط ہوں یا پھر جن سنگھ غلط ہے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہوں کہ میں ایک ادیب ہوں اور بہرحال ایک ادیب کی سوچ ایک سیاسی پارٹی کی سوچ سے بہرحال زیادہ معتبر ہوتی ہے۔"

ادب اور تاریخ

ہماری بات چیت کے وقت تلگو کے مشہور ادیب مسٹر رنگا چاری بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کیلیشور سے تاریخ اور ادب کے مسئلہ پر بحث چھیڑ دی۔

رنگا چاری نے کہا: "میرا خیال ہے کہ تاریخ ہمیشہ حکمران یا فاتح کے لئے لکھی جاتی ہے۔ اگر والمیکی نے رامائن میں رام کے کردار کو مسخ کرنے یا اسے غلط روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید رام والمیکی کی رامائن چھپنے بھی نہ دیتے۔"

کیلیشور نے کہا: "حکمرانوں یا فاتحین کی تاریخ تو مورخ لکھتا ہے لیکن ادیب ہمیشہ اپنے ادب کے ذریعہ عوام کی تاریخ لکھتا ہے۔ اس میں عوام کی بجھی بجھی سی آرزوئیں، ان کی تمنائیں، ان کی خواہشیں موجود ہوتی ہیں۔ ادیب شکست خوردہ کے ساتھ ہوتا ہے، اس کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کمزور کو سہارا دے۔ خود والمیکی کی رامائن، کسی حکمران کی تاریخ نہیں ہے یہ تو سیتا کی آزمائشوں اس کی مصیبتوں، اس کے دکھ درد اور کرب کی ایک داستان ہے۔ اگر رامائن میں سے سیتا کے کردار کو نکال دیا جائے تو رام کا کردار کوئی معنی نہیں رکھتا

نام نہاد انٹلکچول جب ادب میں ناکام ہوجاتے ہیں تو اچھے تاری بن جاتے ہیں

ہندوستان میں "تاریخ کہانی" تحریک سے بڑی حد تک "غیر انسانی" بنا دی گئی ہے

والمیکی کوئی مورخ نہیں بلکہ ادیب ہی ہے
وہ رام کی فتح سے نہیں بلکہ سیتا کے دُکھ درد سے قریب
ہے۔ مورخ چاہے کچھ بھی لکھے لیکن ادیب تو بہرحال
عوام کے حوالوں، ان کی تمناؤں، اُن کی خواہشات
اور اُن کے احساسات کی تاریخ مرتب کرتا رہتا

مسٹر رنگاچاری نے کملیشور سے متفق ہوتے ہوئے
کہا: "ادیب کا رول تو اپنی جگہ پر درست ہے لیکن
تاریخ تو ہمیشہ حکمرانوں کے لئے لکھی جاتی ہے۔"
اس پر میں نے بات چیت کو مزاح کا رنگ دینے کی
خاطر کہا: "ویسے بعض لوگوں کا ہمارے ملک کی تاریخ
کے بارے میں یہ خیال ہے کہ انگریز جب تک ہندوستان
میں رہے ملک کی تاریخ بناتے رہے لیکن جب جانے
لگے تو اس کا جغرافیہ بگاڑ کر چلے گئے۔"
اس پر کملیشور نے کہا: "جغرافیہ تو خیر بگڑ ہی گیا تھا لیکن
انگریزوں کے جانے کے بعد ان ۴۳ برسوں میں ہم
نے اپنی تاریخ بھی بگاڑ دی ہے۔"

پھر وہی اُردو ہندی کا جھگڑا

اس طویل بات چیت کے بعد کملیشور ذرا سی تھکن محسوس
کرنے لگے انہوں نے کہا: "ہمیں اب ٹھنڈا کوکا کولا
پینا چاہئے، آپ کا کیا خیال ہے؟"
اور انہوں نے بیرے کو بلا کر پھر چائے لانے کا آرڈر دے
دیا۔ کملیشور غالباً یہ بھول گئے تھے کہ اب میں اُن سے وہ
سوال کرنے والا ہوں جس کا جواب دینے سے وہ
بچنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو ترو
تازہ کرنا ضروری سمجھا۔
میں نے پوچھا: "کملیشور جی! اب میں ہندی اور اردو
کے جھگڑے کے بارے میں آپ کی رائے جاننا
چاہتا ہوں۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں کہ زبانوں کا
جھگڑا کم از کم اس وقت ہم دونوں کے جھگڑے کا
سبب نہیں بنے گا۔"
کملیشور ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے اور زیر لب مسکراتے ہوئے
بولے: "میں زبان کے مسئلہ پر اظہار خیال کرنے سے
پہلے ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں تاکہ بات چیت کی
فضا ہلکی پھلکی رہ سکے۔ ویسے یہ صرف لطیفہ ہے اور
اسے آپ اتنی ہی اہمیت دیں جتنی کہ ایک لطیفہ کو
دے سکتے ہیں۔ ایک بار کرشن چندر دہلی کے ہندی
رسالے "پراگ" کے دفتر پہنچے تو اتفاق سے میں
بھی وہاں موجود تھا۔ کرشن چندر بڑے منہ پھٹ آدمی
ہیں۔ کسی کو "نہ" کہنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ "پراگ"
کے ایڈیٹر نے اُن سے کبھی خواہش کی تھی کہ وہ پراگ کے
لئے کوئی مضمون لکھیں اور کرشن چندر نے محض شرافت
میں "ہاں" کہہ دی تھی۔ کرشن چندر جب پراگ کے
دفتر پر آئے تو پراگ کے ایڈیٹر نے انہیں ان کا وعدہ
یاد دلایا اور یہ بھی کہا کہ اگلے شمارے کے لئے ان کے
مضمون کا ملنا نہایت ضروری ہے کیونکہ ان کے نام
کا اعلان ہو چکا ہے۔ کرشن چندر بہت سٹپٹائے اور

بولے: "بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ بچوں کے لئے لکھنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میں تو صرف بڑوں کے لئے لکھتا ہوں۔ کرشن چندر کی حیرانی دیکھ کر میری رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور میں نے کہا: "کرشن جی! آپ فکر نہ کریں اردو میں آپ بڑوں کے لئے جو کچھ تحریریں لکھتے ہیں وہی "پراگ" کو دے دیجئے۔ وہ جب ہندی میں ترجمہ ہو کر چھپیں گی تو خود بخود بچوں کے لئے لکھی گئی تحریریں بن جائیں گی۔"

یہ کہہ کر کملیشور نے زبردست قہقہہ لگایا مگر میرا قہقہہ کہیں دب کر رہ گیا۔ میرے ہونٹوں پر اس وقت مسکراہٹ نہیں بلکہ صرف شرافت کھیل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کملیشور نے جو لطیفہ فضا کی تلخی کو ختم کرنے کے لئے سنایا ہے اُس سے اس تلخی میں شاید اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ اردو سے ہٹ کر خود کرشن چندر میری کمزوری رہ چکے ہیں۔

کملیشور نے غالباً میرے پوشیدہ جذبات بھانپ لئے۔ خود ہی مسکرا کر بولے: "اجی صاحب! لطیفہ کو صرف لطیفہ سمجھئے ایک لطیفہ زبانوں کے مقام کا تعین نہیں کر سکتا۔ میں نے تو یونہی یہ لطیفہ سنا دیا ہے۔ سچ پوچھئے تو میں اُردو کا بہت بڑا مداح ہوں۔ میں ایک کائستھ گھرانے میں پیدا ہوا جس کا سارا ماحول اردو کے خمیر سے اٹھا ہے۔ میرے والدین اور میرے سارے بزرگ آج بھی مجھے اردو میں خط لکھتے ہیں۔ ایک میں ہی کافر ہوں۔"

میں نے کہا: "گویا لطیفہ کی رو سے آپ اپنے بزرگوں کے بزرگ اور آپ کے بڑے آپ کے چھوٹے ہیں۔"
کملیشور بولے: "آپ تو اس لطیفہ کے بارے میں خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے۔"

میں نے کہا: "اچھا چلئے میں اسے لطیفہ مان لیتا ہوں۔"
کملیشور نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "میرا شخصی نظریہ تو یہ ہے کہ ایک تخلیقی ادیب کو زبانوں کے جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئے زبانوں کا مسئلہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو زبانوں کی سیاست چلانا چاہتے ہیں۔ میرے لئے تو زبان صرف اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میں ہندی کا ادیب ہوں۔ ہاں البتہ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ میں اردو کا ادیب ہوں تو اس وقت مجھے یاد آتا ہے کہ میں ہندی کا ادیب ہوں۔ اردو بڑی جاندار زبان ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اردو کی قدیم و جدید شاعری، ہندی کی شاعری سے کافی آگے ہے۔ کہانیوں کے معاملے میں بھی اردو پیچھے نہیں ہے۔ مزاح نگاری میں بھی اردو کا ستارہ عروج پر ہے لیکن اردو زبان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا تعلق سیاست اور مذہب سے پیدا کیا گیا۔ حالانکہ کسی بھی زبان کا جائزہ سیکولر اور غیر جانبدارانہ انداز میں لیا جانا چاہئے اردو کے مسئلہ کو پیش کرنے میں پہلی غلطی تو اس وقت ہوئی جب اُسے اقلیت کی زبان کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا لانکہ اسلام کی زبان اردو نہیں

مجھے یہ منظور نہیں کہ سیاسی قائدین کوئی نظریہ سوچ کر ادیبوں کے حوالے کریں۔

کیا ادب میں بالتھ رُوم کے لئے بھی گنجائش فراہم کی جائے؟

ہے بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان کی زبان ہندی نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر کی وجہ سے اکثریت میں خواہ مخواہ "ضد" اور "ہٹ" پیدا ہو گئی۔ جب تک اردو کو اقلیت کی زبان سمجھا جاتا رہے گا اس وقت تک اکثریت اس کی مخالفت کرتی رہے گی۔"

میں نے پوچھا: "کیا آپ اس مخالفت کو جائز سمجھتے ہیں؟"

وہ بولے: "اس مخالفت میں بعض ہندی والوں نے جو شدید رویہ اختیار کیا ہے میں اُسے بھی ناپسند کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں کئی مواقع آنے کے باوجود میں نے کبھی سیٹھ گوبند داس سے ملاقات نہیں کی۔ اس قسم کے ہندی کے کٹر حمایتی بنکر خود ہندی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ملنا تو درکنار مجھے ان کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں ہے۔ میں یہی کہتا ہوں کہ زبانوں کو سیاستدانوں کے چنگل سے آزاد کیا جانا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ سارے ملک کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط ہونا چاہئے اور اس رسم الخط کو علاقائی زبانیں بھی اپنائیں کیوں کہ اس طرح ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔"

میں نے پوچھا: "آپ کون سے رسم الخط کو مشترک رسم الخط بنانا چاہتے ہیں؟"

وہ بولے: "میں رومن رسم الخط کو چھوڑ کر کسی بھی رسم الخط کو ملک کے مشترکہ رسم الخط کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار ہوں، چاہے وہ فارسی رسم الخط ہی کیوں نہ ہو۔ ایک رسم الخط ہوگا تو لوگ دوسری علاقائی زبانیں بھی پڑھ سکیں گے اور دوسری زبانوں کے الفاظ سے بھی واقف ہوتے جائیں گے۔ میری مثال لیجئے کہ میں دو دن سے تلگو اور اردو کی کانفرنس کے جلسوں میں شرکت کر رہا ہوں۔ مجھے تلگو مطلق نہیں آتی لیکن دو دن تک لگاتار اس زبان کو سننے کے بعد میرے کان اس کے الفاظ سے مانوس ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر مشترکہ رسم الخط ہو تو میں شاید صرف پڑھ کر اس زبان کو سمجھ سکوں۔"

حضرت فراق

میں نے کہا: "کملیشور جی! دیوناگری رسم الخط اور ہندی ادب کے بارے میں فراق صاحب کے نظریات کے تعلق سے آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ بولے: "میں فراق کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ جب شاعر کے روپ میں سامنے آتے ہیں تو بہت بڑے آدمی نظر آتے ہیں لیکن جب وہ ماہر لسانیات کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں تو بہت چھوٹے بن جاتے ہیں۔"

میں نے کہا: "مگر فراق جیسے مفکر اور فنکار کی رائے صرف متعصب تو نہیں ہو سکتی؟"

کملیشور بولے: "سچ بات تو یہ ہے کہ فراق جس مرصع اور سجی دھجی والی اردو کی آج حمایت کر رہے ہیں وہ اردو آج باقی نہیں رہی ہے۔ فراق کے ذہن میں جس اردو کی حفاظت کا خیال ہے وہ وہی اردو ہے جو میر و غالب کی نکھری ستھری زبان رہ چکی ہے، مگر آج جو اردو بول چال اور ادب میں استعمال کی جاتی ہے وہ اس اردو سے مختلف ہے جو فراق کے ذہن میں محفوظ ہے۔"

۲۲ ستمبر حیدرآباد

میں نے کہا: "مگر فراق پر ایسا الزام لگانا مناسب نہیں ہے کیونکہ فراق نے اردو شاعری کی زبان میں کئی تجربے کئے ہیں اور اردو شاعری کو ہندوستان کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کوشش میں انہوں نے کئی ہندی الفاظ بھی اپنی شاعری میں بلا تکلف استعمال کئے ہیں۔ بجا طور پر کہئے تو اردو شاعری کا رشتہ انہوں نے ایران سے جوڑنے کی بجائے ہندوستان کی سرزمین سے جوڑا ہے:

کیلش والے: "آپ یقین کریں یا نہ کریں میں اس معاملہ میں فراق سے کہیں زیادہ علامہ اقبال کی شاعری کے CONTRIBUTION یا دین کو مانتا ہوں۔ علامہ اقبال کے سیاسی نظریات سے اختلاف کے باوجود میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ انہوں نے ہندوستان سے اپنی محبت، کم پیغام کو ہندوستانی تہذیب کو بہت دور تک پہنچایا تھا۔ یوں کہئے کہ اقبال نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے ذریعہ ہندوستان کو ایران تک پہنچایا تھا جب کہ فراق نے اردو شاعری کو صرف گورکھپور تک پہنچانے کی کوشش کی۔ میں علامہ اقبال کی اس دین کو کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ مانا کہ فراق نے اُردو شاعری میں ہندوستان کے مزاج کو داخل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نظیر اکبرآبادی بہت پہلے یہ کر چکے تھے۔ یہی اردو شاعری میں ہندی الفاظ داخل کرنے کی بات تو اس سلسلہ میں میری عرض یہ ہے کہ "زبان کی تلاش" فطری ہونی چاہئے، ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں زبردستی ٹھونسنے کا عمل فطری نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صرف شعبدہ بازی ہوگی۔

زبان کی تلاش

اس بات پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ ڈاکٹر گوپال ریڈی جب وزیر اطلاعات تھے تو انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کے عہدیداروں کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ اردو نیوز بلیٹنوں میں ہندی الفاظ اور ہندی نیوز بلیٹنوں میں اردو الفاظ کا استعمال کریں تاکہ ان دونوں زبانوں کو قریب لایا جا سکے اور مشکل الفاظ سے پاک کیا جائے۔ انہیں دنوں دلی کے چاندنی چوک علاقہ میں کوئی حادثہ ہو گیا۔ ہندی والوں نے جب اس خبر کا ترجمہ شروع کیا تو انہوں نے محسوس کیا کہ "درگھٹنا" کافی ثقیل رہے گا اس لئے انہوں نے خبر نشر کی کہ چاندنی چوک میں آج ایک حادثہ ہو گیا۔ دوسری طرف اردو والوں نے ترجمہ کے وقت سوچا کہ "حادثہ" کافی ثقیل رہے گا اسی لئے انہوں نے یہ خبر اس طرح نشر کی کہ چاندنی چوک میں آج ایک دُرگھٹنا ہو گئی۔

یہ صرف الفاظ کا الٹ پھیر ہے۔ زبان کو فطری طور پر پروان چڑھنا چاہئے۔ میں ہندی اور اردو کو دور دور رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ دونوں ہی زبانوں میں "زبان کی تلاش" کا کام شروع ہونا چاہئے اور یہ کام صرف ادیب ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں عوام کی بول چال کی زبان کو ادب میں جگہ

جب ہم زندگی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتے تو ہمیں اُسے مسترد کرنے کا بھی حق نہیں

میں رومن رسم الخط کو چھوڑ کر ملک کے کسی بھی رسم الخط کو قبول کرنے تیار ہوں

دینی چاہئے۔ کتابی زبان زیادہ دیرپا نہیں ہوتی۔ زبان کی تلاش ہی ایک دن اردو اور ہندی کے درمیان حائل خلیج کو دور کر دے گی۔ انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ راجندر سنگھ بیدی نے "ایک چادر میلی سی" میں جس زبان کی تلاش کی ہے وہ ایک سچی اور فطری کوشش ہے۔"

ہم لوگ بڑی دیر سے بحث کر رہے تھے اور کملیشور اپنے ایک پروگرام کی منسوخی کے بعد دوسرے پروگرام کے لئے بھی کافی لیٹ ہو چکے تھے پھر انہیں ہنا کے طیارے سے بمبئی بھی جانا تھا۔ اسی لئے میں نے کملیشور سے کہا۔

"اچھا اب اجازت دیجئے میں چلتا ہوں۔"

وہ بولے۔ "بیٹھئے ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں زبان کی تلاش میں فوراً یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

کملیشور نے قہقہہ لگایا اور پھر اس کے بعد ہم دونوں بڑی دیر تک حیدرآباد کی سڑکوں پر زبان کی تلاش میں پھرتے رہے۔ پتہ نہیں کملیشور کو اس تلاش میں کیا ملا ——— پتہ نہیں کملیشور کو اس تلاش میں کیا ملا۔ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں نے کملیشور کو تلاش کیا اور کملیشور نے مجھے تلاش کیا اور یوں سارا حساب بے باق ہو گیا۔

■ ■

کون ہے جو کہ سانس لیتا ہے
میرے اندر بھی کوئی رہتا ہے؟
پڑ گئے پھیکے سب نقوشِ وفا
وقت کی دھوپ کا کرشمہ ہے
جسم میں اپنے دفن ہے انساں
کھوجنے والا کیوں بھٹکتا ہے؟
آہ جس کو خلوص کہتے ہیں
بند کمروں میں آہیں بھرتا ہے
رات کالی ہے ڈس نہ لے ہم کو
دیکھیں کب تک سویرا ہوتا ہے

عزیز اندوری ۱۳۱ آشیانہ جونا رسالہ اسٹریٹ
(اندور)

"التجا اور دعا آج کچھ بھی نہیں"

وہاب دانش

لوور بازار۔ رانچی (بہار)

تم کو معلوم ہے
اس سمندر نے بھیگے ہوئے ہاتھ سے
آسماں پر جمی گرد کو پونچھ ڈالا
چاند، سورج، ستاروں کو پاتال میں
دفن کرنے کا جو حادثہ ہو چکا
جاں گسل ... دل شکن کچھ نہیں
روشنی کے لیے انگلیوں میں تھکاوٹ پرونے کے
مقروض لمحوں سے تم بچ گئے

یہ ہزاروں برس سے
ہر اک صبح اور شام
گونگی روایت کے لب
چاند کی سلوٹیں چاٹتے ہی رہے
روشنی روشنی کی صدا
ڈوبتی ہی رہی رات کے بطن میں
تو کہو!

یہ بُرا کیا؟
آسماں کو اگر پونچھ ڈالا گیا
وقت سے جنس کی ساری تعریف لے لی گئی
رات دن صبح اور شام کے دائرے توڑ ڈالے گئے

اب تو ہر اک دِشا برہنہ ہو گئی
خوف کی پنڈلیوں سے نکلتے ہوئے کانپتے زرد الفاظ کو
کرم خوردہ کتابوں کی تحویل میں ڈال دو
التجا اور دعا آج کچھ بھی نہیں

روشنی، تیرگی کا تماشہ بہت ہو چکا
اب تو منظر نگاہوں کے آگے کوئی اور ہے
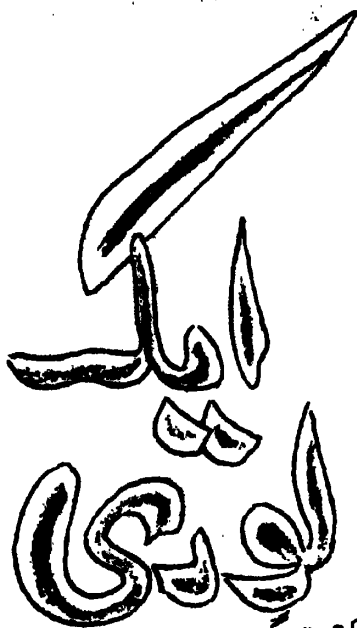
سو بھی جاؤ

اے میرے کم سِن، نحیف اور ناشناس بچو!
کہ تم کو گنتی کے دن ملے ہیں
کہ کل کا دن تو بہت کڑا ہے
تمہاری یہ نیند پھر کبھی تم نہ پا سکو گے
محاذ کے اس طرف گئے تو نہ آ سکو گے
تمہارا کل بارکوں کی دن رات میں کٹے گا
یہ نرم پہلو نہ ہوں گے
—— کل خندقوں کے کانٹے تمہارے پہلو کو چھید دیں گے
ہمارے بعد اب نہ کوئی بابا نہ کوئی ممی نہ کوئی بہنا تمہیں ملے گی
یہ گوشت اور پوست کے زندہ تر سلسلے
بس یہیں ختم ہو جائیں گے
بس یہیں ختم ہونا ہے ان کو
خدا کرے یہ تمہاری نیندیں بس ایک شب کے لئے نہیں ہوں
ابد تلک بے خبر رہو تم
ابد تلک لاپتہ رہو تم
سو بھی جاؤ
—— اے میرے کم سن، نحیف اور ناشناس بچو!
کہ تم کو گنتی کے دن ملے ہیں

عتیق اللہ ۳۔ ملار گیٹ۔ اجین (ایم۔پی)

مجھے وہ موج کسی روز جب ڈبوئے گی
تو بے بسی میں کناروں کی آنکھ روئے گی

وہ شکل جس سے ابھی روشنی ٹپکتی ہے
سفر کی دھول میں وہ رنگ اپنا کھوئے گی

میں منتظر ہوں اسی رُت کے لوٹ آنے کا
جو سبز زہر مری روح میں سموئے گی

مری تھکن کو نئے دشت پھر بلائیں گے
کسی ندی میں وہ جھک کے جو پاؤں دھوئے گی

ہمارے زرد سے بے برگ جب شجر ہونگے
بڑے سکون سے فکری وہ یاد سوئے گی

پرکاش فکری
ڈورنڈہ درزی محلہ
پوسٹ آفس ہینو۔ رانچی-۲

وہی یوسف وہی بازار نئے موسم میں
دام بدلے نہ خریدار نئے موسم میں

دوسری بار نہ جی بھر کے تجھے دیکھ سکے
زندگی! تیرے گنہ گار نئے موسم میں

کسی سمجھوتے کی کالک ہی لگا دو ان پر
بے نمک ہیں لب و رخسار نئے موسم میں

چوڑیاں دل میں چھنکتی ہیں نہ مانوس آہٹ
دھیمی نغموں کی ہے جھنکار نئے موسم میں

قربتیں فاصلہ بنتی گئیں بنتی ہی گئیں
اونچی ہوتی گئی دیوار نئے موسم میں

حسن فرخ
۳-۶-۲۱۴
حمایت نگر۔ حیدرآباد-۲۹

چکدیپتی پٹیل

راج پال ہاؤس، پندرھویں روڈ

کھار۔ بمبئی۔ ۵۲

بنگلے کے بڑے دروازے پر پہنچ کر جب جوالا سنگھ جی نے ہریے کے چیخوں کی آواز سنی تو انہیں خیال آیا کہ آج اماوس کی رات ہے۔ اُس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے اور شہر کے باہر سنسان سی اس جگہ میں بنگلے سے آتی ہوئی ہریے کی چیخوں کی آواز بڑی خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔ جوالا سنگھ جی نے اپنے کمرے میں پہونچ کر لالٹین روشن کی اور کھڑکی سے باہر اُس کوٹھری کی طرف دیکھا جہاں سے ہریے کی چیخوں کی آواز آ رہی تھی۔ چوکیدار کو جب اُن کے آنے کی خبر ملی تو وہ اُن کے کمرے میں بھاگا بھاگا آیا۔

"مالک! ہریا پھر اسی طرح چیخ رہا ہے — ایک مہینہ پہلے کی طرح اُسے پھر دورہ پڑا ہے۔"

"ہوں —!" کہہ کر جوالا سنگھ جی خاموش ہو گئے پھر ایک لمحہ انہوں نے کچھ سوچ کر جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چوکیدار کو دیا اور کہنے لگے۔

"سگریٹ کے ایک ٹن کا بندوبست کر دو۔"

"لیکن مالک اس وقت — اس وقت سگریٹ؟"

جوالا سنگھ کی پیشانی پر تیوریاں پڑ گئیں، اسکی بات کاٹ کر بولے۔ "میں کچھ نہیں جانتا کہیں سے بھی لاؤ۔ کسی کی دوکان کھلواؤ۔" چوکیدار کچھ نہ بولا۔ اور چپ چاپ بنگلے کے پھاٹک سے نکل کر باہر سڑک پر چل پڑا۔ جوالا سنگھ جی وہی کپڑے پہنے ہوئے پلنگ پر لیٹ گئے۔ اور اُن کی نظریں چھت پر ٹک گئیں۔ شاید وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔ ہریے کی چیخوں کی آواز کچھ کم ہو رہی تھی۔ شاید چیخ چیخ کر اُس کا گلا بیٹھا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد وہ پلنگ سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل کر اُس کوٹھری کے دروازے پر کھڑے ہوئے جہاں سے ہریے کے چیخنے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ایک لمحہ انہوں نے کچھ سوچا اور پھر دروازے پر دستک دی۔ ہریے نے اندر سے گلا پھاڑ کر چیختے ہوئے کہا۔

"کون ہے، چلے جاؤ! دفع ہو جاؤ — !!"

جوالا سنگھ جی کی بڑی بڑی آنکھوں میں غصے کی لہر دوڑ گئی — سارے جسم کی طاقت بازوؤں میں بھرتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"ہری سنگھ دروازہ کھولو — میں ہوں جوالا سنگھ"

اُن کی آواز ٹھہری ہوئی اور گمبھیر تھی۔ نہ جانے اُس آواز میں کیا اثر تھا۔ اندر سے چیخنے کی آواز بند ہو گئی اور سارا ماحول اس طرح خاموش ہو گیا جیسے کچھ کہا کر ہمیشہ کے لئے سو گیا ہو۔ دو منٹ تک وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ لیکن ہریے نے دروازہ نہ کھولا۔ انہوں نے پھر ایک بار دستک دی۔ اور پہلے لیکن بارعب انداز سے کہا۔ "ہری سنگھ دروازہ کھولو!"

ایک لمحہ بعد دروازہ کھل گیا۔ اور اندھیری کوٹھری

میں ہریئے کا چھ فٹ لمبا بھیانک جسم سامنے کھڑا تھا۔ وہ ایک مضبوط اور بھاری جسم کا آدمی تھا۔ قد چھ فٹ سے کچھ اوپر ہی نکلتا ہوگا۔ آنکھیں خونخوار اور چڑھی ہوئی تھیں مضبوط جبڑوں کے اوپر دائیں گال کی ابھری ہوئی ہڈی پر چاقو کے زخم کا گہرا نشان تھا۔ اس کی شکل کوٹھری کے اندھیرے میں بہت خوفناک معلوم ہو رہی تھی جوالا سنگھ جی کوٹھری کی دہلیز پر کھڑے ہو گئے۔ مضبوطی سے اپنے قدم جما کر انہوں نے کہا: "کیا بات ہے ہری سنگھ ___ تجھے یہ اماوس کی رات کو کیا ہو جاتا ہے۔؟"

"ک۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں سرکار!"

اچانک ہی جوالا سنگھ جی نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ایک بھرپور ہاتھ مارا اور اس کے گریبان کو اپنی مضبوط گرفت میں کس کر اس کے گرنے سے پہلے ہی زمین سے گھسیٹ کر اسے کوٹھری سے باہر کھینچ لیا۔ ان کے ہاتھوں میں جیسے بجلی تھی۔ آنکھ جھپکتے ہی سب کچھ ہو گیا۔ ہریا اپنے کو سنبھال نہ سکا۔ اور کوٹھری سے باہر گیلی زمین پر وہ جوالا سنگھ جی کے قدموں میں آ گرا۔ پاس کے کمرے کی کوٹھری سے جھلملاتی ہوئی لیمپ کی روشنی میں جوالا سنگھ نے ہریئے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے جسم کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ اور اس کا تنومند اور مضبوط جسم انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ اس کے مضبوط بازوؤں پر جا بجا تازہ زخم بنے ہوئے تھے۔ جن سے خون ابل کر بہہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تیز ناخنوں سے اس نے اپنے بازوؤں پر گہرے زخم بنا لئے تھے۔

ایک منٹ میں ہریا چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا اور تن کر جوالا سنگھ جی کے آگے بپھر گیا۔ غصے سے اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی۔ اپنے دانتوں سے ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے اس نے اپنی مٹھی کس لی۔ اس کے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں تن کر جیسے تڑپ اٹھیں۔ "چلے جاؤ۔ چلے جاؤ مالک ___ میں نے تمہارا نمک کھایا ہے کہیں تمہارا خون ___"

جوالا سنگھ جی کا بایاں ہاتھ بجلی کی تیزی سے اٹھا اور ہریئے کے منہ پر ایک بھرپور وار ہوا۔ اس کے دانتوں سے خون نکل کر ہونٹوں پر بڑی سرعت سے ٹپکا۔ ہریا جیسے غصے سے پاگل ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر

وہ جوالا سنگھ جی کی طرف بڑھا۔ لیکن جانے کیسے جوالا سنگھ جی کے ہاتھوں کی بجلی کی کڑک کی طرح ایک وار ہریے کی طرف لپکا اور دوسرے ہی لمحہ وہ بہت زور سے پکی زمین پر گر گیا۔ آگے بڑھ کر وہ ہریے کے قریب کھڑے ہو گئے۔

"ہری سنگھ!" انہوں نے پکارا۔ لیکن ہریے کی ناک پر وار بہت زور سے ہوا تھا اور وہ بے سدھ ہو کر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ذرا جھک کر جوالا سنگھ جی نے ہریے کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اس طرح سے اٹھا لیا۔ جیسے وہ کوئی مٹی کا بت ہو۔ اور کمرے کے اندر لا کر پلنگ پر لٹا دیا پھر پاس کی الماری کھول کر انہوں نے روئی نکال کر اس کے منہ اور بازوؤں کے زخموں کو دھو کر صاف کر دیا۔ اسی وقت چوکیدار ہاتھ میں سگریٹ کا ٹن لئے اندر داخل ہوا۔

"بڑی مشکل پڑی مالک۔۔"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا جوالا سنگھ جی نے سگریٹ کا ٹن اس کے ہاتھ سے لیکر کہا۔

"اب تم جا سکتے ہو!"

پانچ منٹ کے بعد ہریے نے آنکھیں کھول دیں۔ اور جوالا سنگھ جی کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا بڑی میٹھی آواز میں انہوں نے کہا۔

"اب کیسے ہو ہری سنگھ؟"

ہریا کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے گھوم کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ اور جب اسے احساس ہوا کہ وہ جوالا سنگھ جی کے پلنگ پر لیٹا ہے تو یکایک جست میں وہ پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اوہ۔۔۔ میں۔۔۔" اس کا ہاتھ غیر اختیاری طور اپنے چہرے کی طرف اٹھ گیا۔

بھو پیکر حیدرآباد

جوالا سنگھ جی نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور نرم آواز میں بولے۔ "لیٹے رہو۔۔۔"

"نہ۔۔۔ نہیں سرکار" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں "میں بڑا پاپی ہوں، نمک حرام ہوں۔۔۔ میں بہت برا ہوں سرکار! میرے یہ ہاتھ، یہ کالے ہاتھ، آپ پر ہی اٹھنے کو تیار ہو گئے۔۔۔ میں۔۔۔ میں بہت برا ہوں!"

جوالا سنگھ جی نے اپنا دوسرا ہاتھ ہریے کے دوسرے شانے پر رکھ دیا۔ اور اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اسی طرح نرم میٹھے انداز سے وہ بولے "نہیں ہری سنگھ تم اس وقت ہوش میں نہیں تھے۔ اور پاگل آدمی کو اچھے برے کی تمیز کہاں رہتی ہے۔ مجھے اسی لئے تم پر ہاتھ اٹھانا پڑا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

"آپ کا دل بہت بڑا ہے سرکار۔۔!"

جوالا سنگھ جی مسکرا دیئے۔ "ہری سنگھ۔۔!"

ہریے نے جوالا سنگھ جی کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں نہ جانے کیسی کشش تھی۔ ہریے کی نگاہیں جھک گئیں۔ اپنا ایک پاؤں پلنگ کی پٹی پر رکھ کر انہوں نے کہا۔ "بیٹے بتاؤ ہری سنگھ تم یہاں نوکری سے پہلے کوئی ناکی چوریاں تو نہیں رہے۔۔۔ ہر اماوس کی رات تم پیتے ہو جیسے کوئی شدید خواہش تمہارے خون میں ابال پیدا کر رہی ہو۔۔۔ بیٹے بتاؤ تم کون ہو؟"

ہریے نے چونک کر جوالا سنگھ جی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ایک لمحہ انگارے کی طرح سرخ ہو گئیں۔

اس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔۔۔ جوالا سنگھ جی ایک لمحہ ہریے کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک کرسی کھسکا کر بیٹھ گئے

کے قریب بیٹھ گئے۔ ڈبے سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ پھر کچھ سوچ کر انہوں نے سگریٹ کا ڈبہ ہیرے کی طرف بڑھا دیا: "سگریٹ لو ہری سنگھ۔"

ہیرے کے چہرے پر ایک لمحہ پس و پیش کی لکیریں کھنچ گئیں

جوالا سنگھ جی بول اٹھے۔

"نہ لو ہری سنگھ ——— مجھے اپنا دوست ہی سمجھو۔ تمہیں اس وقت سگریٹ کی ضرورت ہے۔"

ہیرے نے ایک لمحہ کچھ سوچا پھر ہاتھ بڑھا کر ایک سگریٹ نکال لیا۔ جوالا سنگھ جی نے لائیٹر جلا کر ہیرے کے سگریٹ کے کنارے پر آگ کی لو رکھ دی۔ پھر اپنا سگریٹ سلگا کر انہوں نے ایک لمبا کش لیا اور کہنے لگے۔

"ہری سنگھ! مجھے اب بھی تمہارے جواب کا انتظار ہے۔"

ہرا پہلے تو خاموش رہا۔ پھر سگریٹ کے دو تین کش لیکر بولا۔ "آپ جان ہی گئے ہیں تو کیا چھپانا۔ میں چمبل میں بھی راجپوت سردار کے ڈاکوؤں کے گروہ کا آدمی تھا۔ آپ نے اس گروہ کی نسبت سات آٹھ مہینے پہلے اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا۔ سارے راجستھان اور مدھیہ بھارت میں لگاتار دو سال تک ہم لوگ ڈاکے ڈالتے رہے۔ بہت بار پولس کے جتھوں اور جاگیردار کے آدمیوں کے ساتھ آمنے سامنے مقابلہ بھی ہوا۔ لیکن ہمارا سردار بلا کا بہادر اور دلیر آدمی تھا ——— ڈاکے کے وقت سارے گروہ کو اس طرح ترتیب دیتا کہ پولس کی گولیوں کے درمیان ہزاروں اور لاکھوں کی رقم ہم لوگ اڑا لے جاتے۔ اس طرح سے کہ دونوں طرف جانی نقصان بھی بہت کم ہوتا ——— بہت ہی کم ایسا وقت آیا جبکہ ہمارے گروہ کے ایک دو آدمی گرفتار ہو جاتے ——— لیکن ہمارے سردار کی نسبت پولس والے کچھ پتہ نہ لگا پائے۔ اور وہ پتہ بھی کیا لگاتے۔ اس کی نسبت تو کسی کو علم نہ تھا۔ ہمارے گروہ کے کسی بھی آدمی کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا یہاں تک کہ ہم اس کے چہرے کو کبھی بھی دیکھ نہ پا سکے۔ وہ جانے کون تھا کہاں سے آتا۔ ہر اماوس کی رات کو وہ اپنے سارے جسم کو کالے لبادے میں چھپا کر مقررہ جگہ پر ٹھیک وقت پر آ جاتا۔ اور اس دن کے ڈاکے کے بارے میں ہدایت دے کر چلا جاتا۔

اس رات ہمیں مدھیہ بھارت کے موضع لکھی پور کے جاگیردار کے گھر ڈاکہ ڈالنا تھا ——— لکھی پور سے پانچ میل اتر کی طرف ایک جگہ ہے جو اندھا کنواں کے نام سے مشہور ہے۔ اس اجڑے ہوئے کنوئیں کے قریب کسی پرانے بادشاہ کے کھنڈروں میں ہم رات کے ساڑھے گیارہ بجے جمع ہوئے ——— ہمارا سردار اس دن بہت دیر سے پہونچا۔ اس کے آنے سے پہلے ہم سب کی نگاہیں کھنڈروں سے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں کچے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔ اور ہم بہت بے صبری سے اس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ سردار جب غیر حاضر ہوتا تو سارے گروہ کو سنبھالنے کا ذمہ میرے سر پر آ جاتا۔ میں اس کا دایاں ہاتھ تھا۔ لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ مجھے بھی اس کی بابت کچھ علم نہ تھا ——— جب انتظار کرتے ہوئے ہمیں آدھا گھنٹہ بیت گیا تو میرے دل خیال آیا کہ آج کا پروگرام ملتوی کر کے سبھی کو جانے کے لئے کہہ دوں ——— پھر خیال آیا کہیں سردار پکڑا نہ گیا ہو۔ لیکن اس کا پتہ کیسے لگایا جائے۔ اتنے میں پیچھے سے

آواز آئی ـــ

"ہریئے ـــ!" ہم سبھی چونک گئے، اندھیرے میں ہم سب کی پشت پر ایک پتھر کے قریب ہمارے سردار کا کالا سایہ کھڑا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے ہم سُن ہو کر کھڑے رہے۔ جانے کیوں میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے سردار نے مجھے پھر بلایا۔ میں اس کے قریب گیا تو میرے ہاتھ میں مشعل دیتے ہوئے اس نے کہا۔ "اسے روشن کرو!"

میں نے مشعل روشن کی اور ہم سب کی نگاہیں سردار کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بڑا بکس تھا اپنے پاس ہی ایک پتھر پر رکھ کر اس نے مجھ سے کہا۔

"اس بکس کو کھول کر یہ روپیہ سبھی آدمیوں میں تقسیم کر دو"

ہم بہت ہی حیران تھے۔ جانے سردار کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کے سارے جسم میں وہ پہلے جیسا تناؤ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تھک گیا ہے۔ اور نڈھال سا ہو کر کھڑا ہے۔ لیکن اس سے پوچھنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ جب سبھی نوٹ بٹ چکے تو سردار اس پتھر سے بکس کو نیچے رکھ کر خود اس پر کھڑا ہو گیا۔ بلند آواز میں وہ بولا۔

دوستو! آج سے اسی وقت سے میں اس گروہ کو توڑ رہا ہوں۔ اب تک تم لوگوں نے میرے حکم کو ایمان سمجھ کر مانا ہے۔ اسی طرح میں چاہتا ہوں میرا یہ آخری حکم بھی تم تا حیات ماننے کی قسم کھاؤ"

اس کی تھرتھرائی ہوئی آواز بند ہو گئی۔ اور ایک منٹ تک اس سنسان جگہ پر یوں خاموشی چھا گئی۔ جیسے صدیوں سے اس طرح موت کی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ میں آگے بڑھ کر سردار کے پاس آ گیا۔

"آپ کا حکم ہم نے آج تک جان کی بازی لگا کر بھی مانا ہے پھر سردار کے دل میں شک کی گنجائش کیوں پیدا ہوئی؟"

سردار کی کپکپاتی ہوئی آواز ایک بار پھر خاموش فضا میں تیری ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے کالے لبادے میں رو رہا ہو ـــ

"یہ حکم ہی کچھ ایسا ہے کہ میرے دل میں شک پیدا ہوا ہے میں چاہتا ہوں کہ آج سے اس گروہ کا کوئی آدمی چوری نہ کرے۔ آئندہ ڈاکہ نہ مارے۔"

پھر اسی طرح خاموشی چھا گئی، ہم سبھی حیران تھے۔ سردار کو آج کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ ہم کچھ بھی جواب نہ دے سکے۔ اس بار سردار کی مضبوط اور بارعب آواز فضا میں تیری ـــ

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ میرا آخری حکم ماننے تیار نہیں ہو ـــ"

میں نے جلدی سے کہا: "نہیں سردار یہ بات نہیں۔ ہم سبھی آپ کے حکم سے حیران تھے" پھر سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا ـــ "میں جانتا ہوں ان سب کا جواب کیا ہے۔ ہم سبھی ڈاکہ نہ ڈالنے کی قسم کھاتے ہیں۔"

"یوں نہیں ـــ آگ کی اس جلتی ہوئی لو پر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی رکھ کر یہ قسم تم سب کو کھانی ہوگی" ہر آدمی باری باری آ کر آگ کی لو پر اپنی انگلی رکھ کر ڈاکہ نہ ڈالنے کی قسم کھاتا اور چلا جاتا، سب سے آخر میں میری باری آئی ـــ میں جب قسم کھا کر جانے لگا تو سردار نے مجھے پکارا۔

"ہریئے تم یہیں ٹھیرو۔"

جب سبھی لوگ چلے گئے تو سردار نے میرے قریب آ کر کہا: "ہریئے تمہیں یاد ہے تمہیں دس سال کے ڈاکے

جب تم اپنی بستی میں گھر کر رہتے تھے۔ اور میں نے پوچھا تب کیوں قسم کھایا تھا تم نے اس وقت کہا تھا۔ سردار یہ زندگی آج سے میری نہیں تمہاری ہے تمہیں جب اس کی ضرورت ہو مانگ لینا آج وہ وقت آگیا ہے ——" مجھے تمہاری زندگی نہیں چاہیئے بلکہ اس احسان کے بدلے میں ساری زندگی اس قسم کو نبھانے کی بندھ جانا چاہیئے —— میرے بعد تم ہی ایک ایسے شخص ہو جو اس گروہ کو پھر سے ترتیب دے سکتے ہو اگر تم ثابت قدمی سے اپنی قسم پر قائم رہے تو یہ گروہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گا۔"

میں سردار کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا —— سردار آپ میری قسم پر یقین کریں۔ میں راجپوت ہوں اور راجپوت کا وعدہ پہاڑ کی طرح اٹل ہوتا ہے ——"

سردار نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہریئے یہ کام اتنا آسان نہیں، پھر بھی میں دعا کرتا ہوں کہ تم اپنی قسم نبھانے میں کامیاب ہو جاؤ!"

یہ کہہ کر سردار اٹھا اور کھنڈروں سے باہر پھیلی ہوئی تاریکی میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ ہریا خاموش ہو گیا۔ جوالا سنگھ جی نے سگریٹ کا آخری ٹکڑا کھڑکی سے باہر پھینک دیا ——

"اگر تمہارے پاس اتنا روپیہ ہے تو میرے پاس نوکری کیوں کر رہے ہو۔؟"

ہریا مسکرا دیا —— "اس بات کو آج آٹھ مہینے ہو گئے ہیں، سردار کی وہ بات اب میرے کانوں میں گونج جاتی ہے۔ اتنے دنوں تک ڈاکہ ڈالنے کے بعد ڈاکہ چھوڑنا کتنا مشکل ہے۔ اس کا احساس مجھے بعد میں ہوا اماوس کی رات کو میرے بدن سے ڈاکہ ڈالنے کی شدید خواہش کے جو شعلے اٹھتے ہیں ان پر قابو پانے کے لیے مجھے اپنا کیا حال کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ میں نے سوچا، نوکری کر لو دل لگا رہے گا اور اس طرح اس بات کا خیال نہ آئے گا لیکن میرا خیال غلط نکلا —— کاش میرا سردار میری جان لے لیتا۔ یا بیس سال کے ڈاکے میں مجھے مر جانے دیتا تو میری یہ حالت نہ ہوتی۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ آدمی اپنی خواہش کا کتنا غلام ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر ہریا خاموش ہو گیا —— جوالا سنگھ جی نے کہا "ہری سنگھ! میں بہت خوش ہوں کہ اتنی مصیبتوں کے بعد بھی تم اپنی قسم نبھا رہے ہو —— میرا اپنا خیال ہے کہ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید کب کا پھر چوری کرنے لگتا آدمی دنیا میں ہر شے جیت لیتا ہے لیکن اپنے کو جیتنا اپنی خواہشات کو جیتنا، بہت بڑی بات ہے —— بہت ہی بلندی کی بات ہے۔"

" اچھا اب تم آرام کرو، یہیں لیٹ رہو۔"

ہریا جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ "نہیں سرکار میں تو بڑا کڑا آدمی ہوں۔ یہ زخم تو کچھ بھی نہیں، یہ گھاؤ تو میرے بچپن ہی سے لگتے ہوئے ہیں، آپ آرام کریں، رات بہت بیت چکی ہے میں اپنی کوٹھری میں جاتا ہوں۔

اماوس کو دو دن باقی تھے۔ جوالا سنگھ جی نے اس شام ہریئے کو بلا کر اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ بنگلے سے وہ پیدل دور شہر کی طرف چل پڑے —— ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی۔ اور شام سرد تھی۔ جوالا سنگھ جی نے

سردار نے ہریے کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"دیکھو ہری سنگھ! مجھے تم سے ایک ضروری کام آپڑا ہے ——— جس کے لئے میں تمہیں لے جا رہا ہوں، اس عمارت کے بڑے ہال کے بیچ میں ایک خوبصورت اور قیمتی غالیچہ بچھا ہوا ہے۔ اس غالیچہ پر دس سال سے میری آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ میں اس کے مالک کو منہ مانگا دام دینے کے لئے تیار ہوں لیکن وہ کسی قیمت پر غالیچہ کو بیچنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ——— دراصل میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ غالیچہ تم ——— وہ غالیچہ تم مجھے لا دو"

ہریا چلتا چلتا رک گیا۔ ایک لمحہ اس نے جوالا سنگھ جی کو گھور کر دیکھا ———

"آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں اس غالیچے کو چرا لاؤں؟"

"ہاں ——— !" جوالا سنگھ جی نے انتہائی گمبھیر لہجے میں کہا ———

"نہیں ——— میں ایسا نہیں کروں گا!" یہ کہہ کر ہریا پلٹ کر جانے لگا۔ جوالا سنگھ جی نے اسے پکارا۔

"ہری سنگھ ———" ان کی آواز میں تمکنت تھی ہریا کے چلتے قدم رک گئے۔

"ہری سنگھ! یہ کام تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ تم یہ چوری کسی لالچ کے لئے نہیں کر رہے ہو، اپنے لئے تو نہیں کر رہے ہو ——— یہ چوری تم میرے لئے کر رہے ہو۔ کسی اور کی خاطر کر رہے ہو ———"

ہریے کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ جھک کر اس نے جوالا سنگھ جی کے دونوں ٹخنوں کو پکڑ لیا۔

"سرکار میں آپ کے پاؤں پکڑتا ہوں، مجھے اس کام کے لئے نہ کہیں ——— میری یہ جان حاضر ہے میرے جسم سے نوچ کر نکال لیں لیکن مجھ سے یہ کرنے کے لئے نہ کہیں ———"

جوالا سنگھ جی نے ہریے کے شانے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "ہری سنگھ یہ کام تمہیں کرنا ہی ہوگا ——— اپنی زندگی کی آخری چوری! اس کے بعد تمہاری توبہ نبھانے میں میں تمہاری مدد کروں گا، میں نے اس دن نہیں کہا تھا کہ آدمی دنیا میں سب کچھ جیت سکتا ہے۔ لیکن اپنی خواہش کو جیتنا اس کے لئے بڑی بات ہے ——— ذرا سوچو اس غالیچہ کی خواہش کو میں نے اپنے دل میں کس طرح سے دبا رکھا ہوگا۔ اس کا تو ذرا اندازہ کرو۔ مجھے اپنی مدد سے آج اس خواہش سے آزاد کر دو۔"

"کہیں اپنی خواہش کو پوری کرنے کے لئے آپ مجھ سے بہت بڑی قیمت مانگ رہے ہیں۔ اور پھر سردار کو معلوم ہو گیا تو ———"

"تم کیوں اس سے ڈر رہے ہو وہ نہ جانے اس وقت کہاں ہوگا اور پھر میں تو تمہاری مدد کروں گا۔"

ہریا جواب میں خاموش رہا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیوں جوالا سنگھ جی کی مدد کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی ——— اور ——— اور پھر اماوس کی رات بھی تو قریب ہے ——— وہ رات ——— پرسوں رات ———

ہریے پر ایک عجیب سا نشہ طاری ہونے لگا۔ اس نے جوالا سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلو سرکار واپس چلیں ——— اماوس کی رات پرسوں ہے ———"

اماوس کی رات کا آخری پہر تھا۔ ہریا ایک خوبصورت سفید عمارت کے نیچے کھڑا ہو کر عمارت کا جائزہ لے رہا تھا اس نے ایک بار ادھر ادھر دیکھا اور دوسرے ہی لمحہ پائپ کے سہارے وہ آن کی آن میں عمارت پر چڑھ گیا۔ اوپر جا کر اس نے ایک بار نیچے کی طرف دیکھا اور پھر جست لگا کر مکان کی چھت پر کود گیا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ جوالا سنگھ جی کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق ہال کے دروازے پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کو اس نے آہستہ سے دھکا دیا۔ لیکن دروازہ اندر سے بند تھا اس نے جیب سے ایک اوزار نکالا دروازے کے اوپر لگے ہوئے شیشے کو ایک منٹ میں توڑ دیا۔ اور ہاتھ اندر ڈال کر چٹخنی کھول دی۔ ایک بار پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دروازے کو آہستہ سے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ایک بار تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ ایک خوبصورت غالیچے کے پاس کھڑا تھا۔ نیچے جھک کر اس نے جلدی جلدی غالیچے کو رول کیا اور انہیں قدموں سے ہال کے دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت آہستہ سے دروازے کے باہر نکلا۔ جونہی اس نے باہر قدم رکھا اس کی پیٹھ کے پیچھے ایک سخت لوہے کی چیز آ چبھی —

ہریے کے ہاتھ سے غالیچہ گر گیا۔ چونک کر اس نے پیچھے دیکھا اس کے عین پیچھے دیوار کے ساتھ ایک کالا سایہ چپکا کھڑا تھا۔ ہریے کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس کے منہ سے نکل گیا، سردار —"

"ہاں میں ہوں — !" پیچھے سے آہستہ سے آواز آئی

"یہ غالیچہ یہاں نہیں رہے گا۔ وہیں اپنی جگہ پر جائے گا —"

ہریے نے چپ چاپ اس غالیچے کو پھر اٹھایا۔ اور ایک بار پھر ہال کے اندر اسی جگہ پر آ کر پھیلا دیا پھر وہ دونوں آگے پیچھے مکان کے دالان سے ہوتے ہوئے باہر آ گئے۔ سائے نے کہا ادھر میرے ساتھ آؤ۔" اور مکان کے پیچھے راستے پر لا کر اس نے ہریے کو کھڑا کر دیا۔

"ہریے تم نے میرے ساتھ وشواس گھات کیا۔ تمہاری زندگی اب تمہاری نہیں میری ہے — میں تمہارے جسم سے زندگی کو کھینچ کر باہر پھینک دوں گا۔" ہریا چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ اس وقت کانپ رہا تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں — ؟" تم راجپوت ہو — تمہارا وہ وعدہ، تمہاری وہ پرتگیا کیا ہوئی — ؟ بولو — بولو — ؟"

اور آگے بڑھ کر اس نے ہریے کے دونوں شانوں پر بھرپور وار کیا۔ ہریا لوٹ کر اس کے قدموں میں جا گرا اس سے کچھ بن نہ پڑا۔ اس نے اس کے قدموں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اچانک ہی اسے محسوس ہوا کہ یہ فوجی بوٹ — یہ فوجی بوٹ تو — اور ایک قہقہہ اس کے منہ سے نکل گیا — سایہ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ ہریے نے ہنستے ہوئے کہا۔" سردار میں نے آپ کو پہچان لیا ہے — !"

ایک لمحہ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر سائے نے اپنا کالا لبادہ الگ کر دیا۔ وہ جوالا سنگھ جی ہی تھے۔ ٹھہری اور مضبوط آواز سے انہوں نے کہا۔ "ہاں میں ہی ہوں تمہارا

بے وفا، نامہرباں، یہ سچ ہے وہ ایسا تو تھا
مت کہو کچھ اس کو یارو جو بھی تھا میرا تو تھا

بھیڑ آتی ہے نظر میں کس جگہ ڈھونڈوں اسے
ایک چہرہ کچھ دنوں پہلے کہیں دیکھا تو تھا

رات آئی اور آ کے مجھ کو تنہا کر گئی
کہنے کو دن تھا تو میرے ساتھ اک سایہ تو تھا

اب تو اک مدت ہوئی کوئی صدا آتی نہیں
جن دنوں ٹوٹا تھا دل اک شور سا اٹھا تو تھا

ہم حسن کو جانتے ہیں آدمی اچھا نہ تھا
دو گھڑی کو پاس آ کے دل کو بہلاتا تو تھا

غزل

حسن کمال
[illegible] ایپا ہاؤس جی پٹیل اسٹریٹ
بمبئی - 1

شاید جو زہر شہر میں تھا کام کر گیا
خود سے ملے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا

پاگل کوئی اک اک سے یہی پوچھتا تھا کل
ہم سب کا ایک گھر تھا بتاؤ کدھر گیا

جب تک میں زندگی کو نہ سمجھا تھا جی لیا
جب آ گئی سمجھ میں تو بے موت مر گیا

سورج کو جنم دے کے جھلسنے کے واسطے
ٹھنڈی سی ریت چھوڑ سمندر اتر گیا

سوچا تھا اپنے دل میں سنواروں گا میں تمہیں
تم آئے تم کو دیکھ کے میں خود بکھر گیا

ہر شام کتنے درد سے دیکھا ہے یہ حسن
سورج کا خون پی کے سمندر نکھر گیا

بیک چھاپہ

۱. میرے کمرے کی اک رات

میرے کمرے کی دیواروں پر
کچھ لاشیں ٹنگی ہیں
مسہری کے سرہانے میز پر
بکھری ہوئی خونی کتابیں
کانپتے الفاظ کے منہ نوچتی ہیں
فرش پر
ٹوٹے ہوئے کچھ کانچ کے برتن پڑے ہیں
اور الماری پہ رکھے
ریڈیو کی گونجتی آواز بھی بکھرا رہی ہے
چند سائے کرسیوں کی آڑ سے
کیا جانے کس آسیب کا منہ تک رہے ہیں
اور میں بستر میں سمٹا دم بخود
کیا جانے کیسی ساعتوں کا منتظر ہوں

۲. مجبوری

آج اک لفظ کی موت پر
سارے الفاظ
کس درجہ مغموم ہیں
اپنے اپنے معانی سے محروم ہیں
دور تک
دشتِ تشبیہ و تمثیل میں
استعاروں کی تپتی ہوئی ریت پر
بے معانی کی دہکی ہوئی دھوپ ہے
میرے اشعار ہر غیر واضح علامت کے سائے تلے
چند لمحات کی زندگی کے لئے
خود کو محفوظ کرنے پہ مجبور ہیں

کیف احمد صدیقی
میونسپل انٹر کالج
سیتا پور (یو۔پی)

۴۸ پیکر حیدرآباد

آج سے تم اس کی مالک ہو۔

یہاں نہ شور ہے نہ ہنگامہ، پورب کی کھڑکی سے آنے والی چاندنیاں بھی سیج کر اپنی مست اور زندگی دیتی ہے، اور کمرے میں ایسے داخل ہوتی ہے جیسے اجازت مانگ کر اندر قدم رکھ رہی ہو، کوئی چیز اپنی جگہ نہیں چھوڑتی، گرد بھی نہیں جمتی، یہ ہمارے پرکھوں کی جائیداد ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آرہی ہے اور خاندان کی ہر لڑکی کو ملتی ہے، مجھ سے پہلے میری ماں کو ملی تھی اور آج میں تمہیں دے رہی ہوں، کاش کہ ....

ماں نے یہ باتیں کمرہ کھول کر اندر قدم رکھتے رکھتے کہہ دی تھیں۔

کمرہ بہت پرانا ضرور ہے لیکن سیلن اور گھٹن سے پاک، یہاں تین قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور جیسے وہ تینوں دولت مل جائے ....

ماں کی نظریں ایک تصویر پر جم گئیں، ہونٹ ساکت ہو گئے اور اندر کوئی بے آواز مشین پوری رفتار سے حرکت میں آگئی جس پر پرانی ریلیں چڑھی تھیں، پورب اور پچھم کی طرف کھلنے والی دو کھڑکیاں۔

سامنے روشندان ـــــ لیکن وہ اتنی بلندی پر تھا کہ دوسری طرف کی چیزیں نظر نہیں آرہی تھیں، کھڑکیوں میں سلاخیں کبھی رہی ہوں گی، اب نہیں تھیں، لیکن اُن کے پٹ دیمک کی پہنچ سے دور تھے

سپاٹ اور بے داغ دیوار پر ایک قطار میں کئی تصویریں آویزاں تھیں جن میں بیشتر مجسمات کا خاموش

شفق

کبیر گنج سہسرام (بہار)

اور بے حس و حرکت سفر جاری تھا۔ پوربی کھڑکی کے طاق
پر ایک کتاب رکھی تھی۔ جلد اور اندر کے صفحات میں اتنا
تضاد تھا کہ اوپر سے دیکھنے والا ضرور دھوکا کھاتا، کتاب
کی اندرونی حالت بتاتی تھی کہ اس کی باقاعدہ دیکھ بھال
کی جاتی رہی ہے۔ یہاں مجھے اس وقت تک رہنا
ہے جب تک میں یہ ساری باتیں دہرانے لائق نہ ہو
جاؤں اور وہ وقت نہ جانے کس منزل میں ہو۔

شابی کو پوربی کھڑکی میں دیکھتی ہوں۔ روبی اور شابی
اب تک یہ باتیں نہ دہرا سکیں حالانکہ اُن کی ماؤں نے
اُنھیں مجھ سے پہلے کمرہ سونپا تھا، شابی کہتی ہے، جب
تک اس کمرے سے باہر نہ نکلوں گی، وہ باتیں نہ دہرا
سکوں گی، روبی اور شابی بھی اس سے متفق ہیں لیکن میں
......میری بات دوسری تھی جب میں مالکن بنوں گی تب
فیصلہ کروں گی کیا واقعی ......لیکن یہاں دل بہلانے کی
کتنی چیزیں ہیں پھر......میرے خیالات ماں کے دماغ
میں ٹرانسمٹ ہو رہے تھے۔

پہلے پہل تمہارا دل ضرور گھبرائے گا لیکن یہاں اس کا بھی
علاج ہے، یہ کتاب جو طاق پر رکھی ہے اب تک سب کی
رازدار رہی، پھر یہ پوربی کھڑکی، اس نے بڑھ کر کھڑکی
کا پٹ کھول دیا۔

انسان عجیب جانور ہے جب تمہارا دل اس کتاب میں
بھی نہ لگے تب تم اس کھڑکی کو کھول کر اس کے قریب
کھڑی ہو جانا، بہت پرانی ہوا آئے گی جس کے ساتھ
بے شمار کہانیاں آئیں گی تم وہ کہانیاں سننا، ہر ذرہ ایک
کہانی سناتا ہے جنھیں سننے والے کان چاہئیں، پھر ان کہانیوں کو
سمجھنا بہت مشکل نہیں، ہاں تم بھی کہہ سکتی ہو......

پہاڑی ندی کے ساتھ نشیب میں بہتے ہوئے سنگ ریزے
اور مٹی کے گھروندے، اور کچھ پختہ گھروندے تنگ و تاریک
کھنڈروں کی شکل میں، مجھے یقین ہے اب ان میں بادلوں
اور الّوؤں کے گھونسلے ہوں گے، الو رات کی تاریکی میں
کریہہ آواز نکالتے ہوئے پر پھڑپھڑاتے ہوں گے، ابابیلیں
جو بدروحوں کی طرح سنسان دوپہروں میں بستی کا چکر کاٹ
کر واپس آ جاتی ہوں گی، کبوتروں کے تھپیڑوں سے بچنے
کے لیے کسی منہدم دیوار کے سائے میں مٹی میں جسم چھپائے
آنکھیں موندے بیٹھے ہوں گے لیکن ـــــ اُن کے
مٹ جانے کے بعد بھی جن کے یہ گھروندے تھے یہ اب
تک انھیں قائم رکھے ہوئے ہیں اور اس وقت تک
مستقل رہیں گے جب تک آخری اینٹ بھی نہ گر جائے۔

اچانک کہیں سے ایک خوشگوار آواز ابھری اور بتدریج
تیز ہوتی گئی، آواز کدھر سے آ رہی ہے، آسمان، بستی یا
چاروں طرف سے، عجیب سی گونج ہے اور اس کے ساتھ
ہی بے شمار قدم
پھر گھنٹیوں کا شور
اور تیز تیز قدم
اس بستی کو مرے گھر سے ملانے والی سڑک کبھی پختہ
رہی ہو گی لیکن بیل گاڑیوں نے اس میں جگہ جگہ پیوند
لگا دیئے ہیں، برسات میں ان گڑھوں میں پانی بھر جاتا
ہو گا اور پھر کسی تاریک رات کا مسافر......

[illegible] کھڑکی [illegible] بہت اچھی لگتی
کہ اس کھڑکی کے باہر ایک پوری فضا ہے جو کھل
کر نیلی ہو سکتی ہے [illegible] رنگ میں تبدیل
اور پھر.... میں نے اسے کھولنا چاہا لیکن ماں....
مجھے ہمیشہ کہتا تھا کہ بیٹی خبردار اس کمرے سے قدم باہر نہ
نکلے، ماں کو پھر کچھ یاد آیا اور وہ جاتے جاتے رک گئی۔
یہ کھڑکی کبھی نہ کھولنا۔

کیوں؟

میں نہیں جانتی لیکن آج تک کسی نے اس کی جرات نہ کی
کہ اگر ایک بار یہ کھل گئی تو پھر بند نہ کی جا سکے گی اور کوئی
ماں اپنی بیٹی سے یہ باتیں نہ دہرائے گی۔ کمرہ، روشن دان،
کھنڈر، کتاب اور کھڑکیاں...... کھڑکیاں، روشن دان،
کتاب، کھنڈر اور کمرہ...... کھنڈر، روشن دان، کھڑکیاں۔

اس کھڑکی کا کچھ مقصد ہونا چاہیے، دنیا کی کوئی چیز بے
مقصد نہیں تو پھر یہ پابندی....
اب تک کسی نے دیکھا بھی نہیں اور بغیر تجربے کے کسی چیز
کی افادیت کا کیا پتہ پھر....؟
شاید کا خیال صحیح ہے لیکن کیا ایک ہی راہ ممکن ہے؟ ایک
بڑے سوالیہ نشان کے بعد ہی کمرہ، روشن دان، کھنڈر،
کتاب اور کھڑکیاں.......
میں تو یہ کھڑکی ضرور کھولوں گی، پابندیاں توڑنے کیلئے
ہی ہوتی ہیں اور پھر کیا ہمارے بزرگ احمق تھے اور اگر
تھے تو میں اُن کی تقلید کیوں کروں، میں تو سامنے
دیکھوں گی، کھنڈر، کتاب، روشن دان اور کھڑکیاں۔
کھنڈرات میں کیا ہے؟ سسکتی ہوئی بے معنی ہوا،
چلتی ہوا رک گئی اور اب، میں یہ کھڑکی ضرور کھولوں گی
[illegible] نہیں رہ سکتا کہ میرے متحمل منحنی ہاتھوں
سے نہیں چھٹتے پٹ چرچرائے، پھر گرد باتوں پر
گری اور کبھی کھڑکی کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر پٹ کے
نیچے گرا اور سسکنے لگا، خدا کی پناہ جہالت کی حد ہو گئی،
کمرہ، روشن دان، کتاب اور......
کمرے کی باڑھ، گل، شبو، جیسمین، بیوگن بیلیا، عمارتیں،
کاریں، شاہراہیں، صرف بیٹ، ملبوسات، خوشبو،
روشنی اور ہوا..... میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔
حیرت ہے بی کھڑکی میں تجھ پر شرمندہ ہوں، آج تھا

دیوار پر ٹنگی تصویریں لرزنے لگیں، کبھی ہوا تیز ہو گئی
تھی، پھر زوردار جھٹکا ہوا اور بیگمات کے چہروں پر
ریزوں کے زخم لگے اور خون رسنے لگا۔
کتاب ورق ورق ہو کر روشن دان کی طرف جا رہی تھی۔
بگولوں کے رقص میں عمل کا ڈوپٹہ۔

میں نے گھبرا کر کھڑکی بند کرنی چاہی لیکن پورا زور صرف
کر دینے پر بھی پٹ ٹس سے مس نہیں ہوا، کبھی ہوا
کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

میں نے بے بسی سے پوری کھڑکی کو دیکھا اور سینے کو
ڈھکنا چاہا، اُسی وقت ماں گھبرائی ہوئی داخل ہوئی۔
یہ کیا کیا تم نے؟ میں نے منع کیا تھا نا، کبھی کھڑکی
کبھی نہ کھولنا!!
■■

[illegible]

نذرِ غالب

حرف ہو چکیں ہیں رات کی سب آیتیں بھائی
نئے پیغمبروں پر اب نئے سورے اترتے ہیں
جو اپنے دور کے معیار پر پورے اترتے ہیں
نئے معنی دکھاتی ہے نئے لفظوں کی رعنائی

نئی دھوپوں میں پچھلی رات کے سب خواب زرد ہوئے
مسائل نور کی ہر بوند پی لینے کے عادی ہیں
ادھر ہم بھی نئے سورج اگا دینے کے عادی ہیں
کہ ہم ڈرتے ہیں اپنے قد سے بڑھ جائیں نہ یہ سائے

غلط ہے یہ کہ ہم ماضی کی تصویروں سے جڑتے ہیں
مگر یہ سچ ہے اپنا درد اپنا درد ہوتا ہے
ترے لہجے میں اپنا غم سمونا ایک دھوکہ ہے
نئے اوراقِ قلم پیچیدہ تحریروں سے جڑتے ہیں

"تو" اپنے دور کی آواز تھا یہ مانتے ہیں ہم
مگر جو غم ہے اپنے دور کا پہچانتے ہیں "ہم"

نذرِ ملٹن

بڑے مزے میں تھا تینتیس [33] سال تک ملٹن
غمِ حیات سے جب اسکو بے خبری بھی نہ تھی
مزے کی بات تو یہ ہے خود آگہی بھی نہ تھی
ادا ادا سے نمایاں تھا اس کے بھولا پن

ہوئی نہ تھی ابھی حالات سے شناسائی
نہ گھر کی فکر نہ باہر سے خوف آتا تھا
بڑے سکون سے ہر روز بیت جاتا تھا
ملا نہ تھا ابھی اس کو شعورِ تنہائی

یہاں یہ حال کہ تینتیس [33] سال کا عرصہ
پلک جھپکتے تو کیا بیتا کہ راہوں میں
ہزار موڑ تھے خوں مانگتی پناہوں میں
کٹا ہے جاگتے، خواب و خیال کا عرصہ

اسے ملال رہا دورِ لاشعوری کا
ہمیں ملال یہاں اپنی باشعوری کا

رؤف خیر
۶۲۵ - الاوہ شیخ بھائی، کاروان، حیدرآباد - ۶

غم دولتِ دستا کہیں جسے — دنیا کہیں جسے کبھی عقبیٰ کہیں جسے

جبہ تمام نقشِ کفِ پاک ہے مگر — منزل کہیں، مراد کہیں، کیا کہیں جسے

ہے آدمی بذاتِ خود اک محشرِ خیال — کیونکر ہجوم شوق میں تنہا کہیں جسے

خندہ بھی جو کربِ دل کا ہے پردہ دار — ناکامیوں کا اپنی سہارا کہیں جسے

وہ حسن کیف ساز ہے سوزِ دروں نواز — وہ دردِ عشق، حسن سراپا کہیں جسے

اپنا مقام شورشِ عالم سے ہے الگ — دل کا وہ ایک گوشہ ہے دنیا کہیں جسے

غم توڑتا ہے غم کی حدوں کو یہ بجا سہی — وہ غم کہاں سے لاؤں مداوا کہیں جسے

ہوش و خرد کا جس سے توازن ہے برقرار — میخانۂ شباب کی صہبا کہیں جسے

رونق برائیوں پہ کسی کی نہ جائیو
ایسا بھی کوئی آج ہے اچھا کہیں جسے

رونق دکنی سیمابی
سینٹ کراس روڈ ۶، پوسٹ آگریکو، جمشید پور-۹

غزل
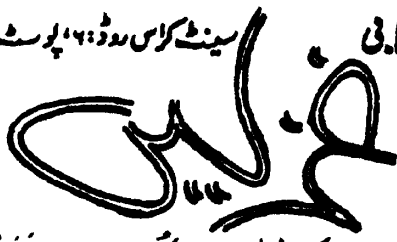
تیری صورت ہے کہ غزل — مدھر، پیاری، سرس سرل

منزل زیادہ دور نہیں — ہے یہ شرط کہ چلتا چل

چھن بھر کو سستا لیتے — ملتا گر تیرا آنچل

لگتا ہے اک ٹھور نہیں — گوری کا چت ہے چنچل

کل ہے نام قیامت کا — کہتی ہو، آؤں گی کل

جب سے تجھ کو دیکھا ہے — مچی ہے من میں اتھل پتھل

بجھی بجھی سی تو کیوں ہے — آ میرے نزدیک مچل

من کی بات خدا جانے — غازے سے منہ ہے اجول

لگتے ہیں پربت ناوک
مجھ کو جیون کے ہر پل

ناوک حمزہ پوری
ہیڈ ماسٹر ایم ای اسکول۔ ڈاک خانہ سوندا ضلع ہزاری باغ (بہار)

یوسف عثمانی
ابن کلینک بیگم پورہ
اورنگ آباد

چلو یہ مان لیتے ہیں

چلو یہ مان لیتے ہیں
کہ نفرت اک حقیقت ہے
مگر کوئی حقیقت سے اگر نظریں چراتا ہے
طبیعت چاہتی ہے
اس حقیقت کا ہم ہی اس سے کیوں اظہار کروائیں؟

محبت اور نفرت کے شجر دل سے نکلتے ہیں
ہماری آرزوں اور جواں جذبوں کا خوں پی کر پنپتے ہیں
مگر بیکار ہیں دونوں
کہ یہ آرام کے بدلے ہمیں آلام دیتے ہیں
سکوں کی چھاؤں ان سے مل نہیں سکتی
چلو ان کو جلا ڈالیں
چلو ان کو جلا ڈالیں
مگر پھر کس شجر کی چھاؤں میں آرام پائیں گے؟

چلو یہ مان لیتے ہیں
کہ سچائی محبت ہے
محبت کے لئے لیکن
کرو جذبوں کی قربانی
سکوں کا ایک لمحہ تک میسر آ نہیں سکتا
ملیں جس سے
یہی خواہش رہے دل میں
محبت ہی محبت گفتگو کا بس رہے عنواں
اگر ہم سے وہ دوری چاہتا ہے
تو خود ہی بچھڑ کر پوچھیں
محبت ایک سچائی ہے اس سے کیوں گریزاں ہو؟

اسلم عمادی

عمادی منزل ۱۰-۴-۳۰

ہمایوں نگر حیدر آباد - ۲۸

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

(غالبؔ)

ایک دلچسپ شعر ہے لیکن جب میں اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ شاعر نے کون سا مصرعہ پہلے کہا ہوگا۔؟ تو کشمکش سے دوچار ہو جاتا ہوں۔ اگر غالب نے پہلا مصرعہ پہلے کہا تھا تو دوسرا مصرعہ کہنا ایک آسان عمل تھا۔ (نسبتاً) لیکن فرض کیجئے کہ انہوں نے دوسرا مصرعہ پہلے کہا تھا تو اس پر آتنا پرمعنی مصرعہ لگانا کمال ہے! یہی دردی کرب اور حقیقی درد ایک اچھی شاعری کے صورت گر ہیں۔ جو شاعر کو خود بخود ایک صورتِ اظہار کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔

میں مطالعہ کے دوران، شاعری کے تین ابعاد پر نظر رکھتا ہوں۔ (۱) خارجی (۲) داخلی (۳) صوری

شعر کا خارجی رخ وہ ہے جو ایک صاحبِ بصر شاعر اپنے دامان نگاہ سے حاصل کرتا ہے۔ حالانکہ جس زاویے سے شاعر منظر کو دیکھتا ہے وہ اکثر عام نگاہ سے جدا ہوتا ہے۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے

پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے (دوستی)

۵۶ بیکر حیدرآباد

اس شعر میں آپ دیکھیں گے کہ شاعر نے مجبوری کے ماتھے کے پسینہ کو منتخب کیا اور ایک ایسا خط بنایا کہ اسے "فی البدیہہ" انداز میں اس شعر کے کہنے پر مجبور کر دے!

سونا ہوں کرید کر تو دیکھو

مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں!

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

اس شعر میں بھی شاعر نے خارجی منظر سے اپنا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ اس منظر کے پیچھے کتنا شدید احساس ہے یہ ایک سخن شناس ہی جان سکتا ہے۔ اس طرح اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ایک بہترین منظر تلاش کرنا شاعری کی معراج ہے۔

بہت سے لوگ افتخار جالب کو نا شاعر سمجھتے ہیں لیکن میں انکو "حذف" کا عمدہ شاعر سمجھتا ہوں۔ "حذف" وہ فن ہے کہ شاعر بیرونی ماحول میں سے ہر چیز کے چہرے کو کچھ اس طرح برتے کہ ایک درونی شکل پیدا ہو جائے حالانکہ اس بیان کے درمیان سے جملے کے جملے اڑا لئے گئے ہوں۔ اس تسلسل کے ساتھ منظر سے حصول کہ شاعر کا زاویۂ نگاہ دو رہ کر تاری سے آ کر ٹکرائے۔ شعر کا خارجی DIMENSION کہا جائے تو بہتر ہے اس حذف کی ایک مثال دیکھئے:

فی صدور عوام خرخراہٹ، اکبو دبیلا،

وریدیں دمواس، نسیم، خوابیدگی کی

سنسان سائیں سائیں، مجروا دبا دربہ

تشخیص، طرفہ سیماب نشتر منجلاب

تذکیر منتشر نا دیئے خطوط عذاب تانیث

شاعری کے ابعاد

تھکانے صورت بچھائے راستے میں آئے
ہو جائے، غرق سڑکیں، ادھورے امکاں
خواب خستوں پر آدمی کا ہو چکا ہے ...

(قدیم بنجر — افتخار جالب)

دیکھئے شاعر کس طرح مختلف چیزوں پر مرتکز ہوتا ہے کہ ایک ریڑھ کی ہڈی کی طرح خیال مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ خارجی سمت سے حصول کی چند مثالیں اور دیکھتے چلئے —

پرندے

فضاؤں کی لہروں پہ
ننھے سفینوں کی مانند بہتے ہوئے
وسعتیں ناپتے ہیں —

(موسم کا المیہ — زبیر رضوی)

ان آنکھوں میں سیاہ ڈالیوں پر کھلے
کالی دانتے دار پتیوں کے گچھوں میں
وہ لال جو پھول کھلے ہیں
جاگتی رات کے شعلے ہیں —

(شعلے کی شناخت — عمیق حنفی)

(صاحب دیکھئے — میں ناموں کی گنتی تو نہیں کر رہا ہوں، بس چند مثالیں دے کر آگے بڑھ جاتا ہوں) خارجی عناصر کے بارے میں، کچھ تفصیل سے جاننے پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ تجربے ہیں جنکو ایک شاعر حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ ان تجربوں کو سمجھنے کے لئے قاری کے پاس خود اتنا تیز دماغ چاہئے کہ وہ فوراً انکے مشابہ مناظر تک پہنچ سکے۔ مثلاً زبیر رضوی کی نظم کے مذکورہ بالا ٹکڑے میں پرندوں کو دیکھ کر شاعر کے ننھے سفینوں تک پہنچنے میں جو ذہنی سفر ہوتا ہے اگر قاری اس کا ادراک کرلے تو شاعر کے خارجی حصے سے واقف ہو سکتا ہے!

اسی طرح غالب کے اس شعر کو دیکھئے —

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب!
ذرے اس کے گھر کی دیوار کے روزن میں نہیں

اس شعر میں کیا سارے مناظر حقیقی ہیں۔ !؟ ایسا تو

نہیں ہے۔" اجزائے نگارِ آفتاب" پورا مرکب ہی شاعر کے ادراک کا ایک حصہ ہے۔ ممکن ہو کہ شاعر نے کسی جانور یا کسی شخص کی آنکھوں میں کوئی چمک دیکھی ہو اور نگارِ آفتاب اور اجزائے نگاہ دو مختلف مرکبات تک پہنچا ہو۔ میں اس پورے مرکب کو خارج سے حصول ہی قرار دوں گا۔ اسی طرح جلتی ہوئی دیوا مسکراتی ہوئی شاخ، سنہری گھنٹیاں، روندی ہوئی دھول ایسے کئی تخیلات جو حقیقت میں غریب ہیں بہرحال خارج سے حصول کا نتیجہ ہیں۔ تشبیہات ــــ استعارات اور علامات سب خارجی عناصر ہی کہلائیں گے۔!

شاعری کی دوسری جہت اس کا داخلی حسن ہے یعنی وہ حسن جو شاعر کے درونی کرب یا فرحت کو اس طرح ظاہر کر دے جیسے وہ الفاظ کے اندر سے جھانکتے ہوں ــــ

کرتا ہوں جمع خود کو بکھرنے کے نام پر
جیتا ہوں اس نواح میں مرنے کے نام پر

(ظفر اقبال)

پہلے مصرعہ کو دیکھئے تو ایک منظر نگاہ میں آتا ہے کہ مرد جو روح مرگ کے عالم میں یکایک موجیں پانی جمع کر لیتی ہیں اس کے بعد یکایک بکھر کر فنا ہو جاتی ہیں۔ (یا ریت کے ایک پہاڑ کی مثال بھی دماغ میں آسکتی ہے) لیکن یہ آدمی ہے۔ اس کا جمع ہونا اور بکھر جانا شاعر کے اس احساس کے آئینہ دار ہیں جو اس نے اپنے سینے اور دماغ میں پیدا کیا ہے۔ آپ اس شعر کو جتنی مرتبہ پڑھیں گے وہ اتنا ہی معنی خیز ہوتا جائے گا۔

دروں کا اظہار بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بیروں کا اظہار ہو لیکن جب ہم اس خارجیت سے گذر کر معنی میں داخل ہو جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ شاعر نے اس شعر میں کہیں وہ بات کہی ہے جو اس کے اندر تھی مثلاً

دریا کے کنارے پہ مری لاش پڑی تھی
اور پانی کی تہ میں وہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا

(عادل منصوری)

اس شعر میں شاعر نے منظر میں ایک دریا کے کنارے پر ایک لاش دیکھی اور یہ محسوس کیا کہ ایک شخص اس بات سے بے خبر پانی کی تہ میں، اسے ڈھونڈ رہا ہے لیکن وہ دریا کیا ہے؟ یہاں آپ شاعر کے داخلی احساس کے نا نوس میں داخل ہو جاتے ہیں اس لئے شعر اگر اچھا ہے تو اسکے خارجی پرتوں میں ایک داخلی روح تیرتی رہتی ہے۔ لیکن اب یہ سوچنا کہ کون پہلے خلق ہوا خیال یا منظر یہ ایک ناقد کا کام ہے۔ ایک اچھا شعر وہ ہے جو وجدان سے جنم لیتا ہے اور خیال اور منظر دونوں کچھ اس طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ دونوں کو علٰحدہ کرنے اور دونوں میں تقدم دریافت کرنے کے لئے ایک کیمیائی عمل درکار ہوتا ہے۔ چند مثالیں لیجئے (داخلی پہلو کی شاعری کی)

ساحلِ آب و سراب ایک ہے منزل منزل
تشنگی کرتی ہے غرقاب نہ سیراب مجھے

(شہاب جعفری)

دکھی شام کے ہانپتے کانپتے جھٹ پٹے میں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شاعری کا اصل حسن اس کا داخلی کرب اور شاعر کا وہ جلتا ہوا احساس ہے جو بادلوں سے باہر آنے کے لئے تڑپتا ہے۔ شاعر اس فرض سے بری ہونے کے لئے ایک خاص منظر کا انتخاب کرتا ہے یہ انتخاب وجدانی بھی ہو سکتا ہے، جبری بھی ۔۔۔! زبان و بیان شاعر کی فطرت پر منحصر ہیں ایک اچھا شاعری وہ ہے جو ایک سبنے بنائے ضابطے کا حامل نہ ہو بلکہ شاعر کے نظریات کا دلیرانہ اظہار ہو چاہے وہ زہر ہو یا شہد ۔۔۔!!

میں یہاں پر دلیری کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ایک ہی شاعر مختلف رسائل میں چھپنے کے لئے یا مختلف احباب کی دل بستگی کے لئے مختلف رنگ کی نظمیں کہتے دکھتا ہے۔ جب یہ عالم آجاتا ہے تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جناب فلاں شاعر کہاں سے پیدا ہوا اور کہاں ختم ۔۔۔! کیا شاعر اپنی اس حرکت پر قابل تحسین ہے؟ نہیں اس لئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں پر پانی پھیر کر نو رستی شہرت کی طرف بھاگ رہا ہے؟ اس کی شاعری دروں احساس سے بے بہرہ ہو کر ایک ریڈیو رپورٹ ہی جاتی ہے۔ ابھی خدمت قدم تو ابھی انشا پردازی، ابھی ظرافت ہے تو ابھی فلسفہ ۔۔۔؟ اب ایسی شاعری کو پڑھنے سے تو بہتر ہے کہ اکبر و بیربل کے لطیفے پڑھے جائیں۔

زخمی آنکھیں

لمبا رستہ ہانپ رہا ہے
گرم ہوائیں چیخ رہی ہیں
دھوپ میں روشن کالے ذرّے
ناچ رہے ہیں
خوابوں کے کھنڈروں میں لاکھوں
زہریلے کیڑے مکوڑے
رینگ رہے ہیں
رنگوں کا دلدار طلسمی پیکر
گر کر ٹوٹ گیا ہے
ان گنت شیشے کی کرچیں
ٹوٹے ارمانوں کے خوں میں
ڈوب گئی ہیں
زخمی آنکھیں
تنہا تنہا
سہمی سہمی
حیراں حیراں
انجانے سُونے رستے کو
دیکھ رہی ہیں
ہانپ رہی ہیں

۶۲ پیکر حیدرآباد

وہ روشنی کی اک کرن
لباس زرد زرق میں
ہوا کے دوش پر سوار ہو کے
آئی بام سے
فضا کے سینۂ گداز کو لبوں سے چومتی
زمیں پہ ہو کے آئی تھی
وہ روشنی کی اک کرن
جھکی ہوئی نظر کا اک پیام دلربا بنی
دھڑکتے دل کا ساز گداز نغمۂ جواں بنی
دہکتے جسم کی رگوں کا قصۂ نہاں بنی
خموش سرخ ہونٹ کی عظیم آرزو بنی
وہ روشنی کی اک کرن
دمکتے ذہن کے حسین قصر زر نگار میں
بھٹکتی ڈولتی چلی گئی
ورق کے سادہ فرش پر
سمٹتے لفظ کے سیاہ قالب جمیل میں
اتر گئی

عزیز الرحمان
۱۳۰ ۔ ٹیکلاجی اسٹریٹ ۔ بمبئی ۔ ۸

جتنے بونے تھے وہ رہبر ہو گئے
اور ہم رستے کے پتھر ہو گئے

اجنبی بن کر لگا یہ سارا شہر
بند ہم کمرے کے اندر ہو گئے

دل کے زخموں کا بہت احساس تھا
میرے اک اک لفظ نشتر ہو گئے

وقت کے بگڑے خرافاتی خیال
دسترس سے میری باہر ہو گئے

ہم حسد کی آگ میں جلتے رہے
کتنے قطرے خود سمندر ہو گئے

کرتے ہی تقلیدِ فنِ آذری
آج سب فنکار آذر ہو گئے

تلخیٔ حالات کا ممنون ہوں
میرے احساسات پتھر ہو گئے

کچھ نئی قدریں لئے آئے ظہیر
لوگ سمجھے یہ پیمبر ہو گئے

روایتوں کے حجاب اب اٹھاؤ چہرے سے
اٹھے جھکے نئے جلوے نئے دریچے سے

ہر اک ادائے جنوں پر کڑی نظر ہے مری
میں بے نیاز نہیں زندگی کے رشتے سے

ادب تھا التفات بھی لیکن عقیدتاً نہ گراں
بچے ہیں میں نے جو کاغذ اٹھا کے رستے سے

مرے لئے نئے افکار لے کے آئے کوئی
نکل بچا ہوں میں اب حادثوں کے نرغے سے

حیات مانگ رہی ہے پناہ اس سے کہیں
جنوں ڈرا نہ کبھی رحمت کے فرشتے سے

کرن تراش رہا ہوں کوئی نئی سحر کے لئے
لگاؤ بس مجھے اتنا ہے آبگینے سے

یہ صبح و شام کبھی اجنبی نہیں لگتے
بچا ہوں گردشیں الجھی ہیں اس سلیقے سے

حیات اور گراں ہو گئی ہے اب یہ ظہیر
جو لے کے ہاتھوں میں پتھر اٹھے ہیں شیشے سے
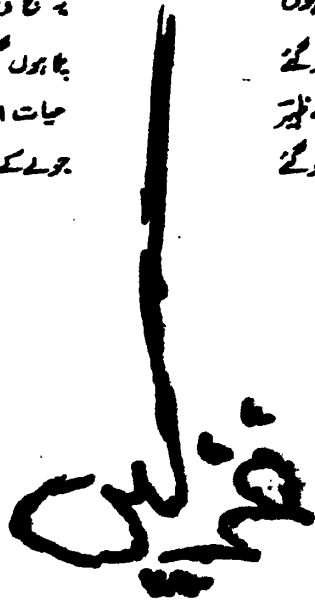
ظہیر غازی پوری
انچارج ریلوے آؤٹ ایجنسی ہزاری باغ ٹاؤن (بہار)

[illegible]

صدیق عثمانی

وہ فرش پر ایک کونے میں بچھے ہوئے بستر پر لیٹا بالکل ہڈیوں کا پنجر لگ رہا تھا۔ اس نے جاسوسی ناول تکیے کے پاس رکھ دیا۔ عینک ناک کی بانس پر اٹکائی اور کروٹ بدل کر گھڑی پر نظر ڈالی دوپہر کے دو بج چکے تھے۔ باہر سورج آگ اگل رہا تھا اور ہاؤزنگ بورڈ کے اس کمرے کے اندر گرمی سے دم گھٹا جا رہا تھا اسکی قمیص اور نیکر پسینہ سے نم ہو گئے تھے۔ ہاؤزنگ بورڈ کی یہ پانچ منزلہ بلڈنگ کسی بے آسرا بیوہ کی طرح سڑک کے کنارے دم سادھے کھڑی گرمی میں جھلس رہی تھی۔ اور اسکے اُتنی کمروں میں رہنے والے کرایہ داروں کی عورتیں اور بچے یا تو بالکونی میں آ بیٹھے تھے یا اپنے تپتے ہوئے کمروں میں لیٹے دستی پنکھے جھل جھل کر کچھ دیر کے لئے ستانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سراج علی رجب علی اپنے بستر پر اٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اسے کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا حلق اور سینہ سوزش سے جل اٹھے۔ اس نے قریب رکھا ہوا۔ اگالدان اٹھایا اور منہ کے قریب لے جا کر بہت سا بلغم تھوکا تکیہ کے نیچے رکھے ہوئے تولیہ سے اس نے اپنا منہ صاف کیا اور تولیہ کو کاندھے پر ڈال کر دریچہ کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اسکی بیوی احمدی بانو ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ آج گھر میں بالکل پیسے نہیں رہے تھے۔ اور وہ راہر ٹو انکل سے کچھ قرض لینے گئی تھی۔ جب سے سراج علی بیمار ہوا تھا، گھر کا خرچ یونہی چل رہا تھا۔ دفتر سے اسے چھٹی دے دی گئی تھی۔ جب سے سراج علی بیمار ہوا تھا گھر کا خرچ یونہی چل رہا تھا۔ دفتر سے اسے چھٹی دے دی گئی تھی۔ اور سرکاری ہسپتال میں رجوع کر دیا گیا تھا۔ جہاں دو مہینے تک اسکے جسم کی اسٹرپٹو مائیسین

کے ہاتھوں سے چھلنی کیا گیا اور اب اسے مزید چار مہینے تک آرام لینے اور مقوی غذائیں کھا کر دوبارہ طاقت حاصل کرنے کے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ میں نہ آرام دینے کی سکت تھی نہ مقوی غذائیں فراہم کرنے کی گنجائش اور بانو بڑی مشکل سے قرض حاصل کر کے ڈاکٹروں کی بتائی ہوئی ٹانکیں۔ انڈے۔ دودھ۔ ہڈیوں کے شوربے میوہ۔ گوشت اور مچھلی کا انتظام کر رہی تھی۔ کبھی وہ کسی سہیلی یا جان پہچان کی عورتوں سے تھوڑا ادھار مانگ لیتی لیکن زیادہ تر قرض اسے رابرٹو انکل ہی کے پاس سے ملتا۔ انکل کو سراج علی یوں تو کافی مدت سے جانتا تھا لیکن پچھلے چھ مہینے میں، جب سے اسکی صحت خراب ہونا شروع ہوئی تھی اور وہ اکثر بیشتر گھر ہی پر رہنے لگا تھا، یہ جان پہچان زیادہ بڑھ گئی تھی۔ بانو نے بتایا تھا کہ رابرٹو انکل سے اس کے باپ کی بہت دوستی تھی۔ اور وہ اسی زمانے سے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ سراج علی نے اپنے سسر کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اسکی ساس نے بھی کبھی رابرٹو کا ذکر اس کے سامنے نہیں کیا تھا۔ اب تو اسکی ساس بھی رتنا گری میں اپنے رشتہ داروں کے پاس چلی گئی تھی۔ اور سراج علی کو انکل کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرنے کا موقعہ نہیں تھا۔ اس قدر وہ جانتا تھا کہ رابرٹو فورٹ میں وہ اسپائر ہوٹل کا منیجر ہے۔ وہ ایک شریف، رحم دل اور شیریں زبان بڈھا تھا۔ جو دو ہفتہ میں کبھی کبھار مزاج پرسی کے لئے آجاتا تھا اور ہمیشہ دو پیسہ دو روپے میوہ کے لئے دے جاتا تھا۔ ان کیمپ زیادہ پیسوں کی [illegible] خود جا کر انکل سے قرض لے آتی۔

پیسوں کی ضرورت تو اسے ہمیشہ ہی رہا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے مہینے میں زندگی بسر کرنا ایسا ہی ہے جیسے تنے ہوئے رسے پر چلنے کا کرتب۔ ذرا بھوک ادھر اُدھر ہوا اور بس سارا بجٹ دھڑام سے نیچے آگرا اور رسی پر دوبارہ چڑھنا مشکل ہو گیا۔ کبھی بالوں میں ہے تو کبھی تیل نہیں۔ کسی مہینے کبھی کوئی بیماری آگئی تو مہینہ بھر دودھ بند کرنا پڑا۔ کبھی ایک ایش ٹرے یا پتلون بنائی تو بس کا کرایہ غائب۔ کبھی کسی دوست کو کھانے پر بلا لیا تو اس ہفتہ فکر کا راشن گل۔ وہاں دفتر سے ہفتہ دو ہفتہ میں کبھی دو چار روپے کی بالائی آمدنی ہو جاتی تو کچھ یا بھرم کی سیر کا خرچ نکل آتا ورنہ سارا مہینہ اسی ادھیڑ بن میں بسر ہو جاتا کہ کس طرح دوستوں کو گھیر کر ان سے چائے پی جائے اور انکی سگریٹ کی ڈبی پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ شروع شروع میں ایک دو روپے تو وہ آفس میں اپنے سپرنٹنڈنٹ سے بھی مانگ لیا کرتا تھا۔ لیکن جب ان پیسوں کے لوٹانے کی نوبت نہیں آئی تو لوگوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور اب تو رابرٹو انکل اور بانو کی سہیلیوں کے سوا اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ بڑے دنوں سے وہ کبھی نہیں ملا تھا بلکہ الٹا انہیں پر اپنی فارغ البالی کی دھونس جماتا رہتا تھا۔ "کیا ہو رہا ہے پہلوان؟" احمد بھائی نے دروازے میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

چمکارا —

"نہیں جائے گا۔ ایک آنہ دے۔ نہیں تو نہیں جائیگا" رحمت اپنے باپ کی چڈی ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"اچھا لے۔ بھاگ" سراج نے چڈی کی جیب سے پانچ پیسے نکال کر رحمت کے ہاتھ میں تھما دیئے اور وہ اسی طرح دروازے کو بھڑبھڑاتا ہوا واپس بھاگ گیا۔

"اب اسے اسکول میں شریک کرا دو۔" احمد بھائی نے مشورہ دیا۔

"ہاں احمد بھائی سینٹ میری میں درخواست دی ہے۔ داخلہ مل گیا تو ڈال دونگا" سراج نے بڑے فخر کے ساتھ بتایا۔

"وہاں تو عمر بھر داخلہ نہیں ملے گا۔" احمد بھائی بولا۔ "وہاں داخلے کے لئے تین سو روپئے چندہ دینا پڑتا ہے۔ پھر مہینہ کے مہینہ چھتیس روپئے فیس بھرنی پڑتی ہے یہ سب کہاں سے لاؤ گے۔ لونڈے کی عمر برباد مت کرو۔ اسے قریب کے میونسپل اسکول میں ڈال دو۔"

"تم کو تو معلوم ہے بھائی۔ ہماری فیملی ذرا اونچی ہے ہم اپنے لڑکے کو کیسے میونسپلٹی کے اسکول میں ڈالیں ہمارے باپ اکونٹینٹ جنرل آفس میں آڈیٹر تھے۔" احمد نے اسے بیچ میں ٹوک دیا۔ "وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ گورنمنٹ بہادر کی تنخواہ بھی وہی دیتے تھے اور انکی سات پشتوں تک سب ہی کلرک، آڈیٹر، اسسٹنٹ یا سپرنٹنڈنٹ تھے۔ یہ سب تم کئی بار کہہ چکے ہو۔" احمد بھائی نے نرمی سے اسے سمجھایا لیکن ان میں سے کسی نے بھی تمہیں کانونٹ میں پڑھنے کے لئے نہیں بھیجا۔ اس لئے کہ انکی آمدنی بھی ڈیڑھ سو روپئے مہینے سے زیادہ نہیں تھی۔ اب یہ فضول شیخی کی باتیں چھوڑ دو اور لونڈے کو کسی بھی اسکول میں ڈال دو۔ ورنہ وہ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

احمد بھائی نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور سگریٹ کو اپنے چمکدار نوکیلے جوتے سے مسلتا ہوا باہر نکل گیا۔

ہلکٹ — سالا ہلکٹ۔ سراج نے دل ہی دل میں کہا سالا دو پیسے کا آدمی ٹائی گاٹی باندھ کر۔ بوٹ پہن کر اپنے کو لاٹ صاحب سمجھتا ہے۔ سالے کو اتنی تمیز نہیں سگریٹ فرش پہ پھینک کے جاتا ہے اور دوسروں کو عقل سکھاتا ہے۔ اس نے اپنا سگریٹ دریچہ سے باہر گلی میں پھینک دیا اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ میں سب تیری حیثیت پہچانتا ہوں۔ سالا شراب کا بلیک مارکیٹ کرتا ہے اور اوپر سے دھونس جماتا ہے۔ ارے جا جا۔ میں تم لوگوں کو سب کو پہچانتا ہوں۔ بڑا دواؤں کا ایجنٹ بنتا ہے۔ یہ دھوکہ کسی اور کو دینا۔ میرے ساتھ یہ دھاندلی نہیں چلے گی۔ کبھی سی۔ آئی۔ ڈی میں کمپلینٹ کر دوں گا تو سب معلوم ہو جائے گا۔ سالے کہاں کہاں کے ہلکٹ لوگوں میں رہنا پڑتا ہے۔ اس ہاؤزنگ بورڈ کی کالونی میں تیرا باپ کیا پتہ موچی ہے یا بھنگی۔ یہاں بمبئی آکے سب سیٹھ بنتے ہیں۔ ابے جا میں تم سب کو پہچانتا ہوں۔ بیٹا گھر میں کھانے کو نصیب نہیں ہے۔ دال کھاتا ہے۔ سڑی ہوئی بھاجی سبزی دو چار آنے کی لاتا ہے۔ مگر باہر ٹائی پتلون پہن کر اکڑتا پھرتا ہے۔ تیری ایسی تیسی

تیرے جیسے باپ دادا کی عزت کیا بچائے گا۔ وطن کی
کا دھندا کرنے والے مددگار لوگ۔ ہم سب گورنمنٹ
کی نوکری کرتے رہے ہیں۔ گورنمنٹ کی ادھر کچھ آمدنی
میں آتا جاتا ہوں کیا عجب ہے۔ تیرے جیسے کتنے
سالے پاؤں پکڑتے ہیں ہمارے۔ ارے تو ٹکٹ
ہے۔ بڑے بڑے سیٹھ ادھر چکر مارتے ہیں آکے
میں کسی کو وہاں منہ بھی نہیں لگاتا اور ــــ کہ یہاں
تم جیسے لوگوں کے ساتھ بات کرنی پڑتی ہے تو ہمارا
بیماری کرتے ہیں۔ ارے جا تو کیا برابری کرے گا۔
آٹھ پاؤ کھا کے۔ میرے گھر میں ہر روز مچھلی پکے
ہیں۔ میرا لڑکا ہر روز انڈا کھاتا ہے۔ سالے
تیری عورت کو بھی بیضہ کھانے کو نہیں ملتا ہوگا۔
میری عورت کی سہیلی اتنی امیر لوگ ہیں۔ کبھی جاتی
ہے تو پندرہ بیس روپئے لے کر آتی ہے۔ اسکے
پاس سے تیری عورت کو کوئی سالا دس روپیہ بھی
نہیں دیتا۔ وہ سارا دن یہاں بلڈنگ میں گھوما
کرتا لڑکوں سے آنکھ لڑاتی ہے سالی۔ تو ہم کو بھی
اپنی طرح ہی کٹ سمجھتا ہے۔ میرا لڑکا یونیورسٹی اسکول
میں پڑھنے جائے گا؟ کیا سمجھتا ہے تو؟ تم لوگوں
کا دماغ دراصل باتوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ تم
لوگوں سے ہنسی مذاق کرتی ہے اس لئے تم خود کو ہمارے
برابر کا سمجھنے لگے ہو۔ مجھ سے ہمیشہ ٹیڑھی بات کرتا
ہے کمینہ۔ تیرا سگریٹ پیتا ہوں تو کیا تیرے باپ
کی کمائی کا ہے؟ تو بلیک کا پیسہ بلیک سے
لوٹتا ہے۔ تیرا پیسہ کھانا تو ثواب کا کام ہے۔ وہ
بولا ہی دل ہی دل میں کڑھتا رہا اور کھانستا رہا
اور بلغم کے بڑے بڑے لوتھڑے اپنے گدے کے گھولا
میں تھوکتا رہا جس کی کوفت اور گرمی سے اسکا دماغ
بھاری بوجھل ہو گیا۔ اور دودھ کا ایک گلاس پی کر وہ
اپنے میلے بچھونے پر لیٹ کر سو گیا۔

جب اسکی آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے۔ محراب میں
ٹائم پیس کے ارد گرد تازہ تازہ موسمی، سیب
کیلے اور چیکو بکھرے ہوئے تھے اور دیوار سے
ادھر موری میں برتن بج رہے تھے۔ وہ کوشش
کر کے ایک دفعہ زور سے کھانسا۔ اسکی کھانسی
کی آواز سن کر بانو دیوار کی اوٹ سے جھانکی اور
قریب ہی برتن میں رکھے ہوئے پانی میں ہاتھ دھو کر
اسکی طرف چلی آئی۔ کسی ہوئی چولی میں اسکے تنے
ہوئے سینے ننگے نیزوں کی طرح آنکھوں میں چبھ رہے
تھے۔ اور اسکے کولہوں اور رانوں کا زندہ گوشت
لہنگے کی پوسٹ پھاڑ کر باہر نکل آنے کے لئے بیقرار
ہو رہا تھا۔ شکل تو اسکی معمولی سی تھی لیکن اس کا
جاندار جسم ترشی ہوئی چٹان کی طرح پرکشش تھا۔
"جاگ گئے؟ موسمی لاؤں؟" اس نے لہنگے کی پشت
پر ہاتھ پونچھتے ہوئے پوچھا۔
"ذرا میں منہ صاف کر لوں۔" سراج علی بولا لیکن جب
وہ بستر سے اٹھنے لگا تو اسے پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔
اس نے پھر بلغم تھوکا اور ہاتھ منہ دھونے کے لئے
دیوار سے ادھر موری کی طرف چلا گیا۔ بانو نے دو
موسمبیاں اٹھائیں اور انہیں زمین پر رگڑ کر گلاس میں
انکا رس نکالنے لگی۔ جب گلاس رس سے بھر گئی

تو اس نے اسے سراج علی کے بستر کے پاس رکھ دیا
"کونسی پکچر دیکھی؟" سراج نے منہ صاف کرتے ہوئے
بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ ٹکٹ ہی نہیں ملا" بانو نے بہت
سپاٹ لہجے میں کہا اور محراب سے ایک سیب اتار کر
تراشنے لگی۔ "زینب بہن کے ساتھ میں اسکے گھر چلی
گئی۔ اور ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آئندہ جمعہ
کو زینب بہن نے پھر بلایا ہے۔ دن بھر کے لئے۔"
بانو نے سیب کی قاشیں ایک طشتری میں لگا کر
سراج کے آگے رکھ دیں۔

"آج میں دن بھر خوب سویا" سراج علی بولا۔ "احمد
بھائی نے بتایا تھا کہ تم پکچر گئی ہو — ارے یہ
احمد بھائی کیا دھندا کرتا ہے جی؟ مجھ سے کہتا تھا
رحمت علی کو میونسپلٹی کے اسکول میں ڈال دو،
اس نے غٹا غٹ موسمبی کا رس پی لیا۔ اور سرگوشی
میں اپنی بیوی سے پوچھا" اس کے پاس کئی چیز
کی ایجنسیاں ہے۔ انگریزی دوائیں بیچتا ہے۔
مالیجوں کی ایجنسی ہے۔ بجلی کے پنکھے اور سینے کی مشین
ہیں۔ اچھا خاصا دھندا ہے" بانو نے بتایا۔

"سب چار سو بیس ہے" سراج علی نے اسے
بیچ میں ٹوکا۔ "مجھے معلوم ہے۔ سالا شراب کا بلیک
مارکیٹ کرتا ہے۔ میں نے اسکی کھولی میں باٹلی
بھی دیکھی ہے" اس نے بڑی رازداری سے بتایا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے" بانو جھلا کر بولی۔ "تم دن
بھر یہاں گھر میں بیکار پڑے پڑے لوگوں کی برائیاں
ہی سوچتے رہتے ہو۔ فلاں بلیک مارکیٹ کرتا ہے۔ اس
کے گھر میں صرف دال چاول پکتے ہیں۔ اسکا ایک
کا دھندا ہے۔

"نہیں بانو تجھے نہیں معلوم۔ یہ لوگ دکھانے کو
ادھر ادھر کی ایجنسیاں لے بیٹھے ہیں۔ انکا اصل دھندا
کچھ اور ہوتا ہے۔ تو نے خواہ مخواہ اس کو واسپائر
ہوٹل میں کھولی دلا دی۔ یہ بے چارے رابرٹ کو
کو بھی کسی دن لے ڈوبے گا۔ کھولی کا بھاڑا واڑا
بھی یہ کچھ دیتا ہے یا نہیں؟" سراج نے سیب کی
قاشیں چباتے ہوئے دبی آواز میں پوچھا۔

"میرے سامنے فضول بک بک مت کرو" بانو
نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ سو روپے ہمیشہ بھاڑا دیتا
ہے۔ اور آج تک کبھی ایک دن کی بھی دیر نہیں کی
اس کا آفس جا کر دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں گی۔
کم سے کم ڈیڑھ دو ہزار کا کاروبار روز روز وہاں ہوتا
ہے"۔ اس نے دروازہ کھول کر بالکونی میں دائیں
بائیں دیکھا۔ "یہ رحمت سور کہاں مر گیا ہے۔ شام
ہو گئی ابھی تک گھر آنے کا نام نہیں لیتا"۔

"ارے بھائی اسے ابھی مت آواز دو" سراج علی
نے سیب کی دو قاشیں ایک ساتھ منہ میں ڈالتے
ہوئے کہا۔ اسکے اندر کو دھنسے ہوئے گالوں کی سیاہ
جھرّی ابھر آئی اور بندر کی طرح باہر نکلے ہوئے دانت
زور زور سے چلنے لگے۔ "وہ سالا آ کر یہ سارا سیب
کھا جائے گا"۔

بالکونی کے دلہنے سرے پر احمد بھائی اپنے کمرے
کے آگے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے بانو سے
آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا۔ کچھ کام ہے بانو۔

"ہاں" باتو نے کھوئے کھوئے انداز سے جواب دیا۔
"تھکے ہو؟" احمد بھائی نے چھوٹی انگلی کی جنبش
سے پوچھا۔
باتو نے جواب میں اپنی پانچوں انگلیاں احمد بھائی کو بتلایا
وہ ٹہلتا رہا سراج علی کے کمرے تک چلا آیا اور دریچے
سے جھانکتے ہوئے بولا۔ "کہو پہلوان۔ کیا عیش ہو رہا
ہے؟" "کچھ نہیں بھائی۔ ذرا سیب کھا رہا ہوں۔" سراج
علی نے ہتھیلی سے عینک درست کی اور دوسرے
ہاتھ میں طشتری لئے کھڑا ہو گیا۔ "لو بھائی تم بھی کھاؤ"
"ارے شیا ہے یار۔ دس گز دور کھڑے ہو کر کہہ
رہے ہو سیب کھاؤ۔ جانتے ہو میرا ہاتھ نہیں
پہنچے گا۔"
"ایسا نہیں ہے بھائی۔ لو۔" سراج طشتری تھامے
ہوئے ایک دم دریچے تک آ گیا۔ "لو بھائی لو۔"
وہ بولا۔
"ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔" احمد بھائی نے ہنستے
ہوئے کہا۔ "تم کھاؤ یہ سیب ویب۔ تمہارے عیش
کرنے کے دن ہیں۔"
"کیوں بھائی؟ آج بھنڈی دی کا ارادہ نہیں ہے؟"
سراج علی نے پوچھا۔
"پھر کھیلو گے رمی؟ ابھی پرسوں ہی چار روپے ہار بیٹھے
ہو وہ کافی نہیں ہوئے؟"
"اللہ مالک ہے۔ سب نکل آئیں گے کسی نہ کسی دن"
سراج علی نے طشتری صاف کر کے رسوئی میں رکھ دی
اسے ہلکا سا کھانسی کا ٹھسکا لگا۔
"اللہ مالک نہیں۔ جورو مالک ہے کہو میرے یار۔"

احمد بھائی دریچے کی سلاخوں تک منہ لے جا کر بولا۔
"بے چاری کہاں کہاں سے لاتی ہے تمہیں کیا معلوم۔ اور
تم ایسے جتے میں اڑاتے رہتے ہو۔ انہیں پیسوں کا
بکھیڑا ہے کھاؤ۔" احمد بھائی نے ہاتھ کے اشارے
سے سراج علی کو خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے کی طرف
پلٹ گیا۔ جاتے جاتے اس نے باتو کے آنکھ ماری جس کے
جواب میں باتو نے اپنی جوتی کی جانب اشارہ کیا اور
دونوں ہنسنے لگے۔ "ہٹ۔ سالا ہٹ۔ حرامی۔ مجھے
کہتا ہے۔ جورو مالک ہے۔ ارے تو ہو گا جورو کا غلام
تیری جورو ملاتی ہو گی اپنے یاروں سے کما کر اور تجھے کھلاتی
ہو گی۔ تو میری جورو کو بھی ویسی ہی کہتا ہے۔ ابے میں اپنی
بیوی کو اپنے قابو میں رکھتا ہوں۔ اسکی طبیعت خوش رکھتا
ہوں۔ کیا مجال وہ کسی کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ
لے۔ کیسے سے کیسا حسین آ جائے وہ اسے جوتی پہ بھی نہیں
مارے گی۔ سارے کرتی کیا میری طرح خوش کرے گا عورت
کو۔ تم لوگ کیا کھا کے خوش کرو گے سالے؟ اور تم لوگوں
کی جوروئیں بازار میں عاشقی نہیں کریں گی تو کیا کریں گی؟ خود
دس دس مردوں کے پاس جاتی ہیں میری بیوی دو چار دن
میں کبھی باہر نکلتی ہے تو تم سب جلتے ہو حرامی کہیں کے۔ وہ
مدھو ہی سالی۔ نمبری چھنال ہے کیسی نظروں سے مجھے تکتی
رہتی ہے اور میرے سامنے تو بھولی بات بے بات ہنستی رہتی
ہے۔ اور اس کا آدمی مجھ سے پوچھتا ہے "یہ بھابی فورٹ میں
کہاں جاتی ہے ہر روز؟" ارے جاتی ہے تیری عورت کے لئے
یار ڈھونڈنے۔ تو اپنی عورت کو تو سنبھال پہلے۔ تجھ سے نہیں
سنبھلتی ہو تو میرے پاس چھوڑ جا۔ دوسرے کی بیویوں کی کیا
کھوج کرتا پھرتا ہے؟ یہ سب شرارت اسی سالے احمد بھائی

کی ہے۔ وہی بلڈنگ والوں کو بہکاتا پھرتا ہے۔ اس کی
عورت کا جب بھی ہاتھ پکڑا لوں وہ خوشی سے چلی آئے گی
سالی بھینس ۔۔۔ اور میری بیوی کے متعلق جھوٹے الزام لگاتا
پھرتا ہے۔ ذلیل۔ ابے حرامی اگر اس نے انکل سے سفارش
نہیں کی ہوتی تو تجھے وامپائر ہوٹل میں کمرہ مل بھی سکتا تھا کبھی؟
عمر بھر سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔
اب مادر ـــــــــــــ کو آفس مل گیا ہے اسکے صدقے
میں تو مجھ پر اور میری بیوی پر فقرے کستا ہے۔ ہلکٹ۔ مجھ
سے کہتا ہے مجبور کرے کو میونسپلٹی اسکول میں ڈال دو۔ ارے
تو پہلے بچہ تو پیدا کر پھر اسے میونسپلٹی میں ڈالنا۔ اگر تیرا ہاتھ
نہ ہوتا ہو تو میرے پاس لا۔ میں پیدا کر کے دیتا ہوں ۔۔
سالا چار پیسے کمانے لگا ہے تو ٹریین سے کم کپڑا نہیں
پہنتا ہے۔ ٹائی باندھنے لگا ہے کمینہ کہیں کا۔ ارے تیرے
باپ نے بھی کبھی ٹائی باندھی تھی۔؟ ہر کلے سگریٹ پیتا
ہے اب۔ شیواجی بیڑی بھول گیا بیٹا؟ بزنس مین بنتا
ہے بزنس مین۔ ابے تیرا سب بزنس چٹکی بجاتے میں نکال
دوں گا۔ میں اپنے کمرے میں پڑا رہتا ہوں تو سمجھتا ہے مجھے کچھ
خبر ہی نہیں ہوتی؟ ارے میں تم لوگوں کا سب حال جانتا ہوں
دو کوڑی کا آدمی اور مجھ سے برابری کرتا ہے۔ میری بیوی کی
برابری کرتا ہے۔ ارے تجھے تو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ عمر بھر
یاد رکھے گا۔ سالے ہلکٹ۔ ایک ایک پیسے کے لئے بھیک
مانگتا پھرے گا۔ ہم کو تو جہیز بھی قرض، ادھار کچھ ال ہی جاتا ہے
تجھے تو بھیک سدی بھی نہیں ملے گی پتا شہ کہیں کا۔

دوسرے ہی دن صبح ہی صبح اٹھ کر اس نے کچا انڈا اور گلاس
بھر دودھ پیا۔ پھر خیو بنا کر گرم گرم پانی سے غسل کیا۔ غسل

۲۷ پیکر حیدرآباد

کرتے ہوئے اس نے سوچا پٹیل بھائی سے اسکی پرانی
دشمنی ہے۔ اگر پٹیل سی آئی۔ ڈی میں شکایت کر دے گا
احمد بھائی پکڑا بھی جائے گا اور پولیس میں خوب جلدی کی
چلے گی۔ ساری بلڈنگ کو دونوں کا حال معلوم ہو جائیگا۔

دس بجے چار چپاتی آدھ پاؤ مچھلی۔ ایک ابلا ہوا انڈا اور
کچھ ابلی ہوئی سبزی کھا کر اور ایک گلاس دودھ پی کر اس نے
بانو سے کہا کہ اسے ہسپتال جانا ہے۔
"آج کیسا ہسپتال۔؟ آج تو ہفتہ ہے۔ تمہارا دماغ تو نہیں گیا"
بانو نے یاد دلایا۔
"رات بہت کھانسی اٹھی تھی" سراج علی بولا۔
"رات تو تم گدھے بیچ کر سوئے تھے۔ ایک دو دفعہ ہی
معمولی سی کھانسی ہوئی تھی"۔
"پچھلی رات کو جب تم سو گئیں تھیں اسوقت بہت زور کی
کھانسی اٹھی تھی۔ سینہ بھی بہت جلتا ہے۔ سوچا ڈاکٹر کو
دکھا لوں آج۔ ایک دو روپے دیدینا مجھے" اس نے
نیازمندی سے کہا۔
"سب دھاندلی ہے" بانو چڑچڑاتے ہوئے بولی "مجھے
دھوکے مت دو۔ آج پھر کہیں پکچر دیکھنے کا ارادہ ہوگا۔
"تیری جان کی قسم نہیں۔ میں سیدھے ہسپتال جاؤں گا اور لوٹ
آؤں گا"
"میں بھی ساتھ چلوں گی" بانو نے دھمکی دی۔
لیکن وہ اس کے ساتھ نہیں گئی۔ سراج علی بس میں بیٹھ کر ہسپتال
گیا تو لیکن وہاں وہ کسی ڈاکٹر سے نہیں ملا۔ کچھ دیر ہسپتال کے
وارڈوں میں گھوم کر وہ باہر نکل آیا اور فورٹ کی دکانوں
میں نئے نئے کپڑے۔ خوبصورت گھڑیاں۔ پلاسٹک کے

[illegible] ۔ جب کچھ [illegible] ہوا تو وہ ہوٹل تک رک
کر دائیں طرف سے دیکھتے ہوئے واپس ہوٹل پہنچ گیا۔ دوسرے
دن کمپاس پہنچ گیا جہاں وہ چپراسی احمد بھائی کے آفس
میں جا دھمکا۔ چپراسی نے اسے بتایا کہ احمد بھائی کام سے
باہر گیا ہوا ہے۔ احمد بھائی کی خوب صورت گوری اسسٹنٹ
نے اسے بیٹھنے کے لئے کرسی دی۔ وہ احمد بھائی کے بڑے چکنے
چمکتے میز کو دیکھتا رہا۔ اس نے میز شیشے اور خوبصورت
دوات، قلم، کیلنڈر اور پیپر ویٹ کو بھی دیکھا۔ اس نے
ایک اور شوکیس میں رکھے ہوئے غالیچوں، شطرنجیوں، دوا
کے ڈبوں اور دواتوں، بجلی کے پنکھوں اور سینکڑوں چیزوں
پر تفصیلی نظر ڈالی۔ دوا کے ڈبے اور بوتلیں اسے مشتبہ
نظر آئیں۔ ایک کونے میں بیئر اور رم کی چند بوتلیں پڑی
تھیں۔ اسٹیل کی چند الماریوں کا بھی اس نے نگاہوں سے جائزہ
لیا اور اس پر رکھے ہوئے لکڑی کے خالی کیس کو بھی اس
نے غور سے دیکھا۔ لیکن پایا کچھ نہیں۔ دس منٹ انتظار
کرکے وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ راستہ میں تھوڑی دیر کے لئے
وہ پوسٹ آفس میں رکا اور پھر بس پر چڑھ کر گھر واپس
آگیا ——

اتوار کو وہ احمد بھائی سے بہت بے تکلفی سے ملتا رہا۔ بہانے
بہانے گھس گھس کر اس کے کمرے میں بھی کئی بار گیا۔
اسکی بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ اور دوپہر میں تو گھیر کر
اسے رمی کے لئے بھی راضی کر لیا۔ تاش کھیلتے ہوئے اسکی
نظریں بڑی احتیاط سے احمد بھائی کے کمرے کا جائزہ لیتی
رہیں۔ کمرے میں بھی ہر طرف دواؤں کی شیشیاں اور
ڈبے رکھے تھے۔ چھت میں اوشا کا پنکھا چل رہا تھا۔
شوکیس میں کتابیں رکھی تھیں۔ کرسیوں پر موٹے موٹے کشن
پڑے تھے۔ ایک کونے میں گودریج کی بڑی سی الماری
کھڑی تھی۔ محراب پر پردہ پڑا تھا اور جب احمد بھائی
نے سگریٹ نکالنے کے لئے پردہ ہٹایا تو سراج علی کی
تیز نظروں نے اسکی نادر رکھی ہوئی شراب کی بوتل
بھی دیکھ لی۔ لیکن احمد بھائی سے اس نے اسکا کوئی ذکر
نہیں کیا۔ اس نے احمد بھائی کی تیز ہوائی باتوں کا بھی
برا نہیں مانا انہیں ہنس ہنس کر سہتا رہا اور اس کے سگریٹ
پی پی کر پھونکتا رہا۔ اس نے بڑھ چڑھ کر احمد بھائی کی
تعریف بھی کی اور اس کی کاروباری سوجھ بوجھ کو بہت
سراہا بھی۔ لیکن احمد بھائی صرف مسکراتا رہا۔ اس نے
اپنے کام دھندے کے متعلق کوئی بات بھی نہیں بتائی
پھر سراج علی اپنی بلڈنگ میں رہنے والے ہر شخص کے
بارے میں کچھ نہ کچھ بولنے لگا۔
"یہ سب سالے ہم سے جلتے ہیں احمد بھائی۔" اس
نے بڑی گرم جوشی سے بتایا۔ "یہ کسی کو کھاتا پیتا دیکھ
ہی نہیں سکتے۔ ابھی پرسوں کی بات ہے۔ پٹیل باکروالا
میں کھڑا لونڈے سے کہہ رہا تھا کہ تم دارو کا دھندا کرتے
ہو ہاں! دیکھو کیسے گندے ان لوگوں کے خیالات
ہیں ——"
"ارے بکنے دو یار ان۔ کون ان کتوں کی پرواہ کرتا ہے"
احمد بھائی نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

پیر، منگل اور چہارشنبہ بھی گزر گئے۔ جمعرات کو دوپہر میں
وہ کئی بار احمد بھائی کے کمرے میں گیا اور اسکی بیوی سے
انٹ شنٹ باتیں کرتا رہا لیکن اسے کوئی نئی یا

انوکھی بات نظر نہیں آئی۔ اس نے باتیں کرتے کرتے احمد بھائی کی بیوی سے سگریٹ مانگا۔ جب وہ پردہ ہٹا کر محراب سے سگریٹ نکالنے لگی تو سراج علی کی نظر پھر شراب کی بوتل پر جا پڑی جو ابھی تک جوں کی توں رکھی تھی۔

جمعہ کے دس بجے کھانے سے فارغ ہو کر بانو زینب بہن سے ملنے چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس نے سراج علی کو تاکید کر دی کہ وہ وقت پر اپنا کھانا کھا لے اور رحمت کو بھی کھلا دے، دودھ اور ریجل بھی اس نے سراج علی کے حوالے کر دیئے۔

وہ کچھ دیر بستر پر پڑا جاسوسی ناول دیکھتا رہا اور کھانستا اور بلغم تھوکتا رہا پھر اسکی آنکھ جھپک گئی۔

بالکونی میں لونڈوں کے شور و غل اور عورتوں کی چیخ اور پکار کی آواز پر اسکی آنکھ کھل گئی۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ کھانسی روکتا ہوا بالکونی میں دوڑ آیا اور اسکی نظریں سیدھے احمد بھائی کے کمرے کی جانب چلی گئیں۔ کمرے کے آگے قمیص اور نیکر پہنے ہوئے تین مشٹنڈے قسم کے مرد ہاتھوں میں لوہے کی سلاخیں لئے کھڑے تھے۔ اور انکے پیچھے عورتوں اور بچوں کا ایک مجمع گردنیں تانے کمرے کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے میں ایک باوردی پولیس سب انسپکٹر اور تین سادہ لباس سپاہی سامان کو الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے صندوق اور بوریاں کمرے میں بکھیر دیئے تھے اور لوہے کی الماری کا سارا سامان باہر نکال پھینکا تھا۔ محراب کی سب چیزیں بھی تتر بتر ہو گئی تھیں اور احمد بھائی کی بیوی بے وقوفوں کی طرح دروازے

۴۲۷ بیکر حیدرآباد

سے لگی دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ وہ [illegible] پر رکھی تھی۔

"تم گھبراؤ نہیں بائی۔ ہم تم کو کچھ نہیں کرے گا۔" سب انسپکٹر نے دلاسا دیتے ہوئے کہا: "یہ باٹلی پرمٹ کا ہے۔ اسکا کوئی کیس نہیں ہوتا ہے۔ تمہارا آدمی آئے گا تو ہم یہ اسکو واپس کر دے گا۔ تم پریشان نہیں ہونے کا"

پولس کی پارٹی وہسکی کی بوتل اور احمد بھائی کا شراب کا پرمٹ لے کر چلی گئی لیکن ساری بلڈنگ میں دھوم مچ گئی کہ احمد بھائی کا شراب کا دھندا پکڑا گیا۔ لونڈے دوڑ دوڑ کر ساری کالونی میں یہ خبر پہنچاتے رہے۔ اور عورتیں اپنی لمبی لمبی ناکوں پر انگلیاں اور اپنے ڈھیلے ڈھالے پہاڑی کولہوں پر ہاتھ رکھے چہ میگوئیاں کرتی رہیں۔ شام ہوتے ہوتے تک انہوں نے ایک بوتل کے کئی مٹکے بنا دیئے اور احمد بھائی کو جیل بھی پہنچا دیا۔

ابھی گرما گرم افواہیں چل ہی رہی تھیں کہ چھ بجے شام کو پولس کا ایک باوردی سپاہی سراج علی کے کمرے پر آیا۔

"چلو۔ تم کو صاحب بلاتا ہے۔" سپاہی نے سراج علی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیوں بلاتا ہے۔ میں نے کوئی کمپلینٹ نہیں کیا ہے" سراج علی منمناتے ہوئے بولا۔ "وہ اُدھر ٹیل بھائی رہتا ہے۔ اسکو بولو۔ اس نے کچھ کیا ہوگا۔"

"تم کو ضامنی کے لئے بلایا ہے۔ جلدی چلو۔" سپاہی نے سراج علی کو گھسیٹتے ہوئے کہا: "میں کسی دارو والے کی ضمانت نہیں دوں گا۔" سراج نے کہا۔

"یہ سب اُدھر صاحب سے کہنا۔" سپاہی [illegible]

سمجھا اور سوچا کہ چپ چاپ ٹیکسی اور اس کا پیچھا
کرا کے ساتھ ہو لیا۔

جب وہ پولیس اسٹیشن میں پہنچا تو یکایک اس کی نظر بانو
پر پڑی جو ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ سراج علی کو
دیکھتے ہی اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔
اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"یہ بانو کو جانتا ہے تم" سب انسپکٹر نے سراج علی
سے بڑے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"ہاں صاحب یہ ہماری بیوی ہے۔" سراج علی بڑی تحمل
سے بولا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

"یہ اسمگلنگ کا سامان اِدھر اُدھر سپلائی کرتی ہے"
سب انسپکٹر نے بتایا۔ "کسٹم والے نے آج اسکو
وامپائر ہوٹل میں پکڑا ہے۔ رابرٹو کو بھی ساتھ میں پکڑا
ہے۔ اس کے پاس مال بھی نکلا ہے۔ تم اسکا ضمانتی
دلا سکتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ میں اس حرام زادی کی ضمانت
نہیں دوں گا۔" سراج سر سے پیر تک کانپتے ہوئے بولا
"اسے یہیں سڑنے دیجئے۔ میں اسکو طلاق دے دوں گا"
اور وہ تیزی سے پولیس اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ اور
بلا ارادہ سڑک پر چل پڑا۔ اسکے دماغ میں طوفان بپا
تھا۔ اسکے سر کے موٹے موٹے بال غصہ سے تن گئے تھے
اور اسکے ہاتھوں میں رعشہ پڑ گیا تھا۔ ہلکٹ۔ سالی
کمین ہلکٹ۔ تیری ——

پتہ نہیں وہ کتنی دیر چلتا رہا اور کہاں پہنچ گیا۔ اسکے حواس
تو اس وقت واپس آئے جب ایک ٹیکسی زور سے
چرچراتی ہوئی اسکے قریب آ کر رکی۔

"سیدھی طرح اندر آجاؤ بے وقوف کے بچے۔" احمد بھائی
ٹیکسی میں سے چنگھاڑا اور سراج علی کو گھسیٹ کر اندر
بٹھا لیا۔ "اگر تیری بیوی اور وہ حوالات میں پڑی رہے
گی تو سالی کالونی کو خبر ہو جائے گی۔ پھر تو وہ کسی کو
منہ بھی دکھا سکے گی؟ ابھی کسی کو پتہ نہیں ہے۔ اسے
چپ چاپ گھر لے جا۔"

"لیکن میں ضمانت کہاں سے لاؤں؟" سراج علی نے
بلبلا کے پوچھا۔

"ضمانت میں دے دوں گا۔ لیکن کسی کو پتہ نہیں ہونے
پائے۔" احمد بھائی نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"رابرٹو کی بھی ضمانت میں نے ہی دی ہے۔"

"تم؟" سراج نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں!" احمد بھائی غصہ سے بولا۔ "مجھ پر کوئی
الزام نہیں ہے۔ میں نہ اسمگلنگ کا دھندا کرتا ہوں
نہ شراب کا۔ سالوں کو اور دس کمپلینٹ کرنے دو
میں ان سے خود ہی نمٹ لوں گا۔"

اور ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ پولیس اسٹیشن کے سامنے
رک گئی۔ ●●

حیدرآباد دکن

مانگنا ٹھیک نہیں روح کے زخموں کا حساب
چشمِ بینا ہو تو پڑھ لیجئے چہرے کی کتاب

زخمِ دل پیار کی خوشبو سے مہک اٹھتے ہیں
کتنے تازہ ہیں ابھی تک تری یادوں کے گلاب

سانحے کتنے ہی اربابِ نظر پر گزرے
رُخ پہ تاریخِ وفا ڈال کے پھرتی ہے نقاب

مسکراتے ہیں دیئے اب بھی تری یادوں کے
اب بھی روشن ہے درِ دل پہ وفا کی محراب

کس سے تیری خلشِ جاں کا مداوا ہو گا
کون رکھے گا تری روح کو اے دل شاداب

دل کے کاشانے میں یوں یاد تری آئی ہے
جیسے میخانے میں آجائے کوئی خانہ خراب

تا بہ کئے آپکی تہہ دار سیاست کا چلن...
پیاس کیا خاک بجھائیں گے امیدوں کے سراب

لوگ چہروں پہ سوالات لئے پھرتے ہیں
غیر واضح ہے ابھی وقت کا خاموش جواب

مُصحفِ قلب کے اوراق منور کرنے
اُفقِ ذہن نے تخلیق کئے ہیں مہتاب

راہِ تاریک میں روشن ہے ضیا زخم کا چاند
شہر پر پھیل گیا ہے مرے زخموں کا شباب

اثرِ جذبۂ دل کیا ہے دکھایا جائے
وہ نہ آئیں تو انہیں کھینچ کے لایا جائے

وقت کوشاں ہے کہ بجھ جائیں ستاروں کے چراغ
دل یہ کہتا ہے لہو دے کے جلایا جائے

وسعتِ راہ نوردی کے لئے دروکشو
آج شہروں کو بھی صحرا سے ملایا جائے

زندگی گم ہے تباہی کے گھنے جنگل میں
ڈھونڈھ کر اب اُسے گھر واپس لایا جائے

غمِ انساں، غمِ دوراں، غمِ ہستی، غمِ دل
آپ کو کونسا افسانہ سنایا جائے

شام ہوتے ہی مرے شہر میں ایک فقیر
ایسے چلتا ہے کہ جیسے کوئی سایہ جائے

کتنا معصوم ترا درد ہے میرے دل میں
جیسے پھولوں کو نگاہوں سے اٹھایا جائے

وقت کا کوئی تقاضا بھی نہیں، بے معنی
اصطلاحات کا مقتل نہ بنایا جائے

برق گرنے کیلئے سوچ میں پڑ جائے ضیا
اس سلیقے سے نشیمن کو سجایا جائے

ضیا ساحری
۱۱۳۱-۲-۱۷ رین بازار حیدرآباد - ۳۰

ماضی

چلو اک کہانی سناؤں میں
جس کے ہر موڑ پر
تم سے جھگڑے ہوئے

کہانی کو سننے سے پہلے سنو
مجھ سے وعدہ کرو
کہانی کے اس موڑ پر
جہاں تم نے جھگڑا کیا تھا
اب نہ جھگڑو گے مجھ سے

تم کہانی کے اس موڑ کو چھوڑ دو
اس سے آگے کہو —
پھر کیا ہوا....؟

شاہد عزیز
بچھو گھاٹی
اُدے پور (راجستھان)

دو نظمیں

کبھی آؤ گے —
میرے نزدیک آکر کے.....
دیکھو گے مجھ کو
تو محسوس ہونے لگے گا کہ میں
بہت بے وفا آدمی ہوں

اس لیے چاہتا ہوں
کہ یہ فاصلہ ہو.....
تمہارے مرے درمیاں جو
ہمیشہ رہے —

☆

دھرتی کے پھیلے کاغذ پر
کتنی سندر تصویریں ہیں
پیڑ، پہاڑ، ساگر، ندیاں
شہر، گاؤں، پنگھٹ، گلیاں
کچے، پکے گھر دروازے
آنگن، آنگن شور مچاتے
نٹ کھٹ، ساتھی بوڑھے بچے
اور جنگل میں روپ سلونا
دھرتی کے پھیلے کاغذ پر
کتنی سندر تصویریں ہیں

پیکر حیدرآبادی

دیوالی کی رات تھی، گاؤں کے کچے، کچھ پکے مکانوں پر مٹی کے دیئے جگمگا رہے تھے۔ گھر کے سامنے پرانے کنوئیں کی شکستہ جگت پر چاروں اور سے جگمگ کرتے ہوئے دیئے، زندگی کے مایوس اندھیروں میں امید کے جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔

بھاگا کو جلدی تھی۔ پانچا پیر کے مکان پر املی کے بوڑھے پیڑ کے نیچے، منوتی ہونی تھی۔ برس برس کا دن تھا۔ آج تو وہ جہاں بھی ہوتی پھڑ پر پہونچ جاتی اور جم کر جوا ہوتا جلدی جلدی اس نے کھانا کھایا اور بیڑی کے گہرے گہرے کش لیتی اور پھونک مارتی ہوئی باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی وہ گھر میں داخل ہوئی۔ دودھ سے بھرا ہوا مرادآبادی گلاس قمرن کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"لو جلدی سے پی ڈالو۔"

"رکھ دو پی لوں گی۔ مجھے دودھ اچھا نہیں لگتا پھر بھی تم لے آئی ہو۔"

"جب بھی کوئی چیز میں لا کر تمہیں دیتی ہوں تم ایسے ہی کیا کرتی ہو۔ پیو نا۔!"

"کہہ تو دیا نہیں، پھر کیوں ضد کرتی ہو"— ارے بابو تم پی لو۔" قمرن نے گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں، تم ہی پیو، بھاگا اتنے شوق سے تمہارے لئے لائی ہے، تو تمہیں اسکا دل نہیں توڑنا چاہیئے۔" میں نے کہا۔

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں بھیا! دل رکھنا یہ کیا جانے اس کے نخرے تو میں سنبھالتے عاجز آگئی ہوں ۔ مگر . . . ."

"پھر کیا؟ پھر میرا ساتھ کیوں نہیں چھوڑ دیتی ہو۔" قمرن نے بھاگا کی طرف دیکھ کر دلربا انداز میں کہا۔

"دیکھ لیا بابو آپ نے، بس اسکی انہیں باتوں سے

بھا بھاگا اسے ... کہتے کہتے رک گئی۔

"اچھا! تو بڑی بھاگا کی پیاری ہے جلدی سے" اس نے
بہت بہت آہستہ اور خوش آواز میں کہا اور پھر
جیسے احسان کرتے ہوئے اس نے چند گھونٹ پی لئے۔
جس طرح ایک جوہری اپنے کسی قیمتی پتھر کو دیکھتا ہے، اس
نے قمرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھابی! بہت دبلی ہو گئی ہے، دیکھتے ہیں ایسا سوکھی ہے
جیسے اس کے بدن میں خون ہی نہیں، اس بار جب آپکی
دلہن شہر جائیں گی تو اسے بھی وہاں لے جائیں گی اور کسی ڈاکٹر
کو دکھلا کر اسکی اچھی طرح دوا کرائیں گی۔"

"ہٹ تیرا کیا بھروسہ، جھوٹی کہیں کی، بڑی آئی ہے جانے
والی، تو برابر ایسے ہی کہتی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے دیکھ لینا۔"

پھر بھاگا، قمرو پر ایک پیار بھری نظر ڈالتی
ہوئی باہر نکل گئی۔ پاپو کے مکان کی طرف، جہاں اس کے
ساتھی جوئے پاس کا انتظار کر رہے تھے۔

عجیب عورت ہے ——

میں بڑی دیر تک ان دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔
ان دونوں میں کیا رشتہ ہے؟
دو عورتوں میں اتنی گہری دوستی کا ہونا، ایک دوسرے کے
لئے جان چھڑکنا کوئی عجیب بات تو نہیں، ہاں اگر کچھ نرالی
اور حیرت میں ڈالنے والی یا چونکا دینے والی بات تھی تو ان
دونوں کی وارفتگی، شکوہ شکایت اور دیکھنے کا انداز۔
میرے سامنے ایسے ہی سوالوں کا جال سا تھا مگر پھر
بھی جواب تشنہ تھا۔

اب تو ان دونوں کے چرچے ہر جگہ اور ہر محفل میں ہوتے
تھے۔ گاؤں کی ساری عورتیں انہیں عجیب شبہ نظروں
سے دیکھتی تھیں اور اب بات یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ
لوگ جہاں بھی ان دونوں کو اکٹھا دیکھتے تھے اپنی جوان بہو
بیٹیوں کو نہیں بیٹھنے دیتے تھے مگر میرے گھر کی بات ہی دوسری
تھی ——

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، بھاگا کو ایسے ہی دیکھا
ہے۔ گہرا سانولا رنگ، چپٹی ناک، گول چہرہ جس پر کہیں
کہیں چیچک کے ایک دو گہرے داغ، بڑی بڑی آنکھیں
گرد آلود بال جن میں نہ کبھی تیل نہ کنگھی، ہر گھڑی سوکھے
سوکھے ہر دم گردن پر جھولتے رہتے اور خود قدرتی طور
پر تراشیدہ لگتے تھے۔ ہمیشہ سفید بغیر کناروں کی ململ کی
ساڑی باندھے رہتی اور ہاف آستین کی سفید یا ہلکے
رنگ والے سفوا ڈیزائن کپڑوں کی قمیص پہنتی۔ ساڑی کی جگہ
پر مدراسی چارخانوں والی تہبند اسکی پسند تھی۔ اس
کی پسند اور مزاج دونوں میں مردوں سے کافی مشابہت
تھی اور تھی بھی یہ عجیب سیلانی قسم کی۔ جیسا کہ مجھے اپنے
گھر والوں سے معلوم ہوا میرے چھوٹے بھائی کی دیکھ
بھال کے لئے بچپن سے میرے گھر پر رہتی تھی۔ اس
وقت بھی اسے لڑکوں کا ساتھ زیادہ پسند تھا۔ لڑکیوں
میں بہت کم رہتی اور ان کے کھیلوں سے بھی اسے کوئی لگاؤ
نہیں تھا۔ زیادہ تر لڑکوں کے ساتھ کوڑی، گولی اور گیند
کھیلتی، خوب مار پیٹ کرتی اور اسی دھینگا مشتی میں وہ
دھیرے دھیرے جوان ہو گئی۔ میرے گھر والوں نے اپنا
فرض سمجھ کر، اس کی ذات برادری کے ایک نوجوان سے
(جو روڈ ڈھلنے کا کام کرتا تھا) اسکی شادی کر کے رخصت
کر دیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد آپس میں جھگڑا شروع ہو گیا

* بکر حیدرآباد ۹۷

یہاں تک تو بات کوئی خاص [illegible]
پھر دونوں ایک ساتھ، ایک چارپائی پر [illegible]
یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر بھاگا کو جو بات سب سے [illegible]
گزرتی ہے، وہ ہے قمرن کا دوسرے مردوں سے [illegible]
یا ہنس کر بات کرنا۔ اسے بس اسی بات سے نفرت
ہے اور وہ اسے نہیں برداشت کر پاتی ہے۔ [illegible]
بھی اس پر دونوں میں بڑی تلخیاں ہوتی ہیں۔ اور کبھی کبھی
مار پیٹ بھی ہو جاتی ہے، دن بھر لڑائی ہوتی رہتی ہے مگر
رات ہوتے ہی دونوں خود بخود مل جاتی ہیں اور بھول
جاتی ہیں جیسے دن میں کچھ ہوا بھی نہیں۔ اور یہی وجہ
تھی جس نے سبھوں کو اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور
کر رکھا تھا۔

کئی دنوں سے میرے یہاں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ ہر دم
گھر عورتوں اور مردوں سے بھرا رہتا تھا۔ ایسے میں قمرن
کی موجودگی میں بھاگا کی غیر حاضری بری طرح کھٹک رہی
تھی۔ دو ایک بار میں نے چاہا کہ اس کے بارے میں
اپنی بیوی سے پوچھوں، مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔
دوسرے دن شام ہوتے ہوتے، جب گھر پر آئے ہوئے
مہمان قریب جا چکے تھے۔ میں نے اپنی بیوی سے
قمرن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ سوال کر ہی دیا جو
مسلسل میرے ذہن کے ایک گوشے میں جکڑا رہا تھا۔
"کیا وجہ ہے، بھاگا نہیں دکھائی پڑ رہی ہیں؟ گاؤں
میں ہے کہ نہیں؟"
"وہ کہاں جائے گی، ادھر ادھر کہیں گھوم رہی ہوگی ـــ اب
یہاں کیسے آ سکے گی؟"

اور ایک دن پتہ چلا شوہر سے مار پیٹ کر کے وہاں سے
بھاگ گئی۔ اور تبھی سے اپنی ماں کے ساتھ رہنے لگی۔
دن رات کی کوئی قید نہیں جب دیکھو مردوں کے ساتھ
ادھر کے کھیتوں میں، آم کے باغوں میں یا گنے کے کبھی
کھیت میں تاش یا موٹھ کھیلتی۔ کبھی غنڈے اور بدمعاش
اس سے لڑتے رہتے، سنا جاتا ہے کہ ایک بار کسی
بات پر ایک پہلوان کی اس نے وہ پٹائی کی کہ بس اللہ کی
پناہ، اور تبھی سے اس کی دھاک بیٹھ گئی۔

اب وہ آزاد پنچھی کی طرح، بے فکر گھومتی رہتی، صرف جوا
ہی اس کا پیشہ نہیں، ویسے وہ بہت محنتی بھی ہے۔
انڈہ اور مرغیوں کا بیوپار بھی کرتی ہے۔ سارا دن گاؤں
گاؤں گھوم کر انڈے خریدتی ہے، اور شہروں کو سپلائی
کرتی ہے اور صرف ایک بوڑھی ماں ہے جسے وہ بڑی شان
سے رکھتی ہے، اکثر اپنے مخصوص لہجے میں کہتی، "کوئی مرد کا
بچہ مجھ سے اچھی طرح اپنی ماں کو رکھتا ہوگا ـــ اور ہاں
ماں! میں تیرا بیٹا ہوں، خوب عیش کر لے" ـــ ماں کے
علاوہ اس کا کوئی اور ہے تو پھر اس کی دوست، سہیلی
یا جو کچھ بھی ہو، قمرن ہے، جس پر خوب فراخدلی سے خرچ
کرتی ہے، دوسروں پر بھی خرچ کرنے میں اسے خوشی ہوتی
ہے اور وہ فخر محسوس کرتی ہے۔ اور ویسے وہ بڑی دردمند
بھی ہے، دوسروں کا غم دیکھ کر اس کا جی بھر آتا ہے۔
دن بھر وہ چاہے جہاں رہے، اپنے کاروبار سے فرصت
پاتے ہی سیدھے قمرن کے پاس پہونچ جاتی ہے۔ ہر فصل
اور موسم کی کھانے پینے کی چیزوں اور مختلف سوغات
کے ساتھ ـــ

۸۰۔ پیکر حیدرآباد

پھر دیکھا جب [illegible] تو کھولی دیکھ [illegible] پڑ گیا۔

"سب [illegible] سے پوچھئے، اس لوگوں میں تو رنڈی زیادہ کمی [illegible] رہتا ہے:

اور پھر اس نے بتایا کہ [illegible] وہ ہے جو [illegible] نہیں ہوتی ہے۔ ایک دو دن سے غائب ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا: "کچھ نہیں بس ویسے ہی [illegible]" اور پھر کچھ دیر رک کر کہنے لگی۔ "میں کیا جانوں، اس سے پوچھئے، وہی بتا سکے گی، میں تو اب اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔" مگر یہ کہتے کہتے اس کا گلا رندھ سا گیا۔

مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ سائے کی طرح جو ہر دم ساتھ ساتھ رہتی تھیں، اور ایک پل کے لئے جدا نہیں ہوتی تھیں، جہاں بھی رہتی تھیں۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتیں ـــ دن بھلے ہی ابھاگا کا روزی روٹی یا [illegible] کے چکر میں کہیں بھی گزر جائے، مگر رات میں وہ [illegible] کے پاس ضرور پہنچ جاتی۔ یک بیک یہ کیسے ہو گیا؟ میرے ذہن نے کئی بار یہی سوال دہرایا اور شام ہوتے ہوتے جب میں بستی جانے والی سڑک پر، جہاں بس اسٹینڈ بھی ہے، گھومنے کے لئے گیا، وہیں ایک چائے کی دوکان پر وہ مجھے بیٹھی، بیڑی پیتی ہوئی نظر آ گئی، اور میں نے اسے دیکھتے ہی پکارا۔

"ارے ابھاگا، میرے [illegible] مگر تم دو دن دکھائی نہیں پڑیں، [illegible] کو تم سے بڑی شکایت ہے، اور [illegible] تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔" ([illegible] جان بوجھ کر [illegible] کا نام نہیں لیا)

"ہاں بابو، میں تو خود ہی آنا چاہتی تھی، مگر وہاں پر [illegible] رہتا۔"

"کون؟" میں نے ذرا وضاحت چاہی۔

"ارے وہی [illegible]! میں تو اب اس کا منہ دیکھنا نہیں چاہتی۔ اگر کہیں مل گئی تو اسے چپلوں سے اس کی صورت بگاڑ دوں گی۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو تم چلو، اس سے بات مت کرنا۔" اور آخر میرے اصرار پر وہ میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔

راستے میں، میں نے یونہی چھیڑ دیا۔ "کچھ مجھ سے بھی کہو، وجہ کیا ہے؟ اتنی ناراضگی آخر کیوں ہے؟ تمہاری گہری دوستی میں فرق کیسے آ گیا؟" میں نے سوچا، پھر شاید اسی طرح وہ کھل سکے، یہی لوگوں کو تو پورا یقین تھا مگر میں اب تک شکوک کی سرحدوں کے پار نہیں پہنچ سکا تھا اور پھر اس نے مجھے بتایا۔ "ارے بابو! وہ ہرجائی ہے، پوری [illegible]، مجھ سے نہیں ہو سکتی، ادھر ادھر رات برات، چلی جاتی ہے۔ اب آپ سے کیا کہوں، مردوں سے آنکھ لڑاتی پھرتی ہے۔ اگر اس کی صورت کا خیال نہ ہوتا تو اس دن اس قصائی کے بچے کا گلا ہی گھونٹ دیتی بس اب آگے نہ کہلوایئے ـــ" میں ہوں، ہاں کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

راستہ ختم ہو گیا اور ہم گھر پہنچ گئے، وہ پیچھا [illegible] دروازے پر ہی رک گئی اور گھر میں جا کر اس کی آمد کی اطلاع دی۔ میری بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا "بس آپ کو تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہو جاتا ہے۔"

"بس دیکھتی جاؤ۔" میں کہتے ہوئے باہر نکل گیا اور پھر

بیکر حیدر آباد ۸۱

ابھاگا کو نے میں مکان میں داخل ہوا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش سی منّا کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ بیگم نے اُسے پان پیش کیا اور شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگیں — "واہ ابھاگا! ہم لوگوں کو تو تم نے بھلا دیا، کتنی دفعہ بلوا بھیجا، مگر تم نہیں آئیں" — اور اُسی وقت میری اماں نے بھی آکر اُسے بڑی ڈانٹ سنائی۔

"کیوں رے! تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔؟ اس بے چاری نے تو رو رو کر اپنی جان ہلکان کر لی ہے اور تم ماش کے آٹے کی طرح اینٹھی ہوئی ہو۔ اب دیکھوں گی، کبھی نہیں ملتی ہو۔"

"لو لو! اس کا نام مت لیجئے۔ اُس کا تو میں خون پی لوں گی۔"

اُس نے کچھ اتنے زور سے کہا تھا کہ یہ بات سنتے ہی قمرن تیر کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور پھر جنگ چھڑ گئی۔ دونوں طرف سے حملے ہوتے رہے۔ ابھاگا بڑے غصے میں کہتی رہی۔ اُسے جیسے کسی کی موجودگی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ "یہ تو رنڈی ہے، رنڈی۔ مردوں کے لئے گھومتی پھرتی ہے۔ وہ جو بڑا شہدا بنا پھرتا ہے۔ اُس کے تو میں بھوسہ بھر دیتی۔ خیر اُسے میں بعد میں دیکھوں گی۔ یہ بہانا کرتی ہے مگر مجھے بھی طرح معلوم ہے اُس دن یہ اُسی کے پاس گئی تھی۔"

"ہاں میں گئی تھی۔ اور برابر جاؤں گی۔ تجھ سے کیا، تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی —" جیسے وہ بھری ہوئی بیٹھی تھی — "میں جاؤں گی۔ میرا رشتہ دار ہے میں کیا وہاں برائی کرنے گئی تھی۔ کمینی! اپنی طرح تو سب کو سمجھتی ہے۔ میں ٹھیک ہوں، ایسی [illegible] رہوں گی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُس کا غضبناک چہرہ اور بھی بھیانک ہو گیا، منہ سے جھاگ نکلنے لگے اُس کے تیور سے یہی لگ رہا تھا جل جائے گی، مگر شاید ہم لوگوں کی موجودگی کا خیال کر کے وہ سنبھل گئی۔ اور کہنے لگی۔

"میں نے اس کے لئے کیا نہیں کیا، کوئی مرد کیا لا کر اتنی چیزیں اپنی بیوی کو دیتا ہوگا۔ ایک سے ایک قیمتی چیز قسم قسم کی قیمتی ساڑیاں، سال بھر میں کچھ نہیں تو دو تین درجن بہتریا کپڑے بنوائے ہوں گے۔ ابھی جس دن یہ اپنے اُس یار سے ملنے گئی تھی، اُسی دن بھی، دن میں ٹریلو کی ایک ساڑی اور بلاؤز لا کر میں نے دیا تھا مگر کبھی اس نے میری لائی ہوئی کسی چیز کی تعریف نہیں کی اور نہ خوش ہو کر کبھی ایک لفظ ہی کہا۔ ایک سے ایک چیز گھر میں بھری رہتی ہے۔ تب بھی نہ جانے کیوں اُس کے یہاں چلی جاتی ہے؟ اس بدچلن کے پاؤں تو گھر میں رُکتے ہی نہیں۔" ابھاگا کے جملے شدید صورت اختیار کر گئے تھے۔ وہ مستقل روئے جا رہی تھی۔ "تمہارے سبھی کپڑے اور سارا سامان پڑا ہوا ہے۔ لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیئے۔" اور کہنے لگی۔ "میں بدچلن ہوں تو میرا ساتھ کیوں نہیں چھوڑ دیتی؟ میں ہی کب تم سے سٹنے جاتی ہوں۔ وہم کا میرے پاس کیا علاج ہے۔ کئی بار اس نے خود ہی جھانک کر دیکھا ہے۔ چوری چھپے میرا پیچھا کیا ہے مگر پھر بھی اسے یقین نہیں آتا — اور ہاں اگر میں ایسی ہی ہوتی

رک گیا تھا۔ اس سے پہلے بھولی لڑکیاں کئی پہلو کی
ان سے گئیں۔ اور اگر وہ اسطرح کی ہوتی تو آج تیرہ
بھی آنکھوں میں اتنے اتنے گھروندے بسے تو اس نے زینہ
سے ڈرتے نیٹ اور بیانی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
ابھا کا منہ کھولے ہوئے اسے دیکھتی رہ گئی۔
اور قرآن کی ابھرتی ہوئی سسکیوں سے یہ سب کچھ ڈوب
گیا تھا۔

■ ■

گلی بستیوں کی گلیوں سے
تازہ دم روشنی
ابھرتی ہے

لغزشوں کے دراز قد سائے
ڈھانپ لیتے ہیں
نور کے مینار
ڈھانپ لینے دو
تیرگی کے بھنور
خالقِ نور ہیں
نہ گھبراؤ
....

حمیدہ قمر ، وارڈ نمبر ۲ چرچ کالونی دوسرا ۱۱۱ - اندور-۱

دو نظمیں

ایک شب
اپنی سونی سی جگہ پر بیٹھے تھے تارے
تک رہے تھے دنیا کو
تنہا ، اُداس
کہ چاندنی کیا ہو گئی
حیرتوں کی دھند
سر اٹھائے تک رہی تھی — چاندنی
مر گئی یا سو گئی

فضل الحسن صدرِ اردو - مرلی ہاری - بہار

صہبا پیکر حیدرآباد

رات جب شب کے پہلو میں سمٹ جاتی ہے
تیرگی کتنی ہی سنگین ہو چھٹ جاتی ہے

حفیظ نضا
۱۲۰-۵-۲۰۰ بازار عیب لال
شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد۲

میرے منگت ہیں تیری یاد کے زخموں سے لہو
پھر وہی آنکھوں سے بری بوند اچٹ جاتی ہے

دل کو اس طرح سے ڈستی ہے شب غم اے دوست
جیسے ناگن کوئی ڈستی ہے پلٹ جاتی ہے

اب نہیں رقصِ طرب ہوتی جنوں کا ہنگام
ہجر کی رات ہو یا وصل کی کٹ جاتی ہے

تیری زلفوں تیرے ہونٹوں کی مہک لے کے صبا
دل کے ویرانے تک آ آ کے پلٹ جاتی ہے

اور بڑھ جاتے ہیں احساس کے پیچ و تاب نضا
گردشِ ایام کی خرابوں سے پٹ جاتی ہے

غزلیں

ہیں شعلہ فگن گل نہ برقِ تپاں اب
جو دینے لگا لو مرا آشیاں اب

مریضِ محبت کہ ہے نیم جاں اب
ترا غم نہ بن جائے اک داستاں اب

جنہیں بات کرنا گوارا نہیں تھا
وہ لینے لگے ہیں مرا امتحاں اب

بہارِ گلستاں ہے زنجیرِ وحشت
چلے پا بہ جولاں نہ جانے کہاں اب

بہاریں ہوئیں آپ کے ساتھ رخصت
مسلط ہے میرے چمن پر خزاں اب

سحر ڈھونڈ کر ان کا نقشِ کفِ پا
بسائیں جبیں سے نیا آستاں اب

جمیل سحر
میونسپل اردو اسکول ۲
ٹیگور نگر۔ وکرولی۔ بمبئی ۔ ۸۳

بیکر حیدرآباد ۸۵

نقد و نظر

تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

● رؤف خلش

ارتکاز

● مرتب: عبدالرحیم نشتر
● پہلی اشاعت: مارچ ۱۹۷۱ء
● قیمت: چار روپے
● ناشر: مطبوعات نشتر، نیا بازار، کامٹی (ناگپور)

نئی شاعری جہاں بعض حلقوں میں مطعون و معتوب رہی ہے وہاں اس کو پسند کرنے والوں نے اسے زیادہ قابل اعتنا اور زیادہ پسندیدہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی "نئے نام" جسے شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین نے مرتب کیا، اسی کوشش کا نتیجہ تھا اور اب ہمارے سامنے "ارتکاز" اسی ایک اور مجموعہ آیا ہے جو مرتب کے دعوے کے مطابق نئی غزل کے لب و لہجہ کے فرق کو واضح کرتا اور موضوعات کا وسیع تر احاطہ کرتا ہے۔ یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے؟ میں نے یہ مجموعہ بلا کسی ذہنی تحفظ کے اور غیر مشروط طور پر پڑھا۔ کتاب کے آغاز میں مرتب نے بظاہر یہ معذرت تو چاہی ہے کہ "ارتکاز" موجودہ صورت میں وہ کتاب نہیں جسے پیش کرنے کا خیال تھا کیونکہ چند ناگہانی حادثات کی بنا پر اسکی ترتیب حسب دلخواہ نہ کی جا سکی۔ وہ ناگہانی حادثات کیا تھے؟ اور کیوں اسکی ترتیب حسب منشا نہ کی جاسکی اسکی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ لہٰذا یہ سوچنا کچھ غلط نہیں معلوم ہوتا کہ مرتب کا ذہن ابتدا ہی سے چند مخصوص شعراء کو اس مجموعے میں جگہ دینا اور چند بندھے ٹکے فارمولوں کی پابندی کرنا تھا۔ ویسے کسی بھی مجبوری کا کوئی بھی جواز پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایسا کوئی بھی مجموعہ ہر قاری کو مطمئن کر سکے۔ تاہم کوئی بھی مرتب اگر چاہے تو غیر جانبدارانہ انداز میں سخت احتساب کرتے ہوئے نئے انداز فکر اور نئے لب و لہجہ کے نمائندہ رنگوں کو سمیٹ کر ایک مرکز پر لا سکتا ہے۔ ویسے "ارتکاز" پڑھ کر مایوسی نہیں ہوئی۔ البتہ یہ احساس یقیناً شدید ہو گیا کہ مرتب نے نئی غزل کے لب و لہجہ کو کم و بیش پیش تو کر دیا ہے لیکن وہ نئے شاعر کے مخصوص رنگ کی نمائندگی میں ناکام رہا ہے۔ مرتب کے اس اعتذار کے باوجود کہ اگر چند اہم یا خاص ناموں کی عدم شمولیت گراں گذرے تو اسے مرتب کی کور ذوقی اور تعصب سے تعبیر کیا جائے مرتب کے دل کا چور پکڑنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

مثال کے طور پر "ارتکاز" کل ۳۸ نئے شاعروں کی غزلوں کا انتخاب پیش کرتا ہے۔ اس مجموعے میں جہاں ناصر کاظمی محمد علوی، عادل منصوری، زبیر رضوی، شہریار، بشیر بدر اور پرکاش فکری جیسے اہم اور نسبتاً جدید شاعروں کی غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہیں مخمور سعیدی، فضا ابن فیضی، بشر نواز، ظفر اقبال، شمیم حنفی اور باقر مہدی وغیرہ جیسے شعراء بھی شریک کئے گئے ہیں، جو ان معنوں میں زیادہ جدید نہیں جن کی بنا پر نئی شاعری بدنام

[illegible] حیدرآباد

ہے۔ اگر مرتب کے ذہن میں ہر رنگ کو پیش کرنا مقصود
تھا تو اس میں بہر حال خورشید احمد جامی، شاذ تمکنت
اور وحید اختر وغیرہ کو شریک کیا جانا چاہیے تھا۔
بالخصوص پچھلے دہے میں نئی غزل کی طرف ان شاعروں
نے اجتہادانہ انداز میں رجوع کیا اور اسے نئے امکانات
سے روشناس کرایا۔ اُن میں جامی بے حد نمایاں ہیں
اُنکی غزل کا یہ شعر دیکھئے ؎

لے کر نئے خیال کی قندیل ہاتھ میں
جامی کسی کو ڈھونڈ رہی ہے نئی غزل

لگتا ہے مرتب نے جدید اور جدید تر غزل میں کوئی
مابہ الامتیاز وصف ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی اور
روا روی میں چند نام اِدھر اُدھر سے چن لئے۔ مخمور سعیدی
کی خوبصورت غزلیں شریک ہیں اُن میں اُن کا اپنا منفرد
رنگ نمایاں ہے۔ مخمور سعیدی کے بارے میں بہت لوگوں
نے یہ بات کہی ہے اور بالکل صحیح کہی ہے کہ انکی شاعری
پر ایک طرح کی المیہ فضا طاری ہے اور یہ ماضی سے
ناخوش ہونے کے باوجود اس کی بہت سی خوبیوں کے
قائل ہیں۔ اسی طرح عادل منصوری اور محمد علوی کی
غزلیں نمائندہ نہیں ہیں۔ کچھ اشعار دیکھئے ؎

وہ نقطہ جو تھا بے کے نیچے ابھی
ہرکتا ہوا آ گیا نون میں؛

(عادل منصوری)

بدن 'ب' کے اندر اُتر جائے تو
کنارے پہ رہ کر نکالو الف

(عادل منصوری)

کاف کی کرسی پہ کالی چاندنی
کاف میں گرتا سمندر لام کا

(عادل منصوری)

پڑھ سکے تو ایسا ہوں خبر اخبار میں
میں الف ننگا پھرا بازار میں

(محمد علوی)

اس سچائی کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ جدید شاعروں
نے لب و لہجہ اور لفظیات کی شکست و ریخت کی
ہے اور معانی، علامت و امیجری کی سطح کو یکسر بدل
دیا ہے، ادب کا منتخب قاری بھی مذکورہ بالا نمونوں
کو مضحکہ خیز اور چیستاں سمجھے گا۔ ہر چند کہ میں تشریحی
ابلاغ کا قائل نہیں ہوں تاہم تجریدی آرٹ اور تصویری
ہیئت کے بہانے شعری تجربے میں ایسے اہمال و ابتذال
کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اوپر کی مثالوں کو زیادہ سے زیادہ
"استعاراتی لغالی" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ نئی غزل کے
مرتب کو ایسی ہیر پھیر بازی سے بچنا چاہیے تھا۔ اس سے
ہٹ کر بعض ایسے شعراء بھی اس مجموعہ میں جگہ پا گئے
ہیں جو غزل سے زیادہ نظم اچھی کہتے ہیں۔ بعض بالکل
مبتدی اور غیر معروف شاعر بھی شامل کئے گئے ہیں۔ لگتا
ہے مرتب کا ان کے ساتھ کوئی ذہنی یا باطنی رشتہ ہے
مجموعہ کے آخر میں "نئی غزل" منظر و پس منظر" کے عنوان
سے بشر نواز نے بھرپور اور سیر حاصل مضمون لکھا ہے
اگر "ارتکاز" کی ترتیب اسی مضمون کی روشنی میں کی جاتی
تو اس سے زیادہ جامع اور مکمل مجموعہ نکل سکتا تھا۔
کتابت اور طباعت معمولی ہے۔ قیمت چار روپے
یقیناً زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر "ارتکاز" پڑھ کر قارئین نئی غزل کے تئیں اپنی رائے میں تھوڑی بہت تبدیلی کریں گے۔ ■ ■

پیکر حیدرآباد ۸۷

راجندر سنگھ بیدی کی ایک بے مثال فلم

دستک اس وقت جنم لیتی ہے جب دو توانا ہاتھوں کی ہتھیلیاں ٹکراتی ہیں اور اس کے درمیان جو خلا گونجتا ہے، اسی پر ہم چونک اٹھتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی دستک کی یہ گونج فلمی دنیا کے غل غپاڑے میں بے حس کانوں پر ایک تازیانہ کا کام کرے گی۔

دستک: ان کھوکھلے اقدار کا بھرپور مضحکہ اڑاتی ہے جو کسی فرد کے کردار کو اس کے ماحول کے چوکھٹے میں رکھ کر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرد کی ذات کو سمجھنے کا یہ بیگانہ اور مضحکہ خیز انداز خود فرد اور اس کے احساسات کے لئے کتنا صبر آزما ہو سکتا ہے، اس فلم کا یہی موضوع ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

راجندر سنگھ بیدی اردو لکھنے پڑھنے والوں کے لئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اب تو ان کی اہمیت اتنی مسلّم ہو چکی ہے کہ دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ان کا نام جانا پہچانا جاتا ہے۔ ان کی کہانیاں اردو ادب میں بیش قیمت سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے فن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنا ادبی شعور دوسروں کی طرح اپنے آپ کو اپنے ادبی تقاضوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کے ادبی خزینے نے جن میں کئی ڈرامے، افسانوں کے کئی مجموعے اور مشہور ناولٹ "ایک چادر میلی سی" (جسے ساہتیہ اکاڈمی کا ایوارڈ مل چکا ہے) شامل ہیں، ہندوستان کے ادبی حلقوں میں انہیں بے حد قدر و منزلت سے نوازا ہے۔

بیدی بحیثیت مکالمہ نگار

بیدی نے جہاں اپنے قلم کے ذریعہ ادب میں اپنی منفرد راہ نکالی، وہیں جب انہوں نے فلم کے میدان میں قدم رکھا تو داغ۔ میم دیدی۔ انورادھا۔ مسافر مدھومتی۔ دیوداس۔ انوپما اور ستیہ کام میں اپنے تیز مشاہدے اور بہترین فنی صلاحیت کو بروئے کار لا کر مکالمہ کے ذریعہ کردار کی نفسیات اور احساسات کو ایک عام فلم بین کے سامنے نہایت ہی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے فلمی مکالمہ نگاری کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔

بیدی دستک کا فلم ساز

دستک جیسی منفرد فلم بنا کر بیدی ایک فلم ساز کی حیثیت سے پہلی بار جو ابھر نکلتے ہیں۔ حالانکہ اس

[illegible] حیدرآباد

ایک اچھوتا خیال — ایک نیا انداز

دستک

سے پہلے انہوں نے ہمیں "گرم کوٹ" اور "رنگولی" جیسی اچھی فلمیں دی ہیں۔ لیکن "دستک" ایک باصلاحیت ادیب اور روشن دماغ فلم ساز کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ دستک میں بیدی کے فنی کمال نے اپنے جاندار قلم کے بجائے کیمرے کو تھام لیا ہے۔ دستک متوسط طبقے کے مصائب کا ایک متاثر کن اور احساس سے بھرپور خاکہ ہے۔

دستک کی کہانی

دستک کے مرکزی کردار ہیں — حمید اور سلمیٰ۔ حمید — ایک کم تنخواہ والا بمبئی کی میونسپل کارپوریشن کا کلرک۔ اور سلمیٰ — اس کی بیوی — یہ نو بیاہتا جوڑا (جو اب تک ایک گندی بستی کا مکین رہا ہے) اپنے دو کمروں والے تاریک مکان میں جو ایک انتہائی پُر شور اور گنجان آبادی والے علاقے میں واقع ہے داخل ہوتا ہے۔ اس جوڑے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ مکانوں کے دلال نے دھوکہ کیا ہے اور انہیں ایک ایسے مکان کا مکین بنا دیا ہے جس میں پہلے ایک طوائف رہتی تھی۔

حمید اور سلمیٰ چاہتے ہیں کہ کسی طرح بھی ہو، وہ اس مکان میں سکون سے رہیں۔ لیکن کئی مشکلیں ان کی راہ میں حائل ہیں۔ انہیں اُن لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کسی بھی وقت ان کے گھر پر دستک دینے چلے آتے ہیں۔ سلمیٰ اپنے شوہر کے کام پر جانے کے بعد دن بھر گھر کے اندر کھڑکیاں اور دروازے بند کئے گھٹی رہتی ہے۔ اُدھر حمید پر اپنے آفس میں ہر طرح کی طوائفیت کے عقدے کھل جاتے ہیں! اس ایماندار کلرک کو رشوت کا لالچ دیا جاتا ہے — اور روپوں کی ضرورت اُسے رشوت کے قبول کر لینے پر اکساتی ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کو طوائفوں کے محلے سے نکال کر کسی بہتر جگہ لے جائے اور زندگی کی خوشیوں کا لطف اٹھا سکے۔

اس طرح دونوں زندگی کی جدوجہد میں اس دستک کو سننے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن کے ہاں نئی آمد کا خوشگوار پیغام لانے والی ہے۔

حمید اور سلمیٰ کیوں؟
راجو اور رمالی کیوں نہیں؟

بیدی چاہتے تو دستک کے کردار راجو اور رمالی بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے حمید اور سلمیٰ

کو کیوں منتخب کیا؟ کیا یہ نام نہاد مسلم سوشل فلم ہے؟ یا کسی مسلم نواب کے رومان کی داستان ہے؟ اس فلم میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ بلکہ ایک اوسط طبقہ کے لوبیا ہتا مسلم جوڑے کی چند دنوں کی کہانی ہے جس میں ایک نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی مسلسل کوششیں ہیں۔ یہ ماحول اس وسیع تر ماحول کی پیداوار ہے جسے سماج کا نام دیا جاتا ہے۔ اس فلم کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مرکزی کرداروں کو مسلم دکھلاتے ہوئے بھی کہیں یہ احساس پیدا ہونے نہیں دیا گیا ہے کہ یہ سماج کے وسیع تر دھارے سے ہٹ کر بہہ رہے ہیں۔ ان مسلم کرداروں کے مسائل بھی وہی ہیں جو کسی بھی اور مذہب یا فرقہ کے لوبیا ہتا جوڑے کے مسائل ہو سکتے ہیں۔

دستک سیاہ و سفید میں کیوں؟ رنگین کیوں نہیں؟

فلموں کے شائقین اور فلم ساز دونوں آج کل رنگین فلموں کے کریز میں مبتلا ہیں۔ جس کا نتیجہ ہے کہ بعض ایسے موضوع جنہیں صرف بلاک اینڈ وائٹ میں پیش کیا جانا چاہیئے، کلر کے چکر میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ بلاک اینڈ وائٹ فلم میں فلم بین اپنی تمام تر توجہ موضوع پر دے سکتا ہے جبکہ کلر فلم میں توجہ کو بٹانے والے بہت سے سامان ہوتے ہیں۔ بیدی کے پیش نظر بلاک اینڈ وائٹ میں فلم بنانے کا یہی مقصد تھا۔ دستک میں ازدواجی زندگی کے کچھ ایسے مناظر بھی پیش کئے گئے ہیں جنہیں اگر کلر میں فلمایا جاتا تو خطرہ تھا کہ فلم بین کی نظر ان مناظر کی رنگینیوں میں کھو کر اصل موضوع کے تاثر کو کم کر سکتی۔ مثال کے طور پر اگر گرو دت کی فلمیں "پیاسا" اور "کاغذ کے پھول" اور بمل رائے کی فلمیں "دیوداس" اور "بندنی" وغیرہ رنگین ہوتیں تو وہ تاثر نہیں دے پاتیں جو بلاک اینڈ وائٹ میں فلمانے سے ہمیں ملا ہے۔

بیدی بحیثیت ہدایت کار

ایک فلمی رائٹر کی حیثیت سے راجندر سنگھ بیدی پچھلے دو دہوں سے درجنوں فلمیں لکھ چکے ہیں۔ فلمی دنیا میں اپنے تیسرے دہے میں، اب بیدی نے ایک فلم پہلی بار ڈائرکٹ کی ہے۔ یہ فلم ہے "دستک" جو حال ہی میں جزوی طور پر فلم فینانس کارپوریشن کے قرضہ سے تکمیل پا چکی ہے اور اب سنسر نے اسے "سرٹیفکیٹ کے ساتھ یعنی" صرف بالغوں کے لئے" جو ہندوستانی فلموں کے لئے ایک غیر معمولی

۹۰ پیکر حیدرآباد

فلم نگر کی سماجی پیشکش

(ایسٹ مین کلر)

تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے

فلمساز و ہدایتکار

سوہن لال کنور

موسیقی

شنکر جے کشن

منوج کمار،

پران، پریم چوپڑہ

پریم ناتھ، ناظمہ اور

دوسرے

● کہانی : سچن بھومک ● عکاسی : کے۔ اچ۔ کپاڈیہ ● گیت : ورما ملک

● آرٹ : کے۔ بابو بھائی ● منظرنامہ : رام کیلکر ● مکالمے : ویدراہی ● تدوین : نند کمار

انکم ٹیکس نے کشور کمار کے بعد دلیپ کمار کے دروازے بھی فلمسازوں کے لئے کھول دیئے

آنجہانی کشور کمار نے عدالت کے فیصلے سے مجبور ہو کر فلموں میں زیادہ سے زیادہ گانے دینے شروع کر دیئے تھے جب انکم ٹیکس نے کشور کمار پر لگ بھگ ۲۵ لاکھ روپے عائد کئے تھے۔ عدالت کے فیصلے کے بعد کشور کمار کو یہ رقم ماہانہ ۲۵ ہزار روپے اقساط میں ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ بصورت دیگر انہیں جیل کی ہوا کھانی پڑتی۔ انہیں اقساط کی ادائیگی کے لئے کشور کمار کو بہ عجلت اتنے گیت گانے پڑ رہے ہیں کہ وہ ماہانہ قسط بر وقت عدالت میں جمع کرا سکے۔ اب کچھ ایسا ہی حال دلیپ کمار کا ہوا ہے۔ اسے بھی انکم ٹیکس کی ادائیگی کی خاطر اپنی روش سے ہٹ کر متعدد فلموں میں کام کرنے کے لئے تیار ہونا پڑا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں اس نے تین نئے معاہدے کئے ہیں۔ آئندہ چند دنوں میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ مزید کچھ فلمیں بھی قبول کرلے۔ دلیپ کی فلم "داستان" اگست میں ریلیز ہو رہی ہے۔ باقی ساری فلمیں چھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کی مدت میں تیار ہو جائیں گی۔

کہتے ہیں کہ دولت، عزت اور شہرت جب قدم چومتی ہیں تو محنت، صلاحیت اور صورت کچھ بھی نہیں دیکھتیں۔ یہ بات ہماری فلم انڈسٹری پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ چنانچہ بھارت بھوشن، پردیپ کمار، کلپنا، مالا سنہا، راجندر کمار، ریودی، بسواجیت، جتندر، راکھی، گلزار اور جوالے سنگھ بھی اسی طرح شہرت کے آسمان کو چھو چکے ہیں یہ اور بات ہے کہ آج ان کے قدموں تلے سے فلمی دنیا ہی سرک رہی ہے (بہت سوں کے ہاں تو سرک بھی چکی ہے) ایسی صورت حال عموماً بھیڑ چال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ان دنوں بمبئی اور مدراس میں بننے والی ۸۲ فلموں میں سے ۶۲ فلموں کی موسیقی لکشمی کانت پیارے لال، کلیان جی آنند جی، راہل دیو برمن اور شنکر جے کشن کے ذمے ہے۔ دیکھنا ہے کہ یہ بھیڑ چال کب تک ان لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جن میں سرفہرست لکشمی کانت پیارے لال ہیں اور اس کے بعد کلیان جی آنند جی اور راہل دیو برمن آتے ہیں۔ اس دوڑ میں قسمت کب اور کہاں تک کس کا ساتھ دے گی اس کا جواب تو مستقبل ہی دے سکے گا۔

۷۵ فی صد فلموں پر چار موسیقاروں کا قبضہ

ہمیر حیدرآباد ۹۳

"پاکیزہ" سنسر ہو گئی

فلمکار فلم ساز، ہدایت کار کمال امروہوی کی رنگین فلم پاکیزہ سنسر بورڈ نے پاس کر دی۔ اس فلم میں اشوک کمار مینا کماری اور راج کمار کے علاوہ نادرہ، سجاتا، وجے لکشمی، نرملتا، مناکوتر، وینا، سپرد، پرمیتا دیوی اور ایس نذیر نے کام کیا ہے۔ مینا کماری نے اس فلم میں ڈبل رول کیا ہے۔ عکاسی جوزف اور جال مستری کی ہے۔ گیت مجروح کیفی اور اسد بھوپالی اور کمال امروہی کے ہیں اور موسیقی مرحوم غلام محمد کی ہے پس منظر موسیقی خیام کی ہے۔ توقع ہے کہ فلم بہت جلد سارے ہندوستان میں ریلیز کر دی جائے گی۔

شرمیلا ٹیگور آتما رام کی فلم میں

گرودت کے بھائی فلم ساز و ہدایت کار آتما رام (پچھلی فلم امنگ) کی فلم (جس کا ابھی نام نہیں رکھا گیا ہے) میں شرمیلا ٹیگور اور راجیش کھنہ کو یدڈی لوسرز گلڈ نے کام کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

ہیمنت کمار "بیس سال پہلے"

موسیقار، فلمساز ہیمنت کمار کی فلم "بیس سال پہلے" جس کی ۵ ریلیں بن چکی ہیں انہوں نے پچھلے دنوں تا منگیشکر سے ایک گانا ریکارڈ کروایا۔ وہ اپنی بیٹی رانو مکرجی سے دو گانے ریکارڈ کروا چکے ہیں جنھیں فلم میں پدما اور ہیروئن انوپا ہد کیبرے کے ساتھ فلمائے گئے۔ اس فلم میں نیا اداکار ریتیش ہیرو کا رول ادا کر رہا ہے۔

خواجہ احمد عباس باکس آفس کے چکر میں!

خواجہ احمد عباس جواب تک نئے اداکاروں نئے موسیقاروں اور نئے نئے فنی ماہروں کے ساتھ سیاہ و سفید میں فلمیں بناتے رہے ہیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ باکس آفس فارمولے پر فلم بنانے کے چکر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی آئندہ فلم "رنگین" بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فلم میں انہوں نے سمی کو بطور ہیروئن لیا ہے اور وجے دیو کو موسیقار کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جبکہ ان کی پچھلی چند فلموں کی موسیقی ایک گمنام موسیقار کو شک دیا کرتے تھے جس کی دھنیں نہ تو خواص کو متاثر کر سکیں نہ ہی عوام میں کوئی مقبولیت حاصل کر سکیں۔ ابھی ہیرو کے نام کا اعلان نہیں ہوا ہے ہو سکتا ہے کہ بطور ہیرو خواجہ احمد عباس کسی چالو اداکار کو پیش کریں اور دوسرے شعبوں میں بھی اسی طرح کا انتخاب کریں کہ فلم کی کامیابی ذرا سی بھی شک کی نہ ہونے پائے۔ اور وہ اپنے سوشلزم کو رنگین بنا کر پیش کر سکیں۔

لگام

اے آر صدیقی

غیر جانبدار فلمی تبصرے

ہاتھی میرے ساتھی

"ہاتھی میرے ساتھی" اُن لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے جو خاص طور پر سرکس دیکھنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس فلم کے دیکھنے کے لئے کسی مخصوص عمر کی قید نہیں۔ کوئی بھی آدمی جس کی عمر تیرہ سال سے کم ہو اس فلم کا صحیح لطف اٹھا سکتا ہے۔

پروڈیوسر چنپا دیور نے اس فلم کے ذریعے ہر انسان کے اندر چھپے ہوئے بچے کو جگانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوشش بے حد بچکانہ ہے اور شاید اس زمانے کا بچہ بھی اس فلم کی کہانی کو کہانی نہ سمجھ سکے گا۔

فلم کی کہانی اصل میں چند جانوروں اور خاص طور پر ایک ہاتھی کے اطراف گھمائی گئی ہے جو دیکھنے میں راجیش کھنہ جیسی لیکن راجیش کھنہ سے بھی زیادہ عقل مند ہے۔ تقریباً سارے کام جو راجیش کھنہ فلم کے پردے پر کر سکتا ہے۔ ہاتھی اس سے زیادہ بہتری سے یہ کام انجام دے سکتا ہے چونکہ بدقسمتی سے ہاتھی لکشمی کانت پیارے لال کے گانے نہیں گا سکتا تھا اس لئے پروڈیوسر راجیش کھنہ کو لینے پر مجبور ہوا ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ فلم راجیش کھنہ کی وجہ سے کم اور ہاتھی کی وجہ سے زیادہ چلا رہی ہے۔ فلم میں کہانی نام کی کوئی چیز تلاش کرنا کسی زندہ ببر کے (سرکس کے نہیں) دانت گننے جیسی بیکار اور خطرناک بات ہے۔ کہانی کی خامیوں کو پر کرنے کے لئے جگہ جگہ دوسرے جنگلی جانور پیش کر کے تماشائیوں کو بہلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

راجیش کھنہ نے بڑی سہل اداکاری پیش کی ہے۔ لیکن تنوجہ نے ایک غیر اہم رول میں اپنی فطری اداکاری کے رنگ بھر دیا ہے دوسرے اداکاروں میں قابلِ ذکر صرف ہاتھی ہیں۔ وہ ہاتھی جس کے ساتھ فلم کا نام وابستہ ہے لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی جانوروں کے خور کو چار چاند لگا رہی ہے۔ آنند بخشی اگر "چل یار دھکا مار" کی قسم کے ہی گیت لکھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب کہ ان کی شاعری کو بھی دھکا مارنے کی ضرورت پیش آئے۔ مجموعی طور پر "ہاتھی میرے ساتھی" ایک معمولی فلم ہے۔

ایک مکمل ماہ نامہ

دسواں سال ● آٹھواں شمارہ

پیکر

اگست ۱۹۷۱

جشن آزادیٔ ہند مبارک

مدیر:
اعظم راہی

سرورق:
محمد اقبال

عنوانات:
غوث محمد

کتابت:
مسعود جاوید

قیمت سالانہ:
بارہ روپے

فی شمارہ:
ایک روپیہ

صدر دفتر:
۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد-۲۹

دیگر دفاتر:
● ۳۱۸ - اروان چیمبر
مین روڈ - تار دیو بمبئی
فون: 373647
● ۶۵ - بی - دوسرا بلاک
راجہ جی نگر بنگلور - ۱۰

'پیکر' میں شائع ہونے والے
افسانوں، خاکوں وغیرہ میں نام، مقام،
کردار، واقعات فرضی ہیں
اور ان سے کسی بھی قسم کی مطابقت
محض اتفاقیہ ہے۔

اعظم راہی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے پرنٹو پریس کے لیے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
میں چھپوا کر ۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد - ۲۹ سے شائع کیا

اس شمارے میں

زاویے

اداریہ

۱۵ اگست ۱۹۷۱ کو

ہمارا ملک آزادی کے چوبیں سال مکمل کرکے پچیسویں
سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ ایک ایسے موقع
پر ہم پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ ہم نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ساز باز کرکے مشرقی
بنگال کو علیحدہ اور خود مختار مملکت بنانے
کی سازش کی۔ ۱۹۴۷ کی تقسیم کے زخم ابھی مندمل بھی نہیں ہو پائے
تھے، وقت نے جو ایک بے درد مسیحا ہوتا ہے، کوئی
چارہ گری بھی نہیں کی تھی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم پھر ایک ملک کی تقسیم
کی حمایت کرتے۔
ہم نے تو پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے امکانات کا
استقبال کیا تھا۔ ہمارے صحافتی، سماجی اور سرکاری
حلقوں نے کھلے دل سے انتخابات کے نتائج کا خیر مقدم کیا تھا۔ محض اس لیے
کہ پاکستانی عوام نے ترقی پسند جماعتوں
کو کامیاب بنایا ہے، لیکن جمہوری نظام کی بحالی کی بجائے پھر
ایک بار مملکت پاکستان پر مارشل لاء کی
تاریکیاں مسلط ہو گئیں جس کی مذمت ہمارے علاوہ ساری دنیا کے انصاف
جمہوریت پسندوں نے کی۔ اب یہ صورت حال ہے
کہ بنگلہ دیش میں عام شہری حالات خوف و دہشت کی فضا
میں گم ہو چکے ہیں اور ہمارے ملک میں
مشرقی بنگال کے ستر لاکھ پناہ گزین موجود ہیں، چنانچہ اب وہ وقت دور
نہیں رہا جب ہندوستان بنگلہ
دیش کی حکومت کو تسلیم کرلے، وہاں کی جمہوری قوتوں کی حوصلہ افزائی اور اعانت کرے
حکومت کے ایسے کسی بھی اقدام کی سارا ملک ایک جسد واحد کی طرح حمایت کرےگا
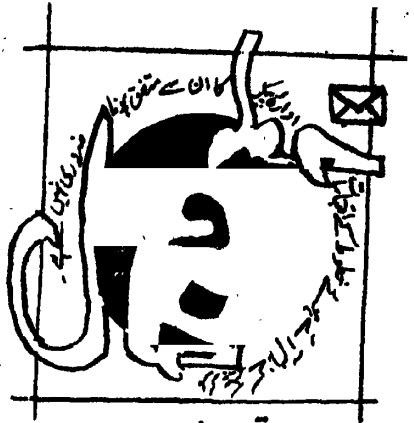
عزیز قیسی۔ بمبئی: بھائی پیکر! تمہارے دو شمارے ملے۔ منفرد ہیں۔ اُردو کے رسالے مقبول ہو سکتے ہیں، معتبر نہیں۔ میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ اعتبار تو مواد سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ پابندی سے رسالہ نکلنے سے بھی اور رواداری شعور کے بڑے معتدل اظہار سے بھی۔ پیکر کے مواد کے بارے میں کیا لکھوں؟ رسالہ تو انہی چیزوں سے بھرتا ہے جو رائج الوقت ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے پیکر بھی اُردو کے اور رسالوں کی طرح ہے۔ مگر کتابت اور ترتیب کے اعتبار سے یقیناً پیکر مختلف ہے۔ اسے معتبر بنائیے۔ اس شمارے میں صدیق منانی کی کہانی اچھی لگی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ وہ ایک خاص ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ نظمیں اچھی ہیں۔ غزلیں بھی لیکن کیا تمہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اب جدید شاعر (جن میں میرے شامل نہ ہونے کی مجھے خوشی ہے) ترقی پسندوں کی طرح (جن میں بھی میں شامل نہیں ہوں، اسکی بہت سوں کو خوشی ہوگی) گنے چنے موضوعات اور محدود لفظیات کے CLICHE کے شکار ہو گئے ہیں۔ اسلم عمادی کے مضمون کی تعریف

۶- پیکر حیدرآباد

کر دینا۔ رافد آذری کی نظم کیسی ہے... مجھے تو بس یہ خوشی ہے کہ یہ رافد کی نظم ہے... میں نے کیسے کیسے جاندار اور شاعرانہ لمحات... وہاں بھی اور یہاں بمبئی میں بھی—

اقبال مجید۔ سیتاپور: جولائی کے شمارے میں مجتبیٰ حسین کی کلیشوروں سے گفتگو بڑی دلچسپ اور پُرمغز ہے۔ مجھے ادبی پرچوں سے ایک عام شکایت ہے۔ بھائی! صرف چند ادبی افسانوں، چند نظموں اور غزلوں کے ساتھ ایک آدھ مضمون اور بس—صرف اتنی سی دنیا ہوتی ہے آجکل کے پرچوں کی۔ بہت ہوگئے بڑھے تو دو ایک خط چھاپ دیئے۔ اس لئے کہ کوئی فساد اٹھ سکے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو کے رسالوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے دامن کو اور کشادہ کریں۔ نئے موضوعات کو جو علمی سطح کے ہوں، سامنے لائیں ورنہ محض افسانوں، لولی لنگڑی شاعری اور اپنی اَنا کی تسکین کے لئے لکھے گئے ادبی مضامین کے ساتھ ہم زیادہ لوگوں تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ دیگر صورت میں ہمیں پرچہ چھپوانے کی بجائے سائیکلو اسٹائل کرا لینا چاہیئے اور چند گنے چنے لوگوں میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔

ارشد صدیقی۔ بھوپال: پیکر کا ذاتی اپنا ایک مزاج ہے۔ جس پر میری رائے میں عصبیت کا تو کوئی حرف آ ہی نہیں سکتا۔ اگر آپ اسی طرح ہوشمندی سے کام لیتے رہے تو یہ پرچہ ہندوستان میں اپنی تاریخ چھوڑ جائے گا۔

پرکاش فکری۔ رانچی: پیکر بہت خوبصورتی سے نکل رہا ہے۔ اس بار پیکر میں مخ...

[illegible] ۔ غزلیں بھی
بھیج رہا ہے اس سے بڑی مسرت ہوئی۔ یہ غزل
ترقی پسند کی تھی۔

حسن فرخ۔ حیدرآباد: "مجتبیٰ حسین اور کملیشور
کی بات چیت" کئی اعتبار سے یادگار رہا۔ ایک
تو اس لئے کہ کملیشور نے اپنے تمام تعصبات اور تاثرات
کسی تحفظ ذہنی کے کھول کر رکھ دیئے ہیں وہ ادبی
ہوں کہ سیاسی و سماجی دوسرے اس لئے بھی کہ اس
طرح ایک ہندی ادیب کی سوچ یا اجتماعی طور پر ہندی
ادیبوں کی سوچ سے اردو داں طبقہ واقف ہو سکے
"پھر وہی اردو ہندی جھگڑا" کے علاوہ کملیشور جی کے
سیاسی نظریات نے مجھے کچھ لکھنے پر اکسایا ہے اور
یہ موضوع تفصیلی تجزیہ چاہتا ہے (جو بہت جلد مکمل
ہو جائے گا) البتہ سرسری طور پر اتنا کہنا ضروری
سمجھتا ہوں کہ زبان کی ترقی و ترویج اور اسکی تشہیر
اشاعت کے لئے ماہر لسانیات ہونا اتنا ضروری
نہیں ہے۔ خود کملیشور جی بھی ماہر لسانیات نہیں
ہیں مگر ان کے CONTRIBUTION سے کون انکار
کر سکتا ہے؟ انہوں نے فراق پر زبان کی دریافت
کے بجائے ہندی لفظوں کے ٹھونسنے کا جو الزام
لگایا ہے وہ بڑی حد تک درست نہیں ہے فراق
ماہر لسانیات بننے کی کوشش میں خواہ کتنے ہی چھوٹے
ہو جاتے ہوں مگر انہوں نے مسعود حسین خاں کی
قبیل کے بہت سے ماہر لسانیات کی طرح اردو کو
ادبی اور تعلیمی میدان میں کبھی بھی نقصان نہیں پہنچایا
ہے۔ اقبال کے CONTRIBUTION سے جب
کملیشور جی کو بھی انکار نہیں ہے تو بھلا مجھے کیا ہو سکتا
ہے مگر اقبال کا CONTRIBUTION زیر بیان
اور زبان کی دریافت سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا
کہ نفس مضمون سے تعلق رکھتا ہے اقبال نے اردو
کو عالمی سطح پر پہنچایا تو اس میں ان کی فن کاری اور
فارسی شاعری دونوں ہی کا حصہ ہے۔ بہر حال یہ
بات چیت گفتگو کے بہت سے دروازے کھولتی
ہے اس کے لئے مجتبیٰ حسین قابل مبارکباد ہیں۔

احمد وصی۔ بمبئی: اندازہ ہو رہا ہے کہ
پیکر اردو میں اچھے رسالوں کی کمی کو پوری کرتا ہے
اسے ادبی ہونے کے ساتھ تفریحی پرچہ ہونے کا فخر
بھی ہے اور ساتھ ہی معیار بھی برقرار ہے۔ یہ بڑی
بات ہے۔

اسرار عظمت: اورنگ آباد: ایک
بات میں شروع سے ہی محسوس کر رہا ہوں کہ پیکر میں
جدیدیت کے نام پر دھاندلی نہیں ہو رہی ہے اور پرچہ
کو آپ نے غیر متوازن نہیں ہونے دیا ہے۔ نظموں کے
انتخاب میں تھوڑی سی احتیاط برتیں تو مناسب ہے۔

فیاض رفعت۔ دلّی: یہ آپ نے
بہت اچھا کیا کہ کملیشور کا انٹرویو شائع کر دیا۔ دوسری
علاقائی زبانوں کے نمائندہ ادیبوں کے انٹرویو بھی
شائع کیجئے۔ اس طرح عصری ادب کو سمجھنے میں اردو
والوں کو آسانی ہوگی۔ راشد آذر۔ عتیق حسن کمال
اور پرکاش فکری کی تخلیقات متوازن اور معیاری
ہیں۔

سلمیٰ شاکر۔ حیدرآباد: مجتبیٰ حسین اور
ے۔ پیکر حیدرآباد

کملیشور کی بات چیت میں مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ اینٹی اسٹوری قطعی طور پر غیر انسانی نہیں۔ جنگ عظیم کا پس منظر نہ ہو تو کیا ہوا۔ انسان کا روبوٹ بن جانا کیا کسی جنگ عظیم کی پھیلائی ہوئی تباہ کاریوں سے کم ہے؟ اس صورت میں تو صبر بھی آجاتا مگر اب ہمدردی کے دو بول تو کجا — سب کچھ نرا دکھاوا بن کر رہ گیا ہے۔ ہاں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہماری تجریدی کہانیاں اپنے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں ابھی یہ متوازن نہیں۔ علائم کا ٹھیک استعمال مشکل ترین فن ہے کیونکہ یہی علامتیں اگر کہانی سے صلح کرلیں تو قاری سے بغاوت کر جاتی ہیں اور بیراگر پاگل کی بڑ نظر آتی ہیں۔

علی ظہیر۔ حیدرآباد۔ کملیشور سے مجتبیٰ حسین کی بات چیت بہت دلچسپ ہے۔ ویسے اس بات چیت سے جہاں فراق کی شاعری پر کملیشور کے نظریات سامنے آسکتے ہیں وہیں خود کملیشور کے بعض درپردہ تعصبات بھی چھپے نہیں رہتے۔ حسن فرخ رؤف خیر، پرکاش فکری اور حسن کمال کی تخلیقات پسند آئیں گو کہ رؤف خیر کا اسٹائل کچھ فرسودہ سا ہی لگا۔ پتہ نہیں آپ نے ضیا ساحری جیسے شاعر کو اپنے شمارے میں کس طرح جگہ دی۔ اسلم عمادی کا مضمون بھی اچھا ہے۔ امید ہے کہ وہ ہمیں جدید شاعری پر اور بھی اچھے مضامین سے سرفراز فرمائیں گے۔

فلموں کے حصے میں آپ نے "دستک" کے بارے میں جو لکھا ہے وہ بہت ہی اچھا اقدام ہے۔ ہم کو ایسی فلموں کی کامیابی کے لئے اسی طرح کوشش

۸ ـ پیکر حیدرآباد

کرنی چاہئے۔ امید کہ اس طرف بھی آپ [illegible] اور دوسری زبانوں کی اچھی فلموں پر بھی مضامین سے نوازیں گے۔

نسیم مظفرپوری۔ پٹنہ: کرشن چندر کی کہانی بہ یک وقت دو ماحول پیدا کرتی ہے۔ ایک سنجیدہ اور گمبھیر اور دوسرا مزاحیہ اور پرلطف کشمیر کی تاریخ اور اس کے بدلتے ہوئے حالات والی بحث، کچھ زیادہ طویل ہو گئی ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب اور بھالو کی کہانی ایک لطیفہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہانی اچھی ہے آگے بھی تو کچھ ہوتا ہی ہے۔

شاہدہ حسن۔ کھڑگ پور (مغربی بنگال) جولائی کے شمارے میں مجتبیٰ حسین کا کملیشور سے انٹرویو، جگدیش بمل اور صدیق عثمانی کے افسانے بہت پسند آئے۔ کرشن چندر کی "ذرا سی گنگو" بے حد دلچسپ ہے۔

شاہد کبیر۔ ناگپور: ایک ماہ بعد دفتر لوٹا ہوں تو ذاتی ڈاک معمول سے کچھ زیادہ ہی ملی۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ آپ نے میرے پتہ کے ساتھ "ڈائرکٹر" لکھ دیا جبکہ میں نے "ڈائرکٹریٹ" لکھا تھا۔ بہرحال ثابت یہ ہوا کہ شاہد کبیر کی بہ نسبت ڈائرکٹر ادبی حلقوں سے زیادہ قریب ہے۔

شاکر کریمی۔ بتیا (چمپارن) کسی اچھے رسالے کیلئے بک اسٹال تک جانے کی تیاری کررہا تھا کہ پیکر ملا دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ طبیعت خوش ہوگئی۔

اجنتہ

افکار تراشے گئے پتھر کے متن میں
افکار نمایاں ہیں تصوّر کے سخن میں
انساں کے معراج کا اظہار ہے یہ بھی
افکار ہیں پوشیدہ ہر اک رنگ بہ گہن میں

تیری طلب دید میں کعبہ کو سجایا
تیرے ہی لیے مندر و مسجد کو بنایا
تسبیح میں تیرے ہی دو عالم کے خداوند
انسان نے اجنتہ کے پہاڑوں کو تراشا

ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ

۱۹۲ - ریڈہلز - حیدرآباد - ۴

آرزو روکش فریاد ہوئی
دل کی بستی کبھی آباد ہوئی
عرشِ اعظم ہی میں دل کو سمجھا
جس گھڑی دل میں تیری یاد ہوئی
جونہی چہکی تھی کہ گل پر بلبل
لقمۂ پنجۂ صیاد ہوئی
لب تک آئی نہیں فریاد مری
دل میں گھٹ گھٹ کے یہ برباد ہوئی
یاد میں تیری ہی ہم جیتے ہیں
تجھ سے قائم مری بنیاد ہوئی
خانہ ویرانی بھی لمعہ اپنی
دشت پیمائی فرہاد ہوئی

ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ حیدرآباد کے بزرگ شاعر ہیں۔ آپ کا ایک مجموعہ "پریم رس" شائع ہو چکا ہے۔ آپ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی شاعری کے ذریعہ بھی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ علامہ اقبال کے قریبی شاگردوں میں سے ہیں۔ "مکاتیب اقبال" میں آپ کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر لمعہ ہی نے ٹیگور اور اقبال کے درمیان رابطے کا کام انجام دیا تھا جس کے سبب دونوں عظیم شاعروں نے ایک دوسرے کے نظریات اور فلسفے کو بہتر طور پر سمجھا۔

ایک طویل کہانی

(تیسری اور آخری قسط)

ڈیوڈ نے سکھ نوجوان کے ساتھ گالف کھیلنے کا پروگرام بنایا۔ تو میگی بولی "تم جانتے ہو میں گالف سے سخت بور ہوتی ہوں۔"

"تو تم کوئی دلچسپ سی کتاب پڑھو۔ کتابیں پڑھنا تمہارا کام ہے۔ نفسیات پڑھاتی ہو۔"

"میں گل مرگ کتابیں پڑھنے نہیں آئی۔" میگی نے ڈیوڈ کے خفتہ طنز کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا کروگی۔"

میگی نے عالم اضطراب میں اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ پھر بولی "میرا خیال ہے میں گھوڑے پر ایک لمبی دوڑ لگا آتی ہوں۔"

"کھلن مرگ تک ہو آؤ۔" ڈیوڈ بولا۔ "میں بھی جی بھر کے گالف کھیل سکوں گا۔"

کنول نے جولی سے کہا "میں نے ابھی سن لیا۔ میگی کھلن مرگ جا رہی ہے۔"

"موقع اچھا ہے۔ جولی مسکرا کر بولی "تم بھی ہو آؤ۔"

میں نے کہا "اچھی طرح سے غور کر لو۔"

"کر لیا۔" جولی دانت پیس کر بولی "میں اس حرامی ڈیوڈ کو زک دینا چاہتی ہوں۔"

"اور اگر میگی نے مجھے منہ نہ لگایا تو۔۔۔۔"

"نا ممکن ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر تم کوشش کروگے۔"

"ہر عورت اپنے شوہر کے بارے میں اسی قسم کے شبے رکھتی ہے۔ بہرحال میں جاتا ہوں۔"

کنول نے بھی ایک عمدہ سا گھوڑا لیا۔ اور میگی کی مخالف سمت دوڑاتے ہوئے نکل گیا۔ دور جا کر اس نے باگ موڑی اور ایک دوسرے راستے سے میگی سے آن ملا۔ اس وقت میگی چڑھائی چڑھ رہی تھی اور دریا اور سڑک ایک لمبی قطار اس کے جسم پر سایہ

وابیر حیدرآباد

کرشن چندر
"دی نش" اپر ٹلورسیٹ فرانسیس ایونیو
سانتا کروز ویسٹ بمبئی ۵۴

ننگی تھی ___

میگی نے نارنجی رنگ کا سوئیٹر پہن رکھا تھا جس میں سے کریم رنگ کے کھلے کالر ہوا میں اڑتے نظر آتے تھے۔ اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی چھاتیوں کا زیر و بم بہت واضح ہو جاتا تھا۔ اس نے بھونسلا رنگ کی کارڈورائے مخمل کی جودھپور پہن رکھی تھی۔ جو اس پر بہت سجی تھی اور جس سے اس کی پتلی کمر اور بھاری کولہوں کا ابھار نمایاں ہو چلا تھا۔ کنول نے سوچا۔ اس نیگرو لڑکی سے تو بے پناہ عشق کیا جا سکتا تھا جب دو نسلیں ملتی ہیں تو ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے میگی میں نیگرو قوم کی وحشی لچک اور مضبوطی اور جلد کی مخملیں نرمی آگئی ہے تو دوسری طرف سفید قوم سے اس کا سحر آمیز رنگ آنکھوں کی نیلاہٹ اور پتلے ہونٹ آگئے ہیں۔ لانبی گردن اور بھرپور چھاتیاں اسے نیگرو قوم نے دی ہیں۔ تو کالے بالوں کا سیدھا پن سفید نسل نے عطا کیا ہے۔ میگی بے تحاشا حسین اور جاذب نظر ہے۔

پھر وہ گھوڑا دوڑا کے آگے بڑھ کے میگی کے گھوڑے کے ساتھ ہو لیا۔ میگی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو کنول نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

"ہائی ___"

ہائی وہ بھی ہاتھ ہلا کے بولی۔

"کدھر جانے کا ارادہ ہے؟" کنول نے پوچھا۔

"کھلن مرگ!"

"چلو میں بھی اُدھر ہی چلتا ہوں۔"

"تو کیا تمہارا ارادہ کہیں اور جانے کا تھا؟" میگی نے پوچھا۔

کنول بولا: "نہیں میں تو ایک لمبی سیر کو نکلا تھا یعنی گل مرگ میں۔ مگر اب ایک خوب صورت لڑکی کا ساتھ ہے تو چلو کھلن مرگ تک ہو آتے ہیں۔"

کچھ عرصے تک دونوں گھوڑے ساتھ ساتھ چلتے رہے کنول نے کہا۔
"تم بہت مشاقی سے گھوڑا چلاتی ہو۔"
"ہاں مجھے اس کی عادت ہے۔ گھوڑے کی سواری مجھے پسند ہے اور تمہیں بھی۔؟" میگی نے پوچھا۔
"ہاں۔ مجھے بھی۔۔۔۔" کنول نے جواب دیا۔
پھر پوچھا۔ "ڈیوڈ کیوں نہیں آیا۔؟"
"وہ آج لنچ تک گالف کھیلے گا۔ وہ گالف کے لئے دیوانہ ہے۔ اور میں اس کھیل کو برداشت نہیں کر سکتی۔"
"ایسی خوب صورت لڑکی کو اس نے اکیلے جانے دیا۔؟" کنول نے مسکرا کر کہا۔ میگی کے خوشنما دانت چمکے۔ کنول نے سوچا۔ یہ سپید خوشنما مضبوط دانت بھی نیگرو قوم نے اس لڑکی کو دیئے ہیں۔ سفید رنگ قوموں کے دانت اتنے اچھے نہیں ہوتے
میگی ہنس کر بولی: "میں اکیلی کہاں ہوں میرے ساتھ بھی تو ایک ہینڈسم مرد ہے۔"
"شکریہ۔۔۔ کیا تمہیں ہندوستانی پسند ہیں۔"
"سبھی تو نہیں۔ مگر کوئی کوئی پسند آجاتا ہے۔ عام طور پر ہندوستانی اجنبی لڑکیوں کے سامنے شرمیلے سے نظر آتے ہیں۔ اور مجھے۔۔۔۔۔ اور مجھے۔۔۔۔
کنول نے کہا: "تمہیں شاید جرأت آمیزی پسند ہے"
"ہر لڑکی کو ہوتی ہے۔" میگی بولی۔ اور عجیب طرح سے ہنسی۔ پھر پوچھنے لگی: "اور تمہیں لڑکیوں میں کیا پسند ہے۔ شرم یا بے باکی۔۔۔
کنول بولا: "دونوں۔ کبھی شرم۔ کبھی بے باکی۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کہاں [illegible] ڈرائنگ روم میں یا بیڈ روم میں؟"
میگی نے چونک کر کنول کی طرف دیکھا۔ پھر بولی: "پہلے تم مجھے احمق سے معلوم ہوئے اب معلوم ہوتا ہے۔ تم بہت تیز آدمی ہو۔"
"تیز تو نہیں ہوں۔" کنول بولا: "ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر میری گھگھی نہیں بندھ جاتی۔"
"تجربے کار مرد کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے۔" میگی ہنس کر بولی۔
دھوپ میں میگی کے بدن کا رنگ خوب چمک رہا تھا۔ یہ سپید رنگت نہیں تھی۔ سرخ بھی نہیں تھی۔ کالی یا سانولی بھی نہیں تھی۔ زیتونی بھی نہیں تھی۔ جیسی کہ اطالوی لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ بلکہ ایک عجیب قسم کا کریم کلر تھا جس میں ہلکا سا لیمن رنگ جھلکتا تھا۔ کچھ صندلی اور زعفرانی رنگت کے بیچ کا رنگ جو رخساروں پر شہابی ہو جاتا تھا۔ جلد بے حد بے داغ اور صاف شفاف تھی۔ کنول غور سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک دھوپ چلی گئی۔ اور بادل گھر کر آنے لگے۔ پہلگام اور گل مرگ میں موسم اس قدر غیر متعین رہتا ہے۔ ابھی دھوپ ہے ابھی چھاؤں۔ ابھی سورج چمک رہا ہے اور اس کی تمازت جلد پر بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ ابھی بارش ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ جب وہ چڑھائی کا ایک لمبا چڑھاؤ کے ایک سطح مرتفع پر پہنچے۔ تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چلی تھی۔ کنول کو میٹرولا جیکل،

[illegible] بڑی سڑک پر روک دیا
گھوڑا آگیا۔ اس نے بیگی سے کہا۔ بارش زور پکڑ
جائے گی ایسا دکھائی دیتا ہے۔ اگر اس بنگلے پہ نہ پہنچا
تو ہم بری طرح بھیگ جائیں گے۔

"چلو وہیں چلیں۔" بیگی گھوڑا دوڑاتے ہوئے بولی۔
مگر بنگلے تک پہنچتے پہنچتے بارش کی بوچھار شروع ہو چکی
تھی۔ بیگی کا بلاؤز اور سویٹر اس کے بدن سے چپک
گیا تھا۔ اور وہ بیگی بیگی بے حد متناسب معلوم
ہو رہی تھی۔

بنگلے کا وکٹ گیٹ کھول کر وہ دونوں گھوڑوں کی
باگیں ہاتھ میں تھامے اندر گئے۔ باہر برآمدے
میں انہوں نے گھوڑے باندھے۔ برآمدے میں
ایک مالی کُرتی لئے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے باغیچے
میں کام کر رہا تھا۔ بارش دیکھ کر برآمدے میں آگیا
تھا۔ اسے دیکھ کر کنول نے پوچھا۔

"صاحب کہاں ہیں؟"

"کون کول صاحب۔"

"ہاں کول صاحب"

"وہ نیچے گلمرگ گئے ہیں۔"

"تو بنگلہ تو کھولو۔ ہم باہر برآمدے میں کھڑے کھڑے
بارش کی ترچھی بوچھار سے بھیگ جائیں گے۔ کول صاحب
سے ملنے آئے تھے۔ جب تک وہ آئیں ان کا انتظار
کرنا پڑے گا۔

مالی نے رعب میں آکر بنگلہ کھول دیا۔ دونوں اندر
گھس گئے۔

دو کمرے آگے تھے۔ ایک ویٹنگ روم تھا۔
دوسری رنگ میں ایک ڈرائنگ روم تھا۔ ڈرائنگ
روم سے ملحق بیڈ روم تھا۔ اور ایک باتھ روم۔
بیگی باتھ روم میں گھس گئی۔ گیلا سوئٹر اتار کے واپس
آئی پھر اسے ایک کرسی پر پھیلا دیا۔ پھر بولی۔ "میرے
بلاؤز کا بیک زپ گیلا ہو کے پھنس گیا ہے کھلتا نہیں
ہے۔"

کنول نے کہا۔ "میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔"
بڑی مشکل سے اس نے زپ کھولا۔ بیگی نے بلاؤز
اتار کے اسے بھی سکھانے کے لئے دوسری کرسی پر
ڈالا۔ اب وہ صرف برا پہنے تھی۔

کنول نے میز کی دراز دیکھی۔ پھر ایک الماری کھولی
اس میں اسے وہسکی کی بوتل مل گئی۔ اور چند گلاس۔
ایک تپائی پر پانی کا جگ رکھا تھا۔ اس نے دو
گلاس میں وہسکی ڈالی۔ بیگی کا بدن سردی سے کانپ
رہا تھا۔ وہ غٹا غٹ پی گئی۔

بیڈ روم دیکھ کر بولی۔ "آدمی خوش ذوق معلوم ہوتا
ہے تمہارا دوست ہے؟"

"میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔"

"اگر وہ اس وقت آجائے۔"

"تو کیا ہوا۔ بارش میں بھیگے ہوئے جوڑے کو باہر تو
نکال نہیں دے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہسکی کے
پیسے لے لے گا۔ میرے خیال میں خوش ذوق آدمی
ہے۔ نہیں لے گا۔"

"مجھے اور وہسکی دو۔" بیگی بولی۔

"میرے خیال میں تم اسے نیٹ پی جاؤ۔" کنول
نے گلاس دیا۔ "نہیں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔"

دوسرا پیگ پینے کے بعد میگی بولی "ہاں۔ اب گرمی آ گئی ہے بدن میں۔"

کنول اس کے برا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ کہ تمہیں یوں دیکھ سکوں۔ اس کی خواہش ضرور تھی۔ امید نہ تھی۔"

"کیسی لگتی ہوں؟"

"میری توقع سے زیادہ۔"

"میں گیلے کپڑوں سے بہت گھبراتی ہوں۔" میگی بولی۔ "مجھے دو بار نمونیا ہو چکا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کیا۔ گیلا سوئٹر اور گیلا بلاؤز نکال دیا۔ اب اس برا کو بھی۔" میگی نے مسکرا کر اپنی بھری بھری نکیلی چھاتیوں کو دیکھا پھر شرما کر منہ پھیر لیا۔

کنول بولا "مجھے معلوم نہ تھا۔ اتنی جلدی مجھے تم سے عشق کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔ حالانکہ آیا میں اسی ارادے سے تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"یعنی ایک قسم کا جھوٹ موٹ عشق۔"

میگی پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر جب کنول نے اسے سب بات بتائی۔ تو دھیرے دھیرے ہنسنے لگی۔

"عجیب اتفاق ہے۔"

"کیا۔؟"

"میں بھی آج صبح کچھ اسی طرح کی باتیں سوچ رہی تھی۔"

میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

میگی نے تشریح کی۔ . . . میں جولی کا غصہ سمجھ سکتی ہوں۔ ڈیوڈ میں ایک رگ ہے۔ طنزیہ حملہ کرنے کی۔ وہ کبھی اس سے نہیں چوکتا۔ اور اس سے ہر ایک کو اپنے دشمن بنا لیتا ہے۔ مگر وہ اپنی عادت سے مجبور ہے۔ جولی اگر اسے سبق سکھانے پر آمادہ ہو گئی تو کوئی عجیب بات نہ ہوئی۔ عجیب بات تو کچھ اور ہے۔

"وہ کیا؟"

آج صبح انگرڈ نے مجھے بتایا۔ کہ کل رات کو کسی وقت کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اور جب اس نے دروازہ کھولا تو باہر ڈیوڈ کھڑا تھا۔ شب خوابی کے لباس میں۔ وہ انگرڈ کے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔ اور اس سے محبت کرنا چاہتا تھا۔

"ایسے ہی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ کل رات ہم دونوں کچھ زیادہ پی گئے تھے۔ میں تو بے خبر سو گئی تھی۔ ممکن ہے ڈیوڈ نے ایسا کیا ہو۔ کیونکہ انگرڈ نے بتایا کہ ڈیوڈ نے بے تحاشہ پی رکھی تھی۔"

"پھر۔؟"

"پھر کیا؟" انگرڈ نے منیجر کو بلانے کی دھمکی دی۔ تو ڈیوڈ واپس چلا آیا۔ انگرڈ نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ مگر مجھے کچھ معلوم نہیں میں بے خبر سو رہی تھی۔ مجھے اتنا معلوم ہے۔ کہ بہت رات گئے ڈیوڈ نے میرے پہلو میں آ کر مجھے جگانے اور مجھ سے پیار کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر مجھے بے حد نیند آ رہی تھی اس لئے میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ صبح جب انگرڈ نے مجھے رات کا حال بتایا تو مجھے سخت غصہ آیا میں ڈیوڈ کو سزا دینا چاہتی تھی۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیسے؟ اس لئے یہی بہتر سمجھا کہ آج دن بھر اس سے

ضرور تھا۔ مگر تم نے مجھے اس سے بہتر کب سمجھا
دیا ہے۔
میگی زیرِ لب ہنسنے لگی۔
"تو تم دونوں اس تجربے پر متفق ہیں؟ کنول نے پوچھا۔
"بلا شبہ۔"
"لیکن اس جھوٹ موٹ کے عشق کے مظاہرے پر!"
میگی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ بولی۔ "بہت مزا آئے گا۔
جب ڈیوڈ کے سامنے.... وہ بے تحاشا مجھ سے
محبت کرتا ہے۔ برداشت نہیں کر سکے گا۔
"مگر انگرڈ؟"
"وہ بہت پی گیا تھا رات کو۔ آپے میں نہ تھا۔ ایسے
موقعوں پر سبھی مرد ایسا کر سکتے ہیں۔"
"تو آؤ ـــ اس جھوٹ موٹ عشق کی ریہرسل کریں۔
کنول نے ایک انگلی اس کی لمبی گردن کے خم پر پھیری
پھر اس انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو اونچا کیا۔
میگی نے منہ پھیر لیا۔ اور گردن جھٹک دی۔ گردن جھٹکنے
سے سر کے بال ایک رخسار سے شانے تک کو ڈھکتے
چلے گئے۔ کنول نے اس کے بالوں کو رخسار سے
ہٹا کر کہا۔
"مگر یہ سب جھوٹ ہوگا۔"
پھر اس نے میگی کے ہونٹوں کو چوما ـــ
اور یہ بوسہ بھی جھوٹ تھا۔
میگی کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ کنول نے اسے
اپنی باہوں میں لے لیا۔
اور یہ باہوں کا عمل بھی جھوٹ ہے۔
جالی دار برائیں سے اس کی چھاتیوں کے کنول جھلک
رہے تھے۔ کنول نے بچے کی طرح میگی کو اپنے سینے سے
لگا لیا۔
اور بولا۔ "یوں لپٹ کر رہنا بھی جھوٹ ہے۔"
میگی اس کی باہوں سے نکل گئی۔ بولی۔ "یوں جھوٹ
بولتے ہوئے کہیں سچ نہ ہو جائے۔ تم بہت خطرناک
آدمی ہو۔ لاؤ وہ بلاؤز مجھے دو۔ شاید سوکھ گیا ہوگا۔
سوکھا تو نہ تھا۔ مگر ہاں ایسا ہو گیا تھا کہ پہنا جا سکتا
تھا۔ برا کے اوپر میگی نے وہ بلاؤز پہن لیا۔ سوئٹر ہاتھ
میں لے لیا۔ کیونکہ ابھی گیلا تھا۔ بولی۔ "چلو باہر برآمدے
میں چلیں۔ بنگلے کا مالک اگر آ جائے گا تو کیا کہے
گا۔"
"اور وہ جھوٹ موٹ کی محبت؟"
"دیکھو شریر مت بنو۔" میگی بولی۔ "ڈیوڈ کیا یہاں موجود
ہے؟ آج رات کو ڈانس پر تماشہ کریں گے ـــ
ایں ـــ؟"
"اچھا ـ"
وہ دونوں جب باہر برآمدے میں آ گئے۔ تو بارش
تھم چکی تھی اور دھوپ نکلنے لگی تھی۔ گھوڑوں کی باگیں
کھول کر وہ دونوں سوار ہو گئے۔ کنول نے میگی کا سوئٹر
اپنی گردن سے باندھ کر پیٹھ پیچھے لٹکا لیا۔ مالی سے کہنے
لگا۔ "کنول صاحب آئیں تو کہنا بٹ صاحب آئے
تھے۔ سلام کہہ دینا ـــ
کنول نے مالی کو دو روپے دیئے۔ مالی خوش ہو گیا۔
میگی نے پوچھا۔ "یہ بٹ صاحب کون ہیں۔"
"میں نہیں جانتا ـــ کنول بولا۔ "مگر ممکن ہے کوئی صاحب
کے کوئی دوست بٹ صاحب ہوں۔ اور اگر نہ بھی

ہوئے تو یاد کرنے کی کوشش تو کریں گے کون بٹ صاحب آئے تھے۔

وہ دونوں جب کھلن مرگ پہنچے۔ تو دھوپ چھاؤں سا موسم تھا۔ گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے میگی کا بلاؤز بالکل سوکھ گیا تھا۔ اور سوئیٹر بھی۔ اس نے سوئٹر پھر سے پہن لیا۔ پھر اُن دونوں نے دو سلیج (SLEDGE) لے لئے۔ اور دیر تک پھیلتے رہے۔ ایک دفعہ دونوں کے سلیج ٹکرا گئے۔ اور وہ دونوں سلیج سے باہر نکل کر برف پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ پھر دونوں بڑے مہذب طریقے سے ایک دوسرے سے معافی مانگ کر الگ ہوئے کیونکہ کھلن مرگ پر آج کافی بھیڑ تھی۔

کوئی ساڑھے بارہ ایک بجے کے قریب میگی کو سخت بھوک لگ آئی۔ بولی "سخت غلطی کی۔ سنڈویچ تک ساتھ لے کے نہیں آئی۔ خیال تھا۔ جلد لوٹ جاؤں گی۔ اور لنچ کے وقت واپس ہوٹل میں پہنچ جاؤں گی اور اب بھوک سے برا حال ہے۔

"دیکھو — کچھ بندوبست کرتے ہیں" کنول بولا۔ "آج تمہیں ہندوستانی کھانا کھلاتے ہیں — کبھی کھایا ہے؟"

"نہیں"

ذرا نیچے ایک پنجابی کا ڈھابہ تھا۔ اس سے کنول نے گوبھی، مولی اور آلو کے پراٹھے تیار کرنے کو کہا۔ گرم گرم مسالے دار پراٹھے جب بالائی والے دہی کے ساتھ میگی نے کھائے تو زبان چٹخاتی رہ گئی۔ ارے یہ تو بہت لذیذ کھانا ہے — بے اختیار کہہ اٹھی "میں نے اور ڈیوڈ نے کریٹ جزیرے میں اس طرح کا ترکی کھانا کھایا تھا۔ پھر ایک دفعہ یونان میں — مگر اس کا مزہ ... اور ہے۔

"اور اس دہی کی بالائی کا؟" کنول نے پوچھا۔

"تمہارے ہونٹوں کا سا مزا تھا اس میں۔" میگی نے شریر لہجے میں کنول کے کان میں کہا" تو ایک دفعہ پھر اس لذت کو حاصل کرنے کی کوشش کریں" کنول نے تجویز پیش کی۔

"شٹ اپ!" میگی تیکھی نگاہوں سے اُسے دیکھ کر کہنے لگی۔ پھر اپنی انگلی کی ایک پور جس پر بالائی لگی تھی اپنے منہ میں لے کر اسے چوستے ہوئے بولی۔

"بے چارہ ڈیوڈ!"

"کیا تمہیں ڈیوڈ پر رحم آ رہا ہے۔"

"مجھے سبھی مردوں پر رحم آتا ہے۔ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔" میگی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

سہ پہر میں جب وہ دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے ہل ٹاپ ہوٹل کے پورچ میں پہنچے۔ تو کنول نے اپنے گھوڑے سے اتر کر میگی کا گھوڑا تھاما۔ اور میگی اس کے شانے کا سہارا لے کر نیچے اتر آئی۔

بار کی بوریں دیوار کے اُدھر ڈیوڈ بڑی بے چینی سے میگی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر میگی نے اس سے آنکھ نہیں ملائی۔ وہ دونوں، کنول اور میگی شانے سے شانہ ملائے بار میں داخل ہوئے۔

جولی ایک کونے میں سوئیٹر بن رہی تھی۔

"ہلو" میگی نے لاپروائی سے ڈیوڈ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دن کیسے گزرا؟" ڈیوڈ نے زیر لب گالی دی میگی ...

[illegible] ہمارے یہاں۔ ڈارکسٹن کنول سے ہندوستان اور نیگرو کلچر کی چند مشترک خصوصیات پر بحث کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں دلچسپی ہو تو تم بھی شامل ہو سکتے ہو۔

"جہنم میں جائیں دونوں کلچر۔" ڈیوڈ بڑبڑایا۔

میگی نے بڑی شائستگی سے کہا: "کنول معلوم ہوتا ہے میرے منگیتر کو ہمارے کلچر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے آؤ کہیں اور بیٹھ کر بات کریں۔"

پھر نیم دائرے میں پھیلے ہوئے بار کے کنارے کنارے اونچے اونچے سٹول دیکھ کر بولی: "آؤ۔ وہاں بیٹھ کر بحث شروع کریں۔"

ہم دونوں نے بار کے دو اونچے سٹول لے لئے اور ان کو ایک دوسرے کے قریب سرکا کر بیٹھ گئے۔

جولی کنکھیوں سے کبھی ہمیں اور کبھی ڈیوڈ کو دیکھ رہی تھی۔ اور ڈیوڈ کو دیکھ کر زیر لب مسکراتی تھی۔

"کیا پیو گے؟" میگی نے پوچھا۔

"تم کیا پیو گی؟" میں نے میگی سے پوچھا

"مارٹینی لوں گی۔"

میں نے بارمین سے دو مارٹینی کے لئے کہا۔

مارٹینی سپ کرتے ہوئے میگی بولی: "ہندوستان کی زندگی کے کئی رسم و رواج ہم افریقی نیگرو لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ان دونوں خطوں کی تہذیب ایک تھی۔ اگر ایک نہیں بھی تھی تو دونوں تہذیبوں میں لین دین ضرور ہوتا ہوگا کچھ ہمارے رسم و رواج یہاں سے وہاں گئے کچھ وہاں سے یہاں آئے۔ مثال کے طور پر موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی کھدائیوں سے جو ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں وہ صرف دراوڑ لوگوں کی ہڈیاں نہیں ہیں۔ نیگرو لوگوں کی ہڈیاں بھی نکلی ہیں۔

تو دراوڑ کون سے خالص النسل تھے۔ میگی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ ان کے جسم کی ساخت میں کئی خصوصیات نیگرو نسل کی پائی جاتی تھیں۔

کنول بولا۔ زمانہ قدیم میں افریقہ اور ہندوستان اور آسٹریلیا تک حبشی تہذیب اور حبشی نسل پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ پہلے سے یہاں آباد تھے۔ اس زمانے میں کہتے ہیں آسٹریلیا ایک جزیرہ نہ تھا ایشیا سے جڑا ہوا تھا۔

"ہاں": میگی کنول کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ آج بھی آسٹریلیا کے اصلی باشندوں اور تامل ناڈ کے رہنے والوں کی زبانوں میں کئی مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور یہ نسلی قومی تہذیبی اور لسانی اشتراک کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ایسا ہو۔

"ہندوستان میں کبھی کوئی خالص نسل نہیں رہی۔" کنول بولا۔

میگی نے مارٹینی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ مگر میری مارٹینی کا عجیب سا ذائقہ ہے۔ اسے ذرا چکھ کر تو دیکھو۔

میگی نے اپنا گلاس کنول کے منہ کی طرف بڑھایا۔ ڈیوڈ گھور کر دیکھ رہا تھا۔ کنول نے میگی کا گلاس اپنے منہ سے لگا لیا۔ ایک گھونٹ لے کر اور اسے

بیکر حیدرآباد دکن

اپنی زبان آہستہ سے چکھتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں بولا: "مجھے تو مزہ ٹھیک لگتا ہے۔ بالکل ٹھیک"
میگی اپنا گلاس واپس اپنے منہ کے قریب لائی۔ اور دوسرا سپ خود لیتے ہوئے بولی: "ہاں تو ٹھیک ہی ہوگا۔"

یکایک کھٹکا سا ہوا۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ ڈیوڈ ٹائم کا رسالہ بغل میں دبائے تیز تیز قدموں سے بار سے باہر نکل گیا۔

جولی اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہاں تو بحث کس مرحلے پر پہنچی ہے" کنول نے پوچھا۔
"بڑے نازک مرحلے پر۔" میگی دھیرے سے ہنس پڑی۔

رات، ہل ٹاپ کا ڈانس فلور۔ آج ہوٹل کے منتظمین نے ڈائیننگ ہال کو بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ اور خاصا اہتمام کیا تھا۔ کیونکہ آج ہوٹل کی چوتھی سالگرہ تھی۔ آج سے چار سال پہلے یہ ہوٹل گلمرگ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ آج سیاحوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اور لگتا تھا کہ منتظمین نے بہت سے لوگ سری نگر سے بھی خاص اس موقع کے لئے مدعو کئے ہیں۔ ڈیوڈ اپنے کھانے کی میز پر بیٹھا تھا۔ پہلا ڈانس یقیناً میگی نے اُسے دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد دو بار وہ برابر کنول کے ساتھ ناچی تھی۔ اور اب تیسری بار ناچنے جا رہی تھی۔

جولی بڑے اطمینان سے اپنی میز پر بیٹھی تھی۔ اگرچہ وہ بھی کسی یورپین سیاح کی باہوں میں تھی۔ میگی اور کنول ایک دوسرے کی باہوں میں جھول رہے تھے۔ میگی کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ جیسے نیلے آسمان سے تیسرے پہر کا اندھیرا دور ہوتا جا رہا ہو۔ اس سحر آمیز روشنی میں جولی نے کنول کے لئے ایک عجیب جذبہ دیکھا۔ میگی جیسے کنول کی باہوں میں گھل گئی تھی۔ وہ ایک لے کی طرح پگھلتی تھی اور ایک دھن کی طرح شروع ہو کر آخر تک مکمل تھی۔

لہر ذرا تیز ہوئی۔ جیسے سمندر بیدار ہونا شروع ہو۔ اب میگی کی دونوں باہیں کنول کی گردن میں تھیں۔ اور وہ اپنی اونچی ایڑی سے جوبلی ڈانس فلور پر اس ذرا تیز گت پر دھمک جاتی تھی۔ ٹھیک سم پر۔ اور دونوں باہیں کنول کی گردن میں ڈالے ہوئے اس کی آنکھوں میں آتشیں چمک۔ اور اس کے بدن میں جیسے لاوا پھوٹ نکلا تھا۔ آخر تھی وہ ایک گرم دیس کی رہنے والی، اس کے لہو میں جنگل بول رہا تھا۔ اور وہ ناچتے ناچتے اپنا سینہ کنول کے سینے سے لگائے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈالے ناچ رہی تھی۔ اور کنول کے ہاتھ نے اس کی پتلی کمر کا پورا احاطہ کر لیا تھا۔ اس طرح کہ وہ دونوں ایک جسم و جاں معلوم ہوتے تھے۔ جولی نے اس وقت یہ تو نہیں دیکھا۔ کہ ڈیوڈ کا ردِّ عمل کیا ہے۔ ہاں رشک و حسد سے وہ خود جل اٹھی تھی۔ اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے گرم پگھلتے ہوئے سیال لہو میں دیا سلائی دکھا دی۔ اور جب میگی نے اپنی دونوں باہیں کنول کی گردن میں ڈال دیں اور اس کے بدن کی لے پر ڈولنے لگی۔ تو وہ برداشت نہ

گر سکی چند منٹ تو اپنی کرسی پر بیٹھی کسمساتی رہی۔ پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی اور ڈانس فلور پر پہنچی جہاں میگی اور کنول کے پاس اور بے ڈھنگا ڈانس کرتے ہوئے جوڑوں کا خیال نہ کرتے ہوئے تہذیب اور سلیقے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے زور سے میگی کے دونوں ہاتھ جھٹک دیئے۔ اور کنول کو بانہوں سے کھینچ کر ڈانس فلور سے تو کیا ڈائننگ ہال سے باہر لے گئی۔ میگی حیران اور ششدر کھڑی رہ گئی۔ مگر اس نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا مگر کنول کو کھینچ کر لے جاتی، جولی پر اس وقت سینکڑوں نگاہیں جمی تھیں۔ میگی نے نیم بیزاری کے عالم میں اپنے کندھے اچکائے۔ دونوں ہاتھ ایسے جھٹک دیئے جیسے معاملہ ہمیشہ کے لئے صاف کر دیا ہو اور پھر بڑے اطمینان سے ڈیوڈ کے قریب آ کے بیٹھ گئی۔

جولی کنول کو کھینچ کر اپنے سوئٹ میں لے گئی۔ اس نے دھکا دے کر کنول کو بیڈ پر گرا دیا۔

کنول نے ہنس کر کہا: "مگر ڈارلنگ تم ہی نے تو..."

"مگر میں نے اس قدر قریب اس قدر چپکا ہو کر ناچنے کو تو نہیں کہا تھا۔" جولی آتش بار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ تو سب جھوٹ تھا۔" کنول نے احتجاج کیا۔

کچھ جھوٹ نہیں تھا۔ میں نے میگی کی نگاہوں میں ایک خطرناک جذبے کو ابھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ جذبہ جھوٹ نہیں تھا۔ سچ تھا۔ سچ سے بھی زیادہ، خطرناک تھا۔ وہ لاوا بھاپ آگ اور شعلے کی طرح خطرناک تھا۔

"تم نے اپنی حماقت سے سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

جولی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ بیڈ پر کنول کے پاس گر گئی اور سسکی لے کر بولی: "کنول مجھے اپنے گھر لے چلو۔ دلی میں ہندوستان کی سیر نہیں کرنا چاہتی۔ میں تمہارے گھر میں ایک ہندوستانی عورت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں بس مجھے کل ہی یہاں سے لے چلو۔ کل ہی میرے لئے ایک ساڑھی لا دو۔ ٹخنوں سے نیچی..." ■■

شہر سے چلیں

دیوانو! آؤ جانبِ صحرا چلیں کہ آج
یہ شہر چاہتا ہے دل و روح سے خراج
زلفِ حیات کتنی پریشاں ہے شہر میں
انساں ہے اور کشاکشِ انساں ہے شہر میں
سینوں کی آگ نذرِ چراغاں ہے شہر میں
تاریکیوں کے فرق پہ رہے روشنی کا تاج

صحرا، جہاں سکوت کو طرزِ ادا ملے
ہم گفتگو کریں تو فضا ہم نوا ملے
کانٹوں میں اور نکھرے گی بیداریٔ جنوں
سرشار ہو کے نبضوں میں مچلے گا اور خوں
صحرا کی خامشی میں ملے گا مجھے سکوں
صحرا کی خامشی ہے مرے درد کا علاج

کٹ جائے شب رُو پہلے نظاروں کی چھاؤں میں
چھیڑیں ربابِ فکر ستاروں کی چھاؤں میں
وحشیوں کو خودنگری کا سرور دیں
ماحول کو گدازِ دلِ ناصبور دیں
صبح آئے تو اسے تپشِ جاں کا نور دیں
اہلِ ریا کی بزم میں رکھ لیں جنوں کی لاج

رکھ لیں جنوں کی لاج کہ دنیا میں جی سکیں
اتنا تو ہو کہ ہنستے ہوئے زہر پی سکیں

پیکر حیدرآبادی

رحمت الاکرام
رام باغ مرزا پور (یو۔پی)

کس کو خبر

دانشورو! یہ لالہ و نسریں کا کارواں
رکھتا ہے پور پور میں اک دردِ جاوداں
اک شعلۂ نہاں سے ہے شبنم کا دل تپاں
دانش ورو! صبا بھی یہاں ہے شرر فشاں

کس کو خبر، حیات کا سرمایہ وار کر
آفاق کی جبیں پہ ستارے ابھار کر
کس کی نگاہ لمحوں کا محمل سنوار کر
کہتی رہی زمانے سے لیلیٰ کی داستاں

آفات کے حصار میں روحِ طرب ملی
شبنم کی بوند بوند مجھے تشنہ لب ملی
راحت وفا کو بسترِ گل پر بھی کب ملی؟
خوابوں نے عمر کاٹی ہے شعلوں کے درمیاں

میں ہر نگہِ بلا کی گرہ کھولتا رہا
جامِ سخن میں دل کا لہو گھولتا رہا

وہ عہد ہے کہ حسن و زر مانگتے ہیں لوگ
میرے وطن میں آج بھی گھر مانگتے ہیں لوگ

بھٹکے کون سی ہے کہ آ گئی کہاں
اب تک یہاں دعا میں اثر مانگتے ہیں لوگ

سایوں کی اپنے فکر نہیں ہے جو کھو گئے
قامت سے بے نیاز ہیں، سر مانگتے ہیں لوگ

کاغذ کی مستطیل میں کھوجیں گے زندگی
شیشے کے دائروں سے نظر مانگتے ہیں لوگ

رہزن جہاں ہو، مژدہ سنا دیجیے اسے
رہبر کدھر ہے؟ اذنِ سفر مانگتے ہیں لوگ

اس دورِ ارتقا میں انھیں چاہیے سکوں
تاریکیوں سے نورِ سحر مانگتے ہیں لوگ

اس اور خود کہیں ہے سوالی بنا کھڑا
اس اور در نہیں ہے جدھر مانگتے ہیں لوگ

ظاہر ہے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا اس طرح
گملے سے بو، شگوفے سے پر مانگتے ہیں لوگ

اس کو سلام، اس کو دعا، اس کی خیریت
کیوں بد دعائیں آ کے پھر مانگتے ہیں لوگ

برسے تھے اشک وہ ہم پہ جو بادلوں کی طرح
وہ لوگ آج بکھرتے ہیں پانی کے موتیوں کی طرح

تری تلاش میں یہ کون سا مقام آیا
بکھر گیا ہوں خلاؤں میں رستوں کی طرح

کہاں کے درد کا درماں ہو گئے آخر تم
کہ ہم تو سر سے قدم تک ہیں آبلوں کی طرح

ہوس کی آگ لگی ہے بدن کے جنگل میں
لہو کے قطرے بھی چبھتے ہیں سوئیوں کی طرح

دعا یہی ہے کہ دشمن ہزار مل جائیں
کسی کے دوست نہ ہوں میرے دوستوں کی طرح

اندھیری رات کے دل کا غبار ڈھل جائے
ٹپک پڑیں یہ ستارے جو آنسوؤں کی طرح

اگی ہے دوب یہاں بھی ترے بدن جیسی
کھلے ہیں پھول یہاں بھی ترے لبوں کی طرح

پہاڑی راستہ نکلا ہے خودکشی کرنے
کھڑے ہیں دونوں طرف پیڑ مجرموں کی طرح

ادھر ہے آگ کا دریا، ادھر ہے ریگِ رواں
ہماری ذات ہے سوکھے سمندروں کی طرح

غزلیں

مظفر حنفی
میواتی پورہ۔ بھوپالی گیٹ سیہور (بھوپال)

عالمی صحافت

بنگالیوں کے عدم تحفظ کے احساسات کو ختم کرنا ضروری - (نامہ نگار [illegible])

مشرقی بنگال کے حالیہ واقعات، وہاں کا ظلم و ستم اور فوجی کاروائیاں تاریخ انسانیت کا سب سے المناک باب ہیں۔ صدر یحییٰ خاں نے جو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی ہیں، انسانوں پر کئے جانے والے تمام مظالم کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ جہاں ان کی سفاکی اور بربریت چنگیز، ہلاکو، نادر شاہ اور ہٹلر کے ناموں کو بھلا سکتی ہے وہیں ان کی تضاد بیانیاں، جھوٹ اور پروپیگنڈہ جرمنی کے گوئبلز کو فراموش کر دینے کے لئے کافی ہے

جنرل یحییٰ خاں اسلام اور سالمیت کا ذکر بڑے زور و شور سے کر رہے ہیں، جو بجائے خود مضحکہ خیز ہے اسلامی اصولوں کا جہاں تک تعلق ہے اُن کی آمریت خود اسلام کے منافی ہے۔ اسلام جغرافیائی حد بندیوں اور نسلی تفریق کے خلاف عالم انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دینے کا پیام دیتا ہے اور رائے عامہ کو اہمیت دیتا ہے جو آج کے جمہوری نظام کے عین مطابق ہے اور کہتا ہے "اے لوگو!! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے، ہاں متقی لوگ بزرگ اور محترم ہوں گے جن کے اعمال نیک ہوں۔ اور اے لوگو! تم پر خدا اور اس کے رسول اور اس شخص کے احکامات کی پابندی لازمی ہے جسے تم نے اپنے میں سے بڑا بنایا ہو" ان صریح احکامات کے بعد آخر یحییٰ خاں کس اسلامی سالمیت کی بات کر رہے ہیں اور انہیں حکمرانی کا حق کس طرح حاصل ہو گیا ہے؟

اخلاقی، سیاسی اور مذہبی ہر اعتبار سے جنرل یحییٰ خاں کا یہ اقدام صرف اور صرف ظلم و ستم کی ہی تعریف میں آ سکتا ہے۔ اسلام نے صرف احکام الٰہی کی عمل آوری یا مظلوموں کی حمایت اور اصولوں کے لئے ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی ہے مگر یہ شرط بھی ہے کہ بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور ان لوگوں کو پناہ دی جائے جنہوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں یا عبادت گاہوں میں جا چھپے ہوں یا اپنے گھروں کے دروازے بند کر لئے ہوں۔ بالخصوص عمری

۲۲ پیکر حیدرآباد

پاکستان نے اپنی وحشیانہ کارروائی کو ہندوستانی مداخلت قرار دیا (بحوالہ ٹائمز آف انڈیا)

ہتھیاروں کے ساتھ نہتے عوام پر ٹوٹ پڑنے کے
بعد اسلام اور سالمیت کی دہائی دینا محض دنیا
کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔

مگر یہ پروپیگنڈہ اور یہ دہائیاں ناکام ہو گئی ہیں
اب ضمیر عالم چونک پڑا ہے اور عالمی رائے عامہ ملکی،
تجارتی اور معاشی مفادات کے باوجود ان مظالم
کو کام میں لایا گیا ہے اس کے پیش نظر صدر محمد
یحیٰی خاں کی ظلم و تشدد کی حامل حکومت کو فاضل
ہتھیار فراہم کرنا ظلم ہوگا۔ اداریے میں لکھا ہے
"صدر یحیٰی خاں کی ان پابندیوں کے باوجود جو انھوں
نے مشرقی پاکستان کے خونیں واقعات کی اشاعت
پر لگائے ہیں آج بھی مشرقی پاکستان میں عوام کے
قتل عام کے روح فرسا حالات شائع ہو رہے

اور بنگلہ دیش

کی مذمت کر رہی ہے۔ اخبارات رائے عامہ کے اظہار
کا ذریعہ ہوتے ہیں انہیں کی روشنی میں یحیٰی خاں کی
پرفریب اور مکروہ تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ امریکہ
سے شائع ہونے والا اخبار "سینٹ لوئی پوسٹ
ڈسپیچ" اپنی ۲۵ جون ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں اپنے
اداریے "پاکستان میں وحشیانہ ظلم و ستم کی اعانت"
میں لکھتا ہے۔

"مغربی پاکستان کی فوج نے مشرقی پاکستان میں جو
قتل عام کیا ہے اور اس کام کے لئے امریکی ہتھیاروں
ہیں چنانچہ خیال ہے کہ مشرقی پاکستان سے ہندوستان
آنے والوں کی تعداد ۵۰ تا ۶۰ لاکھ ہے جس کے
باعث ہندوستان کے لئے پناہ گزینوں کا مسئلہ
ایک زبردست مسئلہ بن گیا ہے۔

یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ امریکہ اس قتل و غارت
گری کے سلسلہ میں معاونت کرے گا ۲۵ مارچ
کے بعد جو ہتھیار کراچی پہنچ چکے ہیں انہیں واپس
نہیں لایا جا سکتا البتہ جو جہاز ابھی سمندر میں موجود
ہیں انہیں واپس لا سکتے ہیں۔ پاکستان کی اقتصادی

مشرقی پاکستان کے واقعات تاریخ انسانیت پر بدنما داغ ہیں — اوتھان

حالت بھی خراب ہو چکی ہے چنانچہ عالمی بنک سے متعلق کنسورشیم کو مزید مالی امداد اس وقت تک کے لئے روک دینی چاہئے جب تک کہ صدر یحییٰ خان مشرقی پاکستان سے اپنے دستے واپس نہیں بلا لیتے اور وہاں حسب وعدہ نمائندہ شہری حکومت قائم نہیں کر دیتے۔"

جاپان کے سب سے زیادہ با اثر اور کثیر الاشاعت روزنامے "اساہی شمبون" نے اپنے یکم جون کے اداریئے میں لکھا ہے کہ مغربی پاکستان کے فوجیوں نے مشرقی پاکستان میں جدو جہد آزادی کو دبانے کے لئے جو فوجی تشدد اور ظلم و ستم کیا اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستانی باشندوں کی کثیر تعداد بھاگ کر ہندوستان پہنچ رہی ہے جن میں زخمی افراد کی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔" اس اخبار نے خوراک اور دواؤں کی فوری فراہمی پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ ہمیں اقوام متحدہ کی مختلف تنظیموں نیز بین الاقوامی ریڈ کراس کے توسط سے بین الاقوامی امداد کی پوری امید ہے لیکن پھر بھی مختلف ملکوں سے ہماری یہی اپیل ہے کہ وہ ان پناہ گزینوں کا کسی پس و پیش کے فوری امداد کریں۔"
بنگلہ دیش میں چھاپہ مار سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے اخبار نے لکھا ہے کہ پاکستان سرکار کے لئے سب سے اہم سوال یہی ہے کہ وہ کس طرح مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اختلافات کی خلیج کو پُر کرے اور کس طرح ملک کی سالمیت بحال رکھے۔ اخبار نے اس حقیقت کو بھی بیان کیا ہے کہ بنگالیوں کی کثیر تعداد کو فوجی اور سرکاری عہدوں پر سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اگر غیر بنگالیوں کی کثیر تعداد مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان روانہ کی جا رہی ہے تاکہ وہ مشرقی پاکستان کا انتظام سنبھال لے تو مستقبل میں مشرقی پاکستان میں نو آبادیاتی نظام کا عمل ترقی کرتا جائے گا۔ ایک اور بات جس پر ہم زور دیتے ہیں یہ ہے کہ پاکستانی حکومت کو ملک کی سالمیت کے مفاد کی خاطر جمہوریت کو اپنانا چاہئے۔"

مشرقی بنگال کے بحران پر انڈونیشیا کے ایک اخبار "جکارتا ٹائمز" نے اپنی حالیہ اشاعت میں "پاکستان اور دنیا" کے عنوان سے موصوف جان کا ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ غیر جانبدار ذرائع سے ملنے والی خبروں اور فوجی حکمرانوں کے رویے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صورت حال وہ نہیں ہے جو پاکستانی حکمران بتاتے ہیں۔ بین الاقوامی ریڈ کراس سوسائٹی اور برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ارکان کو کمزور حیلوں اور بہانوں سے متاثرہ علاقوں میں جانے سے باز رکھنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مسلح افواج

۲۲ حیدرآباد

خونچکاں روزنامچہ بھی گزشتہ سال کی قیامت صغریٰ سے زیادہ بھیانک (ال ٹائمز، بیروت)

کی کارروائیاں نہایت ظالمانہ اور وحشیانہ تھیں اور وہ انہیں ہر طور چھپانا چاہتے تھے اور اس مقصد کی خاطر انہوں نے "سماج دشمن عناصر" اور "غیر ملکی مداخلت کار" جیسے فقرے تراش لئے تھے۔ مضمون میں کہا گیا ہے کہ یہ دنیا کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ پوری صورتِ حال کا جائزہ لیں اور انسانیت کی خاطر اس خونریزی اور غارتگری کو روکنے کے لئے اپنی قوت اور اپنا اثر استعمال کریں لیکن اس امر پر اولین توجہ کی ضرورت ہے کہ مقتدر ممالک آگے بڑھیں اور انسانی زندگیوں کو بچانے کے لئے کوئی فوری اقدام کریں اور سیاسی صورتِ حال کے مسئلہ کے حل کو متعلقہ عوام اور وقت پر چھوڑ دیں۔"

اوٹاوا (کینیڈا) کے اخبار "گلوب اینڈ میل" نے ۳۰ جون کی اشاعت میں مانٹریل میں مقیم اپنے نامہ نگار ولیم جانسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ پاکستان کو جو سامان بھیجا جا رہا تھا اس میں لڑاکا طیاروں کے پارٹس بھی شامل تھے۔ اس سامان کو کل پاکستان کے مال بردار جہاز "پدما" میں بھیجا جانا تھا لیکن بالکل آخری لمحے سامان پر پابندی لگ جانے سے اس کی مال برداری کا کام روک دیا گیا۔ رپورٹ میں بتا دیا گیا ہے کہ پارٹس مہیا کرنے والی فرم کے صدر مسٹر ڈیوڈ ملک ایلن نے ۲۹ جون کو کہا کہ آج ہمیں یہ پتہ چلا کہ یہ سامان جہاز پر لادا نہیں جا سکتا اور پاکستان کی صورتِ حال کے پیشِ نظر تا حکم ثانی ہمارا برآمدی اجازت نامہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔ کینیڈا کی وزارتِ خارجہ کے ایک ترجمان نے کہا کہ پاکستان میں حالیہ گڑبڑ کے پیشِ نظر مارچ کے آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پاکستان کو بھیجے جانے والے فوجی سامان کی برآمد کے لئے کوئی پرمٹ جاری نہ کیا جائے۔ اس رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ مانٹریل میں ۲۹ جون کو امریکی سفارت خانے پر پاکستان کو امریکی اسلحہ کی فروخت کے خلاف مظاہرہ کیا گیا۔

اقوامِ متحدہ کے اخباری نمائندوں کی ایسوسی ایشن کے نمائندوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل اوتھانٹ نے کہا: "ماہِ مارچ کے آخر اور اپریل میں مشرقی پاکستان میں جو واقعات رونما ہوئے ان کے بارے میں پہلے دو دنوں میں میں نے جو کارروائی کی میرا یقین ہے کہ آپ میں سے بہت سے لوگ اس سے بخوبی واقف ہوں گے۔ میں نے حکومتِ پاکستان کو اس علاقے میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بین الاقوامی تنظیموں کی امداد کی پیشکش کی تھی۔ آخرکار حکومتِ پاکستان نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔" انہوں نے کہا: "ابتدائے اپریل سے مجھے جو معلومات دستیاب ہوئیں ان کی روشنی میں میں یہ کہوں گا کہ مشرقی پاکستان کے واقعات تاریخِ انسانی کا ایک انتہائی المناک باب ہیں۔ انہوں نے

یہاں ۔۔۔ ہیں کے تاریخ دانوں کا کام ہے کہ وہ حقائق کو یکجا کریں اور اپنے طور پر تجزیئے مرتب کریں۔ لیکن یہ واقعات انسانی تاریخ کے صفحات پر بدنما داغ بن گئے ہیں"

اوتھان نے کہا: "مشرقی پاکستان کے واقعات کے نتیجے کے طور پر ہندوستان کو اپنے مشرقی حصے میں بے شمار پناہ گزینوں کے جس عظیم مسئلہ سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، تاریخ انسانی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

پیرس کے اخبار "لی مانڈے" نے اپنے پہلے صفحہ پر ورائیلی کا ایک مضمون "بنگالیوں پر بے رحمانہ ظلم و ستم" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ مضمون پر ڈھاکہ ۲ ربون کی تاریخ درج ہے۔

ورائیلی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"اس وقت ڈھاکہ جہاں پہلے کبھی ایشیاء کے بہترین شہروں کی سی رونق اور چہل پہل ہوتی تھی، ایک ایسا سنسان شہر ہے جہاں کی نصف سے زیادہ آبادی دوسری جگہوں پر منتقل ہو گئی ہے۔ گزشتہ مارچ میں بنگلہ دیش کے جھنڈوں کے مقابلہ میں وہاں پر پاکستانی جھنڈوں کی تعداد اب بھی کم ہے۔ جس طرح الجزائر کے مجاہدین کا مقابلہ کرتے ہوئے بموں کا استعمال کیا گیا تھا اسی طرح پچھلے کچھ دنوں میں مشرقی بنگال میں بھی کیا گیا۔ وہاں پر تھیا ر لیکر چلنے کی ممانعت ہے، کھلوں میں اجتماعات پر پابندی ہے اور اس طرح دستاویزات رکھنے کی ممانعت ہے جانے سے دونوں صوبوں کے درمیان منافرت پھیلے گی۔ یونیورسٹیاں شاید اگست ہی میں کھلیں گی۔ بہتر ین پروفیسروں، ریڈروں اور لیکچراروں کو معہ ان کے افراد خاندان ۲۵ راور ۲۶ رمارچ کی درمیانی رات کو ہی ان کی قیام گاہوں پر قتل کر دیا گیا تھا اور طلباء نے مکتی فوج میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔

کرفیو کے وقت سے پہلے ہی ڈھاکہ کی سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں۔ اکا دکا دکان کھلی دکھائی دیتی ہے ورنہ غروب ہونے کے ساتھ ہی تمام بازار بند ہو جاتے ہیں کیونکہ دوکانداروں کو یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ "یحییٰ خان کے قزاق" ان دکانوں کو لوٹ لیں گے۔

خون آلود خانہ جنگی کے باعث ہر جگہ تباہی و بربادی کے آثار دکھائی دیتے ہیں جو گزشتہ سال کی قیامت صغریٰ سے بھی کہیں زیادہ بھیانک ہیں۔ راجا رھاٹی ڈھاکا منتی قصبے کھلنا، ملک کی اہم بندرگاہ چٹاگانگ کے نقصانات تقریباً ناقابل تلافی ہیں۔ راج شاہی ہیمن سنگھ اور سلہٹ کی شہری آبادی جہاں انتہائی خوفناک طریقہ پر انتقامانہ جذبے سے ظلم و ستم توڑا گیا ہے۔ وہاں تک تو ہمارا گزر ہی نہیں ہو سکا۔ سڑکوں کے کنارے کئی کئی کلومیٹر تک کنکریٹ کے بنے ہوئے مکانات جھونپڑیاں اور کھیت وغیرہ جلے پڑے ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔ بس جھلسی ہوئی زمین ہر طرف ہوئی کڑیاں یا ٹوٹے ہوئے برتن ـــ

مقامی حکمران طبقے کے ارکان کی کثیر تعداد ماردی گئی ہے یا ہندوستان پہنچ گئی ہے اور ان کی جگہ فوجی افسروں یا مغربی پاکستان سے لائے گئے افراد نے سنبھال

لیے —

مشرقی بنگال میں ابھی تک صرف چند کارخانے ہی کھل سکے ہیں، کارخانوں کی صرف ایک چوتھائی تعداد ہی ڈیوٹی پر موجود ہوتی ہے اور وہ بھی بہاریوں پر مشتمل ہے ورائیل نے آخر میں لکھا ہے کہ بنگالیوں کے عدم تحفظ کے احساسات کو اب ختم کرنا بے حد ضروری ہے -

مغربی پاکستان کے ایک ممتاز صحافی مسٹر انتھونی مسکرینس اپنے وطن کو چھوڑ کر لندن پہنچ گئے تاکہ مشرقی بنگال میں پاکستانیوں کے مظالم کا پردہ چاک کر سکیں چنانچہ ان کا مضمون "نسل کشی" کے عنوان سے "سنڈے ٹائمز" لندن میں شائع ہوا ہے۔ اخبار نے اپنے ابتدائی جملوں میں لکھا ہے: "مغربی پاکستان کی فوج مارچ کے اواخر سے مشرقی پاکستان میں ہزارہا باشندوں کو منظم طریقے سے قتل کر رہی ہے۔ یحییٰ سرکار نے اواخر مارچ سے خبروں کی اشاعت پر جو پابندی لگائی ہے اس کے پس پردہ یہی لرزہ خیز حقیقت ہے یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان سے لاکھوں رفیوجی بھاگ کر ہندوستان آگئے ہیں۔ پاکستان میں "سنڈے ٹائمز" کے نامہ نگار مسٹر انتھونی مسکرینس نے پہلی بار خاموشی کا پردہ چاک کیا ہے انہوں نے ظالمانہ کارروائیاں دیکھی ہیں اور انہوں نے پاکستان اس لئے چھوڑا ہے کہ دنیا کو حقیقت سے آگاہ کر سکیں —"

مسٹر انتھونی نے بتایا کہ "مغربی پاکستان کی فوجی حکومت نے ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو فوجی کارروائیاں شروع کرنے کے بعد پاکستانی فوج کی توپیں اور گولہ بارود [illegible] کو براہ سیلون، پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے طیاروں کے ذریعہ مشرقی بنگال پہنچایا۔ بعض غیر ملکی نامہ نگاروں کے برعکس جو کہ جنرل یحییٰ خاں کو فوجی حکمرانوں کے ٹولے کا قیدی سمجھتے ہیں مسٹر انتھونی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جنرل یحییٰ خاں نے مشرقی بنگال کی ہیئت بدلنے کی خاطر اتنی بڑی کارروائی سوچے سمجھے منصوبے اور اندازے کے مطابق کی ہے۔ انہوں نے بتایا۔ صوبائی اور نیشنل اسمبلیوں کے منتخب ۱۲ عوامی لیگی ممبروں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مغربی پاکستان کے حکمرانوں سے تعاون کریں انہیں ڈھاکہ میں سب سے الگ تھلگ کر کے برف کی سلوں پر بٹھایا جا رہا ہے پاکستانی افواج کی ظالمانہ کارروائیوں کے نتیجے میں جو خوف و دہشت اور تباہی پھیل چکی ہے اس کے باوجود مشرقی بنگال میں گوریلا طرز جنگ اختیار کرنے والوں کی غیر مربوط اور غیر منظم سرگرمیوں نے متعدد مقامات پر پاکستانی افواج کو بدترین شکست دی ہے" —

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ فوجی حکمرانوں کے خلاف دنیا بھر میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے پاکستان میں نشر و اشاعت کے سرکاری اداروں نے دنیا بھر کے اخبارات کے خلاف مہم شروع کر دی ہے۔ اس طرح مسائل حل نہیں ہوتے۔ یہ بات فوجی حکمرانوں کی سمجھ میں نہ آئے تو تباہی و بربادی ان کا مقدر بن جائے گی۔ ■■

یہاں گنجان سڑکوں کی طوالت سوچ میں گم ہے گھروں کی
لڑکھڑاتی چوکھٹیں بھی ہیں
کس شور کو سنتی ہیں
پُل کے اس طرف کا شہر کیوں بہتا ہوا رشتہ ہے
یہ دیکھیں
وہاں کی جانی پہچانی سبھی قدریں مکمل اجنبیت کا دھواں بنتی ہیں
یا تحلیل ہو کر کینوس پر ٹوٹ پڑتی ہیں
ذرا اس موڑ کی تنہائی سے پوچھیں
تمہارا کرب کس سورج کی گرمی سے پگھل سکتا ہے
کس سیارے کی کتنی مداری گردشوں سے منجمد ہوتا ہے
اور تخلیق کے کس مرحلے کو لانگھ جاتا ہے

ایک نظم، ایک غزل

حسن فرخ ۲۱۳-۶-۳ حمایت نگر حیدرآباد - ۲۹

قائم تمام رشتے رہے دل نہیں رہا
لے دے کے میں ہی بھیڑ میں شامل نہیں رہا

برسوں کا لمس صدیوں کی لذت سہی، یوں تو پاس
تھا ایک پل جو خوابوں کا حاصل نہیں رہا

پہلے رواروی میں تھی بکنے کی چاہ، اب
وقفہ تک اڑتے رنگوں میں حائل نہیں رہا

اک عمر تک خود اپنا پتہ پوچھتے پھرے
لوٹے تو شورِ زیست مقابل نہیں رہا

گھل مل گئے وہ اتنے کہ ربطِ نگاہ کو!
یاں فاصلہ بھی بڑھنے کے قابل نہیں رہا

دیکھا تو کائنات سمٹنے لگی حسنؔ!
سوچا تو خود ہی شاملِ محفل نہیں رہا

بیسویں صدی کا انسان

عقیدہ

شخصیت

احساسِ خودداری

یہ کل تک آدمیت کے لوازم تھے

مگر اس

جگمگاتے، جاگتے دورِ تمدن میں

عقیدہ ــــ آگ

شخصیت ــــ ہیولا

اور احساسِ خودی

خود اپنے شعلے کا جہنم ہے

امیر عارفی شوکت منزل - دودھ پور - علی گڑھ

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

جانے کتنے ماہ و سال

سیڑھیوں کو

پار کرنے کی،

لگن میں کٹ گئے ہیں

پھر بھی

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب تک

پہلی سیڑھی پاؤں کے نیچے نہیں ہے

بیکر حیدرآبادی ۲۹

ملبے

ہوا کے تیز جھکڑ تو چل رہے ہیں
جمی ہے گرد فانوسوں پہ کتنی
چمکتی روشنی دھندلا گئی ہے
اِدھر کچھ شام بھی الساگئی ہے

تمہارے راستے ہیں
کئی برقی کے ننھے قمقمے ہیں
انھیں کے نور سے روشن ہیں سڑکیں
کہاں تک بجھتے شعلوں کا کریں غم
کہاں تک بوڑھے فانوسوں کا ماتم

جو بُت خود گر چکے ہیں
انھیں کیوں پوجتے ہو
پُرانے کھوکھلے ملبے نہ ڈھونڈو
وہاں کچھ بھی نہیں ہے
کھلے کمرے بنے ہیں تنگ قبریں
تنفس رک گیا ہے اور آنکھیں
زمانہ ہوگیا پتھرا گئی ہیں
انھیں خود ان کی عمریں کھا گئی ہیں

۳۰، بیکر حیدر آباد

نقش اور آئینہ ★

گرد آلود فضا میں کب سے
دل کا آئینہ لیے بیٹھا ہوں
کتنے ہی نقش ہیں دھندلائے ہوئے
ریت کے نقش ہوں کہ بادل کے
جیسے پانی پہ لکیروں کا سماں
وہم کی حد میں گماں
پلکیں جھپکاؤ
تو کھو جاتے ہیں
ہاں مگر آئینہ
گرد جھاڑو
تو کوئی نقش اُبھر آتے ہیں
لمحہ بھر ہی کو سہی
ذہن کو ڈس جاتے ہیں

مسعود عابد
نیشنل ہائی اسکول
ظہیر آباد (میدک)

نور شاہ
ہسپتال روڈ۔ درگ جن
سری نگر (کشمیر)

اجالے کی تاریکی

بارش تھم چکی ہے اور بارش کے بے شمار قطرے اپنے ساتھ خون کے اُن دھبوں کو بھی بہا کر لے گئے ہیں جو کچھ دیر پہلے کولتار کی سڑک پر نظر آ رہے تھے۔ بارش برسنے سے پہلے یہاں سڑک کے اسی موڑ پر بس سٹاپ کے ٹھیک سامنے دو جوان جسموں کا خون بہا تھا اور میرے دیکھتے دیکھتے سرخ رنگ کی لکیریں بکھر گئی تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کی کار فراٹے بھرتی ہوئی آئی اور دو جسموں کو کچل کر چلی گئی۔ میں نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے لپٹ کر مرتے ضرور دیکھا۔ جنازہ کب اٹھا مجھے معلوم نہیں۔ پھر میں اُن کی موت کو بھول گیا لیکن اُن کی زندگی کے وہ لمحے نگاہوں کے سامنے ہیں جو کبھی چمکتے تھے۔ میں اس بس سٹاپ پر کھڑا اکثر اپنی بس کا انتظار کیا کرتا ہوں۔ میرے ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی یہاں کھڑے رہتے ہیں۔ لڑکیاں، لڑکے بچے بوڑھے۔ پر وہ دونوں سب کو نظر انداز کر کے میرے پاس چلے آئے۔ گم سم مجھے دیکھتے رہتے اور میں ان کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اُن کی زندگی کے بارے میں، ان کے رشتے کے بارے میں ایک سڑک کا باسی دوسرا کئی منزل اونچی عمارت کا مکین اور اب اس سٹاپ کے سامنے چنار کے درخت کے نیچے، گھاس کے سرسبز میدان کے قریب، سب کے سامنے۔ کوئی ڈر نہ کوئی خطرہ۔ بالغ نابالغ کا۔ نہ مذہب و ملت کا اور نہ ہی غربت اور امارت کا نہیں دیکھ کر کم سے کم نوجوان لڑکے لڑکیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ طور پر قرب حاصل کرنے کی تمنا ضرور جاگتی۔ اُن کے چہرے ویسی ہی تمنا کے غماز ہوتے لیکن انسان بڑا تنگ دل اور کم ظرف ہے۔ زندگی سے پیار کرتے ہوئے بھی اس کی راہ میں پھول کھلنے نہیں دیتا۔

آج بھی وہی بس سٹاپ ہے، بس کا انتظار ہے
لیکن میں اکیلا ہوں وہ سیاہ ملائم بالوں والی دُھلی
دُھلی سی کتیا اور وہ خارش زدہ کتا نہیں ہیں۔ اس
دنیا میں پیار کرنے کا حق سب کو نہیں ملتا.....
تاریخ گواہ ہے؟!

چنار کا درخت خاموش ہے!!

گھاس کا میدان سونا ہے اور اس کے کنارے
جو تختی لگی ہوئی ہے۔ اس کے حروف دُھل چکے
ہیں ــــ میں سڑک کے اسی موڑ کے سامنے بس
سٹاپ کے قریب بس کا انتظار کر رہا ہوں۔ کل
یہاں بہت سے لوگ جمع تھے آج میں اکیلا ہوں۔
کل بارش تھی آج بڑی تیز دھوپ ہے۔ بس ابھی
آکر چلی گئی ہے اور دوسری بس کی آمد آمد ہے۔
سڑک کا موڑ سامنے ہے۔ سنسان اور اجاڑ سا۔
ویران سا ہے۔ خون کی لکیریں تو بارش کل اپنے ساتھ
ہی بہا کر لے گئی ہے۔ آج سڑک کا کولتار
دھوپ میں چمک رہا ہے۔ کوئی مرد ہے نہ کوئی
لڑکی ــ سامنے مکانوں کی کھڑکیاں بند ہیں۔ کوئی
پردہ نہیں ہل رہا ہے۔ کوئی سرسراہٹ نہیں ہوتی
ہے۔ کبھی کبھی انتظار خود ہی نا امید ہو کر سو جاتا ہے
مجھے وہ لمحے پھر یاد آرہے ہیں۔ اُن دو جانوروں
کی ایک دوسرے کے لئے والہانہ الفت دیکھ
کر میں ساری رات سو نہ سکا۔ میرے من میں عجیب
سی خواہش ابھر آئی۔ میرے سارے وجود میں خون
تیزی سے گردش کرنے لگا۔ سرخ خون گرم گرم جو
میں نے سڑک پر پھیلتے ہوئے دیکھا۔ مجھے ساری

وقت اپنا وجود کی اندرونی تپش میں جلتا رہا تو
ہوا جیسے میں بھی کچھ جا رہا ہوں۔ کل رات میں نے
پہلی بار رات کا بھاری پن محسوس کیا۔ پہلی بار روتا
چیختا چلاتا اندھیرا میرے وجود کو ڈسنے لگا۔ جیسے میں
نے پہلی بار اپنے اندر کے وجود کو ظاہری نمائش
کی حدود سے باہر پایا۔ یہ بناوٹی چہرہ، یہ مصنوعی
خدوخال اپنے اصلی رنگ و روپ میں میرے
سامنے آگئے۔ اور میں نے ایک اجنبی سے جسم کو
اپنی آنکھوں کے سامنے پایا۔ برف جیسا سپید تن۔ مجھے
لگا جیسے وہ ایک بھرپور سراپا بن کر میرے قریب آ
رہی ہو۔ لپٹ لپٹ کر ایک ہونے کے لئے جیسے
سرخ اناروں سے جھکی شباب سے لدی بھرپور شاخ
دھرتی پر اپنی خوشبو بکھیرنے کے لئے۔ اس لمحے مجھے
لگا جیسے سارا سکون اپنے آپ ہی مر گیا ہے۔ ختم
ہو گیا ہے۔

میں جب جاگا۔ نہ کوئی سراپا تھا اور نہ ہی سرخ رنگ
کے اناروں سے جھکی ہوئی کوئی شاخ۔ میں تھا اور
میری ازل ازلی کی تنہا زندگی کا ساتھی تھا ــــ
میرا کمرہ ــ ؟!

اور میں نے سوچا ــ!

اُن کی طرح اگر میں بھی ایک کتا ہوتا تو شاید سماج
اور قانون کی پابندیوں سے آزاد ہوتا۔ یہ نقلی خول
یہ مصنوعی چہرہ اسی سماج کی دین تو ہیں۔ سماج اور قانون
کی باریکیاں اور نزاکتوں کا جال تو صرف انسان
کے لئے ہے۔ میرے لئے ہے۔ کتے کے لئے نہیں
اُن کی ایک ہی نظر میں یہ تفریق اور امتیاز مٹ

جاتا ہے۔ سماج اور قانون کا جال ختم ہو جاتا ہے
پسند اور ناپسند کی بات رہ جاتی ہے۔ بھلا کتوں کو پسند
اور ناپسند سے کیا واسطہ۔ بس خواہش ہوئی دل
مچلا اور وہی پسند بن گئی ـــــ کوئی چہرہ کسی کی آنکھیں
کسی کے چلنے کا انداز مجھے بھی تو پسند آسکتا ہے۔ میں
بھی چاہتا ہوں کہ کسی کو اپنا لوں۔ کسی کے سینے پر اپنا
سر رکھ کر دکھ سکھ کی باتیں کروں۔ پر اس مصنوعی چہرے
کا کیا کروں۔ قانون اور سماج کی نزاکتوں سے کب
نکلوں۔ دراصل یہ بھوک، کسی کو اپنانے کی بھوک
کسی جسم کے ساتھ اپنے جسم کو ملنے کی بھوک بڑی
جان لیوا ہوتی ہے۔ یہ بھوک نئی کہانیوں کا عنوان
بنتی ہے۔ رنگوں کا فرق مٹا دیتی ہے۔ نسل کا فرق
ختم کر دیتی ہے اور ہر شئے ایک سی دکھائی دینے لگتی
ہے۔ چاہے کتیا بھورے یا سیاہ بالوں والی ہو اور
کتا خارش زدہ ـــ چاہے جسم کسی الہڑ مست گلابی
جوانی کا ہو یا کسی بھکارن کا کالا بدصورت ـــ یہ
بھوک مشترک ہے آدمی کی بھی اور کتے کی بھی!!
آج گھاس کا میدان پانی پانی ہے اور کنارے پر
ٹنگی لکڑی کی تختی اپنے ہی بوجھ سے جھک چکی ہے۔
بس ابھی نہیں آئی۔ بڑی تیز دھوپ ہے۔ میں اکیلا
ہوں ـــ مگر یہ میلی کچیلی گندی سی لڑکی ـــ ؟
"بابوجی دس پیسے۔"
اور میں سوچ رہا ہوں ـــ "وہ کتیا کتنی خوبصورت
تھی ـــ"
"بابو میرے بچے کے لئے۔"
میں پھر سوچ رہا ہوں ـــ "بلی اور بچے کی اسی

تلاش میں تو ساری عمر گذر گئی۔ اسی تلاش کی آگ
تو سارے شریر میں گردش کر رہی ہے۔ اس کے
ہونٹوں پر دبی سی مسکراہٹ تو ہے لیکن یہ بچہ مجھے
جانا چاہیئے۔ مجھے یہ جسم نہیں چاہیئے۔ یہ کھردرے
بال، یہ میلے میلے ہاتھ اور ان باہوں میں سویا ہوا
یہ بدصورت گنوار بچہ ـــــ بس ابھی نہیں آئی۔
میرے قدم پھر سے گھر کی جانب اٹھ رہے ہیں۔
"بابو دس پیسے"۔
آواز میرا پیچھا کر رہی ہے۔ میں مڑ کر دیکھ رہا ہوں
ہاں وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ ہاتھ پھیلا ہوا
ہے۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ ہے۔ وہ شاید
میرے اندر کی خلش کو پہچان گئی ہے۔ میں بار بار
مڑ کر دیکھ رہا ہوں۔
"بابوجی۔"
میں جھک جھک کر چھوٹے چھوٹے درختوں والے
جھنڈ کو دیکھ رہا ہوں۔ جو سڑک کے دائیں کنارے
نظر آ رہا ہے۔ وہاں کوئی نہیں، خاموشی کا پہرا
ہے۔ بہت وسیع اور عمیق ـــ میں اگر اس جھنڈ
میں گھس کر خارش زدہ کتے کا روپ اپنا لوں۔
اُسے سیاہ بالوں والی کتیا سمجھ کر پیار کر لوں تو قانون
اور سماج کی نزاکتیں مجھے کہاں تلاش کریں گی۔ لیکن
اگر ایسے میں کوئی کار فرانٹے بھرتی ہوئی آئی اور کچل
کر چلی گئی تو۔۔۔۔ تو پھر کیا۔ خون کی لکیریں
پھیل جائیں گی۔ اور ایک بھنگی موٹی سی گالی دے
کر ہم دونوں کی لاشوں کو لے کر چلا جائے گا۔
"بابو ـــ"

پگلی ہے شاید میں نے نام پوچھا تھا کب تھا
اور نام پوچھنے سے ہوگا بھی کیا۔ مالتی رہی ہوگی کملا
ہوگی یا زرینہ ہوگی۔ کچھ نہ کچھ نام تو ہوگا ہی ——
اور پھر ان ناموں میں رکھا گیا ہے۔ نام جوانی کا ہے
شباب کا ہے۔ بھوک کا ہے، پیاس کا ہے۔!!
میں اُس کے قریب آگیا ہوں۔ قریب آکر اس کی
گھٹاؤں کے بیچ زخم کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کی خوشبو بھی
سونگھ رہا ہوں۔ اُف اس کے بالوں سے تو
سڑی ہوئی مچھلی کی سی بو آرہی ہے۔ پر میں اپنی
دیوانگی کو کیا کروں۔ میری دیوانگی شاید اس
حد کو پہونچ چکی ہے جب خوشبو بدبو اور بدبو خوشبو
بن جاتی ہے۔!

"بابوجی منہ دھولوں"

"کیسی عورت ہے یہ —— میرے دل کی باتیں جان
جاتی ہے۔

"اکیلے رہتے ہو بابو"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا ہے اور غسل خانے
میں دھکیل دیا ہے —— وہ اندر غسل خانے میں
ہے۔ پانی کا شور یہاں بھی آرہا ہے۔ کپڑوں میں
سرسراہٹ ہو رہی ہے۔ اس نے اپنے میلے کپڑے
اتار لئے ہوں گے اور وہ اپنے میلے جسم کو قدِ آدم
میں دیکھ رہی ہوگی۔ زندگی میں شاید پہلی بار اپنے جسم
کو اتنے قریب سے دیکھ رہی ہوگی۔ میرا شعور جل
رہا ہے۔ میں راکھ ہو رہا ہوں۔ ابھی ابھی اس
کی ساری گندگی ساری میل دھل جائے گی۔ میں
الماری کی جانب جا رہا ہوں۔ الماری کا دروازہ

میرا ہاتھ جیب کی جانب بڑھ رہا ہے میرے ہاتھ
میں کچھ نوٹ کھیل رہے ہیں۔ اسے تو صرف دس
پیسے چاہئے اور میرے ہاتھ میں نوٹ ہیں ——

"بابوجی"

میرا گھر سامنے ہے۔ میں گھر کا دروازہ کھول رہا
ہوں۔ وہ اور قریب آگئی ہے۔ میں اندر گھس آیا
ہوں وہ ابھی باہر ہی کھڑی ہے۔ میں نے اُسے سر
کے اشارے سے اندر آنے کو کہا ہے۔ وہ پھر بھی
رکی ہے۔ دائیں بائیں دیکھ رہی ہے۔ بچے کو سینے
سے چمٹا رہی ہے۔ پھر میری طرف دیکھ رہی ہے۔
وہ اندر آگئی ہے۔

میں نے دروازہ بند کر لیا ہے اور اُسے کرسی پر
بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا ہے۔ وہ فرش پر بیٹھ گئی
ہے۔ پھر میری طرف دیکھ رہی ہے میں نے ہاتھ
بڑھا کر اس کے کندھے سے بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے
لیا ہے وہ حیران ہو رہی ہے اور بچے کو زور سے
پکڑ رہی ہے —— اُس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے ہیں
میں بچے کو دوسرے کمرے میں لے آیا ہوں۔ وہ رو
رہا ہے۔ میں نے بسکٹ کا پورا ڈبہ اسکے ہاتھ
میں تھما دیا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا ہے۔ شاید زندگی
میں پہلی بار بسکٹ کھا رہا ہے۔ میں دوبارہ کمرے
میں لوٹ آیا ہوں۔ وہ کھڑی ہو گئی ہے۔ اس کی
آنکھوں کو کسی شئے کی تلاش ہے۔

"میرا بچہ کہاں ہے"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

"میرا نام مالتی ہے بابو"

۴۴؍۳ بیگم پیٹھ حیدرآباد

کھول دیا ہے کپڑے ... گرم سے کپڑے ساتھی کو
... یہ سب تو میرے کپڑے ہیں۔
ہاں میری شب خوابی کا لباس اچھا رہے گا۔ میں
ہاتھوں میں کپڑے تمہارے باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹا
رہا ہوں۔

"بابو! اندر نہ آنا۔ میں نہا رہی ہوں۔"

میں نے کپڑے دروازے کے پاس پھینک دیئے ہیں
خود دوسرے کمرے میں آ گیا ہوں۔ میلا کچیلا بچہ سو رہا
ہے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دے رہی ہے
میں کمرے میں لوٹ آیا ہوں۔ وہ میرا شب خوابی کا
لباس پہنے باہر آ گئی ہے۔
میں اس کے قریب آ رہا ہوں۔

"بابو جی"

"کیا ہے۔"

"ارے تم تو لوٹ رہے ہو صاحب"

"کیا کہنا چاہتی ہو" میں اپنے آپ میں ایک کمزوری سی
محسوس کر رہا ہوں۔

"بابو میرا بچہ۔"

"دوسرے کمرے میں ہے جاؤ لے آؤ"

وہ جانے لگی ہے۔

"سنو!"

"کیا ہے بابو"

"کس کا بچہ ہے یہ"

"میرا اور کس کا ہوگا بابو"

"اس کا باپ کون ہے۔"

"میں کیا جانوں — ہوگا تم جیسا ہی کوئی بابو"

میں نے پانچ کا نوٹ اسے تھما دیا ہے۔ وہ لینے
سے ہچکچا رہی ہے۔ میں نے پانچ کا ایک اور نوٹ
جیب سے نکال لیا ہے۔ وہ حیران نظروں
سے دیکھ رہی ہے۔

"بابو"

"کہو"

"بابو تم ایسے ہی یہ روپے دے رہے ہو۔ بالکل ایسے
ہی بابو ... بابو"

اور میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"میں کتا نہیں ہوں ماتی۔"

وہ اب گیٹ سے باہر جا رہی ہے۔ اس نے بچے کو
اپنی باہوں میں زور سے تھام رکھا ہے —

میرے لئے اب نہ کوئی عورت ہے اور نہ کوئی بچہ
صرف ایک بس شاپ ہے۔ بہت سے نئے پرانے
لوگ ہیں اور نیلی گھاس کا میدان ہے جس کے کنارے
پر ایک تختی لٹک رہی ہے۔ کسی صلیب کی مانند اور
تختی پر سفید حروف چمک رہے ہیں "گھاس پر چلنا
منع ہے۔"

■■

وسیم شعلہ
بتوسط ایس۔ سبحان احمد
بی۔ ایس۔ آر۔ ٹی۔ سی (جمشید پور)

جگہ جگہ پہ وہ پھنکارتا ہے ٹھیک نہیں
زہر اس کو ذرا سا دکھا بھی دو لوگو
نہ جانے کتنے ہی جسموں میں زہر اتر جائے
کسی کا کاکل سرکش دبا بھی دو لوگو
ہے جس کا لہر سے کھیلنا بہت عزیز تمہیں
اسی کے سبزۂ خط کو مٹا بھی دو لوگو
جو ڈھانا ہوگا تو ڈھلے گی اگلی نسل ضرور
عمارتوں کی جڑوں کو ہلا بھی دو لوگو
ہے جس کی ریشہ دوانی نے بلبلایا تمہیں
مجھے حریف اسی کا بنا بھی دو لوگو
بتوں کا کعبہ میں رہنا تو اچھی بات نہیں
وسیم بت ہے تو اس کو گرا بھی دو لوگو

غزل

ہر ایک لمحہ مہکتا ہوا گلِ تر تھا
بس ایک دامنِ فکرِ رسا معطر تھا
میں چل پڑا تو ہوا تھا رکا تو پتھر تھا
تمام عمر عجب زندگی کا چکر تھا
مرے عیوب کی جس نے نشاں دہی کی تھی
وہ ایک عدو تھا مگر دوستوں سے بہتر تھا
کسی سے آنکھ ملانے کی تاب ہی نہ رہی
خود اپنے گھر میں نہ ہونے کے میں برابر تھا
جدید تر تھا بظاہر غموں کا مجموعہ
کھلا تو یہ بھی روایات ہی کا دفتر تھا
اب آنکھ کرب کے زہراب سے لبالب ہے
نظر کو دیدۂ بینا کا رس میسر ہے

کاوش بدری
مدراس یونیورسٹی۔ لائبریری، مدراس۔ ۵

غزلیں

کب سے آوارہ ہوں صحراؤں میں ہواؤں کی طرح
مل ہی جائے اماں کاش گھٹاؤں کی طرح
ارتقا کا یہ جنوں ہی اسے لے ڈوبے گا
آدبوچے گا یہ انساں کو بلاؤں کی طرح
آج نکلے ہو کسے ڈھونڈنے منزل منزل
لوگ ہیں مہر بلب اندھی گپھاؤں کی طرح
بجھ ہی جائیں گے یہ یادوں کے سلگتے ایندھن
آکے برسو جو کسی روز گھٹاؤں کی طرح
خود سے ملنا ہے اگر بند دریچے کر لو
آج انساں ہے گنبد کی صداؤں کی طرح
لغزش آدم خاکی ہوں کہ خالق کی خطا
کٹ گئی زیست بہرحال سزاؤں کی طرح

شکیل دسنوی
شاہد بھون، کٹک - ۱

غم نہیں جو مسکراہٹ آہ میں مدفون ہے
زندگی اُمید کا لکھا ہوا مضمون ہے
زد میں تاریکیوں کے جان لیوا فرش پر
جابجا بکھرا ہوا کرنوں کا تازہ خون ہے
کم سے کم تکلیف کا احساس تو ہوتا نہیں
میری تنہائی تمہاری یاد کی ممنون ہے
جو اُڑا دے نامرادی کے مرض کی دھجیاں
آپ کی زنبیل میں ایسا کوئی معجون ہے؟
ظلم کی تعمیک ــ اپنی موت کا نعم البدل!
یہ نرالے دور کا بالکل نیا قانون ہے
کس طرح ساجد بچاؤ گے معانی کو یہاں
ہر طرف پھیلا ہوا الفاظ کا طاعون ہے

ساجد اثر
دیوان بازار
کٹک - ۱

خالد سعید
ٹرونیشنل ہائی اسکول گلبرگہ (میسور اسٹیٹ)

تنہائی میں جب کبھی مرے منہ میں چپکے سے نیم کا رس اتر آتا ہے تو ایک پرچھائیں سی لہرا جاتی ہے۔ پرچھائیں جسے قید نہیں کیا جا سکتا —— مجھے اس بہکتی ہوئی پرچھائیں سے کوئی بیر نہیں۔ ہاں اس بات کا اعتراف ضرور ہے کہ وہ مرا منہ کڑوا کر جاتی ہے۔

مری بند مٹھی میں گذرتے ہوئے وقت کے چند لمحے قید ہیں اور نہیں بھی — کبھی کبھی انگوٹھوں کے پوروں پر چبھن کا احساس ضرور ہوتا ہے اور انگوٹھے چیخ چیخ کر حق مانگتے ہیں کہ ہمیں روندگی عطا کرو — نہیں اب یہ ناممکن ہے۔

حال کی قبر میں مدفون لمحے جاگتے ہیں تو ایک جھک سی اتر جاتی ہے روح میں اور . . . اور پھر ابھر آتے ہیں چاند سے اُجلے لمحے !!

چاند پگھل کر قطرہ قطرہ بہہ رہا تھا۔ گلی میں گونجنے والی ڈھولک کی تھاپ سے لمحے مرتعش ہو رہے تھے جو احساس دلا رہے تھے کہ ہاتھ مشاق ہیں۔ کئی سُروں میں بٹا ہوا گیت جو پہلے تو گلی کے آخری سرے سے ابل رہا تھا ساری گلی پہ چھا گیا، سناٹے میں ڈوبے ہوئے ہمارے آنگن میں اتر آیا اور سنسان کمروں میں بھی۔ دیواروں کو گدگدانے لگا، کواڑوں کو چومنے لگا۔ دیواریں جھوم گئیں کواڑ ہنس پڑے۔ اس گیت میں مری ماں اور دلہنوں کی بڑی آواز بھی شامل تھی

مگر . . . وہ ایک میٹھی تھی سی گا تی۔ جو ہمیشہ دائرہ ہو کر خوبصورتی میں ڈھل جاتی ہے، یہ میرا احساس ہے۔

گیت سوتے آنگن میں مچلتا رہا۔

پھر پچھلے دروازے کے کواڑ ہلے، شاید گیت نے ہلایا ہوگا۔ نہیں —— ہاں وہ گیت ہی تو تھی وہ گیت نہیں جو کچھ دیر سے آنگن میں کھیل رہا تھا بلکہ وہ مہکتا ہوا نغمہ تھا جو ابدی ہے ازل سے مہک رہا ہے وہ دروازہ میں ہچکچائی کھڑی رہی۔ گیت اسے بلا رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی، ٹھٹک گئی، مڑ گئی، رک گئی، پھر پلٹ گئی۔ احتیاطاً اس نے سنسان کمروں کا جائزہ لیا: بچپن سے آج تک وہ کبھی اتنی محتاط نہ ہوئی تھی۔ وہ قریب آ کر ٹھہر گئی۔ اس کے محتاط رویے نے مجھے غیر محتاط کر دیا۔ فضا خاموش تھی، ہوا ساکت تھی۔ لمحات منجمد ہو گئے، منجمد ہو کر پھیل گئے۔ میں پھیل گیا، آگے بڑھا۔ وہ سمٹ گئی، سمٹ کر دیوار سے جا لگی پھر مرے اور دیوار کی حدود میں قید ہو گئی۔ چھت پر سے جھانکتا ہوا نیم کا پیڑ مسکرایا، اس کے فربہ پتے گنگنانے لگے۔ بادل نے بڑھ کر چاند کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ کائنات پر مدھم سی تاریکی پھیل گئی۔ دیوار کا سایہ بڑھ گیا اور اس کے سائے میں ہم سما گئے۔

دیوار سے چپکے میرے ہاتھ پھسل کر اس کے شانوں پر گر پڑے۔ کاندھے پر پھیلی روندگی مری انگلیوں کے پوروں میں گھس گئی۔ اس کے نرم بازوؤں کو تھاما، چکنے پانی کا خیال آیا۔ اسکے گیسوؤں کو چوما،

چہرہ خوشبوؤں میں تحلیل ہو گیا۔ اسکی بھری بھری سلونی آنکھوں کو چوما تو اس کے ہونٹوں کے ارتعاش سے نغمے پھوٹ پڑے دلداریں گنگنا اٹھیں، پُر اثر نغمے۔ فرشتے مسکرا پڑے سانسوں کی مہک سے مری پلکیں جلنے لگیں۔

بدلی سے چاند جھانکا، چاندنی دھیرے دھیرے اترنے لگی نیم کے نوکیلے پتوں پر آ رکی۔ وہاں سے چھت پر اتر آئی پھر آنگن میں کود گئی۔ وہ گھبرا کر سمٹ گئی۔ چاندنی نے اس کی بھیگی آنکھوں کو چوما اور مدہوش ہو گئی چاندنی نے اس کے گیلے لبوں کو چوسا اور مدہوش ہو گئی۔ وہاں سے پھسل کر اس کے سینے پر پہنچ گئی اور پھر عقیدت سے اس کے قدموں پر گر پڑی۔

"یہ گناہ ہے۔" اسکی بھیگی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"ہاں ہے۔"

"تو پھر؟!"

"تم ہی بتاؤ کیا کریں؟"

"——"

"چلو گناہ ہی کریں۔ ازل سے کرتے آ رہے ہیں۔"

میری جلتی ہوئی ہتھیلیوں پر اس کا مقدس چہرہ رکھا ہوا تھا سانسوں کی مہک سے میری پلکیں جلنے لگیں۔ اور

.... اور سامنے والے کمرے کا دروازہ کھڑکھڑایا وہ پھسل گئی، پھسل کر نکل گئی۔ پچھلے دروازہ سے چلی گئی اور عقبی تنگ گلی نے اسے نگل لیا۔

"اسے اکیلا آنگن میں کیا کر رہا ہے؟" میں جواب نہ دے سکا۔ منڈروں کی کھڑکھڑاہٹ مجھے قتل کرتی رہی ——

"کہیں جانا مت کچھ دیر بعد ہم شادی سے لوٹ آئیں گے۔" اس وقت بھیا کا درد بھی کڑوا لگا۔ قدموں کی چاپ کو سناٹے نے نگل لیا۔

میری مٹھی بند تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس میں وہ لمحے قید ہیں مگر نہیں، وہ تو چپکے سے پھسل گئے تھے۔ مٹھی کھولا تو ہتھیلی پر کان کا بلو سنگ کا بُندا چمک رہا تھا۔ چمک نہیں رہا تھا دور رہا تھا، رو نہیں رہا تھا ہانپ رہا تھا۔ ہانپ بھی نہیں رہا تھا ہنس رہا تھا۔ ہنس نہیں رہا تھا چمک رہا تھا۔

وہی آنگن تھا، ویسی ہی مسکرا کر چلنے والی ہوا تھی کواڑوں کو ہلکانے والا گیت فضا میں مچل رہا تھا وہی مدھماتی چاندنی تھی مگر پھر بھی کچھ نہ تھا۔ آنگن مہیب سناٹے میں بدل گیا تھا۔ نیم کے پتوں سے اتر کر آنے والی چاندنی کرلیری لگ رہی تھی۔

وہ چاندنی کی طرح آئی پرچھائیں کر چلی گئی۔

پھر کبھی ویسی چاندنی مری زندگی کے کینواس پر نہ بکھری البتہ پرچھائیں کا رہا لہرائی ہے۔ کیا کسی نے پرچھائیں کو قید کیا ہے؟ —— نہیں۔ بس ایک لمحہ کے لئے لہرا جاتی ہے۔ مجھے اس ہنکتی پرچھائیں سے کوئی بیر نہیں کیونکہ یہ میرا منہ کڑوا کر جاتی ہے۔ اب یہ کڑواہٹ مری زندگی کا اثاثہ ہے۔ ■■

کڑوی پیاس

اوم پرکاش
اسٹیل فرنیچر

علی ظہیر

تین سو سال پرانی حویلی کو دیکھ کر

تین سو سال کا رشتہ بھی کوئی رشتہ ہے
میں کہ لاوقت زمانوں کا مکیں
کچے رشتوں کی کمندوں میں اسیر
کیا ستم ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتا

جب مرا لطفِ سخن چھینا گیا

جب مرا لطفِ سخن چھینا گیا
ٹھنڈے لاوے کی چٹانوں کی طرح
سوچ سینے کے سیہ خانوں میں خاموش ہوئی
زرد سوکھے ہوئے پتّوں کی قطاریں ہر سُو
راستے ڈھکتی گئیں
آج راہوں کے مقدر میں کوئی چاپ نہیں

وقت نغموں کے سُبک دوش پہ

وقت نغموں کے سبک دوش پہ مستانہ خرام
یوں گزرتا ہے کہ
صدیوں کے کھنڈر
اپنے مانوس مکینوں کے بغیر
تلملا اٹھتے ہیں

۹۷۹-۱-۲۲ ڈیوڑھی راؤ رمبھا، حیدرآباد-۲۴

باذل عباسی

۲۲-۸-۴۶۸ پرانی حویلی۔ حیدرآباد

چشم ہنر سے خون ٹپکتا دکھائی دے
نغموں کا شہر درد کا صحرا دکھائی دے

ظاہر میں چل رہا ہے مرا جسم راستہ
درپردہ ایک سایۂ سرکتا دکھائی دے

ابتک ملا نہ جس کی نظر سے کوئی پیام
وہ دور دور رہ کے بھی اپنا دکھائی دے

ہر لمحہ ایک تازہ ہوس کا شکار ہوں
یہ بھی فسونِ چشم تمنا دکھائی دے

اشکوں کا سیل وہ ہو نہ فریاد کر سکوں
آہوں کے راستے میں اندھیرا دکھائی دے

برسوں سے اس طرح ہے کوئی میرے ساتھ ساتھ
سایہ دکھائی دے نہ سراپا دکھائی دے

روٹھے جو بات بات پہ خود اپنے آپ سے
باذل کوئی تو شہر میں ایسا دکھائی دے

۴۴ حیدرآباد

بہت مجھ سے آنے لگی ہے حیا
اسے پیش کی میں نے جب سے کہ قبا

عجب شور و غل ہے مرے کان میں
تعاقب میں ہے جانے کس کی صدا

بکھرنے کو ہیں پھر مرے بال و پر
اڑانے لگی ہے مجھے پھر ہوا

ابھی تک وہی زہر ہے جسم میں
ابھی تک لبوں پر ہے وہ ذائقہ

دریچے میں ہو یا کہ دیوار پر
وہی ایک چہرہ دکھائی دیا

فقط ریت اپنا مقدر بنی
سرابِ ہوس جگمگاتا رہا

اسے کس طرح رائیگاں جانئے
یہی درد سینے میں روشن رہا

عبدالرحیم نشتر

معرفت غنی جنگل اسٹور
انصاری وارڈ۔ بھنڈارا

امجد یوسف زئی
۲۳۲-۷-۲۱ عثمان پورہ حیدرآباد ۲۴

جدید مراٹھی ادب

بھارت میں لسانی بنیادوں پر اسٹیٹس کے قیام کے قیام کے بعد سے علاقائی زبانوں کا ادب تیزی سے ترقی کرتا جا رہا ہے مگر اس عرصہ میں اردو کو اس کے علاقہ سے محروم کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی ترقی متاثر ہو گئی ہے۔ مگر دھیرے دھیرے یہ لسانی تعصب کم ہوتا جا رہا ہے ایک دوسرے کے ادب اور آرٹ کے مطالعہ کے شوق نے اس خلیج کو اور کم کر دیا ہے۔ مگر ہمارا یہ شوق مغرب کے ادب کے مطالعہ اور اس کی نقالی کے مقابلہ میں بہت کم ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک کی یک جہتی اور اتحاد میں تیزی سے ترقی نہیں ہو رہی ہے۔

بھارت کثیر لسانی ملک ہونے کے اعتبار سے سوویت یونین سے مشابہ ہے، مگر وہ سوویت یونین کی طرح MULTI NATIONAL نہیں۔ قومیت کے ایک ہونے کے باوجود ہر اسٹیٹ کے باشندوں کے لباس رہن سہن، طور طریق اور مزاج میں بڑا فرق ہے ہر زبان کے رسم الخط میں فرق ہے۔ ان اختلافات کی پرچھائیاں ان کے آرٹ، ادب میں بھی نظر آتی ہیں۔ بنگال کی موسیقی میں جہاں دریاؤں کی روانی اور ماہی گیروں کا ترنم ملتا ہے وہاں مہاراشٹر کے سنگیت میں کوہستانی علاقوں کا انداز ترنم جھلکتا ہے۔ گوالیار گھرانہ اور کیرانہ سکول کے گائیکی میں بڑا فرق ہے۔ شمالی اور جنوبی ہند کی موسیقی کے فرق کو ہر ایک جانتا ہے۔ آسام کے منی پوری رقص اور آندھرا کے کچی پوڈی اور ملابار کے کتھا کلی میں نمایاں فرق ہے۔ بھانگڑا اور گربہ دو علیحدہ علیحدہ رقص ہیں۔ یہی حال شعر و ادب کا ہے۔ غزل اردو ادب میں جس طرح پروان چڑھی اس طرح وہ دوسری زبان میں نہ چل سکی، مراٹھی زبان کے مشہور شاعر اور فارسی کے پروفیسر مادھو جولین نے اس کی مراٹھی میں ترویج کی کوشش کی اور آج بھی مراٹھی کے جدید شاعر ذوق کر غزلیں لکھ رہے ہیں مگر یہ غزل کم ہوتی ہے اور ہم انہیں نظم ہی کہہ سکتے ہیں ہندی کے گیتوں کا رس اور مٹھاس اردو میں نہیں آ سکا بنگالی اور مراٹھی ادب میں ناول اور ڈراموں نے بڑی ترقی کی مگر اردو میں بہت کم اچھے ناول اور ڈرامے لکھے گئے۔ تلگو اور ہندی میں طویل نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ اردو اور مراٹھی کا مزاج اسے قبول نہیں کرتا۔ گجراتی اور مراٹھی کا مزاج کسی دوسری زبانوں میں نہیں بھارت کی مختلف زبانوں کے ادب کے مطالعہ

معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں طور پر
مغربی اثرات پڑنے لگے تھے۔ چنانچہ سر والٹر اسکاٹ
نے ہندستانی ادیبوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا
اور ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ بنکم چندر چٹرجی نے درگیش
نندنی، مراٹھی کے ادیب بابا پدمن نے یمونا پریٹن،
گجراتی کے نند شنکر تلجا شنکر نے کرن گھیلو اور ہندی کے
پنڈت بالکرشن بھٹ جی نے نوتن برہمچاری انیسویں
صدی کے آخر میں لکھے، اس طرح تامل میں ویدنائیکم
پلے تلنگی میں ویریشلنگم پنتلو اور آر وینکٹ رتنم اور
کنڑی میں وینکٹاچار نے پہلے پہل ناول لکھے۔ اردو
میں نذیر احمد دہلوی نے مراۃ العروس اور توبۃ النصوح
سے اس دور کا آغاز کیا۔ اور ان ناولوں کی شکل اختیار
کرلی۔ نذیر احمد دہلوی کے ناولوں کے بارے میں مولانا
عبدالماجد دریابادی نے جو لکھا ہے۔ وہاں سب
پر صادق آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:"

" ناول کا۔ جو اصطلاحی مفہوم بعد کو متعین ہوا اور
اس کا معیار بعد کو قرار پایا اس کے اعتبار سے چلئے
تو نذیر احمد کے ناولوں کو ناول کہنا ہی مشکل ہے لیکن
اصطلاحی نام جو کچھ بھی رکھئے اس زمانہ میں تھیں اس
قسم کی کتابیں، کچھ نئی نئی سی، نئے خیال والوں کو اپنی
جدتوں سے، ندرتوں سے لبھانے والی، رجھانے
والی، اور پرانے دماغ والوں کو وحشت سے بھڑکانے
والی ہٹانے والی، بھگانے والی، یہ جدید وقدیم کی
آویزش بھی ایک عجب دلگی ہے، شاید روزِ اول
سے ہی چلی آرہی ہے اور رہتی ہے کہ کبھی ادھر بڑھ جاتا
ہے اور کبھی ادھر۔"

یم یم بیکر حیدرآباد

ٹھی کے مشہور مصلح ادیب وشنو شاستری چپلونکر
اور اردو کے سر سید احمد خاں میں ہمیں بڑی مشابہت
دکھائی دیتی ہے، دونوں ایک ہی دور میں پیدا ہوئے
اور دونوں نے اپنے اطراف ادیبوں کا ایک گروہ
جمع کر لیا تھا، سر سید احمد خاں نے ۱۸۷۰ء کے
لگ بھگ تہذیب الاخلاق، شائع کرنا شروع
کیا، اور چپلونکر نے ۱۸۷۴ء میں نبندھ مالا کے
ذریعہ ملک وقوم کی اصلاح شروع کی۔ مولانا حالی
نے جس طرح انیسویں صدی کے آخر میں اردو شاعری
کو پرانی ڈگر سے ہٹا کر نئی راہ پر لایا، اسی طرح مراٹھی
میں کیشو سوت نے مراٹھی شاعری کو نئی راہ دکھائی
اس نے ۱۸۸۲ء سے اپنی شاعری شروع کی۔

ادب میں جدید اور قدیم کی تفریق بھی کچھ عجیب سی
لگتی ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ ادب بھی بدلتا جاتا
ہے۔ لیکن اس نئے جام میں وہی کہنہ شراب رہتی
ہے۔ آج ہمارے لباس کتنے ہی چست کیوں نہ
ہوں اور قدیم لباس کتنے ہی ڈھیلے ڈھالے کیوں
نہ ہوں ہم اپنے جسم کو تو نہیں بدل سکتے، مگر آج کا
رجحان ستر پوشی نہیں جسم کی نمائش ہے۔ مراٹھی میں
جدید ادب کا آغاز ۱۹۵۰ء کے بعد سے ہوتا ہے مگر
جب تک اس کے پہلے کے ادب کا ایک سرسری
جائزہ نہ لیا جائے اس ادب کی تحریکات کا سمجھنا
مشکل ہے اور نہ اس کے رجحانات کا صحیح اندازہ قائم
ہو سکتا ہے۔

مراٹھی میں بیسویں صدی کے پہلے عشرہ کے بعد سے

افسانہ، ناول اور ESSAY کے میدان میں بڑی ہل
چل نظر آتی ہے۔ پروفیسر نارائن سیتارام پھڑکے
نے ۱۹۱۲ء سے لکھنا شروع کیا اور اب تک برابر
لکھ رہے ہیں، انہوں نے اب تک ۶۰ سے زیادہ
ناول لکھے ہیں، سینکڑوں افسانے اور ESSAYS بھی
لکھے ہیں۔ وہ فن برائے فن کے حامی ہیں، جو اپنے زورِ
قلم، اور سحر نگاری سے مہاراشٹر کے نوجوانوں کو پچاس
سال سے گرما رہے ہیں۔ انکا موضوع ہے محبت اور
وہ بھی بیاہ سے قبل۔ ان کی مقبولیت کو کوئی ادیب
نہیں پہنچ سکتا۔ حیدرآباد میں جب وہ ۱۹۵۰ء میں
آئے تھے۔ تب میں نے ان کے فن برائے فن، کے
نظریہ پر چوٹ کی تھی۔ اس وقت وہ پروفیسر شہانے
کے گھر میں مقیم تھے، چہرہ پر غازہ ملتے ہوئے انہوں
نے کہا زندگی میں میک اپ کی بڑی اہمیت ہے۔
اور میں اسی کے ذریعہ خود کو جوان بنا رہا ہوں۔
آچاریہ اترے نے ان کی مقبولیت و آرٹ کے
بارے میں یوں طنز کیا ہے۔ "پھڑکے کے ناول
گویا لومڑی کا جال ہیں۔ ان کا تانا بانا بڑا حسین ہے،
اگر ان کے پڑھنے کے مزہ میں لگ جائیں تو پھر موت
ہی ہے۔ مگر کیا کریں سب اس لومڑی کے جال میں
پھنستے جاتے ہیں"۔ اسی دور کے دوسرے فنکار کھانڈیکر
ہیں، ان کے چالیس سے زیادہ ناول اور بیس سے
زیادہ افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کھانڈیکر
نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کو غریبوں سے
ہمدردی اور مالداروں سے نفرت ہے۔ وہ ذہنی
الجھنوں کی بھی تصویر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے
افسانہ پھول اور پتھر میں اس کا ایک کردار دتو ناتھ
بیان کرتا ہے۔ "دنیا غریبوں کی نہیں امیروں کی
ہے، انسانیت کی نہیں، سچائی کی نہیں۔ دنیا میں
مالدار اور غریب کی جنگ جاری ہے"۔ اس طرح
کرونچ ودھ میں انہیں سوشلزم میں اپنی نجات ان
کے افسانوں اور ناولوں میں نظر آتی ہے۔ انہوں
نے زندگی کے تجربات کو خوبصورت تشبیہات و
استعاروں میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ مراٹھی کے
تیسرے بڑے ناول نگار ماڈکھولکر نے ان کے
بارے میں لکھا ہے۔ "پھڑکے کی نظر بھونرے کی طرح
حسن کی جانب دوڑتی ہے وہ زندگی کا رس چوستا
ہے مگر کھانڈیکر زندگی کی حقیقتوں سے قریب ہے
اس کی نظر ہمدردانہ ہے اور وہ گتھیوں کے سلجھانے
کی فکر میں ہے"۔ دونوں متوسط طبقہ کے ناول نگار
ہیں۔ پھڑکے مراٹھی کے ہارڈی ہیں اور کھانڈیکر کے
افسانوں نے مراٹھی میں موپاساں کی کمی پوری کردی
ہے۔ ماڈکھولکر مراٹھی کے پہلے اور اہم سیاسی ناول
نگار ہیں۔ پھڑکے اور کھانڈیکر نے مراٹھی افسانہ کو
بام عروج پر پہنچایا لیکن وامن چورگھڑے نے اس کو پلاٹ
اور CLIMAX کی پابندی سے ہٹایا اور روزمرہ کی
زندگی کو افسانوں میں بڑے خوبصورت ڈھنگ سے
پیش کیا، اسی طرح مرڈھیکر نے فرائیڈ اور ینگ
سے متاثر ہو کر یولی سس کے ڈھنگ پر ایک
ناول لکھا۔ اردو میں سجاد ظہیر کی لندن کی ایک
رات بھی اسی زمانہ میں لکھی گئی۔
کوسماگرج نے مراٹھی شاعری میں بغاوت کا علم بلند

گیا۔ دوا اور کرتے [illegible] کی نظمیں لکھے۔ آزادی کے حصول کے بعد ترقی پسند ادب اور حقیقت پسندی کی جو تحریکات تھیں ان کی خدمت میں کمی ہو گئی اور ان پر ایک جمود سا طاری ہو گیا اور وہ مختلف تجربوں میں معروف ہو گئے۔ اور کیا نہ تر مغرب کے ادیبوں کی الجھنوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔

نئے ناول نگاروں میں ونت کانیٹکر، وانڈیکر، دیگھے اور پینڈسے کے نام قابل ذکر ہیں۔ ونت کے دو ناول گھر اور پنکھ بہت مشہور ہوئے۔ "گھر" میں بمبئی میں مکانوں کی قلت، اور خاندانی و جنسی زندگی کی الجھنوں کا نقشہ بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ وانڈیکر کا ٹوٹا ہوا گھر حقیقت نگاری کا شاہکار ہے۔ جدید ناول نگاروں میں سب سے زیادہ مشہور پینڈسے ہیں۔ انہوں نے یلغار، ۴۹ء میں لکھی، اس میں لڑائی کے اثرات ساکھر پینڈی جیسے گاؤں تک پہنچنے کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ اس کے دو کردار، رگھوناتھ بینڈرے اور قادر نہایت گہرے دوست تھے جو ابن فساد کی نذر ہو جاتے ہیں۔ حدیار میں رانبے ماسر کی داستان ہے، غریبوں کا باپو، ۱۹۵۱ء میں لکھی گئی۔ پینڈسے نے ہماری زندگی کی جہالت اور غربت کو جس ڈھنگ سے لکھا ہے۔ اس میں اس کا جواب نہیں۔ اس طرح مراٹھی ناول نے شہر سے سفر کر کے دیہات میں قدم رکھا ہے۔ اسی طرح افسانوں میں دیگھے اور ٹھوکر کی کہانیاں دیہاتی زندگی پر لکھی

[illegible]
[illegible]
جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات میں جنگ عظیم کے بھیانک اثرات، بے کاری و بے روزگاری، ۴۲ء کی تحریک، فرقہ وارانہ فسادات، گرانی وغیرہ۔ مراٹھی کے کسی دوسرے افسانہ نگار نے اتنے مختلف موضوع پر افسانے نہیں لکھے۔

گنگادھر گاڈگیل متضاد کردار پیش کرتے ہیں۔ متوسط طبقہ کی ذہنی الجھنیں اور ان کی نفسیاتی تحلیل ان کا خاص موضوع ہیں۔ شری بھاوے ان سے الگ ہیں جس طرح جدید مراٹھی ناول میں پینڈسے کا نام بہت آگے ہے اسی طرح افسانہ میں وینکٹیش ماڈگولکر کا نام سب سے پیش پیش ہے۔ دیہاتی زندگی کو مختلف افسانہ نگاروں نے پیش کیا ہے۔ لیکن ان کی نظر رومانی تھی۔ ماڈگولکر کی نظر بڑی گہری ہے۔ ان کا ہیرو افلاس و مصیبت سے لڑتا ہے۔ اس میں ہارتا ہے، وہ اپنی جدوجہد سے باز نہیں آتا، ان کے افسانوں میں زندگی کا درد جھلکتا ہے اور ان کے آرٹ کا جنم دیہاتی زندگی سے ہوا ہے۔ جدید مراٹھی افسانوں میں البرٹ کامو اور سارتر کی بھی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ESSAYS پہلے بہت مقبول تھے پھڈکے، کھانڈیکر اور کانیٹکر نے بہت اچھے ESSAYS لکھے مگر اب ان کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے۔

قمر اقبال

معرفت ملتی ہوٹل

عثمان پورہ۔ اورنگ آباد

غزل

یاد موسم وہ پرانے آئے
زخم سجنے کے زمانے آئے

دل کی دہلیز پہ یادوں کے سوا
کون آواز لگانے آئے

اب کہاں تاب ہو رونے کی
اب نہ وہ خواب دکھانے آئے

ساتھ خوابوں نے دیا ہے کس کا
کون خوابوں کو چرانے آئے

لوگ جیتے ہیں لہو پی کے یہاں
ہم کہاں پیاس بجھانے آئے

کہہ گئے بات جو کہنا تھی ورنہ
یاد کتنے ہی بہانے آئے

ہر غزل میں ہے چھپا وہ چہرہ
کوئی گھونگھٹ تو اٹھانے آئے

شاخ پھولوں سے جھکی جاتی ہے
کوئی تو ہاتھ بڑھانے آئے

پھر کہیں ہم کو ٹھکانا نہ ملا
غم لگا کر جو ٹھکانے آئے

صبح جب ہو تو قمر مثلِ صبا
پھول رکھنے وہ سرہانے آئے

لہریں

مرا وجود تو اک جھیل ہے اداسی کی
تم اپنی یاد کا پتھر
جو پھینک دیتی ہو
تو پھیلتی ہیں کئی سیم گوں
حسین لہریں ـــــ!!

قطب سرشار

پوسٹ آفس کلواکرتی۔ محبوب نگر

خاموش!
وہ زخمی جانور کی طرح غرّایا
"میں خاموش نہیں رہوں گی؟"
اس نے ہزیمت خوردہ شکاری کی طرح وار کیا
"میں تم کو جان سے ختم کر دوں گا۔"
"تم ایسا نہیں کر سکتے؟"
"کیوں نہیں کر سکتا؟"
"تمہارے ایسا کرنے سے حقیقت چھپ نہیں
سکتی؟"

مرد کی آنکھوں میں آگ
عورت کی آنکھوں میں پانی
آگ اور پانی کی بھاپ
اس بھاپ سے دونوں جھلس رہے تھے۔ دونوں
ایک دوسرے کو کاٹ کھانے والی نظروں سے
رہے تھے۔ حالانکہ چند منٹ پیشتر دونوں
دونوں اپنی خوشی میں تحلیل ہو کر ایک دوسرے کو
بانہوں میں لئے جھوم رہے تھے۔ اور جھومتے جھومتے
دونوں بستر میں آ گئے تھے۔

شبنم قیوم ۱۹۰ بچھوارہ (ڈل گیٹ) سری نگر۔ کشمیر

دیا جلاؤ — روشنی بجھاؤ

میں کچھ سننا نہیں چاہتا؟!"
"غلط! تم سننا چاہتے ہو۔ اس کے وہاں جانے
کی یہی تو ایک شرط تھی۔"
"کس کی شرط تھی — ؟"
"میری —!"
ایک زناٹے دار طمانچہ
— وہ گال سہلانے لگی۔
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
دونوں کے دیکھنے کا انداز جدا جدا تھا۔

ان کا آپس میں میاں بیوی کا رشتہ نہیں تھا فقط
عارضی ملاپ تھا — دونوں ایک دوسرے
کے عارضی پڑوسی تھے۔ ان کی آپس کی ان گناہ آلود
خوشیوں کے لئے جو رول اس کی بیوی نے ادا کیا
وہ......
"تم نے مجھے طمانچہ کیوں مارا؟!"
میں کچھ نہیں جانتا؟"
"اگر تمہاری بیوی کے چہرے پر اس وقت میرا شوہر
اسی طرح اسی بات پر ایسا ہی ایک زوردار طمانچہ

"ارے تو ...... ؟"

وہ چونک سا گیا ــــ اس کے دل پر چوٹ سی لگی ــ

یکایک اس کے سارے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی ــ

اس کی حالت سے ایسا لگتا کہ اگر اس وقت اس کے سامنے اس کی بیوی ہوتی تو وہ فوراً اس کو خوٹ دیتا، حالانکہ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ بھی کسی کی بیوی ہے جو میرے سامنے کھڑی میرے ہاتھوں پیٹی جا رہی ہے۔ ہو نہ ہو میری بیوی بھی اس وقت اس کے شوہر سے ایسا ہی طمانچہ کھا کر اپنے گال سہلا رہی ہو ــــ' یہ شرط کا تقاضہ ہے۔ لیکن میں اس جھانسے میں کیوں آ گیا؟ مجھے یہ کیا ہو گیا ــــ؟ آج یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا کر رہا ہوں۔ اور کیا کچھ سن رہا ہوں۔

اگر میری بیوی کی اس وقت اس کے شوہر کے سامنے ایسی ہی حالت ہو گی جو اس کی بیوی کی میرے سامنے ہے تو مجھے ایک ایک کر کے سبھوں کو خوٹ کر دینا چاہیے اور خود مجھے کسی اونچائی پر جا کر اپنے آپ کو گرا کر خودکشی کر لینی چاہیے اب میرا جینا کسی کام کا نہیں ــــ آج میں لٹ گیا۔ اپنے ہی ہاتھوں برباد ہو گیا۔"

یکایک اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور اس انداز سے اپنے آپ کو بستر پر گرا لیا گویا آج اس کے سامنے سب کچھ گر گیا۔ بلندیاں پستی میں آ گئیں۔

تہذیب، اخلاق اور شرافت دب گئی۔

عزت، نام اور ناموس مٹ گیا۔

اور یہ سب اُسی کے ہاتھوں ہوا جو ......، بیوی کی یاد آتے ہی وہ ایکدم کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھا لیکن دوسرے لمحے رُک گیا۔

وہ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔

اس نے بڑی بے صبری سے ادھر ادھر دیکھا۔

آمنہ دروازہ کے پاس کھڑی یہاں سے چلے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

رمیش نے اسے کاٹ کھانی نظروں سے دیکھا ــ لیکن جلد ہی منہ پھیر کر اپنے آپ سے بولا۔

"ہو سکتا ہے دوسری طرف بھی ایسی ہی آگ لگی ہو، اور اس کا شوہر بھی میری طرح اسی آگ میں جھلس رہا ہو، اور اگر یہ سچ ہے تو ...." تو مجھے اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہیے۔ مجھے .... نہیں نہیں!! یہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ مجھے یہ کیا ہو گیا؟ میں کیوں اس جھانسے میں آ گیا؟ میرے ساتھ کیوں یہ کھیل کھیلا گیا ــــ؟؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟

ــ

"کشمیر میں سردیاں شروع ہوتے ہی جب معمول کے مطابق یہاں کے سرکاری دفاتر جموں کی طرف چھ مہینوں کے لئے کوچ کر گئے، تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا آج زندگی میں پہلی بار دور کسی ویرانے میں مجھے گرفتار کر کے لیا جا رہا ہے۔ نومبر سے اپریل تک کا یہ عرصہ جموں میں گذارنے کا ویسے میرا پہلا موقعہ نہ تھا۔ میں تو متواتر آٹھ سال سے جب

سے مسلسل سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ہر سال
سردیوں میں اپنے سرکاری دفتر کے ساتھ جموں جایا کرتا
تھا۔ ان آٹھ برسوں میں آٹھ بار میں دربار مُو کر کر
رہا تھا۔ اور جموں جانے سے صاف کتراتا تھا جانا کہ
کشمیر کی آنے والی سردیوں کا خیال آتے ہی میں بھی
سے ٹھٹھرنے لگتا۔ کشمیری باشندہ ہوتے ہوئے بھی مجھے
کشمیر کی سردیوں سے ایسا ڈر لگتا ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ اس
ڈر کے مارے نومبر آتے ہی میں دربار مُو کے دن گننے لگتا
کہ کب اور کس گھڑی ہمیں اپنے اپنے دفتر کے ہمراہ
جموں جانے کا آرڈر ملے تاکہ یہاں کی جان لیوا سردیوں
سے نجات ملے، لیکن اس بار میرا جموں جانے کو بالکل
جی نہیں چاہتا تھا۔"

"میں بتادوں گی ایسا کیوں ___؟"

"اس لئے کہ اکتوبر کے مہینے میں میری تمہارے ساتھ
شادی ہوئی تھی اور نومبر کے اختتام پر مجھے تم سے جدا
ہونا تھا۔ جو میرے لئے سوہانِ روح سے کچھ کم نہ تھا۔
تم تو جانتی ہو کہ شادی سے پہلے میں نے تم کو شاید ہی
دیکھا ہوگا لیکن شادی ہونے کے فوراً بعد تم میرے جتنے
قریب آ گئیں، مجھے ایسا لگا گویا ہم جنم جنم کے ساتھی تھے۔ گویا
ہم اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ بہت کم وقت میں ہم ایک
دوسرے کے جتنے نزدیک آ گئے۔ شاید ہی کوئی میاں
بیوی اتنے قریب آئے ہوں گے۔ میں اپنے آپ کو
بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے تم جیسی بیوی مل گئی۔
تم جیسا جیون ساتھی مل گیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں تمہارے
بغیر میں ایک پل بھی نہیں سکوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ
جب میں جموں آ گیا تو چند دنوں میں میری جو حالت
ہوئی وہ میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے بار بار تمہاری
یاد آتی تھی۔ تمہاری باتیں، تمہاری آنکھیں، تمہاری
ادائیں، تمہاری قربت اور .....

"تم نے اسی لئے گھر والوں کو لکھ دیا ہوگا کہ جموں
میں کشمیری ملازموں کو بغیر فیملی کے آسانی سے رہائش
کے لئے جگہ ہی نہیں ملتی ہے۔"

"یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن تمہارے لئے میں
سخت بے چین تھا۔ نہ میرا دفتر میں جی لگتا تھا۔ نہ
ہی ڈیرے پر۔ تم ہر وقت میرے دل و دماغ پر چھائی رہتی
تھیں۔ تمہاری ایک ایک بات یاد آ کر میں مچلنے لگتا۔

"کونسی باتیں ___؟ میں بھی تو جانوں؟"

"کچھ باتیں ہوتیں تو بتا دیتا۔ تمہاری تو ہر بات ....
میں کبھی کبھار یہ بھی سوچتا ہوں کہ جو باتیں تم مجھے بتاتی
ہو کیا سب بیویاں اپنے اپنے شوہر کو ایسی ہی باتیں
بتاتی ہیں۔ اگر واقعی سبھی بیویاں ایسی ہی باتیں بتاتی
ہیں تو مجھے ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے
اگر نہیں بتاتی ہوں گی تو مجھے اپنے آپ پر فخر کرنا چاہئے
کہ مجھے تم جیسی بیوی مل گئی جس نے مجھے اپنا تن من
دیا۔ جس نے زندگی گزارنے کا مجھے اچھا سلیقہ بتا دیا
جس نے مجھے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کا طریقہ بتا
دیا۔ جو قدم قدم پر میری رکھوالی کرتی ہے۔ میری
ایک ایک چیز کا خیال رکھتی ہے۔ جو مجھے ہر وقت
خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ جو میری صحت کے
لئے مجھے بچوں کی طرح اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی ہے
اور فالتو وقت میں مجھے سیر و تفریح کو لے جاتی ہے اور
رات کو میرے پہلو میں سو کر مجھے ابدی خوشی و مسرت میں

[illegible] — نیلما! تم کتنی اچھی ہو!

"رمیش! جن باتوں سے تم خوش ہو کہ میں ایسا کرتی ہوں ان باتوں سے مجھے مسرت ہے کہ یہ سب کچھ تم مجھے بتا اور سکھا سکتے ہو، اگر تم مجھ پر ناز کرتے ہو تو میں تم پر فخر کرتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ مجھے تم جیسا جیون ساتھی مل گیا جو میری ناز برداری کرتا ہے۔ میرے نخروں پر چلتا ہے۔ جو مجھے ہر دم خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میری ہر آرزو پوری کرتا ہے۔ میری ہر چاہت پروان چڑھاتا ہے، میری ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ تمہاری دلچسپی اور تمہاری تڑپ دیکھ کر میں خوشیوں میں ڈوب جاتی ہوں — بھگوان کرے ہم دونوں ایسی خوشیوں میں ڈوبے رہیں۔ رمیش! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دو ساتھی ہیں۔ ہم زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں ہماری حیثیت برابر برابر کی ہے، ایک دوسرے کے بنا ہم نامکمل ہیں۔ ادھورے ہیں تم مجھے اپناؤ، میں تم کو اپناؤں گی، تم مجھ کو پا لو میں تم کو پا لوں گی۔ تم میری ضرورت کو پورا کرو میں تمہاری ضرورت کو پورا کروں گی۔ تم میری آرزو، چاہت اور تمنائیں پوری کرو، میں تمہاری تمنا آرزو اور چاہت کے لئے اپنی جان تک دے دوں گی۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گی۔"

"نیلما! یہ باتیں تم نے کتنی بار بتا دی ہیں — اور بار بار تمہاری زبان سے یہی باتیں سننے کے لئے میں یہاں چلنے لگتا تھا۔ جب میں زیادہ دیر تک تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکا تو میں نے تمہیں یہاں بلا لیا۔ یہاں پر ہم نے ایک سیٹ کرایہ پر لیا جس کے آدھے حصے میں پہلے ہی ایک فیملی رہتی تھی — یہاں ہم نئے سرے سے زندگی گزارنے لگے۔ پہلے پہل میں صبح کھانا کھا کر دفتر جایا کرتا تھا۔ لیکن دفتر میں جب تمہاری یاد مجھے تڑپاتی تو میں نے دوپہر کو ڈیرے پر کھانا کھانے کے لئے آنا معمول بنا لیا۔ اس طرح ہم شام کی طرح دوپہر کو بھی ساتھ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ تم مجھے کھلاتی میں تم کو کھلاتا۔ اس طرح ہنسی خوشی ہم دن گزارتے رہے۔

تم کو یاد ہوگا۔ میں نے تم کو کتنی بار کہا تھا کہ تم پڑوسن کی طرح بن ٹھن کر کیوں نہیں رہتی ہو، یہ ٹھیک ہے کہ وہ سپرنٹنڈنٹ کی بیوی ہے اور تم کلرک کی، لیکن میری مرضی ہے کہ تم اس سے بڑھ چڑھ کر رہو، تم ہمیشہ اس کے حسن کو مات دینے کی کوشش کرو تا کہ میری نظر اس پر ٹھہر نہ جائے۔"

"کیا تمہاری نظر اس پر ٹھہر جاتی ہے؟"

"نیلما! میں تمہارے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ چاہے وہ کیسی ہی بات کیوں نہ ہو، میں سچ کہہ رہا ہوں تمہاری اس پڑوسن... کیا نام ہے اس کا —؟"

"آمنہ —"

"بہت خوب — نام کی طرح اس کے حسن میں بھی بہت کشش ہے۔ جب بھی میری نظر اس پر پڑتی ہے تو یکایک میری نظر اس پر ٹھہر جاتی ہے، میرا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ اور میرے منہ سے ایک آہ نکل جاتی ہے کہ کاش! تم بھی ایسی ہی ہوتی حالانکہ حسن اور خوبصورتی میں تم کچھ کم نہیں مگر میں کیا

کروں۔ تمہاری آمنہ نے نہ جانے مجبور کر دیا جاؤ
لیا ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے؟ کیا تمہارے ساتھ اس کی
بات چیت ہوئی ہے؟!"

"نہیں صرف مڈبھیڑ ہوئی ہے۔"

"کیا وہ تمہارا مدعا سمجھتی ہے؟"

"میں کیا جانوں۔؟ البتہ جب میں اسے گھور گھور کر
دیکھتا ہوں تو وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتی ہے۔ اور
پھر ایک ادا سے اندر چلی جاتی ہے۔"

"رمیش! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میرا دل بہت دکھ
رہا ہے۔"

"نیلما! میں تمہارا دل دکھانے کے لئے ایسا ہرگز
نہیں کہہ رہا ہوں لیکن یہی بات کہنے کے لئے میری زبان
کسی کے سامنے نہیں رکتی، ہو سکتا ہے یہ میری کمزوری
ہو ــــ!"

ــــ "کیا تم میری ایک بات مانو گے؟"

ــــ "کیا ــــ؟"

ــــ "ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم اور کسی
جگہ رہنے کے لئے کوارٹر لیں گے۔"

"صرف ایک شرط پر؟"

"کونسی شرط؟"

"تم مجھے اس سے صرف ایک چانس دلاؤ، اس کے
بعد میں تمہارے سامنے توبہ کروں گا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے تمہارا تابعدار رہوں گا۔ تم جو کچھ بھی کہوگی میں
کروں گا ــــ تم میری یہ ایک چاہت پوری کر
دوگی تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے جیون بھر کا سکھ دیا۔

تم نے مجھے سب کچھ دیدیا ــــ نیلما! میری
یہ چاہت کسی طرح پوری کر دو ــــ میں تمہارے
پیر پڑتا ہوں۔"

"لیکن میں اس میں کیا کر سکتی ہوں؟!"

"تم اس کو میرے لئے راضی کر سکتی ہو، کیونکہ مجھے
اس کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملتا
تم دن بھر یہاں اس کے ساتھ رہتی ہو باتوں باتوں
میں اس کو ٹٹولو اور پھر کسی طرح صرف ایک چانس کے
لئے اسے پھنساؤ، چاہے اس کے لئے تمہیں کچھ بھی
کیوں نہ کرنا پڑے۔"

"تمہاری اس چاہت کے لئے میں اپنا سب کچھ داؤ پر
لگا دوں گی لیکن مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی بھی تم
اس قسم کی چاہت کا اظہار نہیں کرو گے۔ اور نہ ہی
کسی عورت کو نظرِ بد سے دیکھو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"میں کوشش کروں گی!"

"اُف ــــ! یہ سب کیا ہو گیا؟"

"کیا میں یہاں سے جا سکتی ہوں؟"

"ہاں آمنہ! تم جا سکتی ہو، لیکن ایک بات یاد رکھو
تم نیلما کو میری طرف سے کہہ دینا وہ یہاں میرے پاس
آنے کی کوشش نہ کرے اب سے وہ مجھے اپنا منہ نہ
دکھائے اگر وہ یہاں آگئی تو میں اسے ختم کر دوں گا۔"

"اگر میرا شوہر بھی اس وقت تمہاری بیوی سے ایسا
ہی کہتا ہوگا تو۔۔۔۔؟"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں ــــ ویسے اس کو بھی

لیا اپنا چاہیے:

"کیا اس لئے کہ آپ مرد ہیں اور ہم عورتوں کو ایک کھلونا سمجھ رکھا ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔"

"اگر تم حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ تو پھر تم نے نیلما کے سامنے ایسی چاہت کا اظہار کیوں کیا جس کی اُسے ایسی قیمت ادا کرنی پڑی۔"

"تم نے اُس کے سامنے ایسی شرط کیوں رکھی اُسے بھی اپنی جان دینی تھی۔ لیکن اپنی...."

"تمہاری چاہت بر لانے کے لئے میں اُس کی جان لے کر کیا کرتی کیونکہ مجھے بھی اپنے انور کی چاہت پورا کرنے کے لئے تمہاری نیلما کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا ـــــ، غلطی میری ہے جو تمہارے سامنے میں تھا اس بات کا اظہار کیا حالانکہ ہم نے یہ مسئلہ اپنے آپ تک محدود رکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔"

"کیا تمہارے انور نے تم سے کہا تھا کہ تم مجھے نیلما سے صرف ایک چانس دلا دو میں ہمیشہ کے لئے تمہارا تابعدار رہوں گا۔"

"ہاں، میں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ آئندہ وہ میرے سامنے ایسی کسی چاہت کا اظہار نہ کرے اور یہ چاہت پوری ہو سکتی ہے وہ اس کوارٹر کو چھوڑ دے۔"

"اف ـــ! یہ میں کیا سن رہا ہوں ـــــ میں یہ کونسی سزا بھگت رہا ہوں۔ تم چلے جاؤ یہاں سے ـــ، تم نیلما کو فوراً یہاں بھیج دو، ہم یہ کوارٹر آج ہی خالی کر دیں گے۔"

■■

رضا وصفی

79-7-1 اے رسالہ خورشید جاہی

زمستان پور - حیدر آباد ۲۰

دنیا نے مرے نام سے منسوب کیا تھا
جو فتنہ ابھی شہر میں برپا نہ ہوا تھا

جلتی ہوئی دنیا میں کھڑا سوچ رہا ہوں
کیا سوچ کے میں خلوتِ جاناں سے اٹھا تھا

سوچا تو ہر اک دور رہی دورِ مکرر
دیکھا تو ہر اک دور کا عالم ہی جدا تھا

ہم ہی میں برائی تھی ہمیں کورِ نظر تھے
ہر شخص ترے شہر میں بہتر تھا بڑا تھا

تم کو ہی نہ تھا پیار فقط دہر سے وصفی
یہ جرم رہِ زیست میں ہم سے بھی ہوا تھا

م۔ع۔ باسط
۳۴۔ خلیفہ کالونی
جالنہ ضلع اورنگ آباد

سائنس عام لوگوں کی زندگیوں پر دو طرح سے اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ عام آدمی سائنس کے عملی استعمال سے اس طرح سے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ وہ گھوڑا گاڑی میں سواری کرنے کے بجائے موٹر کار یا بس میں سفر کرتے ہیں۔ بیمار ہونے پر کسی جادوگر یا پجاری سے علاج کروانے کے بجائے کسی سرجن یا ڈاکٹر سے علاج کرواتے ہیں اور کسی خنجر یا جنگلی کلہاڑی سے موت کا شکار ہونے کے بجائے پستول یا شل کے ذریعہ لقمۂ اجل بنتے ہیں۔ سائنس مختلف امور کے بارے میں ان کی رائے کو بھی متاثر کرتی ہے۔ تقریباً ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ہماری زمین گول ہے اور آسمان ٹھوس نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک ایک خالی جگہ ہے۔ ہم اب چند قدیم ترین حیوانات کو اپنے جد امجد تسلیم کرنے لگے ہیں اور حیاتیاتی اصولوں کے تحت انسانی فطرت کے زبردست ارتقاء کے امکان کو درست سمجھنے لگے ہیں۔

لیکن سائنس ایک طرح کے نظریات کی جگہ دوسری قسم کے نظریات کی تشکیل کرنے میں مدد دینے یا مسلمہ نظریات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے اور ان کے بارے میں از سر نو تحقیق کرنے کی تعلیم دینے کے علاوہ ذہن انسانی کے ارتقاء میں اور بھی زیادہ اہم حصہ لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ بحیثیت مجموعی تمام انسانوں میں اس نقطۂ نظر کا عام

نمبر ۵ پیکر حیدرآباد

کر سکتے ہیں جس کے حامل اصحاب سائنس ہوتے ہیں جس طرح اس سے چند ہزار برس پہلے اور چند سو سال قبل کو اس سائنس کی تخلیق کرنے کے قابل بنایا ہے جس پر تہذیب جدید کی بنیاد قائم ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنے یا دوسروں کے حرکات و سکنات پر تنقید کرنا چاہتے ہیں جہاں آج ہیں سائنسی نقطۂ نظر کو تجربہ خانوں کی حدود سے نکال کر اسے اپنی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں استعمال کرنا ہوگا۔ یہ بھلا ناممکن ہے کہ وہ نقطۂ نظر جس نے صنعت زراعت اور طب کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے نسل انسانی کے مسائل کو حل کرنے میں بیکار ثابت ہوگا۔

لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر پر بڑھتے ہوئے یقین کی وجہ سے ایسے جھوٹے مبلغین کی ایک بڑی تعداد ہمارے سامنے آ رہی ہے جو علم سماجیات میں اپنے من پسند نظریات کو سائنٹفک نظریات کا نام دے کر پیش کر رہے ہیں۔ سائنس ان کے ذریعہ ہمیں مسلسل یہ کہہ رہی ہے کہ اگر ہم سگریٹ نوشی ترک نہ کریں یا برتھ کنٹرول وغیرہ نہ کریں تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ یہاں میرا مقصد کسی سائنٹفک نظریہ کی حمایت کرنا نہیں بلکہ میں صرف سائنٹفک نقطۂ نظر کی وضاحت اور تائید کرنا چاہتا ہوں۔ اس نقطۂ نظر کی خاص خاص باتیں کیا ہیں؟ اس کی سب سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ حقیقت پرستی پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے غیر جانبداری بھی اس کی خصوصیت ہے۔ اس میں غیر جانبداری کی یہ خصوصیت قانونی نقطۂ نظر کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ایک اچھا جج مسٹر جان اسمتھ اور مسٹر جان سنگ کے معاملہ

عقیدت واحترام سے بندگی کی کوشش کرنے لگیں گے لیکن ایک
اچھا سائنسداں ستاروں، کہکشاں اور نظام شمسی کے عناصر
بھی بڑی فرمانبردار رہے گا۔ وہ کبھی سے ان کی حرکت کو
ترک کر دینے لگا ہے اس کا اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ
مشاہدہ کرنے پر مجبور کرتے کے بجائے جیسا کہ ہم کسی خوبصورت
مجموعہ کا مشاہدہ کرتے ہیں اسے پھینک دینے پر مائل کرتی،
اور اپنے ذہن سے نظام شمسی کے کلاسیکی رعب اور دبدبہ
کو پرے جھٹک دے گا جس کی وجہ سے اس کے پیش رو
نے اس کے مختلف حصوں کی پرستش کی یا کم از کم انہیں

فہم انسانی سے بالاتر اور خدائے برتر کے بعید از فہم
عدام سمجھا۔

اس طرح کا رجحان سائنسداں کی طبیعت میں منکسر المزاجی
اور فخر کا ملا جلا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس کی نظر میں
نظام شمسی سماوی اجسام کا ایک ایسا گروہ ہے جو
اپنے پڑوسی اجسام کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں اور قابل
فہم اور آسان اصولوں کے مطابق حرکت کرتے رہتے
ہیں۔ لیکن وہ خود اس نسل سے تعلق رکھنے والا کسی قدر

غیر معمولی نوعیت کا رکن ہے جس سے چند رشتے ہیں۔ اور
اس کا وزن اس کے جسم میں ہونے والے ایسے کئی کیمیائی
تغیرات کے زیر اثر ہے جنکو وہ بڑی مشکل سے سمجھ سکتا
اور ان پر قابو رکھ سکتا ہے۔

چونکہ سائنٹفک نقطۂ نظر کے تحت تمام مظاہر کا مشاہدہ
ایک ہی نوعیت کی جذباتی سطح پر رہ کر کیا جاتا ہے اس
لئے اس نقطۂ نظر کو انسانی نقطۂ نظر بھی کہہ سکتے ہیں۔
لیکن سائنس یہ تعین نہیں کر سکتی کہ کونسا فعل اخلاقی
اعتبار سے درست ہے اور کونسا غلط اور اسے
ایسا کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہئے۔ وہ مختلف افعال
سے پیدا ہونے والے نتائج کا اندازہ تو لگا سکتی ہے
لیکن ان افعال کے اخلاقی طور پر غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ
نہیں کر سکتی۔ ایک ماہر جراثیمیات صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ
اگر ایسے ذخیرہ آب کو جس سے شہریوں کو پانی سپلائی کیا
جاتا ہو جراثیم آلود کر دیا جائے تو اس کی وجہ سے اتنی
ہی اموات واقع ہو سکتی ہیں جتنی کسی آبادی میں بم کے
پھٹ پڑنے کی وجہ سے ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ یہ تعین نہیں

کر سکا کہ یہ نتائج اخلاقی اعتبار سے کس حد تک غلط یا صحیح ہیں۔ سائنس کے نکتہ چیں سائنسدانوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے قطعی بے بہرہ ہیں اور اخلاقی مسائل کی صحیح نوعیت سے قطعی طور پر ناواقف ہونے کے باوجود ان مسائل میں بلاوجہ دخل دیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں اعتراضات قطعی غلط اور بے بنیاد ہیں

عام انسانوں کا ہمیشہ سے یہ رجحان رہا ہے کہ وہ کسی بھی مسئلے کے جذباتی اور اخلاقی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اس کے ان خشک حقائق میں بہت کم دلچسپی لیتے ہیں جن سے سائنسدانوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اب میں آپ کے سامنے دو مثالیں پیش کروں گا۔ ایک مثال کا تعلق امریکی نیگروؤں کے مسئلہ سے ہے اور دوسری کا بیماریوں کے مسئلہ سے۔ امریکیوں کی غالب اکثریت کی رائے یہ ہے کہ نیگرو سفید فام اقوام کے مقابلہ میں بے حد پست ہیں اس لئے انہیں جہاں تک ممکن ہو سکے سفید فاموں سے الگ تھلگ رکھا جانا چاہیئے۔ لیکن کچھ کی یہ رائے ہے کہ انہیں سفید فاموں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ ماہرین حیاتیات یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے حق پر کون ہے۔ ہاں وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ نیگروں کے سروں کی ساخت سفید فاموں کے سروں کی ساخت کے مقابلہ میں ایپ بندروں کے سروں کی ساخت سے زیادہ مشابہ ہے۔ لیکن نیگروں کے بے بال جسم سفید فاموں کے بالدار جسموں کے مقابلہ میں ایپ بندروں کے جسموں سے کم مشابہ ہیں۔ لیکن وہ نیگروؤں کے متعلق ان دو متضاد سیاسی نظریات کے نتائج کا مشاہدہ

غور کر سکتے ہیں۔ امریکہ کے [illegible] علاقوں میں نیگرو آبادی کی شرح پیدائش شرح اموات سے کہیں زیادہ ہے۔ جنوبی علاقوں کے شہروں اور ملک کے تمام شمالی حصوں میں نیگرو پیدا تو کم تعداد میں ہوتے ہیں لیکن مرتے زیادہ تعداد میں ہیں۔ ان علاقوں میں ان کی بڑھی ہوئی شرح اموات کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ماحول میں جو سفید فاموں کی زندگی کے لئے سازگار ہو نیگرو بالکل اسی طرح مر جاتے ہیں جیسے سفید فام افریقہ کے مغربی ساحل پر لقمۂ اجل بنتے ہیں۔
اس لئے اگر آپ مختلف طریقوں سے کام لیکر نیگروؤں کو کاروں، فیکٹریوں اور دوسری ایسی ہی چیزوں سے دور رکھیں گے یا انہیں ڈرا دھمکا کر سفید فاموں سے روابط قائم کرنے سے باز رکھیں گے تو وہ پھر سے روئی کے پرفضا کھیتوں کی طرف لوٹ جائیں گے جہاں وہ صحت مند زندگی گذاریں گے اور اپنی نسل میں تیزی سے اضافہ کریں گے۔ اس طرح آپ نیگرو مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے اسے اگلی نسلوں کے لئے اور بھی زیادہ شدید بنا دیں گے۔ لیکن جب آپ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے تو آپ انہیں اپنی بیماریوں سے متاثر کر سکیں گے۔

یہ نتائج ان نتائج سے بالکل مختلف ہیں جو اس صورت میں نکلتے جب ہم سائنٹفک طرز فکر سے کام لینے کے بجائے خام قسم کے جذباتی یا سیاسی اصولوں کے تحت عمل کرتے۔ امریکی سول وار کا اہم حیاتیاتی نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد نیگروؤں کی شرح اموات اس قدر بڑھ گئی اور شرح پیدائش اس درجہ گھٹ گئی کہ صرف

[illegible] ۱۹۹۰ء اور ۲۰۲۰ء کے درمیان
ہی ممالک جیسے امریکہ میں نیگروز کی تعداد آتی [illegible] کی
جتنی کہ خانہ جنگی سے قبل کی دہائیوں میں بڑھی تھی۔ اس طرح
رہنے والے نیگروز کی تعداد گوروں سے کہیں زیادہ تھی۔ اگر ہم جنوبی
میں جنوبی ریاستوں میں آباد رنگدار آبادی کو سستی قسم کی دوائیں
بڑی تعداد میں مہیا کریں اور انہیں برتھ کنٹرول کی سہولتیں
فراہم کریں تو نیگروؤں کی تعداد میں رفتہ رفتہ کمی ہو جائے
گی۔ مجھے یقین ہے کہ کئی ایسے قومی اور بین الاقوامی مسائل
موجود ہیں جن کا زہریلا پن حیاتیاتی حقائق کو پیش نظر رکھ
کر دور کیا جا سکتا ہے۔

ہم بیماریوں کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اور بھی زیادہ
غیر منطقی استدلال سے کام لیتے ہیں۔ یہاں میرا روئے
سخن روحانی معالجین کی طرف نہیں ہے بلکہ میری مراد ان
عام عورتوں اور مردوں سے ہے جو جدید طب کے نتائج
میں یقین رکھتے ہیں۔ شدید بیماری ہم میں اور ہمارے
دوستوں میں زبردست جذباتی ہیجان پیدا کر دیتی ہے
جب ہم کسی معاملہ میں جذباتی ہو جاتے ہیں تو ہم اس
بات کی شدید ترین ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس
معاملہ کے متعلق کوئی نہ کوئی خیال قائم کریں۔ ہم اس بات
کی قطعی پرواہ نہیں کرتے کہ ہمارا خیال منطقی بھی ہے یا
نہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل کے زمانہ میں
بیماریوں کے متعلق لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ وہ کسی
دیوی یا دیوتا کا عذاب ہیں جو خود مریض کے یا اس کے
خاندان کے یا ساری برادری کے گناہ کے نتیجہ میں نازل
ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے اس خیال کو درست تسلیم
نہیں کیا۔ جب ان سے ایک پیدائشی اندھے کے متعلق
استفسار کیا گیا کہ وہ گناہ جس کے نتیجہ میں یہ شخص اندھا
پیدا ہوا ہے کس سے سرزد ہوا تھا۔ اس سے یا اس کے
والدین سے؟" تو انہوں نے جواب دیا: "نہ تو اس
شخص نے گناہ کیا ہے نہ اس کے والدین نے۔ حقیقت
یہ ہے کہ خدا نے اس شخص کے ذریعہ اپنی قدرت کا اظہار
کیا ہے۔" بیماریوں کے بارے میں یہ رجحان سائنسدانوں
کے رجحان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جو بیماری کو
قدرتی قانون کا اظہار کرتے ہیں۔ کسی بیماری کو اسی
وقت روکا جا سکتا ہے یا اس کا علاج کیا جا سکتا ہے۔
جب کہ تحقیقات کے ذریعہ زیر بحث قانون کے عمل کے
بارے میں ضروری معلومات فراہم کی جا سکیں۔

لیکن بہت سے مذہبی خیالات کے لوگ آج بھی بیماریوں
کے متعلق اسی قسم کے اعتقادات رکھتے ہیں جن کو حضرت
مسیح نے باطل قرار دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ان لوگوں کی
ذہنی حالت بھی کچھ بہتر نہیں ہے جو خود کو آزاد خیال تصور
کرتے ہیں۔ ان میں سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہم فطری
حالت کی طرف لوٹ کر بیماریوں سے بچ سکتے ہیں میں
سمجھتا ہوں کہ فطری حالت کی طرف لوٹنے کے لئے ہمیں
سب سے پہلے کپڑوں کا استعمال ترک کرنا ہوگا۔ اس
کے نتیجہ میں مرض نمونیا سے ہونے والی اموات سوگنا
بڑھ جائیں گی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کہاوت قطعی
بے معنی ہے کہ ہمیں فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنی
چاہئے۔ مہذب اور وحشی آدمی، صحت اور بیماری
یہ سب کے سب فطرت کے اجزا ہیں۔ اس میں شک

نہیں کہ ہماری تہذیب یافتہ زندگی کے بعض پہلو صحت
کے لئے مضر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اعداد و شمار
سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہماری تہذیب یافتہ
زندگی کے بعض پہلو صحت کے لئے مضر ہیں۔ لیکن اس
کے باوجود اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہوتی ہے
کہ غیر مہذب انسانوں کے مقابلہ میں تہذیب یافتہ
انسان زیادہ عرصہ تک زندہ رہتے ہیں۔ مسائل کے
متعلق اس طرح کا جذباتی نقطۂ نظر بعض لوگوں کو یہ سمجھنے
پر مجبور کر دیتا ہے کہ انسان کے پاس تقریباً ہر بیماری
کا علاج موجود ہے۔ اگر یہ لوگ طب سے ضروری
واقفیت حاصل کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کا خیال
درست نہیں۔ بیشتر بیماریاں ایسی ہیں جن سے بچنے کے
لئے ضروری اقدامات تو کئے جا سکتے ہیں لیکن جب وہ
لاحق ہو جائیں تو دس میں سے نو صورتوں میں ڈاکٹر
مریض کو یہ مشورہ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا کہ وہ
اچھی طرح آرام لے اور خود کا بے حد خیال رکھے۔

موجودہ زمانہ میں طبی صورت حال بے حد سنجیدہ ہو گئی
ہے۔ تقریباً تمام مہذب ممالک میں انسان کی متوقع
زندگی کی مدت ایک سی ہے اور گذشتہ ۵۰ سال
سے یہ مدت بڑھتی ہی رہی ہے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پانی سے پیدا ہونے
والی بیماریوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ آج بھی علم طب ترقی کرتا
جا رہا ہے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذر رہا ہے علم طب
سے حاصل ہونے والے نتائج کو عملی جامہ پہنانے میں
دشواری بڑھتی جا رہی ہے۔

آج کل شدید ترین ذیابطیس میں مبتلا مریض بھی اچھی
صحت مند ہو سکتے ہیں اور دن میں دو یا تین بار انجکشن
لے کر اس بیماری سے چھٹکارہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن
ان کے دماغ میں یہ بات نہیں بٹھائی جا سکتی۔ اس لئے
کہ انہیں کبھی بھی یہ نہیں سکھایا گیا کہ ان کے جسم چند
مقررہ اصولوں کے تابع ہیں اور جس طرح بریکینگ آئل
کے بغیر موٹر نہیں چل سکتی اسی طرح انسولین کے بغیر
ذیابطیس میں مبتلا لوگوں کے جسم کی مشین کام نہیں
کر سکتی۔ حال ہی میں میرے ایک ڈاکٹر دوست کے
یہاں جو کہ سرکاری اسپتال میں کام کرتا ہے دو مریض
عورتیں لائی گئیں جو ذیابطیس کی وجہ سے قریب المرگ
تھیں۔ ان دونوں کا اس سے قبل بھی علاج کیا جا چکا
تھا اور انہیں ہدایت دی گئی تھی کہ وہ دن میں دو بار
انسولین کے انجکشن لیا کریں۔ لیکن ان میں سے ایک اپنی
سرنج توڑ بیٹھی تھی اور نئی سرنج خریدنے کی کوئی پرواہ
نہ کی تھی۔ دوسری نے گذشتہ دو دن سے اس خیال کے
تحت انسولین کے انجکشن نہیں لئے کہ ڈاکٹر کو دکھانا
ہی ہے۔ انگلستان میں ذیابطیس کی وجہ سے ہونے والی
اموات کی تعداد میں کوئی نمایاں کمی نہیں ہو سکی ہے
ہاں انسولین کی ایجاد کی وجہ سے چند ذہین اور سمجھدار
لوگوں کی زندگی ضرور بچ سکی ہے۔

اگر آئندہ چند برسوں میں کینسر کا کوئی قطعی علاج
دریافت ہو بھی جائے تو وہ علاج ذیابطیس کے علاج

[illegible]

مثلاً اس کا شعور و احساس کا فقدان کہ کوئی

خاص اثر نہیں ڈالے گا۔ اس صورت میں ہر شخص اپنے

آپ کو اس نقصان دہ اثرات سے متعلق بچانے کی کوشش نہیں

کر سکتا ہے جو کینسر کے علاج کے ذریعہ بچایا

جا سکے گا۔ لیکن اگر سائنس کینسر کا کوئی قطعی علاج

دریافت کر سکے بلکہ صرف اس سے بچاؤ کا کوئی

طریقہ معلوم کرسکے تو صورت حال اور بھی گمبھیر

ہوگی۔ تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس

صورت میں کسی بھی زہر کا رد عمل بڑا ہولناک ہوتا

ہے۔ کسی بھی ایسے ملک میں جہاں تابکاری اثر عام ہو

ہمیشہ پیر اور دوائیں پیتے رہنا ممکن ہے۔ یا عوام کے

لئے یہ سخت مشکل ہے کہ وہ ہر وقت اس بات کا خیال رکھیں

کہ ان کا پینے کا پانی متاثر ہوا ہے یا نہیں۔ [illegible]

کو پھیلنے سے روکنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ عوام کو

سپلائی کئے جانے والے پانی میں مناسب قسم کی دوائیں

شامل کر دی جائیں۔ اور یہی طریقہ موثر بھی ہے۔ اس

لئے کہ ایسا کرنے پر تابکاری اثر کو پھیلنے سے روکنے کے

لئے عوام کو کسی بھی طرح کی زحمت اٹھانی نہیں پڑے

گی۔ ہوا کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں جیسے خناق، چیچک

وغیرہ کو عوام کو انجکشن کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن

اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام میں اس سلسلے میں تعاون

کرنے کا جذبہ موجود ہو۔ یہ جذبہ صرف اسی وقت پیدا

ہو سکتا ہے جب عوام اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ خطرناک جراثیم

واقعی طور پر موجود ہیں اور کسی بھی انسان کی موت کا باعث

بن سکتے ہیں۔ ان بیماریوں کے متعلق کسی درست اور

[illegible] صرف اسی وقت اپنا سکتے ہیں جبکہ انہیں

سائنٹفک اصول پر تعلیم دی جائے۔

فنا کی طب کو جنگ کا خوفناک ہتھیار بنایا جا سکتا

ہے۔ اب تک چند لوگ فنا کی طب کو ایسا ہی سمجھتے

تھے جیسا پہلے کا خیال تھا کہ دنیا پر تباہ کن قوتوں کی حکومت

ہے۔ ہم آج اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں

اور یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ سائنٹفک نقطۂ نظر کو عام

طور پر اپنایا جائے۔ اس لئے کہ اس نقطۂ نظر کی کمی

میں انسان کی توانائی اپنے ہی ساتھی انسانوں سے لڑائی

اور جھگڑوں میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں

یا تو لڑنے والے فریقوں میں سے ہر ایک کو یا کسی ایک کو

زبردست نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ صرف قدرتی

تباہیوں کی صورت میں ہی عام آدمی ایک لمحہ کے

لئے اپنے حقیقی دشمنوں یعنی جراثیموں سے لیکر طوفانوں

تک کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا ہے۔ جب تک

انسان سائنٹفک نقطۂ نظر کو نہ اپنائے گا تب تک وہ

انسانیت کے ان حقیقی دشمنوں پر فتح حاصل نہیں کر سکے گا۔

جے۔ بی۔ ایس ہالڈین کے انگریزی

مضمون کا ترجمہ

ذکر ہے ۔۔۔ ایک شام کا واقعہ ہے ایک بھری پُری
شاہراہ پر ایک لڑکا کچھ اُداس اُداس اور اپنے آپ
سے بیزار سا کچھ اس انداز میں اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا
جیسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ
اس طرح نہال نظر آنے لگا گویا گوہرِ مقصود ہاتھ
آگیا ہو۔ اُس نے اپنی اوپری جیب سے برآمد ہونے
والے سگریٹ کیس سے ایک بیڑی منتخب کی اور اُسے
دانتوں میں تھامے ایک گوشے سے دوسرے گوشہ
تک پھراتا ہوا سر کھجانے لگا ۔۔۔ ماچس! ۔ اُس
نے ایک آہِ جگر خراش کھینچی اور راہ چلتے لوگ مُڑ
کر اُس کی طرف دیکھنے لگے ۔۔۔ ماچس کا خیال ہمیشہ
اُس کے سینے سے اسی طرح ایک صدائے پُرملال
آزاد کر دیتا تھا۔ اُس کے داہنے ہاتھ سے لٹکتے
ہوئے بریف کیس سے جس میں سبھی کچھ تھا۔ پکاسو
فرائڈ، برنارڈ شا، کنیز شمس، سبھی کا لٹریچر اور نہ
جانے کیا کیا۔ مگر ایک ماچس ۔۔۔ اُس کی گنجائش
کہیں بھی نہیں تھی۔ اُس کے خیال میں ماچس محض
مانگ کر استعمال کرنے ہی کے لئے بنائی گئی ہے
بلکہ اُس کا بس چلے تو وہ سگریٹ اور بیڑی بھی لوگوں
سے مانگ ہی کر پیا کرے۔ مگر وہ اپنے تئیں بے یار و
مددگار پاتا کہ بیڑی جلانا بائیسکل اور موٹر چلانے سے
کہیں دشوار ہے ۔۔۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ
ایک حسینہ پری تمثال، چہرے سے خوش خیال،
اُسے کچھ اس انداز میں بلاتی ہے کہ اپنی آرزوئے
ماہ و سال کو بامراد پایا اور دل سرور اور چہرہ حماقت
کے نور سے معمور ہو گیا۔ وہ چاہتا ہی تھا کہ دوڑ کر
اُس کے حضور میں دست بستہ پیش ہو کر قریب
سے ایک دوسرا مرد بدکردار و صورت سے کوئی ٹھیکیدار
اُس نازنین باوقار کی طرف لپکا۔ خدا سیاہ جنوں
کا برا کرے کہ اُس نے مرجان دل کو اسی طرح

سہیل فلکی

قصہ تین انٹلکچویل کا!

ٹھیں پہنچائی ہے۔ بڑا ملول و دل گرفتہ ہوا۔ اُس
کا خیال ترک کیا اور ایک کافی ہاؤس کا قصد کیا
کہ یہ سستانے اور دل کو بہلانے کا ایک اچھا
مقام ہے۔ جب وہ کافی ہاؤس میں داخل ہوا تو
نہ جانے کیوں اُسکی آنکھیں بوجھل بوجھل سی ہوگئیں
منہ تھوڑی تھوڑی دیر سے کھلتا اور پایۂ تکمیل کو
پہنچے بغیر بند ہو جاتا ـــ اُسے بڑی کوفت ہوتی
کافی دیر بعد وہ سمجھ سکا کہ دراصل یہ نیند کی نشانی تھی
ذہن پر سے ایک بوجھ سا اٹھ گیا۔ اُس نے آنکھیں
پھاڑیں اور پھٹی پھٹی سی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے
لگا۔ استنے میں اُس نے کیا دیکھا کہ ایک میز پر ایک
مرد بے خبر بیٹھا جمائی لے رہا ہے اور دوسرا کہ اُس
کے قریب ہی موجود تھا اُس کے کھلے ہوئے دہن کے
آگے چٹکی بجانے میں مصروف ہے۔ ساتھ ہی وہ
دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق سے بھی نظر آتے
تھے۔ اُس نے جو یہ ماجرا دیکھا تو مارے خوشی کے
ایک قلا بازی کھائی اور دوسری کا ارادہ ملتوی کرتا ہوا
اُن کی طرف چل پڑا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اُسے اپنی
ہی طرح کے انٹلکچوئل مل گئے تھے۔ راہ میں وہ متعدد
بار میز اور کرسیوں سے الجھا اور ایک بار تو منہ
کے بل آتا آتا بچا ـــ مگر اُس نے ہمت نہ ہاری
اور میز کے قریب پہنچ کر ہی دم لیا۔ اب جو اُس نے
اپنے پیچھے نظر کی تو یہ جانا کہ اُس نے بہ مشکل دوری
گز طے کئے تھے۔ بڑا حیران ہوا ـــ یہ عجب ماجرا
اُس کے فہم میں نہ آیا۔ ! اُس نے میز کھینچی اور
کرسی پر دراز ہو گیا۔ لیکن ان دونوں انٹلکچوئلوں

نے کہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی [illegible]
تھے، نہ تو اس تیسرے انٹلکچوئل کا نوٹس لیا اور
نہ نوٹس دیا۔ بلکہ بدستور خلاؤں میں اور کبھی ایک
دوسرے کو گھورتے اور گال یا ناک کھجلاتے رہے۔
اُن میں سے ایک آدھ کبھی کبھی بلند بانگ جمائی
ضرور لے لیتا اور پھر اُس کے منہ چلانے کی آواز
بیزاری میں مزید اضافہ کر دیتی۔ اور [illegible]
اپنی جماہی روکنے کے لئے دانت بھینچے ادھر ادھر
دیکھنے لگتے ـــ نہ جانے وہ کب تک یونہی بیٹھے
رہے ـــ اس اثناء میں دوسرے اور کم عمر انٹلکچوئل
کا یہ عالم تھا کہ ہر دو منٹ کو ایک گلاس پانی کا
نوش جان کرتا اور پہلے انٹلکچوئل کو کہ بزرگ تر
تھا برداشت نہ رہی اور وہ یوں گویا ہوا۔ "پہلی
بار دیکھا، دوسری بار دیکھا، تیسری بار دیکھا۔
علی الحساب آٹھویں بار دیکھا لیکن نویں بار دیکھنے
کی ہوس نہیں ہے۔ تو اے نوجوانِ نیک بخت کیا
وجہ ہے کہ تو اس طرح اپنی جوانی کو پانی بنائے جا رہا
ہے۔" بس یہ وہ نوجوانِ رعنا پہلے تو مسکرایا پھر
ہنسا اور پھر ایک دم سنجیدہ ہوتا ہوا گویا ہوا۔ "اے ہم
محترم معاف کرنا کہ تو حساب میں کمزور معلوم ہوتا
ہے۔ یہ میرا آٹھواں نہیں اٹھارواں گلاس
ہے۔" دوسرا انٹلکچوئل مزید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ
تیسرا انٹلکچوئل کہ کچھ دریافت کرنے کے لئے بیتاب
ہوا جا رہا تھا بول پڑا ـــ "ایکس کیوز می! اے
مردِ خوش گفتار کہ عجب اطوار بھی نظر آتا ہے، کیا
بات تھی کہ تو پہلے تو مسکرایا پھر ہنسا اور پھر قہقہہ

[illegible]

[illegible] دوسرا انٹلکچول گویا ہوا۔ "یہ بھی
بات اپنے ساتھی کی سادگی پر مسکرایا کر وہ جن کو
پانی سمجھ بیٹھے ہے۔ پھر اس نے کہا کہ اس
قدر معروف مگر وہ ابھی صاحب بن کر وردی ادا
ہو رہا [illegible] کہ دنیا نے ڈرالنے [illegible]
اتنا بڑھا دیا ہے کہ مجھے اس کی جگہ پانی پینا پڑ رہا
ہے۔"

اس تقریر سے دونوں مرد جتنے محظوظ ہوئے اتنے
ہی ملول بھی۔ تیسرا انٹلکچول اپنی فغاں نہ روک
سکا۔ اس نے ایک آہ سرد بھری۔ اور دوسرا
انٹلکچول سردی سے تھر تھر کانپنے لگا۔ جب وہ
تھما اور اس کی جان میں جان آئی تو پہلا انٹلکچول
گویا ہوا۔ "اے مرد با مروت دریا نیا تو سخت بڑی
غیرت برتی کہ پہلے ہی ہمیں اپنے حال دل سے
آگاہ نہ کیا، ورنہ پانی سے تیرا معدہ تباہ نہ ہوتا۔"
اور ایک بیرے کو بلانے لگا۔ جب وہ قریب آیا
تو اس نے اس کے کان میں بیچ کر رم کا آرڈر
بلیس کیا۔ جب بیرا جا چکا تو برا سا منہ بنا کر
بڑبڑانے لگا۔ "نہیں معلوم یہ ہوٹلوں میں بیرے کیوں
رکھے جاتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد جب رم آگئی اور تیسرے انٹلکچول
کا گلاس جو تھائی تک پہنچ گیا تو یکایک اُسے
تھوڑی دیر قبل کا واقعہ یاد آگیا اور وہ پہلے انٹلکچول
سے یوں گویا ہوا۔ "اے ہمدم ناداں.....
ساری! ۔۔۔ ہمدم دانا کہ تو انتہائی عقیل و فہیم
معلوم ہوتا ہے۔ ابھی میرے ساتھ عجب ماجرا ہوا۔
میں جب اس میز کی سمت گامزن ہوا تو یہ راستہ اپنا
ڈالا تھا ۔۔۔ میں جگہ جگہ ٹکرایا، اٹھا اور گرا مگر پھر
جو دیکھتا ہوں تو گویا یہ گھٹ کر ایک گز رہ گیا۔ جب
سے یہ واقعہ عظیم ظہور پذیر ہوا ہے، کمال حیرت
میں غرقاب ہوں اور ساتھ ہی اندر سے پیچ و تاب ہوں
عجب خلفشار ہے۔ یہ کوئی اسرار ہے یا عقل کا
انتشار ہے؟

تیسرا یہ سن کر مرد [illegible] دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔
حتیٰ کہ اس کی آنکھ سے آنسو بہ نکلے۔ دوسرے انٹلکچول
نے اس کی جیب ٹٹول کر رومال نکالا اور کمال رحم
اور ادب سے اسکی سمت بڑھا دیا۔ پہلے انٹلکچول نے
اطمینان سے اپنی آنکھیں صاف کیں پھر دوسرے انٹلکچول
کو شکریہ کے ساتھ اپنا رومال واپس کرتا ہوا یوں گویا
ہوا ۔۔۔

"اے نوجوان نافہم بلکہ بعید از فہم اس میں تیرا نہیں تیری
عینک کا قصور ہے۔ تو تیری عینک کا ایک شیشہ یوں
غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے ایک سینگ!"
بس تیسرا انٹلکچول کہ انتہا درجہ خفیف بھی تھا اس درجہ
خفیف و نادم ہوا کہ اسکی عینک کا دوسرا شیشہ بھی
ٹوٹ کر کئی حصوں میں منقسم ہو گیا! ۔۔۔

وہ کافی دیر تک اپنے خیالوں میں کھوئے رہے جب
پہلے انٹلکچول کا گلاس خالی ہو گیا تو اس نے جیب سے
ایک "ڈن ہل" کا پیکٹ نکالا اور میز پر رکھ دیا۔
ایک انٹلکچول کی جیب سے ڈن ہل جیسا قیمتی اور نایاب
سگریٹ نکلتا دیکھ کر باقی دونوں ہی انٹلکچول ہکا بکا

بڑے۔ آخر تیسرا انٹلکچوئل بوجھو ہی بیٹھا۔
"یا مرشد! —" وہ بولا۔ "حیرت ہے کہ تو انٹلکچوئلس
کی روایات کو 'ڈن ہل' بنا رہا ہے۔"
بس کیا تھا پہلا انٹلکچوئل پھر ایک بار پھوٹ پھوٹ
کر ہنسنے لگا۔ جب ہچکیاں بندھ گئیں تو یکایک
سنجیدہ ہوتا ہوا پیکٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ ماجرا دیکھا
تو تیسرا انٹلکچوئل کسی قدر حیران و پریشاں ہو کر گویا ہوا
"ارے یار بزرگوار تیرے دشمنوں کے مزاج تو اچھے
ہیں —"
"ہاں!" پہلا انٹلکچوئل کمال سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے تو
تیری کم عقلی پر ہنسی آتی تھی۔" یہ کہہ کر ڈن ہل کے پیکٹ
سے ایک (CHICKLET) چکلیٹ نکالا اور اُسے اپنے
دہن مبارک میں ڈال لیا۔ تب تو تینوں ہی انٹلکچوئل
انتہائی شاداں ہوئے اور وجداں ہو کر لڑکیوں، فش
نیٹ کاسٹیوم، اور منی اسکرٹس کے تعلق سے باتیں کرنے
لگے۔ دوسرا انٹلکچوئل بولا۔
"بھائیو! — اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو اور برا
نہ مانو تو میں ایک گندہ جوک آپ حضرات کی خدمت
میں گزرانوں —"
"ارشاد — ارشاد" باقی دونوں بیک زبان و
بے تابانہ گویا ہوئے —
"ایک شخص سفید کپڑے پہنے ایک کیچڑ سے بھرے گڑھے
میں گر پڑا۔" دوسرا انٹلکچوئل بولا اور سر کھجاتا ہوا قریب
آتے ہوئے بیرے کی طرف دیکھنے لگا —
بیرا میز پر ایک بل رکھ گیا۔ پہلے انٹلکچوئل نے اُسے
طشتری سے اٹھا لیا اور اُس پر نظریں جما دیں۔ مگر پھر
دوسرے ہی لمحہ اُسکی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ
بہتے ہی رہے۔ جب اُسکا گریبان اچھا خاصا بھیگ
گیا تو دوسرا اور تیسرا انٹلکچوئل اُسے دلاسے اور تسلیاں
دینے لگے کہ بُرا وقت ہر انسان پر آتا ہی ہے مگر
اُس مرد عاقبت اندیش کا یہ عالم تھا کہ قطار اندر
قطار روتا ہی جاتا تھا۔ آخر سسک کر اُس نے یوں
کلام کیا۔
"کرم فرماؤ —— تم لوگوں کی تسلی سے ڈھارس بندھتی
ہے اور قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے
دل کا بار ہلکا کرتا ہوں۔ میرا یہ حال زار آج ہی
نہیں اس سے پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے۔ جب بھی
میں کوئی بل پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری یہی
حالت ہوتی ہے۔ کیونکہ میں اس کا ایک بھی لفظ
نہیں سمجھ سکتا۔"
پہلا انٹلکچوئل اپنی آستین سے آنسو خشک کر کے
چپ ہو گیا۔ تیسرا انٹلکچوئل بولا۔ "اے مرد بلند
بخت و بلند اقبال۔ قسمت کے لکھے کو کون پڑھ سکتا
ہے! پچھلی باتوں کو درگزر فرما اور فی الحال اللہ
پہ بھروسہ اور طشتری میں رقم رکھ — کہ کاؤنٹر
کلرک ایک عرصہ سے ہماری جانب بڑی تیز
نظروں سے گھورے جا رہا ہے۔"
بس پہلا انٹلکچوئل پھرتی سے اپنی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے
لگا۔ آخر تھک ہار کر گویا ہوا —
"یارو — شاید میں دوسری رقم میں اپنی پتلون
بھول آیا ہوں۔"
"اے مرد بے خبر کہ کمال درجہ انٹلکچوئل ہے۔ اس

قدر ہمارے ساتھ ہوا اور فکر کرکے تو میں رقم ہی بچوں
آپ سب چلاتے نہیں۔" تیسرا اسمگلر بولا۔ "ذرا
میں بھی کوشش کر دیکھوں۔" اور جب اپنی جیب
میں ہاتھ ڈال دیئے —— جب تک تیسرا اسمگلر
جیب میں کچھ تلاش کرتا رہا دوسرا اسمگلر خاموش
بیٹھا پلکیں جھپکاتا رہا۔ مگر جب اس کا پیمانۂ صبر
لبریز ہو گیا تو اس نے ایک ہاتھ اٹھا دیا اور تیسرے
اسمگلر سے یوں ہمکلام ہوا۔

"اے ہم نشین و طوطی بیان نقارخانہ! تیری یہ کوشش
عبث ہے۔ وہ تیری نہیں میری جیب ہے اور
میں اپنی رقم کبھی جیب میں نہیں رکھتا۔" اس نے کہا
اور کمال خوبی سے اپنے پاجامہ سے تہہ کھولتے ہوئے
نوٹ پیسے نکال کر سب کے سامنے میز پر رکھ دیئے
اب تو تینوں ہی اسمگلر کو فکر دامن گیر ہوئی۔ تھوڑی
دیر کی سوچ بچار کے بعد پہلا اسمگلر بولا۔

"اے ایک ہی کشتی کے سوارو! اب تو ہمارا ناخدا
وہ کاؤنٹر کلرک ہے جو ہمیں اپنی لال پیلی آنکھوں سے
ہمارے پچھلے حسابات یاد دلا رہا ہے اور خمیازہ
بھرا جو بوقت حساب کسی کی نہیں سنتا — مقدر کا
لکھا اٹل اور یہ مسئلہ لاینحل ہے۔ کیوں نہ ہم اس
وقت ہی کو سراہا جائیں اور ایک دوسرے کو اپنے
حالات سنا کر جتنی عبرت لیں اتنا ہی دیں۔"
اس تجویز کو سب ہی نے پسند کیا اور اس موقع
کو غنیمت و باعث رحمت جانا —
کرنا مجبور پہلے اور دوسرے اسمگلر کا تیسرے
اسمگلر کو اپنا قصہ پہلے سنانے پر۔ اور پھر
آنکھیں کھلی دکان بند کرکے کرکا پردراز ہو جانا
و پہلے اسمگلر کا اپنا افسانہ سنایا۔

"سیر پہلے اسمگلر کی —"

عاجز —— میرا تیسرا اسمگلر کہے۔ میرا
جائے پیدائش وکٹوریہ ہسپتال و شہر بزرگوں کا
بمبئی ہے۔ والد اس آخر کا ملک میں سب سے چھوٹا
تھا آنرایبل برنس، شیخ ڈیوڈ نام بڑا سوداگر تھا۔
اس وقت میں کوئی مہاجن، بیوپاری ان کے برابر
بلیک مارکیٹر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور
گماشتے خرید برد کے واسطے مقرر تھے اور لاکھوں بیلے
نقد بلیک اور جنس جس میں جنس لطیف بھی شامل
تھی ملک ملک کے گھر میں موجود تھے۔ انہیں میں سے
ایک گورنس نام اس فقیر کی پرورش پرداخت کے
لئے موجود تھی جو میری پرورش کم اور پرداخت زیادہ
کرتی تھی —— میں اس سے گھنٹوں کہانیاں سنا کرتا
کہ اس کے کپڑوں کی تراش عاجز کو انتہائی پسند تھی
اور بھینس کے دودھ سے سخت نفرت۔ وہ انگریز
جاتی اکثر دو طوطوں کا قصہ سنایا کرتی۔ جو اٹھتے تو ساتھ
بیٹھتے بھی ساتھ — ساتھ کھیلتے اور ساتھ کودتے
حتی کہ ساتھ ہی بڑے ہوئے اور گنجے بھی ہوئے
تو ساتھ ہی — واللہ عالم —— یہ خادم بچپن
میں ایک بار بری طرح باپ کے ہاتھوں پٹ بھی
چکا ہے۔ وجہ بس اتنی تھی کہ یہ اسمگلر جس نے
یہ بال کافی ہاؤس میں سفید کئے ہیں اور جو ہر روز ہنڈول
کے حضور میں حاضر اور لوٹتا ہے، اپنے باپ کی
دوست سے حجامت کی فرمائش کر بیٹھا تھا کہ نام

جس کا بار بار آرا تھا — زندگی آیا کا اثر یہ ہوا کہ خادم تم کو تُم اور ہم کو ہام کہنے لگا۔ اس کے علاوہ مختلف بوسوں کی عادتِ قبیح ایسی پڑی کہ جب بڑا ہوا تو ایک دن وقتِ رخصت خالہ زادی سخت خفا ہوئی۔ اور ڈرایا دھمکایا — جب سرکاری طور پر بالغ ہوا تو ایک اور بری عادت اس فقیر کو پڑ گئی۔ جوئے کی عادت — ایک دن جیب میں جتنی رقم تھی ہار گیا۔ یعنی ایک سو پچاس۔"

"ایک سو پچاس! —" تیسرے انٹیلیکچوئل نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں پورے ایک سو پچاس نئے پیسے!" پہلے انٹیلیکچوئل نے اپنا سلسلہ جاری رکھا۔ "جب یہ انکشاف دیکھی تو عاجز کے باپ نے نہ صرف جیب خرچ بند کر دیا بلکہ دھکے دلوا کر گھر سے نکلوا دیا کہ اُن کے سفید خون اور دوسروں کے پسینہ کی کمائی یوں گنوا رہا ہوں۔ فقیر ناچار در بدر پیادہ دو منزل کی ایک منزل کرتا بے منزل نکل کھڑا ہوا۔ اس حادثہ کے ٹھیک آٹھویں دن یہ محسوس کیا کہ یہ حقیر انٹیلیکچوئل ہوا جا رہا ہے۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ کر جھول گئے تھے اور داڑھی اور سر کے بال دونوں ہی بڑھ آئے تھے۔ ابھی یہ خیال خام ہی تھا کہ دو ترقی پسند شاعروں سے ملاقات ہوئی۔ چائے کی پیالی کے عوض اُن کا کلام سننے پر مجبور ہوا۔ ان میں سے ایک کی شاعری سے گل و بلبل ہی کی بو آتی تھی۔ دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ضروری نہیں وہ ترقی پذیر بھی ہو۔ وہ بس ترقی پسند تھا — دوسرے کا کلام سنا — یوں محسوس ہوا جیسے بھیجہ سر سے اوپر نہ آ گیا ہو۔ پھر بھی پلے نہ پڑا۔ مگر پھر بھی تعریف کی کہ شاعر وہ ترقی یافتہ ہو۔ اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا یعنی یہ حقیر جو کفنی میلی پہنے اُن شاعروں کے سامنے بیٹھا سنتا تھا۔ شاعر بن گیا اور بے معنی بکواس سے مال و دولت کمائی۔ مگر اپنی حیثیت نہ بھولا نہ بال کٹوائے۔ نہ داڑھی بنائی۔ بلکہ جیسے کہ میں پکچریں دیکھنی بھی شروع کر دیں۔ گو یا انٹیلیکچوئل ہو گیا۔ پھر تو کوشش کر کے اپنے آپ کو مطالعہ کا راغب کیا اور ڈھیر ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ایک دن سیکس پر کسی کتاب کی تلاش تھی کہ سگمنڈ فرائڈ کی "فرائڈ اور امریکہ" ہاتھ لگی — ایک ہی سال میں پڑھ ڈالی۔ پتہ چلا کہ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا بھی سیکس میں داخل ہے۔ سخت مایوسی اور کوفت ہوئی۔ اور پھر کسی میں بھی سیکس اپیل نہ رہی — زمانے سے آرزو تھی کہ کوئی پری جمال اس فقیر پر مرے۔ وہ گھڑی بھی آئی کہ ایک حسینہ مرنے لگی مگر حسرت باقی ہی رہی —"

"اے درویشِ آوارہ گرد پتہ نہیں تو کیا بک رہا ہے۔ شاید تو قصہ سناتے سناتے بور ہو گیا ہے۔ بیک وقت دونوں باتیں کیسے ممکن ہیں۔" دوسرا انٹیلیکچوئل بولا جس کے کان سیکس اور لڑکیوں کے نام پر کھڑے ہوتے ہوئے تیسرے انٹیلیکچوئل نے صاف دیکھے تھے —

"ارے نوجوان ناتجربہ کار — کھونے کی عادت تیری غیریت میں معلوم ہوتی ہے۔" پہلا انٹیلیکچوئل بولا۔ "دراصل وہ لڑکی اندھیرے میں حسین نظر آتی تھی۔

[illegible] مختصر تعارف کرایا۔

• قصے پر شک — اس قصے کا ایک حوالہ فخر سے کیا تعلق؟ دوسرے اسمگلر نے پوچھا۔

• ہاں یار قصہ سنایا اسے لیکن سمجھ دیسے نے پہلے اسمگلر کا موڈ خراب ہو گیا۔ "ان دنوں آنے والے اگر کریش ہو رہے تھے اور میں ایسی بجت —"

• خیر، خیر — تیسرے اسمگلر نے پہلے اسمگلر کا موڈ بگڑتا دیکھ کر کہا: کیا میں بھی ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟

• ضرور پوچھو — تو کیوں اس سعادت سے محروم رہے۔"

• ایک دن کا ذکر ہے۔ تیسرا اسمگلر بولا: میں چوک سے گزر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں وہیں چوک میں ایک کھونٹے سے ایک آدمی اور ایک گدھا ساتھ ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرا شخص کہ بات تو تھا ہی عاقل بھی معلوم ہوتا تھا، اُس آدمی کے ساتھ بندھے ہوئے گدھے پر موٹی موٹی کتابیں بار کرتا جا رہا ہے — میں نے جو یہ گدھے . . . اور آدمی کے ساتھ یہ ناانصافی دیکھی تو ماجرا دریافت کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بس یہ اُس مرد جنیں نے کہا: "یہ نامراد میرا بڑا بھائی ہے۔ مگر اس کا حال اُس گدھے سے مختلف نہیں ہے جو اس کے ساتھ بندھا ہے اور جس پر منوں کتابیں بار تھا —" تو اے عزیز تیرے ساتھ یہ معاملہ نہیں معلوم ہوتا۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا اسمگلر کون تھا؟"

• ایک نہیں چار بتا سکتا ہوں: پہلا اسمگلر تھا پہلا درویش۔ دوسرا درویش۔ تیسرا درویش۔ چوتھا درویش —"

پہلے اسمگلر کے اس جواب پر تیسرے اسمگلر نے قتل وغیرہ کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بیرا سر پر پہنچ گیا کہ یہ ہوٹلوں اور چائے خانوں کے بند ہونے کا وقت تھا — اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی تھوڑی ہی دیر بعد اُن تینوں اسمگلرس کو کافی ہاؤس کے بازوؤں نے اٹھایا اور باہر سڑک پر پھینک دیا —

تو صاحبو۔ یہ قصہ یونہی ادھورا تمام ہوا — تینوں اسمگلروں نے کپڑے جھاڑے اور اپنی اپنی راہوں پر ہو لئے — سچ ہے کہ خدا بڑا مسبب الاسباب ہے —! ■■

مجید کوثر
۲۱۶ چونے کی بھٹی۔ مالے گاؤں
ناسک (مہاراشٹر)

کہاں چلی ہو لیے ہوئے تم ہواؤ مجھ کو!
پتنگ ہوں میں کٹی ہوئی مت اڑاؤ مجھ کو

میں ریزہ ریزہ بکھر چکا ہوں تو پھر لہو میں
یہ کون رہ رہ کے چیختا ہے بچاؤ مجھ کو

یہ کیسا جنگل ہے، زندگی کا جہاں پہ ہر سو
دکھائی دیتا ہے موت ہی کا پڑاؤ مجھ کو

نکل کے باہر سنہرے رنگوں میں کھو نہ جاؤں
بدن کی اندھی گپھاؤں سے مت بلاؤ مجھ کو

غبار بن کے بکھر چکا ہوں تو عکس میرا
کہاں سے جھلکے ہزار شیشے دکھاؤ مجھ کو

لمحوں کے راستے میں سبھی بھاگتے ملے
ہم تھے کہ نقش پا کی طرح چپ پڑے رہے

ہو جائے اس کو زیست کے ہر زاویے کا ہوش!
وہ آدمی جو درد کے رشتے سے جا بندھے

بے چھت سے اک مکان پہ کل جب نظر پڑی!
دیوار و در پہ خون کے دھبے ہی دھبے تھے

دن چڑھ رہا ہے اپنے دریچے کو وا نہ رکھ
آئیگی تیز دھوپ اسے کچھ تو موڑ دے

اک جسم کے کھنڈر میں تھا سویا ہوا مگر!
جاگی سحر تو آنکھ سے تارے نکل پڑے

رفیق الزماں
۶۔ رابسن اسٹریٹ
کلکتہ۔۱۶
۶۸ پیکر حیدرآباد

اکبر سکندر پوری
۱/۲۶۶ جی لیوس روڈ
جوڑہ۔۱

کاجل سی کالی رات ہے سنسان راستہ
لیے میں چل پڑا ہے امیدوں کا قافلہ
چھو کوئی ملے تو پتہ اس کا پوچھ لوں!!!
سرگوشیوں کی بھیڑ میں کل سوچتا رہا!!
تم اے برہنہ روح چلو جسم ڈھانپ لو!
کیا ہو گا تم پہ دھوپ کا سایہ جو پڑ گیا
پاگل ہوا سمیٹ کے لے آئی زندگی!!
جنگل کی سمت گھر کا دریچہ تھا ادھ کھلا
وہ کھردرے بدن کو کوئی رنگ دے گیا
میں اس کے خط و خال ہی بس دیکھتا رہا

موہنی صورت دیکھ کے ہو جاتا ہے ہر اک دل بے قابو
کون ہے جو چاہت نہ کرے گا پھولوں کی رعنائی پر
دن کو بکھرے خاک اڑاتے صحرا صحرا پھرتے ہیں
رات کو شبنم رو جاتی ہے آکے مری تنہائی پر
جس دل کو ٹھیس لگے گی وہ یہ راز بھی کھولے گا
آنکھ میں آنسو خشک ہوئے کیوں ان کی کرم فرمائی پر
اگلے دن یہ دنیا والے تم کو بھی رسوا نہ کریں
سوچ لو پہلے پھر ہنس لینا تم میری رسوائی پر
سامنے فن ہے نکھرا ہوا یا پیش نظر کچھ اور بھی ہے
آنکھیں غم و شک کرنے لگی ہیں اپنی بینائی پر

آزاد گورداسپوری
کوکاکولا پلانٹ
جمشید پور ۱۰
پیکر حیدرآباد ۹۹

گرا ہوا آدمی

نسیم مظفرپوری
ریزرو بینک آف انڈیا پبلک ڈیٹ آفس
پٹنہ-۱ (بہار)

ہوا کے نیزے اس کے نحیف جسم میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ اس نے کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے اور پتلون کی جیب ٹٹولی۔ چند سکنڈ بعد ایک مڑا تڑا چارمینار سگریٹ اس کی انگلیوں میں تھا۔ مگر ماچس کی ڈبیہ خالی تھی۔ اس نے پتلون کی دوسری جیب ٹٹولی، کوٹ کے سارے جیبوں کی تلاشی لی مگر ماچس کی دوسری ڈبیہ یا کوئی بھولی بھٹکی تیلی برآمد نہ ہو سکی۔ اور وہ مایوس ہو گیا۔ ہوا کی طرح! برفیلے جھونکوں میں بھی وہ زندہ تھا۔ اور اس کے قدم میں ڈگمگاہٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔ گرچہ برہم دیو نے اُسے تھوڑی سی دیسی شراب بھی پلا دی تھی۔ یہ برہم دیو کتنا اچھا آدمی ہے۔ تھوڑی سی سہی، پلا تو دیتا ہے۔ اور جگدیش! آخ تھو! کہاں سے یاد آ گیا کمبخت! خوشبو تک نہیں سونگھنے دیتا۔ اچھا یار ے جگدیش! تو بھی کیا یاد کرے گا۔ ایک دن تو بھی ترسے گا میری طرح — ہا — ہا — ہا۔ اُسے کھانسی آ گئی۔ کیا اُسے سگریٹ چھوڑ دینا چاہئے — ہا — سگریٹ! اس جان لیوا سردی میں سگریٹ ہی تو ایک سہارا ہے۔

"ارے او بھائی رکشا والے! ماچس ہے تیرے پاس —؟"

"لیجئے بابو —!"

"جیو میرے یار! کمال کر دیا تو نے —"

سردی بڑھ چکی ہے۔ اب اُسے جانا چاہئے۔ کہاں؟ گھر — اگھر —؟ اس کا کوئی گھر بھی ہے؟ — گھر کس کو کہتے ہیں۔ کون بتا سکتا ہے؟ منہ پیٹ کر سونے کے علاوہ گھر پر اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے! — اور سڑکوں پر —؟ سڑکوں پر کیا نہیں کیا جا سکتا؟ گھوما جا سکتا ہے، قہقہہ لگایا جا سکتا ہے، آزادی ہے!

یہ سب تو گھر پر بھی کیا جا سکتا ہے — تم چپ رہو! اُس نے کسی کو ڈانٹا۔ کون تھا وہاں — کوئی تھا کیا —؟ کیا بجا ہو گا؟ آٹھ —! آٹھ بج کر بارہ منٹ! دس بجے گھر کے دروازے پر — ساڑھے دس: باتھ روم۔ گیارہ: بستر! بہت وقت ہے۔ اسٹیشن قریب ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ پلیٹ فارم پر گاڑی مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ شاید چھوٹنے ہی والی تھی۔ بھیڑ کافی تھی۔ بک اسٹال پر مارٹن لوتھر کنگ، نہرو، کینیڈی، بھیا، آنا پارکھ اور غالب ایک صف میں کھڑے تھے۔ وہ اُن کے قریب چلا گیا۔ مارٹن لوتھر کنگ مسکرا رہا تھا۔ مسکراہٹ بڑی خفیف تھی۔ مگر تیز —! یہ مسکراہٹ طنزیہ تھی یا چیلینجنگ (CHALLENGING) قیمت ایک

محمد سعید باوزیر
ویلس ہاؤز (بی) فلیٹ نمبر ۳
شہید مدرم روڈ۔ معلا۔ عدن

نظمیں
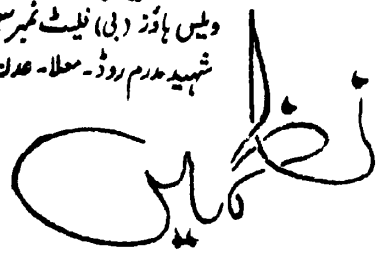
میں
تصورات کے بوتے پر تزئین کا بلڈ پریشر ناپ رہا ہوں
اور یہاں چند لوگ
اخلاق کے نصف النہار کو اشتراکیت کا پورٹریٹ سمجھ بیٹھے ہیں
جس میں میرا کوئی دوش نہیں
کہیں آتما کے ماتھے پر
قنوطیت کی سلوٹیں
عذابِ آسمانی تو نہیں
احساس کی جھلاہٹ خطاؤں کا میزان ہے
ویسے ان کے فلسفے میں
جنت اور جہنم میں صرف ٹمپریچر ہی کا تو فرق ہے

تم
اصولوں کے دامن کو موم کر کے مضراب غزنوی کہاں کھو بیٹھے
صنعتی جھاگ سے کاغذ کو طمع نہ کرو
مجھ کو ڈر ہے کئی قرطاس سلگ جائیں گے
ویسے
کیا تو بس قزح کے رنگ نچوڑ نچوڑ کے
اُن کا ایک ایک قطرہ
ان وسعتوں میں بکھیر سکو گے

۷۲ بیکر حیدرآباد

میں اکثر راہ چلتے سوچتا ہوں
میں کیا ہوں اور کیوں کر جی رہا ہوں
زمانہ آرہا ہے جا رہا ہے
مگر میں راہ میں تنہا کھڑا ہوں
تسلسل زندگی کا میرے دم سے
مگر صدیوں سے میں بکھرا پڑا ہوں
تمہارا نام جب آتا ہے لب پر
میں پتوں کی طرح سے کانپتا ہوں
کوئی آؤ مجھے باہر نکالو
میں اپنے آپ سے تنگ آچکا ہوں
نہ سایہ ہے نہ سائے کا گماں ہے
میں جلتی ریت پہ کیوں چل رہا ہوں
حصارِ جسم سے ہے مطلق دل
میں زنجیریں بہت کم توڑتا ہوں

ممی! ہماری تہذیب

وحید الحسن سی۔ ڈی اینڈ پی آر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، نہال۔ رانچی ۔ ۵

کل جب مٹی کے نیچے سے
اک ممی نکلی
بکھرے ٹکڑے ٹوٹے برتن کے
ہر اخبار میں بس ایک خبر تھی
تہذیب کی کھوئی دولت پا لینے کی ـــــ

ہم
اپنے مستقبل سے
مایوس نہیں
آنے والے تن آسان محقق کی خاطر
ہم نے
اپنے ہاتھوں
شہروں کے شہر ہیں ممی کر ڈالے
ٹوٹے برتن، کپڑوں کے ٹکڑے
چوڑی کے ریزے، بچوں کے جوتے
کشکول فقیروں کے
اور ہتھیاروں، اوزاروں کی ساری قسمیں
ہم نے جگہ جگہ ہیں محفوظ کئے
ـــــ آج سے صدیوں بعد
تاریخ کے صفحوں پر
تہذیب ہماری ابھرے گی

نسیم چمن
۲۷۔ کوٹھی روڈ، اُجین (ایم پی)

غزل

اپنا ہی جسم اب کسی دیوار سا لگے
جینے کا سلسلہ مجھے دشوار سا لگے

دنیا کے اس عظیم ڈرامے میں روبکار
مجھکو ہر ایک شخص اداکار سا لگے

اس رنگ و بو سے اسقدر اکتا گیا ہوں میں
کالر کا پھول بھی مجھے اب بار سا لگے

ان سرحدوں کے پار جو ایک مخمل قصبہ ہے
مجھکو تو میرا بچھڑا ہوا یار سا لگے

الفاظ اپنے خول سے باہر نکل پڑے
اقرار بھی ترا مجھے انکار سا لگے

ایک ایک قطرہ کر کے لہو سب بکھر چکا
سارا بدن ہی اب مجھے مسمار سا لگے

پیکر حیدرآباد ۲۷

روشن آرا نسیم
ڈاک خانہ۔ جیب پور
بھاگل پور ۲ (بہار)

راجو نے بس کے اندر ایک سرسری نگاہ دوڑائی
مسافروں میں زیادہ تر ڈیم پر کام کرنے والے مزدور
تھے۔ آگے والی سیٹ پر ایک لڑکی سرخ کپڑوں میں
ملبوس اداس بنی بیٹھی تھی۔ رہ رہ کر لڑکی کلائی پر بندھی
گھڑی دیکھتی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے کہیں پہنچنے
کی جلدی ہو۔ صورت شکل میں اچھی تھی۔ بھڑکیلے لباس
نے اُسے بہت ہی اسمارٹ بنا دیا تھا۔ لڑکی کا سیکسی
(sexy) وجود قدرتی طور پر اتنے سارے مردوں کے
لئے انتہائی لذت آمیز ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی وقعدلو
جیبوں کے بیچ اس کا جسم تسکین کا واحد ذریعہ تھا۔ راجو
کے بغل میں بیٹھا ہوا نوجوان بہت ہی بے چینی کا اظہار
کر رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں لڑکی کی پُشت پر مرکوز تھیں
نیم کھلی سڈول اور گداز پشت لوگوں کو دعوت نظارہ
دے رہی تھی۔ نوجوان سے برداشت نہ ہو سکا تو اس
نے بلند آواز میں ایک بھدا سا جملہ کہہ دیا۔ نوجوان
کے منہ سے [illegible]
پست ذہنیت کے [illegible]
اس طرح [illegible] کہ قہقہے کے [illegible] بس کا [illegible] بن کر
رہ گیا۔ لڑکی نے پلٹ کر غور [illegible]
دیکھا۔ ہوس بھری نگاہوں کی [illegible]
لڑکی کی نفرت یا غصہ کا کوئی احساس تھا۔ البتہ اتنا
ضرور ہوا کہ اس کے برجستہ جواب نے تھوڑی دیر کے
لئے کچھ لوگوں کو شرمسار کر دیا۔

راجو نے سوچا خوبصورتی کے دھوکے میں یہ لڑکی حقیقت
سے کتنی دور جا چکی ہے۔ فیشن کی دوڑ نے اُسے بالکل ننگا
کر دیا تھا۔ وہ اس قدر اندھی ہو چکی تھی کہ اپنی آنکھوں
سے اس نے حیا اور جسم سے شرافت کا لبادہ نوچ پھینکا
تھا۔ پتہ نہیں تہذیب کی اس ننگی دوڑ میں یہ دنیا
کب تک قائم رہے گی۔ اور یہ لوگ بھی کس قدر نادان
تھے کہ اپنے کردار کی خوبصورتی کو زبردستی ہوس پرستی
کا ذریعہ سمجھتے۔ واقعی عورت کی آزادی اُس
حد تک درست بھلی ہے جہاں تک وہ اخلاقی
طور پر اپنے جائز حقوق کا استعمال کرے۔
راجو نے بیزاری سے باہر کی طرف دیکھا۔ سڑک کے

۴۷ بیکر حیدرآباد

[illegible] کو اب تک [illegible] تھیں۔ کبھی کبھی جھکنے جاتا تو [illegible]
[illegible] دیکھتے اور [illegible] دیکھ جاتے۔

راجو کوئی سادھو نہیں تھا۔ آج ہی کے ماحول میں رہنے
والا ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ لیکن اسے ایسی گھٹیا
قسم کی عادتوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ لڑکی کے متعلق
سوچ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں ستام اپنی قیامت
خیز جوانی کے ساتھ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ دلکش اور
خوبصورت ستام جس سے وہ والہانہ محبت کرتا
تھا۔ ستام سے اس کی ملاقات ایک شام بڑے
ہی اتفاقیہ طور پر ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں اس
شام کی یاد آ گئی۔ وہ اپنے بچپن کے دوست کانت
کے ساتھ سندھ ہوٹل کے اندر تھا۔ سندھ ہوٹل کی
شام، شام اودھ سے کم نہیں ہوتی۔ ہوٹل میں شربت
اور لسی پینے والوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ موجود
رہتی۔ یکایک اس کے دوست نے ایک کیبن
(CABIN) کی جانب اشارہ کرکے انکشاف کیا۔
"اندر جو لڑکی بیٹھی ہے۔ اسے میں اچھی طرح جانتا
ہوں!"
راجو نے گردن موڑ کر دیکھا۔ واقعی ایک خوبصورت
لڑکی کا روپ رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ کانت کی
دوستی تو اس شہر کی بہت ساری لڑکیوں سے تھی۔
لیکن یہ لڑکی تو بالکل اجنبی تھی۔ اس نے پوچھا۔
"کون ہے یہ ظالم؟"
"اس کا نام ستام مکرجی ہے۔" کانت نے بتایا

"ٹی۔ اے۔ بی کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کے ڈیڈی
جاموں ڈیم میں انجینئر ہیں۔"
راجو نے بیرے کو شربت کا آرڈر دے دیا۔ اب اس کی
دلچسپی کسی قدر بڑھ گئی تھی۔ وہ کیبن کی جانب دیکھنے
لگا۔ اس وقت وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ اس
کے دودھ جیسے سفید دانت چمک رہے تھے۔ ہلکے
گلابی چست سوٹ اور سڈول شانوں پر جھومتی سیاہ
بالوں کے بیچ جیسے بجلی کا کوندا تھی۔
"وہ آرین بابو سے میری بہت پرانی ملاقات ہے۔ وہ
برابر میرے اسٹینڈ پر آتے ہیں۔" کانت نے چابی
سے گلاس پر جلترنگ کی آواز پیدا کرکے کافی
اطمینان سے کہا۔ شاید وہ راجو پر اپنے حلقے کا اثر
ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ بولا۔ "اگر چاہو تو میں تمہیں ان
سے ملوا دوں؟"
"کانت دا۔" بہرحال راجو اس کی باتوں سے
زیر ہو ہی گیا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں چمک لا
کر کافی خلیق لہجے میں بولا۔ "ایسا کر سکتے ہو تو کر دو۔
شاید میرے لئے کوئی راہ نکل آئے۔"
بیرا شربت رکھ گیا تھا۔ شربت پینے کے بعد راجو
جلدی سے کانت کے پیچھے ہو لیا۔ کانت اسے اپنے
پیچھے آنے کا اشارہ کرکے کیبن کی طرف جا رہا تھا۔
کانت کو دیکھتے ہی آرین بابو مسکرا پڑے۔ لیکن ستام
مسکرائی بھی نہیں۔ عجیب بات تھی، راجو نے سوچا
ہو گی یونہی سی ملاقات۔ آرین بابو نے بڑے ہی
تپاک سے کہا۔ "ارے کانت۔ آؤ بھئی۔ بہت
دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔" ادھیڑ عمر کے آرین

بابو کی آنکھوں میں مرعوب کرنے والی چمک تھی اور
ہونٹوں پر نہایت ہی پرخلوص مسکراہٹ۔
"میں تو یہاں مستقل رہتا ہوں۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے
کانت نے کہا: "پہلے آپ سے ایک عرصے کے بعد
ملاقات ہو رہی ہے۔"
"تم تو جانتے ہو کہ ٹریم سے بھاگل پور آنے میں کتنی
پریشانی ہوتی ہے۔ آج سنتام کے فلم دیکھنے کی ضد
نے مجبور کر دیا۔" وہ سگریٹ بڑھا کر بولے: "سگریٹ
لو ــــ"
کانت نے سگریٹ سلگائی۔ راجو نے دیکھا سنتام
اپنے تذکرے پر قدرے شرما گئی تھی۔
"آپ بھی سگریٹ لیجئے۔" آنرین بابو نے سگریٹ
بڑھاتے ہوئے پوچھا: "یہ کون ہیں کانت؟"
"یہ میرے بچپن کے دوست راجیشور ہیں۔" کانت
نے کہا۔ "دو سال پہلے بی۔ ایس۔ سی آنرز کیا ہے۔
لیکن اب تک بیکار ہیں۔ آپ کے یہاں کوئی مناسب
جگہ مل جاتی تو بڑی مہربانی ہوتی!"
"نمستے۔" راجو نے بڑے ہی ادب سے کہا۔
"نمستے۔" وہ بہت ہی خلوص سے بولے: "آپ سے
مل کر بہت خوشی ہوئی راجیشور بابو۔ لیکن ابھی وعدہ
نہیں۔ ہاں کوشش پوری کروں گا۔"
"آپ کی مہربانی۔" راجو نے کہا: "تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو جائے
گا ــــ!"
سنتام بڑے غور سے راجو کو دیکھ رہی تھی۔ جو واقعی
اپنے لباس میں غربت کا اشتہار تھا۔ معمولی کھدر کے
کرتا اور پاجامے میں ملبوس راجو کافی پریشان حال

کہہ رہا تھا تعلیم کے بعد [illegible]
[illegible] صورت [illegible]
اس کی حالت بے روزگار تھا۔ کانت بات
بنانے میں بہت ہی تیز تھا۔ سیاست سے لے کر
بے روزگاری تک کی گفتگو اس نے اس خوبصورت
ڈھنگ سے کی کہ آنرین بابو قائل ہو گئے۔ انہوں نے
شربت کا آرڈر دینا چاہا۔ لیکن کانت نے معذرت
مانگ لی۔ تھوڑی دیر کے بعد آنرین بابو سے کہا "صاحب
اجازت دیجئے۔"
اور وہ ان لوگوں سے اجازت لے کر جیپ میں بیٹھ
گئے۔ جیپ تھوڑی دور گئی اور پھر رک گئی۔ ڈرائیور
لپکتا ہوا ان دونوں کے پاس آکر راجو سے بولا ــــ
"صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔"
راجو کا دل انجانی امید سے دھڑک اٹھا۔ وہ تیزی
سے جیپ کے پاس گیا ــ "راجو بابو۔ یہ میری لڑکی
سنتام ہے۔ اور ٹی این بی کالج میں پری سائنس
میں پڑھتی ہے۔" آنرین بابو نے کہا: "مجھے ایک اچھے
ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ آپ بیکار ہیں۔ کیوں نہ آپ
ہمارے یہاں آجائیں۔ جو بھی آپ کہیں گے میں پے
کر دوں گا۔"
اچانک اس پیشکش سے راجو نروس سا ہو گیا۔ لیکن
جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا کر وہ بولا: "اس سے
بڑھ کر میری خوش قسمتی کیا ہوگی۔ آپ کی خدمت
کا موقع بھی ملا۔ جب سے حکم دیں میں آجاؤں۔"
"اسی ہفتے آجائیے۔"
"میں کل شام ہی کے بس سے آجاؤں گا۔"

[illegible] سا گیا۔ کچھ دیر
[illegible] مڑ کے اس جانب کی طرف ہوا۔ آئرین
بابا اس سے ہاتھ ملا کر چلے گئے۔ وہ دیر تک شاہراہ
پہاڑ کی طرف جاتی ہوئی جیپ کو دیکھتا رہا۔ وہ ایک
غریب خاندان کا لڑکا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے
بی۔ ایس۔ سی کا آخر کیا تھا۔ نوکری نہ ملنے کی وجہ سے
وہ ٹیوشن کر کے اپنا اور بوڑھی ماں کی پرورش کر رہا تھا
کانت اس کے بچپن کا دوست تھا۔ زیادہ تعلیم حاصل
نہ کر کے اس نے شہر میں فوٹوگرافی کی ایک دکان کھول
لی تھی۔ اس نے ہر موقع پر راجو کی مدد کی تھی۔ اور
آج بھی اس کی بدولت آئرین بابا کے یہاں اس کا ٹھکانہ
ہو گیا تھا۔ کانت کو جب اس نے یہ خوش خبری سنائی تو
جانے کیوں اس نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ راجو نے
یہ صاف محسوس کیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح خوش نہیں ہوا تھا
کیوں نہیں ہوا تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ راجو کی سمجھ
میں نہیں آ سکی۔

دوسرے ہی روز راجو وعدے کے مطابق پہنچ گیا تھا
ڈیم سے ملحق ایک چھوٹی سی کالونی تھی۔ جس میں آئرین
بابو رہتے تھے۔ پہاڑ کے نیچے چاندنی ندی دور تک
بل کھاتی چلی گئی تھی۔ نیلگوں آسمان کے نیچے [illegible]
خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا۔ بڑے بڑے
پہاڑ ندی کی پتلی لمبی سی پرت بچھا دی گئی ہو۔ منظر کافی دلکش
تھا۔ شہر کی نسبتاً بہت ہی صاف جگہ تھی۔ وہ بس
سے اتر کر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ جیپ کے ہارن پر
اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سفید ساڑی اور بلاؤز میں
ملبوس ستنام جیپ میں آگے بیٹھی ہوئی تھی جیپ
قریب آ کر تو وہ بچہ اتر کر بولا: "نمستے۔ ڈیڈی نے
آپ کو ریسیو کرنے بھیجا ہے۔"
وہ جواب دینے کے بجائے سُن کھڑا تھا۔ ستنام کی
[illegible] اور اس کی سادگی نے پھر [illegible]
میں وہ کھو گیا تھا۔ [illegible] سے [illegible] رہا
ہوا اور وہ ....
"پہاڑ تلی ـــ!"
راجو اپنے خیال سے چونک گیا۔ بس رک گئی تھی۔
یہ سارا منظر جو اس کا حسین ماضی تھا۔ اور اس کی یادیں
جو بہت حد تک حقیقت کا رنگ لے چکی تھیں۔ اور
جسے یاد کر کے وہ واقعی بے حد مسرور ہوتا تھا۔
سامنے کھڑی والی لڑکی ہینڈ بیگ لئے اس کے قریب آ
کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ وہ راجو
کے بغل والے نوجوان کو کھا جانے والی نگاہوں سے
دیکھ رہی تھی۔ سارے مسافر موجود تھے۔ لڑکی نے
حقارت سے کہا: "حرامی ـــ تیری ماں بہن نہیں جو
دوسرے پر جملہ کستا ہے۔"
نوجوان کا چہرہ لڑکی کی جرأت سے پھیکا پڑ چکا تھا۔ وہ
شرم اور خوف کے ملے جلے احساس سے نگاہیں نیچے
کئے ہوئے تھا۔
لڑکی تیزی سے نیچے اتر گئی۔ اس کے اترتے ہی ایک
زوردار قہقہہ پڑا۔ نوجوان بری طرح جھینپ گیا۔ لڑکی
نے جس انداز سے اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا۔ بالکل
ڈرامائی انداز تھا۔ راجو نے باہر دیکھا۔ لڑکی تیز تیز
قدم اٹھاتی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ اور پھر لڑکی کا چہرہ
یاد کر کے اسے جھرجھری آ گئی۔ اُف ـ کس قدر بھیانک
بقیہ حیدرآباد سے

چہرہ تھا اس کا۔ کتنی درندگی تھی اس کی آنکھوں میں
عورت ایک پہیلی ہی تو ہے۔ اس نے سوچا۔ ستنام
بھی تو ایک پہیلی تھی جو اتنے عرصے کے بعد بھی اس
کی سمجھ میں آ نہیں سکی تھی۔ عورت کے پیار، غصے اور
نفرت میں کیا فاصلہ ہے۔

راجو کو ثریا بابو کے یہاں سبھی لوگ پسند تھے
لوگوں کے اخلاق نے اس پر کافی اثر ڈالا تھا۔
اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں۔ وہ اونچے خیال کی
ایک مذہبی عورت تھیں۔ پوجا پاٹ اور لوگوں سے اچھی
باتیں کر کے انہیں بے حد تسکین ہوتی تھی۔ ستنام نے تو
اسے اتنا اور مان دیا تھا کہ بلاشبہ وہ اپنے آپ کو
بہت ہی خوش قسمت انسان سمجھنے لگا تھا۔ لیکن اس گھر
میں اسے کسی سے نفرت ہوئی تھی تو وہ بھوانی تھا۔ دن
رات اپنی سیاہ بلی کو گود میں بٹھائے وہ دھندلی آنکھوں
سے سبھوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت
ہی خطرناک چمک ہوتی تھی۔ بڑے بڑے بالوں نے اس
کا حلیہ آدم خور انسان کی طرح بنا دیا تھا۔ اسے بھوانی
سے شدید نفرت اس لئے تھی کہ وہ ستنام کا احترام
نہیں کرتا تھا۔ بھوانی نے جب کبھی ستنام سے الٹ
پلٹ کہا تو نتیجتاً وہ اسے بری طرح پیٹ کر رکھ دیتی تھی
اس کے برعکس بھوانی کو نہ تو اس کا افسوس ہوتا تھا
اور نہ غم۔ مار کھاتے وقت وہ اپنے لمبے لمبے دانت
نکال کر بڑی بے حیائی سے ہنسا کرتا تھا۔ ایسے موقع
پر راجو نے ستنام کی مدد کرنا چاہی تو وہ اس کا
ہاتھ پکڑے ندی کے کنارے آتی اور پتھر پر بیٹھ کر
خوبصورت پنڈلیوں کو پانی میں ڈالے بچے کی طرح

۸۷ بیکر حیدرآباد

[illegible] رہتی تھی۔
راجو نے کئی ایک بار بھوانی کے متعلق پوچھنا چاہا لیکن
ہر بار وہ بہت ہی خوبصورتی سے اس کے سوال کو ٹال
گئی تھی۔ اور اس وقت وہ راجو کو جیسے لگتی تھی، اس کی
مترنم آواز میں اسے کالا اسرار لگی تھی۔ وہ کوئی چھوکر
تھا نہیں کہ ستنام کے تمام جلنے کا مقصد نہیں
سمجھتا۔ ستنام اکثر بھوانی سے لڑ کر بہت غصے میں آتی
اور اپنے غصے کا ثبوت وہ خود کو اذیت دے کر دیتی
تھی۔ یا اپنے بے زبان کتے کو مار پیٹ کر۔ بے زبان
جانور کے ساتھ خود کو اذیت دے کر کیا سکون ملتی
کرتی تھی۔ راجو کو اس کی اس حرکت سے بے حد حیرت
ہوتی تھی۔ عجیب فطرت کی لڑکی تھی۔ جسم پر زخم پیدا
کرنا اور اسے زور زور سے دبا کر آہیں بھرنے میں اسے
لذت ملتی تھی۔ ایک بار اس نے اپنے پالتو کتے کو ایسی
بری طرح مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اور معصوم بے زبان
جانور نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ آہ کس قدر
خوفناک منظر تھا۔ بہتا خون دیکھ کر جیسے ستنام کو
سکون مل گیا تھا۔ راجو کو ایک بے زبان کی موت
پر بے حد غصہ آیا تھا۔ مگر اسے اس کے اظہار کا
موقع نہیں مل سکا۔ بڑھ کر اس نے اپنے ہاتھوں پر
ستنام کو روکا نہیں ہوتا تو وہ بے ہوش ہو کر گر ہی
گئی ہوتی۔ ہوش میں آنے پر راجو نے اسے کتے
پر ظلم ڈھانے کا احساس دلایا تو وہ اس کے سینے
میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی تھی۔ راجو نے
پھر کبھی اس سے بھوانی کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ وہ ستنام
کی اس حرکت کو نفرت کی شدید وجہ سمجھتا تھا۔ انسان

[illegible] ہونے لگے تو اس میں نفسیاتی
[illegible] سے اس کو فردیت کے خطرہ ہو گئی
پیدا ہونے کا انجام اکثر خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ
فوراً بعد حساس ہوتی ہے۔ اور اپنے خیالات
کا اظہار نہ ہونے سے وہ نفسیاتی مریض بن جاتی ہے اور
انجام کے طور پر اس سے بہت سی ناقابل یقین حرکتیں
سرزد ہونے لگتی ہیں۔ راجو کی نگاہوں میں ستام بھی
ایک معمہ تھی۔ جو بھوانی سے شدید نفرت کی وجہ سے
اپنے آپ میں الجھ گئی تھی۔

راجو کی نفرت بھوانی سے دن بہ دن بڑھتی گئی۔ آخر
وہ کیسے برداشت کر لیتا۔ ستام کی حسین آنکھوں میں
اُسے اپنے خواب کی تعبیر نظر آنے لگی تھی۔ اس کی معصوم
مسکراہٹ میں وہ سارے جہاں کی مستی محسوس کرتا تھا
اور جب کبھی وہ اس کے پاس ہوتی اور اس کے مرمریں
صاف شفاف بدن سے خوشبو کی لپٹیں اس کے نتھنوں
میں داخل ہوتیں تو چاندن ندی کی اتھل پتھل ہو جانے کی
طرح اس کے جذبات بھی مخل ہو جاتے تھے۔ اس
کے دل کی بنجر زمین پر پھول کا ایک پودا خود بخود اگ
آیا تھا۔ جس میں خوشبودار پھول کھل چکا تھا۔ اور
اس کی خوشبو سے وہ دن رات مست رہتا تھا۔ لیکن
بھوانی — وہ کون تھا۔ اس سے ستام کے گھر والوں
کا کیا تعلق تھا۔؟ راجو کو کبھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس
لئے کہ بھوانی کی قدر ٹھاکراں بھی کرتی تھیں۔ اور اُسے
اگر اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی تو اس مقام پر پھر
بھی راجو کو اس کی ذات سے کوئی خوف نہیں تھا۔
بھوانی کی بدصورتی سے اُسے گونا گوں اطمینان تھا۔
وہ ستام کی آنکھوں میں اپنے لئے چمک دیکھنا
چاہتا تھا۔ دل کے اندر کھلے پھول کی شادابی
کے لئے صرف اس کی مسکراہٹ کی ضرورت تھی۔

ڈیم —

کنڈکٹر کی آواز نے اُسے دوبارہ چونکا دیا۔ اور
وہ خود بخود مسکرا پڑا۔ ستام کا پیار اس پر نشے
کی طرح چھا گیا تھا۔ دن رات وہ اس کے متعلق سوچتا
رہتا تھا۔ اور اس نے اب مکمل ارادہ کر لیا تھا کہ
اس بار ستام سے پوچھ کر اپنی ماں کو آتریں بابو کے
یہاں بھیجے گا۔ اُسے کبھی اتنی ہمت نہیں ہوتی لیکن
ایک بار ٹھاکراں نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ راجو
تو میری ستام سے بیاہ کرے گا۔ تو جواب دینے کے
بجائے وہ شرما گیا تھا۔ ٹھاکراں کی باتوں ہی نے اُسے
اتنا سہارا دیا تھا۔

سورج پہاڑی کی پشت پر جا پہنچا تھا۔ آسمان جیسے
نسوانی حسینہ کا عارض ہو گیا تھا۔ چاندن ندی کا پانی
خون کی طرح بہہ رہا تھا۔ بل کھاتے راستے سے وہ
نیچے اتر رہا تھا۔ دل میں میٹھی میٹھی کسک تھی۔ آج
ایک ہفتے کے بعد وہ گھر سے لوٹا تھا۔ اور یہ ایک ہفتہ
اس کے لئے طویل مدت ہو گئی تھی۔ ستام سے دور
ہو کر اس کے پیار کی پیاس اور بھی تیز ہو گئی تھی۔
گویا اس کے تیز تپتے جذبات کے لئے وہ ٹھنڈے
پانی کا آبشار تھا۔ کپاؤنڈ میں جب وہ داخل ہوا تو
عجیب قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گیراج میں جیپ
نہیں تھی۔ شاید سب باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ

چاروں جانب دیکھتا رہا۔ اور اُسے ستنام کی غیر موجودگی کا پورا یقین ہو گیا تو وہ تیکھے قدموں سے اپنی کوٹھری کا قفل کھولنے لگا۔ خلافِ معمول سامنے کوارٹر میں بھوانی کا دروازہ بند دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی۔ بھوانی جو اپنے مندر سے کبھی ایک پل کے لئے نہیں جاتا تھا۔ آخر آج وہ کہاں گیا۔؟ وہ ابھی حیرت سے دوچار تھا کہ روشن دان سے بھوانی کی بلی دھم سے کود ی۔ وہ چونک پڑا۔ بلی پر نظر پڑتے ہی اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ بلی کے منھ میں ایک خون آلود کپڑا تھا۔ اور وہ دم ہلا ہلا کر سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ راجو جلدی سے بھوانی کی کوٹھری کے قریب گیا۔ دروازے پر قفل نہیں تھا۔ اس کے معنی وہ اندر تھا۔ کسی کے کراہنے پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ یقیناً یہ آواز اندر سے آئی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت ہی خوفناک شبہ پیدا ہوا۔ اور وہ بے چینی سے اندر کا حال جاننے کے لئے سوراخ تلاش کرنے لگا۔ کھڑکی کی دراڑ سے روشنی کی ایک کمزور کرن باہر نکل رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی بے تاب آنکھیں ہٹا دیں۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی اُسے زور کا جھٹکا لگا۔ ستنام بھوانی کی لانبی لانبی زلفیں سارے جسم پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے سفید جسم کے بعض حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ آنکھیں درندے کی طرح دہک رہی تھیں۔ ہاتھ میں کوڑا تھا اور وہ مادر زاد ننگے بھوانی کے جسم کو دیکھ رہی تھی۔ جو زمین پر لیٹا اپنے ہی جسم کے بہتے خون کو چاٹ رہا تھا۔ راجو نے سوچا۔ ستنام کے کوڑے نے اس کے جسم کو لہولہان کیا ہے یا بھوانی کے خوفناک دانتوں نے ستنام کے جسم کو نوچا ہے؟ یہ تو قدیم ہندوستان کی کسی زہریلی لڑکی کا روپ ہے۔ اس کی مثال ٹھیک اس زہریلے بچھو کی طرح ہے جو اپنے اندر کیڑے دبوچ کر خون کا آخری قطرہ پی لیتا ہے۔ اور اس کا سر چکرانے لگا۔ بھوانی اور ستنام کو ایسی حالت میں دیکھ کر اس کے دل و دماغ کو شدید صدمہ پہنچا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بھوانی کی بلی دھیرے دھیرے راجو کے قریب گئی۔ خون آلود کپڑا چھوڑ کر اس نے سرخ آنکھوں سے چاروں جانب دیکھا۔ اور دُم اینٹھ کر زور سے میاؤں بولی۔ پھر وہ راجو کا منہ چاٹنے لگی۔ ■■

برسات کی ایک رات

پانی بڑے زور سے برس رہا ہے . . .

بادل گرج رہے ہیں۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی ہے ۔ سامنے کے درخت غیر ارادی طور سے اپنے بھیگے ہاتھ ہلاتے ہوئے ڈر رہے جا رہے ہیں۔ میں چادر اوڑھے بیٹھا ہوں۔ کمرہ نہ صرف سرد ہے ، تاریک ہے ، بلکہ سنسان بھی ہے۔ سامنے سیاہ چھت کے کنگوروں سے گرنے والی بوندوں میں نکھار آگیا ہے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ جب بجلی کڑکتی ہے تو ناریل کے پتے چمک اٹھتے ہیں۔ سنتے ہیں کہ کوئی کائیں کرے تو بارش رک جاتی ہے۔ لیکن اس وقت نہ تو بارش ہی بند ہونے کو آتی ہے اور نہ کوئی کوا کائیں کائیں کرتا ہے ۔

سوچتا ہوں ، چراغ جلا کر کمرہ کو دیکھوں۔ لیکن پھر یہ خواہش کی طرح یہ بھی کسی اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے۔ میں کنوئیں کے پانی میں چھپے ہوئے کسی کچھوے کی طرح چھت کے کنگوروں کو تک رہا ہوں ۔

سامنے والے گھر میں کسی نے دیا جلایا۔ دھیمی روشنی میں بارش کی بوندیں اور دھندلا گئیں۔ کوئی ادھر سے ادھر چلتا ہوا سامنے والے مکان کی کھڑکی میں آیا اور ساتھ ہی کچھ آوازیں بھی ابھریں ___

ایک بھاری آواز سنائی دی ، جو مانوس تھی۔ پھر ایک باریک آواز ، جو بھاری آواز کی جیون ساتھی تھی ، اور پھر ایک شہنائی جیسی مدھر آواز . . . . نہ جانے یہ کون تھی ؟

گھر کے سامنے والے راستے پر ایک بیل گاڑی کی گھڑ گھڑ سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر گاڑی کو دیکھا۔ پانی سے سارا شرابور ، ٹھٹھرا ہوا ، اندر گاڑی والا چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ بھیگی ہوئی زمین پر بیلوں کے پیر چھپا چھپ پڑ رہے تھے۔

پی۔ پدما راجو
ترجمہ: صفدر حسین

پارس پبلیکیشنز
گھوڑے کی قبر۔ حیدر آباد
۸۲ بیگم حیدر آباد

[illegible]
[illegible] کی چھت کے کونے سے [illegible]
دیا تھا۔

بھاری آواز نے پکارا: "اے گاڑی والے!
گاڑی رک گئی۔ اندر سے آواز آئی — "ہاں
بابو...."

بھاری آواز نے کہا: "جگنا تھ پورم چلو گے؟"
"جگنا تھ پورم؟" گاڑی والے نے دُہرایا۔
"ہاں۔"
"نہیں بابو، نہیں۔"
"کیوں بھئی؟ منہ مانگا کرایہ دوں گا۔"
"نہیں بابو، چاہے جتنا کرایہ دو، اس بارش
اور آندھی میں جگنا تھ پورم کون جائے گا!"
"سنو، سنو۔"
لیکن گاڑی دھڑ دھڑ کرتی گلی سے گزر گئی۔
بھاری آواز نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر اندر جا
کر دروازہ بند کر لیا۔
"کیسے جاؤ گی اس بارش میں؟ کوئی گاڑی والا بھی
تو تیار نہیں ہوتا۔"
شہنائی جیسی مدھر آواز نے جواب دیا۔ "لیکن
مجھے جانا ہے۔"
"پھر جاؤ گی کیسے....؟"
"میرا جانا ضروری ہے۔ اگر میں نہ جا سکی....
تو.... تو...."
باریک آواز نے سمجھایا: "میں اس طرف کونے میں
تمہارے لئے بستر لگوا دیتی ہوں۔ رات کی رات یہیں

[illegible]
شہنائی نے کہا: "نہیں.... نہیں...."
"میں دوسری میں بستر کر دوں گی۔" باریک آواز
نے کہا۔
بھاری آواز نے کہا، دوسری کی چھت تو ٹپکتی ہے
وہ بدمعاش عورت ہر مہینہ کرایہ برابر لیتی ہے
مگر مکان کی ٹھیک طرح مرمت بھی نہیں کرواتی۔
"پھر کیا ہو گا؟"
"کیا ہو گا؟"
اور بارش نے تو رکنے کا نام نہیں لیا۔
پھر ذرا سی دیر بعد مجھے اپنے گھر کے باہر کچے چبوترے
پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ "ہے بھگوان، اس
وقت کون یہاں آ رہا ہے!"
کسی مرد نے غرّا کر کہا: "ارے سنبھل کر۔"
کسی عورت نے جواب دیا: "نہیں، نہیں، میں
گری نہیں۔ بس یہ جگہ ٹھیک ہے، آؤ...."
مرد کی غراتی اور عورت کی چہکتی، دونوں آوازیں
قریب ہو گئیں۔ پتہ لگا کر دونوں چبوترے کے سائبان
کے نیچے کھڑے ہیں۔
"بچہ سو گیا؟"
"ہاں، سو گیا۔"
"گھر میں اندھیرا ہے۔ شاید کوئی نہیں۔"
چہچہاتی آواز نے کہا: "ہمیں کیا کرنا ہے؟ نہ ہو
کوئی۔"
"بچے کو ایک طرف سُلا دو۔"
"ہونہہ، سُلاتی ہوں۔"

مرد نے دانت بھیں کر بارش کو گالی دی، "جانے کب ختم ہوگی! ہم جیسے بھکاریوں کا تو خاتمہ ہی ہو جائے گا۔"

"آج مسافر خانے میں نہیں جاسکتے۔"

"نہ سہی، رات کی رات یہیں پڑے رہیں گے۔"

غرّائی آواز نے ایک لمبی سانس لی۔

ادھر بارش کے شور کو چیرتی ہوئی شہنائی جیسی مدھر آواز نے کہا: "افوہ، میں تو یہاں آکر پھنس گئی! . . ."

نہ جانے کہاں سے ایک کوّا الگنی پر آکر پھڑپھڑانے لگا —

جھجھاتی آواز نے گھبرا کر کہا۔ "کیسی آواز ہے؟"

غرّائی آواز نے کہا، "کوّا ہے۔"

"کیا کوّوں کو بھی سردی لگتی ہے؟"

"ارے کوّے کو اگر اتنی سردی لگتی تو وہ مر ہی جاتا"

جھجھاتی آواز چیخنے لگی۔ "ارے، ارے، یہ کیا کر رہے ہو؟"

غرّائی آواز نے ہنستے ہوئے کہا، "پھر سردی کیسے دور ہوگی؟"

میں نے جھرجھری لی اور اپنی چادر ٹھیک کی۔

نہ جانے کس طرف سے بارش کی بوندوں کی ٹپاٹپ اب سرتال ہی سنائی دینے لگی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

پھر غرّائی آواز نے ایک اطمینان کی سانس لی۔

"بھوک تو نہیں لگی تجھے؟"

جھجھاتی آواز ہنسی، "نہیں۔"

"اچھا؟"

"نہیں۔"

"اس موٹی بھنگی عورت نے تھوڑا سا کھانا دیا تھا مجھے —"

"لے، یہ پرانے کپڑے۔ بچے کو اڑھا دے۔"

"سنو۔"

"ہونہہ۔"

"آج بابو نے مجھے ایک بڑی چادر دی۔"

"بڑی چادر دی؟ کس بابو نے؟"

"وہی جو اونچے بنگلے میں رہتا ہے۔ عینک والا۔"

"عینک والے بابو نے دی؟"

"ہاں!"

غرّائی آواز نے ایک لمبی سانس لی۔ "ہونہہ۔"

"کیا بات ہے؟" جھجھاتی آواز نے کہا۔

"کیوں لی تو نے اس بابو سے چادر؟ طالب علموں سے کچھ نہیں لینا چاہئے۔"

جھجھاتی آواز چپ رہی۔

"تو بابو کو کتنے دنوں سے جانتی ہے؟"

"چلو، تم بڑے شکی ہو!"

"کیا؟"

"اور کیا، جب بھی کوئی میری طرف دیکھتا ہے تمہیں غصہ آجاتا ہے۔"

"تو نہیں جانتی، پاگل!"

"کیا نہیں جانتی؟"

"مجھے غصہ کیوں آتا ہے۔"

"میں سب جانتی ہوں۔"

۴۸ بیکر حیدرآباد

[illegible] کر کے بیٹھے ہیں [illegible]
کی ضرورت ہے۔ خوابی آواز والا کہہ رہا تھا کہ
ہوا۔ پھوار! پتہ ہے، مجھے بھی کبھی زیادہ ہی
ہے؟"
بھاری آواز نے پوچھا: "کیا اس لئے؟"
"ہاں۔"
"بڑی سردی ہے۔"
"ہونہہ، بہت!"

اُدھر سامنے والے مکان کی بھاری آواز نے کہا: "تم دونوں کمرے میں سو جاؤ۔ میں باہر سو جاؤں گا۔"
باریک آواز نے پوچھا: "باہر کہاں؟"
"ارے دروازے کے پاس۔"
شہنائی جیسی آواز نے ایک ٹھنڈی سانس لی —
"اوہو، میں کیسے یہاں آکر پھنس گئی!"
بارش پھر تیز ہو گئی۔
ادھر دونوں ہنس رہے تھے۔ ہنستے ہنستے ایکدم چپ ہو گئے۔
بھاری آواز نے کہا: "اس طرف پانی کے جھونکے آ رہے ہیں۔"
خوابی آواز نے کہا: "تو چلو، اس طرف مڑ کر بیٹھیں ادھر کرسیاں ہیں، وہاں تک پانی کے جھونکے نہیں آئیں گے۔"
"ہاں چلو۔"
"اب ٹھیک ہے!"
"ہاں، پیٹ بھرا ہو تو سردی بھی نہیں لگتی۔"

مزدور اس نے اپنا گلا رندھا ہوا محسوس کیا۔
خود مجھے بھی بڑی دیر سے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی بڑی کا بل پے کیا۔ چھتری لے کر دوکان سے اٹھا۔ باہر ہوتے ہوئے پایا کہ خوابی آواز نے دھیرے سے کہا: "بابو جی گھر پڑی ہیں۔"
میں نے دروازے پر تالا لگایا۔ چھتری کھولی اور سڑک پر آ گیا۔

سارا راستہ کیچڑ سے بٹا پڑا تھا۔ میرے سنبھل سنبھل کر چلنے کی وجہ میرے ہاتھوں میں چھتری ڈگمگا رہی تھی۔
ایک گھر کے ادھ کھلے دروازے سے سلائی کی مشین کی آواز گھر گھر سنائی دے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بارش اور سلائی کی مشین ایک ہی سُر میں بجا رہے ہیں۔ دو آدمی تولیے، اوڑھے بھیگے جوتوں سے میرے پاس سے گزرے اور میں گرتا گرتا بچا۔
ہوٹل کے دروازے پر پہنچ کر میں نے چھتری بند کر دی۔ میرے پیروں سے سارا فرش بھیگ گیا۔ بجلی کے بلب کے چاروں طرف پتنگے چکر لگا رہے تھے۔ میں ایک میز کے پاس جا بیٹھا۔ پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنے ساتھی سے پوچھا: "کیا آپ کی بیوی اب نہیں آئی؟"
"ارے بھائی، بیوی آجاتی تو اس وقت ہوٹل کا کھانا کیوں قسمت میں لکھا ہوتا۔؟"
"اب تو موسم بدل گیا ہے، ہوا کو کھلنے کو۔"

اور دونوں ہنسنے لگے۔

سامنے کی قطار میں دو طالب علم کھانا کھا رہے تھے۔ ایک کچھ سوال کر رہا تھا۔ دوسرا کھانا کھاتا ہوا 'ہونہہ ہونہہ' کرتا جا رہا تھا۔ پھر کھانا ختم کرتے ہوئے پہلے نے کہا۔ "اپنے راج میں تو سب پانی ہی پانی ہے۔ رات کیسے گزارو گے؟"

دوسرے نے کہا: "کیسے گزاریں گے؟ سکنڈ شو دیکھیں گے۔"

"سکنڈ شو... اچھا... کون سا کھیل چل رہا ہے؟"

"کوئی اچھا سا کھیل ہے۔"

"نام یاد نہیں۔"

"نہیں، کوئی ٹارزن کی فلم ہے۔"

میں نے جلدی جلدی اپنا کھانا ختم کیا۔ طالب علم بھی میرے ساتھ اٹھ گئے۔ میں نل کے پاس ہاتھ دھو رہا تھا۔ طالب علموں میں سے ایک نے کہا۔ "میں تو تنگ آ گیا ہوں ہوٹل کے کھانے سے۔ طبیعت اکتا گئی ہے۔ اس بار تو دسہرے پر گھر جانا ہی ہوگا۔"

"ضرور جانا ہوگا، بھائی میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

میرا پیٹ ہوٹل کے خراب کھانے سے بھرا نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اطمینان کی سانس لی۔ شاید چیپلے دہی نے پیٹ میں پہنچ کر کچھ سردی کم کر دی تھی۔ کھانے کے بعد ہمیشہ جس سڑک سے میں واپس لوٹا کرتا تھا، اسی سے لوٹنے لگا۔

تحصیل کی گھڑی نے آٹھ کے گھنٹے بجائے تو ایسا لگا جیسے یہ آواز اس دنیا سے نہیں کسی دوسری دنیا سے آ رہی ہے۔

میں نے کیچڑ سے بچنے کے لئے ایک طرف ہٹنا چاہا تو وہاں کچھ بکریاں بار بار گر پڑ رہی تھیں۔ ادھر سے بچنا چاہا تو سامنے صرف ایک آنکھ والی، ایک کار آتی دکھائی دی جو اپنے گندے پہیوں سے کیچڑ اچھال اچھال کر آس پاس کے لوگوں کو اور گندہ کر رہی تھی۔ میں لپک کر ایک گھر کی سیڑھی پر چڑھ گیا۔ پھر بھی کار اپنی شرارت کرنے سے رکی نہیں۔ چھت سے گرنے والا پانی اس زور سے چھتری پر گرا کہ میں اور چھتری دونوں پھسل گئے۔ میں نے آگے نکلا ہوا ٹاٹ کا ایک حصہ پکڑ لیا۔ کار کے چلتے ہی سڑک پر پھر سے اندھیرا ہو گیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے کرتے کی جیب سے سگریٹ نکال کر جلایا۔ سگریٹ کے دو تین کشوں نے جسم میں گرمی کا نیا احساس پیدا کر دیا۔ برسات اور سگریٹ میں شاید کوئی رشتہ ہے۔ میرے ہر کش پر سگریٹ کا بھبھو کسی نیا [illegible] کی طرح سرخ ہو جاتا تھا۔ اس موسلا دھار بارش میں بھی رات کے آٹھ بجے سڑک پر بچے کھیل رہے تھے۔ ایک دم میرا جی چاہا کہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر یہ کپڑے اتار کر اسی وقت ان میں جا ملوں۔ لیکن نہ جا سکا۔

اپنے گھر کے چبوترے پر چڑھ کر میں نے جلدی جلدی تالا کھولا۔ شام کے مہمانوں پر نظر ڈالی تو بچہ منہ میں انگوٹھا لئے سسک رہا تھا۔ ماں اسے تھپک رہی تھی۔ خراٹی آواز والا مرد خراٹے لے رہا تھا۔ تینوں

[illegible] سے بے خبر بند
سکڑے سے بیٹھے تھے۔ میں نے چھتری بند کر کے
دیا سلائی جلائی۔ بند چھتری سے پانی کی ایک دھار
پھوٹ پڑی۔ دیا سلائی کی روشنی میں چمکنے لگی۔ بنٹ
جھڑک کے باہر ٹھہر کر میں اندر چلا آیا۔ میں چاہتا
تھا کہ اس مصیبت میں سوئی ہوئی اس بھولی بھالی عورت
کا چہرہ دیکھوں لیکن دیکھ نہ سکا۔ اندر آ کر میں نے
بستر کے پاس رکھا ہوا لیمپ جلایا۔ ٹیڑھے میڑھے
سائے دیوار پر حرکت کرنے لگے۔

ادھ گیلے کپڑے اتار کر میں نے دوسرے پہن لئے۔

ایک دم دروازہ کھلا۔ میرا خیال تھا شاید یہ ہوا
سے کھل گیا ہوگا لیکن نہیں، یہ سامنے والے مکان کی
بھاری آواز تھی۔ "گڈ ایوننگ سر"

"گڈ ایوننگ!"

وہ اندر آ گیا۔ بولا: "اف فوہ، کیا بارش ہے! یہ
بارش تو مار کر دم لے گا۔"

"ہونہہ"

بھاری آواز والے آدمی سے بات چیت کرنے کا
میرا یہ پہلا یا شاید دوسرا موقع تھا۔ ہمارے گھر آمنے
سامنے تھے، لیکن پڑوس کا یہ ناطہ صرف عورتوں تک
ہی قائم تھا۔ اس وقت وہ اپنے آنے کا سبب بتانا
چاہتا تھا، لیکن ہچکچاتا رہا۔

آخر تمہید باندھتے ہوئے بولا: "بھئی کیا بتاؤں —
ایک مصیبت آ پڑی ہے۔"

"مصیبت!"

"ہاں۔"

"کیسی مصیبت؟"

"میری بیوی کی بہن کی ایک سہیلی ہے۔ جگت پور ہی
سے ملنے آئی ہے۔"

"ہونہہ... پھر؟"

"جب سے آئی ہے، بارش کم ہونے کی بجائے
بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ شام سے وہ جانا چاہ رہی
ہے، مگر سواری کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا، اس
نے رکی ہوئی ہے۔"

پھر وہ کرتے کی جیب سے ڈبیا نکال کر ناس لینے لگا۔
ذرا سی ناس چٹکی سے اس نے ناک میں چڑھائی۔
ہاتھ جھٹک کر اپنے کپڑے صاف کئے پھر بولا: "ایک
دو گاڑی والوں کو میں نے ٹھہرانا چاہا مگر کوئی تیار نہیں
ہوتا۔"

"ہاں۔ برسات کی وجہ سے!"

"کمرہ سارا ٹپکتا ہے۔ رسوئی پانی سے بھر چکی ہے۔
سمجھ میں نہیں آتا... رات کیسے گزرے گی؟"

ٹہلتا جا رہا تھا اور باتیں کرتا جا رہا تھا۔ دیوار پر
اس سے کہیں زیادہ موٹا سایہ ادھر سے ادھر حرکت
کر رہا تھا۔ میں نے اپنے بستر کی چادر ٹھیک کی، شال
کو تہہ کر کے پیروں کی طرف رکھا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا: "بیٹھئے نا!"

لیکن وہ بیٹھا نہیں۔ جیب سے ڈبیہ نکال کر ایک
بار پھر اس نے ناس لی۔ ہاتھ جھٹکا، کپڑے صاف
کئے اور پاس آ بیٹھا۔

"میری بیوی اور اس کی سہیلی ایک کمرے میں سو جائیں
گے۔ اگر آج کی رات میں یہاں..."

"ہاں ہاں ضرور گزاریئے۔ جایئے اپنا بستر لے آیئے۔"

"لے آؤں گا، لے آؤں گا۔"

"تو پھر جایئے۔ لایئے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

بارش کے ساتھ ساتھ میرا مزاج بدلتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر اپنا بستر لانے کو چلا گیا۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ شال پیروں سے لیکر اچھی طرح اوڑھ لی۔ شال سے میں نے اپنے دونوں کان ڈھک لئے۔ میں بارش کی آواز سننا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی سن رہا تھا۔

بھاری آواز نے میرے پلنگ کے پاس ہی اپنا بستر لگا دیا۔

"کیا دروازہ بند کر دوں؟"

میں نے دھیرے سے کہا۔ "ہاں، بند کر دیجئے۔"

وہ دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹ گیا اور پھر رام کا جپ کرتا ہوا کچھ دیر بعد بولا "اور سنایئے، آج کل دیش میں کیا ہو رہا ہے۔؟ کانگریس یہ کیا کر رہی ہے.... ہائے میرے رام.... رام..."

جی چاہتا تھا بستر میں لپیٹ کر اس آدمی کو باہر پھینک دوں، لیکن میں آنکھیں بند کر کے اس طرح لیٹ گیا جیسے میں سو گیا ہوں۔ وہ مسلسل باتیں کرتا جا رہا تھا۔

کچھ نہیں تو اپنی پچھلی زندگی کے واقعات ہی دہرائے جا رہا تھا۔

"شنبھو... شنبھو جی!" اس نے میرا نام لے کر پکارا۔

لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔

باتیں کرتے کرتے وہ مجھ سے پہلے ہی سو گیا۔

اب صرف بارش کا زور شور تھا۔ شہنائی جیسی آواز کی بے چینی تھی اور کبھی کبھی چھپاتی آواز کی ہنسی۔

ایک بار پھر میرے دل میں یہ خواہش جاگی کہ میں چھپاتی آواز کی شکل دیکھوں۔ میرے تصور نے ایک اجنبی لیکن خوبصورت مکھڑا میرے سامنے پیش کر دیا۔

ادھر شہنائی جیسی مدھر آواز نے انگڑائی لی "کہاں تھیں اس وقت گھوم رہی!"

تصور نے ایک نئی تصویر میرے آنکھوں کے سامنے کھینچ دی —

ٹرین دندناتی چیختی چلاتی گذر رہی تھی۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں، میں اور میری بیوی گھر واپس لوٹ رہے تھے۔ ایک دم ٹرین میں ایک بھکارن داخل ہوئی میری بیوی اس بھکارن کو دیکھ کر پریشان ہو گئی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس بھکارن اور میری بیوی میں کوئی تعلق ہو — کوئی جانا پہچانا سا تعلق۔ شہنائی جیسی آواز والی میری بیوی ہے۔ اور وہ بھکارن جیسے گھر کے باہر چبوترے پر سونے والی چھپاتی آواز —

اچانک میرے گال پر کسی نے چانٹا دے مارا — میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ رات کی بجائے منور دن تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کمرے میں بھاری آواز کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے بند دروازہ کھولا۔ باہر آ کر چبوترہ پر ایک نظر ڈالی وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ لیکن پانی تھا کہ اسی زور و شور سے برس رہا تھا — ...

■ ■

یاد کی خوشبو کا شاعر جامی

جامی صاحب کے تذکرے ان کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کے بعد بھی بیٹھکوں، احباب کی محفل کی زینت ہیں لیکن ان سے ملاقات کے موقعے مجھے بہت کم ملے جسے بھی تو بڑے معاملی سے "لیجئے" یاد کی خوشبو مجموعہ سامنے آیا ہے تو وہ موت بھی اس خوشبو میں شامل ہو گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار جامی صاحب نے کہا تھا "قدرت اچھے شاعر پیدا کرنے میں بڑی کنجوس ہے۔" آج جامی صاحب ہم میں نہیں ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ قدرت اچھے شاعروں کو پیدا کرنے میں ہی نہیں بلکہ انھیں زندگی دینے میں بھی کنجوس ہے۔ "یاد کی خوشبو" نے اس احساس کی بے بسی کو کچھ نمایاں ہی واضح کر دیا ہے

جامی غزل کے شاعر ہیں، ان کی غزلوں میں جہاں زندگی کا شعور، حقیقتوں کا ادراک، تخلیقی کرب اور تنہائی کا جلتا ہوا احساس اپنی بھرپور کیفیت کے ساتھ ملتا ہے لیکن جو بات انھیں منفرد شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے وہ ہے ان کی شاعری میں دو زمانوں، دو نسلوں، دو قدروں اور دو رجحانات کا حسین سنگم آج کی شاعری تجربات اور اسلوب کے اعتبار سے ایک تیز رفتار انقلاب سے دوچار ہے اور جس کی تیز ہی رفتار کی زد میں آ کر پرانی روایات جاں بلب ہو گئی ہیں۔ مگر جامی کا کمال یہ ہے کہ اس انقلاب کے مقتل سے وہ چند پرانی قدروں کو بچا لائے ہیں اور انھیں ایک ایسا رنگ عطا کیا ہے جس کی شگفتگی نہ صرف جدیدیت کے معیار سے قریب تر ہے بلکہ اس تجرباتی اور منتشر دور میں جبکہ راستوں کا تعین نہیں ہو پا رہا، ایک روشنی بھی عطا کرتی ہے۔ جہاں تک فکر و نظر کا تعلق ہے، جیسا کہ جامی نے خود کہا ہے۔ "آج کی غزل میر و مومن کے زمانے کی غزل نہیں بلکہ اس کے دامن سے تاریخِ انسانی کے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیریں وابستہ ہیں۔" چنانچہ ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے روایات سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے بھی وہ غزل کو نئی فکر اور نئے خیال عطا کرتے ہیں:

جو ہو سکے تو حدیں توڑ کر خلاؤں کی
فلک کے دل میں زمیں کا عذاب بھی رکھ دو
مری راتوں نے تراشے تھے جو خوابوں کے بدن
اُن پہ آخر کوئی چہرہ تو لگایا جائے

جامی کے کلام کا حسن نئی اور انوکھی تشبیہات و تراکیب سے دوچند ہو جاتا ہے۔ ان کو اتنے سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ سلیقہ آج کی جدید شاعری پر اپنی چھاپ لگا کر مستند بن گیا ہے۔ چنانچہ جدید شاعری میں ان تراکیب و

پیکر حیدرآباد ۸۹

تشبیہات کا استعمال عام ہو چکا ہے :

جو زہر ہے' صلیب ہے' خنجر کی پیاس ہے
وہ خواب لے چلا ہوں زمانے کی روبرو

آہٹ ہے' نہ غم ہے' نہ کوئی چیخ ہے جامی!
اس واسطے اس رات کو مصلوب کہا ہے

ماحول کا دم گھونٹ رہی ہے یہ خموشی!!
لے آؤ کہیں سے کوئی آواز کا نشتر

افلاس کی راتوں سے ہے یوں دور سویرا
جیسے کسی امت سے خفا کوئی پیمبر

خیالوں کی چٹانوں سے گزر کر
سمندر میں اترتا جا رہا ہوں

خوابوں کے حسین جسم پگھل جائیں نہ دیکھو
آگے تو وہی دھوپ کی دیوار کھڑی ہے

یہ شہر ہیں کہ صداؤں کے گونجتے جنگل
نہ کوئی جسم نہ چہرہ دکھائی دیتا ہے

جامی کا لب و لہجہ اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے احساس و الفاظ کی ہم آہنگی نے ایک ایسا نیا تاثر دیا ہے جس سے اردو غزل اب تک نا آشنا تھی۔ ان کے پاس حقیقت اور تجربے کی بیباکی سے عکاسی کرتے ہوئے الفاظ احساس کے نرم دھارے میں بڑی روانی سے بہتے ہیں جس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جامی کی شاعری کے پس منظر کیلئے ہم ان کی زندگی اور ان کی تصوراتی تاریخ کا جائزہ لیں تو ان کی شاعری میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار کا جواز ہمیں مل جاتا ہے لیکن محرومی کا یہ لمحہ اور تنہائی کا یہ کرب صرف جامی کی اپنی ذات سے وابستہ نہیں بلکہ ہر دور اور ہر طبقے کے [illegible] کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح ان کے [illegible] ہوئے نہیں بلکہ دھڑکتے ہوئے ہیں وقت اور [illegible] کی حدیں پھلانگ کر جاوداں ہو گئے ہیں۔

جامی کے پاس زندگی سے اجنبیت کا ایک شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام کے بیشتر اشعار زندگی کا قرب حاصل کرنے کے باوجود اس سے اپنی اجنبیت کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کبھی کھلے طور پر اور کبھی رمزیہ انداز میں ــــ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جامی زندگی کو محسوس کرنے کے باوجود اسے گلے سے نہ لگا سکے :

کوئی سایہ کہیں دیکھا تھا میں نے
بس اتنا زندگی سے آشنا ہوں

اب کے تمہارے شہر میں یوں زندگی ملی
جیسے کوئی مسافرِ دشتِ الم ملے

چلتا رہے یہ رسمِ تعارف کا سلسلہ
ہر بار اجنبی کی طرح مجھ سے تم ملو!!

وہ رات بہت دور کہیں مجھ سے ملی تھی
جس رات کے ہاتھوں میں تھی شمعِ نظر تک

مگر اس محرومی کے باوجود جامی کے ہاں شکست نہیں زہر کو تریاق بنانے کی کیفیت ملتی ہے :

کچھ اور اعتبارِ شعورِ وفا بڑھا
کچھ اور راستوں میں پیچ و خم ملے

سو بار اندھیروں نے جسے قتل کیا ہے
تخلیق کے ماتھے کی وہی ایک کرن ہوں

جامی کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت غیر مرئی

[illegible] ہے
یہ [illegible] شاعر ہیں بہت مقبول ہے لیکن شاید
بہت کم اس سے واقف ہیں کہ اردو شاعری میں سب
سے پہلے مستقل طور پر جامی ہی نے یہ اسلوب استعمال
کیا۔ اس کی چند مثالیں دیکھیے :

یوں لے دل کے پاس درد رہا جس طرح کوئی
حیران سا ہو دیکھ کے خالی مکان کو!!

بیتے بہت سے دن دشمن خوف قرار کی صورت
کیا جانے کیوں سوچ کی راہوں میں بکھرے تھے

تنہائیوں کی برف نہ جم جائے پھر کبھی!
چھپ جائیں پھر کہیں نہ خیالوں کے راستے

ملی تو کوئی قتا منا نہ کر سکی مجھ سے
تمہاری یاد بھی اتنی تھکی ہوئی کیوں ہے

لے کر نئے خیال کی قندیل ہاتھ میں!!
جامی کسی کو ڈھونڈنے نکلی ہے نئی غزل!

وقت کی تیزیٔ رفتار کی زد میں آکر!
ہم نے اک عہدِ روایات کو مرتے دیکھا

جامی کی ابتدائی شاعری تشبیہات، استعارات اور
علامتوں سے سجائی گئی تھی لیکن شعور کی نشو ونما کے ساتھ
ہی ساتھ ہم ان کی شاعری میں محاکاتی عمل کی بھرپور
کیفیت بھی پاتے ہیں۔ چنانچہ خیال اور اسلوب کے
اعتبار سے "رخسارِ سحر" اور "برگِ آوارہ" کی ابتدائی
شاعری کی بہ نسبت "برگِ آوارہ" کا اختتامی کلام
اور "یاد کی خوشبو" کی غزلیں نئے شعور اور احساس
کی مکمل تصویریں کھینچنے میں کامیاب ہیں۔ یعنی
احساس وخیال جامی کے پاس اس قدر مکمل ہے
کہ وہ اسے قاری کے سامنے ایک منظر کی
صورت میں پیش کرنے پر قادر ہیں :

خوابوں کو تیرگی کے سمندر میں پھینک دو
چھایا ہوا سکوت ہے لیسے میں کچھ کہو

آیا وہ دشتِ غم کہ بدن ٹوٹنے لگا!
دیکھی وہ تیز دھوپ کہ پتھر پگھل گئے

وقت کی دھوپ ہے اور درد کا لمبا رستہ
زندگی سوچ کے سائے میں کھڑی ہے تنہا

ساتھ خوابوں کو لئے گھر سے نہ باہر نکلو
چار سو شہر میں ہے ناچتے شعلوں کی قطار

ہم سفر جامی ہے جیسے شعلۂ لرزاں کوئی
یوں مرے ہمراہ چلتا ہے شعورِ کائنات

زمیں کا درد لیے ساتھ لے کر!!
خلاؤں میں کسی کو ڈھونڈتا ہوں

کوئی آہٹ ہے نہ چنچل نہ صدا ہے کوئی
دل کی دہلیز پہ چپ چاپ کھڑا ہے کوئی

حیات پیاس کا صحرا ہی تو پھر اس میں
کچھ آرزو کے چمکتے سراب بھی رکھ دو

میں اس ندی کے پار اتر جاؤں گا مگر
آگے کوئی چراغ تو جلتا دکھائی دے

جو ساتھ لے کے چلا تھا ہزار ہنگامے
وہ شخص آج اکیلا دکھائی دیتا ہے

"یاد کی خوشبو" کی غزلیں پختگیٔ شعور، وسعتِ خیال،
تازگیٔ احساس اور روانیٔ بیان کے ساتھ بڑی
شدت سے جامی کے بے وقت موت کا احساس
دلاتی رہتی ہیں۔ ■■

فلم نگر ایسٹ مین کلر میں بہت جلد پیش کرتے ہیں

فلم ساز سوہن لال کنور کی بے مثال پیش کش
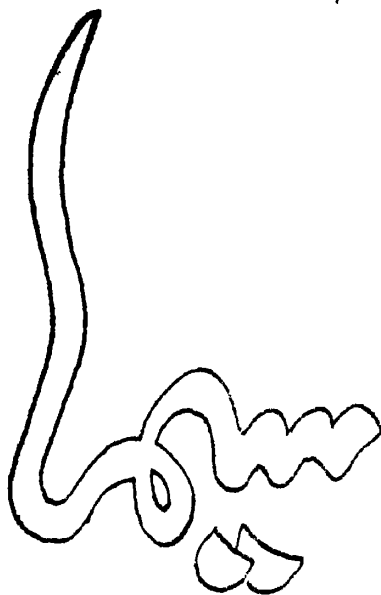
ببی۔ راکیش روشن۔ بھارتی۔ کبیر بیدی۔ ابھی بھٹاریہ۔ چاند عثمانی۔ راج مہرہ۔
گوپال سہگل۔ یشودھرا کاٹجو۔ کیچن اور ننھا اداکار بنٹی

ہدایت کار: سریندر موہن • موسیقی: شنکر جے کشن • عکاس: کے ایچ کپاڈیہ
گیت: گلزار، ورما ملک، اندیور • کہانی، منظر نامہ اور مکالمے: **گلزار**
آرٹ: بنسی چندر گپت • تدوین: نند کار

ایچ۔ایم۔وی اور پولیڈور کمپنیوں میں مقابلہ بازی

ہز ماسٹرز وائس بہت پرانی گراموفون کمپنی ہے۔ فلمی ریکارڈز تیار کرنے میں حال حال تک ملک میں
کی اجارہ داری رہی ہے۔ اس کی ہندوستان کی شاخ گراموفون کمپنی آف انڈیا فنکاروں کو پنپنے
نہ دینے کے بارے میں ہمیشہ من مانی پالیسیوں پر عمل کرتی رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے کانوں تک وہی
پہنچتا رہا ہے جو یہ کمپنی عوام کو سنانا چاہتی ہے۔ اس طرح سوائے چند نام نہاد مقبول موسیقاروں
کے کسی اور موسیقار کا چاہے وہ فنی اعتبار سے کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو۔ ایچ۔ایم۔وی کے ذریعے اپنے
ریکارڈز عوام تک پہنچانا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ چند اعلیٰ موسیقاروں کی تخلیقات
اسکو فروخت کرنے کے لئے ریکارڈ تو کرلی جاتیں لیکن ان کے ڈسک (DISC) بننے نہیں پاتے۔ نتیجہ یہ
ہوتا کہ یہ تخلیقات محض ٹیپ تک ہی محدود رہ جاتیں ۔

ایچ۔ایم۔وی کی یہی مخالف پالیسیاں فنکاروں میں مایوسی کا باعث ہوئیں اور اسی مایوسی کا فائدہ اٹھاتے
ہوئے ٹیبل برادرس نے جو پہلے فوٹوگرافی سامان کا بزنس کرتے تھے۔ ساؤنڈ ریکارڈنگ اور ریکارڈز
بنانے کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب ایچ۔ایم۔وی اور پولیڈور جو ٹیبل برادرس کا
ادارہ ہے۔ باقاعدہ ایک دوسرے سے مقابلے پر اتر آئے ہیں اور پولیڈور دوسرے معاہدہ کرنے والے
پروڈیوسروں کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ ایچ۔ایم۔وی کو بھی ان فلموں کے ریکارڈز دوسرے پلے بیک
سنگروں لیکن انہی دھنوں پر بنانے کی اجازت دے دیں۔ یہ صورت حال جہاں ایچ ایم وی کو صحت مند
بنانے اپنا ادارہ چلانے کے لئے جہاں مجبور کرتی ہے وہیں ایک ہی دھنوں میں مختلف سازوں اور مختلف
پلے بیک سنگروں کو لے کر ریکارڈ کئے ہوئے مختلف (DISCS) سننے والوں کے لئے ایک پریشانی کا مسئلہ
بن گئے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس برابر کی بھاگ دوڑ کا مقصد سننے والوں کو اچھے فنکاروں سے روشناس
کرانا ہو نہ کہ سننے والوں کے لئے الجھن کا باعث بن جائے ۔

مکیش اور شنکر جے کشن میں اختلاف؟

مکیش نے حال ہی میں اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ منائی۔ اس جشن میں اُسے اور اُسکی بیوی کو مبارکباد دینے اُسکے قریبی دوستوں راجکپور، شمی کپور اور دتا رام کے علاوہ خیام، طلعت محمود، ششی کپور۔ جیا بہادری، ایم جوہر، پریم ناتھ۔ بی۔ آر۔ چوپڑہ۔ یش چوپڑہ۔ اور بی۔ رلہن۔ تپن سنہا، لکشمی کانت پیارے لال اور کلیان جی آنند جی نے شرکت کی۔ مکیش کے قریبی دوستوں شنکر اور جے کشن کی غیر موجودگی اس محفل میں بری طرح محسوس کی گئی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مکیش کی کسی دعوت میں انہوں نے شرکت نہ کی ہو۔ شنکر اور جے کشن کی عدم شرکت کو اُنکے مکیش سے تعلقات میں کشیدگی کا نقطۂ آغاز سمجھا جا رہا ہے۔

● مشہور ہدایت کار رشی کیش مکرجی اپنی آئندہ فلم "گڈی" میں نئی اداکارہ جیا بہادری اور بنگالی اداکار سمیت بھنجا کو لیا ہے۔ ان کے علاوہ مشہور بنگالی اداکار اتپل دت بھی ایک اہم کردار ادا کریں گے دھرمیندر اس فلم میں مہمان اداکار کے طور پر پیش

بیکر حیدرآباد ۹۴

جیا بہادری اور امیتابھ بچن "مان ابھیمان" میں

نیا ہیرو امیتابھ بچن نئی ہیروئن جیا بہادری کے ساتھ پربتی چترا کی فلم "مان ابھیمان" میں پیش ہو رہے ہیں۔ ہدایت انیل گھوش کی، مکالمے اور گیت گلزار کے، فوٹوگرافی الوک داس گپتا کی اور موسیقی نئے موسیقار ہری ارجن کی ہوگی۔

اداکار سپرو کی بیٹی فلموں میں

مشہور کیریکٹر ایکٹر سپرو کی بیٹی ایما ہیروئن کی حیثیت سے نلنی کی فلم "بھارت کے شہید" میں آ رہی ہے۔ اُس کے مقابل بھاشن گھائی مرکزی کردار ادا کرے گا۔ دوسرے اداکاروں میں سپرو، رمیش دیو، جیون، فتا اروڑہ اور رام اوتار قابل ذکر ہیں۔ مکالمے راج بتی کے ہیں اور ہدایت وشرام بیڈیکر دیں گے۔
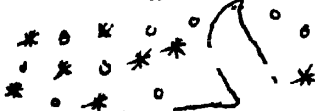
ہوگا۔ مکالمے اور گیت گلزار نے لکھے ہیں اور موسیقی وسنت ڈیسائی کے ذمے ہوگی جو آشیرواد کے بعد رشی کیش مکرجی کے ساتھ دوسری بار آ رہے ہیں۔

"جیون ایک کہانی" میں نوتن نشچل اور نندا

یونائیٹڈ موویز آرٹس کی فلم "جیون ایک کہانی" میں نندا
اور نوتن نشچل ایک ساتھ آ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ
ہیلن، شتروگھن سنہا، جگدیپ راج، ہمیت کمار، راجندر
ناتھ اور کمل کپور بھی اس فلم میں کام کر رہے ہیں۔ ہدایت
کل دت کی ہوگی۔ فوٹوگرافی "بھون خرم" کے شہرت
یافتہ فوٹوگرافر کے جاجی کی ہے۔ راجندر کرشن
کے لکھے ہوئے گیتوں کی طرزیں راہل دیو برمن بنا رہے
ہیں۔ مکالمہ نگار احسن رضوی ہیں۔

محافظ حیدر "ٹیکسی ڈرائیور" میں

مشہور مصنف محافظ حیدر ایک عرصے کے بعد
ایم۔ ایچ۔ فلمز کی رنگین فلم "ٹیکسی ڈرائیور" میں ایک
مکالمہ نگار کی حیثیت سے آ رہے ہیں۔ فلم کے مرکزی
کردار دیو آنند کا بھانجا وشال آنند اور دیپا ادا
کر رہے ہیں۔

مختصر مختصر خبریں

● مشہور مغنیہ اوشا ایر جس نے کلکتہ اور
بمبئی کے نائٹ کلبس میں اپنے انگریزی گیتوں سے
تہلکہ مچا دیا ہے اب محمود پروڈکشنز کی فلم "بمبئی سے
گوا" میں اپنے ہندی گانے ہوئے ایک گانے کو بھی
دھن راہل دیو برمن نے بنائی ہے خود پیش کرے گی
اوشا ایر نے مرچنٹ آئیوری فلمز کی فلم "بمبئی ٹاکی"
میں بھی دو گانے خود ہی پیش کئے تھے۔ "بمبئی سے گوا"
میں امیتابھ بچن اور ارونا ایرانی کام کر رہے ہیں
فوٹوگرافی جمال مستری کی ہے۔

ریحانہ سلطان کامیابی کے زینے پر!

بہت کم اداکارائیں ایسی ہوتی ہیں جنہوں
نے اپنی پہلی فلم میں خوبصورتی سے بہت
کر اداکاری کے بل پر غیر معمولی شہرت
حاصل کی ہو۔ شاید گیتا بالی اور نتی
کے بعد ریحانہ سلطان پچھلے پندرہ برس
میں فلموں میں پیش ہونے والی وہ پہلی ہیروئن
ہے جس نے اپنی پہلی ہی فلم "چیتنا" سے نقادوں
اور عوام دونوں کو متاثر کیا ہے۔
بیان کیا جاتا ہے کہ آج کل بمبئی میں ہر بڑا
ڈائریکٹر اپنی فلم میں موقع دینے پر تیار ہو گیا ہے
حال ہی میں ریحانہ نے تین نئی فلموں کے
لئے معاہدہ کیا ہے جس میں بی آر چوپڑا
کی فلم بھی شامل ہے۔ دوسری فلم میں وہ
نئے ہیرو سبھاش گھئی کے مقابل رول ادا
کر رہی ہے۔ موسیقی لکشمی کانت پیارے
لال کی ہوگی۔ تیسری فلم میں [illegible] کے ساتھ

دیو آنند کی نئی فلم "شریف بدمعاش"

دیو آنند نے اپنی اگلی فلم "شریف بدمعاش" کی ہدایت راج کھوسلے کے سپرد کی ہے۔ ابھی ہیروئن کا انتخاب نہیں ہوا ہے۔ اس فلم کی کہانی "جانی میرا نام" کے مصنف کے۔ اے۔ نارائن کی لکھی ہوئی ہے۔ فوٹوگرافی فالی مستری کی ہے۔ گیت آنند بخشی نے لکھے ہیں اور موسیقی راہل دیو برمن کی ہوگی۔

دھرمیندر "لوفر" کے رول میں

سنجری فلمز کی فلم "لوفر" میں دھرمیندر اور ممتاز پیش ہونگے۔ ان کے ساتھ فریدہ جلال، انل دھون، مکری، پریم ناتھ اور اوم پرکاش بھی ہیں مکالمے جگدیش کنول کے لکھے ہوئے ہیں۔ آنند بخشی کے لکھے ہوئے گیتوں کی دھنیں لکشمی کانت پیارے لال نے بنائی ہیں۔

وحیدہ رحمان۔ امیتابھ بچن کے ساتھ

وحیدہ رحمان وہ واحد اداکارہ ہے جو کامیابی اور شہرت کی بلندیوں کو چھونے کے باوجود کسی بھی نئے ہیرو کے مقابل کام کرنے سے مطلق نہیں جھجکتی ہے "بھاشی گھٹی" کے بعد اب وہ ریتا فلمز کی آئندہ فلم میں جس کے ہدایت کار سکل دت ہیں امیتابھ بچن کے ساتھ بطور ہیروئن پیش ہو رہی ہے۔ شتروگھن سنہا بھی اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کرےگا۔ اس فلم کے مکالمے مشہور اردو شاعر راہی معصوم رضا لکھ رہے ہیں۔

بیگم پورہ آباد ۹۶۲

فلمی گیت

میں تو راہوں میں پڑا پتھر ہوں
سب مجھے روند کے چپ چاپ گذر جاتے ہیں
کس کو احساس ہے غم میری تنہائی کا
سب ہیں مصروفِ سفر
تیز رو سارے قدم
کس کو فرصت جو میرے پاس گھڑی بھر ٹھہرے
کس کو توفیق میرے غم کی کہانی پوچھے
کون ہمدرد جو اتنا پوچھے
کیسا طوفان تھا؟
کس زور کی وہ آندھی تھی؟
تم بھی ہم سے کترا کے یہاں کیوں آئے؟
کیوں سرِ راہ پڑے ہو تنہا؟
آنکھ والوں سے بصارت کی توقع ہے فضول
سوچتا ہوں کوئی نابینا ادھر سے گذرے
اُس کی لاٹھی ہی سے ٹکراؤں کہ وہ چونک پڑے
اور پھر مجھ کو اٹھا لے کہ یہ ہے "خدمتِ خلق"
پھینک دے مجھ کو کہیں دور چٹانوں کی طرف
یا مجھے بیچ سے سڑک کے کنارے کر دے
اور میں کھوئے ہوئے یاروں میں پھر آجاؤں

گیت کار: اکمل حیدرآبادی
سنگیت کار: کمل راجستھانی
گلوکار: محمد رفیع

پیار کی کہانی

"پیار کی کہانی" ان فلموں میں سے ایک ہے جو مدراس کی فلم انڈسٹری میں کامیاب تلگو یا تامل فلموں کی کہانیوں پہ بنائی جاتی ہیں۔ اس لئے اس فلم میں بھی میلو ڈرامے کیلئے کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔ جگہ جگہ گلیسرین کے آنسوؤں کا سیلاب ہے۔ پھر بھی کہانی کی بنیاد ایک نئے مسئلہ پر رکھی گئی ہے جو قابل تحسین بات ہے۔ یہ مسئلہ ہے آج کل کی اَن بیاہی لڑکیوں کی شادی کا جو روایت پرستی اور جدیدیت کے دوراہے پر کھڑی ہوئی ہیں۔ جن کا باہر گھومنا پھرنا خواہ مخواہ کی افواہوں کو جنم دیتا ہے اور یہ افواہیں اُن کے مستقبل کیلئے ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جاتی ہیں۔

فلم کی ہدایت کاری معمولی ہے۔ پھر بھی فلم کو تنوجہ اور امیتابھ بچن کی موثر اداکاری نے بڑا سہارا دیا ہے۔ تنوجہ ایک بھولی بھالی لڑکی کی اداکاری میں بے حد کامیاب ہے۔ امیتابھ بچن کا رول پوری طرح واضح نہیں ہے اور اُس سے زبردستی اُچھل کود بھی کروانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن پھر بھی وہ بہت اچھا تاثر تاثر چھوڑتا ہے۔ انیل دھون کا جو جذبات سے عاری ہے۔ فریدہ جلال اور آغا خوب ہیں۔ بانکے کے کردار میں بیم چوپڑہ بہت بور کرتا ہے نئی اداکارہ موہنا بھی کامیاب ہے۔

فوٹوگرافی بڑی معمولی ہے۔ ساؤنڈ ریکارڈنگ میں بھی کئی جگہ خامیاں محسوس ہوتی ہیں۔ راہل دیو برمن نے دو تین گانوں کی دھنیں اچھی بنائی ہیں۔ مختصر یہ کہ "پیار کی کہانی" ایک اوسط فلم ہے۔

ادھیکار

"ادھیکار" کی بنیاد خاندانی مسائل پر رکھی گئی ہے لیکن فلم میں خواہ مخواہ کی جذباتیت کو بہت اہمیت دی گئی ہے جس کی وجہ سے بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔

فلم میں سب سے اچھی اداکاری پران نے بنے خاں بھوپالی کے رول میں کی ہے مگر اس کردار کا فلم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں) اور خوب کی ہے۔ اشوک کمار دبا دبا رہا ہے۔ ناظمہ کے سامنے نندا ماند پڑ گئی ہے۔ دیب مکرجی غنیمت ہے۔ ہدایت کاری صرف چُست ہے، مکالمے اچھے ہیں۔ فوٹوگرافی ناقابل ذکر ہے۔ راہل دیو برمن کی موسیقی معمولی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی "ادھیکار" ایک معمولی فلم ہے۔ ■■

فلم نگر کی سماجی پیشکش

(ایسٹ مین کلر)

تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے

فلم ساز و ہدایت کار: سوہن لال کنور   موسیقی: شنکر جے کشن

کہانی: سچن بھومک • عکاسی: کے ایچ کپاڈیہ • گیت: ورما ملک

آرٹ: کے۔ بابو بھائی • منظر نامہ: رام کیلکر • مکالمے: ویدراہی

تدوین: نند کمار

منوج کمار، پران، پریم چوپڑہ، پریم ناتھ، ناظمہ اور دوسرے

بیکر حیدرآباد ۹۸

SARGAM CHITRA PRESENTS

THEIR PRESTIGE PICTURE

SAMPOORNA DEVI DARSHAN

(IN ORWO COLOUR)

A FILM SAGA THAT WILL TOUCH THE

DEPTH OF YOUR SOULS

Producer
S. J. RAJDEV

Director
SHANTI LAL SONI

Music: **S. N. TRIPATHI**

Staring:

AASHISH KUMAR, SUSHMA, PADMA RANI, SHABANA
AND OTHERS

SARGAM CHITRA
EVER GREEN BUILDING, NAAZ COMPOUND,
BOMBAY-4

R. N. Regd No. 8058/61 "PAIK'ER" Postal Regd. No. H. 1042
An Urdu Monthly Magazine
3-6-214, Himayatnagar, Hyderabad-29 A.P.

September 1971

Re. 1/-

اس شمارے میں

زاویے

پیکر

(اداریہ)

ہند۔ روس معاہدۂ امن، دوستی و خیرسگالی کی شکل میں ہماری خارجی پالیسی
میں پہلی بنیادی تبدیلی عمل میں آئی۔ لیکن جیسا کہ بعض گوشے
باور کروا رہے ہیں، اس تبدیلی کو ہندوستان کی ناوابستہ پالیسی میں تبدیلی نہیں کہا جا سکتا
دراصل ناوابستگی اور غیر جانب داری کے
فرق کو پوری طرح نہ سمجھنے کے سبب ایسا معلوم ہو سکتا ہے اور اس
لیے بھی کہ بہت سے ذہن دوستی، دشمنی اور پالیسی
کو الہامی درجہ دیتے ہیں اور منجمد و ناقابلِ تبدیلی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ دوستی، دشمنی
اور حکمتِ عملی متحرک اور قابلِ تبدیلی ہوتی ہے
ہند۔ روس معاہدے نے ہندوستانی عوام اور حکومت
دونوں ہی میں ایک نئے اعتماد کو بحال کیا ہے
اور ان تمام ملکوں کو اپنے نقاطِ نظر پر ازسرِ نو غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو ہندوستان
کو یکا و تنہا سمجھ کر سیاسی، معاشی اور فوجی دباؤ ڈال رہے تھے۔ ان
حالات میں انھیں خطوط پر اگر جاپان، یوگوسلاویہ اور افغانستان سے بھی معاہدے ہو جائیں
تو ہمارے ملک کا موقف اور بھی مستحکم
ہو جائے گا اور امریکہ، پاکستان اور چین کے سہ رُخی فوجی گٹھ جوڑ
پر یہ معاہدے ایک اور طمانچہ کا کام انجام دیں گے۔

ادارہ پیکر کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں

رام لال۔ لکھنؤ۔ پیکر دلچسپ ہوتا جارہا ہے فلمی صحافت کا حصہ کمزور رہے چونکہ رسالہ ادبی ہے۔ اس لئے اس حصہ کو بھی باوقار ہونا چاہئیے۔ جیسے بعض انگریزی و ہندی کے فلم جرنل میں فلمو پر تبصرے سرسری دیکھے گئے۔ "ادھیکار" فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ فلم میں سب سے اچھی اداکاری پران نے بنّے خاں بھوپالی کے رول میں کی ہے اس سے مجھے مکمل اتفاق ہے لیکن مبصر کا یہ کہنا کہ اس کردار کا فلم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہماری عام زندگی میں ایسے کتنے بنّے خاں اپنا رول ادا کر رہے ہیں لیکن ان کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ کوئی کرتا بھی ہے تو ہمارے ذہنوں پر ایک آدرش بنا کر لادیتا ہے اسی وجہ سے وہ مصنوعی بن کر رہ جاتا ہے۔ ادھیکار فلم میں صرف یہی کردار بہت ہی حقیقی اور فطری انداز سے شامل ہے اگرچہ باقی کہانی بے حد بناوٹی ہے

ادیب یعقوبی۔ حیدرآباد۔ پیکر کے بارے میری رائے ہے کہ آپ پچھلا شمارہ میری آنکھیں کے زیرعنوان سربراہ کسی بالغ نظر اور عصر حاضر کے نقاد سے دو تین صفحے ضرور لکھوایا کریں۔

راشد آذر حیدرآباد۔ حسن فرخ کا اس مضمون کا انتظار رہے گا جس کا ذکر انہوں نے اپنے خط میں کیا ہے۔ عزیز قیسی کو میں خط لکھنا چاہتا ہوں کہ بھائی ایسی بھی کیا روٹھی کہ نظم پر تنقید نہ کرنے دے؟ معلوم نہیں میں ہی "آؤٹ آف ڈیٹ" ہو گیا ہوں یا ہماری شاعری ایسی ہو گئی ہے لیکن میری رائے ہے کہ آپ ایک حصہ "نثری نظمیں" کے عنوان سے شائع کیا کیجئے تو پڑھتے وقت طبیعت پر بار نہیں گزرے گا۔

عبدالرحیم نشتر، بھنڈارا۔ اس بار بھی رسالے کی وہی سج دھج ہے۔ شعری حصہ کچھ کمزور رہا پھر بھی حرمت الاکرام، مظفر حنفی، حسن فرخ، قمر اقبال اور مجید کوثر کی تخلیقات پسند آئیں۔ افسانے اچھے ہیں، "سائنٹفک نقطۂ نظر" اور "جدید مراٹھی ادب" مضامین اچھے ہیں۔

ساجد اختر۔ کٹک۔ خاص بات یہ ہے کہ "پیکر" پڑھ کر جہاں ذوقِ ادب کی تسکین ہوتی ہے وہیں اس کا فلمی حصہ ایک خاصی ذہنی تفریح کا باعث ہے

محمد صلاح الدین بادشاہ۔ مدراس۔ کرشن چندر حرمت الاکرام، نور شاہ، مظفر حنفی، حسن فرخ، کاوش بدری اور روشن آرا نیر کی تخلیقات بے حد پسند آئیں بلکہ ریش والا مقالہ بہت وقیع اور پُرمغز ہے طباعت اور گٹ اپ بھی بہت شاندار ہے۔

رضوان احمد۔ پٹنہ۔ جولائی کے پیکر میں

کملیشور اور مجتبیٰ حسین کی بات چیت نظر سے گزر گئی۔ کملیشور کے خیالات پر تبصرہ کرنے کے بجائے میں ان کا ایک خط قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ تصویر کے دونوں رخ سامنے آجائیں ___

ایک سال قبل اردو رسم الخط کے مسئلہ پر میری ان سے خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس سلسلہ کا یہ ایک اہم خط ہے۔ اس بات چیت سے تو لب لگتا ہے کہ کملیشور سے بڑھ کر اردو کا کوئی ہمدرد ہندوستان میں نہیں ہے۔ اور اب یہ خط ملاحظہ فرمائیے ___

ساریکا۔ بمبئی

۲۶ ستمبر ۱۹۷۱ء

پیارے بھائی

آپ کا خط بہت پہلے مل گیا تھا۔ پر ملازی جواب نہیں دے پایا۔ اس بیچ میں راہی معصوم رضا اور موجودہ والی بحث بھی آگئی۔ اردو اور ہندی کا مسئلہ سچ پوچھئے تو لیپی کا ہے۔ نہ معلوم کہ لوگ اسے لیکر اتنا ناراض کیوں ہیں۔ اتہاس کے کسی دور میں اس سمے کی اتہاسک (تاریخی) شکتیاں (طاقتیں) بہت کچھ طے کرتی ہیں اور اس کے ساتھ جب ایک ضروری سچائی بھی شامل ہو جاتی ہے تو وہ ہو کر رہتا ہے۔ میں جانبداری یا غیر جانبداری کی بات نہیں کرتا، لیکن اتنا میں ضرور دیکھ رہا ہوں کہ اردو، سندھی اور پنجابی کو ایک دیوناگری لیپی اپنانی پڑے گی۔ یہ بات اس وقت بہتوں کا خون کھولا سکتی ہے لیکن خون کھولنے سے دکھ ہوتے ہیں۔ باتوں کا صحیح حل نہیں نکلتا۔ ایسا نہیں کہ ہندوؤں میں ہندی کو نقصان پہنچانے والے لوگ نہیں ہیں۔ ویسے ہی لوگ آپ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اردو میں کیوں لکھتے ہیں۔ ... آپ نے دیکھا ہوگا کہ سردار جعفری، آل احمد سرور، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ بھی اس بات کی وکالت کر رہے ہیں کہ ہمیں اردو کے لئے دیوناگری لیپی اپنا لینی چاہئے۔ آپ چونکہ سمجھدار ہیں اس لئے میں یہ کہنے کی ہمت کر پا رہا ہوں کہ اردو لیپی کو لیکر لوگوں کے دماغ میں یہ بھی کہیں ہے۔ لیپی نے بھارت کے وبھاجن (تقسیم) میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔ ہم اور آپ تو اتنی احتیاط برت سکتے ہیں۔ اس پر یقین نہ کریں لیکن عام لوگوں کے دماغ میں یہ بات ضرور بیٹھی ہوئی ہے۔ اتنا تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جس دن اردو دیوناگری لیپی اپنا سکے گی۔ اس دن یہ روز روز اٹھ کھڑے ہونے والے مسائل ایک چوتھائی بھی نہیں رہ جائیں گے اور جس بڑے سپنے کو ہم لوگ اپنے دلوں میں پال رہے ہیں وہ سپنا بہت حد تک پورا ہو جائے گا۔ لیپی قوم سے بڑی نہیں ہوتی۔ زمین آزادی سے بڑی نہیں ہوتی۔ شاید اسی لئے ہم نے آزادی کے لئے زمین بٹ جانے دی تھی۔ اسی طرح لیپی آج آڑے آ رہی ہے۔ اور اسے ہمیں چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اس سے قوم کا کوئی نقصان نہیں ہونے والا ہے۔ کیونکہ لیپی کی یہ ایکتا ہمیں وسیع النظر بھی بنائے گی۔ باتیں

سکے ... آباد ...

بہت ہو سکتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ کچھ داروں کی کوششیں بہت بار ناکام ہو چکی ہیں ـــــ لیکن اب اس وقت اتہاس (تاریخ) بھی ساتھ ہے اور یہ کام پورا ہو جائے گا۔

راہی معصوم رضا کے بارے میں آیا ہوا خط ہم چھاپ رہے ہیں۔ راہی کا ایک چھوٹا سا جواب بھی ہے آپ کچھ مدّوں پر آگے بات کرنا پسند کریں گے تو "سارنگا" آپ کا ضرور سواگت کرے گی۔ اتنا ضرور دھیان رکھیں کہ اپنے تاثرات کم سے کم الفاظ میں بھیجیں تاکہ ہم اسے ضرور دے سکیں۔

باقی ٹھیک ہے۔

مخلص

کملیشور

یہ خط میں قارئین پیکر کے مطالعہ کے لئے پیش کر رہا ہوں اور بحث کو آئندہ کے لئے اٹھا رکھتا ہوں

رشید الدین۔ حیدرآباد۔ مراٹھی سے واقفیت کی بنا پر میں نے امجد یوسف زئی صاحب کا مضمون "جدید مراٹھی ادب" بہت دلچسپی سے پڑھا لیکن افسوس کہ انہوں نے مجھے مایوس کیا۔ قاری کو اس میں بے حد تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ البتہ بادیہ شبنم نے اپنے تبصرے میں جامی صاحب کی "یاد کی خوشبو" سے قاری کا بھرپور تعارف کروایا ہے مظفر حنفی کی غزلیں بھی بہت پسند آئیں۔

سلیم شہزاد۔ مالے گاؤں۔ افسانہ "ذرا سی لنگوی" بہت پسند آیا۔ اس بار شعری حصہ خاص جاندار رہا۔ خصوصاً مظفر حنفی کی غزلیں بڑی پیاری تھیں

کیا یہ وہی حنفی صاحب ہیں کی غزل "ورم کمرے کی نہیں" شائع ہوئی تھی؟ ذہن ہر وقت نارمل نہیں رہتا اور شاید ذہن کے ابنارمل ہونے پر ہی تالے والی غزل حنفی صاحب نے کہی تھی۔؟

اس میں اور ان نئی غزلوں میں فرق صاف نظر آتا ہے۔ امید ہے حنفی صاحب آئندہ اسی لہجے میں شعر کہیں گے۔ "گرا ہوا آدمی" اچھا افسانہ ہے۔ بھول کا زہر کچھ عجیب سا لگا۔ کہانی شروع ہوئی تو کچھ اور تھی اور اختتام پر کچھ اور ہو گئی ـــ انٹلیکچول والا مضمون غنیمت ہے۔

خالد سعید۔ گلبرگہ۔ "ذرا سی لنگوی" کا کلائمکس قاری پہلے ہی جان لیتا ہے پھر بھی آخری پنچ افسانے کو نیا رنگ عطا کرتا ہے۔

اس ماہ کا ٹائٹل پچھلے ماہ سے بہتر ہے۔

ایس۔ ایم۔ طارق۔ جبلپور۔ کرشن چندر، حرمت الاکرام، مظفر حنفی، حسن فرخ، نور شاہ ساجد افر، شبنم قیوم اور نسیم مظفرپوری کی تخلیقات نے نہ صرف متاثر کیا بلکہ پیکر کو نکھارنے میں پورا پورا تعاون کیا ہے۔

ایم۔ اے۔ نصر۔ کلکتہ۔ یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ ادبی رسالوں کو اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے، غیر ادبی چیزیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو چند ہی ملاں میں کسی حقیر کیچوے کی طرح دم توڑ دینے پر مجبور ہوں۔ یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے، جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

رُکا رُکا سا تنفس، دبے دبے سے قدم
اس احتیاط سے اپنے قریب آئے ہم
چمن چرائے ہوئے چل رہی ہے بادِ صبا
بساطِ گُل پہ رواں ہے کوئی شمیمِ قدم
کہاں کہاں نہ گئے ہوں گے جستجو میں تری
گلی گلی نظر آئے ہمارے نقشِ قدم
فروغِ حسن مکمل نہیں ہوا شاید
تراشتا ہے تخیل کئی ادھورے صنم
اُسی ادائے تکلف سے پھر قریب آجا
تجھے تری بہ تامل سپردگی کی قسم
سمجھ نہ لیں حرم و دیر کم سواد کہیں
یہ کیا کیا یہ کہاں چھوڑ آئے نقشِ قدم
ہمیں یہ فکر کہ مجروح ہو نہ اپنا یقیں
انھیں یہ وہم کہ ہیں انکے اختیار میں ہم
نہ جانے کب سے اسیرِ سفر ہیں دیوانے
وفا کی راہ سمجھنے لگی مزاجِ قدم
ہماری بات اسیرانِ مصلحت میں کہاں
چلے تو راہ گزر تھم گئے تو منزل ہم
یہ کیا ستم ہے طلوعِ سحر کے موقع پر
غروب ہوتا ہوا آفتاب بن گئے ہم
کوئی ہمارا بھی گہرا مطالعہ کرتا
سمٹ سمٹ کے بھی اے اوجؔ کائنات ہیں ہم

اوج یعقوبی
۵۳۱-۸-۱۶ "بیت الغزل"
جدید ملک پیٹ۔ حیدرآباد-۳۶

عزیز قیسی
۶۳۳/۲۰ شاستری نگر
گورے گاؤں۔ بمبئی-۶۲

سلسلۂ روز و شب

آخرِ شب۔ کھنڈر کا سناٹا
چشمِ نم دیدہ جیسے گُم سُم ہے
یہ فضا۔ یہ ہوا۔ یہ ماہِ تمام
جانے کس کے خیال میں گُم ہے
چاند تیرہ اُفق کے زانو پر
تھک کے دم توڑ دے تو کیا ہوگا
پھر سحر نور لے کے آئے گی
پھر اُجالے کا سامنا ہوگا

ہائے یہ روز و شب کا ہنگامہ
ہائے یہ عمر کی گراں جانی

چھاپے کے عام ہونے سے پہلے کتاب کی قدر و
قیمت زیادہ تھی، اتنی زیادہ کہ یونان کے ایک فلسفی
نے یہاں تک کہا کہ "جو شخص کسی کو کتاب مستعار
دے وہ احمق، اور جو شخص کسی سے کتاب مستعار
لے کر پھر واپس کر دے وہ کم عقل"۔ اسی سبب
کتاب کے مالک یا کتب خانے اپنی ملکیت کے
اظہار کے لئے کتاب کے اول و آخر میں عموماً اور
کبھی کبھی درمیان کے اوراق پر اپنی نشانی لگاتے
یادداشت ثبت کرتے تھے اور بعض اوقات دستخطوں
کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا کرتے تھے کہ کتاب ہم
تک کس ذریعے سے پہنچی۔ بالعموم کتب خانوں میں
ایسی تحریریں قارئین کی نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔
اس طرح جتنی یادداشتیں یا تحریریں کتابوں پر ثبت
ہوتی ہیں، ان سے بڑی دلچسپ اور مفید باتیں علم
میں آجاتی ہیں۔ اتنی دلچسپ اور مفید کہ اگر ان
سب کو جمع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو قصہ
یا کہانی کا لطف آنے لگے۔

کتب خانے قوموں کا بیش بہا تہذیبی سرمایہ ہوتے
ہیں اور قوموں کے عظمت و جلال، فہم و فراست
عقل و دانش اور دانائی کا گنجینہ۔ ہر قوم اور ملک
کا کتب خانہ اس کی علمی ترقیوں کی زندہ اور تابندہ
یادگار ہوتا ہے اور جو قومیں واقعتاً زندہ ہیں، انھوں
نے صدیوں سے اپنے کتب خانوں کی حفاظت
کی ہے اور آفات ارضی و سماوی کے باوجود علمی
ذخیرہ محفوظ اور مامون رہا ہے۔

قلمی کتابوں کے پاس شعور اور زبان دونوں ہوتے
ہیں اور وہ اپنی سرگزشت سنا کر ہمیں حیرت
میں ڈال دیتی ہیں۔ ممتاز محقق مولوی امتیاز علی عرشی
ناظم رضا لائبریری رامپور نے ایک جگہ لکھا ہے
کہ "عام طور پر قلمی کتاب کے اول و آخر میں مختلف
اصحاب کے قلم کی عبارتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ
ہمیں بتاتی ہیں کہ کتاب کب لکھی گئی۔ کس نے لکھی
کس کے پاس رہی اور کہاں سے کہاں پہنچی۔ چنانچہ
ایسا بھی ہوا ہے کہ دمشق کے ریگزار میں ایک
کتاب لکھی گئی، عراق کی گرم و خشک سرزمین کی انیس
خلوت بنی، ایران کی گلبار مجلسوں میں زینت جلوت
رہی اور وہاں سے دکن کی گرم اور تر پہاڑیوں
کی سیر کرتی ہوئی، دلی کے شاہی کتب خانے میں

میں روپوش ہو گئی یا پھر برلن اور لندن کے
دارالکتب میں جلوہ باری کرتے جا بیٹھیں۔

ہندوستان بھر کے کتب خانوں میں اردو کے
مخطوطات ملتے ہیں، ان کے علاوہ انڈیا آفس
لائبریری لندن، برلن اور سوویت یونین کے قومی
کتب خانوں کے مراکز کے سبب شہرت رکھتے
ہیں۔ ویسے کئی مقامات پر اکابر مشاہیر اور علماء
ومشائخین کے گھر پر اور شخصی کتب خانے بھی
وراثتاً چلے آ رہے ہیں۔

کتابوں کی اشاعت مطبوعوں (پریس) کے
قیام کے بعد تیزی سے شروع ہوئی۔ ۱۸۰۰ء
میں پہلا اردو مطبع کلکتہ فورٹ ولیم کالج میں قائم
ہوا۔ لیتھو کا پہلا سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء نے
۱۸۳۴ء میں حیدرآباد میں قائم کیا۔

حیدرآباد صدیوں سے علم و ادب اور تہذیب
وتمدن کا شہر رہا ہے۔ عہد قطب شاہی سے
آصف جاہوں کے زمانے تک اس شہر نے
علم و ادب کے گوہر نور کو اپنے سینے سے لگائے
رکھا۔ علمی کتابوں کے گرانقدر ذخیرہ کے سبب یہ شہر
آج بھی دنیا سے خراج حاصل کرتا ہے۔ ہم ذیل
میں حیدرآباد کے کتب خانوں کے بارے میں
ضروری تفصیلات تحریر کرتے ہیں۔ جن سے اردو
کے باذوق اور ٹیچرز کے ذہین و فطین اور مخلص
قارئین کو اندازہ ہوگا کہ یہ شہر اپنے قومی اور تہذیبی
ورثے کی حفاظت اور ترقی میں کتنا پیش پیش ہے

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری

آصفی دور حکومت کے "کتب خانہ آصفیہ" کا
نام اب اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ہو گیا ہے۔ پہلے
پہل اسے نواب عماد الملک، مولوی سید حسین
بلگرامی اور ملا عبدالقیوم نے متحدہ طور پر ۱۸۹۱ء
میں قائم کیا تھا۔ سابق ریاست حیدرآباد میں
اسے بھرپور سرکاری امداد ملتی رہی اور بعد کو یہ
حکومت آصفیہ کا "عوامی کتب خانہ" قرار دیا
گیا۔ اس کتب خانے میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے
ذخیرے کی تعداد تقریباً دو لاکھ ہو گی۔ جس میں
سولہ ہزار سے زیادہ مخطوطات ہیں۔ نواب عماد الملک

وقار خلیل
ایوان اردو۔ پنجہ گٹہ۔ حیدرآباد-۴

مولوی چراغ علی اور مولوی محب حسین اور
دکن کے دیگر باکمال مشاہیر کا شخصی کتب خانہ
بھی خرید لیا گیا اور اس طرح اس کی اہمیت بڑھ
گئی۔ ڈاکٹر راحت اللہ خاں مرحوم کے زمانۂ
کیوریٹری میں یہ کتب خانہ باقاعدہ اور منظم رہا۔
افسوس کہ اب وہ حالت باقی نہیں رہی اور اہم
حوالجاتی مطبوعات سے استفادہ کرنے والے
محروم رہنے لگے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں کتب خانہ آصفیہ
کے (۱۴۴۲) مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں
نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے دو جلدوں میں مرتب اور
شائع کرکے اس ذخیرہ سے ارباب اردو کو متعارف
کرایا۔ اس کتب خانہ میں قطب شاہی، عادل
شاہی اور آصف جاہی عہد کے ادیبوں اور
شاعروں کی اہم اور نادر کتابیں بڑی تعداد میں
محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ غالب اور میر کی تحریریں
بھی ملتی ہیں۔ ملک کے دور دراز حصوں سے ریسرچ
اسکالر بڑی تعداد میں یہاں استفادہ کی غرض سے
آتے رہتے ہیں۔ اب یہ حکومت آندھرا پردیش
کا مرکزی کتب خانہ بن گیا ہے۔ اسکی شاندار
اور خوبصورت تاریخی عمارت میں عصری ضروریات
کے مطابق وسعت کے سبب یہ کتب خانہ بیحد
جاذب نظر ہو گیا ہے دیگر زبانوں کی کتابوں کی
خریدی اور اہتمام کے ساتھ ساتھ ارباب کتب
خانہ کو چاہیے کہ اپنے ماضی کے شاندار اس ادبی
ورثہ میں اردو کی کتابیں اور رسائل بھی زیادہ سے
زیادہ استفادہ کے لئے خریدیں اور انہیں ہر طرح کی
تک پہنچانے میں کامیاب دلچسپی اور خلوص کا مظاہرہ
کریں ۔۔۔

کتب خانہ سالار جنگ

دکن کے محترم خانوادۂ سالار جنگ نے ہندوستانی
علم و ادب کی بڑی خدمت اور سرپرستی کی ہے۔
شہرۂ آفاق سالار جنگ میوزیم کے علاوہ کتب خانہ
اس خاندان کی وہ عنایت ہے جس پر ہندوستان
کو ناز ہے۔

سالار جنگ لائبریری میں شرقی و مغربی علوم و فنون
کا بہت ہی اہم ذخیرہ محفوظ ہے۔ اس کے شعبۂ شرقی
میں عربی، فارسی، ترکی اور اردو زبان کے ساڑھے
سات ہزار سے زائد مخطوطات اور پندرہ ہزار کے
قریب کے قریب مطبوعات ہیں، جن میں اسلامیات
اور دیگر مذاہب اور جغرافیات سے متعلق تمام علوم
و فنون، سائنس، طب اور فنون لطیفہ کی نایاب
کتابیں شامل ہیں۔ یہ علمی اثاثہ خانوادۂ سالار جنگ
کے چار افراد میر تراب علی خاں مختار الملک، میر
لائق علی خاں عماد السلطنت، میر سعادت علی خاں
منیر الملک اور میر یوسف علی خاں سالار جنگ کا
جمع کردہ ہے۔

اس لائبریری کا سب سے اہم اور قیمتی سرمایہ عربی
فارسی اور اردو مخطوطات ہیں۔ مغلیہ، قطب شاہی
عادل شاہی اور اودھ کے حکمرانوں کے شاہی کتب
خانوں کے ایسے نسخے ہیں جن پر ان بادشاہوں

کی تحریریں اور حاشیوں پر ان کی لکھی ہوئی تحریریں ملتی ہیں۔ کئی سو سے زائد ایرانی، مغل، دکنی، کشمیری اور بخارائی مصوری کے نسخے بھی سالار جنگ لائبریری کی زینت ہیں جن میں سے بعض نسخوں میں طلا اور موتی کی سیاہی استعمال کی گئی ہے اور جن کی نقاشی اور رنگ کاری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اسی کتب خانے میں بنی عباس کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کے دربار کے مشہور خطاط یاقوت کا لکھا ہوا قرآن مجید بھی موجود ہے جو ۱۱۲۱ھ میں مغلوں کے شاہی کتب خانہ میں داخل ہوا تھا۔ اس پر جہانگیر شاہجہاں اور عالمگیر کی تحریریں بھی واضح ہیں۔ اس کتب خانے میں محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دواوین کے علاوہ اس عہد کے شعرا، علما اور صوفیا کی تحریر کردہ قلمی کتابیں بھی ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے مخطوطات سالار جنگ لائبریری کی اولین وضاحتی فہرست شائع کی تھی۔ عصری طرز پر ایک نیا کیٹلاگ معلوم ہوا ہے کہ ارباب کتب خانہ جلد ہی شائع کر رہے ہیں۔

اب یہ لائبریری اپنی نئی اور دلکش عمارت میں پہلے سے زیادہ کارکرد ہو گئی ہے اور جناب سجاد رضوی اور حیدر علی صفا صاحب کتب خانے کے امور کی انجام دہی میں پیش پیش رہتے اور مخلصانہ تعاون دیتے ہیں۔

کتب خانہ سعیدیہ

حیدرآباد کا ایک قدیم اور بین الاقوامی شہرت کا حامل کتب خانہ سعیدیہ اپنے بانی مفتی مولوی محمد سعید خاں کی معارف نوازی کا زندہ جاوید ثبوت ہے اس کتب خانہ میں ۲۵ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں جو اس گھرانے کے ایثار اور فراخ دلی سے عوام کے لئے عام کر دی گئیں۔ فارسی، عربی، اردو، ترکی اور انگریزی ادب کی بیش بہا مطبوعات کے سبب یہ کتب خانہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مفتی سعید، مدراس کے قابل قدر علمی گھرانے کے فرد فرید تھے سالار جنگ اول کی طلبی پر حیدرآباد آئے۔ عدالت العالیہ میں اہم عہدہ پر فائز رہے اور مفتی عدالت بھی بنے اور حیدرآباد کی مسجد الماس میں معتمد مقرر ہوئے۔ کتب خانہ سعیدیہ مرحوم کی زندگی کا ثمرہ اور ان کی جیتی جاگتی یادگار ہے۔ ستمبر ۱۹۳۵ء میں سر نظامت جنگ نے اس کا افتتاح کیا۔ مولوی حاجی عبدالعظیم کے ذاتی صرفہ سے جام باغ روڈ پر کتب خانہ کے لئے عمارت وقف کی اور تاحیات اس کے انتظامیہ سے منسلک رہے اور وسعت دی۔ اس کتب خانہ میں علوم شرقیہ کی چار ہزار سے زیادہ نایاب قلمی کتابیں ہیں۔ اسلامی تاریخ اور دکنی تمدن پر بھی قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔ ٹیپو سلطان اور لارڈ کلائیو کے دستخطی خطوط، اور کئی شاہی فرامین بھی ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محمد غوث، مولوی نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر یوسف الدین کی کوششوں سے اس کتب خانے کا کیٹلاگ بھی تیار ہوا۔

اردو زبان کی ہزاروں کتابیں اس کتب خانے

کی زینت ہیں۔ خصوصیت یہ ہے کہ اس لائبریری میں چھٹی سے آٹھویں صدی ہجری کی تحریر کردہ اہم تصانیف کے نایاب نسخے موجود ہیں جن میں سعدیؒ کی گلستاں کا معتبر نسخہ اہمیت رکھتا ہے جو ۹۲۶ھ میں نقل ہوا ہے۔ اسلامی علوم و فنون کی کتابوں کے اعتبار سے یہ کتب خانہ ہندوستان کے بہترین ذخیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" کے قیام ۱۹۳۰ء کے ساتھ ہی اردو کے ایک اہم کتب خانے کا قیام بھی اربابِ ادارہ کے پیش نظر رہا اور ۱۹۳۵ء میں اس کا باضابطہ قیام عمل میں آیا اور بقول محمد اکبر الدین صدیقی صاحب "ادارہ نے اس طرح کتابیں جمع کیں جیسے ایک "بیا" پتوں سے تنکے نکال کر لاتی اور اپنا گھونسلہ تیار کرتی ہے"۔ ادارہ کے کتب خانے کی بیشتر کتابیں بانیٔ ادارہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کا عطیہ ہیں اور پھر ان کے بعد دیگر سرگرم اراکین کی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب ادارہ کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جاری ہوا تو اس میں تبصرہ کے لئے کتابیں آنے لگیں۔ حیدرآباد کے ایک معزز اور علم دوست نواب میر سیف علی خاں کے ذاتی خلوص اور جذبۂ عمل سے کتب خانہ کی تنظیم عمل میں آئی۔ پھر ایک کمیٹی کی نگرانی میں مولوی غلام رسول اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے نہ صرف کتب خانے کیٹلاگ تیار کیا بلکہ فنی اور وضاحتی فہرستیں بھی مرتب کردیں۔ ادارہ کے کتب خانے میں ۲۵ ہزار کے قریب مطبوعات اور ۵ ہزار مخطوطات ہیں قلمی کتابوں کی ۵ وضاحتی فہرستیں ڈاکٹر زورؔ نے مرتب کرکے شائع کردی تھیں، مطبوعات کی تین جلدیں بھی چھپ چکی ہیں۔

ادارہ کے کتب خانے میں پچاسوں ایسی کتابیں ہیں جو نوادارت کا درجہ رکھتی ہیں۔ مطبوعات میں اب سے ۱۲۵ سال قبل کے اشاعتی اداروں کی اہم کتابوں کا وافر ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ جن میں شمس الامراء کے چھاپہ خانہ کی سائنسی علوم پر مطبوعات فورٹ ولیم کالج کی کتابیں، نول کشور پریس اور دارالترجمہ کی تالیفات بھی ہیں۔ رسائل و جرائد کے قابلِ قدر اور اہم ذخیرے میں اردو کے ادبی مجلوں کے مکمل فائل کے علاوہ دہلی اردو اخبار ۱۸۵۱ء جامع الاخبار مدارس ۱۸۵۱ء فوائد الناظرین دہلی ۱۸۴۵ء اور اودھ پنچ لکھنؤ ۱۸۷۷ء کے علاوہ ۱۸۱۹ء میں ہنری مارٹن اور مرزا فطرت نے بائبل کا جو ترجمہ "دیقۂ جدید" کے نام سے کیا تھا، وہ بھی موجود ہے یہ کتاب سری رام پور مشین پریس میں اب سے تقریباً ایک سو ساٹھ سال قبل چھپی تھی۔ مخطوطات میں حضرت خواجہ بندہ نواز کا "چکی نامہ" مکتوبہ ۱۲۲۲ھ، مکاتیب خواجہ بندہ نواز مکتوبہ ۱۱۰۰ھ اور شیخ اشرف کی "نوسرہار" ہے جو ۹۰۹ھ کی تصنیف ہے، اسکا کوئی اور نسخہ دنیا کے کتب خانے میں نہیں ملتا۔ میراں جی کی "باغ و بہار" کا وہ

نسخہ بھی ادارہ کی لائبریری کی زینت ہے جسے ناصرالدولہ آصف جاہ سابع نے بطورِ خاص نقل کرایا تھا۔ اس کے علاوہ "تذکرۂ یادگارِ ضیغم" کا ضخیم مخطوطہ خود مصنف کا مکتوبہ ۱۲۹۸ھ بھی یہاں محفوظ ہے جسے ڈاکٹر رشید موسوی مرتب کر رہی ہیں۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۰ء کو جب ادارہ کی اپنی عمارت "ایوانِ اردو" کا افتتاح ہوا تو پھر اس کے کتب خانہ کو عصری سہولتیں میسر آئیں۔ یہ کتب خانہ اپنے اہم ذخیرہ کی مطبوعہ فہرستوں کے سبب ہندوپاک کے ریسرچ اسکالروں اور محققوں کے استفادہ کا اہم مرکز بن گیا ہے۔ ترمیس الدین انصاری صاحب لائبریری کی ذمہ داریوں کو خلوصِ دل سے پورا کرتے رہے ہیں۔

اسٹیٹ آرکیوز لائبریری

اب سے پچاس سال پہلے ریاست حیدرآباد کے دفتر دیوانی و مال و ملکی و مناصب "مدارالمہام سرکارِ عالی" میں دکنی تاریخ اور تمدن کے ریکارڈ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ایک کتب خانہ بھی اس کے پہلے ناظم مولوی سید خورشید علی کی کوششوں کی بدولت قائم ہوا۔ اس کتب خانہ میں اردو اور فارسی زبان کی تقریباً ۲ ہزار مطبوعات اور چار ہزار کے قریب مخطوطات یکجا ہیں۔ اہم قلمی کتابوں میں ٹیپو سلطان کے عہد کی تاریخ "فتح المجاہدین" کلیاتِ علی عادل شاہ شاہی اور "نوری نامہ" شہرت رکھتی ہیں۔ اس کتب خانے بالعموم تاریخ اور کلچر سے دلچسپی رکھنے والے محقق اور اسکالر بھی پہنچے ہیں۔ یہاں قطب شاہی اور آصف جاہی کے علاوہ آندھرا پردیش کا اہم سرکاری ریکارڈ بھی محفوظ ہے جن میں سب سے زیادہ ذخیرہ فارسی اور اردو میں ہے۔ جناب ضیاءالدین احمد شکیب اپنے بالغ نظر اور بیدار انداز سے اس محکمہ سے وابستگی علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوتی رہی ہے۔

کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ اور دیگر بین کلیاتی کتب خانے

سنٹرل لائبریری عثمانیہ یونیورسٹی جامعہ کے قیام ۱۹۱۹ء ہی کے زمانے سے کارکرد رہی ہے۔ اس میں (۱۹۲۵۱) ہزار کتب ہیں، جن میں قلمی کتابیں اور دیگر زبانوں کی مطبوعات بھی شامل ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ کی مخطوطات کا ایک وضاحتی کیٹلاگ بہت پہلے پروفیسر عبدالقادر سروری نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس کتب خانہ میں کلاسیکس کی اہم کتابیں اور یونیورسٹی کے نصابوں کی معاون جدید اور قدیم مطبوعات سے اساتذہ طلبا اور دیگر ریسرچ اسکالرس استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

آرٹس کالج، نظام کالج اور سٹی کالج کے کتب خانے بھی اپنی نوعیت اور افادیت کے سبب

بیحد اہمیت رکھتے ہیں۔ سٹی کالج لائبریری کو مولوی غلام رسول نے بڑی محنت سے منظم کیا تھا۔

نظامیہ طبی کالج چارمینار کی لائبریری فن طب کی نادر اور نایاب مطبوعات و مخطوطات کے سبب شہرت رکھتی ہے۔ جہاں دکن کے نامی گرامی اطبا کے کتب خانوں کا ذخیرہ بھی محفوظ ہے، ایک مخطوطے پر غالب کی مہر بھی موجود ہے۔ اس لائبریری کے بارے میں پروفیسر محمد عبدالوہاب ظہوری نے کئی تعارفی مضامین لکھے ہیں۔

ریاستی انجمن ترقی اردو کی طرف سے قائم کئے گئے "اردو آرٹس کالج" کی لائبریری ۱۹۶۰ء سے درسیاتی اور کلاسیکل ادبی قدیم و جدید ذخیرہ کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتب خانے میں اردو اور انگریزی کی ۱۵ ہزار کتابیں ہیں جن میں امین جنگ کا گرانقدر عطیۂ کتب بھی شامل ہے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر حسینی شاہد کی شخصی دلچسپی کے سبب یہ کتب خانہ امید ہے اپنا خاص مقام بنائے گا۔ اسی طرح انوار العلوم کالج کا کتب خانہ بھی اپنی قدامت کے سبب اہمیت رکھتا ہے۔

مرکزی اردو کتب خانہ اردو ہال

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے اس مرکزی کتب خانے میں جو ۱۹۵۶ء میں قائم ہوا۔ ۶ ہزار کتابیں ہیں، جن میں سے بیشتر مولوی حبیب الرحمٰن، مرزا سجاد مرزا اور مہدی نواز جنگ کا عطیہ ہیں۔ انجمن کے کتب خانے کے علاوہ ایک مفید ریڈنگ روم بھی ہے جس میں کئی اردو، انگریزی اور تلگو کے اخبارات و رسائل اور علمی جرائد سے قرب و جوار کے رہنے والے اور اردو کالج کے طلباء استفادہ کرتے ہیں۔ ارشاد علی خاں منتظم و لائبریرین نے کتب خانہ کا کیٹلاگ تیار کر لیا ہے۔

بھارت گن وردھک سنستھا لائبریری

۱۸۷۵ء میں حیدرآباد کے پرانے شہر شاہ علی بنڈہ میں راجہ رگھوتم راؤ کی دیوڑھی انجمن فروا فروز کے ساتھ اس سنستھا کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۵۵ء میں اس کی بازیافت ہوئی اور ولئے محبوب نارائن گوڑ کی کوششوں اور صحرا نوردی سے اس لائبریری میں اردو اور فارسی کی اہم مطبوعات اور لغات کا نادر ذخیرہ مجتمع ہو سکا۔ یہاں ۲۸ ہزار کتابیں ہیں جن میں اردو، فارسی کے ساتھ سنسکرت، ہندی، انگریزی اور مراٹھی مطبوعات شامل ہیں۔ اس کے شعبۂ تحقیقات میں دنیا کی ۴۲ زبانوں کے ایک ہزار ایک سو اسی لغات موجود ہیں۔ اردو، فارسی، عربی اور مراٹھی لسانیات کی اہم لغات کا قابل قدر ذخیرہ بڑی کاوشوں سے یکجا کیا گیا ہے۔ سنستھا کی عصری عمارت میں نو کل لائبریری اتھارٹی کی طرف سے ایک شاخ عوامی کتب خانہ کے نام سے کارکرد ہے جس سے بستی کے علم دوست استفادہ کرتے ہیں۔

کتب خانہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

۱۹۱۳ء میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے پہلے صدر پروفیسر محمد عبدالرحمان خاں مرحوم اور ڈاکٹر محمد مرتضیٰ بانی معتمد سے کون واقف نہیں ہے۔ حیدرآبادیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں اس ادارہ نے کئی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں سائنس کے سرٹیفکیٹ کورس تدریس کا ۱۹۶۰ء سے آغاز ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں کالج آف لینگویجز حیدرآباد بھی کارکرد رہا ہے۔ جسکا ۱۹۶۶ء میں جامعہ عثمانیہ سے باقاعدہ الحاق عمل میں آیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے کتب خانہ میں میڈیکل، انجینیرنگ اور اورینٹل لینگویجز کے نصاب کی کتابیں محدود فیس پر اراکین کو فراہم کی جاتی ہیں۔ بچوں کے ادب پر تین ہزار سے زیادہ کتابیں یہاں موجود ہیں۔ اس کے اراکین حکومت کے تعاون کے بغیر بھی نامساعد حالات میں عزم و حوصلے کے ساتھ اعزازی طور پر سرگرم عمل رہے ہیں اور اب تک اسی جذبے سے کام کئے جارہے ہیں۔

حیدری گشتی کتب خانہ

۱۹۲۵ء میں مولوی فضل اللہ احمد (ملا خیراتی) نے سر اکبر حیدری کی علمی یادگار کی حیثیت سے اسے قائم کیا۔ اس کتب خانہ میں چھ ہزار کے قریب خواتین اور بچوں کے ادب پر مشتمل مطبوعات اور رسائل کا ذخیرہ موجود ہے۔ جس سے گھریلو پردہ نشین خواتین برائے نام فیس پر استفادہ کرتی رہتی ہیں۔ شاکرہ بیگم صاحبہ اس کتب خانہ کی اعزازی معتمد ہیں اور اسے کامیابی سے جاری رکھنے کیلئے شب و روز مصروف رہتی ہیں۔

لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لائبریری

اردو کے ممتاز دکنی مورخ و محقق مولوی حکیم سید شمس اللہ قادری نے ۱۹۳۰ء میں اسے قائم کیا اور اپنے ذاتی کتب خانہ کی ۸ ہزار کتابیں اسکے حوالہ کیں۔ جن میں اردو اور فارسی کے ایران میں چھپے اڈیشن اور نایاب نسخوں کے علاوہ تذکرہ، لغت اور تاریخ کی اہم کتابیں ہی نہیں بلکہ حکیم صاحب کے مضامین کے مسودے بھی شامل ہیں۔ اب اس ادارے سے اُن کے فرزند پدم شری سید احمد اللہ قادری (ایم ایل سی) عبارت ہیں اور ریاستی چیف منسٹر مسٹر برہمانند ریڈی کا سرپرست ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کتب خانہ کو عوامی اور کارکرد بنایا جائے اور حکیم صاحب کے مضامین کے انتخاب بھی جلد شائع کئے جائیں

کتب خانہ خواتین دکن

۱۹۴۳ء میں اُردو کے مخلص ادیب اور محقق مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اپنے ذاتی کتب خانہ کو عوام کے استفادہ کے لئے عام کرتے ہوئے اسے قائم کیا اور مرحوم کی وفات کے بعد بھی اُن کے افرادِ خاندان اس کام کو وسعت دے رہے ہیں۔ ریاستی وزیر سیاحت مسز روڈا مستری صدر

اور ڈاکٹر ظہیر الدین ہاشمی کتب خانہ کے معتمد ہیں
یہاں چھ ہزار کتب و رسائل کا ذخیرہ موجود ہے
جس سے بالعموم خواتین ریسرچ اسکالر اور دیگر
تشنگان علم استفادہ کرتے ہیں۔ ادب تاریخ اور
ماڈرن لٹریچر اس کتب خانے میں اچھا ذخیرہ ہے۔

کتب خانہ ترویج و اشاعت زبان اردو

ریاستی حکومت کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں ایک کمیٹی
اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے مقصد
سے قائم کی گئی تھی۔ جسکے صدر پروفیسر سید علی اکبر
اور معتمد رائے جانکی پرشاد نامزد کئے گئے تھے۔
اسی کمیٹی کی طرف سے یہ کتب خانہ قائم ہوا اور
ان دنوں جناب میر عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست
اس کے اعزازی معتمد کے فرائض انجام دے رہے
ہیں۔ اس کی طرف سے ہر سال اردو کی اہم فنی
اور سائنسی مطبوعات پر مصنفین کو امداد دی
جاتی ہے اور اردو سے ایم اے، بی اے
بی او ایل اور ڈپ او ایل کرنے والوں کو تعلیمی
وظائف بھی منظور کئے جاتے ہیں اور علاقہ تلنگانہ کی
حد تک مسلمہ اردو کتب خانوں کو خریدی کتب
کے لئے مناسب امداد بھی دی جاتی ہے۔ اس
کمیٹی کی طرف سے قلب شہر میں ایک مفید کتب
خانہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ جس میں چار ہزار کے
قریب علمی، ادبی، فنی اور نصابی کتب کا جدید
ترین ذخیرہ استفادہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ مہربان
حسین صاحب لائبریرین کے ذوق علمی کے سبب
حروف تہجی پر مبنی مفید کیٹلاگ بھی تیار کر لیا گیا ہے
جسکی اشاعت ضروری ہے۔

مخدوم میموریل ٹرسٹ بک لائبریری

۱۹۷۰ء میں جواں سال طالب علموں نے ہمارے
عظیم شاعر اور دکن کے محبوب قائد مخدوم محی الدین
کی یاد میں مختصر پیمانے پر ہی سہی ہمہ کلیاتی نصاب
پر مشتمل ٹیکسٹ بک لائبریری قائم کی ہے جس سے
میٹرک اور پی، یو، سی کے نادار طلباء استفادہ
کرتے ہیں اس کام کو نصرت محی الدین، چندر
سری واستوا اور افتخار صدیقی صاحبان آگے
بڑھا رہے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ایک دارالمطالعہ
مخدوم کی یاد میں پرانے شہر کے محلہ مغل پورہ میں
ذہانت علی بیگ اور انکے احباب نے قائم
کیا ہے۔

کتب خانہ مدرسہ نظامیہ شبلی گنج

جامعہ نظامیہ کا یہ کتب خانہ اپنے مشرقی علوم کے
گرانقدر علمی و ادبی اور مذہبی سرمایہ کتب کے
سبب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کتب خانہ
میں ہزاروں مطبوعات اور اہم مخطوطات کا ذخیرہ
محفوظ ہے۔

دیگر اہم کتب خانے

ڈاکٹر زور نے اپنے والد حضرت غلام محمد زمّم
رضائی کی یاد میں انکی آخری آرام گاہ خانقاہ

حمایت علی" واقع پہلی مسلم جنگ کتب خانہ اسلامیہ
کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس کتب خانہ میں مولوی انوار
اللہ خاں فضیلت جنگ اور ڈاکٹر زور کے خاندان
کا کتب خانہ منتقل ہے جن میں تاریخی کتابوں اور آثار
دکن پر مفید اس علمی ذخیرہ کو کمال صاحب درگاہ
حضرت زکم پہچ سے عوام کے استفادہ کے لئے کھول
دیں تو ایک دینی اور ادبی خدمت ہوگی۔

کتب خانہ پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا دہلوی بھی
حیدرآباد کے اہم شخصی کتب خانوں میں خاصی
شہرت رکھتا ہے۔ اس کتب خانے میں نادر اور
نایاب دکنی اردو اور شمالی ہند کے شاعروں اور
مصنفوں کی محررہ قلمی کتابیں ہیں۔ آغا صاحب کے
کتب خانے میں چند ایک ایسی کتابیں اور
مسودے ہیں جنکی نقل دنیا کے کسی اور کتب خانے
میں نہیں ملتی۔ کئی مخطوطات کے صحیح اور مستند نسخے
بھی ہیں جن سے محققین اور علم دوست آغا صاحب
کے بنگلہ واقع بنجارہ ہلز جاکر استفادہ کرتے رہتے
ہیں وجہ ہے آغا صاحب اپنی شخصیت میں ایک
کتب خانہ اور دبستان ہیں۔ ضرورت اس امر
کی ہے کہ پروفیسر حیدر حسن دہلوی اپنے کتب خانہ
کی توضیحی فہرست کم از کم شائع کر دیں تاکہ تشنگانِ
ادب کو سہولت ہو سکے۔

ایک حیدرآبادی محب وطن صحیفہ نگار شعیب اللہ
خاں کی یاد میں "شعیب میموریل لائبریری" ٹکٹ پیٹھ
میں کارکرد ہے۔ محکمہ بلدیہ اور حکومت آندھرا
پردیش کے تعاون سے یہ لائبریری اپنے امور کو
انجام دیتی ہے۔

"مدینہ مینشن" نارائن گوڑہ میں نظامت جنگ میموریل
لائبریری اپنے اہم مطبوعات اور معظم جاہ شجیع
کے ذاتی کتب خانہ کی سبب شہرت رکھتی ہے۔
اس لائبریری کی عمارت کا ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم
صدر جمہوریۂ ہند نے اپنے آخری دورۂ حیدرآباد
کے زمانے میں سنگِ بنیاد رکھا تھا۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں قائم کردہ
"ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کی
لائبریری بھی اپنی جگہ علمی و ادبی ذخیرہ کے سبب
اہمیت رکھتی ہے۔ قدیم باغ عام میں یہ کتب خانہ
اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ریڈنگ روم بھی قائم
ہے۔ کئی ہزار اسلامیات اور ادبیات کی کتابیں
اور مختلف انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں موجود ہیں۔
مولوی خواجہ محمد احمد صاحب سابق ناظم آثارِ قدیمہ
اس ادارہ کے ڈائرکٹر اور سکریٹری ہیں۔

کتب خانہ ہنری مارٹن اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کے نام سے عرصہ تک عیسائی مشن اور اسلامیات
کی ریسرچ کے کام کو فروغ دیتا رہا۔ اب یہ
انسٹی ٹیوٹ اور اسکی لائبریری اپنی نئی تعمیر شدہ
عمارت میں حیدرآباد کے اہم مقام عابد روڈ سے
پنجہ حیدرآباد ۱۹۰۱

سے اسٹیشن بازار نامپلی جانے والی شاہراہ پر قائم ہوگئی ہے۔ اس کتب خانہ میں اردو کی مسیحی اور دیگر مذاہب کی کتابوں کے اہم ذخیرہ کے علاوہ فارسی اور انگریزی کا قابل قدر سرمایہ موجود ہے۔ ڈاکٹر مجنوں طالب شاہ آبادی کی نگرانی میں یہ انسٹی ٹیوٹ توقع ہے حیدرآباد میں اپنا مقام بنائے گا۔

تعمیر ملت کے محلہ جاتی کتب خانے اور دارالمطالعے بھی علمی و ادبی ذوق کی آسودگی کے لئے مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد کے قدیم اور مشہور کتب خانوں میں دینی کتب کا بڑا ذخیرہ لائبریری میں ملے گا۔ سکھوں کی خالصہ لائبریری بھی اردو کے تاریخی، ادبی اور مذہبی کتابوں کا اہم مرکز ہے جہاں چار ہزار کے قریب مطبوعات ہیں اور ایک ریڈنگ روم بھی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد اور روزنامہ سیاست میں بھی حوالہ جاتی اور ادبی کتب کا وافر ذخیرہ یکجا ملتا ہے جس سے کارکن استفادہ کرتے رہتے ہیں

حیدرآباد میں سرکاری اور نیم سرکاری کتب خانوں کے علاوہ کئی اشخاص کے شخصی کتب خانے بھی قابل قدر ہیں۔ جن میں پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر ہاشم امیر علی، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پروفیسر اکبرالدین صدیقی، ڈاکٹر مغنی تبسم، میر عابد علی صاحب مدیر سیاست، پرنس مفخم علی خاں ثاقب، ڈاکٹر غیاث صدیقی، جتندر ناتھ کھر سریواستو، ایرانی کے علاوہ ڈاکٹر غلام یزدانی مرحوم اور سعادت علی خاں مرحوم کے کتب خانے ہیں۔

یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ استنے کتب خانوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم حیدرآباد ایک اہم کتب خانہ کی کمی کو بری طرح محسوس کرتے ہیں۔ جس کے بغیر میری دانست میں حیدرآباد میں کتب خانوں کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ میرا اشارہ مشہور نظام میر عثمان علی خاں مرحوم کے خاندان کے اس اہم کتب خانہ کی طرف ہے جو آصف جاہ اول سے آصف جاہ ثامن تک ورثتاً چلا آرہا ہے۔ آصفی سلاطین کے عظیم ذوق علم و ادب کے پیش نظر یہ کتب خانہ جو حضور نظام کی کنگ کوٹھی میں بند حالت میں ہے ایک عظیم دفتر علم و دانش رکھتا ہے۔ کاش جناب آصف ثامن اور ان کے برادر محترم نواب پرنس مفخم جاہ بہادر اس مسئلہ پر توجہ دیں اور دکن والوں کو ایک اہم امانت سے استفادہ کا موقع مرحمت فرمائیں۔ جس سے ممکن ہی نہیں یقین ہے دکنی اردو کی بعض گم شدہ کڑیوں کا سراغ مل سکے گا۔

خط و کتابت کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے

رؤف خلش

۵۲۲ - جدید ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶

غزل

کب کسی راہ پہ چلتے ہیں یہ ٹھہرے سائے
جسم آواز ہی آواز ہیں بہرے سائے

ساون آیا ہے کہ آنکھوں سے جھڑی برسی ہے
غم کی چادر ہے کہ منڈلائے ہیں گہرے سائے

منہ چھپائے سبھی پھرتے ہیں اندھیرا پاکر
دیکھو تو نوچ نہ لیں رات کے چہرے سائے

بے خطاؤں کو بھی اب ڈسنے لگا جرم کا خوف
چار دیواری میں دینے لگے پہرے سائے

زرد سورج کو گھنی شام سے مل لینے دو
اس کو کھا جائیں نہ پگھلا کے سنہرے سائے

بھیک مانگی ہوئی بینائی کسے کیا دیتی
راستے آج نظر آتے ہیں گہرے سائے

اب کے برس، پتوں کا موسم جھڑا یا سا آیا
اب کے برس سرسوں کا میلہ کمہلایا سا آیا

دور دور تک راکھ اُڑے، آکاش چھپے
ندیوں کے پانی میں سرگم، پاؤں کے چپ
شبنم شبنم شیشے مانگیں، ہوا کا پہرا

پیلا پیلا
دھول اڑاتے کالی کالی، سناٹے کا بیلا آیا
پیلا کیسی سانجھ پکارے، کوئی آئے کے پیچھے
چاند کے نیلے ہونٹ کی آہیں

میرا میرا پنکھ پکاریں
چمپا موتی بیچ سجائے کومل تا کی رات نگاریں
آموں کے بوروں کی خوشبو پنکھ نمارے راہ بچھائے
کالے گیتوں کے جھمن کی آس لگائے

اب کے برس کالے گیتوں کا امرت بھی زہرایا
اب کے برس پتوں کا موسم جھڑا یا سا آیا

اختر یوسف

چرچ روڈ - رانچی ۱ (بہار)

محسن علی
ویلفیر آفیسر سنگارینی کالریز
ڈاک خانہ یلیندو۔ ضلع کھمم

"تنہائی بھی اپنی جگہ ایک الاؤ ہوتی ہے جسکی آگ میں جذبات واحساسات اس طرح سلگ اٹھتے ہیں کہ انکی تپش سے ہوائیں بھی دراغ کر جلتی ہیں"

کیدار ناتھ نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا کیونکہ زمانہ بعد آج شام اس نے اپنے گھر میں اپنے آپکو اچانک تنہا پایا تھا۔ اسکی بیوی لیڈیز کلب کی ایک پکنک پر چلی گئی تھی جو شہر سے دور ندی کنارے منائی جا رہی تھی، رات میں — MOON LIGT — DINNER تھا اور شاید ندی کنارے ہی رات گزارنے کا پروگرام تھا — کیدار ناتھ کو یہ خیال اچھا لگا کہ وہ دوسرے دن صبح لوٹنے والی ہے۔ بچے چھٹیاں منانے کے لئے اپنی ماں کے گاؤں چلے گئے تھے۔ گھر کی نوکرانی کے بارے میں خود کیدار ناتھ نے بڑی ہی شرافت زدہ لاپرواہی کے ساتھ اپنی بیوی سے کہہ دیا تھا۔ "تمہارے پکنک پر جانے سے پہلے نوکرانی کو بھی اس کے گھر بھیج دو۔ ورنہ وہ جوان ہے، تمہارے جانے کے بعد وہ رہ گئی تو میں کوئی غرمستی نہ کر بیٹھوں" اس بات پر اسکی بیوی نے اسکی طرف ترچھی نظر سے دیکھتے ہوئے ایک بڑا ہی پُر زور قہقہہ لگایا تھا اور جواب میں "میں تو آپ جیسے آپ ہی کے رہنے کے لئے کہہ جاؤنگی۔ دیکھتی ہوں آپ کیا کرتے ہیں" کہنے کے باوجود اپنے پکنک پر جانے سے پہلے نوکرانی کو چلتا کر دیا تھا

کیدار ناتھ کا ایک خوبصورت سا فلیٹ شہر کے ایک چھوٹے سے چوراہے کے ایک بلڈنگ کی بالائی منزل پر تھا۔ اس کے فلیٹ کا ویسے ہر گوشہ بڑے ہی سلیقے سے سجایا ہوا تھا لیکن خاص طور پر وہ چوراہے کے رُخ کی بالکونی بڑی ہی پُر رونق لگتی تھی۔ جسکی سرخ سرخ منڈیر پر بڑے ہی خوش رنگ اور تر و تازہ پودوں والے گملے رکھے تھے اور گول گول سرخ پلاسٹر والے پلرز پر منی پلانٹ کی بیلیں بڑی ہی فراخ دلی سے پھیل گئی تھیں۔

تنہائی میں انسان کے وجود کی حدود کس طرح اچانک وسیع ہو جاتی ہیں۔ کیدار ناتھ نے محسوس کیا کہ اس کا احساس بھی خوف و خطر پھیل کر اس کے سارے فلیٹ پر چھا گیا ہے۔ آج اُسے محسوس ہوا جیسے اب تک اُسکے بدن کے اعضا کسی بے معنی احساس میں جکڑے ہوئے تھے لیکن اب اس جکڑے سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اُس نے اپنے آپکو بڑا ہی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اور اسکا ذہن ؟ — اُس کے ذہن نے تو جیسے ایک طویل قید با مشقت سے اچانک رہائی پائی تھی اور اب وہ دیوانہ وار زندگی کی ساری گھسی پٹی روشوں سے جن پر وہ بار بار چل کر تھک چکا تھا، بہت دور فرار ہو چکا

ایک شام ڈھل گئی

تھا۔ اور ہر سمت کی قید سے آزاد تھا —
اپنے سلیقے سے آراستہ کئے ہوئے ڈرائنگ روم میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے کیدارناتھ نے ہاتھ بڑھا کر قریب رکھے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کیا لیکن پھر روشنی کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے فوراً سوئچ آف کر دیا اور خود صوفے پر تھوڑا اچھل گیا —

جس طرح آئینہ کی سطح پر روشنی کی ایک کرن منعکس ہو جاتی ہے اسی طرح ایک خیال اس کے ذہن پر نمودار ہوا — "وہ!! — " اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ " ایسے میں اگر چمن سے چلی آئے تو کیا ہو۔ وہ تو سبزے میں لپٹی ہوئی سورج کی کرن لگتی ہے۔ ساری تنہائی جگمگا اٹھے گی اور میری جان نکل جائے گی۔

لیکن وہ یہاں [illegible]ئے گی تو کیسے؟ وہ تو سات سمندر پار والی شہزادی ہے — لیکن ویسی ہی اگر کوئی اور آ جائے؟ انکی تو کتنی ہی قسمیں ہوتی اور ہر قسم جمالی لیوا — لیکن مجھے تو وہ قسم بہت پسند ہے۔ لمبی خوبصورت گردن، ترشے ہوئے بال بھرے بھرے شانوں پر جھولتے ہوئے۔ لچکیلی کمر، کولہوں کی نپی تلی جنبش اور چال میں لغزش۔ پیچھے سے دیکھ رہا ہوں تو کیسے جان نکلی جا رہی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سچ ہے — یا — یا پھر وہ سنگِ سیاہ میں ترشا ہوا متحرک مجسمہ۔ سر سے پیر تک سیاہ پتھر۔ پتھر میں گداز۔ ترشے اعضاء میں ہلکی سی چمک۔ بس رات کے اندھیرے میں جیسے صبح کاذب کی ہلکی سی سفیدی — یا پھر وہ — وہ اونچا قد، بھرا بھرا بدن!

— لیکن ہائے، اس کا تو کوئی جواب نہیں، وہ بوٹا سا قد، وہ گٹھا گٹھا یا بدن جو اپنے اندر ایک منہ زور جوانی کی ہر طلب کو سموئے رکھنے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے اور جس کے ہر حصے کو ایک تنی ہوئی کمان کی طرح ٹوٹ

جلنے کا اندیشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے — بہت عجب
ہوتا ہے۔ مجھے بڑا مرغوب ہے —— لیکن وہ
کیا کم ہے۔ وہ کچی گھاس کی تر و تازہ بھیگی بھیگی خوشبو
میں تر بتر کسا کسایا بدن۔ چہرے پر جنگل کی ہواؤں
کی مہک اور ہونٹوں پر کچی فصل کی مٹھاس۔ اور...
اور...." ایسے کتنے ہی خیالات و تصورات
نے کیدار ناتھ کے سینے میں جانے کیسے کیسے جذبات
کا ایندھن جھونک دیا۔ اس نے اپنے ہر سانس
کے ساتھ محسوس کیا کہ اُس کے سینے میں کسی نے
ایک تپتی ہوئی سلاخ رکھ دی ہے۔ اس نے سوچا
اگر اس گرم گرم تپتی سلاخ پر فرج میں رکھی ہوئی
ٹھنڈی شراب انڈیل دوں تو ایکدم کیسا سکون
ہو جائے گا۔ اور کیسی دلچسپ آواز پیدا ہو۔
جیسے تپتے لوہے پر پانی پڑ جائے۔

وہ صوفے سے اٹھ کر بغل کے کمرے میں رکھے
فرج کے پاس گیا اور شراب نکال لایا پھر اُسی
صوفے پر بیٹھ کر اس نے ایک سگریٹ جلائی
اس وقت اُسے روشنی کی ضرورت محسوس ہوئی
ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر دیا۔ سامنے
ایک خوشنما گلاس میں بھری ہوئی شراب کی ٹھنڈک
کے احساس نے سینے میں رکھی تپتی ہوئی سلاخ
کے احساس کو اور شدید کر دیا۔ اس نے
گلاس کو بڑی ہی پر شوق نظروں سے دیکھا اور
بڑے ہی جذباتی انداز میں ہاتھ بڑھا کر گلاس
کو اس طرح تھام لیا جیسے کسی حسین عریاں بدن
کو اس نے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ پھر اُسے
اپنے بیتاب ہونٹوں سے لگا کر دو تین گھونٹ
ایک ساتھ پی لئے۔ ٹھنڈی شراب سینے کی تپتی
سلاخ کو اس طرح بجھاتی ہوئی اتر گئی کہ سینے
کی حدّت اُس کے سارے بدن میں پھیل گئی
اس نے گھڑی بھر کے لئے، آنکھیں بند کر لیں۔
بند آنکھوں کی ہلکی روشنی میں کتنے ہی رنگ پھیل
گئے۔ پھر آنکھیں کھول کر گلاس کے دمکتے ہوئے
شراب کی ٹھنڈک میں تر بتر کناروں کو دیکھا اُ
مسکرا کر پھر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر صوفے
سے اٹھ کر بالکنی میں چلا آیا اور نیچے چوراہے کی
ٹریفک کا نظارہ کرنے لگا۔

چوراہے پر آنے جانے والوں میں اسے کہیں
کوئی مرد نظر نہیں آیا۔ صرف عورتیں ہی عورتیں نظر
آئیں۔ ہر قسم کی عورتیں اور وہ بھی حسین و جوان
قد آور، تنک کر چلنے والی۔ بھاری بھرکم، سنبھل
سنبھل کر چلنے والی۔ رفتار کے ساتھ مٹک مٹک
کر چلنے والی —— یہ "خد و خال وہی تو ہیں وہی
لمبی گردن، ترشے بال، بھرے بھرے شانوں
اور کولہوں کی دلآویز جنبش —— وہی رنگ ریلا؟
میں ترشے ہوئے مجسمے مدھم مدھم، روشن روشن
اور وہ آگ کا شعلہ ہواؤں میں لپکتا ہوا ——
ہوائیں ایسی سنسنا رہی ہیں جیسے سارا وجود کسی
طوفان کی زد میں آنے والا ہو —— یہ سب اُنہی
تو ہیں، ہو بہو وہی۔ کیا خوب منظر ہے۔ سیاہ

امنڈ نے بادل پریشاں پریشاں ہر نیاں بھیگی ہوائیں۔ خوشبوئیں خوشبو سنی ہی مستی، چلو شراب پئیں "وہ اپنے کمرے کی طرف پلٹ ہی رہا تھا کہ اُس کی نظریں چولہے پر ایک نقطے پر آکر ٹھہر گئیں " ارے یہ تو وہی ہے۔ بالکل وہی، مسز تراشا۔ میری بیوی کی دوست۔ جو اکثر اسی وقت یعنی شام میں ملنے آیا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اُسے معلوم نہ ہو کہ اُسکی دوست پکنک پر گئی ہوئی ہے۔ یا ــــ ہو سکتا ہے معلوم بھی ہو اسی لئے کہ اکثر وہ مجھے میری بیوی کی نظر بچا کر ایک ایسی نظر سے دیکھتی ہے جس میں ایک بیتاب بدن کا ہر لمس شامل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اپنا پرس اپنے سامنے دونوں ہاتھوں میں لٹکائے اور میری طرف ایک ترچھی نظر سے دیکھتے ہوئے مسکرا مسکرا کر میرے بیچ اس قدر قریب سے گذرتی ہے کہ اُس کے لباس کی سرسراہٹ میں یہ الفاظ صاف سنائی دیتے ہیں " ہمت ہے تو مجھے پکڑ لو " یا پھر کبھی اپنی گوری گوری بانہہ کو اپنے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے جھکی جھکی نظر سے اس طرح دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو " یہاں درد ہے، ذرا ہاتھ رکھ دو " یا پھر کبھی اپنی ساری کے پلو کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں اس طرح گرا دیتی ہے جیسے کہہ رہی ہو " پکڑ کر کھینچ لو۔ تم کھینچتے رہنا میں دور بھاگ جاؤنگی ــــ کیدارناتھ نے دیکھا اس وقت مسز تراشا اس سے دور نہیں بھاگ رہی ہے بلکہ اُسی کی طرف آ رہی ہے۔ اُسے اندیشہ سا ہوا کہ مسز تراشا کہیں اُسے بالکونی میں کھڑا دیکھ کر اس کے گھر آنے کا ارادہ نہ بدل دے۔ وہ سیدھے کمرے میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ گلاس میں تھوڑی شراب انڈیلی اور پی گیا۔ اور اس یقین کے ساتھ کہ مسز تراشا اُسکے گھر آ رہی ہے اُس نے اپنے خیالات کی رفتار مسز تراشا کے قدموں سے ملا دی۔

" اب وہ روڈ کراس کر رہی ہے۔ اب وہ نیچے گیٹ کے پاس آ گئی ہے۔ گیٹ کے پاس کے ورانڈے تک بنے ہوئے گرینوں پاتھ پر اپنی ہائی ہیلز سے سنبھل سنبھل کر چل رہی ہے۔ اب ورانڈے سے ہوتے ہوئے اوپر آنے والی سیڑھیوں پر قدم رکھا ہے ــــ اور یہ ٹک ٹک ٹک کی آواز، وہ سیڑھیاں چڑھ رہی ہے لیکن اس ٹک ٹک کی آواز میں بے باکی نہیں ہے دبے دبے، سہمے سہمے قدموں کا انداز ہے۔ ضرور ــــ ضرور مسز تراشا جانتی ہے کہ آج گھر پر میں اکیلا ہوں ــــ کیوں نہ جا کر دروازے پر اسکا استقبال کروں۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ مجھے دروازے پر دیکھ کر وہیں وہ میری بیوی کے بارے میں پوچھ لے اور پھر گھبراہٹ میں وہیں سے واپس ہو جائے۔ یہ مناسب نہیں۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ جلدی سے بھاگ کر دروازے کا بولٹ نکال کر اُسے تھوڑا سا کھلا چھوڑ دوں اور فوراً واپس آکر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤں۔ جب وہ دروازہ کھلا پائے گی تو یقیناً اپنی خواہش کے مطابق تھوڑا اندر آ جائے گی۔ باہر آواز دے گی

تو میں چپ رہونگا۔ وہ کچھ اور اندر آئے گی تو اُنکی جھجک تھوڑی بہت دور ہو جائے گی اور کھلا دروازہ اُسکے لئے اسکے اندر آجانے کا ایک موزوں بہانہ بن جائیگا اور اسکی گھبراہٹ بھی کم ہو جائیگی لیکن جب وہ لازماً پہلا سوال یہ کرے گی کہ میری بیوی کہاں ہے؟ اور اسکو متوقع جواب مل جائیگا تو بظاہر وہ فوراً واپس چلے جانے کا ارادہ ظاہر کرے گی تب میں اُسے اندر کس بہانے بلاؤں گا سب کے سامنے جو دوری ہوتی ہے اُس میں تو نظروں اور اشاروں میں بہت سی باتوں کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن تنہائی اور قربت میں پہلی بار نہ اشارے ہی موزوں لگتے ہیں نہ زبان کھلتی ہے ہاں، میں مسٹر تراشا کے بارے میں کچھ دریافت کرونگا۔ تو اُسے بھی گفتگو کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے موضوع مل جائیگا اور یقیناً وہ مسٹر تراشا کے بارے میں کچھ ایسی بات کرے گی جس میں مسٹر تراشا سے ایک بیزارگی کا اظہار ہوگا۔ اس لئے کہ مسٹر تراشا کچھ اسقدر شریف الطبع کم سخن اصول کا پابند اور شیریں زبان آدمی ہے کہ اُسکا کوئی انداز عورت کو شوخی و شرارت پر اکسا نہیں سکتا۔ اور عورت کے ستائے جانے کی خواہش دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ مسٹر تراشا اگر شراب ہی پیتا ہوتا تو مسز تراشا اُس سے بہت خوش رہتی —— ہاں Situation is favourable ہے یہ سوچ کر کہ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا اور جلدی سے دروازے کا بولٹ نکالکر دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا۔ اور پھر واپس آکر اپنے صوفے پر بیٹھ گیا —— "ہاں، اب وہ شاید پاؤں دروازے تک آگئی ہو۔ گھبراہٹ میں اسکا سانس پھول گیا ہو۔ قدم بھاری ہوگئے ہوں وہ ضرور دروازے میں داخل ہونے سے پہلے اپنے آپ کو سنبھالے گی۔ اور..." اس نے گلاس میں جتنی شراب تھی ایک ہی گھونٹ میں پی لی —— وہ اب وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے دروازے میں کھڑی مسز تراشا کے بھرپور جسم کے وجود کو محسوس کر رہا تھا —— "بس اب دروازہ کھلنے یا کھٹکھٹانے کی آواز آئیگی، یا قدموں کی آہٹ۔ یا مسز تراشا کی سُریلی آواز جو یقیناً بجلی کی تیزی سے اُسکی رگ رگ میں دوڑ جائیگی"۔ اُس نے گھڑی دو گھڑی کے لئے اپنا سانس روک لیا۔ اور اپنے ہر احساس کو دروازے کی چوکھٹ تک پہنچا دیا ——

دو تین لمحے چپ چاپ گذر گئے اس طرح کہ پورے کا پورا ماحول ہلکا ہلکا شور بھی سکوت بنا رہا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف نظر ڈالی۔ پھر صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بڑے ہی محتاط قدموں سے چلتا ہوا دروازے تک چلا گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی دروازے میں کوئی کھڑا ہو کر واپس چلا گیا۔ دروازے سے باہر جھانک کر اس نے نیچے نظر ڈالی۔ دور تک اُسے سیڑھیاں ہی

سیڑھیاں نظر آئیں۔ سیڑھیوں کے ختم پر نیچے جو دروازہ تھا وہ اچانک کھل کر بند ہو گیا جیسے ہوا کا تیز جھونکا آیا ہو ـــ کیدار ناتھ نے اپنے آپ سے کہا "چلی گئی" پھر اُس نے یہ سوچ کر آگے قدم بڑھایا کہ نیچے گیٹ تک جا کر دیکھے کہ مسز تراشا واپس چلی گئی ہے یا ابھی تک وہیں نیچے کھڑی ہوئی ہے لیکن دوسرے خیال نے اُس کے قدم روک لئے کہ اگر وہ مسز تراشا کو نیچے راستے پر دیکھ بھی لے تو راستے پر چلنے والوں کے سامنے اُسے واپس بلائیگا کیسے؟ کیا کہے گا اس سے؟ بہتر ہوگا بالکونی میں جا کر کھڑا ہو جائے اور نیچے وہ نظر آجائے تو دور ہی سے اُسے اشارہ کر دے یہ زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ ضرور آجائیگی ـــ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا واپس بالکونی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ بیرراستے کی بتیاں جل چکی تھیں۔ ٹریفک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور کچھ زیادہ ہی رنگ بکھر گئے تھے۔ اس بار راستے سے گذرنے والی ہر عورت اُسے مسز تراشا نظر آئی لیکن کسی نے اُس کی طرف نہیں دیکھا ـــ

کیدار ناتھ کی نظریں ہر عورت کا تعاقب کر رہی تھیں اور اُن رنگ برنگی، تیزی سے گذرنے والی شکلوں کے ساتھ اُسے اپنی شام کے گذر جانے کا احساس ہونے لگا اور ساتھ ہی اُسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ شراب کا نشہ دھیرے دھیرے اترنے لگا ہے۔ اُسے یقین ہونے لگا کہ مسز تراشا چلی گئی ـــ شام کے رنگوں میں سیاہی زیادہ غالب نظر آنے لگی ـــ اُس نے واپس اپنے روشن کمرے میں قدم رکھا۔ شراب گلاس میں انڈیلی اور پھر ایکساتھ دو تین گھونٹ اتار لئے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ جلایا ـــ سارا گھر خالی تھا، کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ سارا گھر چپ تھا "یہ کیا ہو گیا" شراب کے دو گھونٹ اور پی لئے ـــ

"لیکن اگر وہ اندر آجاتی تو؟" ـــ تو میں بڑے ہی خوشگوار انداز میں نمستے کہتا اور اپنے دل کے چور کو چھپانے کے لئے بڑے ہی اخلاق سے پیش آتا۔ کھلی آواز اور صاف لہجے میں کہتا: میں اکیلا ہوں، دو منٹ بیٹھ کر جائیے: ہے بھی میرے ساتھ اندر آجانے کا موقع مل جاتا۔ بس ایک بار ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ جاتی تو ہر مشکل اپنے آپ حل ہو جاتی۔ مجھے نشے میں دیکھ کر اس پر بالکل ویسا ہی خوف طاری ہو جاتا جو عورتوں کو بہت ہی مرغوب ہوتا ہے۔ کسی کمزوری کو چھپانے کے لئے عورت اس قسم کے خوف کو اپنے آپ پر طاری کر لینا بہت ضروری سمجھتی ہے۔ میرے سامنے رکھی شراب کو دیکھ کر وہ ضرور اپنے چہرے سے ناراضگی کا اظہار کرتی۔ صرف یہ چھپانے کے لئے کہ دل میں وہ خوش ہے۔ اُسکے چہرے کی ناراضگی کو دیکھ کر میں اُس سے کہہ دیتا: "معاف کرنا، مجھے شراب کی بڑی بری عادت ہے۔ میں ایک خراب آدمی ہوں۔" یہ سن کر ضرور وہ اس طرح مسکرا دیتی جیسے

دل ہی دل میں اُس نے میری یہ بات پسند نہیں کی۔ پھر میں ازراہ مذاق اُسے یہ احساس دلاتے ہوئے کہ نشے میں تھوڑی بہت لغزش جائز ہوتی ہے۔ اُس سے کہتا "آپ تو بڑی ہی Advance لگتی ہیں۔ آپ نے کبھی پی ہے؟" یقیناً اسکی آنکھوں میں سرخیاں پھیل جاتیں۔ کسی خوف یا غصے کی نہیں بلکہ ایک ڈھکی چھپی خواہش کے ابھر جانے کی سرخیاں کہ کوئی اُس سے بھی کبھی ایسا سوال کر دے۔ اور پھر بھی مذاق نما موڈ جاری رکھتے ہوئے کہتا۔ آپ جانتی ہیں ایک شرابی کو اتنا مزہ اور کسی بات میں نہیں آتا جتنا کسی شراب نہ پینے والے کو پلانے میں آتا ہے"۔ اور پھر ہمت کرکے کہہ دیتا" اور آپ تو ایک حسین ساقی ہیں اور لیجئے" کہہ کر نشے کے سہارے گلاس پیش کر دیتا۔ وہ مزید یہ بتاتے ہوئے کہ وہ گھبرا گئی ہے۔ یہاں سے چلی جانا چاہتی لیکن اپنی جگہ سے نہیں اٹھتی۔ تب تو میں اپنے نشے میں زیادہ لغزش کرنے کا حق کئے اُس کے قریب چلا جاتا اور اپنی آنکھوں کو زیادہ نشیلی بنا کر اُسکی طرف دیکھتا۔ یقیناً وہ آنکھیں جھکا لیتی۔ تب ایک یقین کے ساتھ میں اُس کے سینے پر سر رکھ دیتا وہ ضرور اپنی طرف کھینچنے کے انداز میں مجھے ڈھکیلنے لگتی اور..... ــــ لیکن وہ چلی گئی"۔ کیسا موقعہ ہاتھ سے چلا گیا" کیدار ناتھ نے گھڑی بھر کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔" ہوتا ہے، ایسا بھی ہو جاتا ہے، بس جب جب آپ شراب پیتے

چلے جاؤ ــــ

..... وہ بھی تو ایک شام تھی۔ کالج کے ایک بڑے ہال میں کیسا ہنگامہ تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور میں کس طرح اپنے ساتھیوں کی نظروں سے بچتے بچاتے ہال سے باہر نکل گیا تھا۔ جب میں لیڈیز روم کے قریب پہنچا تھا۔ لیڈیز روم کے سامنے گھنے پیڑ کے نیچے شام کی ہلکی سیاہی میں لپٹی لپٹائی وہ اکیلی کھڑی ہوئی تھی وہ دہی تھی قلوپطرہ ــــ جو روز کالج میں اور کالج کو آنے والے راستوں پر قتل عام کیا کرتی تھی۔ اُسکی اُن موت کا حکم صادر کرنے والی آنکھوں سے بچ رہنا شاید کسی کے لئے بھی ناممکن تھا۔ لیکن دنیا بھر کے فدائیانِ حسن کو موت کے گھاٹ اتار کر پتہ نہیں کیوں اُسے اپنی قاتل آنکھوں سے مجھے زندگی کا پیام دیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کالج کے سب نوجوان میری رعایا ہیں اور میں اُن کا تاجدار ہوں۔ اور اس شام جب میں لیڈیز روم کے سامنے اُس سے کچھ دور کھڑا ہوا تھا اُس کے اور میرے بیچ کے دھندلے فاصلے کو اچانک اپنی آنکھوں سے روشن کر دیا تھا اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج کی رات شاہی محل کی حشر خیز خوابگاہ میں گذرے گی۔ پھر اس نے اپنی انہی روشن آنکھوں سے حکم دیا تھا،" چلو قتل گاہ چلیں۔ ٹھیک اس وقت ان دھندلکوں میں دوسری طرف

ایک نوجوان نمودار ہوا تھا جس کو اس نے بھی
دیکھا تو تھا لیکن ایک شاہانہ استغناء سے نظر انداز
کر دیا تھا اور پھر مجھے دیکھتے ہوئے آہستہ خرام
شاہانہ رفتار کے ساتھ چلتی ہوئی اپنی خوبصورت
کار میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے بہت اچھی طرح
یاد ہے گھڑی بھر اس نے مجھے بڑے ہی صاف
انداز میں منتظر نظروں سے دیکھا تھا لیکن جانے
کیوں ان دھندلکوں میں چھپے ہوئے اس نوجوان
کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا تھا: "یہ سازش ہے"
میرے اٹھتے قدم رک گئے تھے ادھر کار
اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی۔ ایسا لگا تھا
جیسے اکسیلیٹر کو اس نے ضرورت سے زیادہ
۔۔۔ پریس کر دیا تھا۔ کار پہلے ہی جھٹکے میں
بجلی کی طرح چمک کر ان اندھیروں میں غائب
ہو گئی تھی۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف میں
تھا اور گہرا اندھیرا۔۔۔ پیچھے ہال میں ایک
شور مچا ہوا تھا، زور زور کی تالیوں کی گونج اور قہقہے
کیدار ناتھ نے اپنے آپکو یقین دلایا ۔۔۔
"شاید میں نے ٹھیک ہی سوچا تھا ٹھیک ہی
فیصلہ کیا تھا۔ محفوظ راہیں زندگی کی تعمیر کی طرف
جاتی ہیں لیکن فطرت کے تقاضے تخریب چاہتی
ہیں۔ تخریب کتنی دلآویز اور عیش و نشاط سے بھرپور
ہوتی ہے۔ چھی چھی ۔۔ یہ کیا غیر غلط خیالات آنے
لگے ہیں۔ کہیں شراب میں مٹھاس نہ آجائے
اس نے سوچا۔ اور ذرا اطمینان کے ساتھ شراب
کی بوتل اٹھائی۔ اس احساس کے باوجود
اس کے سارے ہوش و حواس نشہ کی زد سے
ابھی محفوظ ہیں۔ اس میں ایک نیا فل پیگ تیار
کیا اور پورے سکون کے ساتھ ایک سگریٹ
جلایا اور طے کیا: "چلو اطمینان سے شراب پئیں
لیکن، لیکن کیا غضب کی چیز ہوتی ہے عورت
بھی ۔۔ اسکی آگ میں جلو تو محسوس ہوتا ہے
دوزخ کی آگ جنت میں نصیب ہو گئی ہے
اور پھر عورت بھی اگر ویسی ہی ہو جیسی وہ مس رانی
تھی۔ کیسے باغی دماغ اور باغی بدن کی عورت
تھی جو بیس، پچیس سال عمر، اسنے آپکو کچھ اس
قسم کی ہلچل بنی تھی جیسے بجائے خود ایک انقلاب
ہے ۔ جہاں پہنچ جاتی ایک غدر مچ جاتا۔ اس
لئے چھ سال شکاگو میں تین سال فرینکفرٹ میں
اور پانچ سال بیروت میں گزار رہے تھے۔ اس
کے دولتمند باپ نے اپنی بیٹی کو ہندوستان
کے پسماندہ معاشرہ کے اثر سے محفوظ رکھنے
کی کوشش کی تھی۔ چونکہ کچھ ہی دن پہلے وہ بیروت
سے لوٹی تھی۔ وہاں کی ادبی اور کاسموپولیٹن
سوسائٹی کا ذکر بار بار کیا کرتی تھی۔ جہاں کی جسم
و جاں میں آگ لگانے والی رنگین اور عیش و
نشاط سے بھرپور شاموں نے معزول شدہ
عیاش شاہوں ملکاؤں اور مختلف ملکوں کے
صدور اور دوسری سیاسی شخصیتوں کو اپنی
آغوش میں پناہ دی تھی اور سب کو یکجا کر دیا
تھا۔ مس رانی نہ صرف اُن لوگوں کی صحبت میں
گذری Luxury Nights کی بات

کرتی تھی۔ وہ تو بڑے ہی غیر معمولی انقلابی تصورات رکھتی تھی۔ یونہی ایک دن کسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے اُس نے مجھ سے کہا تھا"..... شادی انسان کی جبلت جنس کو کبھی مہذب نہیں بنا سکتی۔ آپکو معلوم ہے مسٹر کیدار ناتھ میرے پاس لفظ مہذب اور لفظ مفید کے معنوں میں کوئی فرق نہیں۔ جوانی تو پیارا افق تا افق پھیلا ہوا آسمان ہے اور جنس سورج ہے جو سارے آسمان کو اور ساری کائنات کو روشنی اور زندگی کو حرارت بخشتا ہے۔ بھلا آپ سورج کو کس طرح گرفتار کر سکتے ہیں"۔ میں نے جب اس کے خیال سے اتفاق کیا تھا تو وہ اپنے عریاں شانوں کو بڑی ہی دلبرانہ حرکت دے کر مسکرا پڑی تھی۔ اور پھر بہت ہی قریب آجانے کے انداز میں اپنی بیروت کی شاموں کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ اور جانے کیوں بڑی ہی دھیمی آواز میں مجھ سے کہا تھا" بیروت میں میں نے جو شیمپین پی ہے اُس کا ذائقہ زندگی بھر زبان سے نہیں جائے گا۔ جانتے ہو میں نے پہلی بار وہیں شراب پی تھی۔ اس لئے نہیں کہ اس کا مزہ چکھ کر دیکھوں یا کوئی تجربہ کروں بلکہ اس اعتقاد کے ساتھ کہ شراب عورت کے وجود کا دوسرا حصہ ہے۔ اور جب شراب عورت سے مل جاتی ہے تو عورت کی زندگی کی ہر شکل مکمل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ چاہے تو واقعی فاتح عالم بن سکتی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ کچھ اس طرح ہنس پڑی تھی کہ ایک الاؤکی موسیقی کی ہلکی ہلکی لہریں میرے روم روم سے ٹکرا گئی تھیں۔ تب اس نے مجھ سے اور قریب آکر کہا تھا: "چلو گھر چلیں۔ اماں میرے پاس بیروت کی شیمپین رکھی ہے۔ وہاں چل کر پئیں"۔ پل بھر کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے بیروت کی Luxury Night اپنی پوری کی پوری یکلخت میری باہوں میں آگئی ہے لیکن جواب میں میں نے اُس سے کہا تھا "نہیں آج نہیں کل، آج تو میری جوانی کے پھیلے ہوئے آسمان پر وہ گھٹتا ہوا چاند روشن ہے جسے بیوی کہتے ہیں"۔ تو وہ زور سے ہنس پڑی تھی اور پوچھا تھا۔ "کہاں ہے تمہارا وہ چاند؟" میں نے کہا تھا۔ "وہ کلب کے دوسرے رخ پر اپنی سماج سدھار مہلاؤں کے ساتھ رمی کھیل رہی ہے۔

مس رمانی ایک بار پھر زور سے ہنس پڑی تھی۔ لیکن ہنسی میں ایک پھیکا پن تھا۔ پھر اس نے میری بات دُہرائی تھی آج نہیں کل اور پھر "کاش تم مجھے بیروت میں ملتے۔" کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔

دوسرے دن میں کلب کو تنہا گیا۔ لیکن اُس دن ٹھیک اُسی انداز میں مس رمانی ایک دوسرے شخص کے ساتھ بحث کر رہی تھی۔ اور مجھ پر ایک اُچٹی سی نظر ڈالکر کہا تھا۔ "آج نہیں کل"۔ ــــ وہ کل کبھی نہیں آیا ــــ

کیدار ناتھ نے گلاس میں بچی ہوئی شراب ختم کر دی

لیکن اُسے کوئی تشفی نہیں ہوئی۔ بڑے ہی بے ڈھنگے انداز میں اُس نے گلاس میں اور شراب انڈیلی اور تیزی سے چڑھالی۔ سگریٹ کے دو تین کش لیے ـــ "وہ تو سب بکھ گیا بھاڑ میں۔ لیکن آج کی شام؟ آج تو جاں جلی جائے لیکن یہ شام نہ جائے۔ یہ نشہ ہی نشہ، بدن میں لگی ہوئی آگ۔ پھر یہ لذتوں کی ترنگ میں گنگنانے والی تنہائی۔ دل کی دھڑکنوں کی طرح سرگوشیاں کرتے ہوئے لمحے کسی نہ کسی منزل کی طرف نشاندہی کر رہے ہیں۔ پھر آگے تو بڑی ہی آزادی سے پھیلتی ہوئی رات ہے۔ بنا روک ٹوک کے بڑھنے والے خوش رنگ اندھیرے ہیں جیسے زندگی بڑی ہی فراغت سے نشیلے انداز میں بھگوڑی نیت کا اظہار کرتے ہوئے انگڑائی لے رہی ہو۔ ابھی بہت وقت ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے ـــ ہاں، بغل کے فلیٹ میں کام کرنے والی جولی ـــ جوان بھی ہے، کالی بھی، بالکل اس رات کی طرح گداز گداز ـــ پیسہ کیا نہیں کرتا۔ اور وہ تو ـــ چلتی بھی ہے۔ ضرور آج بھی ہمیشہ کی طرح اپنے ورانڈے میں بیٹھی ہوئی اپنے صاحب میم صاحب کا انتظار کر رہی ہوگی ـــ

اس یقین کے ساتھ کیدار ناتھ اپنی جگہ موثر تھا اور ڈرائنگ روم کی پچھلی کھڑکی کے پاس جاکر اس پر پڑا ہوا پردہ ہٹا دیا۔ اس لئے بھی کہ وہ خود بھی جولی کو صاف طور پر نظر آسکے ـــ لیکن جولی ورانڈے میں نہیں تھی۔ کیدار ناتھ نے مناسب سمجھا کہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہے۔ شاید وہ ورانڈے میں نکل آئے۔" اسکا اندازہ صحیح نکلا۔ اس نے کسی کے گنگنانے کی آواز سنی۔ وہ مسکرا پڑا یہ سوچ کر کہ جذبے میں صداقت ہو تو جذبہ بے اثر نہیں ہوتا۔ بڑی ہی ترنگ میں جھومتی گنگناتی جولی ورانڈے میں آگئی۔ کیدار ناتھ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ زور سے کھانسا۔ جولی نے نظر اٹھا کر اُسکی طرف دیکھا اور ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔ کیدار ناتھ نے تھوڑی سی احتیاط کی خاطر ذرا ادھر ادھر نظر دوڑائی، جولی کو اشارہ کرتے ہوئے کوئی اُسے دیکھ نہ لے۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ لیکن اُس ایک لمحے میں جولی ورانڈے سے غائب ہو چکی تھی۔" ارے کہیں جولی نے یہ نہ سمجھ لیا ہو کہ میں کسی اور کو دیکھ رہا تھا۔ نہیں یہیں ٹھہرے رہو۔ شاید وہ پھر باہر آجائے۔" اس نے سگریٹ کے ایک ساتھ دو تین کش لئے اور وہیں ٹھہرا رہا۔

لیکن اس وقت مقابل کے ایک دوسرے فلیٹ سے آنے والی ایک زوردار جھنکے کی آواز نے کیدار ناتھ کو چونکا دیا۔ اس نے دیکھا کہ اندر سے پھینکی ہوئی کوئی چیز زور سے اُس فلیٹ کی بند کھڑکی کے شیشے سے ٹکرائی اور شیشہ ٹوٹ کر نیچے گلی میں گر پڑا۔ اس ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے چھن کر آنے والی روشنی اچانک کیدار ناتھ پر پڑی اور اس روشنی کے ساتھ ایک

عورت کے غصے میں بلبلانے کی آواز بھی آئی۔
"کمینے، حرام خور — سؤر کے بچے — تو نے
دھوکہ دے کر میری بہن کی زندگی تباہ کی۔ اب
مجھ پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ میں تو اپنی بہن کا بدلہ لینے
آئی ہوں۔ آج — حرام کے پلے، آج میں
تجھے کچا چبا جاؤں گی —" پھر ایکبار ایک زور
کا چھناکا سنائی دیا اور اس بار ایک بوتل
کھڑکی سے ٹکرا کر فضا میں لہرائی اور نیچے گر پڑی
اس بار کیدارناتھ نے اس فلیٹ میں ایک
مرد کا قہقہہ سنا۔ قہقہے کی آواز میں نشیلا پن
تھا، بڑی ہی گہرائی تھی، بے پرواہی تھی —
ساتھ ہی عورت جیسے پھر بے قابو ہو کر چیخ پڑی
ہو — "دیکھ حرامزادے، میرے ہاتھوں میں
یہ چاقو ہے۔ دیکھ، ابھی تیرا کلیجہ باہر نکل
پڑے گا۔" عورت جیسے دیوانگی کے عالم میں
چیختے ہوئے مرد پر جھپٹ پڑی ہو۔ مرد نے ایک
بار پھر قہقہہ لگایا۔ لیکن گھڑی بھر کے بعد اچانک
خاموشی چھا گئی —

کیدارناتھ اپنی کھڑکی میں کھڑے ہوئے برابر اس
مقابل کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی پر نظریں جمائے ہوئے
تھا۔ "کہیں وہاں خون . . . " لیکن پھر مرد کی
آواز آئی۔ مرد ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا —
"مجھے مار دے، میری جان لے لے۔" پھر گھڑی
بھر بعد اس ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے قریب ایک
جوان عورت نمودار ہوئی۔ کیدارناتھ نے دیکھا
اُسکے ترشے ہوئے بال اُسکے شانوں پر بکھرے
ہوئے تھے۔ اور کمرے کی روشنی میں اسکا گدرا
اور بھرا بھرا بدن چمک رہا تھا۔ وہ بالکل ننگی
تھی۔ اس عورت نے کچھ آگے بڑھ کر کمرے
کی لائٹ کا سوئچ آف کر دیا — وہ ٹوٹی ہوئی
کھڑکی نظروں سے غائب ہو گئی اور کیدارناتھ
کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ جیسے ساری
رات اُسکی آنکھوں میں منجمد ہو گئی ہو۔ ■■

کمار پاشی
۳۲۷۱- دہلی گیٹ. دہلی
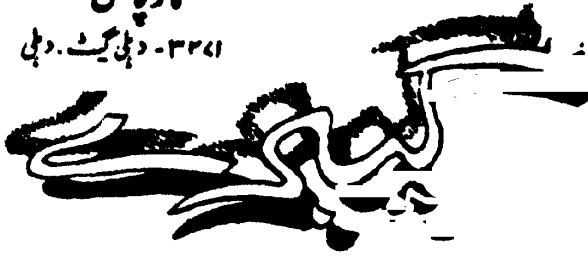
سر سے پاؤں تک مری آنکھوں میں ہے وہ
ڈھول کی آواز پر اب
خوں، اُبلتے خون کا سیلاب گردش کر رہا ہے
ساز کی مجروح، پُراسرار اور وحشی صدا کی سنسناہٹ گونجتی ہے
ساز کی مجروح، پُراسرار اور وحشی صدائیں
جھاڑیوں میں سانپ جیسے سرسرائیں

سُرخ، نیلے
سبز، پیلے
قمقموں کے نیم روشن دائروں میں
گوشت زندہ ہو گیا ہے
وہ مری آنکھوں میں
میں اس کے بدن میں قید ہوں اب
جلتے، بجھتے قمقمے ہیں اور دہشت جنگلوں کی
ساز پُراسرار اور وحشی صدائیں
اک مسلسل سائیں سائیں
نیم روشن گوشت اور وحشی صدائیں
گوشت، زندہ گوشت اور وحشی صدائیں
ایک جاری اور مسلسل سائیں سائیں . . .

افقی خط

اُفق کا کنارا
زمیں کا ہے مارا
یہ محکوم
آرام ہے جس کو پیارا
یہ اُفق کی لکیر
یا اس دھرماں کی تفسیر
ادائے نحوست
حرکت سے خفا
سکوں آشنا
بے حس و بے ادب
فنا کی علامت
کیے کی ندامت
یہ بے سر ہے بے تال ہے
ایک کاہل کا احوال ہے
یہ تفکر کی شکن
اور یہ نقشِ تھکن

مربع

یہ مربع ہے متحد اربع
قائم الزاویہ ایماں اس کا
اس کے چاروں ضلع مساوی ہیں
یہ ہے اک شکل کہ روکارِ حرم
جس کے ہیں چار یارِ کرم
ایک تاریخ و تمدن کی بنا معیاد
یعنی اہرام مصر کی بنیاد
یہ طریقت کی شباہت کو لیے
بن گیا جیسے یہ شریعت کا نشاں
اس کو جمہور کی طاقت کہیئے
اشتراکی ہے جہاں اس کا مکاں
سواستک اوم کی علامت ہے
یہ حرکت ہے اور صداقت ہے
بن گیا یَنْتْرَم برہمن کا
ہوگیا جو کھٹا دُعاؤں کا
اس کا احساسِ حجم
علم و عمل کا مظہر
ایک ہے دور بہ شکلِ مکعب
نقش کے واسطے یہ جانِ طرب

سعید بن محمد ۴-۲۷ آرٹی، وجے نگر کالونی، حیدرآباد - ۲۸

مشہور مصور سعید بن محمد ان دنوں نظموں کے ذریعے خطوط، اشکال اور رنگوں کی شعری آہنگ میں توضیح و تشریح کر رہے ہیں وہ اس طرح اردو شعر کو جاندار اور متحرک علامتوں سے

پیلیا (یرقانی)

بھوک اور فاقہ ہے یہ یرقانی
جھوٹ ہے مکر، ریاکاری ہے
دعوتِ مرگ ہے
بیماریٔ یرقاں جیسے
اس کے قدموں سے فنا ہوگئے کھیتوں کے نشاں
قحط کی گود میں آباد کئے اس کے مکاں
ایک مفلس کا بدن
بے وفائی ہے مزاج
ایک منحوس ادا ہے اس کی
جامۂ جہل ہے یہ
دشمنی اس کا طریقہ جیسے
عشق میں اس کا وطیرہ ہے فریب
زندگانی کے لیے دھوکا ہے
نقش کے واسطے یہ مایوسی

نارنجی

گلِ نارسا
شوخ جذبے کی ترنگ
اک شوقِ خودنمائی
جیسے اک حربۂ جوانی
چنچل مزاج اس کا
جنسی سماج اس کا
ہے یہ شعلے کا شباب
جیسے سنترے کی شراب
حرفِ آغازِ حرارت
سارے رنگوں میں شرارت
نیج رنگ کا بدن ہے یہ
غصے کا سخن ہے یہ
جھنکار یہ ترب کی
دلہن ہے یہ شفق کی
آواز یہ رنگوں کی
تصویر یہ شعر گل کی
گوگاں تھا اس کا عاشق
اور نقش ہے شیدائی

مانوس کرنا چاہتے ہیں تاکہ اظہار کے لفظی وسیلے زیادہ توانا بن سکیں۔ اس طرح انھوں نے لفظوں کے نسبتاً سب سے کمزور وسیلۂ اظہار کو موسیقی اور مصوری جیسے طاقت ور وسیلۂ اظہار تک پہنچانے کی بڑی انوکھی اور قابلِ قدر کوشش کی ہے۔

خواجہ عبدالغفور
۲۵۔ یشودھان
دین شاواچا روڈ، بمبئی۔۲۰
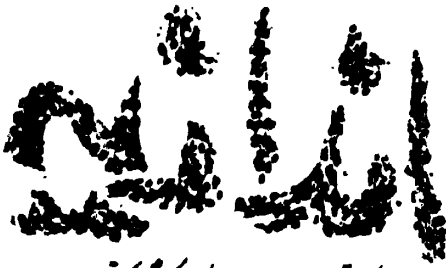
یہ خیالات سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کے ماحول کے متعلق ہیں اور ان میں کارکردگی کے تعلق سے میرے مشاہدات ہیں جو قارئین کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گے' اس لئے پیش خدمت ہیں۔

خواجہ عبدالغفور

سوال۔ "آپ اس دفتر میں کب سے کام کر رہے ہیں؟"
جواب: "جب سے کہ مجھے نوٹس دیدیا گیا ہے کہ اگر کام نہ کروں تو علٰحدہ کر دیا جاؤں گا۔"

●

سوال: اس دفتر میں کتنے آدمی کام کرتے ہیں؟"
جواب: "صرف دس فیصد"

●

سوال: "آپ کب سے یہاں کام کر رہے ہیں؟"
جواب: "جب سے کہ آپ کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔"

●

سوال: "اس دفتر کا ذمہ دار افسر کون ہے؟"
ایک چھوٹے سے عہدہ دار نے جواب دیا
"جملہ خرابیوں کا ذمہ دار تو میں ہوں۔"

●

سوال: "تمہیں ترقی کیوں نہیں ملی، کیا آپ ٹھیک سے کام نہیں کرتے؟"
جواب: وہ تو میں بہت مستعدی اور جانفشانی اور ایمانداری سے کرتا ہوں۔"
سوال: پھر کیا بات ہے؟
جواب: جی میں ہنسنے میں ذرا سست ہوں
سست؟ آپ نے کہا تھا کہ کام میں آپ بہت مستعد ہیں
سوال: ہنسنے سے کام کا کیا تعلق ہے
جواب: وہ اپنے حاکم کے لطیفوں پر ذرا دیر سے ہنستا ہوں۔
سوال۔ کیا تم محنت اور مشقت سے کام کر سکتے ہو؟
جواب: جی ہاں میں اس کا عادی ہوں۔ کئی بار قید با مشقت بھگت چکا ہوں۔

●

ڈگری کے امیدوار کی دیانت داری اور
ایمان داری کے متعلق اس کے دیئے ہوئے
حوالہ پر دریافت کیا گیا تو جواب ملا "
بے شک اس کی دیانت داری اور نیک
کرداری مسلمہ ہے۔ چار چھ بار اس کو چوری
اور دغا بازی کے الزام میں پولس نے گرفتار
کیا تھا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر اس کو
رہا کیا گیا۔"

●

امیدوار سے: کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟ "جی نہیں"
"شراب"؟ - بالکل نہیں
جوا کھیلتے ہو!" - کبھی نہیں۔"
"تب تو تم میں کوئی برائی یا عیب نہیں"
"جی صرف ایک - میں جھوٹ بہت بولتا ہوں۔"

●

امیدوار: "کیا آپ کی کمپنی میں بیماری کی رخصت
پوری تنخواہ اور علاج معالجہ کے اخراجات
کے ساتھ ملے گی؟
جواب۔ ہاں وہ تو ضرور ملے گی۔
امیدوار: انشورنس کی قسط؟
جواب: وہ تو آپ کو خود ادا کرنی ہوگی۔
امیدوار: چھٹی میں گھر جانے کا خرچہ اور وہاں کے
اخراجات؟"
جواب: نہ یہ تو نہیں ملیں گے۔
امیدوار: مگر میری سابقہ نوکری میں تو یہ سب ملتا
تھا۔ تو پھر آپ نے وہ نوکری کیوں چھوڑی؟
جواب: وہ کمپنی ہی دیوالیہ ہوگئی۔

●

ایک فرم میں کام کرنے والے جونیر افسر نے
بھاری تغلب اور تصرف کئے۔ کمپنی اس کو
بغیر شہرت دیئے کے معطل کر دینا چاہتی
تھی۔ اس نے احتجاج کیا اور دلیل پیش
کی - اب جبکہ میرا ذاتی مکان ہے، موٹر
ہے۔ بیوی کے پاس زیورات ہیں۔ آپ
مجھے علیٰحدہ کر کے نقصان میں رہیں گے۔
نیا آنے والا پھر سے ان سب کا بار آپ
ہی پر ڈالے گا۔

●

ایک نئی کمپنی کے بورڈ نے تصفیہ
کیا کہ اپنے ایسے سارے ملازمین جن کی

ملازمت ۲۰ سال سے زیادہ ہو رہی ہے میں
ہزار کا بونس دے گی۔

سوال ہوا کہ اس فرم کو قائم ہوئے دو ہی
تو سال ہوئے ہیں۔ اس پر جواب ملا تو کیا ہوا
ہماری کمپنی کا نام تو مشہور ہو گا۔

بہت بڑی فرم کے مالک سے ایک
افسر نے سوال کیا۔
"آپ کے پاس کام کرنا بہت بڑی عیاشی
ہے جس کا بار میں اپنی چھوٹی سی تنخواہ سے نہیں
اٹھا سکتا۔ اس کی تنخواہ دگنی کر دی گئی۔

●

جوتے بنانے کے کارخانہ والوں کی
مانگیں پوری نہیں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے
ہڑتال کی نہ کام بند کیا۔ صرف سیدھے پیر
کے جوتے بنانے لگے۔

●

پورا خاندان کا خاندان تفریح کے لئے باہر
جاتے وقت نوکروں کو پیشگی تنخواہیں دیدی
گئیں اور جب واپس آنے کے بعد حسب معمول
ختم ماہ پہ ان کی تنخواہیں دی گئیں تو سخت احتجاج
کیا کہ جب مہینہ بھر بغیر کام کاج کے تنخواہ دی
گئی تو اب کام کے بعد تو دوگنی ماہوار ملنی چاہئے

●

۲۴ گھنٹے کی رخصت کی درخواست
دینے پر منظور تو دی گئی اور سمجھا گیا کہ ڈیڑھ دن
بعد وہ رجوع بکار ہو جائیگا۔ لیکن وہ ۷ دن گھر
بیٹھ گیا۔

ہر روز کے دفتری اوقات کے حساب
سے ۷ گھنٹے روز۔ اس میں سے ایک گھنٹہ لنچ
گویا صرف ۶ گھنٹہ کی چھٹی کا مطلب $\frac{36}{6} = 6$
دن، ساتواں دن اتوار اور آٹھویں دن کی حاضری

●

حاکم اندر نہیں ہیں کہنے پر بھی ملاقاتی
بیٹھا رہا۔ گھنٹہ بھر بعد صاحب نے بیزار ہو کر
بلوا لیا اور پوچھا۔ جب آپ سے کہہ دیا گیا کہ میں
نہیں ہوں تو آپ نے کیوں نہیں مانا؟
جواب: وہ تو میں جانتا تھا کہ آپ ضرور موجود ہیں۔
سوال: وہ کیسے؟
جواب: آپ کا سارا عملہ نہایت انہماک سے کام
میں جو مشغول تھا۔

جاگتی آنکھوں کا خواب

اوپر

اور اوپر

اوپر سے بھی اور اوپر

افلاک کی جانب

تنہا

تنہا

آفاقی

آوارہ

خوابوں کا پرندہ

اڑتا ہی رہا ہے

اڑتا ہی رہے گا

دن رات کہاں تک

دھرتی پر گرنے سے پہلے

محافظ حیدر

۲۲- ماؤنٹ میری روڈ، باندرہ۔ بمبئی۔ ۵۰

پھر نئی بستیاں جگمگانے لگیں
بے وفا لڑکیاں یاد آنے لگیں

آنکھ میں رت جگے کا سماں دیکھ کر
نیند کی دیویاں مسکرانے لگیں

ہاتھ مہندی کے پھولوں سے گلنار تھے
سبز بھی پتیاں لہلہانے لگیں

ایک کشتی کا انجام ہے سامنے
دوسری کشتیاں ڈگمگانے لگیں

خون آنکھوں میں اترا تو ہر شہر میں
خون کی ندیاں سرسرانے لگیں

احمد وصی

آکاش وانی بمبئی

آوازیں ——

کچھ جانی پہچانی سی —— سنی سنی سی لگتی ہیں — لیکن یہ تو صرف ایک احساس ہے جنھیں نہ تو لفظوں اور نہ ہی جملوں کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ بس خلائیں ادھر ادھر پھسل رہی ہیں —— پھسل رہی ہیں — کبھی اس سمت اور کبھی اس سمت ......

آوازیں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں — کبھی کبھی آسمان کی نیلی نیلی وسعتوں میں جو خلا نظر آتا ہے —— آوازیں بھی کچھ ایسی ہی....

کبھی کبھی ایسا بھی لگتا ہے کہ چادر اوڑھے لجایا لجایا ٹھٹھکا ٹھٹھکا یا سا آسمان بالکل کسی کنواری دوشیزہ کی مانند لگتا ہے جو شادی کے نام سے شرما جاتی ہے بل کھاتی ہے اور اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔

آوازیں بھی تو ویسی ہی ٹھٹھکی ٹھٹھکی — لجائی لجائی سی ایک حسین جال بن دیتی ہیں اور کسی معصوم کا وجود اس جال میں پھنس کر دم توڑ دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے عقاب کے پنجے میں دبا ہوا کوئی پرندہ —— پھڑپھڑاتا ہوا خاموشی کے دائروں میں گم ہو جاتا ہے۔

• م پیکر حیدرآباد

ایک سرسراتی آواز ——

"سائے کو جسم سے الگ نہ کرو کہ جسم سے الگ سایہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔" اور اس کے بعد غار کی نامعلوم تاریکیاں اپنے بازو پھیلا کر عقاب کی طرح جھپٹنے کو بڑھتی ہیں۔ وہ آوازوں کے سہارے آگے —— اور آگے بڑھا، بڑھتا ہی چلا جاتا ہے لیکن تاریکیاں اس کی واپسی کی منتظر ہیں —— کبھی .... کبھی تو ...... !

آج مسلسل کئی مہینوں کی تگ و دو کا نتیجہ اس کے اندر پھڑپھڑایا —— جیسے —— طوفانی ہواؤں کے زور پر درختوں کے پتے —— اور اسی لمحہ سمتوں میں جکڑا اس کا "میں" چیخ اٹھا ——"سا...... سا...... غ...... ع.... ر—شا..... شا..... دا..... آں کیا تم تب .....؟"

"دوست گھٹائیں گھری ہیں۔ ان کے برس پڑنے کا انتظار کرو —— صبر کرو —— صبر —"

اگر —— اگر چادریں یکے بعد دیگرے گناہ آلودہ جسم پر ڈھک دی جائیں تو کیا پاکیزگی کا کھویا ہوا پرندہ اس کے اندھے غار میں لوٹ آئیگا۔

شاید وہ گھری گھٹاؤں کو برسانا چاہتا تھا۔
جبھی تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ہچکیاں ۔۔۔۔۔ سسکیاں!
اس کا جسم لرز رہا ہے ۔۔۔۔۔
ایک سوال ابھر آیا ہے ۔۔۔۔۔
" کیا یہ آوازیں فضا میں تیرتی وہاں تک پہنچ جائیں گی ۔۔۔؟ اب وہ خود سے، خلاء سے اور اس کی خاموش تصویر سے بھی پوچھتا ہے۔
اور اب اس کے خواب کا بستر بے شکن نہیں بلکہ الجھا ہوا ہے ۔۔۔ ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گیا ہے کیونکہ ایک درد، ایک کرب ازل سے ہی اس کی روح میں پنہاں ہے۔ وہ ازل سے محبت پیار، ممتا کے معنی سے بے نیاز ہے۔ اور اب وہ اسے پاکر بھی اس کے مفہوم سے ناواقف ہے۔ بھلا چند لمحوں کی گرفت بھی کوئی گرفت ہے ۔۔۔ حالانکہ یہ چند لمحے بھی کبھی کبھی بے شمار صدیاں سمیٹ لیتے ہیں۔
اور اس کے دل سے ایک آواز نکل کر فضا کے وسعتوں میں بہہ گئی ۔ جستجو میں، تلاش میں!
اور پھر مجبور و لاچار ہو کر وہ اندھیرے غار کی طرف بڑھتی ہے ۔۔۔ دروازہ تو کب کا بند ہو چکا ۔۔۔ لیکن امیدیں اب بھی دامن تھامے ہوئے ہیں کہ شائد کوئی روزن، کوئی دریچہ تو کھلا ہو گا۔
اس نے اپنے جسم کی ڈھتی ہوئی دیواروں کو ایک آخری اینٹ کا سہارا دیا۔ لیکن انتظار

انور امام
آزاد کتاب گھر۔ پوسٹ آفس ساکچی
جمشید پور۔ ۱

بھی دھوکا ہے ۔۔۔ اور کوئی عمارت جھوٹے سہاروں پر قائم نہیں رہتی۔
اب وہ اپنے اندر احساسات کی لہروں کی طغیانی سن رہا ہے ۔۔۔ اور لہروں کے دھارے حادثات کا شکار ہو کر شاداب کبھی ساحل کا منہ نہ دیکھ پائیں گے۔
ایک، دو، تین ۔۔۔ جانے کتنے جگ بیت چکے ہیں ۔۔۔ عمارت اب بھی کھڑی ہے۔
۔۔۔ میں نے آگے بڑھ کر اس عمارت کی اندرونی دیواروں کو ٹٹولا ۔۔۔ ارے اس کی جڑیں تو کھوکھلی ہیں ۔۔۔ اور پھر ڈھیر سے ڈھیر سے عمارت کی دیواروں کا رنگ و روغن اترنے لگا ۔۔۔ اور وہ شئے جسے روح کہتے ہیں جانے کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ کہاں ہے ۔ ہے بھی یا نہیں ۔۔۔؟ پھر یہ عمارت کیونکر اتنے دنوں تک ۔ ۔ ۔ ۔ اور اب سمجھا ۔۔۔ آوازوں کے بنائے ہوئے حال میں یہ اب تک الجھا رہا ۔۔۔ لیکن آج اس کی کھنکناتی نگاہوں نے، اس کا غلاف میں پوشیدہ چہرہ بے نقاب ہوتا دیکھ لیا ۔۔۔
" اف خدایا اتنا بڑا فریب ۔۔۔
لیکن فریب کیسا ۔۔۔؟ وہ کمزور ہے اور

ہر لمحہ رشتے مجبوری کے دائرہ میں جکڑ دی جاتی

ہے ـــــ اور دائرہ اپنے دائروں میں الجھا

ہی توڑ لیتے ہیں

لیکن اس کا جسم اب تک لرز رہا ہے ـــ شاید

وہ سسک رہا ہے، تڑپ رہا ہے ـ جسم کی لرزش!!

آوازیں فضاؤں کی دوش پہ بہتی ـــــ

قہقہہ لگاتی، کب کی گزر چکی ہیں ـ اب تو تاریکی

کے اژدھے کی لپلپاتی زبان اس کے وجود کو

چاٹنے لگی ہے ـ اور اس کے آنسوؤں کی بوندیں

ان کی مہکتی یادوں کو گیلاتی چلی جا رہی ہیں ـ

ـ ـــ جن کی روشنی سے کبھی اس کا وجود بنا

تھا ــ

لیکن یہ صرف "میں" کی ہی کہانی نہیں ...

.... کئی صدیوں سے ہم سب اسی امربیل کی

شاخوں کی لپیٹ میں الجھے ہوئے ہیں ـــــ

اور جانے کب تک ـــ ؟

حال ماضی کے ان خوشگوار لمحوں کو آنسوؤں

کی بارش سے دھو دینا چاہتا ہے ـــــ

"آخر کیوں ـــ ؟ میں سبھوں سے پوچھتا ہوں ـــ"

خاموشی مسلسل خاموشی ـــ چیخیں ـ!! اور انجام

...... مایوسی ...... مایوسی ـــــ اور

موت ـ !!

تو کیا ہر کہانی کا یہی انجام ـــــ ـــــ !

آوازوں کی بس اتنی سی چمک ..... ؟

ـــ "بولو ـــــ بولو ـــــ بولو .... ؟

سکوت ـــــ خاموشی ...... !

آوازیں چھپتی جا رہی ہیں ـــ ـ ـــ ـــ

آوازیں ـ ـــــ انجان ، ان سنی سی

ـ ـــ ـــ اور اب شاید احساس کا معصوم فرشتہ

سو گیا ہے ـــــ ایک گہری نیند ـــــ

سورج کی آنکھ

سورج کی آنکھ
آج مری خواب گاہ میں
کیا جانے کس درازسے در آئی
اور میں
بستر پہ بے لباس و برہنہ پڑا ہوا
خوابوں کے پیرہن کے لئے بے قرار تھا

سورج کی آنکھ
گرم نگاہوں سے دیر تک
غیض و غضب سے میری طرف گھورتی رہی
میرے برہنہ جسم میں اک کپکپی ہوئی
میں نے نظر اٹھائی تو بستر کے پاس ہی
میرا لباس خون میں ڈوبا ہوا ملا
گھبرا کے زور زور سے میں چیخنے لگا
اور اپنی خواب گاہ سے باہر نکل گیا
سورج کی آنکھ
میری طرف بھاگتی رہی
میں اپنے ساتھ خوف کے سائے سمیٹ کر
ویران جنگلوں کی طرف دوڑتا رہا
لیکن کہیں پناہ کا سایہ نہیں ملا

آخر میں ایک برف کی چوٹی سے پھاند کر
دن کے سیاہ دشت میں
تحلیل ہوگیا
سورج کی آنکھ
میرے تعاقب میں آخرش
مایوسیوں کے گہرے اندھیروں میں کھوگئی
کچھ دیر تک میں برف زدہ خون کی طرح
ماحول کی رگوں میں تڑپتا رہا مگر
ڈھلتے ہی دن کے سائے
میں تاروں کی چھاؤں میں
پھر اپنی اصلی شکل میں تبدیل ہوگیا

کیف احمد صدیقی
[illegible] انٹر کالج سیتاپور (یوپی)

غزلیں

لذتِ غم پہ مر گیا انساں
بھول یہ کیسی کر گیا انساں
خود کو دیکھا تو ڈر گیا انساں
کس کنویں میں اتر گیا انساں
جنگ کرنے لگا ہے فطرت سے
اپنی حد سے گزر گیا انساں
ہائے انسانیت کی تنہائی
ڈھونڈتی ہے کدھر گیا انساں
جانتا تھا وہ مقصدِ تخلیق
بھول دانستہ کر گیا انساں
ساتھ خمیازۂ گنہ لایا
دوسری بھول کر گیا انساں
عمرِ انسانیت دراز وقار
لوگ کہتے ہیں مر گیا انساں

وقار واثقی
ڈگرواڈ دریاپور احمد آباد

نور بھارتی
۱۸۶۔ اے جی ٹی روڈ۔ شب پور۔ ہوڑہ

جتنے پتھر بھی مرے سر پر گرے
جانے کیوں سب پھول بن بن کر گرے
میں تو تنہا تھا خلاء میں پھر یہ کیوں؟
خون کے چھینٹے مرے اوپر گرے
کھل گیا میرا گھروندہ بھی اسے
آسماں سے بھی کئی پتھر گرے
کتنی چکنی ہے مرے آگے زمیں
جانے کتنے کارواں آ کر گرے
اک نگاہِ دوست ہی تھی مہرباں
ورنہ چاروں سمت سے پتھر گرے
روشنی تو مانگ کر لائے مگر
روشنی میں خود ہی دیدہ ور گرے
ماردی ٹھوکر تو وہ خود جھک گیا
نور جس زینے سے ہم اکثر گرے

"دوارکا" کو بمبئی کی بندرگاہ "بیلارڈ پیئر" سے لنگر اٹھائے ہوئے ابھی پورے دس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے، اور حشمت نے ایک لڑکی سے دوستی کر لی تھی اور لڑکی بھی شرارہ جیسی، جو مشرق اور مغرب کے حُسن کا حسین امتزاج تھی۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں اُسے اپنی ماں سے ملی تھیں اور سنہرے ریشمی بال بھی شاید اُسی کی دین تھے۔ ہندوستانیوں کا سا گورا رنگ جو انگریزوں کی طرح روکھا اور کشش سے عاری نہ تھا شاید اُسے اپنے باپ سے ملا تھا۔ اسکا سڈول متناسب جسم آندھرا کی کسی عورت کی طرح کسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

وہ دونوں ڈیک کے ایک تنہا گوشے میں "لائف بوٹ" کے نیچے کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُنکی ملاقات ابھی چند گھنٹے پیشتر ہی جہاز پر ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک ایک ہاتھ سے جہاز کی ریلنگ تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بیئر کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں سے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہے تھے۔

دن بھر کے سفر سے تھک کر سورج کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ مغربی افق کی طرف جھک کر اپنی سنہری کرنوں کو سمیٹ رہا تھا۔ ہوا میں خوشگوار خنکی آ گئی تھی ہلکے ہلکے جھونکوں سے شرارہ کے سنہرے ریشمی بال اُڑ رہے تھے اور اسکی گہری نیلی آنکھیں بیئر کے ہلکے نشے سے اور بھی پُرکشش ہو گئی تھیں۔ حشمت سرگوشی کے سے انداز میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ دل کھول کر ہنس رہی تھی۔ حشمت لڑکیوں سے دوستی کرنے اور پھر اُن سے جلد ہی بے تکلف ہو جانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ کتنی ہی سنجیدہ اور خشک مزاج لڑکی کیوں نہ ہو وہ اُس سے ملنے کے بعد تکلف کی دیوار کے پیچھے نہ رہ پاتی۔ تعارف کے چند لمحوں بعد ہی وہ اس دیوار سے ایک اینٹ نکال لیتا۔ ایک اینٹ نکالنے کے بعد تو دوسری اینٹوں کو نکالنا بے حد آسان ہو جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری دیوار

اسرار عظمت 40-17-1 • مومن پورہ • اورنگ آباد

کو گرا دیتا ـــــ شرلی تو ایک الٹرا موڈرن، اینگلو انڈین لڑکی تھی۔ ملاقات کے ایک گھنٹے بعد ہی وہ حشمت کو "حشمی" کہنے لگی تھی۔ حشمت اس موقعے سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ وہ اُسکی آنکھوں میں دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ "شرلی، تمہاری آنکھیں اس سمندر سے بھی گہری ہیں۔"

وہ دھیرے سے ہنسی اور اس کے موتیوں جیسے دانتوں کی لکیر چمک اٹھی۔

"کیوں مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں ڈارلنگ۔" حشمت دل پر ہاتھ رکھ کر بڑے رومانی انداز میں بولا۔

"جی چاہتا ہے ان حسین آنکھوں میں ڈوب جاؤں اور پھر زندگی بھر کبھی نہ ابھروں۔"

"اچھا اچھا رہنے دو۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "میں تمہارے ٹائپ کو اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ اسی لئے تو میں نے تم سے دوستی کی ہے۔ مجھے ایسے لوگ پسند ہیں جو ملنے کے بعد ہنسیں بولیں اور پھر بھول جائیں عشق کرنے والے اور آہیں بھرنے والے مردوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

"اوہ تم غلط سمجھیں ڈارلنگ" حشمت اس طرح کراہ کر بولا جیسے اُس کے دل میں کوئی دھاردار تیر چُبھ گئی ہو۔ "میں تو تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ تم وہی ہو جسکی مجھے صدیوں سے تلاش تھی۔ تم وہی ہو جو . . . . ."

"رہنے دو ان روایتی جملوں کو" وہ منہ سکوڑ کر بولی "مجھے ایسے الفاظ سے نفرت ہے جو گھس گھس کر اپنا مفہوم ہی کھو بیٹھے ہوں۔ نہ جانے تم نے خود انہیں جملوں کو کتنی لڑکیوں کے سامنے دوہرایا ہوگا۔"

"نہیں ڈارلنگ میں تو صرف تم سے . . . ."

"اچھا اب چپ رہو۔" وہ اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ کر بولی۔ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم جیسے لوگ لڑکیوں کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ اب تک تم نے کتنی لڑکیوں سے عشق کا کھیل کھیلا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تم کو اُن کی صحیح تعداد بھی یاد نہ ہوگی۔"

وہ دل ہی دل میں شمار کرنے لگا۔ "فرزانہ، نرگس، نیرجا، لیشیا، کیتھرین، نیلما، سعیدہ، رخشی، صفیہ..."

لیکن وہ آگے شمار نہ کر سکا۔ آخری نام یاد آتے ہی نہ جانے کیوں اُس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی جیسے دل میں کانچ کا کوئی نکیلا ٹکڑا چبھ گیا ہو۔ لیکن اُس نے فوری اس درد پر قابو پا لیا اور مسکرا کر بولا۔ "تم سچ کہتی ہو ڈارلنگ، اپنے استعمال کئے ہوئے رومالوں کی طرح مجھے اُنکی صحیح تعداد یاد نہیں ـــ"

اور یہ بات واقعی سچ تھی۔ لڑکیوں کو کبھی اُس نے اپنے لباس سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ کالج کے زمانے سے لے کر اب تک انگنت لڑکیاں اُسکی زندگی میں آ چکی تھیں۔ کالج کے زمانے میں تو اس کی ذات سے نہ جانے کتنی رومانی داستانیں وابستہ تھیں۔ لڑکیاں نہ جانے کیوں ہمیشہ اس میں بہت جلد دلچسپی لینے لگتی تھیں حالانکہ وہ کوئی

خوب رو نہ تھا۔ دراز قد اور صحتمند ضرور تھا لیکن
چہرے کے نقوش بالکل معمولی تھے اور رنگ بھی
کچھ زیادہ صاف نہ تھا لیکن پھر بھی اسکے حلقۂ احباب
میں لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کی تعداد تھی۔

لڑکیوں میں ہمیشہ گھرے رہنے کے باوجود اس نے
کبھی عشق و محبت کے بارے میں سنجیدگی سے نہ سوچا
تھا۔ اگر کوئی ذکر نکالتا تو ہنس کر کہتا۔ "چھوڑو یار
یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں۔ اپنا تو اصول ہے
کھاؤ پیو اور بھول جاؤ، یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ
ہجر میں تڑپا جا رہا ہے، آہیں بھری جا رہی ہیں اور
ٹی۔بی میں مبتلا ہو کر سینی ٹوریم جا رہے ہیں۔ دنیا
میں ہزاروں لڑکیاں موجود ہیں، تو نہیں اور سہی
اور نہیں اور سہی، پر عمل کرنا چاہیے۔" اُسکا یہ
"فلسفہ" کالج کی لڑکیوں کو بھی معلوم تھا۔ اور وہ
کالج میں اس کے لئے بدنام بھی بہت تھا۔ لیکن
پھر بھی لڑکیاں اُس سے کتراتی نہیں تھیں۔ وہ نئی نئی
لڑکیوں کے ساتھ دیکھا جاتا۔ اُس کی اس بدنامی
سے اسکا کچھ نہ بگڑتا۔ اکثر لڑکے اور چند لیکچرر
اُسکی رقابت کی آگ میں جل کر اُسے "آوارہ"
"لفنگا" جیسے ناموں سے نوازتے لیکن وہ اُن پر
کان نہ دھرتا۔ کالج کے رنگ کے دن "فن پونڈ"
کا پروگرام ہوتا تو اسے بڑے عجیب عجیب القاب
دیئے جاتے مثلاً "محمد شاہ رنگیلے" "ریاسپوٹین"
اور "جیمس بانڈ" وغیرہ وغیرہ — لیکن اُسکے کان
پر جوں تک نہ رینگتی۔ کوئی اس طرف توجہ مبذول
کراتا تو ہنس کر کہتا "چھوڑو یار — یار لوگوں
کو کچھ نہیں ملتا اس لئے جلتے ہیں"۔

سورج اب سمندر کی عمیق گہرائیوں میں غرق ہو گیا
تھا اور آسمان میں سرخی پھیل گئی تھی۔ اُس کا
عکس سمندر کی نیلی سطح پر پڑ رہا تھا جو اب آہستہ
آہستہ پر سکون ہوتی جا رہی تھی، جیسے سورج کے
ڈوبنے کا ماتم کر رہی ہو —

انہوں نے بیئر کے خالی ڈبے سمندر میں پھینک
دیئے اور کیبن کی نیچی چھوٹی کرسیوں پر آ کر
بیٹھ گئے —

"تم ایران کس سلسلے میں جا رہے ہو —؟" شرلی
نے اُس کی طرف "555" اسٹیٹ ایکسپریس کا
پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سیر و سیاحت کے لئے۔" اس نے ایک سگریٹ
لے کر ہونٹوں میں دبا لیا اور شرلی نے "رونسن"
کے خوبصورت اور قیمتی گیس لائٹر سے اسے سلگا دیا
پھر اپنا بھی سگریٹ سلگا کر بولی "مطلب یہ کہ تم
خاصے امیر آدمی ہو۔"

"نہیں تو" وہ دھوئیں کے بادل منتشر کرتا ہوا بولا
"میرے والد صاحب کوئی تاجر نہیں ہیں، سول
سروس میں ایک دوسرے درجے کے گزیٹڈ آفیسر
ہیں —"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے" وہ مسکرا کر بولی۔
"آج کل سول سروس والے بھی تاجروں سے کیا
کم کماتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن میرے والد ذرا الگ
قسم کے آدمی ہیں۔ آسمان کے نیچے بیتی ہوئی

ان دیکھی قوت سے بہت ڈرتے ہیں اور رشوت
لینے میں یقین نہیں رکھتے۔"

"اور اس کے باوجود تمہیں ایران کی سیاحت کے
لئے بھیج سکتے ہیں اور وہ بھی جہاز کے 'اے۔ کلاس'
کیبن میں" شیرین نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم غلط سمجھیں۔ یہ سب اخراجات میں خود برداشت
کرتا ہوں اُن سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا۔ ورنہ
اُنکی تنخواہ تو شاید میرے شراب اور سگریٹ کے
اخراجات کا بھی بوجھ نہ برداشت کرے۔"

"تمہاری آمدنی کے کیا ذرائع ہیں؟"

"یہ سب مت پوچھو" وہ طویل کش لیکر سگریٹ
کو سمندر میں پھینکتا ہوا بولا ـــ

"ورنہ پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ تم ایک ہوٹل میں
رسپشنسٹ (RECEIPTIONIST) ہو کر اتنے
قیمتی کپڑے کیسے پہن سکتی ہو؟ "555" سگریٹ
کیسے پی سکتی ہو اور "رونسن" جیسے قیمتی گیس لائیٹر
کیسے رکھ سکتی ہو؟ اور اے۔ کلاس کیبن میں
کیسے سفر کر سکتی ہو؟ اور جس انداز میں تم بیئر پی
رہی تھیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم شراب کی بھی
عادی ہو پھر یہ سارے اخراجات کیسے پورے
ہوتے ہیں؟"

اپنی بات ختم کرکے اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا
اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر معنی خیز انداز میں
مسکرایا۔ وہ بھی جواباً مسکرائی اور پُر مسرت لہجے میں
بولی۔" تو اسکا مطلب یہ ہے کہ تم بھی میرے ہی
قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟"

"شاید ـــ" وہ دھیرے سے مسکرایا

"تو پھر ایران جاکر کیا کروگے میرے ساتھ دوبئی
پر ہی اُتر جاؤ تمہیں ایسا کام دلاؤں گی کہ بس یاد کروگے
عمر بھر۔"

"آفر کا شکریہ۔" وہ ہنس کر بولا۔" لیکن فی الحال میں
ایران ہی جاؤں گا۔ میں نے وہاں کی لڑکیوں کی بڑی
تعریف سنی ہے۔ اسلئے میں اُن حوروں کے دیدار
سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔ اور پھر میرا خیال ہے
دوبئی کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں آنے سے پہلے
میں ایران کی برف پوش سرزمین پر ضرور جاؤں تاکہ
اپنے وجود کی گہرائیوں میں اتنی ٹھنڈک بھر لوں کہ
عرب کی جھلساتی ہوئی گرمی مجھے پگھلا نہ سکے۔"

"گرمی کی پرواہ تم کیوں کرتے ہو۔ میں جس ہوٹل میں
کام کرتی ہوں وہ ایرکنڈیشنڈ ہے اور ظاہر ہے
کہ تم میرے ساتھ ہی رہوگے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر لڑکیاں۔۔۔؟"

"ہاں لڑکیوں کا مسئلہ تو ٹیڑھا ہے۔ دوبئی میں لڑکیاں
عنقا ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے پھر مجھے ایران جاکر جی بھر لینے دو۔"
آسمان میں پھیلا ہوا خون اب منجمد ہو کر سیاہ پڑ گیا تھا
اور ہوا کی خنکی اب ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ
گئی تھی۔ ڈیک پر کی بھیڑ آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی
تھی۔ وہ دونوں بھی اٹھ گئے اور زینے چڑھ کر کیبنوں
کی طرف آ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ تم وہسکی پینا پسند کروگے۔" وہ
اپنے کیبن کا دروازہ کھولتی ہوئی بولی۔

"واہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

"میرے پاس 'جانی واکر' کی چوتھائی بوتل موجود ہے ۔۔۔"

"چوتھائی بوتل سے اپنا کیا بھلا ہوگا۔" وہ ایک صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "اور پھر مجھے بار کے علاوہ دوسری جگہوں پر پینے میں مزہ بھی نہیں آتا۔ الماریوں میں رکھی ہوئی رنگین بوتلوں اور کھنکتے ہوئے پیالوں کی آواز سے وہ فضا پیدا ہوتی ہے کہ نشہ دوبالا ہو جاتا ہے ۔۔"

"تو ٹھیک ہے پھر بار میں ہی چلتے ہیں۔"

انہوں نے بار میں ایک ایسی میز منتخب کی جو کھڑکی کے قریب تھی اور وہاں سے سمندر کے پانی پر جھلملاتا ہوا جہاز کی روشنیوں کا عکس نظر آتا تھا۔

بیرا جب اُنکی میز کے قریب آیا تو حشمت نے آرڈر دیا: "ایک اسکاچ کی بوتل لاؤ، 'جانی واکر' اور سوڈا ....."

"میرے لئے شیری یا شیمپین منگوا لو۔ اسکاچ کا موڈ نہیں ہے۔" شرلی ایک انگڑائی لے کر بولی۔

وہ بڑی دیر تک اپنی اپنی پسند کی شرابوں سے شغل کرتے رہے۔ پھر انہوں نے "ڈائننگ ہال" میں جا کر کھانا کھایا اور "ریکریشن ہال" میں آگئے۔ آرکسٹرا "والز" کی دھن بجا رہا تھا اور نوجوان جوڑے ڈانس فلور پر تھرک رہے تھے۔ وہ بھی ناچنے والوں کی اس بھیڑ میں شامل ہو گئے۔

رات گئے تک وہ ناچتے رہے پھر جب وہ اپنے کیبنوں کی طرف واپس ہوئے تو وہ تھکن سے چور ہو گئے تھے۔

اگلی صبح حشمت کی آنکھ کھلی تو کوئی کیبن کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے سلیپنگ گاؤن پہنا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ تر و تازہ کنول کے پھول کی طرح مسکراتی ہوئی شرلی دروازہ میں کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کے بال ربن کے بندھن سے آزاد تھے اور چہرے پر بڑی شگفتگی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی نہا کر نکلی تھی۔ اُس کی نیلی آنکھیں اور بھی نیلی معلوم ہو رہی تھیں اور اس کی مسکراہٹ پر کسی کلی کے چٹکنے کا گمان ہوتا تھا۔ اُس کے ہلکے گلابی رنگ کے "منی اسکرٹ" سے ایوننگ ان پیرس کی مہکی ہلکی خوشبو آرہی تھی۔

"گڈ مارننگ ڈیر ۔۔۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "کیا اب تک سو رہے تھے؟"

"ہاں کل رات بڑی دیر تک نیند نہ آسکی۔" حشمت نے جماہی لے کر کہا۔

"کیوں؟"

"سارا دن تمہارے ساتھ گذرا تھا نا۔" وہ شرارت سے مسکرا کر بولا۔ "رات کو بستر پر تمہارا خیال ستا رہا تھا۔"

"شٹ اپ۔ شریر کہیں کے۔" وہ ہنس کر بولی۔ پھر اُس نے صوفے پر بیٹھ کر "لائف" کا پرچہ اٹھا لیا۔ "تم جلدی سے باتھ روم میں گھس جاؤ۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے میں زیادہ دیر انتظار نہ کر سکوں گی۔"

"کیوں کیا تم نے اب تک بریک فاسٹ نہیں لیا؟"

"بریک فاسٹ؟" وہ ہنس کر بولی "ذرا گھڑی تو دیکھو اب لنچ کرنا پڑے گا۔ مجھے بھی جاگے ہوئے صرف آدھا گھنٹہ ہوا ہے۔"

"واقعی، بہت دیر ہو گئی ہے۔" حشمت نے کلائی پر بندھی ہوئی "اومیگا" آٹومیٹک پر نظر ڈالی جس میں صرف ایک کانٹا نظر آ رہا تھا۔ چھوٹا کانٹا اس کے نیچے چھپ گیا تھا۔

وہ جب ڈائننگ ہال سے نکلے تو ایک بج چکا تھا۔ بار میں جا کر انہوں نے بیئر کا ایک ایک ہاف سائز کا ڈبا پیا اور بلیرڈ روم کی طرف چل دیئے۔

پھر یہ روز کا معمول ہو گیا۔ روز صبح شرلی آ کر حشمت کو جگا دیتی۔ پھر وہ جا کر بریک فاسٹ کرتے پھر لنچ تک بلیرڈ یا ٹیبل ٹینس کھیلتے رہتے۔ پھر لنچ کے بعد سو جاتے۔ اُن کا سارا وقت اب ساتھ ساتھ ہی گزرتا تھا اور اکثر راتیں بھی ساتھ ہی گزرتیں!

ساتویں دن جہاز دوبئی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ حشمت، شرلی کے ساتھ اوپر کیپٹن کے آفس میں گیا۔ جب وہ "امی گریشن" کی ضرورتوں سے فارغ ہو گئی تو اسے چھوڑنے زینے تک گیا۔ وہ نیچے نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اُسے "لینڈنگ پرمٹ" نہیں مل سکا تھا۔

زینے کے قریب پہونچ کر شرلی نے گرد و پیش کی پرواہ کئے بغیر اس کا ایک طویل بوسہ لیا اور مسکرا کر بولی۔ "اچھا ڈیر چلتی ہوں، بائی۔ بائی۔" پھر جانے کے لئے مڑی لیکن اچانک جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے رک کر کہا: "تو تم دوبئی ضرور آ رہے ہو نا۔۔۔!

حالانکہ کسی کو یاد رکھنا میرے اصول کے خلاف ہے لیکن نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم یاد آؤ گے۔"

"میں دو تین ماہ بعد ہی آ جاؤں گا۔ میرا خیال ہے اس عرصے میں ایرانی لڑکیوں سے میرا جی بھر جائے گا اور اگر نہ بھی بھرا تو جیب تو خالی ہو ہی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے میں انتظار کروں گی" وہ بولی "سیدھے کارلٹن ہوٹل آ جانا دوبئی کا سب سے بڑا اور مشہور ہوٹل ہے تمہیں وہاں تک پہونچنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی" اس نے ایک بار پھر اس کا بوسہ لیا اور زینے سے نیچے اتر گئی۔

اُس کی لانچ جب نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی اپنے کیبن کی طرف جانے کے لئے مڑا۔ اُس نے محسوس کیا کہ زینے کے پاس کھڑا ہوا جہاز کا "گنر" اور "امی گریشن" کا عرب آفیسر دونوں اُسے بڑی حسرت بھری اور رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اُسے اپنی قسمت پر کوئی ناز نہ تھا۔

اس شام کو اُسے شرلی کی کمی ضرور محسوس ہوئی لیکن جہاز میں لڑکیوں کی کمی تو نہ تھی اور اُن میں سے کئی خوبصورت تھیں۔ ہر ملک کا حُسن وہاں موجود تھا۔ ایک دو دن میں ہی وہ شرلی کو فراموش کر چکا تھا۔

ایران کی بندرگاہ "خرمشہر" پر اترنے کے بعد اُسی رات وہ طہران کے لئے روانہ ہو گیا۔

طہران اُسے بے حد پسند آیا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ یورپ کے کسی شہر میں آ گیا ہے۔ اونچی اونچی

زرنب پوش پہاڑیاں، سڑک کے بلند درختوں کے درمیان
سے گذرتی ہوئی چوڑی چوڑی صاف ستھری سڑکیں۔ بڑے
بڑے سپر بازار اور ان میں گھومتی ہوئی خوبصورت
لڑکیاں! یہاں کی ہر لڑکی اُسے شرلی معلوم ہوئی۔
بڑی بڑی نیلی آنکھوں اور سنہرے ریشمی بالوں والی
شرلی۔ اس نے سوچا: "یہاں کی لڑکیوں کو دیکھ کر
تو فرشتے بھی انسان بن جانے کی تمنا کرتے ہونگے۔"
دوسری چیز جو اُسے تہران میں پسند آئی وہ روسی شراب
"واڈکا" تھی جو یہاں بے حد ارزاں تھی۔

تین مہینے تک اُس نے خوب ہی عیش کئے پھر
جب اس کی جیب میں صرف دوبئی کا کرایہ رہ گیا
تو وہ اصفہان، کرمان اور بندر عباس وغیرہ شہروں
سے ہوتا ہوا دوبئی پہونچ گیا۔
شرلی نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا اور
اس نے اپنے ہی کمرے میں اس کے بھی رہنے کا
انتظام کردیا۔ اسکا کمرہ "کارلٹن" ہوٹل کی آخری
منزل پر تھا۔ یہ دس منزلہ عظیم الشان ہوٹل سنٹرلی
ایرکنڈیشنڈ تھا۔ اور اس کے بڑے بڑے
کمرے آرام و آسائش کے بھی سامان سے
آراستہ تھے۔
اسی شام کو شرلی نے اُسے ہوٹل کے منیجنگ
ڈائریکٹر سے ملایا جو ایک مصری عرب تھا۔
"یہ میرے ہسبنڈ ہیں، حشمت رضوی، آج ہی
انڈیا سے آئے ہیں۔ اور اب انکا ارادہ میرے
ہی ساتھ کام کرنے کا ہے۔"

"اوہ شیور شیور" ڈائریکٹر معنی خیز انداز میں
مسکراکر بولا "آئی ایم ریلی گلیڈ ٹو میٹ یو
مسٹر رضوی" اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
جب وہ دونوں باہر آئے تو حشمت نے مسکرا
کر کہا: "یہ ہماری شادی کب ہوئی مجھے تو
کچھ خبر ہی نہیں۔"
"اوہ" وہ ہنس کر بولی: "وہ ذرا دقیانوسی خیالات
کا آدمی ہے اس لئے میں نے کہہ دیا ورنہ مجھے
نصیحتیں کر کر کے بور کر دیتا۔"
ہوٹل کی ایک کار میں بٹھا کر شرلی نے اسے شہر کی سیر
کرائی۔ بڑا خوبصورت شہر تھا۔ سمندر کا ایک پتلا
سا حصہ زمین کو کاٹتا ہوا دور تک گھستا گیا تھا۔
اور اس خلیج نے شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا
اس خلیج کے کنارے پر "کارلٹن" اور دوسرے
بڑے بڑے ہوٹل تھے۔ رات کو ان ہوٹلوں کی
رنگین روشنیاں پانی کے سینے پر مچلنے لگتیں تو
یہ خلیج کسی دلہن کی طرح معلوم ہونے لگتی۔ چھوٹی
چھوٹی کشتیاں شہر کے دو حصوں کے درمیان
آمد و رفت کا کام دیتی تھیں۔
شرلی نے جو کام اُسے دلوایا تھا وہ اُسکی پسند کے
عین مطابق تھا۔ اُسے ہیروں کی اسمگلنگ کرنی
پڑتی تھی۔ کبھی بیروت تو کبھی استنبول، کبھی بغداد تو
کبھی القرہ۔ اُسے بڑے بڑے شہروں کے چکر
لگانے پڑتے۔ فضائی سفر کے اخراجات کے علاوہ
ان شہروں میں "اے۔ کلاس" ہوٹلوں میں ٹھہرنے
پینے پلانے اور دوسری تمام عیاشیوں کے اخراجات

"باس" کے ذمے ہوتے اور اس کے علاوہ نقد رقم کی صورت میں بہت ہی معقول معاوضہ ملتا تھا جسے خرچ کرنے کی نوبت اسی وقت آتی تھی جب وہ دوبئی میں چھٹی مناتا۔ چھٹی میں بھی اسکے شب و روز بڑے رنگین رہتے۔ وہ اور شرلی کشتی میں بیٹھ کر دور نکل جاتے۔ شام کو سمندر میں تیرتے اور "جمیرا" کے ساحل پر نرم نرم ریت پر لیٹ جاتے اور اپنے نیم عریاں جسموں کو سورج کی حرارت سے لطف اندوز کرتے۔ پھر وہ کسی اچھے سے بار میں شراب نوشی کے رکارڈ توڑتے اور کسی لبنانی ہوٹل میں شکم سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد نائٹ کلب میں رات گئے تک ناچتے رہتے شراب۔ حسن۔ موسیقی اور رقص۔ یہی اسکی زندگی تھی ـــــ

ایسی ہی ایک رنگین رات تھی۔ وہ "ایرلائنس ہوٹل" میں رقص کر رہے تھے۔ رات کا ایک بج چکا تھا شرلی نے آج کچھ زیادہ ہی پی رکھی تھی اور اس پر بری طرح نیند بھی سوار تھی۔ اس لئے وہ اکثر غلط قدم ڈال رہی تھی۔ اور صحیح معنوں میں رقص نہیں کر رہی تھی بلکہ گھسیٹ رہی تھی۔ لیکن انکی طرف کوئی بھی متوجہ نہ تھا۔ سب اپنی اپنی دھن میں مگن تھے اور سب کا ہی نشے کے مارے برا حال تھا۔

"حشمی ڈیر تم بڑے ہرجائی ہو۔" وہ نہ جانے کس جھونک میں کہہ گئی۔

"نہیں ڈارلنگ میں تو تم سے محبت کرتا ہوں بالکل سچی محبت" حشمت بہت زیادہ نشے میں تو نہ تھا۔ لیکن نشہ تو بہر حال اسے بھی تھا ہی۔

"ہی ہی ہی" وہ انگلی نچا کر بڑے بھونڈے انداز میں ہنسی۔ "تم مجھے الو بناتے ہو۔ تم نے کبھی کسی سے سچی محبت کی ہے؟"

شرلی کا جملہ حشمت کے ذہن پر کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح پڑا۔

"کیا تم نے زندگی میں کسی سے سچی محبت کی ہے؟ اسے لگا کہ یہ سوال کسی تیز خنجر کی طرح اس کے دل میں اتر گیا ہے۔ اسے اپنا سارا وجود لرزتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے شرلی کو کوئی جواب دینے کی بجائے اسے آہستہ سے اپنے سے الگ کیا اور بڑے پیار سے بولا "چلو ڈارلنگ اب چلنا چاہئے۔ رات بہت گذر چکی ہے۔" وہ بظاہر اس سے بڑے پیار سے گفتگو کر رہا تھا لیکن اس کے جملوں کا کھوکھلا پن اسے اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

جب دربان نے دروازہ کھول کر اسے سلام کیا تو اس نے "ٹپ" کے طور پر نہ جانے کونسا نوٹ اسکی ہتھیلی پر رکھدیا۔ دربان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا لیکن اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اور اپنے ہی خیالوں میں ڈوبا پارکنگ شیڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ شرلی بھی اس کے ایک بازو کا سہارا لئے اس کے ساتھ گھسٹتی رہی جب وہ کار چلا رہا تھا تو اس کے ہاتھ اسٹیرنگ

پر لرز رہے تھے۔ شرلی اس کے کندھوں پر سر رکھے اونگھنے لگی تھی۔ لیکن اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نہ ہمیشہ کی طرح اس کے بوسے لئے۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا ــــ

کمرے میں پہونچتے ہی شرلی بستر پر گر کر بے سدھ ہو گئی۔ وہ شرلی کی طرح نشے میں بے سدھ نہیں تھا۔ اسکا نشہ تو جیسے بالکل ہرن ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے شب خوابی کے کپڑے پہننا ضروری نہ سمجھا اور جوتوں سمیت ہی بستر پر دراز ہو کر اس نے مرکری بلب بجھا دیا اور ہلکے نیلے رنگ کا بلب روشن کر دیا۔ آنکھیں موند لیں۔ لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ بڑی دیر تک وہ اس طرح کروٹیں بدلتا رہا جیسے وہ "یو۔ فوم" کے نرم و گداز گدوں پر نہیں بلکہ انگاروں کی سیج پر لیٹا ہوا ہو۔

تھوڑی دیر بعد اٹھ کر اس نے کپ بورڈ سے اسکاچ کی بوتل نکال کر منہ سے لگا لی اور منہ سے اسی وقت ہٹایا جب اس کا حلق بری طرح جل اٹھا۔ بوتل کو اسٹول پر پٹک کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اب بھی نیند کو اس پر رحم نہ آیا۔ خیالات بگولوں کی طرح اس کے دماغ میں چکرا رہے تھے اور ایک تلخ یاد کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیل گیا تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے شرلی کی طرف دیکھا جو خوابوں کی دنیا میں گم تھی۔ اس کے نازک لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ شاید وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے سنہرے ریشمی بال تکئے پر پریشان تھے۔ چہرہ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا اور بڑا حسین لگ رہا تھا۔ چکنی چکنی گداز پنڈلیاں ہلکی نیلی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ لیکن وہ اسے اس طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے اس کے سامنے کوئی خوبصورت لڑکی نہیں بلکہ ایک سادہ کاغذ رکھا ہوا ہو بلکہ وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس پر ضرور مرکوز تھیں لیکن ذہن میں کوئی دوسری ہی تصویر تھی ـــ ... معمولی سے خط و خال کی ایک سانولی سی لڑکی کی تصویر ـــــ

اچانک وہ تڑپ کر اٹھا اور اس نے اپنی الماری کھول کر "بریف کیس" نکالا۔ پلنگ پر بیٹھ کر اس نے بڑی عجلت سے کھولا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ ہر قسم کے نوٹ تھے پونڈ، ڈالر، دینار، لیرے اور ریال لیکن اس نے انہیں اس طرح جلدی جلدی نکال کر پلنگ پر پھینکا جیسے وہ کوڑا کرکٹ ہو ـــ "بریف کیس" خالی ہو گیا۔ اب اس میں "کولٹ" کا بالکل جدید ترین ماڈل کا صرف ایک پستول پڑا ہوا تھا۔ اس نے پستول اٹھا لیا اور بڑی دیر تک پرخیال انداز میں آہستہ آہستہ اسے اپنے دائیں رخسار پر رگڑتا رہا۔ پھر اسے بھی ایک طرف رکھ کر ہلکے نیلے رنگ کا ایک لفافہ

نکالا۔ اس میں ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ ایک سانولی سی لڑکی کی تصویر۔ ہونٹ پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور گالوں میں ہلکے سے گڑھے پڑے ہوئے تھے ـــ

اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل کر تصویر پر ٹپکنے لگے ـــ اتنا یاد نہ آیا کر صفیہ، ورنہ میں کسی دن خودکشی کر لوں گا۔"

تصویر اس کے احساسات سے بے نیاز، مسکراتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے موتیوں کی لڑیاں ٹوٹتی رہیں۔ باہر چاند اپنا سفر طے کرتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔

■■

اے دوست کبھی بار یہاں ٹوٹ چکا ہوں
جب جا کے ترے شہر میں آئینہ بنا ہوں

اب کس کو سمیٹو گے اندھیروں کے نگر میں
اب میں تو اجالوں کی طرح پھیل رہا ہوں

یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ چٹانوں سے گرے ہیں
میں بھی تو پہاڑوں کی طرح ٹوٹ رہا ہوں

کب میں نے کہا مجھ کو ہے کونین کی خواہش
تھوڑی سی ترے دل میں جگہ ڈھونڈ رہا ہوں

اس الجھی ہوئی زیست پہ میرا بھی تو حق ہے
خاموش چتاؤں کی طرح میں بھی جلا ہوں

اب زہرِ وفا پی کے بھی خاموش ہوں نیّر
مجرم ہوں میں اس دور میں جینے کی سزا ہوں

پاکیزہ نظر باعثِ رسوائی کہاں ہے
آنکھوں پہ مری تہمتِ بینائی کہاں ہے

چڑھتے ہوئے سورج کی کرن دیکھنے والو
تم کو مرے زخموں سے شناسائی کہاں ہے

کچھ پھول ابھی چشمِ ندامت سے گرے ہیں
تا حدِ جفا میں نے سزا پائی کہاں ہے

مقتل میں حیاتِ ابدی ڈھونڈنے والو
اب تم میں وہ احساسِ مسیحائی کہاں ہے

ناپختہ تھے جذبات تو بدنامی کا ڈر تھا
دیوانگی اب شاملِ رسوائی کہاں ہے

جب خوش نظری آپ کی تمہیدِ وفا تھی
نیّر یہ کسی دوست کی رسوائی کہاں ہے

غزلیں

صلاح الدین نیّر
۲۰-۲-۳۴۴ بازار روپ لعل حیدرآباد

غزلیں

سیف سہسرامی
نور گنج سہسرام۔ بہار

دیکھ سکے گا کیسے مورکھ درپن کے اس پار
شیشے کی دیوار کے پیچھے شیشے کی دیوار

مٹی کے قدموں میں رکھ دے اپنے سر کا بار
اپنے ہی ہاتھوں سے کر دے جیون کا اپکار

آؤ نا اس پیڑ کے پیچھے چھپ جائیں ہم دونوں
کھلی ہوئی دھرتی پہ گھورے ہم کو یہ سنسار

توڑ دو سارے آئینوں کو پھینک دو گھر کا پانی
ہم تو اپنی صورت سے خود بیٹھے ہیں بیزار

پاپ کے رستے پھول بچھائے دیکھیں بیچ راہ
سچائی کے رستے جیسے پاؤں تلے تلوار

دھرتی کے آنگن سے بھاگی انسانوں کی چھایا
گلیوں گلیوں پھرتے ہیں یوں پیغمبر اوتار

تم مٹی کی مورت لے لو یا چینی کی گڑیا
سجا ہوا ہے یارو کب سے دنیا کا بازار

سیف تمہاری غزلیں جیسے سیج کے باسی پھول
جانے خود کو کس منہ سے تم کہتے ہو فنکار

رؤف خیر
۶۲۵۔ الاوہ پنج بھائی
کاروان۔ حیدر آباد

میں اسکو پا نہ سکا اس نے کھو دیا مجھ کو
کہاں پہ لا کے انا نے ڈبو دیا مجھ کو

میں اپنی تشنگی جاں کہاں کہاں پہ لے جاؤں
اداس دشت ہے دریا بھی رد دیا مجھکو

یہ قحط نور، یہ پاگل ہوا، اور ایسے میں
دکھاتا راہ کہاں تک کہو دیا مجھکو

میں پڑھ رہا ہوں ابھی تک کتاب جسم تری
خدا نے حوصلۂ کفر تو دیا مجھکو

نفس نفس تو بکھرنے کی شرط ٹھہری ہے
اس اہتمام سے کس نے پرو دیا مجھ کو

بنام شعر کہیں راز دل نہ کہہ جاؤں
کسی نے پیچھے سے ناخن چبھو دیا مجھکو

دراز قد نہیں میری طرح، ہوں میں جس میں
یہ کس اجاڑ بدن میں سمو دیا مجھکو

میں آنسوؤں میں نہاتا رہا ہوں جسکے لئے
اسی نے خیر لہو میں بھگو دیا مجھکو!

فصیلِ شب

سیاہ شب کی یہ فصیلِ بے کراں محیط ہے
ہر ایک پیڑ پھول پتہ سو گیا ہے اس طرح
فضا کا خواب بن رہا ہو، دیکھتا ہو زندگی نمو میں ہے —
نمو میں گرچہ زندگی ہے پھر بھی محوِ خواب ہے،
عذاب یا ثواب کا خیال کچھ نہیں اُسے
سیاہ شب ہے جاوداں

جوانی بستروں پہ گرم جسم جل رہے ہیں بے طرح
اُبل رہا ہے پانیوں کا شور، بس گیا ہے رُک گیا
ڈلو گیا ہر ایک تختہ دار کا —
عمارتوں کی اینٹ اینٹ گل رہی ہے
کوئی انھیں بچائے تو بچائے کس طرح
سیاہ شب ہے بے اماں

سنو کہ تم بھی خواب اپنے اوڑھ کے ہی سو رہو!
فصیلِ شب ہے درمیاں!!

خاطر حافظی
ٹرین لائٹنگ سیکشن سی یو ڈبلیو شاپ
عالم باغ لکھنؤ

تیری یاد کا آئینہ جب ٹوٹا دل کے ہاتھوں سے
اس کی کرچیں اک اک کر کے چُن لیں ہم نے پلکوں سے
پاؤں الجھ کر رہ جاتا تھا جن کا گھر میں زلفوں سے
بال تراشے نکلے وہی اب لمبی لمبی کاروں سے
مجھ سے بچھڑ کر مانا، تم نے خوشی خوشی دن کاٹے ہیں
لیکن پہلے یہ آنسو تو پونچھ لو اپنے گالوں سے
یارو! اس سے وقت کے بڑھتے پاؤں نہ رُکنے پائیں گے
چن چن کر چاندی کے تار نکالو مت یوں بالوں سے
اچھا! ان آنکھوں سے کہہ دو، ہم کو دیکھ کے شرمائیں
کیا شے ہے جو ہم نے چرالی رات تمہارے ہونٹوں سے
آہ بھریں یا زلفیں لہرائیں وہ، ہم سب جانتے ہیں
جب سے اپنا پیار بڑھا آزاد! سحر کے جھونکوں سے

آزاد گلاٹی
گورنمنٹ کالج نابھہ
(پنجاب)

سسیفس کی خواہش

کسی دن وقت کے گریباں سے
شام ایسی کوئی نکل آئے
صدیوں کہنہ زمیں کے سینہ پر
اک بڑا سا شگاف پڑ جائے
اور ـــــ غیر دلچسپ دید نما چہرہ
میری مصروفیات کا مرکز
چند دنوں کے لئے سہی پھر بھی
خواب گاہ تری میں سو جائے
پہلے ساری تھکن مٹانے کو
ذہن کے ایک ایک حجرہ سے
فکر کی چیونٹیوں کو صاف کروں
ماں بہن باپ بھائی، کل گھر بار
چند دنوں کے لئے بھلا ڈالوں
پھر غلط بس کوئی پکڑ لوں اور
بے ارادہ کہیں نکل جاؤں
گھوم پھر کر قدم اگر تھک جائیں
کسی ہوٹل میں بیٹھ جاؤں، اور
آنے والے ہر ایک جوڑے کا
جائزہ لوں بڑو کی خوشبو میں
اور پھر ایک قہقہہ ماروں
بیرا گھبرا کے جب مجھے دیکھے
اس سے ماچس طلب کروں، اور پھر
برگلے کا دھواں اڑاتے ہوئے
باہر آجاؤں گنگناتا ہوا
پھر کسی سمت میں نکل جاؤں
کونسی فلم ہے یہ جانے بغیر
کسی تھیٹر میں جا کے بیٹھ جاؤں
اور پھر انٹرمشن سے پہلے ہی
اٹھ کے باہر سڑک پر آجاؤں
نیم کوئی گھنا تلاش کروں
اور بستر بغیر سو جاؤں!
نیند کے جنگلوں میں کھو جاؤں!!

جبار جمیل
ٹائنی پرل انگلش اسکول درگاہ روڈ گلبرگہ

نشاط کلشہ

سلمیٰ شاکر

۲/۴۹۴-۴-۱ زمستان پور مشیرآباد
حیدرآباد-۲۰

نشا اس بوڑھے شہر کا نشہ ہی نہیں طاقت بھی تھی۔ اسکی سریلی نرٹر کے عتاب میں ہوکر رس بلند ہوتا وہ کئی نفوس پر مشتمل ہوتا۔ نفوس یعنی نفس کی جمع مگر نشا کی صدائے عام ہر قسم کی جوانی سے زیادہ اس کا یہ اصول عمدہ تھا کہ اس نے نفس اور نفس میں کوئی فرق روا نہ رکھا — اس لئے اسکی طاقت مقناطیسی ہوتی گئی — اور جو ہر بہن ملک سے بہرآ زما کسی نہ شو و تصل بھائی کھٹل بھائی کی تو رہتی کی مانند پھٹ پڑنے لگا۔

الیون، اسکاچ، جن، ٹھرے کے نشے میں ڈولتے ان باسیوں کو تھرکتی بچی بیٹا ایک نہیں چار چار نظر آتی۔

تب جانی بہک کر کریم دھون سے کہتا۔

"یار — تو تم نے مغل اعظم دیکھی؟"

"دیکھ کر تو اب تک پچھتا رہا ہوں — وہ مدھو... کمبخت بوڑھے بندر پر سیتی بھی مرگئی۔ میرے خط کا جواب تک نہ دیا۔ ورنہ — آج سالی اپنے دماغ کی مالک ہوتی —"

"ابے — چپ — بندر کی دم —" اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہی شیام چلاتا "بڑا آیا مدھوبالا کا دعویدار — بیٹا دن دسے دسے کے کباڑہ ہوگئے تو دماغ کا سودا کرنے لگے۔ اب اس کے بعد جگر گردے، کلیجہ سب سری پائے — سب لگا دیتے داؤ پر — قصاب کہیں کا —"

"کیا کہا —" کریم دھون لڑکھڑاتا اٹھ کھڑا ہوتا — "ابے خالص نشاطی ہوں، نشاطی — خبردار جو کچھ کہا — ..."

"یہ لو — ... بیٹا ایک ہی بوتل میں سب کچھ بھول گئے —" اور گردھر نے اس کے کان پکڑ لئے —" ابے گھاٹ کی دم — ... خبردار گالی کیا کرتے ہیں۔ نشاطی نہیں —"

قبل اس کے کہ کچھ ٹکراؤ ہوتا نشا ٹھرے کی بوتل ہاتھ میں لیے۔ شرابی مسکراہٹ کے ساتھ درمیان میں آجاتی۔ اسکی آنکھیں گردش کرنے لگتیں، دماغ بھک سے روشن ہوجاتے اور جانی کو اصل بات یاد آجاتی۔ اس کے حلق سے ہراتی آواز آزاد ہوتی۔

"نیشا — تم — ... تو — ... صرف چار چار ہی نظر آتی ہو — مگر — ... وہ — مغل اعظم والی تو — ... اوپر نیچے، آگے پیچھے ہر طرف، نظر آتی تھی — ...

تب تمہاری کھوپڑی الٹی تھی ... "

"الٹی —" جانی تیزی کے ساتھ اپنے سر پر

ہاتھ پھیرنے لگتا ـــ ... نشا بل کھا کر جو پلٹی تو اُس کی نگاہ اوپر نیچے ہوتی ہوئی مجھ پر آ کر ٹک گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ٹھرے کی بوتل اُس کے ہاتھ میں نہیں میری کھوپڑی میں گردش کر رہی ہے۔ اُس کے قدم رقص کے انداز میں میری طرف اُٹھنے لگے جوہڑ میں جیسے بھگدڑ رچ گئی ـــ ٹرٹر کا شور بلند ہو گیا۔ داور گردھر کے ایک ہاتھ میں مٹی کا پیالہ اور دوسرے میں دیسی شیشے کی ہری لال بوتل تھمی کی تھمی رہ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں دوسروں کے برعکس تجسس بھی تھا، ڈھکا چھپا اشتیاق بھی ـــ دفعتاً نشا میرے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔

"صاحب خانہ جان پڑتے ہیں... آپ کا اگلا پچھلا ـــ" اس نے داور گردھر سے پوچھا

"اگلا پچھلا ـــ" میں چونک پڑا۔ مگر تبھی گردھر بڑی بے نیازی سے جواب دے رہا تھا۔

"اگلا پچھلا ـــ کچھ نہیں ـــ کہانیاں گھڑتا ہے..."

"کیا مطلب ـــ" میں جھنجھلا گیا ـــ "مجھے بدتمیزی پسند نہیں۔"

"گھڑ والے جو ہوئے.... اصول و آدرش کے بیوپاری ـــ" نیشا نے جیسے میری خیالی چندیا پر چپت رسید کر دی ہو..... میں بھنا گیا۔

"بات یہ ہے کہ یہ اپنی زبان میں آپکی تعریف پوچھ رہی ہے ـــ یعنی وہ مہذب تعارف جسکا اگلا زردستی کی خوشی تو پچھلا مذمت کی ہوتا ہے"

"تو ـــ میں کہانیاں گھڑتا ہوں" اُسکی بات نظرانداز کرتے ہوئے میں نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا ـــ

"غلطی ہوئی شما کر دیجئے ـــ" نشا لچک کر زمین پر گھٹنا ٹیکے جھک گئی۔

"آپ کہانیاں گھڑا نہیں کرتے، ٹھوک کے حساب سے خریدا اور بیچا کرتے ہیں" ـ اس کے ساتھ ہی بے ہنگم سے قہقہے ابل پڑے تکونیہ اور میلدھی کی نوجوان ہو گئی۔ سگریٹ بیڑی چلم کے دھوئیں نے میرا دم گھونٹنا شروع کر دیا۔ میں پلٹ پڑا ـــ "ارے ـــ ارے ـــ" کریم دھوبن نے مجھے بازو سے پکڑ لیا ـــ

"یہ نشاط کدہ ہے ـــ ... کسی کانگریسی کا یا جن کمیونسٹ کا دولت کدہ، جن سنگھ کا اکھاڑہ نہیں۔ جو تم یوں نامراد بھاگے جا رہے ہو۔ تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔"

"انصاف کو تو ادھر رہنے دو ـ ناپید چیزوں کو زیر بحث لانے سے فائدہ؟ ـــ مگر ـــ یہ ـــ ... یہ ـــ کیا واقعی نشاط کدہ ہے۔؟"

لہجے سے زیادہ میری آنکھوں سے تمسخر عیاں تھا۔ میری نظریں گندی دلدلی زمین کو احاطہ کئے بانس کی خستہ ٹٹیوں سے ہوتی ہوئی اس کے اندر جا بجا بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے پتھروں پر براجمان نشاط باسیوں پر جم گئیں..... دفعتاً نیشا سینہ تان کر سامنے آ گئی۔

"اچھا! تو آپ کو اس کے "نشاط کدہ" ہونے

میں ٹھیک سے ہے؟

"جی نہیں ——— آپ کو دیکھنے کے بعد ایسی غلطی کیسے کر سکتا ہوں"

"پورے گھاگ ہو۔ رنگے سیار ... قلم گھسنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں"

"اے ——— محترمہ! ہم صنف نازک کو نزلے سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ سنبھل کر رہیئے گا ——— میرا پارہ چڑھنے لگا۔

"وہ تو بعد کی بات ہے ——— پہلے آپ سنبھل کر اس طرف بیٹھ جائیے" جانی نے مجھے لے جا کر ایک پتھر پر ٹکا دیا ———

"ہوں ——— تو اب پھوٹیے ——— ہوا کا رخ ادھر کیوں ہوا تھا ——— کیا کچھ گڑ بڑ جیسے کا موڈ بن گیا تھا ——— شیام نے پوچھا ———

"——— .. نہیں ——— ... یوں ہی سوچا ——— ذرا اس جمہوریت میں کھلاڑی زندگی کو قریب سے دیکھ لوں"

"اے قلم والے ——— ! زیادہ رنگ بازی کی کوشش نہ کرو، ورنہ بے رنگ کر کے رکھ دوں گی ——— ہاں ——— آں ———" نینا چکر کاٹ کر ساقی کے فرض انجام دینے لگی۔

"منظور ہے ——— لائیے ہاتھ ———" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے کھٹ سے ٹھرے کی بوتل میری کھلی ہتھیلی پر رکھ دی ———

"یہی ہے ہمارا معاہدہ ——— اس سے صلح کر لو ——— پھر سب کے یار بن جانا ———"

"پینے سے قبل کچھ جانچ پرکھ بھی تو ضروری ہے"

"تو پھر ——— چلتے ہوتے نکل آؤ ——— .. میں کس "پارکھ" کی بات کروں ———" نینا جیسے سے بکھر رہی ہوگئی ———..

"ہائی ——— شا ——— !" داور گردھر نے تیزی کے انداز سے کہا ——— "تم نشاط کنڈ کے اصول توڑ رہی ہو ——— .." "دل آزاری" ہمارا سب سے بڑا جرم ہے ... خواہ وہ کسی قلم والے کی ہی کیوں نہ ہو ———"

"ٹھیک ہے ———" نشا پھر کرسی پر بیٹھ گئی ———

"فرمائیے پارکھ جی! آپ کس قسم کا پوسٹ مارٹم کرنا چاہتے ہیں؟" اس کی آواز طنز و تحقیر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"فی الوقت تو آپ کا "اتا پتا" ہی کافی ہوگا۔

"حاضر ہوں ——— پوچھیے ———" اس نے بڑی ادا سے سر جھکا لیا۔

"یہ نیتا" کدھر سے چھپل پڑی ——— یعنی ——— نشاط سے یا نسی سے"

"بس ——— یہی زور شکے کی بات پوچھنی تھی ———" نشاط بھڑک گئی۔

"قطعی لغو سوال ہے ——— ہم ذات پات کی بطنیں نہیں پالا کرتے ..."

"مگر بطلوں سے زیادہ گندے یہ جھونپڑیوں میں رہتے اور گندگی پھیلاتے ہیں، وحشی جنگلی قوم تو کیا تم لوگ، جانوروں، درندوں سے بدتر ہو، انسانی تہذیب تمدن، اس کی نسل اور بقا کے دشمن ——— شرافت و اخلاق شرم و حیا سے عاری ——— اور یہ ...

تمہارا نشاط کنڈ ـــــ ... اس سے تو ایک "کوٹھا" بھلا ـــــ جہاں کم از کم عورت کی ایک خواب گاہ تو ہوتی ہے ـــ غصے سے میری آواز کانپ کر رہ گئی ـــ جسم گرم ہو گیا۔
"دھیرج کہانی کار ـــ ... ادب و اخلاق کے علمبردار ـــ ... یہ نشاط کنڈ" ہے۔ شانتی نگر و آنند بھون کی تجریدی شکل ـــــ ... یہاں غصہ کسی کو نہیں آتا ـــ یہ پاپ ہے۔ ویسے تمہاری قوم کے دکھ میں گھلنے و جلنے والی روح سے کہنا ہے کہ ـــــ "امریکہ و روس کی سیر کے وقت تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا ـــ؟ اپنا قلم گھستے وقت تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ یہ روس یا امریکہ کی خواب آگیں سرزمین نہیں ـــ اپنی جنم بھومی ہے ـــ" بھارت ماتا" اس ماتا کی کوکھ سے پرائی اولاد کو نہیں اپنی اولاد کو جنم دینا چاہیے ـــ" ـــ ـــ

اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا ـــ صرف ان کے تیز وحشیانہ قہقہے ابھر ابھر کر ڈوبتے رہے دھواں بڑھتا رہا ـــ بدبو پھیلتی گئی۔ دم گھٹنے لگا۔
آج جب بھی قلم پکڑتا ہوں تب نشاط کنڈ کے یہ قہقہے دیوانہ وار میرا پیچھا کرنے لگتے ہیں کسی آسیب کی طرح ـــــ"

■■

جاوید مقصود ۲۲-۲-۲۳۶ کوٹھی عافیت حسینی محلہ حیدرآباد ۲۴

"اِلیہِ راجعون"

اندھیرے ہی سے ترا
اور مرا جنم بھی ہوا
انہی اندھیروں کی جانب
ہمیں پلٹنا بھی
چلو
انہی کے بلاوے کی پھر صدا آئی
یہاں
اگر کوئی چارہ ہے .....
اندھیرے ہیں،
تمام دن یہ لڑے سورجوں سے
پھر آئے
تمام رات لڑے چاند سے
ڈٹے بھی رہے
ہزار لاکھ ستاروں سے کوئی
خوف نہیں
یہ لازوال اندھیرے جو ہم سے دور نہیں
ہمارے ذہن کے، دل کے
شعور کے ساکن
یہ لازوال اندھیرے
ہماری منزل ہیں

نجیب رامش
بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن
بلڈنگ بھوپال

غزل

ڈالی ڈالی جھلسائے ہے، ناگ اب اپنے جل بل کا
نادانی ہیں کہہ تو دیا تھا خود کو پیڑ اک صندل کا

پیاسے صحرا میں گونجی ہے بوندکی پہلی سرگوشی
دوڑو لوگو! دوڑو بڑھ کر رستہ روکو بادل کا

پانیوں میں رو دھو کر وہ تو دیواروں میں قید ہوئی
ان کاندھوں کا زخم بن گیا داغ اس آنکھ کے کاجل کا

پیاس، اکیلا پن، سناٹا، بے مہری، جھنکار کی موت
دیکھیں کیا کیا اور رہے گا، ٹوٹا گھنگھرو پائل کا

تم جانے کتنی آنکھوں میں گنگا جمنا بھر دیتے
پھول ارتھی میں رکھے ہیں، پٹرا ہے کر لو پاگل کا

عریانی پورا ہے کا قانون بنی اچھا ہی ہوا
میلے کپڑے کب تک آخر زخم چھپاتے مخمل کا

فوزیہ کی اچانک اور بے وقت موت نعیم کی زندگی کا سب سے بہت بڑا المیہ ہو گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی شریک حیات فوزیہ اپنے پیچھے دو نشانیاں چھوڑ کر اتنی جلد ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو جائے گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ جہاں نعیم نے فوزیہ کو پا کر زندگی کا بھرپور اعتماد حاصل کیا تھا وہیں فوزیہ نے نعیم کو بے پناہ پیار دیا تھا

اس کی ملازمہ حلیمہ نے بڑے ہیبت ناک انداز میں کہا تھا: صاحب جلدی گھر آ جائیے بی بی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی ہے — !
نعیم کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔

فوراً ہی نعیم ڈاکٹر کو ساتھ لئے گھر پہنچا تو فوزیہ کی حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ حلیمہ نے بتایا کہ فوزیہ ننھے منے کیلئے

ولی تنویر
۴-۴-۸۱-۲۰ شاہ گنج روڈ حیدرآباد ۲

ہستا اور مسکراتا وہ ان کی آنکھوں کے تابع تھے۔ زندگی ایک پُر سکون دریا کی طرح گذر رہی تھی۔ لیکن نعیم کو کیا پتہ تھا کہ اس پُر سکون دریا میں اچانک ہی طوفان آ جائے گا اور اسے اتنی جلد فوزیہ کے خوبصورت ہونٹوں کی مسکراہٹ کے لئے ترس جانا پڑے گا۔
وہ دن نعیم کی زندگی کا بدترین دن تھا اس دن وہ آفس کے کام میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فون گھر سے آیا تھا۔
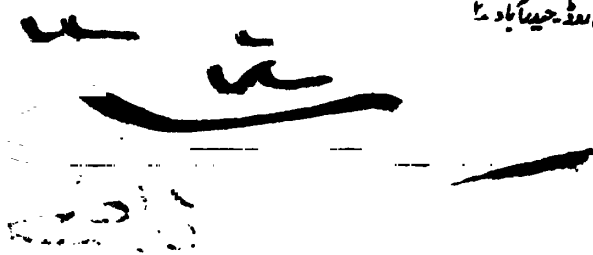
اسٹو پر دودھ گرم کر رہی تھی کہ اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ نعیم کا ذہن چکر لانے لگا ڈاکٹر کے مشورہ پر فوزیہ کو اسپتال لے جایا گیا اور اس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن موت پر کس کا بس چل سکتا ہے؟ دیکھتے ہی دیکھتے فوزیہ کی خوبصورت آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

ایک ایک کر کے پچھلے سارے واقعات نعیم

کو یاد آتے رہے ۔ اور وہ بڑی دیر تک حسرت
ویاس کی تصویر بنا بیٹھا رہا۔
"بابا ــــ آج آپ آفس نہیں جائیں گے کیا ـ
اسد کی آواز پر وہ چونک پڑا ــــ اور اپنے غم کو چھپاتے
ہوئے کہا۔" ہاں بیٹے بس تیار ہوتا ہوں۔ تم چلو
میں ابھی آیا ــــ ؟"
حلیمہ دیدی نے ابھی ابھی میرا منہ دھلایا
ہے اب وہ صمد کا منہ دھلا رہی ہے ۔ آپ بھی

اور دل میں ٹیس سی اٹھنے لگی۔

فوزیہ حلیمہ کو بے حد چاہتی تھی ۔ حلیمہ انہی کے خاندان
کی ایک مجبور اور بے سہارا لڑکی تھی ۔ معصوم حلیمہ
کے شرابی اور آوارہ شوہر نے اس کو محض اسی وجہ
سے طلاق دیدی تھی کہ وہ اسے شراب پینے کے
لئے پیسے فراہم نہیں کرسکتی تھی ۔ نعیم اور فوزیہ
نے بے کس و نادار حلیمہ کی مدد کرتے ہوئے اسے

دلی تنویر

تیار ہو جائیں تو سب مل کر کھانا کھائیں گے !"
"اچھا بیٹے تم جا کر حلیمہ کا ہاتھ بٹاؤ میں بھی تیار
ہو کر آتا ہوں ۔ نعیم نے کہا۔
"بابا ' ممی تو چلی گئیں ۔ آپ بھی ہم سے بات نہیں
کرتے ۔"
حلیمہ ننھے صمد کو گود میں اٹھائے کمرے
میں داخل ہوئی تو رات بھر کے پھونکے ہوئے
سگریٹ کے ٹکڑے اور نعیم کا تھکا تھکا چہرہ
دیکھ کر بے اختیار اس کی آنکھیں نم ہو گئیں

اپنے پاس رکھ لیا تھا ۔ ایک عرصہ سے وہ انہی
کے گھر کام کیا کرتی تھی ۔ حلیمہ ہمیشہ ہی خلوص سے
کام کرتی اور فوزیہ بھی ہمیشہ اس سے پیار و محبت
کا برتاؤ کیا کرتی تھی

"اسد بیٹے ! اس طرح رنج نہیں کیا کرتے اچھے
بچے چلو کھانا کھالو اور پھر خوب کھیل لینا
چلو چلو ــــ !" حلیمہ نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے
کہا ' وہ بے حد غم زدہ تھی اگر وہ بھی رنجیدہ ہو گئی تو

بچوں کو کاروبار چلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے نعیم
کے سینے سے چپٹے ہوئے اسد کو لے لیا اور پھر
دونوں بچوں کو کھانا کھلانے لگی۔ جب بچے
کھانا کھا کر کھیل میں مشغول ہو گئے تو حلیمہ نے
نعیم سے کہا "اگر آپ بھی اس طرح بے قابو
ہو جائیں تو میرے لئے بچوں کو سنبھالنا بہت دشوار
ہو جائے گا۔ ان کے سامنے آپ خوش رہا کیجئے
ورنہ ان کا دل غم سے پگھل جائے گا۔۔۔" یہ کہتے
ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور آواز بھی غم
سے بھر آئی۔ نعیم کو حلیمہ کے خلوص کا احساس
ہونے لگا۔۔۔!

دن گزرتے گئے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ حالات
بھی بدلتے گئے۔ لیکن نعیم کے دل میں درد کی جو دنیا
آباد ہو گئی تھی وہ اب اسی طرح آباد رہی۔ وہ فوزیہ
کی یاد میں رات رات بھر جاگتا رہتا۔ تاہم وہ
ممکنہ کوشش کرتا کہ کسی پر بھی اس کے غم کا
اظہار نہ ہونے پائے۔۔۔! اور ادھر خاندان
کے بعض لوگ اس کے زخمی دل پر نمک چھڑکتے۔
وہ لوگ اسے دوسری شادی کے لئے مجبور کیا کرتے
اس لئے کہ انہیں نعیم کے دل کی حالت کا اندازہ
ہی نہ تھا۔ نعیم ان لوگوں کو ٹالتا رہتا!
نعیم سمجھدار تھا۔ خوبصورت اور قابل تھا
اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اور کافی کماتا
بھی تھا اس لئے بہت سے لوگ اس کو دو بچوں
پر بھی لڑکیاں دینے تیار تھے۔ لیکن اس نے کبھی ان کی

جانب توجہ نہ کی۔ اس کے سامنے تو بچوں اسد اور
محمد کی زندگی کا سوال تھا اور ذہن میں اپنی مرحوم
بیوی فوزیہ کا حسین تصور۔۔۔! اسے گمان تھا کہ
اگر وہ دوسری شادی کر لے گا تو بچوں کی زندگی
خطرے میں پڑ جائے گی۔ جن کی زندگی کو وہ ہمیشہ اپنی
زندگی پر قابل ترجیح سمجھتا تھا۔

یوں ہی کچھ دن اور گزر گئے۔ لیکن ایک دن ایک
عجیب سی بات ہو گئی۔ اس دن نعیم حسب معمول
دوپہر کے کھانے کے وقفہ کے دوران آفس کے
کنٹین میں ایک طرف بیٹھا چائے پی رہا تھا اور
اس روز صبح ہی سے وہ بے حد سنجیدہ اور غمگین تھا
وہ فوزیہ کی یاد میں گم سم خیالوں کی دنیا میں کھویا ہوا
تھا اسے فوزیہ کی یاد بہت آرہی تھی۔ آج فوزیہ
کی برسی کا دن تھا۔ آج ہی کے دن فوزیہ اس سے
جدا ہوئی تھی۔۔۔! اس کا دل غم سے پھٹا جارہا تھا
وہ اداس بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے کچھ ساتھی ادھر
نکل آئے "کیا بات ہے نعیم۔۔! آج بہت کھوئے
ہوئے نظر آرہے ہو۔" ایک دوست نے نعیم کے
کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں یار کوئی خاص بات نہیں۔۔۔!" نعیم نے بھی
سنجیدگی سے جواب دیا
"اچھا تو سناؤ یار، تمہاری بھابی کا کیا حال ہے۔؟"
دوسرے نے بڑا ہی بھونڈا اور بے ہودہ مذاق کیا
"بھابی۔۔۔؟!" نعیم چونک پڑا۔۔۔!
ارے وہی تمہاری حلیمہ! تم بھی خوب بنتے

کی کوشش کرتے ہو یا یہ گھر میں جہاں ملازمہ ہو.... تو زندگی کتنی..... حسین اور دلکش ہو جاتی ہے....

——— تیسرے نے الفاظ کو چباتے ہوئے ادا کیا۔

پھر ایک ساتھ کئی قہقہے بلند ہوئے۔ نعیم تڑپ اٹھا جیسے بے شمار بچھوؤں نے ایک ساتھ اس کے ڈنک ماردی ہو—— ! وہ اس طرح سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے دل میں آیا کہ ان دوستوں کو مار مار کران کی دھجیاں ہوا میں اڑا ڈالے۔ لیکن غم سے وہ اس قدر نڈھال ہو گیا تھا کہ اسے بات کرنا تک محال معلوم ہو رہا تھا اس لئے اپنا خون پی کر خاموش ہو گیا۔

شام کو جب وہ گھر آیا تو اس کے دل و دماغ میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔

بات پھر اس کا ذہن عجیب کشمکش کا شکار ہوتا رہا۔ جب غم اور غصہ کے بادل چھٹے تو دل کو یک گونہ سکون ہوا۔ تب اسے خیال آیا کہ اس کے دوستوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس تعلق سے کسی کو بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ اب حلیمہ کو اپنے گھر سے نکال دینا چاہیئے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں اسد اور صمد کے معصوم چہرے ابھر آئے۔ بچے اب حلیمہ سے کافی مانوس ہو چکے ہیں۔ ان کا حلیمہ کے بغیر رہنا بھی مشکل ہے۔ حلیمہ نے ان کو ماں کی محبت دی ہے۔ صبح سے شام تک وہ بچوں کی خدمت میں مصروف رہتی ہے۔ خدیجہ کے بعد اس نے بچوں کی بے لوث خدمت کی ہے۔ اس نے بچوں کو بڑا خلوص و پیار دیا ہے۔ اگر اس کو گھر سے نکال دوں تو بچوں کا کیا ہوگا

——؟ اسی طرح کے مختلف سوالات کا ہجوم اس کے ذہن میں پیدا ہونے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کہ آخر کیا کیا جائے —— ؟

پھر اس کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ "کیوں نہ حلیمہ کو ہی اپنا لیا جائے—— ؟" وہ اچھے ہی خاندان کی ہے نیک ہے شریف ہے۔ بچے بھی اس سے کافی ہل مل گئے ہیں۔ گھر کے کام کاج سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔ اگر اس کو گھر سے نکال دوں تب بھی مجھے کسی ملازمہ کی ضرورت ہوگی۔ اس نئی ملازمہ پر میں کس طرح اعتماد کر سکوں گا۔ کیا بچوں کو وہ پسند آسکے گی۔ کیا بچے اس کو قبول کر لیں گے؟ اس وقت بھی اس طرح کے بہت سے شک و شبہات اور سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ بڑی دیر تک اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرتا رہا۔

دوسری صبح اس نے اپنے اس خیال کا اظہار خاندان کے ایک بزرگ سے کیا تو اس کے خیال کا خیر مقدم کیا گیا اور خوشی ظاہر کی گئی ——— حلیمہ کی بھی جب اس مسئلہ پر رائے لی گئی تو وہ بھی پس و پیش کئے بغیر خاموش رہ گئی ———!

اس طرح حلیمہ جو کل تک ایک خادمہ کی حیثیت سے اس گھر میں رہتی تھی۔ آج کی رات اسی گھر کی مالکن بن گئی ——!!

رات تو گزر گئی—— لیکن صبح جب نعیم نیند سے بیدار ہوا تو ششدر سا رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ حلیمہ ابھی

ابھی تک سو رہی ہے۔ دن کافی چڑھ آیا ہے، اسد اپنے چھوٹے بھائی کا منہ دھلا رہا ہے اور ننھا صمد مصر ہے کہ وہ حلیمہ سے ہی منہ دھلائے گا۔ اسد اسے سمجھا رہا ہے۔ نہیں منّے اب میں ہی روز تیرا منہ دھلایا کروں گا۔ اب حلیمہ دیدی ہمارا منہ نہیں دھلائیں گی۔!"

بچوں کی باتیں سن کر نعیم کا دل بھر آیا۔ وہ سوتی ہوئی حلیمہ کو جگاتے ہوئے بولا "اٹھو حلیمہ۔ دیکھو صبح کافی ہو چکی ہے.... بہت سارا کام پڑا ہے۔ بچے بھی اٹھ چکے ہیں۔ انہیں تیار کرنا ہے۔ اٹھو!"

حلیمہ نے جسم توڑتے ہوئے انگڑائی لے کر ایک طویل جمائی لی اور کہا "کیا بات ہے جی۔ چین سے سونے بھی نہیں دیتے..."

"اٹھو حلیمہ دیکھو بچے رو رہے ہیں..." نعیم نے جبر کرتے ہوئے کہا۔

"بچے — ا بچے!! بچے!!! ؟ کون بچے؟؟

اُف اسد اور صمد—! ؟ اب مجھ سے یہ سارے کام نہ ہو سکیں گے — کسی ماما کا انتظام کیوں نہیں کر لیتے —؟؟" حلیمہ نے بڑی بے پروائی سے کہا اور کروٹ بدل کر پھر سو گئی۔ ■■

جالب وطنی

بوری باجرلین

ہند پچری مانچی

غزلیں

سنہری ریت کا دریا ہے کیسا خوابوں میں

بھٹک رہی ہے مری تشنگی سرابوں میں

حیات کتنی شکستوں سے ہو کے گزرے گی

لکھا ہے راہ کی پتھر نما کتابوں میں

نہ جانے دست شجر میں ہیں آئینے کس کے

مرے ہی عکس ہیں بکھرے سیہ گلابوں میں

کھڑے ہیں دور جو ساحل پہ ان کو کیا معلوم

چھپے ہیں کیسے گہر سیپ کے نقابوں میں

یہ کیسا وقت نے جالب سوال مجھ سے کیا

تمام عمر رہا منتشر جوابوں میں

اٹکھیلیوں سے جبکہ ہوا باز آ گئی

تنہائیوں میں پھر وہی اک آگ سی لگی

بحر جہاں میں کود کے ہم ڈوبتے رہے

پھر بھی جو ہاتھ آئی وہ اک تشنگی ہی تھی

سیلاب آدمی میں بہت ڈھونڈتا رہا

صورت مگر نہ کوئی مجھے آشنا ملی

دیکھا ہے بار بار اسی راہ پر اسے

پھر بھی وہ لگ رہا ہے کہ جیسے ہو اجنبی

مشعل بجھی ہوئی ہے ہنسی بھی بجھی ہوئی

ایسے بھی لوگ بنتے ہیں کیا راہبر کبھی

ایف۔ اے۔ بادشاہ

نزد ڈسٹرکٹ اگریکلچر آفس موتیہاری (بہار)

مے پیکر حیدرآباد

غزل

ضیا راانجم
۲۲۳ - بی، صدر بازار جبلپور (م.پ)

میرے لبوں کو نرم تبسم کی دھار دے
اے دشمنِ حیات! مجھے کچھ تو پیار دے

ہاتھوں کو اس گناہ کی لذت سے دور رکھ
اپنی نظر کا زہر بدن میں اتار دے

مدت سے بے سکون ہے دریا خیال کا
تخلیق کی تھکن مجھے پروردگار دے

آنکھوں کو انتظار کی لذت تو دی مگر
دل کو بھی اپنے آپ پہ کچھ اختیار دے

ایک اور سال بیت گیا انتظار کا
"دیوار سے پرانے کلنڈر اتار دے"

صدیوں سے اپنا جسم جلاتی رہی ضیا
کیا اور اب ثبوتِ وفا ریگ زار دے

مرے وجود میں اک آگ بن کے بھڑکی تھی
لگی ہوئی میرے سینے سے وہ جو لڑکی تھی

جگہ جگہ سے زمیں خواہشوں کی تڑخی تھی
بدن کے دشت میں بجلی سی کوئی کڑکی تھی

نکل کے دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا
مرے ہی وہم کی زنجیر جیسے کھڑکی تھی

سلگ رہا تھا رگ و پے میں کوئی جنگل سا
یہ آگ جیسے ترے جسم کے رگڑ کی تھی

بدن بدن تھا ترے لمس کا تمنائی
جو نکلا گھومنے تو چھاتی چھاتی دھڑکی تھی

مشاعرے میں تھی ہلچل مچی ہوئی اختر
مری غزل پہ کوئی مہ جبین پھڑکی تھی

نذیر اختر
مقابل رائل ٹیلرنگ فرم، چوک بازار - ناندیڑ

جیے سندھ کا عظیم شاعر شیخ ایاز

امجد یوسف زئی ۴۴۲-۷-۱۶ عثمان پورہ حیدرآباد-۲۴

ہندوستان کی تقسیم کے وقت ہی سندھ کے
ترقی پسند ادیبوں نے "سندھو - کے لیے" کا نعرہ
بلند کیا تھا اور اس میں پیش پیش سندھی زبان کے مشہور
شاعر شیخ مبارک غلام حسین ایاز تھے جنہوں نے جئے
سندھ کی بنیاد پر جئے سندھ کا نعرہ بلند کیا تھا۔ شیخ ایاز شکارپور
میں ۲۸ مارچ ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے ۱۹۴۲ء میں جب
ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بھارت چھوڑو کی
تحریک زوروں پر تھی ان کی نظمیں "اوباغی" اور "انقلاب"
ہر شخص کی زبان پر تھیں ۱۹۵۵ء سے ان کی شاعری میں
ایک نیا موڑ آیا۔

ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا جو ۱۹۶۲ء
میں ضبط ہو گیا ۱۹۶۴ء میں دوسرا مجموعہ چھپا مگر اس پر
بھی پابندی لگا دی گئی۔ ان دونوں مجموعوں میں راجہ
داہر اور ان کی دو بیٹیوں کے متعلق گہری عقیدت کا اظہار
کیا گیا ہے اور محمد بن قاسم کے خلاف نفرت ظاہر کی گئی
ہے جس نے کہ ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ پاکستان میں
جب مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنایا گیا تو شیخ ایاز نے لکھا

دیسی ہو گئے پردیسی
پردیسی بن گئے دیسی
آئے گھر میں انجانے
نکل گئے تھے جو ینہی

(ینہی سے مراد ہندو)

غیر گھس آئے
اور تڑپ گئے سندھری

اسی وقت جمال رند نے "ریت کے محل" نامی کہانی لکھی۔

اور غلام مرتضیٰ سید نے صاف لکھا "سندھ کے ہندو
اور مسلمان پاکستان سے الگ ایک قوم ہیں جن
کی اپنی علیحدہ تہذیب، ثقافت، ادب اور
روایت ہیں۔ شیخ ایاز نے اپنے ایک ہندو دوست
کو جو شاعر تھا بھارت جانے پر لکھا: تمہاری اور
ہماری تڑپ — یہ ایک ایسا دل کو لرزا دینے والا
سوال ہے جو تاریخ کے کانوں میں گونجتا رہے گا۔
اور تاریخ خاموش، لاجواب ہو کر اپنا سر ندامت
و شرم سے جھکا لے گی۔ اب شیخ ایاز سندھ کی جیل
میں نظر بند ہیں۔

جیے سندھ تحریک کے تین مقاصد ہیں:
(۱) ایک یونٹ کے خلاف آواز بلند کرنا
(۲) سندھی زبان اور سندھی تہذیب کا احیاء اور
اس سے پیار۔
(۳) اپنے ہندو ساتھیوں کی یاد، اس تحریک کے
دیگر علمبردار ہیں، حیدر بخش جتوئی، رشید بھٹی، ارشاد
بیگم حیا، ربانی اور عباسی وغیرہ، شیخ ایاز کی چند
نظمیں:

راجہ داہر

تمہاری خوبصورت اور حسین لڑکیوں کو
کون لایا ہے یہاں
قیدی بنا کر؟
کتنی بے چین ہیں وہ؟
ان کی کمر میں رسیاں بندھی ہیں جو،
ان کی زلفیں پکڑ کر وہ
انھیں گھسیٹ رہے ہیں
آگے ہیں گھوڑ سوار
پیچھے ہیں حسین راجکماریاں
ناخن سے سر تک برہنہ
پھر بھی ان کے چہرے پہ ہے عیاں
ہمت و دلیری
اور دشمنوں کے لئے حقارت
گویا
میری نظمیں

بمبئی۔ ساحل ماہیم

کہیں کسی کی بیٹی
گا رہی ہے شادی کے گیت
اور میری سندھی زبان
سمندر کے کشور میں گھل مل گئی ہے
یہ شادی کے گیت
شاید کسی کی بیٹی نے
"کنجھر" کے کنارے گایا ہو
یا شام کے وقت
اس کی مٹھاس
ٹھنڈے جھونکوں میں مل کر
"کیاماڑی" سے "منھاری" تک پہنچی ہوگی۔
اس شادی کے گیت کو جھلا کر دیکھو
یہ اک جھولا ہے
جو کراچی سے بمبئی تک جھول رہا ہے۔
اور جس میں
سندھو دیس کی معصوم محبت سوئی ہے

دوہے

رات کو دیپک کی باتی میں گئے بہت یگ بیت
رو رو کر پڑھتا جاتا تھا دیا پتی کے گیت
جلتی ہے دھرتی کی چھاتی مرتی ہے مخلوق
پریم پربے ہوا ب میں لٹکا ہاتھوں میں بندوق

سنگرام

(بھارت میں رہنے والے سندھی شاعر سے)

یہ سنگرام :
سامنے ہیں نارائن شیام
اس کے میرے قول ایک سے
بول ایک سے
وہ شاعری کا بادشاہ پریم ہی ہیں
میرے بھی رنگ محل
دوست ایک سے
محبوب ایک سے
گاؤں ایک ہیں دل بھی ایک ہیں
اس پر کیسے بندوق اٹھاؤں ؟
کیسے گولی چلاؤں
کیسے چلاؤں ؟
کیسے ؟

جاپانی کہانی
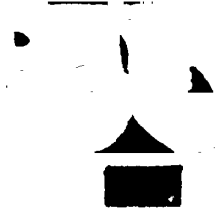
- مصنف : هیاما یوشیکی
- مترجم: اے۔ اے منظر

ست سودو پوشیبو سمنٹ کے بورے خالی کر رہا تھا اپنے جسم کے بیشتر حصے کو وہ اڑتی سمنٹ سے محفوظ رکھا تھا لیکن اُس کے بالوں اور ہونٹ پر بھورے رنگ کی گہری پرت جمی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ناک اور سمنٹ کو، جس نے اس کے نتھنوں کے بالوں کو کانکریٹ کی طرح سخت کر دیا تھا، پوری طاقت کے ساتھ ہٹانا چاہتا تھا۔ مگر سمنٹ مکسچر ہر منٹ پر دس بار سمنٹ نکال رہا تھا اور وہ اس کی رفتار کو گھٹا نہیں سکتا تھا ___

اس نے گیارہ گھنٹے کام کیا اور اس درمیان ایک بار بھی اپنی ناک صاف کرنے کے لئے موقع نہیں ملا دوپہر کو اُسے بھوک بڑی زور سے لگی تھی اور اس نے جلدی جلدی کھانا نگل لیا ___ اُس نے سوچا تھا کہ تیسرے پہر کی چھٹی پر وہ نتھنوں کو صاف کرلے گا، لیکن جب چھٹی کا وقت ہوا، تو اُسے سمنٹ مکسچر کو بھی بند کرنا تھا۔ شام کو اُسے ایسا لگا جیسے اس کی ناک پلاسٹر کی بن گئی ہو ___

مزدوری پوری ہو گئی تھی۔ تھکان کی وجہ سے اس کی اس کی بانہیں ینچ ہوتی جا رہی تھیں۔ سمنٹ کے کے بورے ہٹانے میں اُسے پوری محنت صرف کرنی تھی۔ جیسے ہی اُس نے ایک بورا اٹھانا چاہا سمنٹ میں اُسے لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبا ملا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے تعجب سے سوچا۔

اس نے ڈبا اٹھا لیا اور اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لیا ___

زیادہ بھاری نہیں ہے۔ دھت تیری کی! اسے

ہیں زیادہ پیسے تو ہو ہی نہیں سکتے اور جا ہے جو
کچھ ہوا وہ سوچتا رہا۔ اس درمیان وہ اپنے کام
سے بچھڑ گیا اور سمنٹ مکیچر کی رفتار کے ساتھ
چلنے کے لئے اُسے خوفناک انداز میں بھاگنا پڑا چلا
بڑا۔ تیز چلنے والی خودکار مشین کی طرح اس نے
دوسرا بورا الٹا اور دوسرے فریم میں اُسے بھر دیا۔
کچھ ہی دیر کے بعد مکیچر کی رفتار دھیمی ہونے لگی
اور آخرکار وہ بند ہو گیا۔ اب ہٹسو دو پہر کی چھٹی
کا وقت تھا۔ اس نے مکیچر میں لگے ہوئے پانی کے
پائپ کو اُٹھایا اور اپنے منہ اور ہاتھوں کو صاف
کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنا کھانے کا ڈبا گلے
میں لٹکا لیا اور پیر گھسیٹتے ہوئے اپنے گھر کی طرف
بڑھ گیا ——

وہ بجلی گھر سے آگے بڑھا۔ بجلی گھر کی تعمیر تقریباً مکمل
ہو چکی تھی۔ جلد ہی ان لوگوں کے گھروں میں بجلی
آجائے گی۔ دور شام کے دھندلکے میں، ایک دم
سفید برف سے پوشیدہ پہاڑ کی اونچی چوٹیاں دکھائی
دے رہی تھیں۔ اس نے اپنے چھ بچوں کے بارے
میں اور اس نئے بچے کے بارے میں، جو سردی
کی آمد میں پیدا ہونے والا تھا، اور اپنی بیوی
کے بارے میں جو ایک کے بعد ایک بچے کو
جنم دیتی جا رہی تھی، سوچا اور اس کا دل اُداس
ہو گیا۔ "ذرا دیکھو تو سہی ——" وہ بڑبڑایا ——
وہ مجھے روزانہ ایک این نوّے سین دیتے ہیں
ان میں سے میں پچاس / پچاس سین کے دو

اپ چاول خریدنے پڑتے ہیں۔ کپڑوں اور
رہنے کی جگہ کے لئے نوّے سین مزید خرچ
ہوتے ہیں۔ دھت تیرے کی! پھر وہ مجھ سے
کیسے امید کرتے ہیں کہ میں شراب کے لئے کافی
پیسے بچا لیتا ہوں؟"
اچانک اُسے اپنی جیب میں رکھے ہوئے اُس
چھوٹے سے ڈبے کی یاد آئی ہے۔
اُس نے اُسے نکالا۔ اُس پر لگی سمنٹ کو صاف
کرنے کے لئے اس نے اُسے اپنے پاجامے
سے رگڑا۔ وہ اچھی طرح سیل کیا ہوا تھا۔ اس
نے ڈبا ایک پتھر پر دے مارا۔ ڈبا ٹوٹ گیا۔
اور ایک چیتھڑے میں لپٹا ہوا کاغذ کا ایک ٹکڑا
زمین پر گرا۔ اس نے اُسے اٹھا لیا اور کھول کر
پڑھنے لگا۔
میں نومورا سمنٹ کمپنی میں کام کرنے والی ایک
لڑکی ہوں۔ میں سمنٹ کے بورے سیتی ہوں۔
میرا منگیتر بھی اس کمپنی میں 'کرشر' میں گٹی ڈالنے
کا کام کرتا تھا۔ ۔ ر اکتوبر کی صبح جب وہ ایک
بڑی چٹان پر چڑھ رہا تھا، کیچڑ پر پھسل گیا اور
چٹان کے ساتھ 'کرشر' میں گر پڑا۔ دوسرے لوگوں
نے اُسے نکالنے کی کوشش کی مگر
بے سود۔ 'کرشر' میں وہ چٹان کے ساتھ ساتھ
سما گیا۔ اُس کے بعد چٹان اور اس کے جسم کے
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وہ ساتھ ہی ساتھ
اجکٹر سے باہر آ گئے۔ اجکٹر سے مادی ہو کر
نکلے ہوئے چٹان کے سُرمئی ٹکڑے اُس کے خون

سے سرخ ہو گئے تھے۔ وہ سپاٹ ٹکڑے ایک
بڑے سپاٹ لال رنگ کے پتھر کی طرح نظر آ رہے
تھے۔ پھر وہ کنویئر بیلٹ پر گرے اور وہاں سے
بھوسے نما ٹنکر میں داخل ہو گئے۔ وہاں فولاد
کے وسیع ہتھوڑوں کے ذریعہ انہیں کوٹا گیا۔ آخر
میں جب انہیں پیسا جا رہا تھا، تب ان میں سے
ایک ہی قسم کی کراہ میں سن سکی تھی۔ اس کے بعد
انہیں برنرز میں لے جایا اور سمنٹ کی ایک خوبصورت
بوری بھٹی میں پکایا گیا ——— اس کی ہڈیاں،
اس کا گوشت، اس کا سر، سب کچھ اب پاؤڈر
کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ہاں، میرا منگیتر سمنٹ میں پوری طرح پس
کر اس میں شامل ہو چکا تھا۔ صرف باقی بچ گیا
اس کی قمیض کے ٹکڑے۔ آج میں اُن بوروں
کو سینے میں مشغول ہوں، جن میں وہ بھرا گیا ہے۔

اُس روز، اس کے سمنٹ بننے کے بعد، میں یہ
خط لکھ رہی ہوں اور اسے ختم کر لینے کے بعد
ڈبے میں رکھ کر اس بورے میں بند کر رہی ہوں
"کیا آپ مزدور ہیں؟ اگر آپ مزدور ہیں۔
تو صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے مجھے جواب
دیں۔ اس بورے کی سمنٹ کا استعمال کس
کام کے لئے کیا گیا ہے؟ مجھے آپ کے جواب
کا شدت سے انتظار رہے گا ——— اس
بورے کی سمنٹ سے کتنا مسالا بنا؟ اور اس
کا استعمال کسی ایک ہی مقام پر کیا گیا ہے یا
الگ الگ؟ آپ پلاسٹر کرنے کا کام کرتے ہیں
یا مکان تعمیر کرنے کا؟ . . . .
میں اسے کسی تھیٹر کا برامدہ یا کسی بڑی عمارت کی تعمیر
شدہ دیوار دیکھنا کبھی پسند نہیں کروں گی لیکن میں
کر بھی کیا سکتی ہوں!
اگر آپ مزدور ہیں تو ازراہِ کرم ایسی جگہ یہ سمنٹ
استعمال نہ کریں . . . مجھے یوں احساس ہو رہا
ہے کہ ویسا کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ آپ
جہاں بھی اس کا استعمال کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں
جہاں کہیں بھی اُسے دفنایا جائے گا، وہیں وہ
اس سے اچھا ثابت ہوگا۔ وہ ایک اچھا، صحت مند
نوجوان تھا اور جہاں کہیں بھی وہ رہے گا، صحیح
کام کرے گا ———
اس کی فطرت بڑی عاجزانہ تھی لیکن وہ ایک بہادر
اور ہمت والا آدمی تھا۔ ابھی وہ نوجوان ہی تھا۔ اُس کی
عمر محض ۲۵ سال کی تھی۔ مجھے یہ جاننے کا کبھی موقع
ہی نہ ملا کہ حقیقت میں وہ مجھے کتنا پیار کرتا تھا!
اور یہاں میں اس کے لئے کفن سی رہی ہوں۔
قبرستان کی بجائے وہ مشین اور جلتی ہوئی بھٹی میں
ہی ختم ہو گیا لیکن اُسے الوداع کہنے کے لئے
میں اس کی قبر کے لئے اور کہاں تلاش کروں گی؟
آپ جانتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہی نہ ہو سکے گا کہ
اُسے کس مقام پر دفنایا جائے گا۔ مشرق میں
یا مغرب میں، دور یا نزدیک ——— اسی باعث
میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے جواب دینا نہ بھولیں
اگر آپ مزدور ہوں گے، تو مجھے ضرور جواب دیں گے

کیا نہیں دیں گے؟ اور اس کے عوض میں میں آپکو اس کی قمیض کا ایک ٹکڑا دوں گی ــــ ہاں، کپڑے کا وہ ٹکڑا، جس میں یہ چٹھی لپٹی ہوئی ہے۔ اس بدن کی دھول، اس کے جسم کا پسینا، سب کچھ اس کپڑے میں سمایا ہوا ہے۔ مجھے آغوش میں لیتے وقت ــــ آہ! وہ مجھے کتنی مضبوطی سے آغوش میں لیتا تھا!.....

مہربانی کر کے میرے خاطر اتنا ضرور کر دیں۔ کیا آپ نہیں کریں گے؟ میں جانتی ہوں، یہ کافی تکلیف دہ کام ہے لیکن از راہ کرم مجھے اس سمنٹ کے استعمال کئے جانے کی تاریخ، جس جگہ اسے استعمال کیا جائے، اس کا نام اور پورا پتہ نیز اپنے نام سے بھی آگاہ کریں۔ شکریہ ــــ"

بچوں کے شور و غل نے ایک بار پھر مسودہ نویس کو جھنجوڑ دیا۔ اس نے خط کے آخر میں تحریر شدہ نام اور پتے پر نگاہ ڈالی اور پیالی کی شراب جو اس نے چائے کے پیالے میں انڈیلی تھی جلدی سے پی گیا ــــ

"شراب پی کر میں پاگل بن جاتا ہوں ــــ" وہ چیخا۔

"اور جو چیز بھی میرے ہاتھ میں آئے گی، اُسے پھینک دوں گا!"

"میں دیکھ رہی ہوں ــــ" اس کی بیوی بول پڑی ــــ

"شراب پینا تمہاری بس کی بات ہے! کیوں؟ ہے نا تمہاری بس کی بات؟ لیکن ان بچوں کا کیا ہوگا؟ ــــ"

اس نے اپنی بیوی کے اٹھے ہوئے پیٹ کی طرف دیکھا اور اُسے اپنے ساتویں بچے کی یاد آگئی ــــ ■■

غزلیں

ظفر صہبائی

معرفت ایس۔ اے۔ باری اینڈ کمپنی

موتیا پارک۔ بھوپال

کیسے کہوں کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی
باتیں وہی تھیں آج بھی کل کی کہی ہوئی

اس کا وجود سادہ ورق سا ہے دوستو
گھر میں ہیں گو ہزار کتابیں رکھی ہوئی

تم نے مرے خلوص کو دیکھا جو غور سے
پھر لوٹ آئی چہرے کی رنگت اڑی ہوئی

اپنے ہی خوں میں ڈوبا ہوا ہوں میں آج کل
آنکھوں کے آئینوں میں ہیں لاشیں بھری ہوئی

اُس نے جو آج غم مرے واپس کیے مجھے
پھر کچھ پرانے یاروں سے مل کر خوشی ہوئی

اس بوجھ سے نجات ملے تو سبک ہوں ہم
صدیوں کی گرد غم ہے بدن پر جمی ہوئی

فضا کوثری

۹۲۸۔ رضوریہ روڈ۔ بنگارا پیٹ

میسور اسٹیٹ
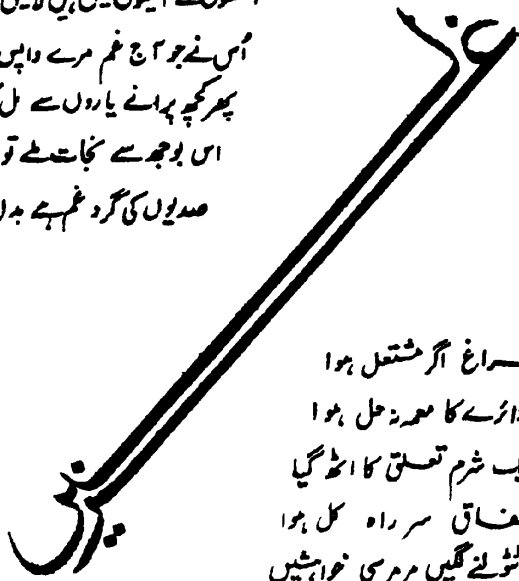
ابہام کا چراغ اگر مشتعل ہوا
لفظوں کے دائرے کا معمہ نہ حل ہوا

پردا ہر ایک شرمِ تعلق کا اٹھ گیا
یہ حسنِ اتفاق سرِ راہ کل ہوا

نبضیں ٹٹولنے لگیں مر مری خواہشیں
بے آنکھ آرزو کا یہی ماحصل ہوا

جو بات منہ سے نکلی وہ پتھر کی ہے لکیر
جو فیصلہ بھی تم نے کیا وہ اٹل ہوا

اس طرح سو رہا تھا میں سپنوں کے سیج پر
تعمیر جیسے ریت پہ کوئی محل ہوا

خواہش کو کیوں نہ درد کے اندر سمیٹ لوں
رشتہ ہی میرا درد سے روزِ ازل ہوا

تدبیر کمال

۱۹-۱-۸ منڈھائی نا ندیڑ (مہاراشٹرا)

وہ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے بدن پر ہلکے گلابی رنگ کی ساری اور اسی رنگ کا بلاؤز ہے۔ اس کے چہرے کی رنگت بھی کچھ گلابی گلابی سی ہے وہ گلاب کا ایک حسین پیکر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ پرکشش ہے اور خاص طور پر اس کی آنکھوں پر لگا ہوا سیاہ چشمہ!

اُس کی نگاہیں سڑک پر دوڑتی ہوئی سواریوں پر جمی ہوئی ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی ہے اور اسی بنا پر وہ میری توجہ کا باعث بنی ہوئی ہے۔ میرے ہاتھوں میں ایک فلمی رسالہ ہے جسے میں نے ابھی آتے ہوئے جنتا ناول گھر سے خریدا ہے۔ میں دیر سے رسالہ اپنی نظروں کے سامنے رکھے ہوئے اس کو خاموش نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ جب کبھی میری طرف متوجہ ہو کر دیکھتی ہے تب میں اپنی نظروں کو رسالہ پر جھکا لیتا ہوں اور یہ باور کرتا ہوں کہ میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھی جب اس سے نظریں چار ہو جاتی ہیں تو میں خود گھبرا کر نظریں چرا لیتا ہوں اور چور نظروں سے اسے تکتا رہتا ہوں

اس کی بغل والی سیٹ پر ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے جو کسی کورس کی کتاب کے مطالعہ میں غرق ہے۔ ابھی ابھی اس نے میری طرف دیکھا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ وہ اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہی ہے۔ کیا میں اس کی توجہ کا مرکز ہوں! یا میرے رسالہ پر چھپی ہوئی عریاں تصویر——!! خود وہ اس رسالہ کا مطالعہ کرنا چاہتی ہے اور مجھ سے مانگتے ہوئے جھجک رہی ہے۔ یہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ خیال آتے ہی رسالہ بند کر کے رکھ دیتا ہوں اور دائیں ہاتھ کی انگلی کے ناخن کو دانتوں سے دبا کر کترنے لگتا ہوں اور سڑک پر دوڑتی ہوئی سواریوں کو دیکھنے لگتا ہوں۔ کبھی کبھی چور نظروں سے اس پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوں۔

اس کی بغل میں بیٹھا ہوا بچہ اب بھی مطالعہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں پھر دہی رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگتا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے دل کی دھڑکن کچھ تیز محسوس ہو رہی ہے شاید یہ اس کی قربت کا نتیجہ ہے جو میرے خیالات سے مس ہو رہی ہے۔ میں اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالتا ہوں۔ اس کے ابھرتے ہوئے سرخ سرخ رخسار دیکھتے ہوئے انگاروں سے لگ رہے ہیں۔ اور اس کا سیاہ چشمہ اس کے چہرے کی دلکشی میں چار چاند لگا رہا ہے۔ اس کی زلفوں کی لٹیں بھی غضب کی شریر لگ رہی ہیں۔ جو بار بار اس کے رخساروں کو چھوتے ہوئے لہرا رہی ہیں۔

نہ جانے کیا سوچ کر اس نے اپنا بایاں پیر ہلانا شروع کیا ہے۔ شاید وہ زیرِ لب کوئی نغمہ گنگنا رہی ہے پیر کے ہلنے کی وجہ سے اس کی گود میں رکھا ہوا اس کا ہینڈ بیگ چکنی گلابی ساری پر سے آہستہ آہستہ پھسل رہا ہے۔

میرے دل میں اس سے بات کرنے کا اشتیاق جاگا ہے اور میں کوئی بہانہ تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن کیا یہ میرے ذہن نے بہانہ سوچنے کی ساری قوت ضائع کر دی ہے اور عجیب عجیب خیالات پیدا ہو رہے ہیں اور خاص کر یہ بات میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے کہ کیا وہ گونگی ہے!؟ کیونکہ اس کی بغل میں بیٹھا ہوا بچہ اس کی جان پہچان کا لگ رہا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی اپنے مطالعے سے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھنے لگتا ہے اور پھر دوبارہ اپنے مطالعہ میں ڈوب جاتا ہے۔

میں اس خیال کو ذہن سے نکال دیتا ہوں اور پھر اس کے چہرہ کا جائزہ لینے لگتا ہوں اور اس کے سیاہ چشمے سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اب بھی زیرِ لب گنگنا رہی ہے کیونکہ اس کا بایاں پیر اب بھی ہل رہا ہے اور گود میں رکھا ہوا ہینڈ بیگ آہستہ آہستہ پھسل کر سرک رہا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن اب بھی تیز تیز چل رہی ہے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ابھی کچھ ہوگا۔ میں اپنے اندر کی گھبراہٹ چھپا کر اس کے چہرے پر نظریں گاڑھ دیتا ہوں۔

یکایک کسی چیز کے گرنے کی آواز گونجی ہے۔ اور میں چونک کر نیچے دیکھنے لگتا ہوں، اس کی گود سے اس کا ہینڈ بیگ گر پڑا ہے۔ دفعتاً میں کہہ اٹھتا ہوں۔

"آپ کا ہینڈ بیگ گر گیا ہے!؟"

وہ کسی اندھے کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں کو ٹٹولنے کے انداز میں پھیلا دیتی ہے اور کہتی ہے۔ "کہاں ہے میرا بیگ" کہاں گرا ہے، کس طرف ——! منے ذرا دیکھ تو —— !!"

"یہ لیجیے، اس طرف، یہ رہا" میں اس کے ٹٹولتے ہوئے ہاتھوں میں بیگ تھماتے ہوئے کہتا ہوں "شکریہ"! وہ بیگ دوبارہ اپنے گود میں رکھتے ہوئے میرے بازو والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک معزز آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔

میرے ذہن میں آندھیاں چلنے لگی ہیں۔
اور میں اپنے اندر سمٹ کر ایک نقطہ میں تبدیل ہو جاتا ہوں۔ □□

تشنہ اعجاز
کاشانۂ ادب - خیر آباد مجھا - چمپارن ، بہار

خوشبو کی موت

وہ شام بھی عجیب تھی۔
میں اپنی ڈسپنسری سے دُور ـــــــ
ایک گاؤں سے مریض دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ ان دشوار گذار راہوں پر چلتے چلتے ، جسم تو بری طرح تھک ہی چکا تھا ' ذہن پر بھی ایک شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے اس وقت سارے آدرشوں سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ خواہ مخواہ میں نے شہر کی بھی سنوری زندگی تیاگ کر یہاں کی گرد آلود زندگی اپنا لی ، کہاں وہ دوستوں کی سدا بہار محفلیں ، کہاں یہ روکھی باسی زندگی
ـــــــ شہر چھوڑ کر یہاں آنے کے اس قدم پر میرے دوستوں نے کتنی مخالفت کی تھی۔
"پاگل ہوا ہے ؟
"ارے انہیں کون سمجھائے یہ تو بیسویں صدی کے گوتم بدھ ہیں ؟"
"میڈیکل کی اعلیٰ ڈگری کیوں خواہ مخواہ وہاں برباد کرنے جا رہے ہو ؟"
"مسٹر گوتم ! اپنے آدرشوں کو بروئے کار لانے کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ دیہات ہی کو منتخب کیا جائے۔ کیا یہاں خدا کی مخلوق نہیں بستی ہے ؟"
"بستی تو ضرور ہے مگر ٹمٹماتے چراغوں میں جو حقیقی حسن ہے۔ وہ بلبلوں میں کہاں۔ مجھے وہاں کی معصومیت کھینچ رہی ہے۔"
میرے رشتہ دار اور دوست قائل ہو گئے
اور میں ایک دن چپکے سے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا
جب میں تھکا تھکا اپنے ڈسپنسری والے گاؤں میں داخل ہوا اس وقت سنولائی شام رات کی دہلیز پر کھڑی دستک دے رہی تھی جھونپڑیوں سے ٹمٹماتے چراغوں کی روشنیاں چھن چھن کر

سرسکیوں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔
رہائش گاہ پہنچنے کے لیے میرے قدم تیز
ہو گئے۔ یکایک میری رفتار سست ہو گئی۔
سامنے والی جھونپڑی کے دروازے سے لگی وہ
سانولی سی لڑکی سسک سسک کر رو رہی
تھی۔ جس کا بچپن جوانی سے گلے مل رہا تھا۔ فطری
جذبے کے تحت اس کی سسکیوں نے مجھے پریشان
کر دیا۔ میرے قدم رک گئے۔

"صرف تیرے نہ جانے سے کیا ہوگا۔ اگر تو
میلہ نہ جا سکی تو اگلے سال چلی جانا۔ اب تو ہی بتا
"میلہ" جانے کے لئے پیسے کہاں سے پیدا کروں؟"

اپنی ماں کے سمجھانے پر اس کی سسکیاں اور
تیز ہو گئیں۔ میری بے تابیاں بڑھ گئیں اور میں
دفعتاً ان دونوں کے قریب چلا آیا۔

"کیا ہے؟"

میری اس آواز پر اس کی ماں چونک پڑی
مگر سسکیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔

"یہ میلہ جانا چاہتی ہے۔"

"تو جانے دو۔"

مگر میلہ جانے کے لئے پیسے تو چاہئیں۔"

میں نے اس کی طرف ایک دس کا نوٹ
بڑھا دیا۔

"نہیں بابو۔۔۔۔ اس پر رحم کیجئے۔ ابھی تو
یہ بہت کم سن ہے۔ آج ہی یہ "مکھیا" کی دو راتیں
آباد کر کے آئی ہے۔

اور میرے ہاتھ سے دس کا نوٹ گر پڑا ■■

۸۴ بیکر حیدرآباد

آذربائیجان کی پری خالہ سے ہزاروں میل دور ہندوستان میں رہنے والے واقف نہیں۔ یہ سیدھی سادھی عورت جسے اپنے ہی موضع کے امیروں اور بیگوں نے کچھ اس طرح لوٹا تھا کہ اس کا مختصر سا مکان بھی اس کا نہیں رہا۔ اور جسے اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ سیب کے اس پودے کی آبیاری بھی کر سکے جو اس نے اپنی شادی کے پہلے دن اپنی محبت کی یادگار کے طور پر اپنے مکان

بھی، کتاب و مکتب سے دور رکھا گیا۔ اور پھر اسکی شادی ہوئی۔ میاں بیوی نے مل کر ایک چھوٹا سا گھروندہ بنایا۔ ایک باغ لگایا۔ مولسری کی بیل۔ انگور کا منڈوہ اور سیب کا درخت۔ چند بطخیں بس یہی ان کی کائنات تھی ... اور پھر ایک دن پری خالہ کی گود ہری ہوئی۔ پری خالہ ماں بن گئیں۔ مگر چند دن بھی نہ گذرے تھے کہ پری خالہ کے پیارے بہادر اور چوڑے چکلے سینہ والے

احسن علی مرزا

۹/۸۲، ۵ - ۳ کنگ کوٹھی۔ حیدرآباد

روسی پری خالہ سے ہندوستانی پری خالہ تک

کے صحن میں لگایا تھا۔ یہ خاتون اپنے کردار اور اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے ہندوستان کی کسی بھی "پری خالہ" سے کتنی مشابہت رکھتی ہے ـــــ لینن کی جنم شتابدی کے موقع پر سوویٹ یونین کے ایک ادیب نے ۱۹۱۷ء کی اس پری خالہ کی بڑی پراثر کہانی لکھی ہے۔ اس عورت نے زار شاہی کے اندھیرے میں جنم لیا تھا۔ غریبی افلاس، توہم پرستی اور جہالت کے اس دور کی بے شمار روسی عورتوں کی طرح اسے

شوہر کو موضع کے امیر کے "کارندوں" نے گاؤں والوں کو امیر کے خلاف مائل بغاوت کرنے کی پاداش میں قتل کر ڈالا۔ پری خالہ کا گھر چھن گیا۔ اور وہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنے لگی .... پری خالہ کے شوہر اور اس جیسے کتنے ہی جفاکشوں کا خون رنگ لانے لگا اور بالآخر وہ دن بھی آیا جبکہ انقلابی دستہ خود پری خالہ کے لڑکے کی قیادت میں ان کے چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوا

اور بری خالہ کو گاؤں کی سب سے زیادہ قابلِ
احترام خاتون کی حیثیت سے امیر کے محل پر انقلابی
پرچم لہرانے کا اعزاز بھی ملا۔ سوویٹ یونین کی اس
بری خالہ کو انقلاب نے نیا روپ دے دیا ہے
اب تو وہ ترشکو وا بن گئی ہے۔ زلیخہ خانم کا روپ
دھار کر اکتوبر انقلاب کے گیت بکھیرنے لگی ہے۔

کاخ ستم و جہل درین ملک فرو ریخت
اندوہ و غم از کشور ما گشت گریزان
ہر سو ہنر و دانش نو شوق دل انگیخت
ہموار شد آری رہ خوش بختی انسان

سوویٹ یونین کی بری خالہ کو ترشکو وا اور
زلیخہ بننے تک جن مراحل سے گذرنا پڑا وہ بڑے
ہی صبر آزما تھے۔ میرے وطن کی بری خالہ کو بھی
کم و بیش ویسے ہی مراحل سے گذرنا پڑا۔ اس نے
بھی سروجنی دیوی کے روپ میں برسوں آزادی کی
راہ دیکھی۔ اور راجلنے کی آرزو اور تمنا کی پاداش
میں اسے قید فرنگ کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ امیروں
کی خواب گاہوں میں، ان کی مسرت و شادمانی کے
لئے اس نے کتنی ہی راتوں رقص کیا ہے۔ فاقوں
نے اس کی تمنا کے سوتے خشک کئے۔ مصائب و
آلام نے اسکا رنگ رُخ اڑا دیا۔

میری نظروں میں صنعتی دور کے آغاز کا وہ یورپ
بھی ایک لحظہ کے لئے ابھر آتا ہے جبکہ رات بھر مشغول
بہ کام کرنے والے بچوں میں اتنی توانائی اور طاقت
بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ صبح سویرے چند ساعتوں
تک آرام لینے کے لئے اپنے گھروں کو واپس ہو سکیں
ان کی مائیں اور ان کے باپ انہیں اپنے کندھوں
پر اٹھا کر گھر واپس لے جاتے تھے۔ مشین، انقلابی
انسانیت دوستی کے اقدار کے بغیر کتنی بڑی لعنت
بن گئی تھی۔ لیکن سوویٹ یونین نے صنعتی زندگی
کے اس عدم توازن کے خاتمہ کے لئے انفرادی
منافعہ کی جڑ کاٹ دی۔ اور نئے نظام نے ان
بدحال روسیوں کے لئے ملک پر پہونچنے کی راہیں
ہموار کردیں جنکی سوکھی روٹی پر بھی زار اور زارینہ
کا قبضہ تھا۔ سنہ ۱۹۱۷ء کے اس انقلاب نے ٹھاکر
ٹیگور کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اور جب انقلاب
کے صرف نو برس بعد ٹھاکر، سوویٹ یونین گئے
تو انہیں پتہ چلا کہ محنت کش طبقہ کا اقتدار کس
طرح ایک نئی جنت ارضی کو جنم دے سکتا ہے
سوویٹ یونین کی بری خالہ اور ہندستان کی
بری خالہ کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ حائل
ہے۔ لیکن غربت و افلاس کے خلاف لڑائی کی قدر
مشترک نے انہیں کس طرح ایک دوسرے سے
قریب تر کر دیا ہے۔ سوویٹ یونین کی بری خالہ
نکبت و فلاکت کے دیو کو پچھاڑ چکی ہے۔ اور
ہندستان کی بری خالہ نے جو پہلے تسلط سے
نجات پانے کے بعد اندرا گاندھی کے پیکر میں
ڈھل گئی ہے اس دیو کو للکار رہی ہے۔

سوویٹ یونین کی بری خالہ اس لڑائی میں ہماری
کامیابی کی آرزو مند ہی نہیں وہ تو ہماری ہمراہی تھی

مدد بھی کر رہی ہے۔ بھیلائی میں، بھوپال میں، حیدرآباد میں اس کے وطن کے انجینئر اور ہوشیار مزدور میرے وطن

انجینئروں اور محنت کشوں کے دوش بدوش ایک نئے ہندوستان کی تعمیر میں مصروف ہیں ان کی زبانوں پر زلفیہ کی نظم ہے ؎

لینن بہ گوشہ تبعیدگاہ و در زندان
ہمیشہ بود بہ فکر جہان و نوع بشر

"فکر جہان و نوع بشر" کے اسی رویہ نے ہندو روس دوستی کے جذبہ کو استحکام عطا کیا ہے۔

—— ہندوستان کی بڑی خالہ آذربائیجان کی بڑی خالہ کی طرح اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے ثمر سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ وہ برسات میں کیچڑ میں دھنسی ہوئی کھیتوں پر کام کرتی ہے۔ کارخانوں میں کمر سیدھی کئے بغیر مصروف رہتی ہے۔ ہسپتال میں زچہ گھروں میں، مدرسوں میں، پوری دلجمعی اور دل سوزی سے خدمت انجام دیتی ہے۔ لیکن ابھی تک اسے اپنی محنت کا منصفانہ معاوضہ نہیں ملتا ہے۔ اس کا کوئی مکان نہیں۔ خود اس کے بچوں کی نگہداشت تربیت اور تعلیم کا کوئی انتظام نہیں لیکن آنے والے تابناک دنوں کی بشارت اسے بھی دی جا رہی ہے۔ سروجنی دیوی نے اس کی مانگ کے سیندور پر نظمیں لکھی تھیں۔ اس کی چوڑیوں کا ساز سنا تھا۔ اس کی رنگ برنگی ساڑیوں کے کینوس پر اپنے وطن کی بڑی دلکش تصویر کھینچی تھی۔ جوش نے اس کی محنت اور رعنائی کا قصیدہ لکھا۔ مخدوم نے اسے بانکی تلنگن کے روپ میں دیکھا سردار و ساحر، کیفی۔ وہ کتنے ہی شاعروں کا موضوع سخن بنتی رہی۔ اور ان سبھوں نے بھی زلفیہ کی طرح اسے اس کی عظمت و تقدس سے روشناس کرایا۔

تو دختر آفتاب عالمتابی
از ظلمت و از جہل نیابی تو گزند
ہر روز تو پیرایۂ نوی یابی
با فتح و ظفر ہمیشہ واری پیوند

سوویٹ یونین کی اس دختر آفتاب کی طرح ہندوستان کی بنت خورشید بھی اپنے آپ کو نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر رہی ہے اور اس کی ماں بھی جس کی جوانی کھیتوں کے کیچڑ اور ملوں کے دھوئیں کی نذر ہوئی۔ یا پھر جو اپنی ساری عمر گھر کی چہار دیواری میں زندگی بھر محبوس رہی، اسے کالج جاتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں کہتی ہے ؎

آں دم کہ تو سوی رواں سوی دانش گاہ
خورشید زند سر ز افق صبح و مد
روشن کندت اشعہ زریں راہ
در سینہ زد جد قلب مادر بہ تپید

زلفیہ آذربائیجان کی شاعرہ ایک ماں کی حیثیت سے ہندوستان کی ان لاکھوں ماؤں سے کتنی مناسبت رکھتی ہے جو جہل و توہمات کے ماحول میں اپنی ساری عمر بتانے کے باوجود ہر صبح اپنی دہلیز پر کھڑی ہو کر اپنی لڑکی کو مدرسہ جاتے دیکھتی اور بڑا فخر محسوس کرتی ہے۔ اور زیر لب کہتی ہے ؎

تو میبروی خود شادی ما سوختن: تعلیم ز شعف زہر تو عبرت ست

لکھنؤ، دہلی، کلکتہ، بمبئی، حیدرآباد، ہندستان کے
کسی بھی بڑے شہر کی شاہراہیں، صبح کی ابتدائی ساعتوں
میں جیسے زندگی اور حیات سے ابلنے لگتی ہیں جب دانا
کدھوں سے لٹکائے لڑکے اور لڑکیاں ـــــ ایک
قافلہ صد رنگ (BUSES) بسیں قہقہوں سے گونجتی
شرارتیں، معصوم مسکراہٹیں، اس سیل نور سے میرے
وطن کا مستقبل جھانک رہا ہے۔ میری بچیاں بھی
جب تازہ رو اور تازہ دم ہو کر ان لمحوں میں اپنے
گھر سے نکل پڑتی ہیں تو میں زلفیہ کا گیت الاپنے
لگتا ہوں ؎

دختر! چہ قدر دلکش و زیباست ردائی تو
پہلو بہ ماہ و اختر و خورشید می زند
دارد مگر طراوت ہستی کرانہ ای
وصف بہار عمر قلم کی ادا کند
بگرفتہ روح نغمہ ای پر شور عصر نو
گشتہ است جا بجا ہمہ لبریز از نشاط

زلفیہ نے ـــــ اپنے دیوان "زر افشاں" کے خوبصورت
صفحات پر بیٹی، بہن، ماں اور محبوبہ کے جو نقوش
ابھارے ہیں وہی نقوش تو ہندستان کے صنم خانہ
تہذیب میں نظر آتے ہیں۔ یہ صنم خانہ، زلفیہ کے
لئے نیا نہیں۔ اس نے ہندستان کی سیاحت
کی ہے۔ ہندستان کے دوستوں نے۔ اس کے
دل پر بڑا گہرا نقش چھوڑا ہے۔ زر افشاں کی آخری
نظم میں اس نے جس محفل شعر کا نقشہ کھینچا ہے وہ
ہندستان کے ہر شہر میں منعقد ہوا کرتی ہے زلفیہ
اس بزم میں شریک ہندستانی دوستوں کو کس پیار

سے یاد کرتی ہے ؎

حال خورشید درخشان شدہ بر ہندستان
زین سبب می کند این چشم دلیرانہ نگاہ
دوستان! ہند کسی گشتہ دگر بار وطن
زین حقیقت ہمہ ای اہل جہان خدا آگاہ
دست افشان پسر ہندی در بنگال
ہم صدا شد و بہ تن جامہ ای سیمین دارد

زلفیہ کی یہ آواز ـــــ آواز دوست نہیں تو کیا
ہے۔ ہند کے بیٹو۔ بنگال کی بیٹیو۔ پنجاب کے
بلبلو! آذربائجان سے کوئی پکار رہا ہے۔ نیل
کی صاف و شفاف سطح کے ساتھ گنگ و جمن کے
پوتر جل کو یاد کر رہا ہے۔

شاعری نغمہ کند سر ز توانائی نیل
دگری چہرہ ای گنگ اور دو ز شعر پید

فاصلے مٹتے جا رہے ہیں۔ ویتنام کے سرفروش
بنگلہ دیش کے مجاہد، ہندستان کے وہ مرد و زن
جنھوں نے استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے خاتمہ کا
عہد کر رکھا ہے۔ سبھی کی نظریں سوویٹ یونین پر
لگی ہیں۔ کریملن جو کسی زمانہ میں زار روس اور اس
کے کم سواد مصاحبوں کی آماجگاہ سمجھا جاتا تھا۔ اب
ان سبھوں کا مرکز نگاہ بن گیا ہے جو یہ چاہتے ہیں
کہ ماں کی محبت، بیٹی کا پیار، بہن کا خلوص اور
محبوب کا حسن و جمال، نئے سماج کی آب و تاب کا
ایک جزو بن جائے۔

جن کی خواہش ہے کہ کارخانے، ایک شخص کی نہیں

سب لوگوں کی ملکیت ہو جائیں۔ جنکی آنکھیں
اس روز سعید کی منتظر ہیں، جبکہ بڑے شہروں
کی سڑکوں کے فٹ پاتھ پر، زندگی گذارنے والوں
کو چھوٹے چھوٹے خوبصورت سے مکان ملیں
جنکی دُعا ہے کہ مدرسے اور مکتب ہمیشہ شاد و
آباد رہیں ـــ سوویٹ یونین نے ایسے سماج
کو جنم دیا ہے۔ اور ہمارے دیس میں بھی اسی
قسم کے معاشرہ کی تشکیل کے لئے ایک مخلص دوست
کی طرح ہماری مدد کر رہا ہے۔ سوویٹ یونین
اب ایک خطہ ارض کا نام نہیں رہا ہے۔ وہ
ایک انداز فکر بن گیا ہے۔ وہ ایشیا کا باغبان بنکر
ہندوستان ہی کا نہیں، عرب افریقہ اور جانے
کتنے ممالک کو خوبصورت گلدستے پیش کر رہا
ہے ـــ

حاصل دست رنج و زحمت را
ثمر ذوق و ہنر و صنعت را
برد تا ہدیہ اش کند بر دوست
وہ کہ این ہدیہ با بس نیکوست

عبدالحلیم عقب لیڈی حیدری کلب بشیر باغ حیدرآباد

پرانے پیکروں کو غرق کرکے
ملی ہے تشنگی ہم کو
شفق کی پاک دامانی
ہوا کی نرم لہراہٹ
گل و لالہ، سنہرے نقش، رنگینی
انہیں ہم دفن کر آئے
کہاں کی ڈالیاں پھولوں سے بوجھل
خزاں کی سلطنت میں سوکھے پتوں کی جبیں سائی
بدلتے موسموں کی لے، گلے شکوے
یہی سب آج سہنا ہے
جلاوطنی میں سرگرداں
تحیر کی فضا میں سانس لینا ہے
صدائیں پھر بھی لہراتی ہیں آنکھوں میں
کئی راتوں کی تنہائی کی فصلیں کاٹتی ہیں
کوئی رہبر نہ سنگ میل
اُدھر دیکھو وہ چوراہے پہ سائے
اور اُن راہوں پہ سائے شام کے گہرے
جہاں پر کچھ نقابیں جال سا بن کر
ابھی سے راستہ ہموار کرتی ہیں
نئے سورج کے سائے میں
کہیں ایسا نہ ہو کہ جھلکیوں کے بھیڑیئے آکر
ملیں ہم اپنے ماضی سے
دھنک کے رنگ، آوازوں
کو پھر سے منتشر کر دیں

کوئی گھر اس وقت تک

گھر نہیں کہلاتا

جب تک کہ

اسمیں عمدہ فرنیچر نہ ہو

اپنے گھر اور دفتر کی عمدہ آرائش وزیبائش

کے لئے خوبصورت اور مضبوط اسٹیل فرنیچر

ہم سے حاصل کیجئے

مکرم جاہی روڈ حیدرآباد (آندھرا پردیش)

فون: ۴۱۲۰۶

راجکمار ——— ایک موڈی انسان اور اداکار

راجکمار ایک بہت ہی اعلیٰ پائے کا اداکار ہے۔ ہندوستانی فلموں کے بندھے بندھائے سانچوں میں جہاں اداکاری سے زیادہ چہرے مہرے کی مانگ ہے، راجکمار ان چند فنکاروں میں سے ہے جن کی اداکاری کسی چہرے مہرے کی رہین منت نہیں ہے۔

"مدر انڈیا" "وقت" "اونچے لوگ" "دل ایک مندر" "پیغام" جیسی فلموں میں یادگار اداکاری پیش کرنے والا یہ اداکار آج کل گمنامی کا شکار ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کیا عوام نے اسے پسند کرنا چھوڑ دیا ہے۔

فلمی حلقوں کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہے عوام میں اب بھی اس کی مقبولیت قائم ہے قصور خود راجکمار اور اس

پرچھائیاں

کی موڈی حرکات کا ہے۔

"وقت" کے بعد راجکمار کی مقبولیت بے انتہا ہوگئی تھی۔ کئی پروڈیوسر اپنی فلموں میں اسے لینے کے لئے اس کے دروازے پر روزانہ حاضری دیتے تھے۔ راجکمار نے اس وقت کئی فلموں میں کام کرنا قبول کیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ان فلموں سے راجکمار کو الگ کر دیا گیا۔ یا ان فلموں کی شوٹنگ ہی رک گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ راجکمار اپنی ہر فلم کے ہر شعبے میں دخل دینا شروع کر دیتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے ان اپنے کردار کو فلموں کے دوسرے کرداروں سے زیادہ غیر ضروری طور سے ابھارنے کا خبط ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آئے دن راجکمار کی کسی نہ کسی پروڈیوسر اور ہدایت کار سے لڑائیاں ہونے لگیں۔ اور پروڈیوسر اس کے نام سے ہی خار کھانے لگے۔ اور اس پر ستم یہ کہ کوئی فلمی پارٹی جس میں راجکمار نے شرکت کی بغیر راجکمار (کسی نہ کسی) سے تکرار کے ختم نہ ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اسے پارٹیوں میں بلانے سے بھی بچنے لگے اور دھیرے دھیرے راجکمار کو ایک تکلیف دہ چیز سمجھ لیا گیا۔

سائرہ بانو کی نئی فلم

بہار فلمز کی نئی فلم میں جس کا ابھی نام نہیں رکھا گیا ہے سائرہ بانو کو ہیروئن کے رول کے لئے لیا گیا ہے۔ ہیرو دھرمیندر ہے۔ پروڈیوسر گیت نگار راجندر کرشن کے بھائی سرگودھ ہیں اور فلم کو مدراس کے اے سبا راؤ ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔

دوسرے اداکار ہیں نذیر حسین، سجیت کمار، جیون، شمی، سندر، راجندر ناتھ اور نانا پلسکر گیت راجندر کرشن کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال دیں گے۔

نرگس امپا کی نئی صدر

مشہور فلم اسٹار اور فلم ساز مسز نرگس دت کو انڈین موشن پکچر پروڈیوسرز اسوسی ایشن کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ وہ مسٹر آئی ایس جوہر کی جانشین ہوں گی۔ جن دیگر عہدیداروں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں مسٹر رام چوپڑہ، مسٹر بخشی رام پرکاش اور مسٹر آر۔ اے۔ چ واڈیا شامل ہیں۔

مجروح سلطان پوری شنکر جے کشن کے ساتھ

مشہور گیت کار مجروح سلطان پوری نے تقریباً تمام نمایاں موسیقاروں کے لئے گیت لکھے ہیں لیکن شنکر جے کشن کے ساتھ انہیں گیت لکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اب پتہ چلا ہے کہ مکرجی انٹرپرائسز کی فلم "لوان بمبئی" میں وہ شنکر جے کشن کی دھنوں پر گیت لکھیں گے۔

پچھلے دنوں اس فلم کے لئے مجروح کا لکھا ہوا ایک گیت ریکارڈ کیا گیا اسے محمد رفیع اور کشور کمار نے گایا ہے۔ اس فلم کے ہدایت کار جائے کر جی ہوں گے اور ہیرو بھی وہی ہوں گے پہلی بار جائے مکرجی اور وحیدہ رحمان اس فلم میں ایک ساتھ آ رہے ہیں۔ دیگر اداکار آئی ایس جوہر، سونیا ساہنی کشور کمار اور نریندر ناتھ ہیں۔

جھلکیاں

● پروڈیوسر ڈائرکٹر لیکھ ٹنڈن جنہوں نے "پروفیسر اور جہاں پیار ملے" جیسی اچھی فلمیں بنائی ہیں اپنی آئندہ فلم کے لئے جس کا نام "ہمارا دور" رکھا گیا ہے۔ مکالمہ نگار پریاگ راج کو جنہوں نے ہاؤس ہولڈر جیسی فلم کے مکالمے لکھے ہیں ہدایت کا موقع دیا ہے۔ اس فلم کے مرکزی کردار ششی کپور اور راکھی ادا کریں گے۔ موسیقی کلیان جی آنند جی کی ہوگی۔

● چیتن آنند نے جن کی پچھلی فلم "ہیر رانجھا"

وفا میں سنجے اور ریکھا

اوما دیوی پکچرس کی فلم "وفا" میں سنجے اور ریکھا کو
لیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ جگدیپ، سندر، نذیر
حسین، نند، پدما کھنہ اور جے شری ٹی
بھی اس فلم میں شامل ہیں۔ ہدایت رمنا کی ہے
مکالمے اور گیت راجندر کرشن نے لکھے ہیں اور
موسیقی لکشمی کانت پیارے لال نے ترتیب
دی ہے۔

مہاکوی ٹیگور کی کہانی پردے پر

راجیشری پکچرز جنہوں نے "دوستی" جیسی
اچھی فلمیں بنائی ہیں اب مہاکوی ٹیگور کی
مشہور کہانی "ستیہ پتی" کو پردے پر پیش کر
رہے ہیں۔ اس رنگین فلم میں جس کا نام "اپہار"
رکھا گیا ہے بنگالی اداکار سروپ دتا
جیا بھادری کے مقابل ہیرو کا رول ادا کرے گا۔

مختصر مختصر فلمی خبریں

فلمی حلقوں میں بہت پسند کی گئی اب اپنا آئندہ
فلم "ہفتہ رحم" کے لیے فیروز چھپل؟ بلراج ساہنی
اچلا سچدیو اور جیون کو لیا ہے۔ ہیروئن بھی بدل [illegible]

● مشہور روسی ادیب ٹالسٹائی کا جنگ ناول

امرجیت کی نئی فلم کے ہدایتکار بی۔ آر اشارا

"چیتنا" کی کامیابی نے اس فلم کے ہدایت
کار کی مانگ بہت بڑھا دی ہے۔
ان دنوں کئی پروڈیوسر انہیں ہدایت
کار کی حیثیت سے لینے کے لئے تیار
ہو رہے ہیں۔
پتہ چلا ہے کہ پروڈیوسر امرجیت نے
جن کی پچھلی فلم "گیمبلر" بری طرح
ناکام ہوئی ہے اب اپنی آئندہ فلم
میں بی آر اشارا کو ہدایت کاری کے
فرائض سونپے ہیں۔ اس فلم کا ہیرو
دیو آنند ہوگا۔ ہیروئن کا ابھی
انتخاب نہیں ہوا ہے۔ گیت آنند
بخشی لکھ رہے ہیں۔ موسیقی لکشمی
کانت پیارے لال کی ہوگی۔ فلم
کی فوٹوگرافی فریدون ایرانی کی ہے
بی آر اشارا کی ہدایت میں یہ فلم تیزی
سے تکمیل کے مراحل طے کر لے گی۔

جنگ اور امن روس میں بڑی کامیابی سے
فلمایا گیا تھا اب ایک اور ناول "اینا کرے
نینا" پر فلم پیش کیا گیا ہے۔ حال ہی میں
بمبئی کے میٹرو سینما میں ریلیز کیا گیا ہے۔
بیان کیا گیا ہے کہ فلم بھی ناول کی طرح پر اثر ہے۔

پیام حیدرآباد ۹۳

سلیل چودھری راجیشری پروڈکشنز کی فلم میں

پتہ چلا ہے کہ راجیشری پروڈکشنز کی نئی فلم میں جو ایک مراٹھی ڈرامے پر مبنی ہے سلیل چودھری موسیقی ترتیب دیں گے اس فلم میں ہیرو کے رول کے لئے پونا فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ گولڈ میڈل یافتہ اداکار وجے اروڑہ کو لیا گیا ہے۔ مکالمے گووند مونس نے لکھے ہیں۔

شکتی سامنت پر قاتلانہ حملہ

مشہور فلم ساز و ہدایت کار شکتی سامنت پر ایک شخص کرتار سنگھ نے چاقو سے حملہ کر دیا۔ شکتی سامنت کے پیٹ پر زخم آئے۔ انھیں دواخانہ میں شریک کیا گیا۔ جہاں وہ روبہ صحت ہیں۔ واقعات یہ بتائے جاتے ہیں کہ کرتار سنگھ ایک کہانی لے کر شکتی سامنت سے ملا تھا۔ مگر شکتی سامنت کے ناپسند کرنے پر اس نے مشتعل ہو کر یہ کارروائی کی۔

رندھیر کپور اور ببیتا "جیت" میں

رندھیر کپور اور ببیتا کی فلم "متوالا" کا نام بدل کر اب "جیت" رکھدیا گیا ہے۔ یہ فلم اب تکمیل کے آخری مراحل سے گزر رہی ہے۔ پروڈیوسر اے ستبا راؤ اس فلم کو خود ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ اداکار راجندر ناتھ، سپنا، منورما، سلوچنا اور انور حسین ہیں۔

۹۴ بیکر حیدرآباد

دستک کے بعد راجندر سنگھ بیدی اور بھی فلمیں بنائیں گے

مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی جن کی خوبصورت فلم "دستک" حال ہی میں ریلیز ہو کر نقادوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ دستک کی تکمیل کے صبر آزما مراحل سے گزرنے کے باوجود اچھی فلمیں بنانے کے اپنے ارادے سے ہٹے نہیں ہیں۔

پتہ چلا ہے کہ بیدی اب اپنے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" کو اپنی آئندہ فلم میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انھوں نے پھر ایک بار سنجیو کمار اور ریحانہ سلطانہ کو لیا ہے۔ یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کئی سال پہلے بھی ایک چادر میلی سی کو فلم کے پردے پر پیش کرنے کا بیڑا آنجہانی گیتا بالی نے اٹھایا تھا لیکن یہ فلم کچھ بننے کے بعد گیتا بالی کا انتقال ہو گیا تھا

اے۔ آر صدیقی

نگاہ

جانب دار تبصرہ

میرا گاؤں ۔ میرا دیش

اس فلم کے نام سے پتہ لگتا ہے جیسے اس فلم کی بنیاد حب الوطنی کے موضوع پر رکھی گئی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

یہ فلم دراصل ڈاکوؤں کے اسی پرانے موضوع پر بنائی گئی ہے جو کئی ہندوستانی فلموں کی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔ جگہ جگہ ڈاکوؤں کے ایک گاؤں پر حملے بتائے گئے ہیں اور انہیں بھولے بھالے دیہاتیوں کو لوٹتے اور قتل کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس گاؤں میں ایک اجنبی داخل ہوتا ہے جسے گاؤں والوں کی بزدلی پر غصہ آتا ہے اور وہ اس بات کا تہیہ کر لیتا ہے کہ وہ گاؤں والوں کو اس قابل کر دے گا کہ وہ ان ڈاکوؤں کا جم کر مقابلہ کریں اور ہمیشہ کے لئے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ فلم کے اختتام تک واقعی گاؤں والے اس اجنبی (دھرمیندر) کی بدولت جس کا ماضی خود بدنام رہ چکا ہے ڈاکوؤں سے نجات پا لیتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلم مشہور انگریزی فلم "The magnificent Seven" اور اس جیسی دوسری فلموں سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہے پھر بھی ہندوستانیت یقیناً اس فلم میں جھلکتی ہے۔ ہدایت کار راج کھوسلہ نے آرٹ اور ٹیکنیک پر توجہ دی ہے اور فلم کو بہت تیز رفتار رکھ کر دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رکھی ہے پھر بھی مار دھاڑ اور تشدد کی زیادتی سے فلم میں احتراز کیا جا سکتا تھا۔

فلم کی فوٹوگرافی بڑی متحرک اور جاندار ہے اور کئی شاٹ بہت اچھے کمپوز کئے گئے ہیں اداکاروں میں دھرمیندر نے اداکاری سے زیادہ مار دھاڑ پر توجہ دی ہے۔ آشا پارکھ قطعی متاثر نہیں کرتی۔ لکشمی چھایا پر ہدایت کار کی غیر ضروری مہربانی لگتی ہے اس لئے اسے زیادہ سے زیادہ کیمرے کے سامنے آنے کا موقع ملا ہے اور اس نے ان موقعوں پر کافی فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ ونود کھنہ میک اپ کے سہارے ایک ڈاکو تو لگتا ہے لیکن چہرے کے اتار چڑھاؤ اور مکالموں کی ادائیگی اس کے بس کی بات نہیں جنیت اپنے مختصر رول میں چند سین کے سوا کامیاب ہے مختصراً اوسط فلم ہے۔

پروانہ

ہدایت کار جیوتی سروپ مشہور ہدایت کار مہیش کول کے مددگار کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں اور خود بھی فلموں کی ہدایت کاری کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں جیسا کہ ان کی فلموں "میاں بیوی راضی" اور "پڑوسن" سے واضح ہوتا ہے انھیں کامیڈی کو پیش کرنے کا انھیں بڑا اچھا گر آتا ہے

زیر نظر فلم "پروانہ" کوئی کامیڈی نہیں ہے بلکہ ایک سیدھی سادی رومانی کہانی ہے جسے انٹرول تک ہدایت کار نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے لیکن فلم کے دوسرے حصے میں انہوں نے خواہ مخواہ جرم کو بھی فلم میں گھسیٹنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پھر بھی مجموعی اعتبار سے فلم دلچسپ کہی جا سکتی ہے۔

فلم کی کہانی میں کئی خامیاں ہیں جنھیں اچھی ہدایت کاری بھی چھپانے میں ناکام رہی ہے ناقص کردار نگاری کی ایک مثال امیتابھ بچن کا کردار ہے یہ کردار انٹرول تک بڑا اچھا تاثر تماشائیوں کے ذہن پر چھوڑتا ہے لیکن بعد میں اس سے جو حرکات کرائی گئی ہیں ان سے یہ کردار ہی مضحکہ خیز ہو گیا ہے۔

اداکاری سب سے اچھی امیتابھ بچن کی ہے گو وہ ہیرو نہیں ہے اس کی جذبات نگاری بہت کامیاب ہے نوین نشچل ٹھیک ہے۔ یوگیتا بالی اداکاری سے زیادہ سیکس اپیل پر زور دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ویسے بھی اسے مکالموں کی ادائیگی پر پوری قدرت نہیں۔ للیتا پوار اسیت سین، مدن بھٹا چاریہ بس ٹھیک ہیں۔ اوم پرکاش اور شتروگھن سنہا اپنے مختصر مہمان رول میں خوب ہیں۔

رام چندرا کی فوٹوگرافی اچھی ہے اور آغا جانی کاشمیری کے مکالمے بہت موزوں اور برجستہ ہیں۔ کیفی اعظمی نے بڑے پیارے گیت لکھے ہیں اور مدن موہن نے ان کی اچھی دھنیں بنائی ہیں گو یہ دھنیں آج کل کے شور و شر میں شاید ہی مقبول ہو سکیں۔ مدن موہن قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے کلاسیکل مغنیہ پروین سلطانہ کو اس فلم میں گانے کا موقع دیا ہے۔

تلاشِ گمشدہ

ندا فاضلی تم کہاں ہو؟ تمہیں مختلف پتوں پر کئی خطوط لکھے گئے۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا! اب ضد چھوڑو اور جلد از جلد اپنے پتے سے مطلع کرو۔ پیکر کے قارئین تمہاری نظموں کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

فلم نگر کی سماجی پیش کش

(ایسٹ مین کلر)

تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے

فلم ساز و ہدایت کار: سوہن لال کنور   موسیقی: شنکر جے کشن

کہانی: سچن بھومک • عکاسی: کے ایچ کپاڈیہ • گیت: ورما ملک

آرٹ: کے بابو بھائی • منظر نامہ: رام کیلکر • مکالمے: وید راہی

تدوین: نند کمار

منوج کمار، پران، پریم چوپڑہ، پریم ناتھ، ناظمہ

اور دوسرے

ایک مکمل ماہنامہ | دوسرا سال ● دسواں شمارہ

پیکر

اکتوبر ۱۹۷۱ء

مدیر:
اعظم راہی
سرورق:
محمد اقبال
عنوانات:
غوث محمد
کتابت:
جمیل الرحمان
قیمت سالانہ:
بارہ روپے
فی شمارہ:
ایک روپیہ

صدر دفتر:
۲۱۴-۶-۳ حمایت نگر۔ حیدرآباد۔ ۲۹
دیگر دفاتر:
● ۳۱۸ تیسرا مالا۔ اردن چیمبر تار دیو بمبئی۔ ۳۴
● ۶۵۔ بی۔ دوسرا بلاک راجہ جی نگر بنگلور ۱۰

پیکر میں شائع ہونے والے افسانوں، خاکوں وغیرہ میں نام، مقام، کردار اور واقعات فرضی ہیں اور ان سے کسی بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے

پیکر میں شائع ہونے والی تمام تخلیقات غیر مطبوعہ ہیں ان کے نقل کی صورت میں حوالہ دینا ضروری ہے

اعظم راہی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے پرنٹو پریس کے لیے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر ۲۱۴-۶-۳ حمایت نگر۔ حیدرآباد۔ ۲۹ سے شائع کیا

پیکر

نومبر ۱۹۷۱ء کا شمارہ خاص نمبر ہوگا

متوقع:

افسانے: کرشن چندر، اقبال متین، جگدیش بمل، آمنہ ابوالحسن، سلمیٰ صدیقی، م۔ ناگ، ساجدہ اعظم، شفق، عشرت ظہیر، خالد سعید، ہمیں نظمی، جوگندر پال، ٹھاکر پونچھی، نعیم زبیری، بانو سرتاج، صادق اور رام لال

مضامین: مجتبیٰ حسین، اعظم راہی، اسلم عمادی، برہان حسین، رشید الدین، رفعت صدیقی، م۔ع۔ باسط اور متین سعید

نظمیں و غزلیں: مظہر امام، راشد آذر، مظفر حنفی، حکیم یوسف حسین خاں، تاج مہجور، رؤف خلش، حسن فرخ، ندا فاضلی، لغیاث متین، پرکاش فکری، محمود عشقی، مسعود عابد، عصمت جاوید، علی الدین نوید، عبدالرحیم نشتر، کاوش بدری، واحد پریمی، عزیز اندوری، لطف الرحمان، سلیم شہزاد، سعید قدرت، عزیز الرحمان، ساجد اثر، قطب سرشار، علی ظہیر، باذل عباسی، بدنام نظر، جاوید مقصود، رفیق الزماں، صفدر، فرحت کیفی، موسیٰ مجروح، ایس ام طارق، ظفر صہبائی، سلطان سبحانی، فیروز،

اس شمارے میں

اپریل ۱۹۷۱ء سے اس شمارے تک 'پیکر' کے تیسرے دور
کے سات شمارے آپ تک پہنچ چکے ہیں۔ ان
سات مہینوں میں ہم نے نئے فن کاروں اور نئے رجحان کے لیے جو کچھ بھی کیا ——
وہ آپ کے سامنے ہے
'پیکر' ہی ملک کا وہ پہلا جریدہ ہے جس نے شخصیتوں کے سحر کو
کو توڑا اور نئے قلم کاروں کو ایک نئی اُمید
اور ایک نیا جذبہ دیا۔ اس کے پچھلے شماروں کے صفحات
پر پھیلی ہوئی بے شمار تخلیقات
اس بات کی گواہ ہیں کہ اس رسالے نے نئے ذہنوں کی
ہمت افزائی میں ایک اہم رول ادا
کیا اور انھیں اپنی سمت مقرر کرنے میں مدد دی۔
'پیکر' نام نہاد عالموں' دانشوروں
اور استادوں کا رسالہ نہیں ہے اور نہ یہ کسی بلاک کا ترجمان!
جب تک ملک میں
ذہین' باصلاحیت اور باشعور نوجوان جنم لیتے رہیں گے
'پیکر' ان کی ترجمانی کرتا رہے گا۔

●●

حکیم یوسف حسین خاں۔ حیدرآباد۔ گلیشور اور جنتو کی بات چیت پڑھ کر میرے ذہن میں جو عنوان آیا تھا وہ "ابن الوقت" تھا۔ لکھا اس لئے نہیں کہ ڈر لگا کہیں مجھے متعصب نہ سمجھ لیا جائے۔ ستمبر کے پیکر میں رضوان صاحب نے گلیشور کا جو خط شائع کیا ہے اس کے بعد کسی تبصرہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ بات چیت کے بین السطور اور خط کے علانیہ میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک نقاب زدہ ہے دوسرا کھلم کھلا۔ یہ ہم اردو والوں کے لئے ایک نصیحت ہے کہ ہم ہوشیار رہیں۔ اس سے پہلے بھی ایسے بہت آئے اور آئندہ بھی اردو کے ایسے ہی خواہوں سے سابقہ پڑے گا۔ ظاہر میں گڑ جتنا میٹھا دکھائی دے گا، ذائقہ اسی قدر کڑوا ثابت ہوگا۔ لہٰذا بھلائی اسی میں ہے کہ رسم الخط کے معاملہ میں اٹل رہا جائے۔ ہم جس قدر سخت جان رہیں گے اسی قدر زیادہ دنوں تک جئیں گے۔

محمود عشق۔ ناندیڑ: اس ماہ کے پیکر میں "خط و خال" کے صفحات پر پٹنہ کے رضوان احمد کی معرفت سارہ بکا والے گلیشور جی کا پتر پڑھنے کو ملا۔ اردو کے لئے ناگری رسم الخط اختیار کرنے کا [illegible] ہوئے گلیشور جی نے ان خیالات کا [illegible] اردو کے ادیبوں میں آل احمد سرور [illegible] احمد عباس اور رضیہ سجاد ظہیر کے ناموں کا اضافہ کرتے ہوئے اپنے مقدمہ کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے ایک آل احمد سرور سے قطع نظر دوسرے جو نام ہیں وہ اردو اور ہندی کی سرحد پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ادیب ہیں جو خوش حال اردو زبان کے ان سرمایہ داروں اور ادیبوں کا ہندی کے ساتھ سمبندھ اس وجہ سے بھی زیادہ گہرا ہے کہ پیٹ بڑا بدکار ہوتا ہے۔ پیٹ کا سوال ہے لہٰذا والی بات پر ہم ان سے درگزر کرتے ہوئے جب آل احمد سرور جیسے اردو کے ناقدوں کو دیکھتے ہیں تو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اگر آل احمد سرور اردو کیلئے ناگری رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں تو یہ بات ضمیر فروشی اور اردو کے ساتھ غداری کہلائے گی کیونکہ موصوف کا چولہا ہندی سے نہیں اردو سے سلگتا ہے۔ اگر موصوف اردو کی ستر پوشی کے لئے ناگری رسم الخط کی لنگوٹی لگانے کی بات کرتے ہیں تو ہم انہیں راجہ پورس کا ہاتھی کہنے کے سوائے اور کیا کہہ سکتے ہیں جو پلٹ کر اپنی ہی فوج کو روندتے اور کچلتے ہے۔ گلیشور جی نے رسم الخط کا تذکرہ کرتے ہوئے ملک کے بٹوارے میں اس کو بھی تقسیم کا سبب قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ موصوف کی سیاسی اور تاریخی بصیرت خطرناک حد تک مشتبہ اور مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ ایک معمولی ذہن کا آدمی بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ تقسیم ہند کے عوامل کیا تھے۔ اردو زبان اگر ناگری رسم الخط اپنائے تو روز روز کھڑے ہونے والے مسائل ختم ہو جائیں

[illegible] ہوں گے جو پہلے ہیں
[illegible] سے ہوں گے۔ اردو
والوں کو رسم الخط بدلنے کا مشورہ دینے والوں سے کہوں گا کہ یہاں
خوبصورت ہیں جیسے کہ انہیں [illegible] ہو چکا ہے
[illegible] جو بھی ہو جانا چاہتے ہیں۔ اردو کا رسم الخط بدل
جانے کے بعد اس کا ادب ، مزاح اور تحریر وغیرہ سب
کچھ رسم کے ساتھ ختم ہو جائیگا۔ زبانوں کا رسم الخط کوئی
لباس نہیں ہے جس کا جب مرضی ہو جب جی چاہا تبدیل
کر دیا۔ رسم الخط زبان کیلئے جسم پر منڈھی ہوئی کھال کی
حیثیت رکھتا ہے اور جو لوگ رسم الخط بدلنے کا مشورہ
دیتے ہیں ایک طرح سے وہ کھال بدل دینے کی بات کرتے
ہیں۔ ویسے گلیشور جی کی نیک نیتی پر کوئی شک و شبہ
نہیں ہے کیونکہ وہ بات تو ان کی سمجھ میں بھی آ سکتی ہے کہ
انسان کے جسم کی کھال اتار دی جائے تو ان کا کیا حشر ہوگا۔ یہ
وہ اور کچھ تو فکر آمیز گے لیکن گلیشور کہاں نہیں دیں گے
نمک کی کان میں جو چیز بھی جائیگی نمک بن جائیگی۔ بالکل
اسی طرح اردو کا رسم الخط تبدیل ہونے پر اس سے پہچان
زبان کا بھی وہی حال ہو جائے گا۔

علا فاضلی۔ بمبئی : اگر میری خاموشی سے ناراض نہ
ہو گئے ہوں تو میری نظم شائع کر دو۔

ستیش بترا۔ ہریانہ : "پیکر" اپنی جگہ پر انفرادی
حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ادب ، معلوماتی مضامین اور تفریحی
ادب کا ایک خوبصورت سنگم ہے۔ ماہ اگست کے شمارے
میں جے۔ بی۔ ایس۔ ہالڈین کے مضمون کے ترجمہ کو دیکھ
کر خوشی ہوئی کہ چلو ایک آدھ پرچہ تو ملا جس کا دامن اتنا
کشادہ ہے کہ وہ ادبی فنون کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی

کو بھی کچھ اہمیت دیتا ہے! ایک کام یہ ہو سکتا ہے کہ ان موضوعات
کے ماہرین جو وہ مسائل [illegible] کسی بھی طرح سے مکمل کیا
جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے موضوعات کیلئے بہت ہی ضروری
ہے کہ ایسے مضامین عام فہم اور دلچسپ ہوں تاکہ قارئین
ان سے مکمل طور پر مستفید ہو سکیں۔

ظہیر نیازی۔ مظفر گڑھ : رضوان احمد نے گلیشور
کے سلسلے میں نظریے گنوائے۔ اس موضوع پر خلوص سے
لکھنے کی گنجائش ہے۔ لیکن رضوان بھائی کی گلیشور
سے یا مجھ سے کونسی ایسی عداوت ہے کہ ایک عجیب
بداخلاقی سامنے آئی ـــــــ ایک لفافہ (جس پر ٹکٹ
ایک روپیہ ۴۰ پیسے) اگست ۱۹۷۱ء کی دوسری یا تیسری
کو مجھے ملا۔ کھولا تو اس میں وہ ساری تخلیقات نظر آئیں
جو رضوان احمد صاحب مدیر "تزئین" نے منظور فرمائی تھیں
منظور شدہ کو نہ جانے کس خفا میں انہوں نے مسترد کی
مہر لگا کر واپس کر دیا...... لیکن عجیب بات یہ تھی کہ لفافے
پر بھیجنے والے کا پتہ نہ تھا، پٹنہ کی مہر تو لگی تھی مگر سینڈر
کی جگہ گلیشور کا جعلی دستخط بنا ہوا تھا۔ یہ بات میری سمجھ
میں نہیں آئی۔ رضوان بھائی شاید سمجھا دیں!

صادق۔ اورنگ آباد : "پیکر" [illegible] خصوصی تو
چاہتا ہے۔ موجودہ یکسانیت سے "پیکر" کو بچانا نہایت ضروری
ہے۔ امید کہ اس بات پر غور کریں گے۔

مامون ایمن۔ نیویارک : یہاں ایک ادب پسند
منچلے ہیں ملک صاحب۔ ان حضرت نے ہند و پاک کے
چیدہ چیدہ اردو جریدوں کی شمالی و جنوبی امریکہ کیلئے ایجنسی
لے رکھی ہیں۔ ان جریدوں میں "پیکر" بھی شامل ہے۔ آپ
اردو کی خدمت وہاں کر رہے ہیں اور ہم اردو کا دامن
تھامے ہوئے آ[illegible]

یہاں وسیع کررہے ہیں۔ نہ مجھے شعرگوئی کا کوئی دعویٰ
ہے اور نہ نثر نگاری کا زعم۔ یہاں پردیس میں اردو زبان
کے ذریعہ رزق حلال فراہم کرتا ہوں۔ میں یہاں نیویارک
میں "وائس آف امریکہ" کا اردو نامہ نگار ہوں۔ اقوام
متحدہ کی ہفتہ وار ڈائری لکھتا ہوں۔ اگر کبھی موقع ملے تو
ہفتہ اور اتوار کی کسی شام کو ریڈیو سے کان لگا کر بیٹھ
جائیے میری آواز بھی سن سکیں گے

ایف۔ اے۔ بادشاہ۔ موتی ہاری: میں آ
ایف۔ اے۔ بادشاہ کے بجائے "فاروق راہب" کے
نام سے لکھوں گا۔ لہٰذا میری کہانی آپ شائع کرنے کا
ارادہ رکھتے ہوں تو "فاروق راہب" کے نام سے شائع کریں

م۔ ع۔ باسط۔ جالنہ: ایم۔ اے۔ نصر کا مکتوب
نظر سے گزرا جس میں موصوف نے اس بات کو اردو
ادب کی بدقسمتی سے تعبیر کیا ہے کہ ادبی رسالوں کو اپنی بقا
حاصل کرنے کیلئے غیر ادبی چیزیں بھی برداشت کرنی پڑتی
ہیں۔ غالباً ان کا اشارہ ایسے مضامین کی طرف ہے جو
ادب سے ہٹ کر دوسرے موضوعات جیسے سائنس
سیاست، تاریخ وغیرہ پر لکھے جاتے ہیں۔ اگر ان کی مراد
ایسے مضامین سے ہے تو میں ان کے خیال سے قطعی
متفق نہیں ہوں۔ ادبی رسائل ایسے مضامین کو اپنے
صفحات میں جگہ دے کر وقت کی ایک اہم ضرورت
کو پورا کررہے ہیں۔ اردو کو صرف ادب و شاعری تک
محدود رکھنا اردو کا گلا گھونٹنا ہے۔

بانو سرتاج۔ چاندہ: پیکر ماہ بماہ دلچسپ ہوتا
جارہا ہے۔ مضامین، نثر و نظم کا انتخاب خوب ہوتا ہے
لیکن علمی صحافت کا حصہ کچھ کمزور ہے۔ حیدرآباد کے

[illegible]
مثنوی [illegible]
کا جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کاش [illegible]
ان کے مثنوی [illegible]
بری نہیں۔ رؤف خیر [illegible] کی غزلیں [illegible]
ہیں۔ موتی ہاری کے بادشاہ کی غزل کے مطلع کے [illegible]
غزل کا آخری شعر ہوتا تو بہتر ہوتا۔ کیونکہ [illegible]
غزل کا آخری شعر ہی قوافی کے اعتبار سے مطلع [illegible]
تعریف میں آئیگا۔ خواجہ عبدالغفور کا انداز نیا ہے۔
... [illegible]
علی مرزا کے انشائیہ کی تعریف نہ کرنا [illegible]

منظر کاظمی۔ جمشید پور: ستمبر کا پیکر موصول ہوا۔
اس شمارے کی سب سے خوبصورت اور دلچسپ چیز
"تلاش گمشدہ" کا اشتہار ہے۔ امید ہے [illegible] کا پتہ
لگ چکا ہوگا۔

محمد سعید باوزیر۔ عدن: میری نظمیں شائع
ہوگئیں۔ حیرت ہے! ویسے مجھے بعد میں احساس ہوا کہ
میں سب سے اوپر "[illegible]" لکھنا بھول گیا تھا۔ کیا
آپ پیکر میں صرف [illegible] نظمیں ہی شائع کرتے ہیں
یہاں عدن ٹیلی ویژن میں [illegible] کی حیثیت سے
کام کررہا ہوں۔

ولی تنویر۔ حیدرآباد: [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تخلیقِ غزل

عجب ہے کارگہِ ذہن کا یہ عالم بھی
نہ حسنِ شام ہے باقی نہ اعتبارِ سحر
نہ کوئی دشت ہی نزدیک ہے نہ اپنا گھر
ہر ایک چہرے کے پیچھے ہزار ہا چہرے
نہ جل رہی ہے نہ بجھتی ہے شمعِ راہ گزر
یہ کیا مقامِ جنوں ہے کہ جس جگہ آ کر
نہ دوسروں پہ نظر ہے نہ اپنے دل کی خبر
تسلسلِ غمِ جاناں لرز کے ٹوٹ گیا
حیات پر غمِ دوراں کا بھی اثر نہ رہا
ستم یہ ہے کہ غمِ دل بھی معتبر نہ رہا
نہ ابتدائے حرکت کی نہ انتہائے جمود
کہیں تصورِ فردا نہ کوئی ہست نہ بود
غمِ زمان و مکاں وجہِ سرگرانی ہے
افق سے تا بہ افق ایک بے کرانی ہے

جو آرزو ہے غنودہ تو منجمد ہے دماغ
نظر کے پاؤں میں پرچھائیوں کی زنجیریں
پڑھیں تو کیسے پڑھیں لوحِ جلی کی تحریریں
کہ حرف حرف ہے واضح بھی اور مبہم بھی
عجب ہے کارگہِ ذہن کا یہ عالم بھی

کبھی یہ چاہیں کہ بے نام بھیڑ میں کھو جائیں
شکستگی کو گلے سے لگائیں اور سو جائیں
کبھی یہ چاہیں کہ ہر طرح سرخ رو ہو جائیں
صلیب اٹھائے ہوئے شہرِ زندگی کو جائیں
جو کچھ نہیں ہے تو رستے میں نور ہی بو جائیں
بڑھائیں بات کہ آخر کوئی تو بات بنے
جلائیں خون کہ افسانۂ حیات بنے
عجب ہے کارگہِ ذہن کا یہ عالم بھی
کہ اپنی ذات میں جنت بھی ہے جہنم بھی

مشاہدے جو کئی پیکروں میں ڈھلتے ہیں
وہ تجربے جو نئی صورتیں بدلتے ہیں!
وہ لمحے چھو کے جو احساس کو گزرتے ہیں
وہ اپنے آپ ہوئے جا رہے ہیں تاج محل
خیال ڈھونڈھے ہے لفظ و بیاں کا پیراہن
کہیں سنور نہ رہی ہو کوئی عروسِ سخن
کہیں نکھر نہ رہا ہو کوئی نگارِ غزل
کہ شعلہ بھی افقِ فکر پہ ہے شبنم بھی
عجب ہے کارگہِ ذہن کا یہ عالم بھی

نازش پرتاب گڈھی
بیگم واڑہ - پرتاپ گڈھ

چینی پرچم پر مسرت، قوموں کے بھائی چارے، امن اور دوستی کے نعرے [illegible]

سوشلسٹ سماج کے کردار اور مقاصد نیز اس کی تعمیر کے طور طریقوں کے متعلق پیکنگ کے نظریہ سازوں کے خیالات، کمیونسٹ پارٹیوں کی نظر میں، کمیونزم کے سائنٹفک تصورات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

سبھی جانتے ہیں کہ اپنے نام نہاد تہذیبی انقلاب کے دوران ماؤ گروہ مستعدی سے یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ چینی انقلاب کے تجربہ کو اس روپ میں پیش کرے

کرتے ہیں۔ ان تصورات کو [illegible] کارنامہ ہے کہ کرشمہ [illegible] اور دو [illegible] کرتے ہیں۔ چین میں بھی کمیونسٹوں کا اس [illegible] مشکل تھا۔ عالمی کمیونسٹ تحریک کا بات [illegible] نے ساری انسانیت کے ارتقا کا راستہ [illegible] میں ماؤ کے دعووں کو بالکل [illegible] کی پچاس برس کی تاریخ کے سوشلسٹ [illegible] ساری دنیا مانتی ہے۔ ماؤ کے [illegible]

ایک مکمل جائزہ
چین میں

گیا وہ کوئی عالمگیر تجربہ ہے۔ یہ گروہ علانیہ عظیم طاقت کے شاونسٹی نقطۂ نظر سے سوشلسٹ اقوام کے تاریخی کارناموں پر کالک پوتنے میں لگا ہوا ہے۔ ماؤ اور ان کے ساتھی دوسرے سوشلسٹ ملکوں میں سوشلسٹ تعمیر کے تجربوں کو جھٹلاتے ہیں اور چین اور دوسرے ملکوں کے عوام ایک ایسے سماج کے جو ان کے خیال میں سوشلسٹ ہے اور اس کی تعمیر کے طریقوں کے متعلق اپنے عجیب و غریب تصورات تھوپنے کی کوشش

کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔

ماؤ نے سماجی ڈھانچے کے متعلق اپنا آدرش پہلے پہل [illegible] ۱۹۵۸ء میں پیش کیا جبکہ چین میں سوشلسٹ تعمیر کی رفتار کو تیز کرنے اور وقت مقررہ سے پہلے کمیونزم کی منزل میں داخل ہونے کی کوشش کی گئی۔ ان کے خیال میں اتنا کافی تھا کہ شہر اور دیہات میں عوامی کمیونوں کا ایک جال سا پھیلا دیا جائے جو صنعت، زراعت، تجارت

چین کا جھکاؤ ایسے ملک کی طرف ہے جس کا ماؤ کے

پیکر حیدرآباد ۱۰

بعد آگے بڑھنا بہت آسان ہوگا۔ ایسا ہونا لازمی ہے کیونکہ وہاں پرولتاریہ کی تنظیم اور اتحاد کہیں زیادہ ہے"

معیشت کو دھکا دے کر آگے بڑھانے اور وقت سے پہلے کمیونزم کی منزل تک پہنچنے کی کوششوں میں جب بیّن طور پر ناکام ہوگئی تو ماؤ دل شکستہ ہوگئے اور انھوں نے کہا کہ چین میں سوشلزم کی تعمیر میں کم از کم ایک سو برس کی مدت لگے گی اور باقی رہی کمیونزم، تو جب تک سامراج موجود ہے اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔ لیکن ماؤ "بڑی چھلانگ" اور عوامی کمیون کی عام اور بیّن ناکامی سے کوئی نتیجہ نکالنے سے قاصر رہے۔ ۱۹۶۵ء کے اوائل میں جب ملک ایک لمبے عرصے کے اقتصادی بحران سے نکلنے لگا تھا، انھوں نے پھر ایک منصوبہ تیزی سے آگے بڑھنے کا پیش کر دیا۔ چنانچہ اس طرح ماؤ اپنے "سوشلزم" کے دلوالیہ، رجعتی شیخ چلی کے سے تصور پر لوٹ آئے۔

درحقیقت عوام کی زندگی کو "پرمسرّت" بنانے کے متعلق ماؤ جس تصور کو مان کر چلتے ہیں۔ وہ نہایت فرسودہ ہے کیونکہ وہ انھیں نیم افلاس کی حالت میں رکھ کر، مادّی معیارِ زندگی کو نہایت پست سطح پر رکھ کر، انھیں تہذیبی قدروں سے محروم رکھ کر ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ ان سب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ "عالمگیر انقلاب کے حق میں" ایسا کرنا پیدا کرنے کے بجائے ضروری ہے کہ غریب کسانوں کا معیارِ زندگی کو بلند کر کے صنعتی مزدوروں کے معیار پر پہنچایا جائے اور جگہ شہری زندگی اور دیہاتی زندگی میں برابری پیدا کی جائے۔

چینی اخباروں نے ماؤ کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ "اس وقت کا تصور بھی ہولناک ہے جب تمام لوگ دولتمند ہو کر زندگی بسر کرنے لگیں گے"۔ کمیونسٹ مزدوروں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ آپ ہی سرمایہ دار طبقہ کا جنم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کو روکنے کے لئے وہ انھیں مضامین اور تقریروں سے تعلیم دینا اور ان کی موجودہ مادی اور تہذیبی سطح کو جو کافی پست ہے، برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

سوشلزم کے بارے میں ماؤ کے خیالات کی رجعت پرستی اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ انھیں علم سے حیرت انگیز طور پر نفرت ہے۔ خصوصاً اس علم سے جو کتابوں سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ سائنس کو، تہذیب کو اور دانشوروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ سوشلسٹ سماج کو یہ خراب کرنے والے لوگ ہیں۔ سائنس اور کلچر کی طرف اس طرح کا رویہ مارکسی لیننی تعلیم کے صریحاً منافی ہے جبکہ کمیونسٹ اقتدار کی ابتدا میں ہی لینن نے کہا تھا کہ "ہم جانتے ہیں کہ سوشلزم کی تعمیر بڑے پیمانے کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے عناصر سے ہی ہو سکتی ہے اور ان عناصر میں ایک دانشور بھی ہیں"۔ انھوں نے مزید کہا کہ "ہم

چین کو سوشلزم کی تعمیر میں کم از کم سو برس کی مدت لگے گی

پیکر، حیدرآباد ۱۴

کی پالیسی چین کے ناکام مقاصد پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے

سرمایہ دارانہ تہذیب کی ایک ایسی میراث ہے جس کو دور پھینکا تو کجا انہیں اٹھائیں تو ہم سوشلزم کی تعمیر نہیں کر سکتے ہم جس سوشلزم کا تصور کر سکتے ہیں وہ صرف وہی ہے جس کی بنیاد ان تمام سبقوں پر ہوگی جو ہم نے بڑے پیمانے کی سرمایہ دارانہ تہذیب سے سیکھے ہیں۔ وہ سوشلزم کیا ہوگا جس میں ڈاک اور تار کی سہولتیں نہیں ہوں اور مشینیں نہیں ہوں۔"

ماؤ نے سماج کے سماجی اقتصادی ڈھانچہ کا جو نمونہ تیار کیا ہے اور جس نمونہ میں وہ زندگی کی روح پھونکنا چاہتے ہیں، وہ غیر سائنٹفک ہے۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کی بنیاد اخلاقی عنصر پر ہے جو محض ذہن کی پیداوار ہے، مادی حالات پر نہیں ہے۔ ماؤ کی اسکیم کے مطابق تمام مسائل کو جن میں معاشیات کے مسائل بھی شامل ہیں، فوراً حل کرنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ چینی قوم ماؤ کے خیالات پر عبور حاصل کرے۔ لیکن ان "خیالات" پر وہ مارکسی تعریف صادق آتی ہے جو مارکس نے خیالات کے متعلق کہی تھی یعنی "یہ ایک ایسا معجون مرکب ہے جس میں اجزا کی پوری طرح آمیزش نہیں ہونے پائی ہے" ماؤ کا خیال ہے کہ جس سماج کو وہ سوشلسٹ کہتے ہیں اس تک پہنچنے کا راستہ چین کی صنعتی ترقی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے کارناموں کا وسیع پیمانے پر چین میں استعمال نہیں اور نہ عالمی تہذیب کے تمام مراکز سے فیضیاب ہونا ہے۔ بلکہ اس کا راستہ نظریٔ خود کفیلی معیشت کی طرف جو قدیم تکنیک پر مبنی ہو، واپس جانے کا راستہ ہے۔ لیکن درحقیقت ہر اس قوم کے سامنے جس نے سوشلزم کا راستہ اختیار کیا ہے، پہلا اور اصلی کام یہ ہے کہ ملک کی پیداواری قوتوں کو ہر میدان میں اور متناسب ترقی اور اس کی بنیاد پر عوام اور اس کے تہذیبی معیاروں کو مسلسل بلند کرے۔ ماؤ نے جو رجعت پسند راستہ اپنایا ہے اس میں یہ کام نظرانداز کیا جا رہا ہے اس راستہ کی خصوصیت ہے سب سے پسماندہ طاقتوں کو برقرار رکھنے کی کوشش۔ ماؤ اور ان کے ساتھی محنت کش عوام کے مادی اور تہذیبی معیاروں کو بلند کرنے کے کام کی مذمت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک سرمایہ دارانہ انقلاب دشمن تصور ہے۔ مادی ترغیب کے یہ نئی عمل کو وہ "پرولتاری انقلاب کو پیٹھ میں چھرا بھونکنا" کہتے ہیں۔

ماؤ کے لئے یہ پالیسی اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقصد پر پردہ ڈال سکیں۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ وسائل کا بڑا سے بڑا حصہ فوجی تکنیکی استعداد (خصوصاً میزائل کی قوت) کو بڑھانے اور ہم باز خارجہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانے میں لگایا جا سکے۔

ماؤ گروہ نے جو نعرے بلند کئے ہیں "کم اجرتوں کے معقول نظام پر سختی سے عمل کرو" "پیداوار کے تمام سادے طریقے کرو اور زندگی کا معیار نیچا" وہ لینن ازم کی روح اور تعلیم

پیکر حیدرآباد ۱۳

کے اصولوں کے منافی ہیں۔

لینن نے بار بار زور دے کر کہا تھا کہ "جو طبقوں کے سیاسی احساسات ان کی اقتصادی پوزیشن سے متعین ہوتے ہیں محنت کش عوام میں پروپگنڈا کرنے کا کوئی حاصل نہیں اگر اس پروپگنڈے کے ساتھ ان کے اقتصادی مطالبات کو پورا نہیں کیا جاوے۔" عوام الناس تبھی تحریک میں کھنچ آتے ہیں، مستعدی سے اس میں حصہ لیتے ہیں، اس کی قدر کرتے اس کی خاطر جرأت، دلیری اور ایثار سے کام لیتے، قربانی دیتے اور ثابت قدمی اور ایثار کا مظاہرہ کرتے ہیں جب اس تحریک سے ان لوگوں کے اقتصادی حالات بہتر ہوں جو کام کرتے ہیں۔" لینن کے قول کے مطابق کسی پروگرام سے اقتصادی مطالبات کو الگ کرنے کا مطلب ہے۔" اقتصادی مفاد کو نظر انداز کرنا، مظلوم، ڈرائے دھمکائے، ان پڑھ عوام کو دھکیل کر ایک بڑی اور انتہائی بے غرض جدوجہد میں شامل کرنا۔"

یہ ظاہر ہے کہ محنت کش عوام کو آنے والے دنوں میں افلاس کے بے مسرت، خشک امکانات دکھا کر اور قدیمانہ توکل اور ترک طلب کو قومی ثواب کا درجہ دے کر اور وہ بھی انقلاب کا نام لے کر، ماؤ اور ان کے گروہ نے ایک بات ثابت کر دی ہے یہ لوگ جیسا کہ گذشتہ چند برسوں کے واقعات سے بھی ظاہر ہے، پارٹی اور محنت کش عوام کو تخلیقی اور تعمیری کام کے لئے منظم کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ یہ عوام آج بھی سوشلزم کے آدرش

کو لفظ بہ لفظ ادا کرتے ہیں مگر غریبوں کی [illegible] ہیں۔ چینی عوام "بڑی چھلانگ" کے سبب [illegible] نہیں ہیں۔

چین کے کمیونسٹ اور محنت کش عوام ۱۹۵۸ء میں [illegible] چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے کہ تین برس کی [illegible] مسرت کے دن آئیں گے ساتھ ہی اس سال [illegible] مہنگی چکانی پڑی۔ تعطل کا جس میں [illegible] رہے انھیں فاقہ کشی کا شکار ہونا پڑا۔ کارخانے [illegible] تک بیکار پڑے رہے۔ یہ تھی وہ قیمت جو [illegible] عوام کو ادا کرنی پڑی اس لئے کہ ماؤ کو [illegible] تمام غلطیوں سے مبرا مانتے تھے۔ ماؤ [illegible] جو بحران پیدا ہوا تو خارجہ پالیسی کی ناکامی کے بعد [illegible] ہو گیا۔ ان ناکامیوں نے چین کو سب سے الگ تھلگ کیا۔

ماؤ آج پھر جس دیوالیہ پالیسی کو چینی عوام پر تھوپ رہے ہیں، اس کی وجہ سے محنت کش عوام میں بے تعلقی اور بے عملی کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے اور کہیں کہیں تو آپ ہی آپ مزاحمت کا احساس بھی جنم لینے لگا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو ماؤ اور ان کے ساتھی محسوس نہیں کر پائے ہیں۔

ماؤ کو عوام پر اعتماد نہیں۔ وہ عوام سے خائف ہیں۔ انھیں اپنے نظریات کے معجزانہ اثر پر بھروسہ ہے، اس اتفاق پر کہ اقتصادی اور تہذیبی مسائل کو بھونڈے، قدیمانہ فوجی سے

"کم اجرتوں کے معقول نظام پر سختی سے عمل کرو!" ——— ماؤ

پیکر حیدرآباد ۶۷

ماؤ سائنس، تہذیب اور دانشوروں کو حقارت سے دیکھتے ہیں

کانگریس کے فیصلے پیروں تلے روند ڈالے گئے ہیں۔ جمہوریت اور امن قانون کی جگہ "فوجی اسپرٹ" نے لے لی ہے یعنی چین کے کارخانوں کے مزدوروں، دفتری کارکنوں اور کسانوں کو شہری لباس میں ایک "فوج" بن جانا ہے۔

فوج کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ فوج کو ایک خود کفیل تنظیم بنایا جا رہا ہے جو صرف ماؤزے تنگ کے تابع ہوگی اور جس پر پارٹی اور عوام کا کوئی کنٹرول نہیں ہوگا۔ چنانچہ فوج کو نظم و نسق اور پولیس کی ذمہ داریاں بھی سونپی گئی ہیں جو سوشلزم کے تحت اس کی ذمہ داری نہیں ہے اور اسے مزدوروں، کسانوں، کمیونسٹوں اور دانشوروں کی مخالفت کو کچلنے پر مامور کیا گیا ہے۔ اگر اس فوج نوکر شاہی ڈکٹیٹر شپ نے چین میں جڑ پکڑ لی تو اس کی وجہ سے ملک کے نظامِ حکومت میں بنیادی تبدیلیاں ہو جائیں گی۔

ماؤزے تنگ گروہ کی ٹرٹ یو نچیہ پالیسی عوام دشمن، سوشلسٹ دشمن پالیسی ہے۔ یہ پالیسی سوشلزم کے تصورات اور کاوش کو مسخ کر دیتی اور اس طرح چین کے سوشلسٹ نشوونما کی راہ میں زبردست رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔

ماؤزے تنگ گروہ کے تنزل کے اسباب خارجی اور داخلی دونوں طرح کے ہیں۔ خارجی اسباب میں عام اقتصادی پسماندگی، اچھی پوشیدہ نظریات کا مضبوط اثر، سرخ فیتہ یعنی دفتر تاناشاہی، عظیم طاقت شاونیت اور قوم پرستی شامل ہیں۔

داخلی اسباب میں یہ باتیں شامل ہیں: ماؤزے تنگ کی نااہلی، منظم، مشقت بھرا تخلیقی کام جس کا پلان برسوں میں بنایا گیا تھا، پورا نہیں کر پانا، پیچیدہ مسائل کو ایک چھلانگ میں حل کرنے کی خواہش اور اگر اس میں ناکامی ہو تو سامنے یکسر ہاتھ دھو لینا اور صدیوں پرانی پسماندگی کو دور کرنے کے کام کو ناقابلِ عمل قرار دینا۔ اور ان سب پر طرہ یہ خواہش ہے کہ اپنی نیک نامی پر کسی طرح حرف نہ آنے پائے اس سے صورتِ حال اور خراب ہوتی ہے۔ ماؤ اور ان کے پیرو اپنی ناکامیوں اور پسپائی کیلئے دوسروں کو موردِ الزام قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ملزم ڈھونڈتے ہیں بیرونی قوتوں میں، یا پارٹی اور سیاسی انتظامیہ میں اور ان کارکنوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ "قائدِ اعظم" کے خیالات کو سمجھ نہیں پائے۔

یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں کہ کمیونسٹوں کی رائے میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے حالات میں یہ تبدیلی محض حتمی پیدا شدہ اثرات کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ چینی کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں کے گروہ نے ماضی میں اپنے ملک کی کوئی خدمت نہیں کی۔ آج اس گروہ کے نشوونما نے جو رخ اختیار کیا ہے اس میں کوئی قطعی ناگزیریت نہیں اور نہ ہو سکتی تھی۔ چینی کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں کے زوال سے مارکسزم کا یہ نظریہ ہرگز غلط نہیں ثابت ہوتا کہ پس ماندہ قوموں کا اگر زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کے پرولتاری ہراول سے گہرا ربط ہو تو ان کی غیر سرمایہ دارانہ نشوونما ممکن ہے۔ لیکن بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک سے

حیدرآباد ۱۹۶

انھیں ہوا یہ کہ ماؤزے تنگ کا گروہ جان بوجھ کر قطعاً ہے اور پس ماندہ ملکوں کی قیادت کے متعلق اپنا نظریہ پیش کر رہا ہے جو سائنٹفک سوشلزم کے برعکس ہے

چین جیسے پسماندہ ملک میں جہاں جاگیری نظام کے اثرات باقی ہیں سوشلزم کی تعمیر عالمگیر مزدور طبقہ اور اس کے اصل نمائندہ یعنی سوشلسٹ دولت مشترکہ کی حمایت کے بغیر اور اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ریاستوں کے تخلیقی تجربہ سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں ہو سکتی ایک کم ترقی یافتہ ملک اگر سوشلسٹ ملکوں سے تعاون کرنے سے انکار کرے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس نے سماجی اور اقتصادی ترقی کی سمت قدم بڑھانا چھوڑ دیا اور سوشلسٹ آدرشوں تک پہنچنے کی کوشش ترک کر دی۔

تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماؤزے تنگ اور ان کے گروہ کو چین میں سوشلزم کے مستقبل کی فکر نہیں ہے۔ ماؤ گروہ صرف یہ کہ سوشلزم کے تصور کو مسخ کرتا ہے، بلکہ اپنی عظیم طاقت والے، قائدانہ مقاصد کیلئے جن کا سوشلزم سے کوئی تعلق نہیں سوشلسٹ خیالات کا نمایاں استعمال کرتا ہے۔ ماؤزے تنگ اور ان کے گروہ کے لوگ یقیناً یہ سمجھتے ہیں کہ کروڑوں چینی عوام کی نظر میں سوشلزم ان کی خوشحالی اور مسرت اور ان کے ملک کے قومی احیا کا راستہ ہے۔ ماؤزے تنگ سوشلزم کی طرف ان کی فطری کشش کو اپنی شخصی آمریت کو مضبوط کرنے کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے اصلی مقاصد کو صاف صاف بیان کرنے کا مطلب اپنی قلعی کھولنا ہے۔ اسی لئے ماؤزے تنگ کے شخصی اقتدار کی مخالفت اس پردے میں کی جاتی ہے گویا یہ چینی مزدوروں اور کسانوں کیلئے سوشلزم کی برکتوں کی حفاظت اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کی بحالی کے خلاف جدوجہد ہے۔

اس عہد میں جب کہ انسانیت سرمایہ داری سے گذر کر سوشلزم کی منزل میں داخل ہو چکی ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز نشوونما کے زمانہ میں سوشلزم اور اس کی تعمیر کے متعلق ماؤزے تنگ کے مسخ، قدیمانہ تصورات صرف غیر سائنٹفک ہی نہیں بلکہ انتہائی رجعت پرست بھی ہیں۔ ماؤ کی سوشلزم کے پرچم پر مسرت، قوموں کے بھائی چارے، امن اور دوستی کے نعرے نہیں بلکہ مستقل افلاس، جھگڑے، جنگ اور عداوت کے نعرے ہیں۔

حال میں اس کی از سر نو تصدیق ہوئی ہے کہ ماؤزے تنگ اور ان کے گروہ کے مفاد چین کے قومی مفاد سے اور آزادی کی خاطر، سامراجی حملے کے خلاف جدوجہد کرنے والی قوموں کے مفاد سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے بحران میں پیکنگ کے رہنماؤں کا موقف بڑی حد تک ان کی اس خواہش سے متعین تھا کہ سوشلسٹ ممالک اور عرب ریاستوں میں نفاق پیدا کریں، ان کے اتحاد کو توڑیں اور عرب قوموں کو ان کے سچے دوستوں یعنی سوویت یونین، ہندوستان اور دوسرے سوشلسٹ اور ترقی پذیر

ناکامیوں نے چین کو سب سے الگ تھلگ کر دیا

جنگ [illegible]

"وہ تصور ہولناک ہے جب تمام لوگ دولت مند بن جائیں" ماؤ

ملکوں کا مخالف بنائیں۔

اگر ہم لفظی ملمع کاری سے قطع نظر کرلیں تو دیکھیں گے کہ سوشلزم کے متعلق ماؤزے تونگ کی باتوں کے پیچھے ایک پیٹی بورژوا قوم پرست کا خواب ہے۔ چین کو عظیم طاقت بنانے کا جس کے خوف سے پڑوسی ممالک کانپ اٹھتے ہیں اور جس کا قائد پوری دنیا پر حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی ایسی ہے کہ اس خواب کو مصنوعی اور تشدد پسند طریقوں سے حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوششوں نے چین کو پیچھے دھکیل کر ایک ایسے زمانہ میں پہنچا دیا ہے جو انسانیت کے ترقی یافتہ حصوں کیلئے پرانے ماضی کی تاریخ ہے۔ دوسرے ملکوں کو اس مکروہ راستہ پر کھینچ لانے کی کوششیں اور بھی فضول ہیں اور ان میں بالکل ناکامی ہو رہی ہے جیسا کہ ماؤزے تونگ گروہ کی ہم بازی کے راستے نے چینی کمیونسٹ پارٹی اور مزدور طبقہ کی پوزیشن کو بہت کمزور کردیا ہے اور پیٹی بورژوا مزاجیت پسند عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔ چین کے محنت کش عوام کو وہ کی جو برکتیں حاصل تھیں وہ سخت خطرے میں پڑ گئی ہیں۔ یہ ہے کہ چین اپنے ہمسایہ ممالک کی طرف دوستی اور خیر سگالی کا ہاتھ بڑھانے کی بجائے ایک ایسے ملک کی طرف جھکا ہے جس کا اُن کے خیالات اور پالیسی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

آج امریکہ اور چین کی دوستی کو ساری دنیا کے دانشور، سیاستداں اور صحافی چین کے اندرونی بحران پر پردہ ڈالنے کی ماؤ کی ایک چال کہنے پر متفق نظر آتے ہیں اور چین کے تھوڑے تھوڑے انحرافات میں لگنے والی خبریں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہیں کہ بہت جلد وہاں ایک اور انقلاب آنے والا ہے۔ ■■

کچھ دیر کالی رات کے پہلو میں بیٹھ کے
لایا ہوں اپنے ہاتھوں میں جگنو سمیٹ کے

دو چار داؤں کھیل کے وہ سرد پڑ گیا
اب کیا کروگے تاش کے پتوں کو پھینٹ کے

اس سانولے سے جسم کو دیکھا ہی تھا ابھی
گھلنے لگے زباں پہ مزے چاکلیٹ کے

جیسے کوئی لباس نہ ہو اس کے جسم پر
یوں راستہ چلے ہے بدن کو سمیٹ کے

میں اس کے انتظار میں بیٹھا ہی رہ گیا
کپڑوں میں رکھ گیا وہ بدن کو لپیٹ کے

ہر فلسفے کو وقت نے ایسے مٹا دیا
جیسے کوئی نقوش مٹا دے سلیٹ کے

وہ ہنس رہا ہے دور کھڑا اور چند لوگ
لے جا رہے ہیں اس کو کفن میں لپیٹ کے

بے گانۂ درد ہو گیا ہے
شعلہ تھا وہ سرد ہو گیا ہے

انسان بنا تھا جو سمٹ کر
بکھرا ہے تو گرد ہو گیا ہے

وہ پھول کھلا تو تھا گلابی
کچھ سوچ کے زرد ہو گیا ہے

اس شہر میں کیا ہوا چلی ہے
نامرد بھی مرد ہو گیا ہے

صحرا کی بھی خاک چھان شاہد
کیوں شہر نورد ہو گیا ہے

شاہد کبیر
ڈائرکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپکشن نیو سکریٹریٹ بلڈنگ۔ ناگپور

تصویروں کا جشن

ہم تم مل کر آؤ کسی دن تصویروں کا جشن منائیں
میری سب تصویریں لے کر اک شب کو تم بھی آجاؤ
اور مری الماری سے بھی اپنی ہر تصویر اٹھاؤ
پیار سے بیٹھو، شمع جلاؤ، اور مجھے بھی پاس بٹھاؤ
پریم لگن کی تھالی میں کچھ آنسو بھی ٹپکاتی جاؤ
اور اپنے ہاتھوں سے اپنی تصویروں میں آگ لگاؤ

آخر اپنے گھر میں ایسا کیوں کوئی سامان رہے
اپنی الفت کی دنیا میں کیوں کوئی پہچان رہے

اپنے بعد گھروں میں اپنی تقدیریں بھی کیوں رہ جائیں
خط تو ہم نے جلا دیئے ہیں تصویریں بھی کیوں رہ جائیں
ہم تم مل کر آؤ کسی دن تصویروں کا جشن منائیں!

ارشد صدیقی
دانش کدہ۔ تول والی مسجد روڈ
(بہار)
بیگم حیدرآباد ۴۰

غزل

ناوک حمزہ پوری
ڈاک خانہ سوندا
ہزاری باغ (بہار)

پاس ان کے سو کے بل جاتے ہیں لوگ
نام میرا سن کے جل جاتے ہیں لوگ

خاک کے بے جان تودے کی طرح
ہر نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ

آج بھی وجہِ قرارِ دل ہے تو
نام سے تیرے بہل جاتے ہیں لوگ

کل موافق تھے، مخالف آج ہیں
یوں بھی چمن بھر میں بدل جاتے ہیں لوگ

گر کے اٹھ جانا بھی ہے ہمت کی بات
ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتے ہیں لوگ

موڑ دیتا وقت کا دھارا کوئی!
وقت کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ

آپ زندہ رہ گئے شعلوں کے بیچ
آنچ سے پھولوں کی جل جاتے ہیں لوگ

وہاب دانش لوہار بازار۔ رانچی بہار

ادھورے دائرے کا سفر

کون اب

شہد دیتے درختوں کی طوفان میں پاسبانی کرے

شاخ سے شاخ بکھری ہواؤں کے اُڑتے ہوئے حادثے

سرسرانے لگے

نرم جاں گٹھیاں

تیز طرار جھونکوں سے پامال ہونے لگیں

چاشنی

جو ابھی اپنے بچپن کے گھیرے میں

محفوظ تھی

کچے موتی کی مانند بے آب تھی

شاخ سے ٹوٹ کر

کھردری مٹیوں میں بکھرنے لگی

ذائقہ اور لذت کو اس عمر میں

دھول کی ہم نشینی کے دن دیکھنے جب پڑے

ایک قتل

جو صدیوں سے پیوست تھی شاخ میں

پھول کے مرکزوں میں سمائی کے آغاز میں گم ہوئی

اور وہ دائرہ رنگ کا

جو ازل سے ابد تک

کسی کرب کی راہ پر اپنی تکمیل کرنے میں مصروف تھا

پھیل کر

اس زمیں پر مسلط ہوا

فیاض رفعت
145 جوبلی ہال
مال روڈ — دہلی ۔ ۷

میں جب بھی یہ سوچتا ہوں کہ میں نے پہلی بار اُسے کہاں دیکھا تھا وہ کون سی کراسنگ تھی جہاں وہ پہلی بار مجھے نظر آیا تھا تو میرے ذہن کی طنابیں کھنچنے لگتی ہیں۔ میں سوچتے سوچتے پاگل سا ہو جاتا ہوں مگر اور چھور کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سب کچھ فضا میں معلق سا ہو جاتا ہے جیسے کوئی سیّال شئے زمین اور آسمان کے بیچ کالے سائبان کی طرح پھیل گئی ہے۔ اس شئے کے وجود سے انکار ناممکن ہے مگر آنکھوں پر جمی ہوئی گہری سبز کائی کی وجہ سے اسے دیکھنا محال سا نظر آتا ہے ——— شاید وہ گھنائے سورج کے عقب میں پھیلی ہوئی تاریکیوں کے گہرے میں ڈوب گیا ہے۔

ذہن کی چھت پر بکھری ہوئی سوچ کی سال خوردہ کڑیاں ایک ایک کر کے گرنے لگتی ہیں۔ تو پھر کیا وہ سب کچھ میرا واہمہ تھا۔ نہ میں نے اسے کہیں دیکھا تھا نہ وہ مجھے کبھی ملا تھا۔ مگر یہ ہو نہیں سکتا مجھے اپنے وجدان پر پورا بھروسہ ہے۔ پتھروں کا جگر تراش کر خوابوں کی پالکی تیار کی گئی تھی جسے راجہ اندر کے پرفشاں گھوڑے اڑا لئے چلے جا رہے تھے اور وہ ایک یونانی سورما کی طرح اپنے جسم پر سارے ہتھیار سجائے نئے سیاروں کی تلاش میں نکل پڑا تھا ———

میں نے اسے پشت کی جانب سے دیکھا تھا اور قوسِ قزح جیسے رنگوں والے زرہ بکتر پر میری آنکھیں نہیں ٹھہر سکی تھیں۔ میں سچ کہتا ہوں، میں نے اسے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ دیکھا بھی ہے۔ مستطیل نما کمرے کی سیلن اس کے جسم کی خوشبو کا پتہ دیتی ہے۔ ہینگر پر لٹکے ہوئے صدیوں پرانے چہروں میں اس کی شبیہ، آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ میز پر رکھا ہوا زہر کا پیالہ یگ یگ سے اس کا انتظار کر رہا ہے کہ فتح یابی کا خبرنامہ نشر ہوتے ہی اسے وش پان کرنا ہوگا۔ وہ آئے گا ضرور۔ مجھے بھی اس کا انتظار ہے۔ میں اس سے ملنے کے لئے

[illegible] سامنے [illegible]
[illegible] ہو سکتا ہے [illegible]
[illegible] سب [illegible] کی آنکھ [illegible] انھیں
[illegible] سنا سکے گا۔

فرانسیسی اسٹار کیو چنہ (Kiu Chinh) نے ایک
ایکسک کے لیے سب کپڑے اتار دیے ہیں اور ٹیپ
یسی بکنی کی میٹ کا پچھڑ نگاہ پر اس طرح چھایا ہے
کہ اس کے علاوہ کسی اور شخص میں اتنی جرأت نہیں کہ
بے باکانہ آگے اور ریشمی کپڑے کو ہٹا کر سیب میں بند روشنی
نکال سکے۔ کیونکہ شیشے میں بھری ہوئی جن اس کا حسن
اندر کے ابال کی تاب نہ لا سکنے کی بنا پر کارک کی مانند
اچھل کر مستطیل نما کمرے کی چھت سے ٹکرا جاتا ہے
جہاں کمرے کا جالا اسے اپنے بازوؤں میں لپک لیتا ہے
اور جن کا نشہ ابخرات کی طرح اڑ کر کمرے کو تلخ ترین
لذت سے بھر دیتا ہے ــــــ الف لیلوی خاتون
مرطوب ایشیائی ہواؤں کو خوش آمدید کہتا ہوا انھیں
اپنے نتھنوں میں جذب کر لیتا ہے کہ ایشیائی ہواؤں
کی خوشبوؤں میں اس کے بدن کی کنواری کسیلی مہک
سمٹ گئی تھی۔ مگر وہ خود نہیں آیا تھا یا اگر آیا تھا
تو پردے کے پیچھے چھپ گیا تھا مگر میری مجبوری یہ
تھی کہ پردہ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دیوتاؤں نے
مجھے خراب دیا تھا کہ اگر میں نے پردہ اٹھا کر دیکھا تو
میں اندھا ہو جاؤں گا۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ کائنات
کے سربستہ راز مجھ پر عیاں ہو جائیں۔

[illegible] بدقسمتی [illegible] سے پہلی
کرن [illegible] مستطیل نما کمرے کی چھت [illegible]
کا ناخن [illegible] سب [illegible]
گئی تو چیخ [illegible] کی صورت میں تبدیل ہو چکی
تھی جسے مقدس سمجھ کر لوگوں نے پوجنا شروع کر دیا تھا۔
اور اس طرح جنس کے [illegible] بدلنے سے خدا [illegible] نے
جنم لیا تھا۔

میری پلکیں سفید ہو چکی تھیں اور چہرا بھی سبز کائی سے
ڈھک چکا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے آب و تاب ہو کر
پتھرا چکی تھیں۔ مگر وہ نہیں آیا تھا جس کا مجھے انتظار تھا
جس کی ایک جھلک دیکھنے میں شہر کی لمبی چوڑی
شاہراہ کے آخری موڑ پر سنگِ میل کی طرح ایستادہ ہو گیا
تھا۔

میں اپنے کمرے میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ
مجھے باہر آئے ہزاروں برس گزر چکے تھے اور کمرے کی
ہر شے نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ ویسے
بھی اس کی پیشانی پر آثارِ قدیمہ کا بورڈ لٹک رہا تھا۔
لہذا اب مجھ میں چلنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ اکثر
جب رات ڈھلنے لگتی تو کچھ جوڑے پناہ تلاش کرتے
ہوئے ادھر آ نکلتے اور میرے سامنے اپنے جسموں کے
اندر سے گناہ کے پھل نکال لیتے اور لذت لے کر انھیں
کھانا شروع کر دیتے اور میں سائبان کی طرح ان پر جھکا
ہوا ان کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتا رہتا۔ کہنے والے
سب لوگ رشتوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ آہ

کے درمیان محض جنس کی ناگن سیڑھیا کا رشتہ مشترک تھا۔ جس کی حد سے بڑھی ہوئی شہوانی بھوک نے اُس کی اپنی کوکھ کے بچوں کو بھی ڈس لیا تھا۔

میری آنکھوں کی پتھرائی ہوئی پتلیاں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ مگر وہ نہیں آیا تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ شائد وہ کبھی نہیں آئے گا۔ میری آنکھوں کی بصارت کبھی نہیں جائے گی۔ شائد۔ شائد ـــــ اُس کے لمس سے شائد میں ہمیشہ ناآشنا رہوں گا۔ سیاروں پہ کمندیں پھینکنے والا مسافر مُکتی کیلئے یقیناً کسی گپھا میں بیٹھ کر تپسیا کر رہا ہوگا۔ مگر اس کی ریاضت بے نتیجہ ثابت ہوگی۔ خود شناسی اور خود آگہی کی منزل سے شائد وہ کبھی ہم کنار نہ ہو سکے گا۔ دھیان گیان میں گمن اس شخص کو کیا معلوم کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ منظر بدل چکا ہے سڑکوں پر شجر ہائے سایہ دار بے نام و نشان ہو چکے ہیں۔ خانۂ باغ سے آنے والی خوشبو عنقا ہو چکی ہے کھیتوں میں ایڈ۔ ایس۔ ڈی۔ (L.S.D.) کی فصلیں بو دی گئی ہیں۔ لوگ اب وٹامنز کی گولیاں کھا کر زندہ رہتے ہیں۔ سیمین (Siemen) اب بازاروں میں عام ملتی ہے۔ نئی نسل کی کھیپیں سائنس لیبارٹریوں کی ٹسٹ ٹیوبوں میں تیار ہو رہی ہیں۔ میکس نیکٹر والوں نے چہرے کے میک اپ سے زیادہ اب اندرونی اعضا کی آرائش کیلئے کاسمیٹکس (Cosmetics) کے ترقیاتی پلانٹ لگا دیئے ہیں۔

چائے خانوں اور کافی ہاؤسوں نے اپنا پیرہن تار تار کر لیا

پیکر حیدرآباد ۲۴۴

جہاں پہ اب ڈسکوتھیک (Discothèque) روشن چلادیا گیا ہے۔ جہاں صحت مندی کی نمائش کے اظہار کیلئے نیم ڈال ایستادہ کر دیئے گئے ہیں۔ جسم کے تحفے کے طور پر ڈیلیٹ باسکیٹس "ایف۔ ایل" سے بھرے ہوئے کوڑے کرکٹ کی میونسپل گاڑیوں میں الٹ دی جاتی ہیں ـــــ اور ریکارڈوں کی لائبریری میں جاز کی ابتی ہوئی گرم موسیقی دریائے ٹیمز کی پاگل لہروں کی طرح شور مچا رہی ہے۔

محبوبوں کی نرگسیت ارزاں ہے اور خریدار کوئی نہیں۔ برہنہ رقص کا تجربہ اپنے آخری مرحلوں پر ہے۔ فیشن ہاؤسوں کی سجی ہوئی لڑکیاں اچھی بریڈ (Breed) کی تلاش میں اپنے پرسوں کو لٹکائے سے جھومر کر نکلتی ہیں اور مایوسی اور ناکامی کی جھلاہٹ لئے کسی مکڑی کے شہزادے کو خرید لاتی ہیں جو اسٹریکنگ (Streaking) لگانے کے فن سے ناشائستگی کی حد تک ناواقف ہوتا ہے۔ شائد اس لئے کہ وہ کمپیوٹر (Computer) کا غلام ہے۔ اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کیلئے مجبور۔

اکثر اشتہاروں کے ماڈل ڈھلتی رات کے غازہ کے دھبے میری پتھرائی ہوئی آنکھوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ میرا دل ابھی تک صدیوں پہلے کی طرح دھڑکتا ہے۔ وہ سب آنے والے اینڈرس کی طرح گوشت پوست کا دل نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ ہرٹ ٹرانسپلانٹیشن (Heart Transplantation) بہت عام ہو گیا ہے۔ مصنوعی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے نہ وہ کھلتے شگوفوں کے چٹکنے کی آواز سن سکتا ہے مگر میرے

[illegible] سانس
کا جلتا ہوا بدن ہے جس میں زندہ خون گردش کر رہا ہے
اور مجھے اب بھی اس کا انتظار ہے جسے میں نے کہیں دیکھا
تھا۔ شاید وہ پیڑ کا سمندر تھا جس کو زبردست لہروں
نے اپنے قبضہ میں لیا تھا۔ سب کچھ وقت کی گردش میں ڈوب
گیا ہے۔ دھند میں کچھ نظر نہیں آتا۔ اب تو اس کے پیچھے
کے فاصلے پر بھی ذہن کی دیواروں سے خون رسنا شروع ہو
گیا ہے۔ جس کے انتظار میں دروازے کی سطح پر صدیوں سے تھک
گیا ہوں۔ اور گھن زدہ کوڑھی سانپوں کا زہر اپنی روح
میں اتار رہا ہوں اور آتی جاتی سانسوں سے رشتہ جوڑ کر
سنگساری کا کرب برداشت کر رہا ہوں۔

اور پھر اُس دن بہت زبردست طوفان آیا تھا۔ آہنی
سڑکوں کا سینہ شق ہو گیا تھا۔ جن کی گہرائیوں میں صدیوں
سے زمین پاتال کی مخلوق نے باہر آتے ہی جشنِ آزادی
کے نقارے بجانا شروع کر دیئے تھے جن کی گونجتی ہوئی
آوازیں آندھیوں کے شور کی طرح قیامت برپا کر رہی
تھیں ـــــ پاتال کی مخلوق جشن منا رہی تھی۔ آسمانوں کا
زوال ہو چکا تھا۔ پہاڑوں کی چھاتی میں گہرے شگاف
پڑ گئے تھے۔ آتش فشاں لاوے کی طرح سڑکوں پر بہہ
رہا تھا۔ خنجر تیری آنکھ والے دیوانہ وار رقص کر رہا تھا
اور سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔ آسمان کو چھوتی ہوئی سیمنٹ
اسٹار بلڈنگیں ریت کے تودوں کی طرح زمین بوس
ہو رہی تھیں۔ تہذیب کا نیا عہد نامہ کانچ دیوتا کے
بت کی طرح اوندھے منہ زمین پر آ رہا تھا۔ آتش کدوں
شوالوں، مندروں اور مسجدوں نے ایک دوسرے سے

بلڈنگوں کو مسمار ہو جانے کا سلسلہ [illegible] تھا
اور وحشت زدہ لوگ اپنی جانیں بچانے کیلئے سڑکوں
پر نکل آئے تھے۔ وہ اپنا سارا اثاثہ اپنے گھروں میں چھوڑ
گئے تھے۔ اُن کے جسموں کی آلودگیاں اور کثافتیں کیچلی
کی طرح ان کے جسم کا ساتھ چھوڑ کر دریاؤں اور خلاؤں
میں جا چھپی تھیں۔ وہ لوگ دوڑتے دوڑتے بری طرح
تھک گئے تھے اور ان کے برہنہ جسم خون سے لہولہان ہو
رہے تھے۔ مگر کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔
سبھی کو جلدی تھی ـــــ سڑکوں پر سرخ لاوے کے
دریا بہہ رہے تھے جن میں کشتیاں تیرتی پھر رہی تھیں
مگر نوح آرام سے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اور لوگوں کو خوف
تھا کہ اس کا جلتا ہوا سگار جلد راکھ ہو گا۔ اس کی مرضی کے
بغیر نہ کوئی کشتی میں سوار ہو سکتا تھا اور نہ بادبان کھل
سکتے تھے۔

میرے جسم کے چاروں طرف سرخ لاوے کا سمندر ٹھاٹھیں
مار رہا تھا۔ پھر اس نے میرے جسم کا حصار توڑ کر مجھے اپنے
شکنجہ میں جکڑ لیا تھا۔ شعلوں کی لپلپاتی ہوئی زبانیں میرے
جسم کو چاٹ رہی تھیں اور پھر میں جسم پر لگی ہوئی سبز کائی
سے آزاد ہو چکا تھا۔

جب طوفان تھما تو میں نے دیکھا۔ سب کچھ وہی تھا۔
محض میری سانسوں نے مجھ سے رشتہ توڑ لیا تھا اور میرا
مردہ جسم ایک گڑھے میں پڑا تھا۔ بھوکی چیلوں نے
میری لاش کے گرد طواف کرنا شروع کر دیا تھا ـــــ
اپنے جسم کو اکیلا چھوڑ کر جانے سے قبل میں آخری بار اپنا

چہرہ دیکھنا چاہتا تھا اور جب میں نے لاش کو پلٹ
کر اپنے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا
جس چہرے کی تلاش میں میں قرنوں اور صدیوں سے معلق

مہدی پرتاب گڑھی
بیگم وارڈ پرتاب گڑھ

غزلیں

عبدالمتین نیاز
"ثروت منزل" موتیا پارک بھوپال

میں وہ دریا ہوں کہ سیراب ہے جس سے دنیا
پھر بھی ہے تشنہ لبی میرا مقدر دیکھو
جس پہ دیکھے ہیں خشونت کے ابھرتے سلنے
کبھی اس چہرے کو نزدیک سے جا کر دیکھو

میں وہ تحریر ہوں واضح نہیں جس کے خدوخال
دل کی آنکھوں سے مگر مجھ کو پڑھ کر دیکھو
زندگی کرنے کی ترغیب ملے گی تم کو
دوستو آؤ مرے قتل کا منظر دیکھو
میں نے احباب نوازی کے طفیل لٹ کے بھی
رکھ لیا سینے پہ احساس کا پتھر دیکھو

جب جب بھی غزل فکر کے رنگوں میں ڈھلی ہے
ہر مسئلہ زیست کا آئینہ بنی ہے!
اقدار کے ٹوٹے ہوئے بت دیں گے گواہی
ہم نے نئی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے
آنکھیں مری بے خواب ہیں اس واسطے شاید
اے دوست تری یاد ابھی جاگ رہی ہے
جو گیت ترے پیار کے دھاگوں سے بنا تھا
اس دور میں اس گیت کی لے ٹوٹ گئی ہے
دو چار گھڑی اپنے بھی ہمراہ گزارو
ملنے کو غم دہر سے اک عمر پڑی ہے
اک عمر میں آتا ہے نیاز اس کا سلیقہ
دراصل سخن گوئی بھی آئینہ گری ہے

پیکر حیدر گلنی ۲

ایم۔ اے۔ نصیر
۲۴۔ بریورن روڈ کلکتہ۔ ۱

مغربی بنگال کی اردو شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ہر دور میں اچھے شاعروں کی خاصی تعداد موجود رہی ہے۔ مگر شہرت کی دیوی نے ہمیشہ ان سے اپنے دامن کو بچایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ "شہرت" کی تمنا انھوں نے کی نہیں اور ان کی اسی بے نیازی نے ان کو نظر انداز ہونے دیا۔ وہ بیجا "انانیت" کے شکار تھے اور ہمارے موجودہ ادبا و شعرا (ماسوا چند) محض خوشامد کے بل بوتے پر شہرت کی انتہائی بلندیوں کو چھونا چاہتے ہیں۔ آخر یہ تضاد کیوں؟ یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے جس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ جدید نسل کے ادبا و شعرا غیر شعوری طور پر خود کو فنا کر دیں گے۔

آزادی کے بعد مغربی بنگال کی افق شاعری پر جو شعرا نمودار ہوئے ہیں ان میں قیصر شمیم صاحب کا مقام بہت اونچا ہے۔

قیصر شمیم کی شاعری دل اور ذہن، دونوں کی شاعری ہے۔ وہ دل کی کدورتوں اور کڑھنوں کو ذہن کی شعاعوں سے چمکاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے محسوسات کو مشاہدات کا لباس دے کر اپنی "شاعری" کو دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔
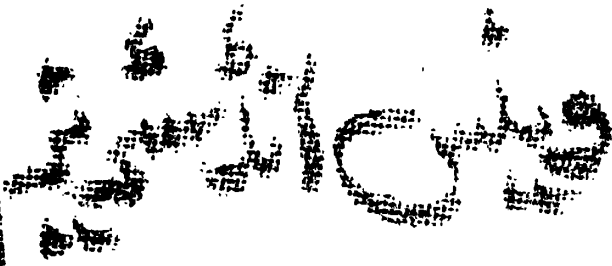
قیصر شمیم صاحب کی شاعری میں ان کی زندگی کی ایک ایک دھڑکن پوشیدہ ہے۔ وہ اپنے خیالات و محسوسات کو اس طرح الفاظ کے خوبصورت جال میں گم کر دیتے ہیں کہ ان کی آپ بیتی میں جگ بیتی کا مزہ ملنے لگتا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی تصویر پوشیدہ ہے۔

جو دل نہ سلگے تو مر جائے شاعری قیصر
بلا سے جاں کی طرح یہ ہنر کہاں کا ہے

ان کے اشعار میں ان کے رستے ہوئے زخم ان کے

روتے ہوئے دل کی صدا کی بھر پور جھلک ملتی ہے۔

مری ذات کا حال نہ پوچھو کہ یہ عالم تو ایسا ہے
جیسے کسی رستے کے کنارے برسوں کا کوئی شجر!
بھرم کھلا ہے وہیں کتنے ہی سہاروں کا
رہ حیات میں جب بھی کہیں گرا ہوں میں
اب اپنی ذات مجھے بھیک جیسی لگتی ہے
نہ جانے کس کا بھکاری بنا ہوا ہوں میں

قیصر خود اپنی ذات سے کیا کیا نہ تھا مگر
سمجھا گیا نہ کچھ بھی وہ اک فرد کے سوا
صدا کی بھیک بھی اونچے مکاں سے مل نہ سکی
یہ دستکوں کو سمجھنا تھا، در کہاں کا ہے

قیصر شمیم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے، جو زندگی کی رنگینی سے دور "حسینی زندگی" کا بوجھ اٹھائے ہوئے، حیات کی سنگلاخ وادیوں سے گذر رہے ہیں۔ تپتی ہوئی زندگی کے صحرا میں ان کا جسم جھلس گیا ہے، پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ مگر ـــــ کٹھن زندگی کا رہرو ہونے کے باوجود ان کے اندر کا شاعر مرا نہیں۔ شاعری زندگی کے خون کی پیاسی ہوتی ہے، خونِ جگر ہی اس کی خوراک۔ اور قیصر شمیم کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو اس کی خوراک مل رہی ہے، وہ اپنے خونِ دل سے، اپنے اندر کے شاعر کی پرورش کر رہے ہیں ؎

لفظ کی سطح سے گہری ہیں بہت سی باتیں
ہم بھی کچھ عرض کریں، کوئی سخن فہم تو ہو

مری زباں پہ نہ آیا فروتا بھی کبھی
وہ لفظ جو مرے یاروں کی بول چال میں تھا

ہمارے عہد کا روشن مثال تھے قیصر
کہ سارا عہد کا منظر جسے بحال ہی تھا
قیصر خود تھا اگر کہ مفلس ہوں، پھر بھی ہوں
ہر صاحب رسوخ سے بیگانہ سا الگ
اپنی پہچان کتنی جھوٹی تھی
ملاؤں میں بھی خود سے الگ تھا

وہ اپنی مشغول زندگی سے، ادبی ذوق کی تشنگی کو بجھانے کیلئے "کچھ لمحے" چھین لیتے ہیں۔ یہی وہ لمحے ہیں جو اردو ادب کے لئے "قیمتی نوادر" کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن قیصر شمیم کو اپنی محنت اور خلوص کا کیا صلہ ملا، اردو شاعری نے انہیں کیا دیا، یہ ایک سوال ہے؟ جس کا جواب ان نقادوں کو دینا ہے جن کا سحر طراز قلم شخصیت کو بناتا اور بگاڑتا ہے ـــــ ایک حساس شاعر کی اس آواز میں، کتنا درد پوشیدہ ہے۔ اسکی کچھ جھلک ان اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

نہیں رنگ خاص سے کچھ غرض، کوئی رنگ عام تو دو کبھی
کبھی اپنی صبح نہ دو مگر، مجھے میری شام تو دو کبھی
یوں ہی اپنے آپ کو ڈھونڈتا پھروں شہر شہر میں کب تلک
مجھے میری شکل تو دو کبھی، مجھے میرا نام تو دو کبھی
جو نشست ہے کسی اور کی، اسے رکھو شوق سے تم مگر
مرا اپنا جو بھی مقام ہے، مجھے وہ مقام تو دو کبھی
مری آہ پر نہ دو دھیان تم، نہیں اس کا کوئی گلہ مگر
مرا درد جس کا ہے مستحق، وہی احترام تو دو کبھی
دئے جاؤ سب کو سبو مگر، اسی میکدے کے ہجوم میں
کوئی عمر بھر کا ہے تشنہ لب، اسے ایک جام تو دو کبھی

گرد پورے طور پر حصار نہیں ڈالتا، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے دل کی دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔ ان کے اسلوب کے انوکھے پن کی انفرادیت، شعری بانکپن، تخلیقی اپج اور سنجیدہ تغزل کی منفرد کیفیات سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔

ہونے کے باوجود ایسے بہت سے ضخیم مجموعۂ کلام سے بہتر ہے، جس کے (بھرتی کے) اشعار قاری کے ذہن کو جلا بخشنے، نئی توانائی دینے کے بجائے پراگندہ کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں کہ ہیرے کے معمولی ٹکڑے، پتھر کی بھاری چٹانوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

قیصر شمیم کا یہ مجموعۂ کلام "ساعتوں کا سمندر" مختصر

غزل

پگھلتی سانسوں کی لو خامشی تک آ پہنچی!
یہ ساعت اب تو عجب بے بسی تک آ پہنچی

اب اپنے اپنے دریچوں کو وا کرو یارو
وہ دیکھو دھوپ سرک کر گلی تک آ پہنچی

جسے چھپانے کی خاطر لبوں پہ قفل پڑے
وہ بات آج ہماری گلی تک آ پہنچی

اداس چہرے دلِ زخم زخم شاہد ہیں
غموں کی آنچ بھی اب ہر خوشی تک آ پہنچی

فخر رضوی

دائرہ ساسارم (بہار)

زخمی سڑک

غیاث متین
۲۵۳-۳-۱۶ چنچل گوڑہ، حیدرآباد ۲۴

مری آنکھیں اٹی ہیں گرد سے پھر بھی
میں سب کچھ دیکھ سکتی ہوں
زمیں پر گاؤں نے جب روپ سارا شہر کا تب سے
سحر کی آنکھ کھلتے ہی
اُسے پھر نیند آنے تک
ہزاروں نقش پا بنتے، بگڑتے ہیں
کئی مانوس ہیں ان میں
کئی ہیں اجنبی لیکن
سبھی یہ چاہتے ہیں یاد رہ جائیں زمانے کو

سحر کی آنکھ کھلتے ہی
اُسے پھر نیند آنے تک
نہ جانے کتنے رکشے، سائیکل، موٹر
مجھے یوں روند کر آگے کو بڑھتے ہیں
کہ جیسے میں نے اپنا جسم ان کو بیچ ڈالا ہے

میں راہوں کا مقدر ہوں
ستم دیکھو
مرے سینے پہ پھوڑے، پھنسیاں اب بھی
گڑھوں کی شکل میں پھیلی ہوئی ہیں

مجھے کچھ یاد آتا ہے
کبھی میں بھول جاتی ہوں
مرے اطراف تھیں کچھ ٹوٹی پھوٹی گلیاں کل تک
وہیں پر آج ایسی بلڈنگیں ہیں
جنھیں میں دیکھ کر حیران بھی ہوں اور خوش بھی ہوں

سنا ہے میں نے یہ اکثر
سمندر پار ملکوں میں
مرے ہم جنس مثل آئینہ ہیں
اور اس میں
زمیں کے چاند، سورج اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں

اس اندھے شہر میں
آئینہ بننے کی لئے حسرت
میں زندہ ہوں
مگر اب سوچتی ہوں
کوئی اک صور پھونکے
صور کی آواز سے ہر شے پگھل جائے
زمیں مجھ کو بھی اپنی گود میں لے کر
خلاؤں میں اُڑے، سورج سے مل جائے
یا پھر ایسا ہو یہ دھرتی بدل جائے

"اعظم سے ایسی امید نہیں تھی۔" نظام نے جملہ پھینکا۔
"بالکل بیوی کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔" حیدر بھلا کب چپ رہتے، حالانکہ وہ خود کئی کئی مہینے بعد نظر آتے ہیں۔
"چھوڑیئے ان سے کچھ کہنا فضول ہے۔" صبیح کی بھی ناک سکڑ سکڑا گئی۔ "اب تو یہ قابلِ رحم ہستی ہیں۔ ہم لوگ ان کے نام کا مرثیہ پڑھ دیں۔" ڈاکٹر نیازی دو مصرعے جوڑ دینے کیلئے کوئی جملہ تلاش کر رہے تھے۔ اور نعیم بھی کچھ کہنے کیلئے اپنی ناک پر عینک چپکا چکے تھے کہ میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ موتی حماری ہے اشمال بھارکا چھوٹا سا خوبصورت شہر جہاں مندروں کی گھنٹیوں کی آواز مسجدوں کی اذانوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے تورات کی کوکھ سے صبح کا جنم ہوتا ہے اور گولندار کی سیلہ چلتی سڑکوں پر پنشن یافتہ بوڑھے چھڑیاں ٹیکتے چہل قدمی کیلئے نکل پڑتے ہیں۔ میرے پڑوس میں ایک پولیس انسپکٹر دین دیال بڑی پابندی سے ہوا خوری کے لئے نکلتا ہے۔ دوسری شادی کے بعد وہ شام میں بھی نکلنے لگا ہے۔ شاید وہ اس طرح اپنی کھوئی ہوئی توانائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یا دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ وہ ابھی بھی

میں فروغ ادب کی اس نشست میں بھی کوئی نئی تخلیق پیش نہیں کر سکا تھا۔ لہٰذا دوستوں نے اچھی طرح کھنچائی کر دی۔ یہ درست ہے کہ شادی کو ایک سال ہو گیا اور اس مدت میں ایک بچے کا باپ بننے کے سوا کوئی دوسرا کارنامہ انجام نہ دے سکا لیکن اردو لائبریری کے ہال سے نکلتے وقت میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آج ایک کہانی ضرور لکھوں گا اور وہاں سے میں سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور اب کرسی پر بیٹھا اپنی کہانی کو ڈھونڈ رہا ہوں ....
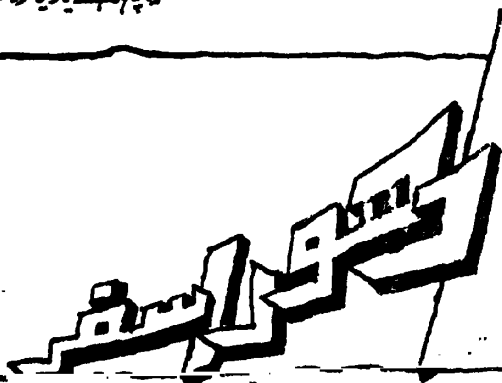
جوان ہے۔ ریٹائر ہو جانے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ایک بیوہ کی چاند سی بیٹی کو بیاہ کر گھر لے آیا جس سے اس کے ساتوں لڑکے خفا ہو کر اس سے الگ ہو گئے اور اب وہ اپنے کمسن بیوی کے ساتھ گھر کی چھوٹی دیواروں کے بیچ تنہا قید کے دن گن رہا ہے۔ وہ جب بھی باہر نکلتا ہے دروازہ میں تالا لگانا نہیں بھولتا۔ دوسری شادی کے بعد عزت پر آنچ آنے کا خوف زیادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا بس تو صرف باہر کے دروازے ہی پر ہے! محلے کے دل پھینک نوجوان جو اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے

بعض تو اس کے ہاتھ پنجوں سے باہر
نکل سکتی ہیں پھر اچک کر کہیں یا چھتوں پر کود
کر چلے جاتے ہیں اور بعض تو اس کی کھڑکی کی طرف رخ
کر کے پیشاب کرنے بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اور چاند کو
اپنے مکان کی کھڑکی یا چھت سے اپنی فضا میں پھینکتا
رہتا ہے ــــــ نوجوان اس کی میٹھی مسکراہٹ کی چوٹ
اپنے دل میں سنبھالے بڑی دیر تک بوڑھی عورت سا کھ
پھول کھیلتے ہیں ــــــ مگر آدھی رات کو اس کے مکان
سے "چھوڑ چھوڑ" کا شور بھی اٹھتا ہے، لیکن کبھی کوئی چور
نہیں پکڑا گیا۔ اور نہ اس کے یہاں کوئی چوری ہی ہوئی

سے پہلے وہ ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ لہذا
نمبر چار سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ لیکن معجونوں کی طاقت
کے سہارے کوئی کب تک چل سکتا ہے ــــــ کچھ عرصہ
ہوئے اس کی چاروں بیویاں اسے چھوڑ کر چلی گئی ہیں
اب وہ بھی نجومی بن گیا ہے اور لوگوں کے ہاتھ کی لکیریں
دیکھتا ہے۔

"بیٹے اعظم!" ایک دن اس نے میرا ہاتھ دیکھتے
ہوئے کہا "خدا جھوٹ نہ بلائے۔ تمہارے پاس دولت
کی فراوانی ہو سکتی ہے، تم کافی ترقی کر سکتے ہو۔ اگر یہ لکیر
اس لکیر کو نہ کاٹے۔ لیکن یہ لکیر اس لکیر کو کاٹتی ہے۔ نعوذ

قادر کے راھب

نزد ڈسٹرکٹ اگری کلچر آفس
موتی ہاری (بہار)

پھر بھی اس بوڑھے ریٹائرڈ انسپکٹر کے بوڑھے دل میں
یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی شئے ضرور چوری ہوتی
ہے!

اپنی تھکی ہوئی زندگی کی ڈوبتی ہوئی سانسیں گننے والے
محلے کے اسّی سالہ کھوسٹ حکیم شہباز کا محبوب
مشغلہ شادی کرنا ہے اور اب تک وہ سات شادیاں
کر چکا ہے۔ لیکن وہ شریعت کا پابند ہے ــــــ یعنی
اس کی صرف چار بیویاں ہیں۔ پانچویں بیوی لانے

"اس سے بچنے کا کوئی طریقہ؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"اسے مذاق مت سمجھو، میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"
"کہہ بھی چکئے"
"میرے پاس ایک بہت ہی نایاب ہیرا ہے، جو پشت
ہا پشت سے میرے خاندان میں محفوظ چلا آرہا ہے
اور میرے خاندان کی ترقی کا واحد راز وہی ہے۔ اگر
تم اس ہیرے کو کچھ دن گلے میں پہنو تو تمہاری قسمت
کھل سکتی ہے۔ میں دوسروں کو تو اسے دو ہزار
سے کم میں نہیں دیتا لیکن تمہیں صرف دو سو روپے

میں دے سکتا ہوں۔"

"اگر اس کے پہننے کے بعد کہیں میں نے بھی شادیاں کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تو ـــــ؟"

"یعنی کہ تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" حکیم صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ "چلے جاؤ یہاں سے اور اپنی قسمت کو روؤ۔"

میں وہاں سے کھسک آیا۔ ایک مڈل اسکول کا ماسٹر پرکاش بھی ایک دن ان کے پھندے میں پھنس گیا اور انھوں نے اسے بتا دیا کہ اس کے ہاتھ میں تو دماغ کی لکیر ہی نہیں ہے اور بے چارہ اسکول ماسٹر آج بھی ہاتھ پھیلائے لوگوں سے پوچھتا رہتا ہے ـــــ

"دیکھو تو یار! کیا سچ مچ میرے ہاتھ میں دماغ کی لکیر نہیں ہے؟ میری بیوی بھی یوں کہتی ہے اور حکیم کا بچہ بھی یہی کہتا ہے۔"

دنیا کے سارے ٹھگ پہلے اس محلے میں آتے ہیں اور محلے والوں کے اخلاص سے کھیل کر چلتے بنتے ہیں۔ ایک دن الطاف بھی اپنی خوبصورت بیوی اور جوان بیٹی کے ساتھ خستہ حال آیا تھا اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں لوگوں سے کہا تھا۔

"ہم احمد آباد سے آ رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں جو وہاں ہولناک فساد ہوا ہے ہم لوگ اسی کے ستائے ہوئے ہیں۔"

اس کی مدد کیلئے بہت سے ہمدرد کھڑے ہو گئے۔ ایک رئیس نے تو اس کے رہنے کیلئے اپنا ایک مکان بھی خالی کرا دیا۔ ڈاکٹر راج بھی اپنی چمکتی ہوئی دو رنگی کار سے آیا اور اسے پانچ سو روپئے دے کر اس کی بیوی اور لڑکی کو اپنی آنکھوں میں جذب کر کے یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

"پھر آؤں گا!" اور روزانہ شام میں وہاں دیکھا جانے لگا ویسے بھی ڈاکٹر راج معاملہ باز مشہور ہے۔ ایک بار جو جوان عورت اس سے اپنا علاج کرانے جاتی ہے، پھر دوبارہ اس کے پاس جانے کا نام نہیں لیتی۔

کچھ لوگوں کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ بھی ٹھگ نہ ہو! لیکن یہ خیال بھی آیا کہ دو حسین عورتوں کے ساتھ کوئی مرد جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس طرح الطاف کے ہمدردوں کی تعداد اچھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ ایک دن چچا چمن نے سیخ کو کوئلے کی آگ پر گرم کرتے ہوئے کہا تھا۔

"دیکھ لینا اعظم بابو! یہ الطاف بھی بہت بڑا ٹھگ نکلے گا"

کباب کی مہک میری بھوک بڑھا رہی تھی اس لئے میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کباب گرم ہو جانے کے بعد انھوں نے اسے طشتری میں نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ چچا چمن اپنے کباب کے لئے ہی مشہور ہیں۔

"لیکن اعظم بابو!" انھوں نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ سارے جتنے ہمدرد ہیں نا ......"

"کون ہمدرد؟" میرا دھیان کباب کی طرف تھا۔

"ارے اسی الطاف کے جو ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں۔"

"ہاں تو انھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کیا ان کو الطاف سے ہمدردی ہے؟ یہ سب اس کی بیوی اور بیٹی کے چکر میں جلتے ہیں ـــــ لیکن اعظم بابو!" انھوں نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ "اس کی بیٹی قیامت ہے ـــــ

مجھے تو وہ بالکل جگناتھ کی چائے لگتی ہے۔ جگناتھ بھی
کم بخت خوب چائے بناتا ہے۔ چائے ہونٹوں کے درمیان
سے گذر نہیں پاتی کہ ہونٹ سے ہونٹ ایسے سٹتا ہے جیسے
پھر کبھی الگ نہیں ہوگا۔"

"الطاف کی بیوی بھی کم نہیں ہے چچا!" میں نے پلیٹ ہی
میں ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔

"اس کی بیوی بھی اچھا" چچا جمن اپنے کندھے پر رکھا ہوا
تولیا میری طرف جھٹکتے ہوئے بولے "لیکن وہ گوبردھن
کی چائے ہے۔ حالانکہ گوبردھن جگناتھ کا بڑا بھائی ہے،
لیکن گوبردھن میں وہ بات نہیں جو جگناتھ کی چائے میں ہے"

چچا کا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ الطاف بہت بڑا فراڈ تھا!
پولیس اس کے تعاقب میں تھی اور ایک دن اسے گرفتار
کر کے لے گئی۔

کمرے میں گھٹن بڑھی تو مجھے احساس ہوا کہ کھڑکی بند
ہے۔ میں نے کھڑکی کھول دی ہے۔ اب تازہ ہوا کے
جھونکے میرے چہرے سے ٹکرا کر مجھے فرحت بخش رہے
ہیں۔ میری کھڑکی کے ٹھیک سامنے ایک چھوٹا سا مکان
ہے جو خلیل درزی کا ہے۔ اس کی ماں بڑی بدمزاج ہے
محلے کا کوئی آدمی بھی ایسا نہیں جس سے اس کی لڑائی
نہ ہوئی ہو۔ جب خلیل کی شادی ہو رہی تھی تو لوگوں کا خیال
تھا کہ ساس بہو میں روزانہ جنگ ہوگی لیکن خلیل کی
شادی کو دس برس ہو گئے اور کبھی کسی نے وہاں سے
زور سے بولنے کی آواز تک نہیں سنی۔ اس لئے کہ
دونوں ساس بہو میں بڑا اچھا معاہدہ ہو گیا تھا۔ وہ
لوگ آج بھی اس معاہدے پر قائم ہیں۔ ساس دن
بھر سوتی ہے اور بہو گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ شام ہوتے ہی
بہو سونے چلی جاتی ہے اور ساس ساری رات جاگ کر
پوتے پوتیوں اور گھر کی نگہبانی کرتی ہے۔ دس برس سے
وہاں یہی ہو رہا ہے۔ ہر گھر کی ساس اور بہو کو ان سے سبق
لینا چاہئے ۔۔۔ مگر میں چونک پڑا ہوں اور میرا دھیان
سامنے کے مکان سے ہٹ گیا ہے۔ رکشا پر ایک آدمی
مائک سے چلاتا چلا آرہا ہے ۔۔۔ "کل نو بجے دن میں بنگلہ
دیش" کی مدد کیلئے چترمندر کے اسٹیج پر ایک ڈرامہ
"بنگلہ دیش کا آدمی" کھیلا جائے گا۔ ٹکٹ کے دو روپے
پانچ روپے، دس روپے ....." اس کی آواز بہت
دور ہو گئی ہے۔ کل سبھاش پارک میں بنگلہ دیش کی
حمایت اور وہاں ہونے والے ظلم کے خلاف میٹنگ بھی ہوئی
تھی۔ اس میٹنگ کی صدارت ایسی شخصیت کر رہی تھی
جو "دل بدلو" اور ابن الوقت کے نام سے مشہور ہے۔
لوگ بڑی جوشیلی اور پر درد تقریریں کر رہے تھے۔ بنگالی
ڈاکٹر حق نے مائک پر جھولتے ہوئے کہا "ہمارا دیس میں
بھی بہوت برا برا نیتا ہوا لیکن شیخ مجیب الرحمان کا جواب
نئی ہے۔ اس کا مافک نیتا ہونا بہوت مشکل ہے۔
بنگلا دیس جن کر ہی رہے گا۔ سینا کا جو ظلم ہے، نہی چل
سکتا ۔۔۔"

شہر کے سیاسی لیڈر فاروق، جنھوں نے ہائر سکنڈری
میں کئی بار فیل ہو جانے کے بعد یہ سستا پیشہ اختیار کر لیا
ہے، نے بھی لفظوں کے پل بنائے "جب کہیں دھرتی پر
انسانوں کا لہو بہتا ہے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ جب

مکانات نذرِ آتش کئے جاتے ہیں تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے.....“

شہر کے پرانے ایڈوکیٹ وشواس، جو ڈانس پریکٹنگ نیاؤ تقریر کم کرتے ہیں، نے کہا۔ ”مانوتا ہی مانو کا اصل دھرم ہے ہندو ہو یا مسلمان پہلے وہ آدمی ہے تب ہندو یا مسلمان ہے۔ آدمی چاہے جس دیش کا بھی ہو آدمی ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر آدمی آدمی ہونے کے ناطے آپس میں بھائی ہے۔ لہذا جگہ جگہ دیش میں، ہونے والے ظلم کے خلاف ہمیں آواز اٹھانی ہی ہے۔ اور ان کی ہر طرح سے مدد کرنی ہے.....“

آخر میں منفی شخصیت رکھنے والا معمولی اسکول ماسٹر پرکاش مائک پر آیا۔ ”آج جگہ جگہ دیش میں ہونے والے ظلم کے خلاف جگہ جگہ احتجاج ہو رہا ہے۔ لوگوں کا خون کھول رہا ہے۔ تن بدن میں آگ لگ رہی ہے۔ کوئی مانوتا کا درس دے رہا ہے۔ میں یہ پوچھتا ہوں ویتنام میں برسوں سے سلگی ہوئی آگ کے خلاف کتنے جلسے ہوئے ہیں۔ عرب اسرائیل جنگ کی مخالفت میں کتنی نشستیں ہوئیں؟ چھوڑیے دوسرے ملکوں کی بات، آپ کے اپنے ملک میں جو مسائل ابھرے ہیں انھیں حل کرنے کے لئے انھیں سمجھنے کے لئے کیا ہندوستان کے عوام نے اس کے لئے بھی کوئی میٹنگ کی؟ کیا ہم نے اپنی سرکار سے اس کے بارے میں بھی کبھی کچھ پوچھا؟“

”ہیر ہیر!“ مجمع میں سے کسی نے چیخ کر کہا اور چاروں طرف سے تالیاں بجنے لگیں۔

”جانے دیجئے اسے بھی!“ پرکاش کی گرجدار آواز پھر گونجی ”احمد آباد، بنگال، بھیونڈی، علیگڈھ، ہر اشتعال انگیز میں جو فسادات ہوئے ان کے لئے ہم نے کیا کیا؟ یہ فساد جو زہریلی وبا کی طرح پورے ملک میں پھیل رہا ہے، کو روکنے کیلئے ہم نے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے؟ ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں ـــــ یہاں تو ہم روز قتل ہوتے ہیں، روز خون کی ندیاں بہتی ہیں......“

”جیو پرکاش!“ کوئی چیخا اور کسی نے ”پرکاش زندہ باد“ کا نعرہ لگا دیا اور اس کے بعد مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا اور میں اپنے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے سوچ رہا تھا، کون کہتا ہے کہ پرکاش کے ہاتھ میں دماغ کی لکیر نہیں ہے۔

لیکن میں اپنے افسانے کے پلاٹ کے متعلق یہیں تک سوچ سکا تھا کہ شہلا نے مجھے میرے خیالوں کے حصار سے کھینچ لیا

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ وہ میرے سامنے کھڑی ہے اور اس کی اداس آنکھیں میرے چہرے کو تک رہی ہیں

”نہیں تو!“ میں اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہتا ہوں ”یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟“

”آج آپ بغیر مجھے ڈھونڈتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے آئے اور اترا ہوا چہرہ لئے چپ چاپ بیٹھے رہے.....“

”پگلی! آج تو مجھے کتنے دنوں بعد کہانی لکھنے کا موڈ آیا تھا جسے تم نے چوپٹ کر دیا“

”آپ یہ کہہ کر بیٹھتے“

اسکے چہرے کی افسردگی شادابی میں بدل گئی تھی اور آنکھیں ہونٹوں کی دلآویز مسکراہٹ کا ساتھ دینے لگیں ـــــ یہ شہلا میری ہمسفر کی آنکھیں ہی حقیقت ہیں جن میں صرف میرا عکس چھپا ہے کسی فساد کا تصور نہیں، کسی کے خون کی پیاس نہیں ـــــ میں نے سوچا ـــــ...!!

اختر یوسف

میں اک تنہا تنہا سورج
جانے کب سے
اپنا پیلا پیلا ابر ڈھونڈ رہا ہوں
میں نے انتھک جانے کتنے
ریت کے طوفانوں کو روکا
فضا کا بکھرا درپن دیکھا
دھول کی زہری نوک سے پوچھا
کہاں چھپا ہے وہ
میں اک تنہا تنہا سورج
جانے کب سے
اپنا ابر ڈھونڈ رہا ہوں
کون پتہ بتلائے گا
کس کو کس کی آس کی چنتا
آنے والے مر جاتے ہیں
اپنے آنے سے پہلے
ٹوٹم کی آوازوں کے پر
مرگھٹ مرگھٹ گونج رہے ہیں
کہاں سمندر
ریت کے طوفاں
دھول کی زہری نوک کہاں

سب بہلاوے
سپنوں کے سب جالے ہیں
میں اک تنہا تنہا سورج
سمے سے پہلے آیا ہوں
ڈھونڈ رہا ہوں، چاروں اور
اپنا بچھڑا پیلا ابر
پیلا ابر کہاں ملے گا
مرے چاروں اور ہے پھیلا
کبڑا سا آکاش
میلا سا آکاش
میں اک تنہا تنہا سورج
سمے سے پہلے آیا ہوں
کہاں ملے گا وہ
نہیں ملے گا وہ

فلم سادھنا سوہن

لال کنور کی

بے مثال

پیش کش

سمی • راکیش روشن • بھارتی • کبیر بیدی • ابھی بھٹاچاریہ •
چاند عثمانی • راج مہرہ • گوپال سہگل • یشودھرا کاٹجو
• کنچن اور ننھا اداکار • بنٹی

ہدایت کار : سریندر موہن • موسیقی : شنکر جے کشن • عکاسی : کے ایچ کباڈیہ
گیت : گلزار، ورما ملک، اندیور • منظر نامہ اور مکالمے : گلزار • تدوین : نند کار
آرٹ : بنسی چندر گپت

غارِ نور

ذہن کی دیمک زدہ الماریوں سے
فلسفہ، حکمت، ثقافت، ارتقار
تہذیب کے
گندے   نوچ ڈالو

فلسفہ دیوانگی ہے
ارتقا ایٹم کی جولانی کا غصہ
اور تمدن، بربریت کا چمکتا تیز خنجر!

خون پی پی کر بھی جو رہتا ہے پیاسا
غور سے خود میں نہ جھانکو
(تم برہنہ کل بھی تھے)

وہ ——

جو صدیوں کی ردا اوڑھے ہوئے
آندھیوں میں سانس لیتا اک دیا ہے
اس کی نورانی تپش سے روح کی
بے نور آنکھیں جگمگا لو
غار میں اُتری ہوئی
پاکیزہ آیات آج بھی تم کو بلاتی ہیں
سُنو
نزدیک جاؤ

علی الدین نوید
16-3-357
چنچل گوڑہ - حیدرآباد - ۲۴

غزل

تیرے ہی پاس رہ کے تجھے بھول جاؤنگا
اب طے کیا ہے دل کے کہے میں نہ آؤنگا

شیشہ نہیں کہ پتھروں سے بھاگتا پھروں
دل ہوں نظر کی چوٹ سے بھی ٹوٹ جاؤنگا

یوں تو مری حیات تری یاد ہے، مگر
تو دل سے گر کہے تو تجھے بھول جاؤنگا

جب بھی خیال ترکِ تمنا ستائے گا
پانی پہ آڑھی ترچھی لکیریں بناؤنگا

ٹوٹا ہوا ستارہ اگر ہوں تو کیا ہوا
پھر آفتاب بن کے فلک پر میں آؤنگا

جھوٹی سحر کے مجھ کو دلاسے نہ دو نوید!
تاریک رہگزر کا پتہ بھول جاؤں گا

پیکر حیدرآباد ۱۴

عرس کا ساتواں دن ـــــ لوگ باگ سات دن سے لگائے ہوئے اپنے ڈیرے بغل میں دبائے گھروں کو جا رہے ہیں۔ اسی گھروں کو واپس جاتی سڑک پر اور بہت ساری دکانوں کے بیچ رحمٰن اپنی چھوٹی سی دکان پر چپ چاپ بیٹھا ہے ـــــ جانے اس کی بکری آج کیوں نہیں ہو رہی ـــــ سڑک کے چلتے لوگ یوں تو اس کی دکان پر آ کر رکتے ہیں۔ مال دیکھتے ہیں۔ الٹ پلٹ کرتے ہیں۔ دام پوچھتے ہیں اور بتائے گئے دام سے یکدم آدھے میں مانگنے لگتے ہیں جو "دام رحمٰن کو گھر میں بھی نہیں پڑتا"! رحمٰن دکان کی چیزیں صاف کرتا ہے اور کریم کی دکان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا ہے جہاں دھڑلے سے بکری چل رہی ہے

آج جانے کس کا منہ دیکھ لیا۔ ورنہ روز ہی اچھی خاصی بکری ہو جاتی تھی۔ آج اتنی دیر ہوئی دکان سجائے اور کوئی نہ آیا ـــــ وہ ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا ـــــ کہ اتنے میں عورتوں کا ریوڑ سا آیا اور اسی کی دکان پر آ کر جم گیا ـــــ ریوڑ میں بہت سارے بچے پیدل تھے اور کچھ ماؤں کی گود میں ـــــ چار چھ جوان لڑکیاں

بھر بھر کے دوپٹے اوڑھے ہوئے ـــــ [illegible]
گھسا کر بیچ گھروں تالی دادی نے ڈانٹ پلائی ـــــ

رحمٰن کی دکان اُن ساری عورتوں میں چھپ سی گئی وہ عورتیں اور لڑکیاں طرح طرح کی گھریلو چیزیں اٹھانے لگیں اور باتیں ـــــ

"عائشہ تو یہ پاؤڈر لے لے" "نہیں یہ لپ اسٹک لے لے"

"اماں اماں وہ دیکھو ـــــ جھمکے کتنے اچھے ہیں میں تو وہی لوں گی" "اماں میں تو وہ موٹر لوں گا۔ ہاں ـــــ"

"ہائے اللہ بچے پاگل بنا دیں گے یہ سب" گروپ کی کھیا نے کہا اور ہاتھوں میں دھرے خیفنی کے پوڈرے کو بے خلاف میں لپیٹ لیا۔ ایک لڑکی نے بیچ سے پان کی پیک تھوکی

"بھیا یہ لپ اسٹک کتنے کی ہے"

"دو روپے کی"

"ایک روپیہ میں دے دو"

"نہیں"

"اور یہ چھلّی"

"ڈیڑھ روپے کی"

"اُدھر تو ایک روپے میں ملتی ہے"

"کدھر"

"ہمارے گھر کی طرف"

"نہیں جی ......"

"ملتی ہے نا ـــــ کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں"

ـــــ وہ سب اٹھنے لگیں اور کھڑی ہو کر اپنے کپڑے جھاڑے کہ بس اب رکیں گی نہیں اور چل دیں گی۔ کبھی

سید احمد شمیم
۲۳ عام باگان، ساکچی، جمشید پور

دو شمسی آنکھیں

یہ سچ ہے
ہماری تمہاری نگاہیں
بہت مختلف ہیں:

مجھے یہ خبر ہے—،
سسکتے ستاروں کی اس انجمن میں
تمہیں اک
چمکتا ہوا چاند سمجھا گیا ہے:
مگر میری آنکھیں
تحیر زدہ ہو سکی ہیں—،
نہ ہوں گی؛
کہ یہ تو
کئی نخشبی ماہتابوں
کے انجام سے آشنا ہیں—!

ہماری نگاہوں میں
پھیلا ہوا
یہ سمندر بھی
چھوٹا نہیں ہے:

تمہارے لئے
تنگ و تاریک سا
یہ کنواں بھی
سمندر سے کچھ کم نہیں ہے:

اسی میں سدا
ٹرٹراتے رہے ہو
اسی میں سدا
ٹرٹراتے رہوگے—!!

پیکر حیدرآباد ۴۴

میں اکیلا گناہ گار ہوں
میرے چاروں طرف حصار ہوں
سارے چہروں کی مٹ گئی پہچان
بھر گیا آنکھ میں غبار ہوں
چوٹ پتھر پہ بیٹھتی ہی نہیں
اور جل اٹھتا ہے شرار ہوں
آگ اس کے بھی دل میں روشن ہے
میں اکیلا نہیں شکار ہوں
سرد پڑنے لگا بدن سارا
پھر بھی اترا نہیں بخار ہوں
کیسی رت آگئی خدا جانے
پیڑ پودوں پہ ہے بہار ہوں

عبدالرحیم نشتر
معرفت غنی بنگل اسٹور۔ انصاری وارڈ۔ بھنڈارا

کالے شبدوں میں گھٹتی ہوئی روشنی مر گئی
تشنگی کا سمندر نہ جانے کہاں کھو گیا

سر برہنہ ہوائیں.....
درختوں میں جانے کہاں چھپ گئیں
دھوپ کو جتنے سائے ملے کھا گئی

پھر اس کو اکیلا کہیں چھوڑ کر
رات کالا کفن اوڑھ کر سو گئی

شاہد عزیز
بھوگھاٹی، اودے پور

موجودہ دور میں جب کہ ممتاز ماہرین طبعیات خلا میں سفر کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ سائنس کے دوسرے میدانوں میں کام کرنے والے ممتاز سائنسداں یہ معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ زمین پر پرندے کس طرح دور دراز مقامات کا سفر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ بحر آرکٹک کا پرندہ ٹرن جو قطب شمالی میں پیدا ہوتا ہے کس طرح ۶ ہفتے کی عمر میں اپنے وطن سے روانہ ہو کر گیارہ ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے انٹارٹیکا کے برفانی علاقہ میں پہنچتا ہے اور وہاں موسم سرما گذارنے کے لیے اپنے آبائی وطن کو لوٹ آتا ہے یہ بات معجزہ سے کم نہیں کہ اس کے پروں میں اتنی طویل پرواز کی قوت پائی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کس طرح اس کے چھوٹے سے دماغ نے پرواز میں پیش آنے والے ان مسائل کو حل کر لیا جو نسلِ انسانی کے راستہ میں ہزارہا سال تک رکاوٹ بنے رہے تھے۔

سمجھا جاتا ہے کہ قطب نما کی ایجاد ۱۲ ویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس کے کوئی ۳۰۰ سال بعد کولمبس نے بحر اٹلانٹک کو عبور کیا۔ لیکن پرندے کوئی دس لاکھ سال قبل ہی بڑے اعتماد کے ساتھ سارے کرۂ ارض کا سفر کرتے رہے ہیں۔ میں نوع انسانی کی تحقیر تو نہیں کرنا چاہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم سفر کے معاملہ میں بڑے سست رہے ہیں۔ اب بھی مکمل طور پر یہ نہیں سمجھ پائے ہیں کہ پرندے اتنے طویل سفر کس طرح کرتے ہیں۔

یونانی فلسفی ارسطو نے دیکھا کہ موسم سرما میں رابن نام کے پرندے غائب ہو جاتے ہیں لیکن ریڈ اسٹارٹ نام کے پرندے موجود رہتے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ موسم خزاں میں رابن، ریڈ اسٹارٹ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور موسمِ بہار میں پھر رابن بن جاتے ہیں۔ رومن فلسفی پلینی نے اس خیال کی تصدیق کی اور روم میں یہ خیال عام ہو گیا کہ SWALLOWS نامی پرندے مینڈکوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے احمقانہ خیالات اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ بیشتر پرندے خاص طور پر وہ جو چھوٹے ہوں رات کے وقت نقل مقام کرتے ہیں۔ وہ کسی مقام پر شام تک تو دکھائی دیتے ہیں لیکن دوسرے دن صبح میں نظر نہیں آتے۔ ہر شخص

[illegible] کرتے اس وقت اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔

۱۸ ویں صدی عیسوی میں ماہرین طیور Orni-thologists کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ پرندے رات میں بھی پرواز کرتے ہیں اور بڑی تعداد میں پرواز کرتے ہیں۔ اس دریافت نے سائنسدانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ پرندوں کے نقل مقام سے تعلق رکھنے والے مسئلہ پر غور کریں۔

اس مسئلہ سے قریبی تعلق رکھنے والا ایک اور مسئلہ پرندوں کی طویل سفر کرنے کے بعد اپنے "گھر لوٹ آنے کی جبلت" ہے۔ پرندوں کی اس تعویشی خصوصیت سے انسان حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے واقف ہے۔ طویل فاصلہ تک سفر کرنے کے بعد اپنے گھر لوٹ آنے کا بین الاقوامی ریکارڈ غالباً گیانکس شیر واٹر نامی ایک چھوٹی سی بحری چڑیا نے قائم کیا ہے۔ یہ چڑیاں ویلز کی ساحلی چٹانوں میں بنی ہوئی دراڑوں کے اندر بہت بڑی تعداد میں رہتی ہیں۔ ان میں سے ایک چڑیا کو پکڑ کر ہوائی جہاز کے ذریعہ امریکے ایک مقام بوسٹن لیا گیا اور وہاں اسے ۳ جون ۱۹۵۲ء کو آزاد کیا گیا۔ وہ چڑیا تین ہزار پچاس میل چوڑے سمندر کو عبور کر کے کوئی ۱۲ دن بعد ۱۶ جون کو ٹھیک ڈیڑھ بجے اس چٹان کی اسی دراڑ میں داخل ہوئی جہاں سے اسے پکڑا گیا تھا۔

گو کہ گذشتہ ایک صدی سے اس طرح کے حقائق کو یکجا کیا جاتا رہا ہے لیکن ۱۴ یا ۱۵ سال سے ہی یہ جاننے کی باقاعدہ کوشش کی جا رہی ہے کہ چڑیاں یہ کام کس طرح انجام دیتی ہیں۔ وہ اپنا راستہ کس طرح معلوم کرتی ہیں؟ کیا قطب تارہ کی مدد سے؟ یا سورج کی مدد سے؟ یا پھر چاند کے ذریعہ؟ یا ہواؤں یا آب و ہوا یا پھر زمین کے مقناطیسی اثر کی مدد سے؟ آخر وہ اپنی پرواز کی سمت کا تعین کس طرح کرتی ہیں؟

پرندوں کے اس طویل سفر کی گتھی کو حقیقی معنوں میں سلجھانے کی جانب سب سے پہلا قدم گستاو کریمر نے

م۔ ع باسط

۴۳ - فلٹر کالونی - جالنہ (اورنگ آباد)

پیکر حیدرآباد ۷۴

ایک جرمن ماہر طیور نے اٹھایا۔ اس نے اس عام خیال کی صحت کی آزمائش کرنے کیلئے کہ پرندے سفر کے دوران سورج کی مدد سے اپنے راستے کا تعین کرتے ہیں ایک طریقہ نکالا۔ یہ دیکھ کر کہ جب نقل مقام کرنے کا زمانہ آتا ہے تو پنجرے میں بند پرندے بے چین ہو کر پنجرے کے اندر چاروں طرف چکر کاٹنے لگتے ہیں۔ اس نے پنجرے میں بند چند چھوٹے پرندوں کو ایک ایسی گول عمارت کے اندر بند کر دیا جس میں چند کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور ان کھڑکیوں میں سے آسمان صاف طور پر دکھائی دیتا تھا

پھر اس نے اس بات کا ریکارڈ رکھا کہ مختلف اوقات میں پرندے کس سمت میں رخ کئے رہتے ہیں اور یہ پتہ لگایا کہ وہ اپنا رخ ہمیشہ اس مقام کی سمت رکھتے ہیں جہاں پر کہ وہ منتقل ہونا چاہتے ہیں۔ جب اس نے کھڑکیوں کو تاریک کر دیا تو پرندے اپنی سمت کھو بیٹھے اور چاروں طرف چکر کاٹنے لگے۔ تب اس نے سورج کی نقل کے طور پر ایک مصنوعی روشنی کا انتظام کیا لیکن اس مصنوعی سورج کو اس نے غلط اوقات میں اور غلط مقامات پر طلوع اور غروب کیا۔ پرندوں نے ایک بار پھر نقل مقام کرنے کیلئے اپنا رخ مخصوص سمت میں کیا لیکن انھوں نے جو سمت اختیار کی وہ اس مصنوعی سورج کے مقام کی مناسبت سے تھی۔ اس طرح اس نے "سورج کی مدد سے سمت کے تعین" کے نظریہ کی صحت کا ایک ٹھوس ثبوت فراہم کیا اور اس گتھی کو سلجھائے بغیر جوں کا توں چھوڑ دیا کہ کوئی پرندہ سفر میں سورج کی مدد سے اپنی سمت کا تعین دن کے علاوہ رات کے وقت بھی اور اچھے موسم کے علاوہ خراب موسم میں

بھی کس طرح کر سکتا ہے؟

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دن کے مختلف اوقات میں سال کے مختلف حصوں میں اور سفر کی ہر نئی منزل میں سورج کا مقام بدلتا رہتا ہے تو یہ معمہ کہ پرندے اپنی سمت کے تعین کیلئے سورج سے کس طرح مدد لیتے ہیں اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں سمت کے تعین کیلئے یہ ضروری ہے کہ پرندوں میں وقت کا بالکل صحیح اندازہ لگانے کا مادہ بھی موجود ہو۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ماہر حیاتیات پروفیسر جی۔ وی۔ ٹی۔ میتھیوس نے بتایا کہ پرواز کے دوران سورج کی مدد سے سفر کی سمت کا تعین کرنے میں پرندوں کو کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو تجربے کئے ان میں ریاضی کے کچھ ایسے پیچیدہ مسائل شامل ہیں کہ آپ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب تک ان پرندوں کے پروں پر الیکٹرونک کمپیوٹر نہ ہوں اس وقت تک وہ اپنے سفر کی سمت کا صحیح طور پر تعین نہیں کر سکتے۔ لیکن پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ نقل مقام کرنے اور پھر اپنے اصلی مقام پر واپس آجانے کی صلاحیت رکھنے والے پرندوں میں صحیح سمت کا تعین کرنے کی صلاحیت بھی جبلی طور پر پائی جاتی ہے۔

لیکن جب انھوں نے ۱۹۵۵ء میں مختلف تجربوں اور مشاہدوں سے حاصل ہونے والے نتائج یکجا کئے تو وہ اس ایک بات کی تشفی بخش طور پر وضاحت نہ کر سکے کہ سورج

[illegible] کے لیے [illegible] کہ نقل مقام کس طرح منظم ہو سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پرندے رات کے بجائے دن کی چمک سمت کا تعین سورج کی مدد سے دن کے وقت کر لیتے ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے اس تعین کردہ سمت کو رات کی تاریکی میں بھی کسی حد تک چاند اور ستاروں کی مدد سے برقرار رکھتے ہیں۔

فرائبرگ یونیورسٹی کے جرمن ماہر طیوریات ایف ساویر کو یہ مبہم سا خیال مطمئن نہ کر سکا۔ موصوف کو وار بلر نامی چھوٹی چڑیوں سے جو زیادہ تر رات کے وقت طویل فاصلوں تک پرواز کرتی ہیں بے حد دلچسپی ہے۔ ساویر نے کئی دنوں تک مسلسل تجربے کئے۔ پرندوں کے نقل مقام کرنے کے موسم کے دوران اس نے پنجرے میں بند کئی وار بلر چڑیوں کو ایسے مقام پر رکھا جہاں سے انھیں ستاروں بھرا آسمان صاف طور پر نظر آتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ رات میں آسمان پر نظر پڑتے ہی وہ چڑیاں اِدھر اُدھر اڑنے لگیں اور ان میں سے ہر ایک نے اپنا رخ قطب نما کی سوئی کی طرح اس مقام کی طرف کر لیا جہاں وہ نقل مقام کر کے جایا کرتی تھیں۔ جب بھی اس نے پنجرے کو گھما کر ان چڑیوں کے رخ کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ اسی سابقہ سمت میں اپنا رخ پھیر لیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر ساویر نے ان وار بلر چڑیوں کو مصنوعی آسمان (Planetarium) کے نیچے بند کر دیا۔ یہ مصنوعی آسمان گنبد کی شکل کا اور ستاروں بھرے آسمان کا ہو بہو نقل ہوتا ہے ــــــ ایک بار پھر ان پرندوں نے اپنا رخ افریقہ کے اس مقام کی سمت میں پھیر دیا جہاں وہ نقل مقام کر کے موسم سرما گزارا کرتے ہیں۔ اور جب اس گنبد کو اس طرح گھمایا گیا کہ وہ ستارے ہٹ کر غلط مقامات پر چلے گئے تو ان پرندوں نے بھی غلط سمت میں اپنا رخ پھیر دیا۔

ڈاکٹر ساویر کہتے ہیں کہ جب ہجرت کا موسم آتا ہے تو وار بلر نامی چھوٹے چھوٹے پرندے جن کا وزن مشکل سے ایک اونس کا تیسرا حصہ ہوتا ہے کسی رات اس ناقابل یقین حد تک طویل سفر پر پرواز ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی سے بھی اس طویل پرواز کی تربیت حاصل کئے بغیر اور یکہ و تنہا جنوب افریقہ میں اپنی منزل مقصود کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ وہ اپنا یہ سفر ستاروں کی رہنمائی میں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ساویر کے یہاں سفید گلے کی چھوٹی سی وار بلر چڑیا تھی جس کا نام انھوں نے جانی رکھا تھا۔ سفید گلے کی چھوٹی وار بلر چڑیاں جرمنی سے روانہ ہوتی ہیں اور جنوب مشرق کی سمت سفر کر کے بالکن کے پہاڑی سلسلے کو عبور کرتی ہیں پھر جنوب کی طرف مڑ جاتی ہیں اور دریائے نیل کے ساتھ ساتھ پرواز کرتی ہوئی مرکزی افریقہ میں اپنے سرمائی مقام پر جا پہنچتی ہیں۔ جانی کو اس سفر کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ پنجرے میں پیدا ہوئی تھی اور اپنی ساری زندگی اسی میں گزار دی تھی۔ لیکن جب نقل مقام کرنے کا موسم آیا اور اس کے پنجرے کو ایک مصنوعی آسمان کے نیچے جو جرمنی کے تاروں بھرے آسمان کی نقل تھا

رکھ دیا گیا تو اس نے جنوب مشرق کی سمت جو اس کا فرضی
کی دوسری چڑیوں کی پرواز کی سمت ہے اپنا رخ پھیر لیا۔
اس کے علاوہ جیسے جیسے اس مصنوعی آسمان کو اس طرح
گھمایا گیا کہ اس کی شکل اس آسمان کی سی ہو گئی جو اس
نوع کی چڑیوں سفر کے راستے میں نظر آتا ہے تو اس نے
پہلے تو رفتہ رفتہ اپنا رخ جنوب کی سمت پھیرا پھر جب دریا
نیل کے علاقے میں دکھائی دینے والا آسمان اسے نظر آیا
تو اس نے اپنا رخ اسی مناسبت سے تبدیل کر لیا۔ ڈاکٹر
ساویر نے جانچ کی مدد سے ثابت کر دیا کہ واربلر چڑیاں نہ
صرف سورج کی بلکہ ستاروں کی رہنمائی میں بھی سفر کرتی ہیں

جب کہر یا گھنگھور گھٹائیں سورج اور ستاروں کو چھپا دیتی
ہیں تو نقل مقام کرنے والے پرندے اپنی پرواز کو جاری
نہیں رکھ سکتے تب وہ بے بسی کے عالم میں ادھر ادھر
بھٹکتے رہتے ہیں اور بعض اوقات لائٹ ہاؤسوں کی
روشنیوں کی طرف لپک پڑتے ہیں۔

یہ بات ایک معمہ بنی ہوئی ہے کہ پرندے اس طرح کی پیچیدہ
جبلتوں کو کس طرح وراثتاً حاصل کر سکتے ہیں۔ پروفیسر
میتھیوس کے الفاظ میں "یہ علم حیاتیات کا پیچیدہ ترین
معمہ ہے" ان کا کہنا ہے کہ سائنس کے اس میدان میں
تحقیقات اور تجربات ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ ڈاکٹر
ساویر کا ارادہ ہے کہ مصنوعی آسمان سے یکے بعد دیگرے
مختلف مجموعہ ہائے ستارگان کو ہٹا کر یہ دیکھیں کہ وہ کون سے
ستارے ہیں جو واربلر پرندوں کو نقل مقام کرنے میں مدد
دیتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ صرف قطب تارے کی مدد سے
[illegible]

ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس سلسلے میں مزید [illegible]
معلومات حاصل ہوں۔ لیکن ماہرین [illegible] گذشتہ چند
سال سے پرندوں کے نقل مقام کے سلسلے میں تحقیقات
میں مصروف ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ نقل مقام کرنے
والے پرندوں کے دماغ میں کوئی ایسا انتظام پایا جاتا ہے
جس کی وجہ سے یہ پرندے آسمانی روشنیوں کی مدد سے
اپنے راستے کا تعین کر سکتے ہیں۔ ■■

غزلیں

تو اگر ہاتھ بڑھا دے مرے ہاتھوں کی طرف
میں اندھیروں سے چلا آؤں اجالوں کی طرف

کچھ اندھیرا سا نظر آیا اجالوں کی طرف
دیکھ کر آپ کو دیکھا تھا چراغوں کی طرف

ہر کشش گھر میں ہے موجود مگر کیا کہیئے
کوئی شے کھینچے لئے جاتی ہے سڑکوں کی طرف

ٹوٹتے آئے تھے اب تک تو فلک سے تارے
اب زمیں ٹوٹ کے جاتی ہے خلاؤں کی طرف

عیش و عشرت میں بھلا دیں نہ پرانے رشتے
دشت گھبرا کے چلے دشت نوردوں کی طرف

گردشِ وقت سے کچھ لوگ بچے ہیں، ورنہ
دیکھنے والا بھی ملتا نہ حسینوں کی طرف

ختم ہوتا ہے سفر دیکھئے کب تک یہ سلیم
چلتے جاتے ہیں ہم انجان سی راہوں کی طرف

وہ جو دن بھر چلا تھا گام بہ گام
چھوڑ کر چل دیا بہ وقتِ شام

آپ جانیں مجھے تو ہوش نہیں
کون کس کے لئے ہوا بدنام

التفاتِ نظر تو عیب نہیں
ہو اگر امتیازِ خاص و عام

میری بربادیاں ہیں میرے سر
لوگ کیوں لے رہے ہیں تیرا نام

پھر پکڑ لینا دامنِ تقدیر
اور ہو جائے کوششِ ناکام

دوستی اور دشمنی میں سلیم
ہے اک آغاز اور ایک انجام

سلیم صدیقی
حسنی منزل، پیٹھا روڈ، دیراس (بہار)

دیپا کو سسرال آئے ہوئے آج ساتواں دن تھا لیکن ابھی تک پتی دیو کے درشن نہیں ہوئے تھے شادی کی رسموں کے درمیان دیپا کی بھیگی ہوئی نظریں کئی بار گریش کے بھرے بھرے، باریک مونچھوں والے چہرے سے ٹکرائی تھیں لیکن اس کے بعد......!

دیپا کھلی ہوئی صاف ستھری چھت کی منڈیر پر اکیلی بیٹھی تھی۔ ڈھلتے سورج کی زرد کرنیں چھت سے ملی ہوئی شرقی دیوار پر مدھم سا پڑ رہی تھیں۔ گہرے نیلے آسمان پر جگہ جگہ بادلوں کے رنگین ٹکڑے تیر رہے تھے۔ شمال مغرب میں گہرے سرمئی رنگ کے بادلوں کے درمیان گہرے نارنجی رنگ کے چمکدار بادل آگ اور دھوئیں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ دیپا دیر سے انھیں بادلوں کو گھور رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اس کی سنہری ساری پر مسلسل لہریں بنا رہے تھے۔ اس کے ماتھے پر سہاگ کی بندیا چمک رہی تھی۔

دیپا بھری سسرال میں اکیلی تھی۔ جن لوگوں کیلئے وہ اپنا گھر بار، اپنے رشتہ دار، اپنا سب کچھ چھوڑ کر چلی آئی تھی ان کا رویہ اس کے ساتھ کچھ عجیب سا تھا پچھلے سات دنوں میں اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی حیثیت اس گھر میں بن بلائے مہمان کی سی ہے۔ حالانکہ وہ گریش کے ساتھ بھاگ کر نہیں آئی تھی۔ گریش کے ماں باپ اور دوسرے عزیز اسے شان سے بیاہ کر لائے تھے۔ مگر اس کے بعد......!

شادی کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ باہر کے سب مہمان چلے گئے تھے۔ دیپا کی دونوں بڑی نندیں بھی اپنے بچوں کی رجھنٹ کو لے کر اپنی اپنی سسرال چلی گئی تھیں۔ اب گھر میں دیپا کے ساس سسر تھے، گریش تھا، اور گریش کا چھوٹا بھائی موہت تھا۔ گریش نے پھیروں کے بعد سے اب تک دیپا کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ گریش کے ماں باپ بہو کے سر پر بڑے پن کا ہاتھ رکھنے کے بعد لاتعلق ہو گئے تھے۔ بس ایک موہت ایسا تھا جس نے دیپک سے سیدھے منہ بات کی تھی۔

صفیہ سلطانہ
توسط قاری عبدالخالق محلہ شیرازاں
سہارن پور۔ یوپی

سہاگن

موہت شکل صورت میں اپنے بھائی سے بہت ملتا تھا
بس رنگ ذرا سانولا تھا اور اس کے چہرے پر مونچھیں
نہیں تھیں۔ وہ بی۔ ایس۔ سی میں پڑھ رہا تھا۔

دیپا کو سب سے زیادہ شکایت گریش سے تھی جس نے
اسے شہر بدر کرانے کے بعد اس جنگل میں لا کر قید کر دیا
تھا۔ ایک گھر میں رہنے کے باوجود وہ دیپا سے میلوں
دور تھا۔ اس نے دیپا سے بات تک کرنی گوارا نہیں
کی تھی۔ بیوی نہ سہی مہمان ہی سمجھ کر وہ رسمی خیریت
تو پوچھ سکتا تھا۔ دیپا کے کمرے کے برابر والا کمرہ
گریش ہی کا تھا۔ وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور
اپنے کمرے میں جا کر سو جاتا تھا۔ دیپا سانس روکے
اس کے قدموں کی آہٹ اور کپڑے تبدیل کرنے کی
سرسراہٹ محسوس کرتی۔ چھت کے قریب بنے روشن
دان کے شیشوں میں روشنی کی جگمگاہٹ دیکھتی۔ پھر وہ
مانوس آہٹیں اور نیلی روشنی گہرے اندھیرے میں
ڈوب جاتیں۔ دیپا دیر تک اپنے اور گریش کے درمیان
اس عجیب و غریب دیوار کے بارے میں سوچتی رہتی پھر
تھک کر سو جاتی۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ کل
دیپا کو لینے اس کے بڑے بھیا آنے والے تھے اور دیپا
سوچ رہی تھی "یہاں سے جانے سے پہلے ایک بار
گریش سے ملنا ضروری ہے۔ جیسے بھی ہو گا میں آج
ہی گریش سے ملوں گی۔ اس سے کم از کم یہ تو پوچھوں گی
کہ.....کہ....؟....زینے پر قدموں کی
آہٹ سن کر اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ پڑوس
کی دو تین چھوٹی چھوٹی لڑکیاں نئی دلہن کو دیکھنے کے
شوق میں اوپر چلی آئی تھیں۔ سورج پر گہرا بادل آ گیا
تھا۔ اب سارے آسمان پر بادلوں کے سفید ٹکڑے
سے بکھرے نظر آ رہے تھے۔ دیپا کچھ دیر لڑکیوں
سے باتیں کرتی رہی پھر زینہ اتر کر نیچے چلی آئی۔

گریش کے کمرے سے ہلکے سروں میں ریڈیو بجنے کی
آواز آ رہی تھی۔ ماں جی کچن میں تھیں اور کوئی بھی گھر
میں نظر نہ آ رہا تھا۔ دیپا نے گریش کے کمرے میں جھانکا
گریش بستر پر الٹا لیٹا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔
دیپا ہمت کر کے اندر چلی گئی۔ آہٹ سن کر گریش بہت

زور سے چونک گیا۔ دیپا کو کمرے میں دیکھ کر وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کتاب جلدی سے تکیے کے نیچے چھپا دی۔ دیپا اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی لگاتار اسے دیکھ رہی تھی۔

گریش نے ذرا سنبھل کر پوچھا "تم یہاں کیوں چلی آئیں؟"

"تم سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔۔۔۔"

"کیا۔۔۔؟"

"تم نے مجھے کس جرم کے بدلے میں۔۔۔۔۔۔ شادی کی سزا دی ہے؟"

گریش خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا

"میں اپنے سوال کا جواب چاہتی ہوں۔۔۔۔؟"

"تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ کوئی دیکھے گا تو کیا ہوگا؟"

دیپا ہنس پڑی پھر بولی۔ "میں بھاگ کر تو یہاں نہیں آئی ہوں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ یہاں سے چلی جاؤ۔"

"یہی تو پوچھنا چاہتی ہوں کہ آخر کیوں چلی جاؤں؟"

"اچھی بات ہے۔ تم نہ جاؤ میں ہی جا رہا ہوں۔" گریش نے چپل پہنی اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

دیپا حیران سی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ میں اس کے جہیز کی مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مسہری پر چادر اور تکیہ بھی جہیز کا ہی تھا۔ یہ سیٹ بہت خوبصورت تھا۔ دیپا نے کئی مہینوں میں بہت محنت سے تیار کیا تھا۔ تکیے کے نیچے سے کتاب کا ذرا سا کونہ نکلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دیپا نے کچھ سوچ کر کتاب

یہ ہو ہو پر باتصویر کتاب تھی۔ دیپا نے [illegible] پہلی پوزیشن میں رکھ دی ریڈیو کا سوئچ آف کیا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

رات کو حسب معمول برابر والے کمرے میں آہٹیں جاگیں کچھ دیر کیلئے روشن دان کے نیلے شیشے جگمگائے اور اندھیرا ہو گیا۔ دیپا کو اندھیرے سے دہشت ہونے لگی۔ اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا اور ایک فلمی رسالے کی تصویریں دیکھنے لگی۔

اچانک دروازے پر بھاری قدموں کی آہٹ سن کر وہ چونک گئی۔ اس نے لیمپ کے شیڈ کے دھندلے اندھیرے میں دیکھا گریش دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ دیپا نے رسالہ ٹیبل پر رکھ دیا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شام کی بات کا یہ رد عمل ہوگا۔ دیپا کے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں تھیں لیکن اس کا سارا جسم گریش کو قریب آتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ گریش اطمینان سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"بھابی۔۔۔۔!" دیپا کے کانوں کے قریب دھیمی سی آواز گونجی۔ دیپا زور سے اچھل پڑی۔ اس کے قریب گریش کی بجائے موہن بیٹھا تھا۔ لیمپ کی بھرپور روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

دیپا نے پیچھے سرکتے ہوئے کہا "موہن۔۔۔۔ تم!! ۔۔۔۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

موہت ہنس پڑا پھر بولا۔ "بھیا یہاں آتے تو کیا تم ان سے بھی یہی سوال کرتیں؟"

دیپا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے کہا۔ "بے کار باتیں مت کرو۔ یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔"

موہت نے ایک بھرپور نگاہ دیپا پر ڈالی پھر بولا "میں تو بہت کام کی باتیں کرنے آیا ہوں۔" ذرا رک کر پھر وہ بولا۔ "اچھا بھابی یہ بتاؤ تم نے مہابھارت پڑھی ہے؟"

"ہاں پڑھی ہے...." دیپا نے کچھ الجھتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تو تم نے یہ بھی پڑھا ہوگا کہ دروپدی کو ارجن بیاہ کر لائے تھے لیکن ارجن سمیت پانچوں بھائی دروپدی کے شوہر تھے..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"ہاں......"

"یہاں تو صرف دو بھائی ہیں۔ پھر بھیا تو برائے نام ہی تمہارے شوہر ہوں گے۔ صرف میں ہی صحیح معنوں میں تمہاری قدر کر سکتا ہوں۔"

"کیا بکتے ہو..... تمہیں شرم نہیں آتی؟" دیپا نے غصہ سے کانپ کر کہا۔

"دھرم کی بات میں شرم کیسی؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بھابی۔ بھیا تمہیں ایک پتی کا سکھ کبھی نہیں دے سکتے۔ ان کی طرف سے کسی طرح کی آشا مت رکھنا۔ لیکن میں اس گھر میں تمہیں کوئی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا۔" موہت نے آگے بڑھ کر دیپا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

دیپا نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے گرجی۔ "چھوڑ دو میرا ہاتھ..... بے شرم..... بے غیرت..... نکل جاؤ یہاں سے۔"

روشن دان میں نیلا ابھر کر چمکا لیکن دوسرے ہی لمحہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ موہت بے حیائی سے ہنستے ہوئے بولا۔ "بھابی تم بہت خوبصورت ہو۔ میں تمہاری خاطر زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔ بھگوان کی قسم۔"

دیپا کا الٹا ہاتھ بہت زور سے موہت کے گال پر پڑا۔ وہ مسہری سے کود کر ماں جی کو آوازیں دینے لگی۔ دیپا کی آوازیں سن کر گریش کے ماں باپ دوڑتے ہوئے آئے انھیں دیکھ کر موہت کھڑا ہو گیا لیکن اس کے چہرے پر ندامت کے آثار نہیں تھے۔

دیپا نے ایک ہی سانس میں موہت کی ساری باتیں ساس سسر کے ماں باپ کے سامنے دہرا دیں۔

شکایت سن کر ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا پھر ماں جی بولیں۔

"تمہیں اس طرح شور مچانے کی کیا ضرورت تھی؟ موہت کوئی غیر تو نہیں ہے۔ گریش ہی کا سگا بھائی ہے۔"

دیپا کو حیرانی کے ساتھ ہی سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے امید بھری نگاہوں سے بوڑھے سسر جی کی طرف دیکھا وہ ذرا کھانس کر بولے۔ "اچھی بہو بیٹیاں گھر کی عزت کو اپنی عزت سمجھ کر بنائے رکھتی ہیں اس طرح کے ہنگامے انھیں زیب نہیں دیتے۔"

دیپا سوچنے لگی۔ غیر متوقع حالات کی آندھی سے ٹکرا کر اس نے جس سائبان کے نیچے پناہ لی تھی وہ تو کاغذ کا بنا ہوا تھا۔

پیکر، حیدرآباد

غزلیں

ایم اے شمیم
(شعبۂ اردو)
گورنمنٹ گرلس کالج اجین

جب بھی گہری جھیل میں میں نے جھانکا ہے
مجھ سا کوئی ڈوبتا اور ابھرتا ہے

فکر کے آئینے میں خود کو دیکھا ہے
اپنا چہرہ انجانا سا لگتا ہے

جو کچھ دیکھا — صرف نظر کا دھوکا ہے
دنیا کیا ہے! ایک سراب صحرا ہے

اس سے کیا ہے قد جو اس کا چھوٹا ہے
سایا جھوٹی شہرت کا تو لمبا ہے

جو برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہے
وہ تو میرے بچپن ہی کا سایا ہے

دیکھ کے مجھ کو کس کا ماتھا ٹھنکا ہے
کون مرے حالات پہ پھبتی کستا ہے

چاند جس شاخ پہ اُگتا تھا اُسے توڑ دیا
میں نے اس عہد کی تاریخ کا رخ موڑ دیا

ہر ورق پر مری تصویر نظر آتی ہے
آج یہ کس نے کتابوں کو کھلا چھوڑ دیا

چند دھندلائی سی بوسیدہ سی تحریروں نے
حال کے درد کو ماضی سے ابھی جوڑ دیا

سنگِ مرمر کے شبستاں میں بسی ہیں جب سے
اُن کی یادوں نے یہ بوسیدہ مکاں چھوڑ دیا

اب کئی صدیوں کی کوشش سے جڑوں گا، تم نے
پل میں اک شیشہ کی مانند مجھے توڑ دیا

درد کے شہر میں کچھ زخموں کی آہٹ جو ملی
میں نے بھی دل کے دریچوں کو کھلا چھوڑ دیا

شہزادہ گل ریز
گوٹیا تالاب۔ رام پور۔ یوپی

اک نیا خوف اک ہراس نیا
عریاں تن کو نہ دے لباس نیا
دیکھ اپنائیت کا زہر نہ پی
اور کوئی بگر تپاس نیا
پڑھ ورق بھی کتاب ہستی کے
حاشیے میں کچھ اقتباس نیا
ساغر و مینا کا تقاضا عبث
لے یہ بوتل نئی گلاس نیا
دست بستہ کھڑے ہے سرکار
شہ نشیں سے لگا ہے داس نیا
ورنہ حرفوں کا ڈھیر کر دیجئے
لفظ جو ہے ہمارے پاس نیا

صفدر
اسسٹنٹ ماسٹر اردو ہائی اسکول
پوسٹ آفس بہوڈ (ضلع امراوتی)

نیا
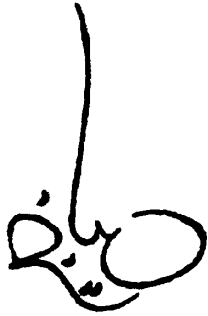
جنون و ہوش کی منطق میں گم تھے فرزانے
بری نگاہ کے فشار کو کون پہچانے
حیات و موت کا وہ راز کھل گیا ہم پہ
جسے نہ آج تک افشا کیا تھا دنیا نے
غم حیات کی مجبوریاں ہی ایسی تھیں
جو عرض حال نہ کر پائے تیرے دیوانے
کمی ضرور ہوتی ہے خلوص میں ورنہ
کوئی سبب نہیں جو تو نہ مجھ کو پہچانے
تمہاری ذات سے منسوب سینکڑوں قصے
ہمارے نام سے وابستہ چند افسانے
بلند و پست کا یہ امتیاز اے گوہر
مری نگاہ سے دیکھے تو کوئی پہچانے

گوہر ندیم
نزد۔ گرین ہوٹل۔ مالیر کوٹلہ

کروشچوف عہد آفریں و عہد ساز شخصیت

مسٹر کروشچوف کے انتقال نے ساری دنیا کو ایک ایسی شخصیت سے محروم کردیا ہے جس نے پر امن مسابقت کے ذریعہ سوویٹ یونین کی نئی تہذیب کی برگزیدگی کا لوہا منوالیا تھا اور بقائے باہم کی پالیسی پر کاربند رہتے ہوئے مختلف سماجی اور معاشی نظاموں کی حامل اقوام عالم کے مابین دوستانہ روابط کی نئی راہیں پیدا کی تھیں۔

مسٹر کروشچوف نے زندگی کا وہ حصہ جسے دور حصول علم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ اپنے گاؤں "کالانوکا" کے ایک متمول زمیندار کی بکریاں چرانے میں گزارا اور بعد میں ایک ٹیٹالرجیکل فیکٹری کے فٹر کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۱۲ء میں جب اس کارخانہ میں ہڑتال ہوئی تو انھوں نے اسے کامیاب اختتام تک پہونچانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۱۸ء میں وہ سرخ فوج میں شامل ہوگئے اور کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت بھی انھیں دی گئی۔ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے مزدوروں کے ایک تربیتی مرکز "رابفاک" سے معاشیات، فلسفہ اور پولیٹکل سائنس میں گریجویشن کی تکمیل کی۔ ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو اسٹالن کے انتقال کے بعد کروشچوف سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے فرسٹ سکریٹری منتخب ہوئے اور مارچ ۱۹۵۸ء میں بلگانن کے وزیر اعظم کے عہدے سے دستبردار ہوجانے کے بعد انھیں ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔ سوویٹ یونین کی اس منکسر المزاج لیکن اصولوں کی پابند شخصیت نے وزیر اعظم بننے سے دو سال قبل ہی سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس میں اسٹالن کی غلطیوں پر بے رحمانہ تنقید کی اور "شخصیت پرستی" کا بت توڑ دیا۔ پچاس ہزار الفاظ پر مشتمل اپنی طویل رپورٹ میں کروشچوف نے صرف ایک مرتبہ اسٹالن کا نام لیا اور انھیں ایک "غیر معمولی حکمراں" کے لقب سے یاد کیا۔ کروشچوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے سوویٹ یونین کی رفتار ترقی کا اندازہ کرتے ہوئے لینن کے "پر امن مسابقت" کے نظریہ کے تحت دنیا کے سب سے بڑے سامراج کا چیلنج قبول کرلیا اور سوویٹ یونین کے دروازے دوسروں کیلئے کھول دیئے تاکہ وہ آئیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ سوویٹ یونین نے سوشلزم کے راستہ پر چلتے ہوئے ہر شعبۂ حیات میں کتنی ترقی کی ہے۔ انھوں نے بڑے ہی وثوق و اعتماد سے سوویٹ یونین میں ایٹمی ہتھیاروں کی مسدودی کا اعلان کیا اور اس وقت کے صدر امریکہ آئزن ہاور کے علاوہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ہیرالڈ میکملن کو بھی مجبور کردیا کہ وہ بھی ایٹمی ہتھیاروں کی مسدودی کا اعلان کریں۔ یہی نہیں بلکہ ۱۹۵۹ء میں کروشچوف نے سوویٹ یونین کے سربراہ کی حیثیت سے امریکہ کا دورہ بھی کیا۔ اور اس دورہ میں اپنی سادگی، کھری صاف گوئی اور انقلابی انسان دوستی کی بنا پر

ایک عام کارکن تصور کیے گئے۔ یکم مئی ۱۹۶۰ء کو سوویٹ یونین
پہلا امریکی جاسوس طیارہ کے دیکھے جانے اور اس کے گرائے
جانے کے بعد امریکہ اور سوویٹ یونین میں سرد جنگ کے ایک
نئے دور کا آغاز ہوا۔ خروشیف نے اس مرحلہ پر ایک سچے
مخالف سامراج اور مخالف سرمایہ داری شخصیت کی حیثیت
سے امریکی نظم و نسق کے سربراہ پر اتنی کڑی نکتہ چینی کی اور
چوٹی کانفرنس میں مئی ۱۹۶۰ء میں پیرس کے ایلیسی پیلیس
میں منعقد ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنا یہ رویہ برقرار رکھا۔ اس
عہد آفریں شخصیت کو اکتوبر ۱۹۶۴ء میں عمر نے ایک ایسی
منزل پر پہنچا دیا کہ وہ وزیراعظم اور پارٹی کی قیادت کی
ذمہ داریوں سے دستبردار ہو گئے اور اس کے بعد مرتے دم
تک انھوں نے اپنی زندگی عام آدمی کی طرح گذاری۔

اومیگا

"آپریشن اومیگا" حال میں قائم کردہ ایک نئی بین الاقوامی
تنظیم ہے جس کا مستقر لندن میں قائم کیا گیا ہے۔ برطانوی
اور امریکی والنٹیرس اس تنظیم کے ارکان میں شامل ہیں۔
اس تنظیم کا قیام برطانیہ کی مخالف جنگ گروہوں کی جانب
سے دو ماہ قبل بنگلہ دیش کے المیہ کے آغاز کے بعد عمل
میں لایا گیا ہے۔ اس تنظیم کی ایک جائنٹ آرگنائزر مسز
ایلین کا ینٹ کے بیان کے بموجب اومیگا کے قیام کا مقصد
یہ ہے کہ پاکستانی افواج نے اپنے ہی شہریوں کو امداد کی
سربراہی روکنے کی خاطر جو مصنوعی، غیر فطری اور ناجائز
سرحد قائم کر رکھی ہے اسے ڈھا دیا جائے۔ اومیگا امن
جماعت کے آٹھ والنٹیرس کی ایک جماعت نے جن میں
چھ کا تعلق برطانیہ سے ہے اور دو کا تعلق امریکہ سے ہے
۸ اگست ۱۹۷۱ء کو اپنی پہلی کامیابی حاصل کی جبکہ وہ
پاکستانی افواج کی بربریت کا شکار ہونے والے مشرقی بنگالی
کیلئے امدادی سرگرمیوں کا آغاز کرنے کے مقصد سے سرحد
کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنگلہ دیش میں داخل ہو گئے
جو جنگ کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ بنگلہ دیش میں
داخل ہونے والے اومیگا کے ان والنٹیرس کی عمریں
۲۳ تا ۴۵ سال کے درمیان ہیں اور یہ مختلف پیشوں سے
وابستہ ہیں۔ ان میں سے اکثر نے اس بین الاقوامی
تنظیم میں شرکت کی خاطر اپنے پیشوں اور کام کو خیرباد کہہ
دیا ہے۔ قائد جماعت کے علاوہ اس گروپ کے دیگر
ارکان مسز جین کروز، مارکس ڈیوران، ڈانلڈو، ڈانیل گرنٹ،
ڈورین پلامینگ، کرسٹین پراٹ اور نرسیرا سپر ہیکلے ہیں۔
انھوں نے اپنے ساتھ ایک شناختی خط بھی رکھا تھا
جس پر دوسروں کے علاوہ مسٹر یوجین مکارتھی اور
لارڈ فینر بروک وے کے دستخط بھی ثبت تھے۔ اومیگا
امن جماعت کے والنٹیرس نے جن میں دو خواتین بھی شامل
ہیں ہند پاک بین الاقوامی سرحد کو اپنی سفید رنگ کی
جیپ گاڑیوں میں بیٹھ کر عبور کیا۔ ان دونوں جیپوں کے
ذریعہ انھوں نے بنگلہ دیش کے مظلوموں اور تشدد زدوں
کی امداد کے مقصد سے [illegible]
۵۰۰ ساڑیاں اور طبی امداد کی اشیاء کی ایک چھوٹی
سی مقدار اپنے ساتھ رکھی تھی۔ ان کی روانگی کے موقع
پر ان کے دوستوں اور گاندھی امن فاونڈیشن کے ارکان
نے انھیں پرجوش طریقہ پر وداع کیا۔ اومیگا جماعت
کے ارکان کے پاس ویزا نہیں تھے اس لئے انھیں
غیر مجاز داخلہ کے الزام کے تحت پاکستانی فوجی حکام

نے گرفتار کرلیا تھا اور ۱۸ گھنٹے تک حراست میں رکھنے کے بعد انھیں ہندوستانی علاقہ میں واپس کردیا گیا۔ اس جماعت کے ارکان پیرالول سے دو جیپ گاڑیوں کے ذریعہ مشرقی بنگال میں داخل ہوئے تھے تاکہ انسانیت کی بنیاد پر کسی بھی سرحد کو عبور کرنے کے انسانی حق کا مظاہرہ کیا جاسکے۔ اومیگا جماعت کے قائد مسٹر موڈی نے اخباری نمائندوں سے بیان کیا ہے کہ ان کی جماعت کی تائید میں اومیگا کی جانب سے لندن میں بھی خصوصاً پاکستانی ہائی کمیشن اور پاکستان انٹرنیشنل ایرویز کے دفاتر کے سامنے مظاہرے کئے جائیں گے۔ اومیگا جماعت کے ارکان گرفتاری یا موت سے نہیں گھبراتے کیوں کہ مسٹر موڈی کے الفاظ میں وہ "عدم تشدد کے سپاہی" ہیں اور وہ اپنے ساتھ کسی مسلح پہرے کو رکھنا پسند نہیں کرتے۔ جاتے ہوئے انھوں نے راستہ پر بنگالی زبان میں لوگوں کو ہینڈبل تقسیم کئے جن میں آپریشن اومیگا کے مقاصد کی وضاحت کی گئی تھی

ڈالر اور ین

ڈالر کے بارے میں حکومت امریکہ کے فیصلہ سے سب سے زیادہ جاپان متاثر ہوا ہے۔ چونکہ جاپان کی ۳۰ فیصد مصنوعات امریکہ کو برآمد ہوتی ہیں۔ اب امریکہ نے درآمدات پر جو ۱۰ فیصد محصول عائد کیا ہے اس کے باعث جاپانی مصنوعات کی برآمدات رک جائیں گی۔

عالمی معاشی ماہرین اور سیاسی مبصرین کی رائے میں صدر نکسن کی معلنہ حالیہ معاشی پالیسی کا بنیادی مقصد جاپانی سکہ ین کی قیمت پر نظرثانی کیلئے جاپان کو مجبور کرنا ہے۔ ڈالر کے استحکام کیلئے حکومت امریکہ کے معلنہ اقدامات اور بیرونی مصنوعات کی درآمد پر دس فیصد محصول عائد کرکے امریکہ، ین کی شرح تبادلہ میں اضافہ کیلئے جاپانی حکومت کو مجبور کرنا چاہتا ہے، دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کے مقابلہ میں ین کی شرح تبادلہ سب سے کم ہے اور اس کے باعث عالمی تجارت میں دوسرے ممالک کے مقابلہ میں اسے ناجائز برتری حاصل ہے۔ ایک امریکی سرکاری عہدیدار کے بیان کے بموجب نکسن نظم ونسق ڈالر کی موجودہ قیمت برقرار رکھنے کو اس کی قیمت میں کمی کرنے کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے کیوں کہ یورپی ممالک کے سکوں کی قیمتوں کے تعلق سے ڈالر کی قیمت میں کمی کے باوجود ین کو پھر بھی قابلِ لحاظ برتری حاصل ہی رہتی۔ امریکہ کے ان فیصلوں کے نتیجہ میں جاپان کے بیرونی زرِ تبادلہ کے اکسچینج میں خرید و فروخت کا کاروبار جس سرعت کے ساتھ جاری ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان ین کی قیمت پر نظرثانی کیلئے مجبور کیا جارہا ہے جس کی کئی ایک جاپانی سیاستدانوں اور کاروباری اشخاص نے سخت مخالفت کی ہے۔ اس تعلق سے جاپان کے کئی ایک اندیشے ہیں۔ اسے ڈر ہے کہ ڈالر کے سونے میں تبدیلی پر امتناع سے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کا نظام تبادلہ بری طرح متاثر ہوگا صدر نکسن کے اس بیان پر جاپان کو شبہ ہے کہ ڈالر کی سونے میں تبدیلی پر پابندی عارضی ہے۔ وہ یاد دلاتا ہے کہ آخر کار امریکہ کو ڈالر کی قیمت میں کمی کرنی پڑے گی جاپان جو امریکی ڈالر کی بڑی حد تک پشت پناہی کرتا ہے

ہے۔ پیٹرول ممالک کی جانب سے کئے جانے والے اقدامات کے تعلق سے بھی اظہار تشویش کیا ہے۔ پیٹرول ممالک بھی ممکن ہے کہ سونے کی قیمت میں اضافہ کا مطالبہ کریں۔ ڈالر کی بہت بڑی حد تک پشت پناہی کرنے کے بعد جاپان اب محسوس کرتا ہے کہ اس کے تمسکات میں کافی کمی واقع ہوئی ہے۔ گزشتہ جولائی تک اس کے سکوں کا ذخیرہ (۷۰۰) ملین ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے برخلاف اس کے سونے کے محفوظ ذخائر صرف (۱۱۴۸) ملین ڈالر کی حد تک ہی تھے، لیکن صدر نکسن نے امریکہ کو درآمدات پر دس فیصد کا جو محصول عائد کیا ہے اس کے باعث جاپان کی معیشت پر زیادہ مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ جاپانی مصنوعات کی (۳۰) فیصد برآمدات امریکہ کو ہوتی ہیں۔ جاپان سے امریکہ کو برآمد کی جانے والی اشیاء میں پارچہ، موٹریں اور الکٹرانکس کا سامان شامل ہیں۔ درآمدات پر جو محصول عائد کیا گیا ہے اس کے باعث جنوب مشرقی ایشیاء کے بیشتر ممالک متاثر ہوں گے جن میں جاپان سرفہرست ہوگا۔

حال ہی میں جاپان کی الکٹرانکس، آٹو موبائل، فولاد اور برقی سامان کے تیار کنندگان نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۹۷۲ء سے امریکی مارکٹ میں ان کے سامان کی برآمدی قیمتوں میں (۱۰) فیصد اضافہ کیا جائے مگر اب انھیں اس فیصلہ کو ملتوی کرنا پڑے گا بلکہ جاپان کو اپنے ملک کی مارکٹوں کے تحفظ کی خاطر بیرونی مصنوعات کی درآمد پر محصولات عاید کرنے پڑیں گے

تلنگانہ اور پرجا سمیتی

۱۸ ستمبر کی قرارداد انضمام کے ساتھ جسے تلنگانہ پرجا سمیتی کی ریاستی کونسل نے متفقہ طور پر منظور کرلیا۔ تلنگانہ پرجا سمیتی اور علیحدہ تلنگانہ کی تحریک کا دو سالہ مطالبہ عملاً ختم ہوگیا ہے ویسے اس قرارداد میں علیحدہ تلنگانہ سے دستبرداری نہیں اختیار کی گئی ہے بلکہ شکایتوں کے جائزہ لینے، اور اس کی عمل آوری کی جانچ وزیراعظم اندرا گاندھی پر چھوڑی گئی ہے۔

۱۹۶۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے ایک گروپ کی جانب سے تلنگانہ تحفظات کیلئے شروع کئے جانے والے اس ایجی ٹیشن کی کامیاب قیادت اور مطالبات کو اہمیت دینے اور منوانے کے تمام نئے طریقوں سے کامیابی کے ذریعہ عہدہ برآ ہونے کا سہرا ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کے سر ہے۔

۱۹۶۹ء میں تلنگانہ تحفظات کے مطالبہ کے ساتھ ہی طلباء کے ایک دوسرے گروپ نے علیحدہ تلنگانہ ریاست کا مطالبہ کیا۔ اخبار نویسوں کے ایک گروپ نے چند افراد کے ساتھ جن کی جملہ تعداد صرف تیرہ تھی، فروری ۱۹۶۹ء میں تلنگانہ کنونشن قائم کیا جس میں چند ہی دنوں میں دوسرے افراد بھی شامل ہوگئے اور اسے تلنگانہ پرجا سمیتی میں بدل دیا گیا۔ شری مدن موہن ایم ایل۔ اے اس کے بانی اور پہلے صدر منتخب ہوئے۔ طلباء کی ایکشن کمیٹی بھی دوش بدوش تھی جس کی قیادت

ملکارجن کر رہے تھے۔ سمیتی کے اس ایجی ٹیشن کو تیزی سے تائید حاصل ہوتی گئی اور اس کی صفوں میں بہت سے سیاستداں بھی شریک ہو گئے۔ ۲۲ مئی ۱۹۶۹ء کو ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی سمیتی کے صدر منتخب ہوئے۔ اب یہ ایجی ٹیشن سارے تلنگانہ میں پھیل چکا تھا۔ اس نے بہت جلد شدت اور تشدد کی راہ اختیار کر لی، عام زندگی درہم برہم ہو گئی، طلباء تقریباً ۹ مہینے تک تعلیمی اداروں سے غیر حاضر رہے۔ این۔ جی اوز نے ۳۹ دن تک ہڑتال جاری رکھی اور کئی تلنگانہ بند منائے گئے۔ ریاستی دارالحکومت شہر حیدرآباد اور ریاست کے بہت سے شہری و دیہی علاقوں میں کئی ماہ تک امتناعی احکام نافذ رہے۔ کرفیو کا نفاذ بھی عمل میں آیا۔ کئی موقعوں پر پولیس فائرنگ کے واقعات بھی ہوئے جس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد سرکاری طور پر (۵۰) اور پرجا سمیتی کے ذرائع نے (۲۵۰) بتائی ہے۔ دوسری ریاستوں کی پولیس بھی بلوائی گئی اور ایک موقع پر چند فوجی دستوں کی مدد بھی حاصل کی گئی۔ کثیر تعداد میں سمیتی کے قائدین، طلباء قائدین اور دیگر افراد گرفتار کئے گئے۔

جون ۱۹۶۹ء میں جب کہ ایجی ٹیشن نقطۂ عروج پر تھا وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی آدھی رات کو اچانک حیدرآباد پہنچیں اور متعلقہ افراد سے گفتگو کی۔ اس کے بعد مسٹر وائی۔ بی۔ چوان (جو اس وقت وزیر داخلہ تھے) نے بھی حیدرآباد کا دو دفعہ دورہ کیا۔ اس وقت صدر راج کے نفاذ کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ جون ۱۹۶۹ء میں

ہی تمام تلنگانہ وزراء نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر چیف منسٹر مسٹر برہمانند ریڈی نے بھی کانگریس پارلیمنٹری بورڈ میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جسے ریاستی بھیلپرز سے رجوع کیا گیا۔ ریاستی بھیلپرز پارٹی نے مسٹر برہمانند ریڈی پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا اور عام حالات کی بحالی تک ان سے قیادت سنبھالنے کی خواہش کی تاکہ عام حالات کی بحالی کے ساتھ وہ تلنگانہ امیدوار کے چیف منسٹر بننے کی راہ ہموار کریں۔ مگر عام حالات کی بہتری کے بعد چیف منسٹر اور بھیلپرز پارٹی اپنے وعدے سے پھر گئی اور قیادت میں تبدیلی نہ کرنے کی قرارداد منظور کی گئی۔

اسی دوران پرجا سمیتی نے دو ضمنی انتخابات میں اسمبلی کی نشستیں غیر معمولی اکثریت سے حاصل کر لیں۔ جمہوری انتخابات سے قبل وزیر اعظم اندرا گاندھی نے چنا ریڈی سے معاہدہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ گفتگو ناکام رہی۔ عبوری انتخابات میں پرجا سمیتی نے پارلیمان کی ۱۴ تلنگانہ نشستوں میں سے (۱۰) نشستیں حاصل کر کے اپنی سیاسی اہمیت اور عوام کے احساسات کا عملی ثبوت دے دیا۔ رائے عامہ کے اس اظہار کے بعد ریاستی حکومت کی طرف سے مختلف طریقوں اور نام نہاد وفود کے ذریعہ تلنگانہ عوام کے احساسات کو دبانے کی کوشش کی گئی لیکن مرکزی قائدین اور خصوصاً مسز اندرا گاندھی صورت حال کو اچھی طرح سمجھ چکی تھیں۔ انھوں نے پرجا سمیتی سے سیاسی معاملات پر گفتگو جاری رکھی بالآخر ۱۵ ستمبر کو کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کی ہدایت پر مسٹر برہمانند ریڈی کو چیف منسٹری سے دستبردار ہونا پڑا۔ نئی وزارت تلنگانہ کے مسٹر پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ کی قیادت میں تشکیل پائی۔

مشینیں رو رہی ہیں

کارخانے میں مشینیں چیختی ہیں
ہر طرف کالا دھواں لہرا رہا ہے
ایک بجلی تار سے لٹکی ہوئی چڑیا ادھر دم توڑتی ہے
کارخانے کا خدا
دو انگلیوں کے بیچ میں
جلتا ہوا سگرٹ دبائے
اپنے کمرے میں
لچکتی ڈولتی آرام دہ کرسی پہ بیٹھا
خشک ہونٹوں پر زباں سے
تھوک کی گندی نمی پھیلا رہا ہے
ریشمی پردے سے لپٹی
سانولی مزدورنی گم سم کھڑی
کھڑکی سے باہر
دور اس بجلی کے پتلے تار میں لٹکی ہوئی
دم توڑتی چڑیا کی جانب
تک رہی ہے
کارخانے میں
مشینیں رو رہی ہیں

عزیز الرحمان
۱۳۰ شکلاجی اسٹریٹ بمبئی ۸

مرشد عبدالسمیع جلیل

گیت کا خالق

۱

کمرے کی محبوس فضا میں
رات کی بھیگی چادر اوڑھے
تنہا تنہا
گیت کا خالق
ڈوب گیا ہے تحریروں میں
سوچوں کی وادی میں روشن
سپنوں کا اک شہر بسا ہے
تعبیروں کا بوجھ اٹھا ہے
لمحوں کی دیوار کھڑی ہے
نیند کی دیوی روٹھ گئی ہے
گیت کا خالق
چاہت [illegible]
[illegible]

علیم صبا نویدی
عامر النساء بیگم اسٹریٹ، مونٹ روڈ، مدراس ۲

ابھی فضاؤں میں گونجتی ہے
وہی لہو کی جوان چیخیں
وہ چیخیں جن میں دبی ہوئی ہیں
تبسموں کی مہک
سسکتی حسین راتیں
وہ راتیں جن میں سلگ رہی ہیں
اداس آنکھیں
خموش یادیں
فریب خوردہ قدیم رشتے
عظیم رشتے
چلو کہ رشتوں کو توڑ ڈالیں
لہو کی چیخوں کو روک ڈالیں
چلو اندھیرے پگھل رہے ہیں
نئے اجالے تھرک رہے ہیں
چلو کہ ہم تم مٹا ہی ڈالیں
مقدروں کی ہتھیلیوں سے سیہ لکیریں

اپنی ہتھیلیوں میں اجالے سمیٹ لو
میں ہوں سیہ نصیب مجھے دور پھینک دو
رکھ کر نظر کی انگلیاں میری شبوں پہ تم
میرے اکیلے پن کا ذرا زہر چوس لو
جتنی طویل عمر اندھیروں نے پائی ہے
اتنی طویل ہے مری تنہائی ناپ لو
صدیوں کے ہاتھ میں نے دیا ہے نیا خیال
اوراق روشنی پہ مرا نام پھر لکھو
ملتا نہیں ہے سب کو یہ سرمایہ وقت کا
سوچوں کا کرب پاس سنبھالے ہوئے رکھو
میرے بدن کا آئینہ ٹوٹا سہی مگر
اک بار اپنا چہرۂ احساس دیکھ لو
کتنا عظیم شخص ہے اس دور کا صبا
اس کے ہی اپنے ذہن کی تاریخ کو پڑھو

یوسف جمال

راج گنگ پور، اڑیسہ

غزلیں

چہرے میں ہر فریب کا بس گھولتا رہا
آئینہ جھوٹ منہ پہ کھرے بولتا رہا

سورج کی طرح جلتا سلگتا رہا، مگر
موتی کسی گھٹا کی طرح رولتا رہا

شرم آئی ایسی برف کی مورت پگھل گئے
جس جس کے نام کی وہ گرہ کھولتا رہا

ہلکا ہوں کس قدر نہ عیاں ہو سکا مگر
کانٹے میں اپنے سائے کو میں تولتا رہا

لذت کے زہر کا تھا انوکھا اثر جمال
خوابوں کی نرم سطح پہ میں ڈولتا رہا

چھوٹا ہے ٹھیک دل کو نہ یوں توڑیئے جناب
آئینے میں ہے نقص اسے چھوڑیئے جناب

بن جائیں گے گہر تو خفا ہوں گے آپ ہی
کنکر نہ کہیئے سہم سے نہ منہ موڑیئے جناب

لائے ہیں تبصروں کی جو سوغات چاند سے
شیشے کے مرتبان میں رکھ چھوڑیئے جناب

ٹھہرے ہیں نقد نظر ہے اک جھیل فن کی
اس وقت شاعری سے سنول جوڑیئے جناب

فن کار کی یہ موت اگر ہے تو اے جمال!
طاری جو ہے جمود اسے توڑیئے جناب

رائے چھوٹے لال صاحب ہمارے شہر میں منصف تھے۔ منصف ہونے کے علاوہ قومی فلاح و بہبودی کے کاموں میں بھی کافی حد تک پیش پیش رہنے کی وجہ سے عوام کے محبوب رہنما بھی سمجھے جاتے تھے۔ خیر و خیرات کے معاملے میں بھی اپنی فراخدلی کی شہرتوں کو کبھی مدھم نہیں پڑنے دیتے بلکہ زیادہ کوشش اس بات کی کرتے تھے کہ وہ کشادہ دلی کی بڑی سے بڑی مثال قائم کرسکیں۔ ادب سے بھی انھیں کافی لگاؤ تھا۔

ابھی کچھ مہینے پہلے ان پر ٹائیفائیڈ کا حملہ ہوا تھا مگر وہ دوبارہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ جانے انھیں کونسا ایسا دلی صدمہ تھا جس کے باعث ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ ان کے اس اچانک حادثے کی وجہ سے سارے شہر میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بالخصوص ادبی طبقے کا تو آہ و زاری سے برا حال تھا۔ نئی رہائش گاہ کی طرف روانگی کے وقت ان کے ساتھ سینکڑوں لوگ تھے۔ میں بھی ان کے چند مخلص دوستوں میں سے تھا۔ مجھے ان سے بے پناہ عقیدت تھی۔ غالباً اسی وجہ سے میں نیم خلوص دل کے ساتھ ان کی اختتامی گل پوشی میں حاضر تھا۔ نیم خلوص دل کی وجہ یہ تھی کہ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اور میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آج صبح میرے گھر انڈوں کا خاگینہ پکنے والا ہے۔ ممکن ہے اسی جانکاری کی وجہ سے مجھے شدید بھوک کا احساس ہو رہا ہو ـــــ مگر انڈوں کا خاگینہ تو پھر کسی اور وقت بھی پکوایا جا سکتا تھا۔ لیکن بے چارے منصف صاحب کی گلپوشی کے دوسرے مواقع میسر نہیں آسکتے تھے۔ پھر بھی میرا دل جیسے اٹک اٹک سا رہا تھا۔ کیونکہ خاگینہ

کے ساتھیوں کا تھا اور ــــ اللہ سے دعا مشغول ہو سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ یہی سوچتے سوچتے منصف صاحب کی منزل آگئی گویا یہ ان کا نیا جنم تھا۔

چاند سلگ رہی تھی اور جلد کے بے رحم شعلے راکے صاحب کو اپنی آغوش میں جھلسائے جا رہے تھے۔ شعلوں کے جوش و خروش سے دور دور تک حدت کا احساس ہوتا تھا اسی احساس سے بچاؤ کی خاطر منصف صاحب کے دوست، رفیق اور نہ جانے کون کون ان سے دور بھاگ کر الگ الگ ٹولیوں کی شکل میں درختوں کے سائے تلے بیٹھے منصف صاحب کے اچانک تبادلے کے بارے میں تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ میں بھی اپنے چند ملاقاتیوں کے ساتھ ایک درخت کے پرسکون سائے تلے بیٹھا محسوس کر رہا تھا ایک تنکے سے زمین پر آڑھی ترچھی لکیروں کے بے شمار مجموعے بنا رہا تھا۔ میں ہی کیا تقریباً سبھی اس بات کے منتظر تھے کہ کب منصف صاحب کی کھوپڑی پھٹے اور کب تمام اپنے اپنے گھر کا راستہ ناپیں مگر منصف صاحب کی کھوپڑی بڑی دقیانوسی تھی ساتھ وہ ایم۔ اے۔ ایل ایل ایم جو تھے۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا میرے قریب کی بیٹھی ہوئی ٹولی سے ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ اس جماعت کے مانیٹر ہوں۔ وہ مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھنے لگے۔ میں سمجھا شاید کسی دوسرے صاحب سے ملاقات کی غرض سے ان کی تشریف آوری ہو رہی ہے لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ محترم میری ہی مزاج پرسی کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ قریب آکر انھوں نے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں مجھے سلام کیا۔ جواب میں میں نے ایک ہلکا سا تبسم اپنے چہرے پر پھیلا دیا۔ کیوں کہ میں خود بھی تھکا تھا۔ لیکن ان کے سلام کا انداز مجھے اتنا پسند آیا کہ بے ساختہ طبیعت چاہی کہ انھیں ایک اسپیشل چائے پلا دوں لیکن مشکل یہ تھی کہ شمشان گھاٹ میں کوئی چائے خانہ بھی نہیں تھا۔ پل دو پل خاموشی رہی۔ دو ایک بار اس دوران میں نظروں کا تصادم ہو گیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے تو یوں پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں لیکن از حد کوشش کے باوجود بھی میں انھیں پہچان نہیں سکا۔ مجبوراً مجھے رسمی گفتگو کا سہارا لینا پڑا اور انھیں قطعی نہ جانتے ہوئے بھی میں نے پوچھ تاچھ کا یوں سلسلہ چھیڑا۔

"فرمائیے ـــــ مزاج تو ٹھیک ہے نا۔" میرے سوال کا آخری حرف "نا" ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ جناب نے فوراً جواب دیا ـــــ

"نہیں محترم کیا کہوں ـــ آپ شاید جانتے ہی ہونگے کہ آج کل اپنے دھندے کی گردن بالکل ہی جھک گئی ہے۔ اب تو میں کسی دوسرے دھندے کی تلاش میں ہوں۔"

انھوں نے ایک گہری سرد آہ چھوڑی۔ میں نے ڈرا ڈرا سا خوف کھا کر پوچھا۔

"آخر ذرا یہ فرمائیے کہ آپ کا دھندہ کیا ہے اور کس لئے آپ کی گردن۔ معاف کیجئے۔ آپ کے دھندے کی گردن کیوں جھک گئی ہے اور ایسی کونسی دقت ہے جسے آپ حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ کوئی

خیال مت فرمائیے۔ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ —— آپ مجھے بالکل ہی نہیں جانتے۔" انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر نہایت انکسار سے کہا۔ "اجی محترم۔ کیا کہوں —— ابھی چند مہینے پہلے "انفلوئنزا" کی لہر اپنے پورے بانکپن پر تھی۔ غالباً آپ کو پتہ تو ہوگا کہ روزانہ تیس چالیس آدمی ادھر سے ادھر ہو جاتے تھے۔"

اب کی بار میں نے ایک گہری سرد آہ چھوڑ دی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنجناب کہنا کیا چاہتے ہیں۔ دھندے کا بھلا "انفلوئنزا" سے کیا تعلق۔ اور پھر ایسی ہنگامی بیماریوں کا دھندہ تو سوائے خدا اور بھگوان کے دوسرا کوئی کر بھی نہیں سکتا۔ میں اپنے پر کڑھ رہا تھا کہ خوامخواہ منصف صاحب کی آخری رسم میں شریک ہوا۔ اگر نہ ہوتا تو انڈوں کا خاگینہ بھی بروقت مل جاتا اور پھر میری غیر موجودگی کی شکایت بھی نہیں کر پاتے کیونکہ وہ تو ابد الآباد کی عدالت میں منتقل ہو گئے تھے، اب رہا دیکھنے والوں کا سوال تو بھلا انھوں نے میری تعریف ہی کب کی تھی جواب کرنے لگتے ....

"انفلوئنزا" جناب نے پھر ایک آہ چھوڑ دی جو میرے خیال میں سرد تو نہیں تھی مگر گرم ضرور تھی۔ میں سمجھا شاید اس وبائی لہر میں اس کی بیوی، بہن پھر ماں، باپ، بھائی وغیرہ سب کی نہ سہی ایک آدھ کی ضرور روانگی ہو گئی ہوگی۔ جس کا جناب کو ملال تھا۔

"خیر دیکھئے۔ یہ تو مالک کی مرضی ہے۔ سدا اس کا یہی چلن رہا ہے۔ یہ دین تو اس کی پالی ہے۔ بھلا اس میں ہم لوگوں کی گنجائش کہاں ...... " میں نے دوسری بات ...

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔" آنجناب نے خفیف آواز میں کہا —— اور میں چونک کر منصف صاحب کی چتا کی طرف دیکھنے لگا کہ جلدی سے ان کی کھوپڑی پھٹ جائے تو میا بھسن کی ڈوری بھی کٹ جائے۔ مگر منصف صاحب آخر ایم۔ اے۔ ایل ایل ایم جو تھے۔

اسی شمشان میں تیس چالیس ارتھیاں روزانہ آ رہی جاتی تھیں۔ بیوپار کافی اچھا ہو جاتا تھا۔ تین ساڑھے تین سو من لکڑی کھپ جاتی تھی۔ لیکن آج کل تو دن بھر چبوترے پر تشریف فرمائی ہوئی مکھیوں کو اڑاتا رہتا ہوں بہ مشکل دن تمام میں تین چار صاحبین کی تشریف آوری ہوتی ہے اور بدقت اسّی نوّے من لکڑی فروخت ہوتی ہے۔ سوچئے کیا مقام ہے کہاں ساڑھے تین سو من لکڑی اور کہاں اسّی نوّے من۔ اسی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ہمارے حال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

مجھے عجیب سا اختلاج ہونے لگا۔ میں سوچنا چاہتا تھا کہ "شمشان" میں لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر بیٹھا ہوا یہ سیٹھ شہر کی موت میں اپنے فائدے کی تلاش کر رہا ہے۔ یہ انسان ہے یا کہ ......" بے اختیار طبیعت چاہی کہ قہقہہ لگاؤں لیکن شمشان میں قہقہہ لگانا بہت مشکل تھا۔

"جی۔" اور میں خاموش ہو گیا۔ منصف صاحب کی کھوپڑی پھٹ چکی تھی۔

پلک جھپکتے میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھی ہوئی مخلوق
شمشان کی شانتی بھنگ کرتے ہوئے باہر ہونے لگی۔ کچھ تو باہر ہو چکی
تھی اور کچھ ہو رہی تھی۔ میں بھی خراماں خراماں شمشان کے پھاٹک
گیٹ کی طرف تک پہونچنے بھی نہ پایا تھا کہ کچھ خادمان شمشان
جنہوں نے منصف صاحب کے چتا کی رچنا کی تھی ہمارے
آگے آکر فرشی تسلیمات بجا لانے لگے۔
"کیا تکلیف ہے آپ کو......" میں نے سنجیدگی سے
پوچھا۔
"جی تکلیف تو کچھ نہیں۔ ہاں انعام کی خواہش ضرور ہے"
"انعام" میں نے کبھی خواب و گمان میں بھی یہ نہیں سوچا
تھا کہ "موت جیسے پُر الم حادثے کے پیش آنے پر بھی
لوگ انعام کے آرزومند ہوتے ہیں۔ عدالت میں یہ دیکھا
گیا ہے کہ چاہے کوئی مقدمہ ہارے یا جیتے وہاں کے
چپراسی کا انعام مقرر ہوتا ہے۔ خادمان شمشان سے مخاطب
ہو کر ہم میں سے ایک حالی جناب بری طرح برس پڑے
"دیکھو ـــــــ لاش کا شمشان ہے۔ کیا یہ جگہ انعام مانگنے
کی ہے....."
"جی ہاں" اور ان لوگوں کے سلام کی رفتار میں اور اضافہ
ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ انعام کی طلب رکھنا چپراسیوں اور منصفوں
کیلئے ایک فطری بات ہے لیکن کیا یہ لوگ شمشان سے
باہر آکر انعام نہیں مانگ سکتے؟ معاملے کو رفع دفع کرنے
کی غرض سے میں نے اپنے منیم کو انھیں پانچ کا ایک نوٹ
دے دینے کے لئے۔ نوٹ فوراً اپنی گٹھری میں دھنسا
لینے کے بعد بھی وہ ہمارے راستے سے ہٹے نہیں بلکہ
اور عاجزانہ انداز میں اصرار کرنے لگے۔
"کیا حضور صرف پانچ روپے کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے
ایسے بڑے بڑے لوگوں کی تو روز روز تشریف آوری
ہوتی نہیں۔ چھ پانچ ماہ میں شاذ و نادر کوئی ایسی قیمتی لاش
آتی ہے جس سے ہمیں کچھ زیادہ ملنے کی توقع ہوتی ہے
اور اگر اس دن بھی صرف پانچ ہی روپے ملیں تو بھلا گھر
تو نذر کا گھڑا چکنا کیسے بنے گا"
ابھی جناب کا بیان جاری ہی تھا کہ منصف صاحب کے
بہنوئی نے دس کا ایک نوٹ ان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

تمام لوگ ٹھمک ٹھمک چال سے شمشان گیٹ سے
آہستہ آہستہ باہر نکلے اور پھر قہقہوں کی قوالیاں
یوں شروع ہوئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ شاید ہی کسی کے
چہرے پر وہ پہلی سی اداسی تھی۔ اور نہ ہی کسی کے
شعور میں یہ احساس تھا کہ ـــ
"زیست سے پیار کرنے والو! موت تمہیں بھی آئیگی"

دنیاوی جھنجھٹوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ کہیں کپاس کے
بارے میں سوال و جواب ہو رہے تھے، کوئی اپنی مونچھوں
کو تاؤ دے رہا تھا، کسی کو اپنی شاردا، پشپا اور سمن کی
یادیں ستا رہی تھیں تو کوئی سوچ رہا تھا کہ کھانے سے
فارغ ہونے پر چائے کے لئے کس دوست کی گردن
پکڑنی چاہیے۔ خیر اوروں کو تو چھوڑئیے میرا دل تو سارا
خاگینہ میں اٹکا ہوا تھا اور پھر چھوٹے چھوٹے انڈوں کا خاگینہ
تو میرے لئے ایک نعمت ہی تھی۔

جن کے پاس سواریاں تھیں وہ اپنی اپنی سواری پر لد کر
چلے جا رہے تھے اور میں بھی اسی دھن میں تھا کہ کوئی مجھے
بھی ساتھ لے لے کہ بائیں کی طرف سے میرے ایک
قریبی دوست وجٹے صاحب جن کا شمار ہائی کورٹ کے
مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا، میری طرف بڑھتے چلے آ رہے
تھے۔ اس وقت تو ان کے چہرے پر کچھ تو شرم اور کچھ
توقعات کی آمیزش چھائی ہوئی تھی۔

بے تکلفی سے ہاتھ ملانے کے بعد انھوں نے اپنی سفید
شیروانی کی جیب سے ایک خوبصورت لفافہ نکالا جس
پر سرخ الفاظ میں لکھا تھا "Forget me not"
جسے میری ہتھیلی پر تھماتے ہوئے انھوں نے سامنے کھڑی
ہوئی نیلی کار میں تشریف فرما چیف جسٹس صاحب کی خدمت
میں پیش کرانے کی درخواست کی۔ چیف جسٹس صاحب
کی کار اسٹارٹ ہو چکی تھی اور اب مزید اس کے بارے
میں پوچھا تاچھ کرنا وقت ضائع کرنے کی شہادت تھی
اس لئے میں فوراً لپکا اور کار کے وہیل گھومنے سے
پیشتر ہی میں نے وہ لفافہ چیف جسٹس صاحب کی خدمت
میں پیش کر دیا اور جواب کا منتظر ہو گیا۔ انھوں نے لفافہ
چاک کر کے ابتداء سے انتہا تک پڑھا اور آخر میں کچھ
طنزاً مسکراتے ہوئے لیکن ہمدردانہ انداز میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ وجٹے صاحب نے کافی تاخیر کر دی۔
اگر ان کی یہ درخواست آنجہانی منصف صاحب کی زندگی
میں ہی آ جاتی تو ممکن تھا میں ان کی خواہش کی تکمیل کر پاتا
لیکن اب واقعی میں مجبور ہوں۔ دراصل میرے پاس
اس وقت سے امیدواروں نے درخواستیں بھیجنی شروع
کر دی تھیں جب کہ منصف صاحب پر نیا نیا ٹائیفائیڈ کا حملہ
ہوا تھا۔ حالانکہ منصف صاحب دوبارہ صحت یاب ہو چکے
تھے لیکن اس صحت یابی سے پہلے ہی میں نے ایک
امیدوار کو منتخب بھی کر لیا تھا۔ جنھیں اب میں مطلع کر
چکا ہوں۔ وجٹے صاحب سے کہیے کہ مستقبل میں اتنی
تاخیر نہ برتا کریں۔ کیونکہ بعض لمحے کوہ نور سے بھی زیادہ
قیمتی ہوتے ہیں۔" ●●

پیکر حیدرآباد ۔۷

شہر آشوب

دور
حدِ سماعت تا حدِ نظر
تا دامنِ آسمان و زمیں
موجزن بحرِ آواز ہے

شہر
جیسے صداؤں کا جنگل ہے گاؤں میں کھل بل
اور جنگل' دہاڑوں کا دنگل
حادثوں کے بموں کے دھماکے
شورِ مخلوق کا اور مشینوں کا
ہے موجزن چرخ تک
ایسے پُر شور سیلِ صدا میں
کیسے گونجے گا یارب
صورِ اسرافیل

اقبال رحمت
اتوارا بازار ۔ ناندیڑ

غزل

ظہیر غازی پوری
ریلوے آؤٹ ایجنسی
ہزاری باغ ٹاؤن (بہار)

میرے سر پہ ہے وہی ٹوٹا سا چھپر اب تک
مجھ سے بدلا نہ گیا اپنا مقدر اب تک

خون ہی بن جائے صلیب اپنی تو کیا کہیے گا
یوں بھی مصلوب ہوئے کتنے ہی آذر اب تک

اک نظر دیکھ لیا تھا جلے جسموں کا ہجوم
ذہن میں چیخ رہا ہے وہی منظر اب تک

لوگ بیگانہ سہی، لگتی ہے مجھ کو اپنی !
بے کفن لاش پڑی ہے جو سڑک پر اب تک

دولتِ دل کا کوئی مول مگر ہو نہ سکا
ہم اٹھا لائے بہت چاند کے پتھر اب تک

سانپ ڈستا رہا شاید مجھے تنہائی کا
شکن آلود نظر آتا ہے بستر اب تک

غم کی برسات ہی ہم دیکھتے آئے برسوں
کبھی دیکھا نہ کوئی نیک نچھتر اب تک

ہم اسی سوچ میں خود ڈوبے رہے ہیں پہروں
اپنا سایہ نہ ہوا اپنے برابر اب تک

لاکھ کوشش کی مگر نیند سے چونکا ہی نہیں
نیا انسان مرے جسم کے اندر اب تک

وہ تو کہیے کہ وہ پانی تھا، نہ تھی اس میں شراب
ورنہ پی جاتے کئی لوگ سمندر اب تک

ندیم شام

سورج کا عکس شام کو گہرا دکھائی دے
دریا میں اس کا عکس سنہرا دکھائی دے
پربت سے گر رہا ہے کچھ اس طرح آبشار
پانی بس اک جگہ ہی ٹھہرا دکھائی دے
اتنی بڑی گلی میں کوئی گھر تو ہو جہاں
کھڑکی میں کوئی چاند سا چہرہ دکھائی دے
دکھڑا سنیں گے اس کا ہی دکھ اپنا ٹال کے
گونگا کوئی نہیں ہے تو بہرہ دکھائی دے
سایہ کہیں نہیں تو کہیں دھوپ ہی ملے
کوئی چمن نہیں ہے تو صحرا دکھائی دے
راون دکھوں کا جل کے کبھی راکھ ہو ندیم
اک روز تو خوشی کا دسہرہ دکھائی دے

غزلیں

اک زخم دیا ہے تو نیا زخم کھلا ہے
کھلتا نہیں یہ راز کہ یہ سلسلہ کیا ہے
بھولی ہوئی یادوں کا کہیں شور اٹھا ہے
ماضی کے دریچے سے کوئی جھانک رہا ہے
جائیں گے کہاں کس کو خبر، کس کو پتہ ہے
یاں خضر بھی رہزن ہے، اماں مانگ رہا ہے
آندھی سے بجھا ہے نہ یہ طوفاں سے بجھا ہے
چھوٹا سا دیا، درد کی ضو بانٹ رہا ہے
وجدان کے صدقے میں غم دہر ملا ہے
شاید یہی حسرت، مری محنت کا صلہ ہے

حسرت سہروردی
جمال محمد کالج - ترچناپلی - ۱

انور رفیق

"دکھ راز سمجھ اس کی ستائش مت کر
دل کے ہر زخم کی اس طرح نمائش مت کر
بن کے ہرجائی تجھے زخم دیا ہے جس نے
اور اب ملنے کی اس شخص سے خواہش مت کر
زندگی ایک جہنم ہے تو جلنے دے مجھے
اور کچھ دیر ابھی سرد یہ آتش مت کر
ایک جلتا ہوا صحرا ہی سہی میرا وجود
مجھ پہ اس طرح تو احسان کی بارش مت کر
ہے کشمکش خوں میں تو خود آئے گا کھنچ کر قاتل
وہ ملے تو مرے بارے میں سفارش مت کر
زندگی دیتی ہے ہر موڑ پہ خود زہر رفیق
دیکھ مرنے کے لئے تو کوئی سازش مت کر

ضیاء انصاری
نزد خانی مسجد ہنسا پوری ناگپور
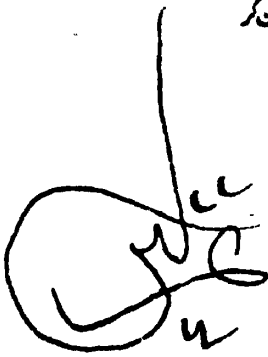
لہو ہے آستیں کا یا حنا ہے
ہتھیلی پہ دیا سا جل رہا ہے
وہی اک پیڑ سب کا آسرا ہے
جو جلتی دھوپ میں تنہا کھڑا ہے
چلو تم بھی کوئی پتھر اٹھا لو
مرے ہاتھوں میں بھی اک آئینہ ہے
نکالی جائیں گی کل صبح لاشیں
ابھی تو گھاٹ پر میلہ لگا ہے
تنی ہے چاندنی سورج کی رتھ پر
مگر یہ خواب ہے یا واقعہ ہے
ضیاء پرچھائیوں کا شہر ہے یہ
یہاں کس کو کوئی پہچانتا ہے

علیم جہانگیر
۸۸-۱-۲، قاضی واڑہ
(اورنگ آباد)

جو لوگ شاعری کو بیکاری کا مشغلہ کہتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ سچ ہے کہ شعر سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں ہوتی تاہم اگر ذہن کی تیزی، دل کی شگفتگی، روح کی بالیدگی اور اخلاق کی استواری کو منفعت میں شمار کیا جائے تو شعر کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ شعر بے حس قوتوں کو بیدار کرتا اور مردہ جذبات کو جلا دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی نظام تعلیم شعر کی مدد کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ جذبات کی تربیت کا شعر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

انسانی معاشرت کی عمارت جذبات ہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ جو تعلیم جذبات کی نشوونما اور ان کی تربیت و تہذیب سے آنکھ بند کرے گی صحیح معنوں میں وہ تعلیم نہیں کہلائی جا سکتی۔ انسانی اخلاق کی تکمیل کیلئے شعر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر کیا ہے؟ شعر کیلئے موزونیت نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہے۔ موزونیت کے بغیر شعر، شعر نہیں کہلاتا۔ دراصل شعر لفظوں کی ترتیب میں ایسے تناسب کا نام ہے جس کے پڑھنے سے ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے۔ نظم کی موزونیت یہ ہے کہ مصرعوں میں تناسب اور توازن ہو۔ مصرعوں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ کلام کی ایک ہیئت معین ہو جائے۔

موزونیت سے شعر کے حسن اور اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر کسی اچھے شعر کی نثر کر دی جائے تو اس میں وہ لطف اور دلکشی باقی نہیں رہتی جو الفاظ کی ترتیب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اساتذہ نے کلام کی شعریت میں قافیہ اور ردیف کو بڑی اہمیت دی ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے آزاد نظم بھی پیش کی جا رہی ہے۔ آزاد نظم صوتی آہنگ کے احساس اور شعریت کے غیر مرتب انداز کی پیداوار ہے۔ آزاد نظم میں ردیف و قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ کلامِ موزوں گویا دو چیزوں سے مرکب ہوتا ہے۔ ایک خیال دوسرے الفاظ۔ جب شعر میں معنوی اور لفظی خوبیاں پیدا ہو جائیں تو وہ شعر یقیناً گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ شعر میں معنوی خوبیاں پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلی شرط اصلیت کو بتائی جاتی ہے یعنی شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس کا وجود حقیقت میں ہو یا عقل و اعتقاد کی رو سے مان لیا گیا ہو۔ ویسے شاعر کو کبھی کبھی اصلیت سے تھوڑا بہت گریز بھی کرنا پڑتا ہے کیونکہ محض اصلیت خشک اور بے مزہ چیز ہوتی ہے اس میں جب تک شاعرانہ تخیل کا عنصر شامل نہ ہو اس وقت تک لطف یا تاثر پیدا کرنے کیلئے مناسب حد تک مبالغہ بھی جائز ہے لیکن مبالغہ امکانات کی حدود سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا مبالغہ جو حقیقت سے بعید ہو جائز نہیں۔ مناسب مبالغہ کی کچھ مثالیں دیکھئے

کہاں نہ جانے اڑا لے گئی ہوا مجھ کو
کہ بحر و بر میں کوئی ڈھونڈتا پھرا مجھ کو (کمار پاشی)

کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی ایسی عجیب و غریب اور انوکھی بات بیان کی جائے جو عام قاری کی سمجھ سے باہر ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ شعر کا خیال عامیانہ اور پست نہ ہو بلکہ شائستہ شریفانہ ہو۔ انسانی فطرت کے گہرے مطالعہ اور مشاہدے کا نتیجہ ہو۔ مثلاً ؎

ہجر کی رات چراغوں میں لہو جلتا ہے
اور اسی رات کی قسمت میں اجالا بھی نہیں (اکمل حیدرآبادی)

یہ اتنی روشنیاں کیوں کھلے گھروں میں ہیں
ہر ایک در پہ صدا دائے نئے سرے سے ہیں (مغنی تبسم)

بنتے رہے بگڑتے رہے کاروبارِ شوق
اک ہم کہ آرزو کا سہارا بنے رہے (مخدوم)

وہ وضع داری کہ دو حرف بھی لکھے نہ کبھی
وہ شرم ہے کہ مخاطب کرے تو نام سنے (قمر اقبال)

لفظی خوبیوں کا سب سے پہلا جُز ہے سادگی یعنی مشکل الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ لفظوں کی ترتیب عام بول چال کے مطابق ہو۔ خیال کا کوئی ضروری جز چھوڑ دیا نہ جائے۔ اجنبی تشبیہیں، استعارے استعمال نہ کئے جائیں اس کے علاوہ کوئی ایسی بات جو مشہور نہ ہو عام لوگوں کے علم میں نہ ہو بیان نہ کی جاوے تاکہ شعر کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ دوسرا اہم جُز اختصار ہے یعنی کم سے کم الفاظ میں مطلب ادا کیا جائے۔ ضرورت سے زیادہ بات کو طول نہ دیا جائے، کوئی لفظ نہ فقرہ بے ضرورت استعمال کیا جائے۔

جو بات یا کیفیت شاعر پیدا کرنا چاہتا ہے اگر شعر میں

وہ پورے طور پر آنکھوں کے سامنے پھر جائے یا جو تصویر وہ کھینچنا چاہتا ہے اس کا نقش واضح اور صاف ہو جو جذبہ وہ ابھارنا چاہتا ہے وہ پورے طور پر ابھر جائے تو ہم اسے کلام میں زور سے تعبیر کریں گے زور سے مراد یہ نہیں کہ شعر میں طیش و غضب رعب و داب، خوف و ہیبت یا شان و ملوکیت کی کیفیت پیدا کی جائے بلکہ کوئی جذبہ جو پوری طرح شدت کے ساتھ دکھایا جائے وہی زورِ کلام ہے ؎

روح کے زخم ابھرتے ہیں سوالوں کی طرح
میں کہیں تیری خدائی سے نہ کر دوں انکار (جہاں...)

غم خانۂ دلِ تنہا نہ دیکھا جائے گا
ہمیں مکین ہیں تو ہم پہ کاکر جائے (مسعود...)

کتنی آنکھیں کرب میں ڈوبی ہوئی ہیں دوستو
دیدہ ور ہونے کا میں اعزاز لے کر کیا کروں (ابن ...)

تیسرا اہم جز ہے صنعتوں کا استعمال۔ صنعتیں کلام کیلئے زیور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال جو کلام کے حسن کو بڑھا دے صنعت کہلاتا ہے ان کے نام بھی رکھے گئے ہیں اور ان میں اضافے اور ایجاد کی بھی گنجائش موجود ہے۔ خاص خاص صنعتیں یہ ہیں۔ صنعتِ تضاد، صنعتِ مقابلہ، صنعتِ مراعات النظیر، ایہام تناسب، تناسب، تجنیس تام، تجنیس ناقص، حسنِ تعلیل وغیرہ۔ صنعتوں کا ایسا استعمال جس سے لفظوں کا چکر یا گورکھ دھندا بن جائے تعقید پیدا ہو اور بیتو فضول و بے محل ہے۔

[illegible]
نظم نہیں ہے۔ اس کا ہر شعر اپنی جگہ ایک
تصویر ہے۔ غزل کے اشعار کو کسی خصوصی اصول یا تھیم
کے تحت پرکھا نہیں جا سکتا کیونکہ انسانی فطرت منطق
اصولوں کی پیروی سے آزاد ہوتی ہے۔ کبھی انسان کچھ
محسوس کرتا ہے اور کبھی بالکل اس کے برعکس کیفیت طاری
ہو جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے ذاتی تجربوں سے محسوس کر سکتا
ہے کہ کبھی وہی چیز ہم کو پسند آتی ہے اور کبھی اسی چیز کو
ہم ناپسند کرتے ہیں۔ کبھی ہمارے خیالات بلندی کی
طرف جاتے ہیں اور کبھی انتہائی پستی کی طرف۔ اس
قسم کی متضاد کیفیتیں ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتی ہیں
جو لوگ شاعر نہیں ہیں وہ ان کیفیتوں کو اپنے دل میں
ہی دبائے رکھتے ہیں لیکن شاعر اس کو شعر میں قید
کر دیتا ہے۔ اسی لئے شاعر کے کلام میں تضاد دکھائی
دیتا ہے۔ بظاہر یہ تضاد غیر منطقی دکھائی دیتا ہے لیکن
دراصل فطری ہے اور اس کی وجہ عقل و جذبات کی
کشمکش ہے۔ کبھی عقل جذبات پر غالب آتی ہے اور
کبھی جذبات عقل پر۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کے خیالات
کو فلسفہ کی عقلی دلیلوں سے پرکھنا بے سود ہے۔ لہذا
یہ اعتراض کہ شاعر پر ایک ہی وقت میں الگ الگ
کیفیتیں کس طرح طاری ہوتی ہیں غلط ٹھہرتا ہے۔
یوں بھی غزل کے تمام اشعار ایک ہی وقت یا ایک
ہی نشست میں کہے نہیں جاتے۔

ہماری شاعری خاص طور پر غزل پر تنقید کی جاتی ہے
کہ اس میں مقامی رنگ نہیں ہے بلکہ زیادہ تر فارسی
تلمیحات کے اثرات دکھائی دیتے ہیں یا شاعری کی
محفل میں ایرانی تہذیب جھلکتی ہے۔ اس اعتراض
میں زیادہ صداقت نہیں بلکہ ایک غلط فہمی ہے
جس کا ازالہ کیا جانا ضروری ہے۔ یہ تو سب جانتے
ہیں کہ اردو شاعری نے اسی سرزمین پر جنم لیا ہے۔
یہیں پلی بڑھی اور شباب کی منزل تک پہنچی۔ غزل
جو جذبات کی زبان ہے وہ وقت اور مقام کی قید
سے ہمیشہ آزاد رہی کیونکہ جذبات وقت یا مقام کے
لحاظ سے بدلا نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی
قابل غور ہے کہ اردو غزل گو شاعروں کا تعلق براہ راست
ایران سے نہیں رہا۔ نہ وہ کبھی ایران گئے اور نہ ایران
میں رہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اردو غزل میں چند
بیرونی چیزوں کا استعمال کیا گیا ہے جیسے تشبیہوں،
استعاروں اور تلمیحوں میں زیادہ تر ایسی چیزوں کی طرف
اشارہ کیا گیا ہے جن کا تعلق ہندوستان سے نہیں
ہے لیکن اردو غزل سے معمولی دلچسپی رکھنے والا
شخص بھی جانتا ہے کہ گل و بلبل، نرگس و سنبل، سرو
و شمشاد، شیریں و فرہاد، قیس و لیلیٰ اور ہما و عنقا
کا ذکر اردو شاعری میں کتنے طویل عرصے سے ہو رہا
ہے۔ اسی طرح کے چند قدیم تاریخی نام اب علامتوں
میں ڈھل گئے ہیں۔ ان سے جو کہانیاں یا واقعات وابستہ
ہیں وہ تاریخی حیثیت سے ممکن ہے غلط ہوں لیکن
ادبی حیثیت سے ان ناموں کے ساتھ وابستہ ہو چکے
ہیں جیسے سکندر، نوشیرواں، قارون، خسرو، فرہاد وغیرہ
ہاں اب اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ ان
چیزوں سے ہٹ کر اردو شاعری میں ہندوستانی چیزیں

بھی شامل کرلی جائیں۔ ہندوستانی رسم و رواج، ہندوستانی روایتوں کا اردو شاعری میں استعمال کیا جائے۔ مستحسن بات یہ ہے کہ آجکل یہ رجحان اردو شاعری میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ رستم و سہراب کے بجائے بھیم وارجن کا ذکر ــــ شیریں فرہاد یا لیلیٰ مجنوں کے بجائے نل دمنی اور دشینت و شکنتلا ــــ بلبل و قمری کے بجائے کوئل و پپیہے کی آواز کا ذکر۔ کوہ طور کے بجائے کوہ ہمالہ اور کوہ سمیر کی سیر۔ گل و یاسمین کے بجائے کنول اور گوما بیلی کی بہار۔ سرو شمشاد کے بجائے مولسری کی بہار دکھائی جائے۔ جہاں آتشِ گل سے شعلے بھڑکائے جاتے ہیں وہاں ڈھاک کے پھولوں سے آگ لگائی جائے۔ جہاں نرگس کے پھول سے آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے وہاں لاجونتی کی ادائیں بھی دیکھی جائیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو شاعری تقلیدی اور غیر فطری ہے؟ نہیں ویسے ہماری بیشتر شاعری خصوصاً کلاسیکل شاعری بڑی حد تک فارسی شاعری سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہیے کہ اردو شاعر اپنے دل کا حال نہیں کہتے بلکہ فارسی شاعری کے مضامین کو دہراتے ہیں۔ اردو کے ابتدائی شاعروں نے بے شک فارسی شاعری کی تقلید کی کیونکہ اس وقت ان کے سامنے شاعری کے دو ہی نمونے تھے۔ ایک فارسی شاعری کے اور دوسرے بھاشا (ہندی) شاعری کے۔ اگر وہ فارسی کو چھوڑ کر بھاشا کی بھی تقلید کرتے تو بہر حال مقلد ہی ٹھہرتے لیکن انھوں نے بھاشا کی بجائے فارسی شاعری کی پیروی کی کیونکہ اول تو بھاشا علمی زبان نہیں تھی۔ دوسرے اس کے ادبی سرمائے میں چند مذہبی قصوں اور منظوم نظموں کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ اسکی قواعد متعین تھی اور نہ لغت مرتب ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف فارسی نہ صرف ترقی یافتہ زبان تھی بلکہ دربار کی سرپرستی بھی اس کو حاصل تھی۔ جس طرح کہ آج انگریزی دنیا کی عام زبانوں کیلئے مشعلِ راہ بنی ہوئی ہے۔ لیکن آزادی کے بعد سے اردو شاعری پر فارسی کا اثر تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ انگریزی زبان سے متاثر ہو کر اردو پر الزام لگاتے ہیں وہ خود بھی انگریزی ادب کی تقلید سے آزاد دکھائی نہیں دیتے۔ بہر حال یہ سوال کہ اردو شاعری تقلیدی یا غیر فطری ہے مبالغہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ تھیں کچھ باتیں جو اردو شاعری کے اجمالی تجزیے کے طور پر کی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری نے اپنی ایک علیٰحدہ تاریخ بنائی ہے اور کیا موضوع کیا زبان و بیان کے اعتبار سے ایک بھرپور خزانہ اپنے ادب کو دیا ہے۔ یہ تو ایک مختصر جائزہ تھا۔ تفصیلی طور پر دیکھا جائے تو مختلف ذیلی عنوانات سے کر اردو شاعری کے ہمہ رنگ پہلوؤں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

لورکا کی تین نظمیں

سوکھے درخت کا گیت

میرا سایہ کاٹ دو
مجھ کو نجات دو عذاب دو
کہ میں بے ثمر ہوں
کیوں پیدا ہوا
آئینوں میں گھرا ہوا
دن میں میری شکل بدلتا ہے
رات ....
ستارے دوبارہ جنم دیتی ہے
میں جینا چاہتا ہوں
خود سے غافل ہو کر
خواب دیکھتا ہوں
مکوڑے : باز بنے ہیں
مجھ سے دور
میرا سایہ کاٹ دو
مجھ کو نجات دو عذاب سے
کہ میں بے ثمر ہوں

منظر مہدی
۱۷۳- آزاد سوسائٹی - احمد آباد

آخری نظم

گر میں مر جاؤں
کھلی بالکنی رکھنا
(طفل معصوم نارنگی کھا رہا ہے)
فصل کاٹنے کی آوازیں
میں بالکنی سے سنوں گا
گر میں مر جاؤں
کھلی بالکنی رکھنا

جب چاند نکلے

گھنٹیاں بند ہوں
اور راستے نظر آئے
جب چاند نکلے
سمندر کی گود میں زمین چھپے
اور میرا دل ایک جزیرہ
پورے چاند کے نیچے
کوئی کھائے ___
ہرے برف کے میوے
سو قسم کی شناختی صورتیں لے کر
جب چاند نکلے
نقرئی سکے سسکتی جیبوں میں پڑے ہوں

یسکر حیدرآباد ۷۹

دستک کسی نے دی نہ کوئی آیا عمر بھر
پیغام جاں فزا نہ کوئی لایا عمر بھر
ہر گام پہ ہوئی ہے جواں میری آرزو
مجھ کو فریب دیتا رہا سایا عمر بھر
مانع رہا ہے پاسِ ادب ہر مقام پر
دستِ طلب دراز نہ کر پایا عمر بھر
ترکِ جنوں بجا ہے مگر اے خرد یہ سوچ!
کنجِ قفس میں قلب جو گھبرایا عمر بھر

غزل

مامون ایمن
۲۸۵۔ ایونیو۔ سی، اپارٹمنٹ ام۔ ای
نیو یارک، نیو یارک ۱۰۰۰۹ (یو۔ اس۔ اے)

خواب کی حقیقت کیا کب یہ راس آئے ہیں
ریت کے گھروندے ہیں تتلیوں کے سائے ہیں
زندگی کے ویرانے عشق نے سجائے ہیں
ذہن و دل کی دنیا میں آپ ہی سمائے ہیں
یہ تضادِ اے یارو رسم ہے زمانے کی
دل کہ چھپ کے روئے ہے آنکھیں مسکرائے ہیں
ضبط اور خاموشی کب تلک روا ایمن
آج ہم بھی محفل میں داستاں سنائے ہیں

ایک نظم

کھینچ رکھا ہے تم نے
جو اک آتشیں دائرہ
گرد اپنے
اگر میں نے رکھا قدم
خاک ہو جاؤں گا
چاہتیں پھر بھی پھیرا لگاتی ہی رہتی ہیں
نت نئے دن نئے بھیس میں
ایک دن تم مجھے اک گداگر سمجھ کر
میرے پاس آجاؤ گی
توڑ کر آتشیں دائرہ
میں تمہیں اپنے خوابوں کی نگری
—— اٹھا لاؤں گا
پھر کہیں کوئی لنکا جلے گی

شاہد ماہلی
۱۵- ونڈسر پلیس۔ نئی دہلی
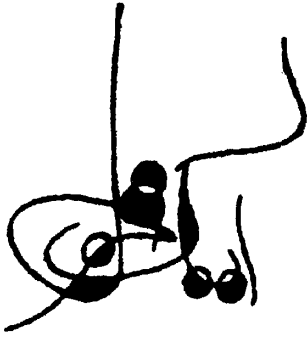
شہر کے بے نام ہنگاموں میں کل
کھو گیا تھا جو وہی لمحہ ہوں میں
مجھ کو بھی تو ساتھ آنے دیجیے
آپ ہی کا گمشدہ سایہ ہوں میں
ٹوٹ کر بکھرا پڑا ہوں راہ میں
پھر بھی لگتا ہے مجھے تنہا ہوں میں
موڑ دوں چاہوں تو رخ طوفان کا
دیکھنے میں یوں تو اک تنکا ہوں میں
کیوں نہ گم ہو جاؤں اپنے آپ میں
ایک کیڑے کی طرح زندہ ہوں میں
مجھ میں مضمر ہے شورِ آذری
کیا ہوا اگر ٹوٹا شیشہ ہوں میں

سہا انجم امام
پٹھان ٹولی، موتی ہاری (بہار)

اسی موڑ پر

ڈائمنڈ کاٹن ملز کا سائرن بجتے ہی مشینوں کی گڑگڑاہٹ
کے درمیان مضمحل چہروں پر طمانیت کی لہریں دوڑ گئیں۔ مشینوں
کے پرزوں سے الجھتے ہوئے تھکے تھکے ہاتھ رک گئے اور نڈھال
دم ہاتھوں نے کلوں کو سنبھال لیا۔ کارخانہ کا شور و ہنگامہ
بدستور قائم رہا ــــ تھکے ہوئے مزدور تیز قدموں سے
کارخانے کا صدر دروازہ پار کرتے ہوئے سرخ بجری کی
اس سڑک پر رواں دواں تھے جو گول تار کی سڑک سے
جا ملتی تھی ــــ اور وہیں بس اسٹاپ بھی تھا۔

مل مزدوروں کا وہ سیلاب فرصت کے لمحات پاکر مختلف قسم
کی انسانی آوازوں کے شور میں بڑھتا جارہا تھا۔ کسی چہرے پر
تھکن کی لکیریں، تو کسی چہرے پر فرحت۔ نہ کیف آگیں تصور
سے مسرت کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں ــــ مگر
سبھی کے قدم اپنی اپنی جائے رہائش پہ پہنچنے کیلئے بیتاب
اور تیز رو تھے ــــ انہیں مزدوروں میں راکیش بھی
تیز رفتاری سے اس ناہموار سڑک پر اپنے ناہموار خیالوں
کے ساتھ کسی کی تلاش میں تھا۔ اس کے چہرہ پر کسی الجھن
اور جستجو کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اس کی متلاشی
آنکھیں کبھی پیچھے پلٹ جاتیں، کبھی سب سے آگے جاتے
ہوئے اس مزدور کو دیکھتیں جس کے داہنے ہاتھ میں
ایک بوسیدہ ٹفن کیریر لٹک رہا تھا۔

"ہلو راکیش! ارے بھئی تم تو بالکل نظر ہی نہیں آتے"
راکیش نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ بھٹناگر تھا جو کسی زمانے
میں دونوں درجوں تک اس کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا
ڈائمنڈ کاٹن ملز ہی میں وہ میکینکل شعبہ سے متعلق تھا
"ہلو ..... کیسے ہو؟" راکیش پیچھے تکتے ہوئے [illegible]
کو ایک نظر دیکھتا ہوا بھٹناگر سے مخاطب ہوا مگر اس کی
تیز روی میں کوئی فرق نہ آیا۔

"اچھا ہوں ..... سنا ہے ڈائرکٹر صاحب نے تین مہینے
کا بونس دینا منظور کر لیا ہے؟"

"سنا تو میں نے بھی ہے" راکیش نے بے اعتنائی سے جواب
دیا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"بابو"

راکیش اس آواز پر پلٹ پڑا۔ ایک کلاس فور قسم کا مزدور
اس کے ساتھ ہم قدم تھا۔ بڑھے ہوئے بال اور جھریاں
پڑے ہوئے چہرہ پر دھنسی ہوئی آنکھیں اس کی حالت کی
آئینہ دار تھیں۔ بھٹناگر تو کب کا آگے نکل چکا تھا۔

"کیا ہے ..... ؟" وہ اس مزدور سے مخاطب ہوا۔

"چار مہینے سے مجھے تنخواہ نہیں ملی ہے ..... بہت پریشان
ہوں ..... اب تو بنیا بھی ادھار دینے کو تیار نہیں ہے .....
..... اگر آپ شرما جی سے میری سفارش کر دیتے تو ..."

"اچھا ..... اچھا ..... کوشش کروں گا۔ کل مجھ سے مل لینا۔
..." راکیش کی باتوں سے مطمئن ہو کر وہ مزدور بیڑی کا کش لیتا
ہوا آگے نکل گیا۔ اور اس کی نگاہیں پھر جستجو میں لگ گئیں۔

"صاحب ٹھیک سے چلئے"

وہ آگے چلتے ہوئے ایک مزدور سے ٹکرا گیا۔ اس کے چہرے

پرنجات کے نقوش ابھر کے مگر اس کا ذہن ڈیوٹی اور کے
متعلق سوچ رہا تھا۔ سوچوں کا ایک سلسلہ تھا ــــ رجنی
ــــ ڈیوٹی ــــ یکایک اس کے قدموں کی رفتار
دھیمی ہو گئی۔ اس کا چہرہ مسرت کی شعاعوں سے چمک
اٹھا۔ اسکی بےتاب نگاہوں نے پیچھے آتے ہوئے ہجوم
میں رجنی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی پریشان نگاہوں سے تیز تیز
کے ساتھ آگے پیچھے دیکھتی چلی آرہی تھی۔

"ہلو رجنی ......" راکیش چہک پڑا

"ہلو راکیش! تمھیں دیکھنے کو تو میری آنکھیں ترس گئی
تھیں" رجنی بھی مسکرا پڑی

"یہاں تو یہ حالت ہے کہ تمھاری تلاش میں گھنٹوں سے
ٹھکرا گیا"

"چلو اچھا ہوا میں بھی تمھاری ہی وجہ سے اپنے باس
سے ڈانٹ سن گئی"

"کیا بات ہو گئی؟" راکیش مجسم سوال ہو گیا

"ہوا یوں کہ میں بہت ہی اہم ایک لیٹر ٹائپ کر رہی تھی
اسی دوران تم یاد آگئے ...... بس ہو گئیں کچھ غلطیاں
ــــ ..." رجنی نے شریر نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تو گویا ہم آج کے حساب میں برابر رہے" راکیش کے
اس جواب پر دونوں چلتے چلتے کھلکھلا کر ہنس پڑے

"رجنی ......" راکیش نے چلتے چلتے بغیر ارادی طور پر رجنی
کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا

"راکیش ......" رجنی دھیمے لہجے میں بولی اور آس پاس
چلتے ہوئے مزدوروں کا خیال کر کے اس نے اپنا ہاتھ
راکیش کے ہاتھ سے الگ کر لیا۔

"سوچتا ہوں کب تک ہم لوگ اس ہجوم میں ایک

فیض الحسن

معرفت مظہر عالم صاحب محلہ آفریدیا

موتی ہاری (بہار)

دوسرے کو ڈھونڈتے رہیں گے ...... آؤ ہم مطلق
ایک دوسرے کی بانہوں میں تھام لیں ...... میں ساتھی
بن جائیں"

رجنی کے رخسار گلنار ہو گئے۔ "مگر تمھاری ماں ......؟"

"نہیں رجنی تم فکر نہ کرو۔ وہ یہ ضرور چاہتی ہیں کہ ان کی
بہو ایک گھریلو لڑکی ہو تاکہ اس مشینی زندگی میں ہر طرح
کی طرح [illegible] کرنے والی ــــ مگر تمھارا [illegible]
کے تصور سے گھبراتی نہیں ــــ ...... میں کئی دن
سے یہ بات سوچ رہا تھا، چلو میں آج تمھیں ماں سے
ملواتا ہوں۔ چلو گی نا ــــ؟"

رجنی نے اقرار کے انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔ راکیش عجب
نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا ــــ کہ یکایک بس کے
ہارن کی آواز سن کر وہ دونوں چونک پڑے۔ ایک بس
سامنے والے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ بہت سارے
مزدور اس کی طرف دوڑ رہے تھے۔

"ارے شہر جانے والی بس آگئی" یہ کہتا ہوا راکیش بس
کی طرف تیزی سے لپکا۔ رجنی بھی اس کے پیچھے دوڑ
پڑی۔ وہ ابھی بس اسٹاپ پر پہنچی بھی نہ تھی کہ بس ہارن
دیتی ہوئی نکل گئی ــــ بھاگتے ہوئے بس کے
پائیدان سے لٹکا ہوا راکیش حسرت بھری نگاہوں سے
رجنی کو دیکھتا رہا ــــ رجنی بھی ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی
ــــ اور بس نظروں سے اوجھل ہو گئی ■■

سلیم مقصود
9-2-134 لنگر حوض حیدرآباد

نظم اور غزل

نظم

زندگی

الجھی لکیروں کا ہے گم کردہ سرا
ڈھلتے ستاروں کی ہے مدقوق کرن
لاشوں کا سناٹا
— یتیموں کی پکار
لوٹے ہوئے ہاتھوں کا نام
جلتی ہوئی آنکھوں کا نام
کوچہ ویت نام کا یا مشرقی بنگال کا نام
مردہ رگوں میں جو جمے خون کثیف
ایک بھیانک منظر
زندگی

ٹینک کے پہیوں کو چلاتی قوت
ٹینک کے پہیوں میں پستے ہوئے جسم
ایٹمی سردی سے ٹھٹھرے پیکر
نیزوں کی انیوں پہ ٹکے ہوئے سر
رستا ہوا خون کہن
— ایک وبا
— ہے تو وبا دو اس کو
مٹا دو اس کو
رسوا نہ کرو

پیکر حیدرآباد ۸

غزل

تشنگی وہ جس میں اک دریا بھی پیا جاتا
کب تک ایک قطرہ اس تشنگی کو بہلاتا
پتھروں کی بارش میں اپنے رقص میں گم تھا
ورنہ دار کا منظر اس سے کب سہا جاتا
شہر کے در و دیوار جلتے جلتے لگتے ہیں
کوئی ابر گزرا ہو جیسے آگ برساتا
"زندہ شہ رگوں" پر تھا قرض کتنی نسلوں کا
"جبر وقت" تھا ورنہ قرض کون لوٹاتا!
تو مسیح کہلاتا اپنے دور کا بے شک
کوڑھ گر زمانے کا تیرے خوں سے دھل جاتا
بے لباس ہے دنیا اور سلیم ہے پاگل
اپنے جسم کو ڈھانپے پھر رہا ہے شرماتا

نقد و نظر

تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

آبلے (شعری مجموعہ)

- مدہوش بلگرامی
- پہلی بار۔ اگست ۱۹۷۱ء
- بلا قیمت
- ملنے کا پتہ: آشا بلگرامی معرفت سینٹ سیباسٹین روڈ۔ باندرہ۔ بمبئی۔ ۵۰

مدہوش بلگرامی کا دوسرا شعری مجموعہ "آبلے" ان کے پہلے شعری مجموعہ "فاصلے" کے بعد کی منزل ہے یا فاصلے کی تھکن یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ اسے ایوا اکیڈمی کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ مدہوش کے اس مجموعہ میں نظمیں، غزلیں اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ جہاں تک نظموں کا تعلق ہے وہ تعداد میں (۱۵) ہیں اور پوری کی پوری سطحیت کا شکار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ماحول سے زیادہ ترقی پسند شاعری سے متاثر ہے۔ ان کے مجموعہ کی پہلی نظم ہے "خواب اور تعبیر" جو ختم اس طرح ہوتی ہے ؎

ایک جنت میں تبدیل ہو جائے گی
لاکھوں خوابوں کی تعبیر مل جائے گی

معلوم نہیں اب شاعر کس جنت کی امید میں ہے۔ اگر جنت سے مراد کمیونسٹ نظام ہے تو اس میں شاعر سے نظمیں لکھوائی کرے گا۔ اسے الگ آنا کہ عمل میں کسی بھی سیاسی نظریہ کی چھاپ یا پرچھائیاں کتنا ہی اچھا عمل ہے جتنا کہ اس کو شاعری کا موضوع بنانا

ان کی ساری نظمیں اس قدر بوسیدہ فقرہ بازی اور بوڑھی رومانیت کی شکار ہیں کہ نظمیں پڑھتے وقت کوفت ہوتی ہے۔ نظموں سے سابقہ ہوتے ہی جدید اردو شاعری میں مدہوش بلگرامی کی "آبلے" والی نظمیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ غزلوں میں اخلاص فنی سے قطع نظر مدہوش صاحب نے بعض اچھے شعر کہے ہیں لیکن غزل اردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں ہر شاعر کچھ نہ کچھ اچھے شعر نکال لیتا ہے۔ کتاب کے آخر میں چند بلا عنوان نظمیں اور متفرق اشعار ہیں جو اگر نہ ہوتے تو شاید کتاب کا عیب چھپ جاتا۔ کتاب کا دیباچہ علی سردار جعفری کا ہے جس میں انھوں نے کسی پرانے شاعر کے ایک شعر کی مدد سے اس نئے شاعر کے آنے کی بشارت دی ہے۔ اس شاعر کی جو ادا سب سے زیادہ انھیں پسند ہے وہ طوفان سے کھیلنے کا حوصلہ اور آگ کو پی جانے کی امنگ ہے کیا یہی ایک ادا انکے دیباچہ لکھنے کا سبب ہے اور کیا یہ حوصلہ اور امنگ مدہوش کی شاعری میں بھی موجود ہے؟ جس پر سردار جعفری نے اپنا فاضل وقت دے کر چند صفحات لکھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ترقی پسند شعرا اس کام کے لیے رہ گئے ہیں کہ وہ ایسی کتابوں پر دیباچے لکھ دیا کریں تاکہ سند رہے کہ وہ زندہ ہیں۔ (علی ظہیر) ●●

پچھلے کئی برسوں سے نیپال اور ہندوستان کی سرحد پر بردہ فروشی بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ مگر بہت کم لوگوں کو یہ پتہ ہے کہ نیپالی لڑکیاں بڑے منظم طریقے سے نیپال سے درآمد کی جاتی ہیں تاکہ بمبئی کے بدنام زمانہ قحبہ خانوں میں انھیں کھپایا جا سکے۔ ایک اندازے کے مطابق فی الحال بمبئی کے قحبہ خانوں میں تقریباً تین ہزار نیپالی لڑکیاں جن میں کئی بے حد کمسن ہیں دنیا کے اس قدیم ترین پیشے کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ان کی روزمرہ زندگی کا آغاز صبح گیارہ بجے سے ہوتا ہے جبکہ وہ قریبی ڈاکٹر کے ہاں جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ہمیشہ ایک نوکرانی ہوتی ہے جو ان کی حفاظت کے ساتھ ان کی نگرانی بھی کرتی ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ان لڑکیوں کا دھندا شروع ہو جاتا ہے جو دوسرے دن صبح کے قریب قریب تک جاری رہتا ہے۔ اس طرح ہر لڑکی تقریباً ستر روپے روزانہ کما لیتی ہے اور تقریباً اتنے ہی روپے اسے اوپر بخشش کے طور پر مل جاتے ہیں۔

ہر قحبہ خانے کی انچارج ایک "مائی" ہوتی ہے جو قحبہ خانے کی نگرانی کے علاوہ چھوٹے موٹے جھگڑوں کی یکسوئی کرتے ان کی ہمت افزائی کرتے اور جب بھی وہ بغاوت پر اتر آئیں انھیں مار پیٹ کر یا سمجھا بجھا کر رستے پر لے آنے کے فرائض انجام دیتی ہے۔ بعض بعض اوقات کوئی لڑکی حاملہ بھی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اچھی کماؤ نہیں ہے تو اسے کہیں بیچ دیا جاتا ہے ورنہ وہیں ایک کمرے میں اس کی زچگی عمل میں آتی ہے اور

بڑی ہو کر وہ لڑکا ہونے کی صورت میں [illegible] اور لڑکی ہو تو طوائف۔

ان قحبہ خانوں میں تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ وہ تمام نیپالی لڑکیاں جو بمبئی کے قحبہ خانوں کا ایندھن بنتی ہیں نیپال سے لانے کے بعد بمبئی سے قریب کلیان میں حاجی ملنگ کی پہاڑی پر رکھی جاتی ہیں۔ یہاں بمبئی کے سارے قحبہ خانوں کے مالک جمع ہوتے ہیں تاکہ لڑکیوں کا مول بھاؤ کیا جا سکے۔

یہ پہاڑی غیر اخلاقی سرگرمیوں کے لئے بے حد موزوں ہے یہاں تک پہنچنے کے لئے بسیں بہت کم آتی جاتی ہیں۔ اور چونکہ زائرین کی تعداد کافی ہوتی ہے اس لئے تین تین چار چار گھنٹے بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

پہاڑی کے نیچے سے چوٹی تک پہنچنے کا راستہ بے حد تنگ اور پیچیدہ ہے اور اوپر تک پیدل پہنچنے میں تقریباً دو گھنٹے لگتے ہیں۔ اس تنگ راستے کے دونوں طرف گھاس پھوس کی جھونپڑیاں ہیں۔ کہیں کہیں چھوٹی موٹی دکانیں بھی ہیں جہاں کھانے اور چائے پینے کا انتظام ہوتا ہے۔

جھونپڑیوں میں رہنے والے ہمیں لگتے تو فقیر ہیں لیکن حقیقت میں ان کی فقیری میں کئی رموز چھپے ہیں۔ یہاں کے فقیر نہ صرف بھیک مانگتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر قصبے سے بچوں کا اغوا کر کے یہاں لایا جاتا ہے۔ پھر انھیں

رفعت صدیقی

منفعت بخش کاروبار کیلئے انھیں بمبئی بھیجا جاتا ہے۔

ایسے ہی ایک بنگلے کے مرکز میں نیپال سے لائی ہوئی لڑکیاں پہنچائی جاتی ہیں۔ اس مرکز میں جو پہاڑوں میں مختلف مقامات پر بنا ہوا ہے جہاں لڑکیوں کو آٹھ دن تک رکھ کر انھیں آنے والے دنوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ مرکز کی انچارج عورت انھیں ساڑھی باندھنا، بال بنانا، مانع حمل دوائیں استعمال کرنا اسی طرح کی کئی باتیں انھیں سکھاتی ہے۔ اس تربیت کے اختتام کے طور پر انھیں پستانوں کے نیچے گرم تپتے ہوئے لوہے سے داغ دیا جاتا ہے۔

اس ٹریننگ کے بعد بمبئی کا کوئی نہ کوئی دلال انھیں خریدنے کے لئے آ جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہر ایسی لڑکی پر جسے نیپال سے ہندوستان درآمد کیا جاتا ہے تقریباً پانچ ہزار روپے کا خرچہ ہوتا ہے۔ اس پیسے میں پولیس کا حصہ، پرمٹ کی فراہمی کے اخراجات اور دیگر اخراجات شامل ہیں۔ اس طرح ہر لڑکی کے خریدار کو تقریباً سات ہزار پانچ سو روپے اس کے "ملک" کو دینے پڑتے ہیں۔ لڑکی کو خریدنے کے بعد لڑکی کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خریدار کو اپنی کمائی کے ذریعے اس کیلئے ادا کئے ہوئے روپے ادا کر دے۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے۔

پچھلے سال سے بمبئی میں نیپالی لڑکیوں کی درآمد بہت بڑھ گئی ہے۔ بمبئی میں ان لڑکیوں کی کھپت اس وجہ سے زیادہ ہو گئی ہے کہ کئی شمالی ہند کے شہروں مثلاً دہلی، لکھنؤ، جبلپور وغیرہ میں عصمت فروشی پر مکمل امتناع عائد کر دیا گیا ہے۔ گو ان شہروں میں چوری چھپے اب بھی عصمت فروشی جاری ہے۔

اس کے علاوہ جنوبی ہند سے اب لڑکیوں کی درآمد کے زیادہ مواقع نہیں رہے ہیں۔ اس کی وجہ لڑکیوں کی بہتر تعلیم اور سماجی اصلاحات کے دیگر

علاوہ ہیں۔ ویسے بھی نیپالی لڑکیوں میں جنس کے بارے میں جھجک کچھ کم ہی پائی جاتی ہے۔

ان نیپالی لڑکیوں میں زیادہ تر کمسن ہوتی ہیں۔ تقریباً ہر ہفتہ پولیس کے دھاوے ان قحبہ خانوں پر عام ہیں لیکن لاک اپ میں کچھ دن گذارنے کے بعد پھر یہ لڑکیاں اپنے پرانے دھندے کی طرف لوٹ آتی ہیں۔

وہ کون لوگ ہیں جو انھیں قحبہ خانوں کی زینت بنانے کے محرک ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جو مسلسل ان لڑکیوں کو خریدتے رہتے ہیں۔ ان کا دھندا بظاہر پان سگریٹ کی دکانوں کی ملکیت ہے۔ بعض ٹیکسی سیکل کی دکانوں کے مالک ہیں اور بعض ہوٹل چلاتے ہیں۔ کچھ فلم پروڈیوسر بھی اس دھندے سے متعلق بتائے جاتے ہیں۔

کون ان نیپالی لڑکیوں کو بمبئی پہنچاتا ہے؟ یہ پہنچانے والے عموماً گورکھا چوکیدار یا سپاہی ہوتے ہیں جو بمبئی سے کافی پھر ٹرک اور کپڑے اور زیورات لے کر نیپال جاتے ہیں اور وہاں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو شادی اور بہتر مستقبل کی طمانیت دیکر نیپال سے ہندوستان لے آتے ہیں۔ سرحد پر ایک فرضی گواہ کی گواہی پر جو پانچ نیپالی روپیوں میں حاصل کیا جاسکتا ہے پولیس کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ساتھ والی لڑکی اس کی بیوی ہے۔ ایکبار سرحد پار کرلینے کے بعد یہ بھولی بھالی لڑکیاں ہمیشہ کیلئے بمبئی کے قحبہ خانوں میں پھنس جاتی ہیں جہاں سے انھیں موت ہی نجات دلا سکتی ہے۔ (ترجمہ انگریزی سے) ■■

پی وی فلمز کی سماجی پیش کش

گیوا کلر میں

(تکمیل کے آخری مراحل میں)

شامل ہے: امیتابھ بچن، جیا بہادری، رمیش دیو اور نگار سلطانہ وغیرہ

فلمساز و ہدایت کار: پرکاش ورما

موسیقی: وجے راگھوا راؤ

پی۔وی فلمز ایئر کنڈیشنڈ مارکیٹ، تاردیو، بمبئی۔۳۴

پچھلے دنوں موسیقار جے کشن کا ممبئی کے بریچ کینڈی ہسپتال میں ۳۹ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ دو مہینے سے زیادہ بیمار رہے۔ انھیں یرقان کا عارضہ ہوگیا تھا۔ پہلے پہل انھیں مدراس میں بخار آگیا جس کا علاج کروایا گیا اور وہ ٹھیک ہوگئے لیکن کچھ دن بعد پھر ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور ان کی آنکھیں پیلی ہوگئیں، انھیں ہسپتال میں داخل کردیا گیا جہاں چند پیچیدگیوں کی وجہ سے ان کا آپریشن کرنا پڑا۔ اس آپریشن کے بعد ان کی صحت بظاہر ٹھیک ہوگئی تھی لیکن انھیں آرام کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اس دوران میں ان کے رشتے دار اور دوست احباب انھیں گھیرے رہے۔ راج کپور، دلدار، کمیش اور ان کی بیوی پلوی دن رات ان کی دیکھ بھال کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ انکی صحت تشویشناک مرحلے میں داخل ہوگئی اور بالآخر ان کا انتقال ہوگیا۔ جے کشن کا انتقال فلمی موسیقی کیلئے یقیناً ایک صدمہ ثابت ہوا ہے۔ اپنے ساتھی شنکر کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک نئے انداز کا سنگیت تخلیق کیا تھا جس میں بھیرویں راگ کو بنیادی درجہ حاصل تھا۔ اس سنگیت کی امتیازی خصوصیت فوری متاثر کرنے والی کشش اور نئے قسم کا آرکسٹرائزیشن تھا۔ یہی وہ انوکھا پن انھیں ایک ایسے دور میں بھی نمایاں بنانے میں کامیاب رہا جبکہ شیام سندر، غلام حیدر، انل بسواس، سجاد، سی۔ رامچندر، ایس۔ ڈی۔ برمن، اور نوشاد جیسے موسیقار فلمی موسیقی کے افق پر جگمگا رہے تھے۔ اسی انوکھے اسٹائل کو اپنا کر کلیان جی آنند جی، لکشمی کانت پیارے لال اور اوشا کھنہ فلمی دنیا میں جمے ہوئے ہیں۔

شنکر جے کشن نے ۱۲۰ فلموں میں موسیقی دی ہے۔ جے کشن کا تعلق گجرات سے تھا اور شنکر حیدرآباد کے ہیں۔ فلموں میں آنے سے پہلے یہ دونوں پرتھوی راج تھیٹرز کے موسیقار علی اکبر کے سازندے تھے۔ وہیں سے ان کی دوستی پروان چڑھی اور برسات میں ان دونوں نے پہلی بار موسیقی دی۔ جے کشن مغربی موسیقی سے بخوبی واقف تھے جبکہ شنکر ہندوستانی موسیقی اچھی طرح جانتے ہیں۔ جے کشن نے فلم "بے گناہ" اور "شری ۴۲۰" میں مختصر رول بھی ادا کئے ہیں۔ وہ سماجی حلقوں میں بھی کافی مقبول تھے۔

پچھلے چند برسوں سے شنکر جے کشن میں وہ پرانی جولانی، جدت طرازی اور سریلا پن باقی نہیں رہا تھا اور وہ بے حد تجارتی خطوط پر موسیقی دینے لگے تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ فلمی موسیقی کی تاریخ میں شنکر جے کشن کا ایک اہم مقام ہے۔ ■

ہیکر حیدرآباد۔ ۹۰

فلمی دنیا کے بڑے آدمی کی آخری بڑی فلم "روپ ترا مستانہ"

مشہور اداکار پران کی فلم "روپ ترا مستانہ" جن معنوں میں ایک یادگار فلم ثابت ہوگی وہ یہ ہے کہ یہ وہ فلم ہے جس میں آخری بار پران کو "بڑے آدمی" کے روپ میں دیکھا جا سکے گا۔ اس طرح اداکار پران کا تیس سالہ دور بہ حیثیت ویلن ختم ہو گیا ہے۔ یہ خبر پریم چوپڑہ اور صفوبل جیسے اداکاروں کے لئے خوشخبری ہے کہ ان کی عدم صلاحیت اور چھچھورے پن کے باوجود ان کے لئے بہت سی فلموں کے دروازے کھل گئے ہیں۔

پران کا تیس سالہ دور "بڑے آدمی" کے طور پر اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ اس کیلئے مقابلہ بڑا سخت تھا۔ اس کے مقابلے پر ویلن کا رول کرنے والے کے۔ این۔ سنگھ، بھیروں، تیواری، ہیرالال، انصاری اور بی۔ ایم۔ ویاس جیسے قابل ذکر اداکار تھے۔ اس کے علاوہ مراد، سپرو، ڈیوڈ، جینت، اوم پرکاش، ایس نذیر اور نذیر حسین جیسے منجھے ہوئے کریکٹر ایکٹر بھی ویلن کا رول کرتے تھے۔ اس سخت مقابلہ میں بھی پران نے اپنے آپ کو سب سے کامیاب اور منفرد اداکار ثابت کرکے اپنی اداکاری کا لوہا منوا لیا۔ بڑے آدمی کی حیثیت سے اس کی چند کامیاب فلمیں آزاد، چوری چوری، ہلاکو، دل دیا درد لیا، خاندان، کشمیر کی کلی، رام اور شیام وغیرہ ہیں۔

حالیہ چند فلموں مثلاً اپکار، شہید، آنسو بن گئے پھول، ادھیکار اور لاکھوں میں ایک، میں پران نے مختلف سنجیدہ رول کچھ اس طرح ادا کئے کہ عوام وخواص اور فلمی نقادوں نے اسے بے حد سراہا اور فلم سے ہٹ کر بھی یہ نقوش دیرپا اور یادگار بن گئے۔ اس طرح کے کردار ادا کرنے کے بعد پران نے اب صرف "شریف" رول قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بمبئی میں سازندوں کی کمی اور ان کے معاوضوں میں اضافہ

بمبئی کے موسیقار آجکل ایک اور مسئلہ سے دوچار ہیں۔ انہیں اپنے گانوں کی ریکارڈنگ کیلئے بڑی پریشانی ہو رہی ہے کیونکہ بمبئی میں سازندوں کی بڑی کمی ہو گئی ہے۔ اس کا سبب ایک تو نوجوان سازندوں کی آمد کی کمی اور عمر رسیدہ سازندوں کی سبکدوشی یا موت بھی ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ بیشتر موسیقاروں نے جو زیادہ سازندوں کی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے اور انہیں کے سہارے زندہ ہیں۔ ایسے موسیقاروں نے سازندوں کے مالی حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنے پاس مستقل طور پر ملازمت کے نام پر معاہدوں میں جکڑ لیا ہے اور پابند کر دیا ہے۔ اس اجارہ داری کے بعد جو تھوڑے بہت سازندے بچ گئے ہیں ایک تو وہ بہت سے موسیقاروں کی ریکارڈنگ کیلئے ناکافی ہیں اور اس پر بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ کے سبب وہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ طلب کرتے ہیں۔ اس صورت حال کو بدلنا سخت ضروری ہے تاکہ فنکارانہ فضا میں گیتوں کی ریکارڈنگ ہو سکے۔ ●

شنکر جے کشن ایک فرم

جے کشن کے انتقال کے بعد یہ افواہیں گرم تھیں کہ شنکر صرف اپنے نام ہی سے موسیقی دیں گے۔ لیکن اب پتہ چلا ہے کہ شنکر، جے کشن کے انتقال کے باوجود اسی پرانے نام کو استعمال کریں گے۔ کیونکہ ان دونوں نے اپنے نام کو بطور ایک "فرم" کے رجسٹر کروایا ہے۔ جے کشن کے انتقال کے بعد ہو سکتا ہے کہ بحیثیت فرم کے جے کشن کی بیوی یا اس کے ورثا اس فرم کے قانونی پارٹنر ہونگے موسیقی تو شنکر ہی کے تفویض رہیگی مگر نام دونوں کا برقرار رہے گا۔

● آر۔ کے۔ فلمز کی فلم "کل آج اور کل" مکمل ہو چکی ہے۔ اس کی پس منظر موسیقی شنکر کی نگرانی میں ریکارڈ کرلی گئی ہے۔ اس فلم کو راج کپور کے بیٹے رندھیر کپور (ڈبو) نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ موسیقی شنکر جے کشن کی گیت نیرج اور حسرت جے پوری نے لکھے ہیں۔ستارے ہیں پرتھوی راج۔ راج کپور۔ رندھیر کپور اور ببیتا۔ اور دوسرے۔ امید ہے کہ یہ فلم بہت جلد ریلیز ہو جائیگی۔

● مشہور ہدایتکار بی۔ آر۔ چوپڑہ کے چھوٹے بھائی یش چوپڑہ نے اپنے ذاتی ادارے "یش راج فلمز" کے تحت "داغ" بنا رہے ہیں جلکی کہانی گلشن نندا کی ہے۔ راجیش کھنہ اور شرمیلا ٹیگور مرکزی رول ادا کر رہے ہیں۔ لکشمی کانت پیارے لال کی دھنیں ہیں

پیکر حیدرآباد ۹۳

جے کشن اوارڈ

جے کشن کی یادگار کے طور پر جے۔ اوم پرکاش نے اپنے فلمساز ادارے فلم یوگ کی جانب سے جے کشن اوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ جے کشن نے اپنے انتقال سے کچھ ہی دن پہلے فلم یوگ کی فلم "آنکھوں آنکھوں میں" کیلئے ایک گانا ریکارڈ کروایا تھا۔ یہ ان کا آخری گانا تھا۔ یہ انعام ہر سال، سال بھر کی بہترین ہندی فلم کی موسیقی دینے والے موسیقار کو دیا جائے گا۔ دیگر تفصیلات اور بہترین موسیقار کے انتخاب کے طریقہ کار کا بہت جلد اعلان کیا جائے گا۔

مختصر مختصر فلمی خبریں

پھلجھڑیاں

ساحر لدھیانوی گیت لکھیں گے۔

● امر جیت کے ادارے نالندہ فلمز کی اگلی فلم "رشوت" کی ہدایت کے فرائض بی۔ آر۔ اشارا انجام دیں گے۔ مرکزی کردار دیو آنند کر رہا ہے۔ آر۔ کے۔ نارائن کی کہانی ہے اور گیت آنند بخشی کے اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال دیں گے

● سورنا فلمز (مدراس) کی نئی فلم میں ممتاز کام کر رہی ہے۔ ہدایت مادھورا ؤ کے ذمہ ہے جسکی نگرانی ایس۔ سبا راؤ کریں گے۔ موسیقی لکشمی کانت

دستک

بہت کم اردو مصنف ایسے ہیں جو الفاظ کے دائرے سے ہٹ کر فلمی طور پر کسی اور میڈیم کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ کامیابی سے بنا سکتے ہوں۔ ان گنے چنے مصنفین میں راجندر سنگھ بیدی کا بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ جو کام وہ اب تک اپنے لاجواب قلم سے لیتے رہے ہیں وہ اب انھیں کیمرے کے ذریعہ لینا پڑتا ہے لیکن فلم "دستک" دیکھنے کے بعد یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ بیدی اس نئے میدان میں بھی اتنے ہی کامیاب ہیں جتنے کہ افسانہ نگاری میں۔

"دستک" شروع سے آخر تک ایک مصنف اور ہدایتکار کی فلم ہے۔ اس کا کینوس یوں تو محدود یعنی ایک فلیٹ جس کے اطراف بنے ہوئے نئے لیکن تہمت شکن ماحول کا احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن در اصل اس کینوس پر پورے جہان کی خوبیاں اور خرابیاں سمیٹی گئی ہیں۔ "دستک" کرشن چوپڑا کی "ہیرا موتی"، راج کپور کی "جاگتے رہو" اور "تیسری قسم" کے بعد فلم کے شیشے میں ایک مکمل افسانہ ہے۔ اس طرح "دستک" میں جزئیات نگاری کے ساتھ باریک نکات، بیان کا وہی بہاؤ اور احساس کا وہی تیکھا پن نظر آتا ہے جو ایک کامیاب افسانہ نگار کا فن ہوتا ہے۔

کردار نگاری کی مثال پیش کی جائے تو بیدی کا شعور رہتا ہے۔ یہی خوبی "دستک" کے کرداروں میں بھی جھلکتی نظر آتی ہے۔ "دستک" کے مرکزی کردار حمید اور سلمیٰ کسی حد تک "مسلم سوشل" فلموں کے حمید اور سلمیٰ ہی ہیں جو کسی جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ ہیں اور اس طرح آدمی فلم "تسلیمات" اور "آداب عرض ہے" ہی میں ختم ہو جاتے بلکہ وہ مسلم ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کے سیکولر جمہوریت کا ایک حصہ ہیں۔ ان کے مسائل بھی وہی ہیں جو کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والے متوسط طبقے کے ایک بڑے شہر میں رہنے والے ایک نو بیاہتا جوڑے کے ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں کرداروں کو پردے پر دیکھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انفرادی خوشی کا تصور کتنا کھوکھلا اور عارضی ہے حقیقت میں پردے میں بند حمید اور ممبئی شہر کی پر ہجوم تنہائی کے شکار حمید اور سلمیٰ میں دیکھنے والوں کو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

بیدی کی ایک اور نمایاں کامیابی، چھوٹے چھوٹے اور بظاہر غیر اہم کرداروں سے بھی ان کا پورا انصاف کرنا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں چھوٹے کردار ہمیشہ سے بے تعلقی اور عدم توجہی کا شکار رہے ہیں لیکن "دستک" میں مراتب علی پان والے سے لے کر حمید کے دفتر کی منو یا تک سارے کردار زندہ اور حقیقی نظر آتے ہیں حتیٰ کہ سلمیٰ کی چھوٹی بہن کا کردار بھی ذہن پر ایک دیرپا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

حمید کا پڑوسی کنٹرولر سے مکان حاصل کرنے کے لئے پیکر میں لگا رہتا ہے

اپنا نام ہندو بتانا" آدھی رات کو پولس انسپکٹر سے اپنی بیوی کے بارے میں پوچھ گچھ پر بہکنا، سلمی کا فلم کے آخر میں ایک شوقین مزاج کی آمد پر تان پورا تھام لینا۔ فلم میں بیدی کے چند بے حد خوبصورت طنز ہیں اور فلم دیکھنے والوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اداکاروں میں ریحانہ سلطان بے حد نمایاں ہے۔ شمشاد بیگم کے سابقہ کوٹھے میں مقید سلمی کی جذباتی گھٹن اور ماحول سے فرار کی بے پناہ خواہش کا اظہار اس نے بھرپور انداز سے کیا ہے۔ سنجیو کمار بھی اپنے رول میں بے حد کامیاب ہے۔ خصوصیت سے فلم کے کلائمکس میں اسکی جذبات نگاری بے حد فطری ہے۔ انور حسین اور شکیلہ بانو بھوپالی کی اداکاری میں بھی بڑی بے ساختگی ہے۔ مرحوم ترلوچن شرما (تاجدار خاں) کے لئے فلم کی تکمیل کے دوران انکی موت کی وجہ سے اداکار مراد کی آواز بعد میں استعمال کی گئی ہے بہت عجیب لگتی ہے۔ فلم کی ایک بڑی خوبی بیدی کے مکالمے ہیں جو سیدھے سادے ہونے کے باوجود بڑے پر اثر ہیں۔ کمل بوس کی بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گرافی فلم کے ماحول کے لئے بڑی موزوں ہے اور خوب ہے۔ مجروح کے لکھے ہوئے گیت کہانی سے بالکل پیوستہ ہیں اور بے حد شاعرانہ ہیں۔ مدن موہن پھر ایکبار اپنے آپکو موڈ کا موسیقار ثابت کرتے ہیں اور انکی دھنیں آجکل کے شور و شر میں ایک سکون بخش کیفیت پیدا کرتی ہیں۔

مختصراً بیدی کی دستک سے تمام مجرم اذہان بری طرح چونک اٹھیں گے۔

سارا آکاش

"سارا آکاش" راجندر یادو کے ہندی ناول کا فلمی روپ ہے اور اسے کمل رائے اسکول کے باسو چٹرجی نے اپنی زیر ہدایت پیش کیا ہے۔ "سارا آکاش" کی کہانی ایک نئے بیاہتا جوڑے کے ایک دوسرے کو نفسیاتی طور پر قبول کرنے کی کشمکش اور بالآخر کامیابی کو سادہ اور خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہے۔ ایک روایتی مشترکہ ہندو خاندان میں جہاں بیٹے کی شادی کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جبکہ باپ کو اپنی بیٹی کی شادی کا قرض اتارنا ہوتا ہے۔ اس طرح بیٹے کی شادی اسکی مرضی کے بغیر اور یہ جاننے کی کوشش کے بغیر کہ آیا وہ ذہنی طور پر ایک شادی شدہ زندگی گزارنے کیلئے تیار بھی ہے یا نہیں۔ ایک میٹرک پاس لڑکی سے کردی جاتی ہے۔ وہ اس شادی کو اپنی آزادی اور اپنے مستقبل کے خوابوں کیلئے ایک رکاوٹ سمجھتا ہے۔ اور شادی ہونے کے بعد بھی شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن آخر کار اسے حالات کی حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس سیدھی سادی لیکن بھرپور کہانی کو باسو چٹرجی نے بڑی چابکدستی سے پردے پر پیش کیا ہے اور کے۔ کے۔ مہاجن کی خوبصورت فوٹو گرافی، زندگی سے قریب سیٹ اور اچھی ایڈیٹنگ کی وجہ سے یہ فلم بے حد دلچسپ اور خیال انگیز بن گئی ہے۔ فلم کے مرکزی کرداروں میں نئے اداکار راکیش پانڈے اور مدھو چندا نے بے حد فطری اداکاری کی ہے اور تماشائی دونوں کرداروں کی مجبوریوں اور نفسیاتی الجھنوں سے اپنے آپ کو بہت قریب پاتے ہیں۔ جلال آغا فلم کی سنجیدگی میں ہدایتکار کے لطیف طنز کے ساتھ ساتھ مزاح پیدا کرنے میں بہت کامیاب ہے۔ سلیل چودھری کی موسیقی گوارا ہے۔ مختصراً "سارا آکاش" فطرت سے بے حد قریب ایک اچھی فلم ہے۔

فلم نگر کی سماجی پیشکش

تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے

فلم ساز و ہدایت کار :
سوہن لال کنور

موسیقی :
شنکر جے کشن

منوج کمار، پران، پریم چوپڑہ، پریم ناتھ، ناظمہ اور دوسرے

• کہانی : سچن بھومک • عکاسی : کے ایچ کپاڈیہ • گیت : ورما ملک

• آرٹ : کے بابو بھائی • منظر نامہ : رام کیلکر • مکالمے : دیدراہی • تدوین : نند لال

South India's Largest Circulated Urdu Monthly

Special Issue November 197[illegible]

پیکر

نومبر ۱۹۷۱ء ● خاص نمبر

اعظم راہی

سرورق:
محمد ا[illegible]ل

[illegible]ت:
غوث محی[illegible]

کتابت:
محمود جاوید
جمیل الرحمن

قیمت سالانہ:
بارہ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ

صدر دفتر: ۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد - ۲۹
دیگر دفاتر: ۳۱۸ تیسرا مالا، اردو چھپر تار دیو - بمبئی - ۳۴
۶۵ - بی دوسرا بلاک راجہ جی نگر بنگلور - ۱۰

پیکر میں شائع ہونے والے افسانوں، خاکوں وغیرہ میں
نام مقام کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ اور
ان سے کسی بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔
پیکر میں شائع ہونے والی تمام تخلیقات غیر مطبوعہ
ہیں ان کے نقل کی صورت میں حوالہ دینا ضروری ہے

اعظم راہی ایڈیٹر، پرنٹر و پبلیشر نے پرنٹو پریس
کے بجائے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
میں چھپوا کر
۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد - ۲۹ سے شائع کیا

فنی اعتبار سے بھی خامیاں رہ گئی ہیں اور ایک شعر تو مجھے عجیب سا لگا ؎

سمجھ نہ لیں حرم و دیر کم سواد کہیں
یہ کیا کیا یہ کہاں چھوڑ آئے نقشِ قدم

اس شعر میں مخاطبت کس سے ہے؟ کم سواد کس کو سمجھیں؟ اور نقشِ قدم چھوڑ آنے کا الزام کس کے سر؟ ایک اور شعر ؎

یہ کیا ستم ہے طلوعِ سحر کے موقع پر
غروب ہوتا ہوا آفتاب بن گئے ہم

دوسرے مصرعے میں "گئے" دبتا ہے۔ بحر کے لحاظ سے "گئے" کا پورا تلفظ ادا ہونا چاہیے تھا۔ زحافات کی رعایت سے فائدہ ضرور اٹھایا جا سکتا ہے، مگر مجبور ہو جانا اچھی بات نہیں۔ یہاں اوج صاحب "مجبور" نظر آتے ہیں۔ اور یہ بات مجھے یوں کھٹکتی ہے کہ یہ حرکت اوج صاحب کی "شعری شان" کے خلاف ہے۔ ایک اور شعر میں ؎

وفا کی راہ سمجھنے لگی، مزاجِ قدم

الفاظ کی ترتیب اور ترکیب میں نقص پایا جاتا ہے۔

متذکرہ غزل کا مطلع اور پانچواں شعر حاصلِ غزل ہیں۔ پھر بھی مطلع میں ان کا "اپنے آپ سے قریب آنے" کا عمل "چوروں" جیسا ہے۔ ایک سہما اور ڈرا ہوا انسان ہی ایسا کر سکتا ہے۔ داغ صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

ذرا ان کی شوخی تو دیکھیے، لیے زلفِ خم شدہ ہاتھ میں
مرے پیچھے آئے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

یہاں جو "دبے دبے" آنے کا عمل ہے کتنا واضح اور فصیح ہے۔ اس "دبے دبے آنے" کے عمل میں چور کا سا تنفس بھی شامل ہے۔ حالانکہ تنفس اور تیز ہو جاتا ہے۔ بہرحال مطلع خوبصورت ہے۔
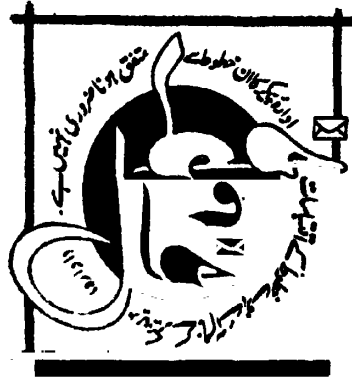
ادارہ کا مکتوب نگاران کے خطوط سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

گنہگار ہندی۔ علاؤ بیتی

ستمبر کا "پیکر"[*] ملا۔ اس شمارے میں کچھ اچھے نام دیکھ کر جی خوش ہو گیا تھا۔ مگر جب ان ناموں کو پڑھ ڈالا تو بڑی مایوسی ہوئی۔

"خطوط نما" میں اوج یعقوبی صاحب کا خط سیدھے سادے قاری کو بھی "چھیڑ چھاڑ" کی دعوت دیتا ہے۔ موصوف نے رائے دی ہے کہ "آپ کا پچھلا شمارہ میری نظر میں" کے عنوان کے تحت ہر ماہ کسی بالغ نظر اور "غیر جانبدار نقاد" سے دو تین صفحے ضرور لکھوایا کریں۔ اس مشورہ کی نیک نیتی پر شبہ نہیں، یقیناً یہ اچھا سلسلہ ہو سکتا ہے۔ مگر تبصرہ کے دو تین صفحات لکھوانے یا لکھنے کیلئے "بالغ نظر" یا "غیر جانبدار نقاد" کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ صرف "نظر" رکھنے والے قارئین یا جانبدار قاری ہی سہی، اس کام کو آسانی سے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اوج صاحب کے مشورہ کی روشنی میں یہ عرض کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اول تو موصوف نے "بیت الغزل" سے جو غزل "پیکر" کے حوالے کی ہے وہ بہت پرانی اور مطبوعہ ہے۔ دو تین اخبار اور رسالوں میں (حیدرآباد کے) بھی اوج صاحب کی غزل میں

[*] "پیکر" حیدرآباد

حیرت ہوئی کہ انکا تعارف صاحب جگر
ایسا سلسلہ میں شعر کیا جا سکتا ہے اور ان کی شاعری کی عمر
بھی پچاس کی حد میں داخل ہو گئی ہے اور حیرت انگیز
یہ ہے کہ کس طرح ان کی نظر سے یہ سہو ہو گیا؟ مرسلہ
غزل کہیں کسی اور نے نقل کر کے تو روانہ نہیں کی؟

نظموں میں عزیز قیسی صاحب کی نظم "زوالِ خدا"
واضح اور صاف ہے۔ کارپاشی کی نظم "کیمرے" میں
آہنگ پاشی زیادہ نظر آتی ہے۔ وقار خلیل صاحب کا
مضمون بھاری بھرکم ہے۔ "حیدرآباد کے کتب خانے"
پڑھنے کے بعد کوڑھ مغزوں کے ذہن میں یہ بات آ جائیگی
کہ حیدرآباد کی علمی، ادبی اور ثقافتی حیثیت آج بھی
مسلّم ہے۔ رؤف خلش کی غزل چپقلش زیادہ
پیدا کرتی ہے، خلش کم ـــــ ٹھہرے، بکھرے اور نکھرے
کے ساتھ "پھرے" کا قافیہ اصولاً غلط ـــــ اور
پھر غزل کی زبان، حسن و معنی اور مطلب کے لحاظ
سے بھی یہ غزل نہیں ہے۔

سعید بن محمد مشہور آرٹسٹ سہی ـــــ مگر انھوں
نے لفظوں کے نسبتاً سب سے کمزور وسیلۂ اظہار کو
موسیقی اور مصوری جیسے طاقتور وسیلۂ اظہار تک پہنچانے
کی بڑی انوکھی اور قابل قدر کوشش کی ہے ـــــ یہ بات
کھٹکتی ہے۔ اور پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے
وہ کمزور الفاظ کا وسیلۂ اظہار کیلئے کیوں اختیار
کیا؟ ان کی چاروں نظمیں پڑھنے کے بعد یہ مزید واضح ہوتا
ہے کیا انھوں نے اپنی نظموں میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں
وہ یقیناً اظہار کا وسیلہ کم رکھتے ہیں۔ نہ تو الفاظ کی بہت
وسعت نظر آتی ہے نہ بحر کی ـــــ اگر ایسی ہی بے بحر و تال

والی شاعری باقی رہی یا یہ حضرت کرتے رہے تو شاید
سے محروم بھی جاتا رہیگا ـــــ حفظنا اللہ ـــــ

مولوی خواجہ عبدالغفور صاحب کا "انداز نیا ہے"
نہایت کھوکھلا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی
کمزور ہے اور پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے اس
انداز میں مطبوعہ مضمون ہے یا صرف لطیفے؟

غزلوں کے حصے میں رؤف خیر کی غزل متوازن
صاف ستھری اور دلکش ہے، صرف ایک شعر میں
"اجاڑ بن" غیر فصیح ہے (شاید یہ حیدرآباد کا اجاڑ
بن ہوگا) صلاح الدین نیّر صاحب پہلے غزلیں اچھی
کہتے تھے ـــــ ان کی دونوں غزلوں کے اکثر شعر دولخت
ہیں اور بے معنی ہیں مثلاً ؎

مقتل میں حیاتِ ابدی ڈھونڈنے والو!
اب تم میں وہ احساسِ مسیحائی کہاں ہے

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مقتل میں حیات ابدی ڈھونڈنے
والوں کو احساسِ مسیحائی کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی
ہے؟" یہ شعر اچھا ہے دونوں غزلوں میں ؎

کب میں نے کہا، مجھ کو ہے کونین کی خواہش
تھوڑی سی ترے دل میں جگہ ڈھونڈ رہا ہوں

اس شمارہ کے افسانوں اور مضامین کا حصہ نہایت
کمزور ہے، اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے "پیکر" کیلئے
فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

"پیکر" میں نئے لکھنے والوں کو ضرور شامل کرنا
چاہیے مگر ایسا بھی نہیں کہ معاملہ "غتربود" ہو جائے
کچھ مستقل عنوانات کے تحت پختہ قلم حضرات سے
لکھوائیے۔ مجتبیٰ حسین صاحب قبلہ کا "قطع کلام"

"پیکر" حیدرآباد ○

دستیاب ہو تو بھیج دیجئے۔ تبصرہ کرنا ہے انھوں نے قطع کلام میں بڑی دھاندلی سے کام لیا ہے۔ ہمارے ینگ صحافی احسن علی مرزا صاحب سے کہیے ——— "ہندوستانی پری خالہ کو اندرا گاندھی کے "پیکر" میں سے نکال باہر کریں ——— ان محترمہ کا (خالہ صاحبہ) زیادہ دیر تک اندرا گاندھی کے "پیکر" میں قید رہنا فالِ نیک نہیں ہے اور موصوف خود بھی "پیکر" میں لکھنے کیلئے اپنے "پیکر" سے باہر آجائیں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔ ان سے ہر شمارہ میں زبردستی لکھوائیے۔

نذیر اختر۔ ناندیڑ

علیم جہاں گیر کا مضمون "ہماری اردو شاعری — کچھ باتیں" پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔

یہ فرد کی شکست و ریخت کا دور ہے! شاعری' ادب صرف فرد' فرد کی ذات' ذات کے کرب کے احساس اور اس احساس کے اظہار کا نام ہیں۔ یہ دور جو فرد کیلئے انگنت محرومیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر لایا ہے۔ ایسے دور میں شاعری عیاشی سمجھ کر نہیں کی جاسکتی۔ یہ ایسا دور ہے جس میں تعلیمات' عقائد' سوچ سب کچھ مصنوعی سا نظر آتا ہے۔ ہم ایک ایسی جنگ میں شریک ہیں۔ جو ہمارے خلاف چھڑی ہوئی ہے۔ آج وہی ادب قابلِ اعتبار سمجھا جاسکتا ہے جو دل و دماغ دونوں کو حاضر رکھ کر تخلیق کیا گیا ہو۔ لفظوں کی بندش' قافیوں کے صحیح استعمال اور شعری صنعتوں کی کھچڑی پکا کر شاعری نہیں کی جاسکتی۔

شاہانہ بانو۔ نامپلی گرلز کالج حیدرآباد

آپ نے جس مقصد کے تحت علیم جہانگیر کا مضمون "ہماری اردو شاعری" شائع کیا ہے۔ اس سے قدیم اساتذہ کے بجائے نئے ذہنوں کو سمجھنے کا موقع ملا ورنہ آجکل کالجوں میں جس قسم کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اس کے بجائے ہم طلباء کو ایسے مضامین بنیادی طور پر نئے خیالات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

سلیم شہزاد۔ مالیگاؤں

فیاض رفعت نے "کھوئے ہوئے چہرے کی تلاش" میں جدید انسان کی Tragedy of Faceless man. کی تصویر صاف کھینچی ہے لیکن جدت میں یہ چہرے کی تلاش کا موضوع کب تک دہرایا جاتا رہے گا؟

انیسہ پروین۔ حیدرآباد

کیا ایک ادبی اور معیاری پرچے کا "سرورق" جو کہ پرچے کی جان ہے' معیاری نہیں ہوسکتا؟ اکتوبر کے پرچے کا سرورق کتنا تہذیب سے گرا ہوا اور عامیانہ ہے۔ ساجد اعظم جیسے افسانہ نگاروں کو اگر "پیکر" میں جگہ نہ دی جائے تو اچھا ہو۔ ان کے افسانے معیاری ادب کے نام پر ایک دھبّہ ہیں۔

جوگندر پال۔ اورنگ آباد

آپ کی چٹھی ملی اور نیا "پیکر" بھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس کا اپنا مزاج ہے۔ اردو میں ایسے رسائل آج بھی کم ہیں جن کے موضوعات میں اتنا تنوع ہو اور کوشش کیجئے تاکہ یہ اچھا رسالہ اور اچھا ہوتا رہے۔

شمیم سعید۔ حیدرآباد

اکتوبر کے "پیکر" میں علمی خبریں بہت ہی خاص ہیں امید ہے ایسی باوثوق خبریں آئندہ بھی "پیکر" کے ذریعہ پڑھنے کو ملیں گی۔

●●

انا

عزیز قیسی
۶۳۳/۲۰ شاستری نگر
گورے گاؤں، بمبئی ۶۲

اک نگارِ تنہائی
انجمن سے نالاں بھی، انجمن طلب بھی ہے
ایک وہمِ یکتائی
زندگی کا ساماں بھی، موت کا سبب بھی ہے
اِک جنونِ دارائی
خود رقیب ہے اپنا، خود حریفِ یزداں ہے
خواب ہے تو ایقاں ہے، وہم ہو تو ایماں ہے

اِک حصارِ آئینہ
سنگ زن کی زد میں ہے
ایک بیکراں قلزم
آب جو کی حد میں ہے
اک فنا کا زندانی
حسرتِ ابد میں ہے!

چار شعر

مظہر امام
آل انڈیا ریڈیو
پٹنہ

جسم و جاں کے کانچ سے نازک رشتے ٹوٹ ہی جاتے ہیں
غم کے پھوڑے پکتے پکتے اک دن پھوٹ ہی جاتے ہیں

میری رقابت میں ہی آخر تم آئے تو منزل تک
راہِ وفا میں ورنہ اکثر ساتھی چھوٹ ہی جاتے ہیں

دل کو پتھر کر لینے کا ہم نے یہ فن سیکھا ہے
ایک ذرا سی ٹھیس پہ ورنہ شیشے ٹوٹ ہی جاتے ہیں

چاہو تو ہشیار رہو، ہشیاری سے کیا ہوتا ہے
لٹنے والے دل کے نگر کو اک دن لوٹ ہی جاتے ہیں

دوغلے، تشکیک پسند اور بانجھ دانشوروں سے ہوشیار!

زرد صحافت کی اصطلاح اب تک بلیک میلنگ یا پانچویں کالم کی سرگرمیوں کے لئے مخصوص رائج ہے۔ دیگر اس طرح کے رسائل و جرائد میں مضامین کا انداز بہت عامیانہ اور پوچ قسم کا رہا ہے۔ مگر اب اس نے اپنا چولا بدل لیا ہے۔ اب اس کا انداز علمی و ادبی ہے اور اس کے مقاصد میں ایسے مضامین نظم و نثر کی نشر و اشاعت ہے جس سے دانشوروں

میں پہنچایا جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کے شہروں کی بڑی زبانوں کے بیشتر قلمکاروں کے ذہن ایسی ہی مصنوعی فضا میں پہنچ چکے ہیں۔ ان کا تعلق زندگی اور اس کے حقیقی مسائل سے ٹوٹتا جا رہا ہے کیونکہ نہ تو ان کے قدم اپنی زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کے سر ان صنعتی شہروں کے آسمانوں کو چھو رہے ہیں۔ ان رجحانات کی تشہیر کرنے

ادب اور غداری

قلمکاروں اور خصوصاً نوجوان نسل میں اپنے مستقبل سے مایوسی کا رجحان پیدا ہوا اور ان کے ذہن ـــــ اپنے ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کی تمام اقدار کی نفی کرنے کے ساتھ ساتھ بعض غیرممالک کی مادی آسائشوں میں اپنی راہ نجات ڈھونڈنے لگیں۔ اس طرح نوجوانوں میں بے یقینی اور بے مکانی کے جذبات و احساسات کو بیدار کرتے ہوئے انہیں صنعتی شہروں کے میکانکی مسائل کی مصنوعی فضا

والے رسائل کو پڑھنے سے بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شہری ـ بہت پیچیدہ نفسیاتی اور جنسی الجھنوں سے دوچار ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں اس طرح کا پیچ در پیچ اور مسائلی معاشرہ بہت زیادہ "فرسٹریٹڈ" ملکوں میں ہی موجود ہے۔ ہمارا ملک تو ابھی پوری طرح ترقی یافتہ زراعتی ملک بھی نہیں بن پایا ہے اور ہمارے مسائل ابھی تک روٹی، کپڑے اور مکان کے بنیادی مسائل سے آگے نہیں بڑھے ہیں اور ہم ان

نوجوان نسل کو ذہنی طور پر ناکارہ بنانے کی سازش!

بیکر حیدرآبادی

پس ماندہ ترقی پسندوں اور ضمیر فروشوں سے خبردار

بنیادی ضرورتوں کے حصول کے لئے تعمیری جدوجہد
میں لگے ہوئے ہیں لیکن کچھ لوگ — ان کے اطراف
تکنیک بندی کا ایک غیر فطری فکر کا شکنجہ اس
طرح مضبوط کر رہے ہیں کہ مستقبل میں یہ ذہن
جو ہمارے ملک اور قوم کے لئے کارآمد ہو سکتے
ہیں، انہیں ناکارہ بنایا جا سکے۔

گھیراؤ، بات چیت اور پھر اس کا حل۔ لیکن اس
گھیراؤ سے کچھ لوگ بہت ہی فنکاری بلکہ چابکدستی
سے ہم سے وہ سب کچھ حاصل کر رہے ہیں جس
کے وہ متمنی ہیں۔ یہ طریقہ ہے ذہنوں کا گھیراؤ —
اس کے لئے انہوں نے غیر محسوس طریقے پر انسانی
ذہنی قوت کو ہراول دستہ کے طور پر استعمال کیا
ہے جو استحصال اور اسٹیبلشمنٹ کے خلاف متحد

زاویے

اعظم راہی

دانشور، فنکار اور گھیراؤ

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنے مسائل کو حل کرتے ہیں
کبھی بھی تشدد سے کام نہیں لیا۔ آزادی سے لیکر
معاش تک کے سب مسائل ہم نے ستیہ گرہ، احتجاج
اور ہڑتال جیسے پرامن طریقے استعمال کر کے حل کئے
ہیں۔ پچھلے دنوں ان میں ہم نے ایک نئے طریقے کا
اضافہ کیا ہے۔ وہ ہے — گھیراؤ — شکایت

ہو رہی تھی۔ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ کام ان لوگوں
کی سرکردگی میں انجام پا رہا ہے جو تخلیقی ذہن نہیں
رکھتے بلکہ ریاضی کے اصولوں اور ضابطوں کی
طرح فن کی "کرافٹنگ" کرتے ہیں — مگر اس
بہاؤ میں فنکار سمجھے جانے لگے ہیں۔ اس میں ان
کی صلاحیت کا کم اور ان کے پراسرار وسائل اور
ذرائع کا زیادہ دخل رہا ہے جن کی مدد سے یہ
نام نہاد فنکار — اشاعتی ادارے چلاتے ہیں

مجہول تنہائی اور زندگی سے فرار کا قاتل رجحان!

بیکر حیدرآباد؟

حد سے زیادہ آسائشیں، جنسی بے راہ روی، نشیات کا استعمال

اور نئے ذہنوں کی تخلیقات کی آڑ میں اپنے آپ کو نمایاں کرتے رہیں۔

پس ماندہ ترقی پسند یا درمیانئے:

اس ساری مہم کی پشت پر زیادہ تر وہ شخصیتیں ہیں جنھیں تناور درختوں تلے پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکا۔ چاہے فن میں ہو یا زندگی کے دوسرے شعبوں میں۔ ان ناکامیوں اور نا آسودگیوں نے بالآخر ایک درآمد شدہ نظریئے اور اسے پھیلانے کے مادی وسائل سے سمجھوتہ کر لیا تاکہ وہ بھی فن اور زندگی سے وہ سب حاصل کرنا جس کے اہل بزعم خود وہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے نہ صرف اپنے قلم اور اپنے ذہن بیچ دیئے بلکہ اپنے ضمیر کا بھی سودا کر لیا۔ آج آخر وہ ساری آسائشیں حاصل ہیں یعنی ادارے، انجمنوں کے عہدے اور غیر ملکی دورے۔ یہ سب کرنے کے لئے انہیں اپنا حلقۂ اثر بڑھانا اور اپنی کامیابیوں سے اپنے آقاؤں کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے عوام میں اور نئے ذہنوں میں آزادئ تحریر کے پرکشش نعرے کو مقبول کیا۔ اپنے سے فوراً پیشتر کے پیش کئے ہوئے فنی شہ پاروں کو پروپیگنڈہ اور وابستگی کے ادب (COMMITMENT) سے تعبیر کیا۔ اور سطحی جذباتیت، رومانیت، نعرے بازی اور طے شدہ نتائج وغیرہ جیسے خانوں میں فن کو تقسیم کیا۔ حالانکہ خود ان کے فن کا نمایاں موضوع یا تھیم طے شدہ نتائج پر مبنی ہے

پیکر حیدرآباد ۱۰

مثلاً فرد کئی خانوں میں بکھر چکا ہے، وہ تنہا ہے، اس کا ماضی سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے وغیرہ۔ اظہار فنی اظہار میں جہاں وضاحت، ترسیل یا ابلاغ ہو وہ فن نہیں بلکہ رپورٹنگ ہے۔ خطابت ہے وغیرہ وغیرہ ——

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بڑھی چڑھی رجائیت، سرخ ستارے کو سلام، انقلاب زندہ باد، درگنا سویرا جیسے موضوعات —— ترقی پسندی (ادبی اصطلاح) یا مارکسی نظریہ کی تبلیغ ہے فن نہیں ہے (کیونکہ یہ طے شدہ نتائج پر مبنی ہوتی ہے) تو تشکیک پسندی، شکستہ اقدار کا اعلان، ہجوم تنہائی یا زندگی کے مسائل سے فرار وغیرہ جیسے موضوعات کس طرح فن کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں جبکہ یہ نتائج بھی طے شدہ ہیں۔

پہلے تو ان درمیانیوں یا پس ماندہ ترقی پسندوں نے ادب میں تجزیاتی اور تحقیقی تنقید کا نعرہ بلند کیا مگر آہستہ آہستہ سماج اور معاشرے اور فن کا ہے سیاسی و سماجی پس منظر کو بھی تنقید کے لئے ضروری قرار دے دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے نزدیک آخر کون سا نظریہ درست ہے؟ کون سی ادبی تخلیق ان کے نزدیک فن ہے؟ اور کون سی تخلیق پروپیگنڈہ؟ ان مسائل کو طے کرنے کے لئے کچھ کسوٹیاں اور طریقے

گانجہ، چرس اور ایل ایس ڈی ـــــ امریکی نسل کی تباہی

بھی اٹھائی گئیں۔ بیشتر کالم بھی منعقد ہوئے مگر عجب بات یہ
تھی کہ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں کے چہروں
سے جب نقاب ہٹا کر دیکھے گئے تو یہی حلقے چلانے
والے سامنے آئے جنہوں نے بھونڈی میں منعقد
ترقی پسند ملکوں کانفرنس (۱۹۵۲ء) سے لے کر
حیدرآباد میں منعقدہ اردو کانفرنس (۱۹۵۶ء) تک
ہر جگہ عوامی فن کے انتہا پسندانہ نعرے بلند کئے تھے
آج وہ مغرب تاریکی کے قائل ہو چکے ہیں۔ یہ تبدیلی
زیادہ حیرت انگیز نہیں ہے کیونکہ ؎

شیطان ایک رات میں انسان ہو گئے
جتنے نمک حرام تھے کپتان ہو گئے

دراصل ان لوگوں کے مسخ شدہ کردار، بکے ہوئے
ضمیر اور خالص جھوٹ ـــــ حیرت انگیزی اور
بھولا دینے کی ایک ناقابل فراموش داستان ہیں۔

غداروں کی کارگزاری

اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ کچھ عرصہ
پہلے جدید ادیبوں کی ایک کانفرنس ہوا کی جانے والی
تھی، جس کے کنوینر تھے ـــ ادب کے ایک ڈاکٹر
ایک نشست میں ان کے گھر پر مسئلہ درپیش ہوا کہ
مالیہ کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ نشست میں موجود
ایک جدید کہانی کار و شاعر نے ایک ثقافتی ادارے
اور اس کے آرگن رسالے کے مدیر کو مطلع کرنے کی پیشکش
کیا جسے کنوینر نے بخوشی منظور کر لیا۔ کہانی کار نے
اپنا "گراہوا قلم" اٹھایا اور اس مدیر کو ایک خط
لکھا جس میں مالیہ کی فراہمی کا ذکر بھی کیا اور یہ
بھی لکھا کہ ان کی امیدیں، مجبوری کانفرنس کے
لئے ناگزیر ہے۔ خط پر ڈاک کر دینے کے بعد
بلیک ڈرافٹ یا منی آرڈر کا انتظار کیا جانے
لگا۔ مگر ملاقات نصیب ـــــ کہ وہ مدیر نہلے پہ دہلا
ثابت ہوا۔ اس نے اس خط کا سارا متن اپنے
رسالے میں شائع کر دیا۔ اب کیا تھا، بڑی لے
دے شروع ہو گئی۔ فوراً تیاری میٹنگ کا ہنگامی اجلاس
بلایا گیا۔ جس میں ادب کے ڈاکٹر نے اپنا دامن
بچانے کے لئے انتہائی صفائی سے سارا الزام
بیچارے کہانی کار پر ڈال دیا اور اس سے تحریری
معافی مانگنے کا مطالبہ کیا تاکہ اس تحریر کو بہت
سے رسائل میں شائع کروا کر اپنا بچاؤ کیا جا سکے
مختصر یہ کہ کہانی کار نے ایسا کرنے سے انکار
کر دیا اور کانفرنس ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ ان مثالوں
سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحریک کی اگلی صف کے لوگوں
کا کردار کتنا گھناؤنا اور ان کی شخصیتیں کتنی کھوکھلی ہیں

ایک اور پروفیسر صاحب ہیں جنہوں نے نوجوان
فنکاروں کو ایل۔ ایس۔ ڈی استعمال کرنے کا مشورہ
دیا ہے تاکہ وہ اس کے منتج ردِ عمل سے واقف
ہو سکیں اور اس احساس اور کیفیت کو اپنے اظہار
کا وسیلہ بنا سکیں جو ان گولیوں کا خاصہ ہے۔
ایک اور "نجات دہندہ" ہیں جنہوں نے تخلیقی عمل کے لئے

بیکر حیدرآباد ۱۱

پی ایل ۴۸۰ کا سرمایہ اور منفی ادبی سرگرمیاں

جنسی علامتوں کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ وہ سگمنڈ فرائیڈ سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں اور ہر تخلیقی فن میں علامتوں کو کھینچ تان کر جنسی علامت بنا دیتے ہیں۔ ایک اور پروفیسر صاحب نے حکومت اور عوام، سماج اور فرد کے درمیانی رشتے کو پاٹنے کا ایک ہی راستہ بتایا ہے اور وہ ہے ــــ "جنسی عمل" انہوں نے سیاسی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی تمام راستوں کو گمراہی کے راستے قرار دیا ہے۔

یہ سب کے سب کردار ہمارے اخلاقی، تعمیری اور تعلیمی اداروں کے ستون ہیں۔ اگر یہ ایسے نظریات کی تبلیغ مختلف میدانوں میں کرتے رہیں تو یہ بات یقینی ہے کہ آئندہ ایک دو دہوں میں باشعور ہونے والی اور تعلیم سے فراغت حاصل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھنے والی نسل اپنے ملک، اپنے تہذیبی و ثقافتی اقدار، توانائی اور اپنے مستقبل سے بالکلیہ مایوس ہو چکی ہوگی۔ وہ یا تو اپنے ملک میں [illegible] "بے مقصد زندگی" گذارے گی یا دوسرے ممالک میں منتقل ہو جائے گی۔ [illegible] ہمارے اپنے افراد پُر اسرار وسائل رکھنے والے زر خرید سدھائے ہوئے مہرے اپنے غیر ملکی آقاؤں کو خوش رکھنے کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔

دستِ غیب اور سوٹ والے

سماج کے مختلف شعبوں میں بڑھتے ہوئے ان منفی رجحانات

بیکر حیدرآباد ۱۲

کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ حکومت فوراً ایسے نام نہاد اداروں اور ان کے چلانے والوں کے خلاف مکمل تحقیقات کرائے۔ ان کے مالی وسائل، جائداد اور آمدنی کے ذرائع کی چھان بین کرائے۔ جس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی پس اندازی کے پچھلے دس پندرہ سالہ ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے کہ آیا وہ بینک کے ذریعہ جمع شدہ ہے یا پھر کوئی اور ناجائز وسیلہ ہے ورنہ کل کو ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو آج ان یورپی ممالک کا ہو رہا ہے جن کی امریکہ سرپرست ہے

ذہنوں کا سرقہ

پچھلے پچاس سال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ چند یورپی ممالک اور امریکہ میں فنی و تکنیکی ماہروں دانشوروں اور سائنس دانوں کا ایک کال سا پڑ گیا ہے۔ اس کی وجوہات ہیں ــــ ہوسناکی، جنگیں، صنعتی و سائنسی ترقی اور مادی خوشحالی جس کے نتیجہ میں حد سے زیادہ آسائشیں، جنسی بے راہ روی، نشیات کا استعمال، ذہنی انتشار اور پراگندہ خیالی وغیرہ ــــ افیون، گانجہ، چرس، اور ایل۔ ایس۔ ڈی کے استعمال نے نئی نسل کی ہر وہ اعلیٰ صلاحیت چھین لی ہے جو ملک کی ترقی کی ضامن ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ ملک دوسرے ملکوں کے سائنس دانوں تکنیکی ماہروں اور دانشوروں کو اپنے ملک میں بسانے کے لئے کروڑوں روپے خرچ کر رہا ہے۔ امریکہ کے نوبل پرائز لینے والوں کی فہرست اٹھا کر دیکھیں تو

موجودہ انتشار: ناانصافیوں کے خلاف نفرت کا اظہار

جبکہ 1/3 حصہ اس فہرست میں امریکہ کے نام ہر کوئی کبھی جاتے ہیں بیرونی ملکوں کے عالموں کا رجحان مختلف ہے۔

اس ملک کو ترقی اور اس کے مفاد صرف بیرونی ملکوں کے ماہر چاہتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کے طلبا جو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونی ممالک جاتے ہیں ان کو روزگار تعلیم اور رہائش ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

اور یہ طلبا اپنی توقع سے زیادہ آسائشوں اور سہولیات پا کر انہی ملکوں کے ہو رہنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ یہ بات سنجیدگی سے سوچنے کی ہے کہ آج امریکہ میں بڑھتی ہوئی بیروزگاری اور ساتھ روحانی خلفشار کے پریشان کن حالات میں غیر ملکی نوجوان کس طرح روزگار حاصل کر لیتے ہیں؟ اور پھر ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانے والے کتنے نوجوان واپس ملک کو آتے ہیں؟ اس بات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

دراصل بیرون ملک میں بس جانے والوں کو امریکی حکومت ہر قسم کا لالچ دیتی ہے اور اس طرح اپنے وطن کی تعمیر و ترقی میں اہم رول ادا کرنے والے یہ طالب علم کسی غیر ملک کی تعمیر و ترقی کا سہارا بن جاتے ہیں۔

برین واش BRAIN WASH

یہ بات یہیں تک محدود نہیں۔ سامراجی اور سرمایہ دارانہ طاقتیں ——— ترقی پذیر ممالک کی بڑھتی ہوئی ترقی سے اکثر گھبرائی ہوئی ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتیں کہ ترقی پذیر ممالک خود کفیل ہو جائیں اگر ایسا ہو جائے تو ان کا تختہ پلٹ جائے گا۔ یہ طاقتیں خصوصاً امریکی حکومت چاہتی ہے کہ ترقی پذیر ممالک ہمیشہ کے لئے پچھڑے رہیں۔ اور یہ یہ بھی ممکن ہے جب یہاں کے دانشوروں، فنکاروں اور اعلیٰ صلاحیت رکھنے والی نوجوان نسل کو ذہنی طور پر ناکارہ بنا دیا جائے۔ اس کے لئے ایک سوچی سمجھی اسکیم اس کے پاس ہے جس کے تحت وہ ہر اس شعبہ میں اپنے ایجنٹ بھیجتی ہے جہاں اس کو اپنے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم کا شعبہ بہت زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان کے تعلیمی شعبوں اور ادبی حلقوں میں بیس کاریس کی آڑ میں اس نے اپنا جال بڑی مہارت سے پھیلا دیا ہے۔ ہمارے یہاں کے بیشتر نام نہاد دانشوروں، جو اس کے چنگل میں آ گئے ہیں۔ لنگوٹ باندھ کر میدان ادب کی قیادت کا جھنڈا لے کر کود پڑے ہیں۔

ناجائز سے جائز

فلم اور صحافت یہ دو ذرائع ایسے ہیں جن کے ذریعہ ملک کے ہر فرد تک بڑی آسانی کے ساتھ پہنچا جا سکتا ہے اور اس کے ذہن کو متاثر کیا جا سکتا ہے اس لئے ان دو شعبوں پر بھی امریکہ کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ جس کا ثبوت ہماری علاقائی زبانوں کا گمراہ کن لٹریچر اور وہ فلمیں ہیں جن میں عریانیت اور جنسی لذت اندوزی کا بڑھتا ہوا سیلاب نوجوانوں کو تباہ کر رہا ہے۔

اس سے ہٹ کر ملک میں بیشتر ایسے ادارے

اور ہندی اخبارات جو ان دنوں وجود میں آگئی ہیں جن کی سرگرمیوں پر حکومت کو چاہیئے کہ کڑی نظر رکھے — یہ ممکن ہے کہ آئے دن ہونے والے اکثر بڑے بڑے فسادات اور کلچرل پروگراموں، بچیرٹی شوز کے ذریعہ بلیک منی کو WHITE – کے روپ میں بدلنے کی ایک منظم سازش کی جاتی ہو۔ تاکہ اپنے اداروں کو برسرعام کھلے عام کھیلنے کا موقع ہاتھ آ سکے اور یہ اپنے اثر و دبدبے میں اضافہ کر سکیں —— ان اداروں کے ذریعہ شائع ہونے والے رسالوں اور ان کی ذہنیت و سچائی پر حکومت کو کڑی نظر رکھنی چاہیئے تاکہ وہ اپنے مکروہ و ناپاک مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس طرح ہمارے ملک کی نوجوان نسل کو ایک — بھیانک خطرے سے بچایا جا سکتا ہے۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب نئی نسل کا ذہن کھوکھلا اور جسم بنجر ہو جائے گا۔

لمحۂ فکر

موجودہ غیر یقینی حالات نے آج کے نوجوانوں کو ایک انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے اطراف جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ یہ انتشار ایسا نہیں کہ ہم نہ پا سکیں، یہ انتشار تو نئے سماج کی تشکیل کے لئے ایک بے چینی کا اظہار ہے۔ بے انصافی عدم مساوات، کالا بازار اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف نفرت کا اظہار ہے۔ نئی نسل جو کہ مستقبل کے ہندوستان کی نگہبان ہے اگر وہ چند مفاد پرستوں کے پیدا کردہ مصنوعی انتشار کا حل —— برآمدہ نظر بندی یا ایل۔ ایس۔ ڈی میں تلاش کرتی ہے تو یہ اس کی نادانی ہے۔

"کیونکہ فسردگی یا عضو تناسل کی مسلسل بیداری سے ہم نے سورج کا منہ تو کیا، رات کو آسمان پر نظر آنے والے ستارے بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

آہ! ڈاکٹر لطیف

بین الاقوامی شہرت کے مالک پدم بھوشن ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ۲۴ نومبر ۱۹۷۱ کی صبح حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ وہ ایک ممتاز عالم، علوم مشرقیہ کے ماہر اور ۲۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا آخری کارنامہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہے جسے ساری دنیا نے قرآن کا بہترین ترجمہ قرار دیا۔ انھوں نے غالب پر انگریزی میں ایک یادگار کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے ہندوستان اور عرب ممالک کے درمیان خیرسگالی کو فروغ دینے کے زبردست خدمات انجام دیں۔ ان کی موت پر ادارہ گہرے رنج کا اظہار کرتا ہے۔

یہ تھی میرے کل کی کہانی:
دو ہونٹوں کے پیار کی حدت
دو جسموں کے لمس کی گرمی
دو پیکر اور ایک ہی سایہ
بے خواب آنکھیں
ایک تلاطم
بستر کی قسمت میں یہ تھا
سوچنے والے سوچ رہے تھے
ایک ہی پیکر
اس بستر پر
لیٹا ہوگا
لیکن بستر کی ہر سلوٹ
بول رہی تھی
اک پیکر اور ایسی قیامت؟
ناممکن ہے
ساری چادر الٹ گئی ہے!
یہ دن وہ تھے

یہ ہے میرے آج کا قصہ:
تنہا اکیلے جسم کی ٹھنڈک
اکیلے بچھونے کی تنہائی
اک پیکر اور لاکھوں سائے
بے خواب آنکھیں
ایک تلاطم
بستر کی قسمت میں اب یہ ہے
سوچنے والے سوچ رہے ہیں
لاکھوں پیکر
اس بستر پر
لیٹے ہوں گے
بستر کی ہر سلوٹ سینہ پیٹ رہی ہے
اک پیکر اور ایسی قیامت!
کیا غضب ہے
ساری چادر اُلٹ گئی ہے!
یہ دن وہ ہیں
جب تم اس دنیا میں نہیں ہو

جب تم اس دنیا میں تھیں اور میں زندہ تھا اور تمہارے بعد بھی میں اب تک زندہ ہوں

راشد آذر "تمنا" راج بھون روڈ۔ حیدرآباد۔۴

روزی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ کون اس کی طرف دیکھ
رہا ہے۔ وہ خاموش قسم کی لڑکی تھی۔ بہت سی باتیں جو اس
سے کم عمر کی لڑکیوں کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ بڑی مشکل سے
اس کے پلے پڑتی تھیں۔ بچپن ہی سے وہ خاموش کند ذہن
مشہور تھی۔ روزی کی ماں نے جب اسے ایک ڈاکٹر
کو دکھایا۔ تو ڈاکٹر نے بتایا کہ اس لڑکی کا دماغ۔۔۔۔
Retarded ہے۔ اور جو علاج اس کے لئے
بتایا۔ وہ اس قدر مہنگا تھا کہ روزی کی ماں زندگی بھر کام
کرتی رہے تو بھی اتنا نہ کما سکے گی۔ پلٹ کر وہ پھر کبھی روزی
کو کسی ڈاکٹر کے پاس نہ لے گئی۔ اس نے روزی کو وہی
کام سکھانا شروع کر دیا جو وہ کرتی تھی۔ یعنی گھروں میں

کرشن چندر

"دی نش" ایئر فلورسینٹ فرانسیس
ایونیو۔ سانتا کروز ویسٹ بمبئی ۵۴

جھاڑو بہارو کرنے صفائی اور برتن مانجھنے کا کام۔
ہوتے ہوتے چند سالوں میں روزی نے اپنے کند ذہن
کے باوجود یہ کام سیکھ لیا۔
روزی گلاب تو نہ تھی۔ مگر اسکا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ اسکا
چہرہ نکھرتا تھا۔ اور پھیکی پھیکی آنکھیں جن میں سمجھ یا ذہانت
کی چمک مفقود تھی۔ وہ آتے ہی سیدھے کچن میں گھس جاتی
اور سر جھکا کر اپنے کام میں لگ جاتی۔ وہ ایک ایسے میکانکی انداز
میں کام کرتی جاتی اور جو انداز اسکی ماں نے اسے سکھایا تھا۔
اس سے بال برابر ادھر ادھر نہ ہو سکتی تھی۔ گھر مالکن کو اسکا
یہی انداز سب سے زیادہ پسند تھا۔ آج کل یا ذہانت کر اپنے نوکروں
سے بیکر حیدرآباد (۶)

میں کون پسند کرتا ہے۔ یہ تو مالکوں کی منافقت [illegible]
روزی کی خاموشی اور غائب دماغی کو گھر کی مالکن نے [illegible]
لئے ایک طرح کی خوش قسمتی سمجھ کر معاف کر دیا۔
جب روزی نے برتن دھو کر فرصت سے سمیٹ دیئے۔
تو وہیں نل کھول کر اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ بال درست
کرنے اور برتن دھونے سے ماتھے پر آ گئے تھے
انہیں انگلیاں پھیر پھیر کر پیچھے کو دھکیلا کچن کے
ایک کونے میں مجید باورچی کام کرتا ہوا چور نگاہوں
سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

چند دنوں سے وہ روزی میں یک لخت ایک تبدیلی
دیکھ رہا تھا۔ رنگ اور کھلنے لگا تھا۔ جسم گدرانے لگا
تھا۔ سپاٹ سینے پر حباب پیدا ہو گئے۔ کچھ اس کی
سمجھ میں نہ آیا۔ وہ کیا کرے۔ بار بار اسے تکے جاتا
تھا۔ روزی بڑی بے وقوف لڑکی تھی۔ اور مشکل سے
کوئی بات اس کے پلے پڑتی تھی۔ تین چار بار سمجھانا
پڑتا تھا۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ آتا تھا۔ چند دن ہوئے
اس کی ماں نے اسے بتایا کہ اب وہ بارھواں سال ختم
کر کے تیرھویں میں قدم رکھ رہی ہے۔ مگر روزی کی سمجھ
میں کچھ نہ آیا۔ اور آتا بھی کیا۔ غریبی میں سبھی سال ایک
سے معلوم ہوتے ہیں۔

نو سال کی عمر سے روزی اپنی ماں کے ساتھ کام پر جاتی
تھی۔ اب جا کے اس نے جب سب سیکھ لیا۔ اور وہ
بارھویں سے تیرھویں میں آ گئی۔ تو اس کی ماں نے اسے
الگ سے مسز جینتی لال گلاس کے ہاں کام پر لگا دیا۔

مسز جینی پے گلاس گٹھیا کی مریض تھی۔ اس لئے اکثر بستر پر رہتی تھی۔ اس کے خاوند ڈیوڈ پے گلاس کو فالج تھا۔ اس لئے وہ بھی بستر پر رہتا تھا۔ مجید ان کا پرانا نوکر ہی سب کچھ تھا۔ وہ بیس برس کا لونڈا اس گھر میں آیا تھا۔ اور اب وہ چالیس برس کا ہو چکا تھا۔ کھانے وہ بہت اچھے پکاتا تھا۔ مسز جینی پے گلاس نے اسے کچن کے ہر کام میں طاق کر دیا تھا۔ مگر اب وہ اپنی بیماری کی وجہ سے کچن میں بہت کم جاتی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنے وسیع بیڈ روم میں بڑے بڑے کراہتے رہتے۔ بڑبڑاتے

رہتے۔ یا ایام رفتہ کی عظمتوں کو یاد کر کے کر آہیں بھرتے۔ بازار سے سودا سلف مجید لاتا تھا۔ اور میاں بیوی کے لئے دوائیں بھی۔ گھر ڈھنڈار نما بڑا تھا۔ دو بیڈ روم اور تھے۔ ان کے دو بیٹوں کے لئے ۔۔۔ مگر گھر کے دونوں بیٹوں نے امریکہ میں پڑھ کے وہیں شادی کر لی تھی اور وہیں بس گئے تھے۔ بڈھے بڈھی کی زندگی بڑی بے رس تھی۔ اور اب تو مجید بھی اس زندگی سے اکتانے لگا تھا۔ اس لئے افیم کا چسکا لگا لیا تھا۔ اور تھوڑے کا پی

اور دوسرے شے بھی کرتا رہتا تھا۔ مجید سلیقے سے انناس کی پلیٹ میں ایپل پائی رکھ کر ایک خالی بیٹھک میں چلا گیا۔ جس کا دروازہ کچن کے بالکل سامنے تھا۔ جب روزی کام ختم کر کے جانے لگی تو مجید نے بیٹھک سے کھڑے کھڑے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر چلی گئی روزی۔

"کیا ہے؟"

وہ بولا: "ایپل پائی کھاؤ گی۔؟"

روزی کو ایپل پائی بہت پسند تھی۔ اسے میٹھے کا بہت شوق تھا۔ اور مجید میٹھا بہت اچھا بناتا تھا۔ اکثر مجید کی نظر بچا کر فرج کھول کر منہ میں میٹھے کا ایک آدھ چمچہ بھر لیا کرتی تھی۔

مگر آج تو کھلی دعوت تھی۔ ایپل پائی کی آدھی پلیٹ لیا اب مجید ۔ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے کھل گئے۔ اور اس نے آگے ہاتھ بڑھا دیا۔

مجید نے پلیٹ پیچھے کر لی۔ بولا: "یوں نہیں۔ پہلے دروا

بند کرو ۔۔۔"

"کیوں ؟" وہ بولی ۔

"اگر میم صاحب آگئیں ۔ اور انہوں نے تمہیں ایپل پائی کھاتے ہوئے دیکھ لیا تو ماریں گی۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" روزی نے سوچا اور دروازہ بھیڑ دیا ۔۔۔

"اب چٹخنی بھی لگا دو ۔"

"چٹخنی کیوں ؟" روزی نے پھر کالی حماقت بھرے لہجے میں پوچھا ۔۔۔

"اگر میم صاحب نے باہر سے دروازہ کھول دیا تو؟" مجید نے پوچھا۔

روزی نے اثبات میں سر ہلا کر چٹخنی لگا دی ۔

مجید نے اس خالی بیڈ روم میں آنے سے پہلے اچھی طرح اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ بڈھا پے گلاس کب سے بیت الخلا جانے کے لئے چلا رہا تھا ۔ اور اپنے گھٹیا کے باوجود یہ سب کام اس کی بیوی خود کرتی تھی۔ جینی پے گلاس نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اب وہ دروازہ ایک گھنٹے سے پہلے کھلنے والا نہیں

جب روزی اندر کی چٹخنی چڑھا کے مجید کی طرف بڑھی تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا ۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے بار بار ایپل پائی کی پلیٹ کی طرف دیکھنے لگی ۔

مجید بستر پر بیٹھ گیا ۔ اپنے قریب اس نے ایک ٹیبل کھسکا لی ۔ اس پر ایپل پائی کی پلیٹ رکھدی ۔ اور روزی کو اپنے قریب بٹھا کر بولا ۔

"لو کھاؤ ۔۔۔"

"اس بستر پر بیٹھ کر ؟ ٹیبل پر ؟" روزی کو اچنبھا ہونے لگا۔

"ہاں ۔ ہاں ۔ ہاں کون دیکھتا ہے ۔ مزے سے بیٹھ کر کھاؤ۔" مجید بولا ۔

روزی بستر پر بیٹھ گئی ۔ اس کی ٹانگیں نیچے لٹکنے لگیں اس نے ٹیبل ذرا سی اور آگے اپنی طرف کھسکا لی ۔ اور ایپل پائی کی پلیٹ قریب کر کے چمچہ بھر بھر کر مزے سے کھانے لگی ۔ مجید ہولے ہولے روزی کی پیٹھ سہلانے لگا۔

اب وہ روز میٹھا کھانے لگی ۔ مجید اس کے لئے کبھی ایپل پائی بناتا ۔ کبھی سوفلے ۔ کبھی کسٹرڈ ۔ کبھی فروٹ سلاد اور کریم ۔ کبھی آئس کریم اور فروٹ ۔ اب تو میٹھے سے پہلے وہ ناشتہ بھی نہیں کرتی تھی ۔ مگر خدا کا شکر ہے میم صاحب کو کچھ پتہ نہ تھا ۔

اس بات کا پتہ تو روزی کے ماں باپ کو بھی نہ تھا نہ اس کی بڑی بہن گیبر نیلا کو جو دو تین گھروں میں وہی کام کرتی تھی جو روزی مسز پے گلاس کے ہاں کرتی تھی ۔ یعنی یہی جھاڑو ، کٹکا اور برتن صاف کرنے کا کام ۔ یہی کام گیبر نیلا اور روزی کی ماں بھی کرتی تھی صرف بڈھا طہماسپ ان کا باپ کوئی کام نہ کرتا تھا ۔ کیونکہ وہ ایک شریف آدمی تھا ۔ اور تعلیم یافتہ بھی تھا ایک زمانے میں کلرک تھا ۔ پھر کسی غبن کے سلسلے میں نکالا گیا ۔ مگر وہ ایک زمانے میں کلرک تھا ۔ پھر کسی غبن کے سلسلے میں نکالا گیا ۔ مگر وہ ایک پڑھا لکھا آدمی تھا ۔

اور گیبریل اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اس کے بچوں سے بہت
کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کافی بوڑھا تھا کہ اس کو کوئی
آنکھیں کمزور ہو گئی تھیں کام کیا چل جاتا تھا اس کے
کے لئے شراب کی روزی آ جاتا تھا۔ گیبریل کا شوہر
ایک جہاز پر خلاصی تھا اور سال میں دو ایک بار چھٹی
لے کر آتا تھا اور گیبریل کو ایک بچہ دے کر رخصت
ہو جاتا تھا۔ اپنے داماد کے آنے پر بڑھا طہاس بہت
مسرور ہوتا تھا اور اس کے جانے کے بعد بھی اکثر اپنے
داماد کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ دیل مین۔ ہم کوئی ایسے
دیا گری بار کا گنڈہ نہیں ہے۔ ہم جنٹلمین ہیں جنٹلمین
ہمارا سن بلا و سیلر (Sailor) ہے سیلر!

اس لئے جب تیسرے مہینے روزی کا پیٹ بڑھنا شروع
ہوا۔ اس حد تک کہ دکھائی دینے لگا۔ تو روزی ڈرنے
لگی۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا۔ ماں نے گیبریل کو۔
گیبریل نے طہاس کو۔ تو بڑھا بہت خفا ہوا اور جب
اُسے معلوم ہوا کہ یہ پیٹ کسی عیسائی سے لا نہیں کسی
مسلمان سے ٹھہرا ہے تو وہ بہت جھنجھلایا۔ مگر اب
کیا کر سکتا تھا۔ روزی کو سمجھایا گیا کہ وہ جا کر مجید سے
بات کرے اور پیٹ گرانے کے لئے اُس سے
پچاس ساٹھ روپے مانگ لے۔
نہیں تو بہت گڑبڑ ہو جائے گا۔ بڑھا طہاس گھور
کر بولا۔ "ہم عزت والا ہے"۔
مگر جب روزی مجید کے پاس گئی۔ اور اس سے
پیٹ گرانے کے لئے پیسے مانگے تو مجید نے صاف
انکار کر دیا۔

"نہ ہاں ـ میں کیوں تمہارا پیٹ گراؤں۔ اس کے اندر
میرا بچہ پل رہا ہے۔ میں اسے پالوں گا۔ تمہیں ایک
کھولی لے کر دوں گا تمہارے سنگ اپنی زندگی بسر
کروں گا۔ یہ پیٹ گرانا بہت بری بات ہے۔ تم
بے فکر رہو بس پیدا ہونے دو کر کے بچہ جنو"
روزی مان گئی۔ آخر عورت کو اور چاہئے کیا ایک
شوہر ایک بچہ۔ ایک گھر۔ اور اس نے بچہ جننے
کا فیصلہ کر لیا۔
مگر بات پھیل گئی تھی۔ یہ محلہ عیسائیوں کا تھا۔ اور
پیٹ ایک مسلمان کا۔ اس لئے پہلے تو مجید کو کھولی
کے ہاں سے جواب مل گیا پھر روزی کے باپ نے
اُسے اپنی کھولی سے نکال دیا کیونکہ وہ عزت والا
تھا۔
مجید بولا: "وہ عزت والا ہے تو ہم بھی عزت والا ہے
ہم تمہارے لئے ایک کھولی لیتا ہے۔ اس میں تم کو
ابھی کا ابھی رکھتا ہے اپنی بیوی کے ماتحت —"

مجید نے گول بار میں ایک چھوٹی سی کھولی لے لی۔ ٹاٹ
اور بوری۔ سینما کے اشتہار اور گتے اور دو ہے کے
پترے جوڑ جاڑ کر بنائی گئی کھولی۔ مگر روزی اس
کھولی میں بہت خوش تھی۔ اب یہ کھولی اس کی اپنی
تھی۔ اس کا بھاڑا مجید دیتا تھا وہ دن بھر کام کاج
ڈھونڈتا۔ اور شام کو ٹھرا پی کھولی میں آ کر سو جاتا۔ جس
دن زیادہ پی لیتا، اُس دن وہ روزی کو مارتا بھی تھا۔
مگر روزی کو اس پر کوئی حیرت نہ ہوتی۔ جس علاقے
میں وہ رہتی تھی اس علاقے میں ہر رات شوہر ٹھرا پی

کرائے پر جا کر ان بیویوں کی پٹائی کرتے تھے۔ اس لئے اگر روزی کی پٹائی نہ ہوتی تو روزی کو حیرت ہوتی۔ روزی نے اُسے اپنے لئے ایک سزا نہیں سمجھا اپنا حق سمجھ کر مطمئن ہو گئی۔

بچہ پیدا ہونے کے دس پندرہ دن بعد ایک شام مجید اپنی کھولی میں واپس نہیں آیا۔ تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ گولی بار کی کسی دوسری کھولی میں کسی دھندا کرنے والی عورت کے ہاں پی کر پڑا تھا۔ بڈھے طہماس نے اپنے دو چار گنڈے دوست بھیج کر مجید کو پکڑ کر بلایا اور اُس سے کہا۔" اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی تو تمہاری اچھی طرح مرمت کی جائے گی۔ دیکھو۔ روز شام کو بلا ناغہ واپس گھر آیا کرو شریفوں کی طرح۔ اور جیلی سے رہو اور اب جب بچہ بھی پیدا ہو چکا ہے، تم روزی کے سنگ چرچ میں جا کر شادی کر لو۔

مجید نے حامی بھری مگر اس واقعہ کے آٹھ دس روز بعد ایک رات مجید اپنی کھولی سے ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ کبھی اس محلّے میں نہ دیکھا گیا۔ معلوم کرنے سے پتہ چلا کہ اسے عیسائیوں کے اس شریف محلّے میں اب کوئی کام دینے پر تیار نہ تھا۔ اب اُسے بڑی مشکل سے کولابہ کے ایک فلیٹ میں کام ملا تھا۔ اور کولابہ گولی بار سے اتنے فاصلے پر تھا کہ رات کے دس گیارہ بجے اپنا کام ختم کر کے وہ واپس گولی بار کسی طرح نہ آ سکتا تھا۔ نہ آنے جانے کے لئے اتنے پیسے خرچ کر سکتا تھا

اور وہ علاقہ اتنے بڑے امیروں کا علاقہ تھا اور وہاں کے گنڈے اتنے بڑے دھندے کرتے تھے کہ وہ کسی طرح روزی کے لئے گولی بار کے گنڈوں کی مدد کرنے پر تیار نہ ہوئے اور اب کے بڈھے طہماس نے گنڈوں کے ذریعے مجید کو واپس بلانے کی جتنی ترکیبیں سوچیں سب ناکام رہیں۔ تو بڈھے طہماس نے اپنی بیٹی کو عاق کر دیا۔ روزی اپنا بچہ لے کر اپنی کھولی میں رہنے لگی۔ اور ادھر ادھر کام ڈھونڈنے لگی بہت جلد اُسے کام مل گیا۔ اس پر ترس کھانے والوں کی کمی نہ تھی مگر اب مصیبت یہ آن پڑی کہ وہ اس چھوٹے سے بچے کو لے کر کام پر کیسے جائے۔

اس موقع پر ولیم لنجا اس کے کام آیا۔ ولیم کسی زمانے میں ایک مل مزدور تھا۔ مگر ایک حادثے میں اُس کا دایاں ہاتھ جاتا رہا۔ اور اب وہ تقریباً بیکار ہو کر گولی بار میں رہتا تھا۔ اور شام کو بڑے بڑے عیسائی گھروں میں ٹھرا پہنچانے کا کام کرتا تھا۔ وہ بہت چیت وچالاک تھا، کبھی کبھی جیب بھی کتر لیتا تھا۔ کبھی کبھی دھندے والی عورتوں کی دلالی بھی کرتا۔ مگر سب کچھ کرنے پر بھی پھٹے حال رہتا۔

ولیم لنجے نے کہا۔ دیکھو روزی اگر تم مجھے رات کو سر چھپانے کی جگہ دے دو اپنی کھولی میں تو میں دن بھر تمہارا بچہ کھلایا کروں گا۔ میرا دھندا رات کا ہے۔ تمہارا دن کا۔ تم بے فکر ہو کر دن بھر کام پر جاؤ میں رات کو دیڑھ دو بجے آ کے ایک کونے میں پڑ جایا کروں گا

تمہیں کسی طرح کی پریشانی نہ ہوگی۔ مجھ پر پورا بھروسہ کرو۔"

بات روزی کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے ولیم بچے کو بچے کے کمرے سے باہر کر لیا اور اُسے اپنی کھولی میں جگہ دے دی۔ دن بھر بے فکر ہو کر اپنے کام پر جاتی۔ ولیم بچے کے لئے دودھ تیار کرتا۔ اُسے پیشاب کراتا اس کا پاخانہ صاف کرتا۔ اُسے نہلاتا دھلاتا سُلاتا اور اپنی عجیب بے ہنگم سی آواز میں اُسے لوری بھی سناتا۔ ہوتے ہوتے وہ بچے سے اور روزی سے مانوس ہوتا گیا۔

پھر سات ماہ گذر گئے۔ یکایک ایک دن روزی کو معلوم ہوا کہ وہ پھر پیٹ سے ہے۔ اس بار اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرور یہ پیٹ گرا دے گی مگر جب یہ ولیم نے سنا تو چراغ پا ہو گیا۔ "تم میرے بچے کی جان لوگی۔ کیوں؟ کیا میں ہمیشہ کی طرح بے سامان ہوں۔ دھوکے باز ہوں۔ دیکھو مجھ پر پورا بھروسہ کرو۔ اطمینان سے بچہ جنو۔ میں اس بچے کے لئے پالنا لاؤں گا۔ ایک چھوٹا پنگوڑا۔ اسے اسی کونے میں رکھ دوں گا۔" اس نے ہاتھ سے کھولی کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا "اور دونوں ننھے بھائی بڑے مزے سے اس جھولے میں رہیں گے۔ اور ہم دونوں ادھر۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے کھولی کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کیا "جب تک تم ہسپتال سے آتی ہو۔ میں اس کھولی کو اپ ٹو ڈیٹ کر دوں گا۔ اس میں المونیم کے برتن لے آؤں گا اور تمہارے ننھے کے لئے کپڑے بھی اور تمہارے لئے دو فراک۔ کیا مجھ کو سمجھا ہے تم نے ولیم بیوقوف کو؟ یہ بچہ میرا ہوگا۔ میں تم سے شادی کروں گا تم مجھ سے آرام سے ہسپتال جا کر بچہ جنو۔ ادھر ناکے کے سرکاری ہسپتال میں میرا ایک وارڈ واقف ہے۔ اس سے کہہ کر تمہارا سب کام فرسٹ کلاس ہو جائے گا۔ اور جب تم ہسپتال سے آؤ گی تو ایک روز تمہارے باپ سے پوچھ کر چرچ میں چلے جائیں گے اور شادی بنا لیں گے۔ کیوں؟"

دوسرا بچہ جننے کے بعد جب روزی اپنی کھولی میں آئی تو نہ پالنا تھا نہ پنگوڑا۔ نہ جھولا۔ نہ المونیم کے برتن بلکہ گھر میں جو تھوڑا سا سامان اُس نے اکٹھا کیا تھا وہ بھی صاف ہو چکا تھا اور ولیم تو تھا ہی غائب تھا۔ بچہ جننے کے دوران پہلے وہ اُسے دیکھنے ہسپتال میں آیا تھا اور اُسے ہر طرح کی تسلی دے کر رخصت ہو گیا تھا

روزی نے سوچا شاید وہ پیسوں کا بندوبست کرنے گیا ہوگا ابھی آتا ہوگا۔ ولیم ایسا برا آدمی بھی نہ تھا۔ اس نے کبھی روزی کو پیٹا نہیں تھا۔ ہسپتال میں آ کے بھی بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ اور تین بار اس کے لئے پھل بھی لایا تھا۔ روزی کو اس پر پورا بھروسہ تھا۔

مگر جب بہت دن گزر گئے تو ولیم نہ آیا اور جب جگہ جگہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھی پتہ نہ چلا تو روزی نے سمجھ لیا

کہ جمیلہ کی طرح ولیم لیجا بھی کہیں غائب ہو گیا اور اب نہیں آئے گا۔

ہولے ہولے زندگی پرانے ڈھرے پر آنے لگی۔ بڈھے طپاس کی محبت کے باوجود ایک دن روزی کی ماں روزی کے بڑے بیٹے کو اپنے گھر لے آئی۔ اور ماں اور گیبر نیا دونوں روزی کے نئے بچے کو دیکھنے کے لئے باری باری جانے لگیں۔ مگر بڈھا طپاس اس بات پر اڑا رہا کہ وہ حرامجادی کبھی اس گھر میں نہیں آئے گی۔ تم وہاں جا سکتی ہو مگر وہ یہاں نہیں آسکتی۔ کیونکہ میں عجت . . . .

چنانچہ روزی کو کبھی ماں آکے دیکھ جاتی۔ کبھی گیبر نیا زیادہ تر دونوں بچوں کو آٹھ برس کی ایک لڑکی ڈمپیا دیکھتی تھی جسے گوا سے اس کے ماں باپ نے بمبئی اپنی قسمت آزمانے کے لئے روزی کی ماں کے پاس بھیجا تھا۔ ڈمپیا کو تین روپیے مہینہ ملتے تھے۔ اور دو وقت کا کھانا۔ آٹھ سال کی بچی کو اس سے زیادہ کیا چاہیئے۔

ہولے ہولے روزی اپنی اکیلی زندگی سے مانوس ہوتی گئی۔ ہولے ہولے وہ پھر سے کام پر جانے لگی۔ اُسے کسی بات پر حیرت نہ تھی کیونکہ حیرت رکھنے کے لئے بھی کچھ نا ضروری ہے۔ اور اب تک جو کچھ ہوا تھا وہ روزی کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

ایک شام وہ کام سے فارغ ہو کر اپنے جھونپڑے کے پیچھے

کوٹے کھولی کے باہر کھڑی تھی جو گولی بار کے بالکل ایک سرے پر واقع تھی۔ یہاں سے گلی بھر کے جھونپڑوں میں گھری ہوئی ایک پتلی سڑک سانتا کروز سب وے سے آنے والی موٹروں کو ائیرپورٹ جانے والی ہائی وے کی طرف لے جاتی تھی۔

شام کا وقت تھا سمندر سے ہوا نمک اور مچھلی کی بو لانے لگی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ امیر عیسائی گھرانوں کے جوڑے عمدہ لباس پہنے شام کی چہل قدمی کے لئے نکلنے لگے تھے۔ روزی بے حس کھڑی اپنے بچہ کو اٹھائے اپنی کھولی کے باہر کھڑی تھی جو بالکل لب سڑک تھی۔

یکایک کھولی کے سامنے سے ایک جوڑا گذر گیا۔ لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں نم تھیں اور وہ اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ لڑکا سرمئی رنگ کی بیل باٹم اور سبز رنگ کا بشرٹ پہنے۔ لڑکی کی کمر پہ ہاتھ رکھے اکڑتا ہوا چل رہا تھا اور شدت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا "پام مجھ پہ بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک۔ میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں۔ مجھ پر پورا بھروسہ رکھو"

یہ بات سنتے ہی جانے روزی کو کیا ہوا۔ جیسے اس کے دماغ میں کھڑکی کھل گئی اور وہ جو نہ جمیلہ کے جانے پر روئی تھی نہ ولیم لیجا کے غائب ہونے پر۔ اب یکایک اس نوجوان کے الفاظ سن کر تھر تھر کانپنے لگی۔ یکایک اس نے زور سے اپنے بچہ کو سینے سے لپٹا لیا اور سر نیچا کر کے سسک سسک کر اس جانے والی لڑکی کے لئے رونے لگی۔ ■■

غزلیں

مظفر حنفی
میواتی پورہ۔ بھوپالی گیٹ
سیہور۔ بھوپال

ہے تیرگی کا راج ہمارے مکان پر
تارے چمک رہے ہیں تو دور آسمان پر

یاروں کو رشک ہے مری ترچھی اڑان پر
کانٹے بنے ہوئے ہیں مرے دھان پان پر

سینے پہ لامکاں کے چلائے کوئی مجھے
کب سے کھنچا ہوا ہوں بدن کی کمان پر

بندوق چیخ مار کے بے ہوش ہو گئی
جب شیر نے چھلانگ لگائی مچان پر

میں ہاتھ کی لکیر پہ ہی فاتحہ پڑھوں
الزام کیا لگاؤں کسی مہربان پر

اب دیکھنا ہے کون کسے آزمائے گا
میں بھی اک امتحان ہوں ترے امتحان پر

نرغے میں مجھ کو میرے ہی اپنوں نے لے لیا
مارا گیا خود اپنے لہو کے نشان پر

صوفے کا نرم فوم بدن کاٹنے لگا
گرمی بہت ہے لیٹ رہو سبز لان پر

کٹتی نہیں یہ رات، مظفر! غزل کہو
تیشہ اٹھاؤ وقت کی کالی چٹان پر

بن کے چھا جا بدن کو چھو کے کوچہ سہی
آؤ ذرا دیر کو یہ بھی تماشا ہی سہی

ٹوٹے ستارے کو پھر فرق ہی پڑتا ہے کیا
سینۂ صحرا نہیں، دامنِ دریا ہی سہی

دھوپ کے صحراؤں میں کوئی سہارا تو ہو
چھت نہیں گھر کی اگر ابر کا ٹکڑا ہی سہی

یوں بھی بہلتا ہے جی یوں بھی گزرتے ہیں دن
ہم کو کسی اور کا آپ یہ دھوکا ہی سہی

کس کو پتہ کل تلک وقت کی موجِ رواں
کس کے حوالے کرے آج میں اپنا ہی سہی

تو ہم اُسے جان کا روگ بنالیں مگر کیا
سچ ہے نہیں وہ بُرا، ٹھیک ہے اچھا ہی سہی

کل کا نیا آفتاب کس کو خبر لائے گا
آج سرِ دل پر کسی پیڑ کا سایہ ہی سہی

بشر نواز
محلہ گھاٹی۔ اورنگ آباد

سورج مکھی

حکیم یوسف حسین خاں ۔ دارالعوام مغل پورہ حیدرآباد ۲

اب کے برس جب سورج نکلا
پگڈنڈی پر
سورج مکھی کا پھر اک پودا
دل میں شب کا غم چھپائے
اوس کے آنسو سر پہ اٹھائے
عمر کے تنہا پن میں نہائے
پھر سورج کو دیکھ رہا تھا!

سورج مکھی کی پنکھڑیوں کو
کس نے گنا ہے؟
رات گزرنا کتنا کٹھن ہے
یہ سب قصہ کس نے سنا ہے!
پھول سحر کا نقش قدم ہے

رات کا کالا تاگا لے کر
دن کا چمکتا ہنستا سورج
پھول نے اپنے دل میں بُنا ہے
سورج مکھی کی آنکھ کا حلقہ
نم ہے اگر تو کتنا نم ہے
اس کے لیے سورج کو نہ دیکھو
سورج کو کب اس کا غم ہے
وقت سے پوچھو
آس سے پوچھو
سانس کی بالک ہٹ سے پوچھو
کاہکشاں کے ٹکڑے کرنا
اُن میں رنگ دھنک کے بھرنا
دن کا مسافر بتلائے گا
شب کے سفر میں کتنا اہم ہے؟
کتنا اہم ہے!

جس نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ادارہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ چار فیصد کتابوں کو نصاب سے قطعی طور پر خارج کردیا جانا چاہیے۔ ان میں ایسا مواد دیا گیا ہے جو قومی یکجہتی کے خلاف ہے۔ ان کے علاوہ بیس فیصد کتابیں ایسی ہیں جن پر جولائی ۱۹۸۲ء سے قبل نظر ثانی ضروری ہے۔ دس فیصد کتابیں ایسی ہیں جن کے بعض حصے قابل اعتراض ہیں اور انھیں جولائی سے پہلے کتابوں سے خارج کردیا جانا چاہیے۔ کونسل نے مجموعی طور پر ۳۵ فیصد کتابوں کو کسی نہ کسی رخ سے قابل اعتراض قرار دیا ہے۔

اوور ڈرافٹ

ریاستوں میں سیاسی نظم و ضبط کی غیر تشفی بخش صورت حال کے علاوہ ریاستوں کے اوور ڈرافٹس پریشان کن حد تک پہونچ گئے ہیں۔

ملک کی اکثر ریاستی حکومتیں ریزرو بینک آف انڈیا سے مسلسل اوور ڈرافٹس حاصل کر رہی ہیں۔ حالانکہ مرکزی حکومت نے انہیں متعدد بار ہدایت دی ہے کہ وہ اپنی مالی صورت حال کا جائزہ لیں اور اسے بہتر بنانے کیلئے اقدامات کریں تاکہ منصوبہ بند اور غیر منصوبہ بند مدوں کا

"پیکر" حیدرآباد ۲۵

نصابی کتب کی اصلاح

درسی کتب کی اصلاح کا مسئلہ کچھ عرصہ سے [illegible] کے دوران بار بار کیا جاتا رہا۔ ۱۹۷۷ء میں راجیہ سبھا میں ایک غیر سرکاری تحریک پر اراکین کی ایک بڑی تعداد نے نہ صرف اس تحریک کی ضرورت سے اتفاق کیا بلکہ ان کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ چنانچہ حکومت نے خواجہ غلام السیدین کی صدارت میں چند ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کردی۔ کمیٹی نے نصابی کتابوں کا جائزہ لیا اور یہ سفارش کی تھی کہ کتابوں کی چھان بین اور قابل اعتراض حصوں کی نشاندہی کا کام تعلیمی تحقیق اور تربیت کی کونسل کے سپرد کردیا جائے۔ حکومت نے اسی سفارش کی روشنی میں گذشتہ سال کونسل کو یہ ذمہ داری سونپی۔ کونسل نے دس ریاستوں کی نصابی کتب کا جائزہ لینے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس سے نہ صرف یہ بات ثابت ہوگئی کہ اقلیتوں کی شکایتیں درست تھیں بلکہ یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی کوششوں کو ان کتابوں سے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا ہے۔ کونسل نے تقریباً ۱۳ ہزار کتابوں کا جو سائنس، علوم انسانی اور فنون لطیفہ سے متعلق نہیں جائزہ لیکر کچھ نتائج مرتب کئے۔ پھر اس پر چار ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک کمیٹی نے غور کیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر مسٹر ایس۔ وی۔ سی آئیا نے ایک پریس کانفرنس میں اب تک کی پیش رفت کا جائزہ پیش کرتے

کے تحت اخراجات کو ان کے ذرائع کے مطابق بنایا جائے
مرکزی حکومت کی جانب سے ریاستوں کو دیئے جانے
والے اڈوانس یا ادھار کے ذریعہ ریزرو بنک کے اوورڈرافٹس
کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ مرکزی حکومت اپنے دئے ہوئے
اڈوانس اسی مالی سال کے دوران ان ریاستوں کو بجٹ
دوسری رقموں میں سے واپس حاصل کرلیتی ہے۔ مرکزی
حکومت کو اس بات پر تشویش ہے کہ سال بہ سال
ریاستوں کے اوورڈرافٹس میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے
ریاستوں کے اوورڈرافٹس جو ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو صرف
۵۰ء۱۴ کروڑ روپے ہی تھے۔ دوسرے ہی سال یعنی
۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء کو ۸ء۱۴۴ کروڑ روپے تک پہونچ
گئے۔ اس کے بعد کے سال یعنی ۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو
وہ گھٹ کر ۷۰ء۱۱۸ کروڑ روپے کے ہوگئے لیکن پھر ان
میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا اور ۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء کو وہ
۷۴ء۲۵۴ کروڑ روپے تک پہونچ گئے اور اسی سال ختم
جون میں بڑھ کر ۳۰۰ کروڑ روپے تک پہونچ گئے۔ اس
مسئلہ پر غور کرنے کیلئے مرکزی وزیر فینانس مسٹر وائی۔بی۔
چوان نے ۳۰ جون ۱۹۷۱ء کو ایک کانفرنس طلب کی تھی
جس میں مرکزی وزیر منصوبہ بندی کے علاوہ گورنر ریزرو بنک
آف انڈیا نے بھی شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد
مسٹر چوان نے ریاستی گورنروں اور چیف منسٹروں کے نام
ایک مکتوب روانہ کیا جس میں ان سے خواہش کی گئی تھی
کہ وہ اپنی ریاستوں کی مالی صورت حال کا جائزہ لیں اور
اپنی ریاستوں کے ذرائع و وسائل اور اخراجات میں توازن
پیدا کرنے کیلئے فوری سخت اقدامات عمل میں لائیں۔ مسٹر چوان
نے خصوصی طور پر دس ریاستوں کو یہ مکتوب روانہ کیا جہاں

اوورڈرافٹ [illegible]
ان ریاستوں میں آندھرا پردیش، آسام، بہار، [illegible]
مہاراشٹرا، میسور، راجستھان، [illegible]
شامل ہیں۔ اوورڈرافٹس کا ضرورت سے زیادہ حکومت کو
[illegible] یا تو اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ان کی رقموں کی
وصولی اور اخراجات میں یکسانیت نہیں ہوتی یا ان کے
ذرائع و وسائل اور اخراجات کے مابین توازن نہیں
ہوتا۔ غیر متوقع قدرتی مصائب جیسے سیلاب اور خشک
سالی بھی اوورڈرافٹس کی صورت حال کو اور بھی پریشان
کن بنادیتے ہیں۔ ریزرو بنک آف انڈیا سے ایک معاہدہ
کے تحت ہر ریاستی حکومت ریزرو بنک کے پاس ایک
اقل ترین رقم رکھتی ہے جس کا تعین تین سال کے عرصہ
میں ریاست کی آمدنی و خرچ کے تناسب کی روشنی میں کیا
جاتا ہے۔

فسادات

مہاراشٹرا کو جہاں ملک کی ایک خوش حال صنعتی
اعتبار سے انتہائی ترقی یافتہ اور کانگریس کا مضبوط گڑھ
ہونے کا فخر حاصل ہے وہیں فرقہ وارانہ فسادات کے لحاظ
سے سر فہرست ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ۱۹۷۰ء
میں پورے ملک میں چھوٹے بڑے ۵۲۱ فسادات ہوئے
جن میں ۱۶۱ فسادات مہاراشٹرا کے حصہ میں آئے۔ اس کا
مطلب یہ ہوا کہ مجموعی طور پر ۳۱ فیصد فسادات مہاراشٹرا
میں ہوئے۔ بہار دوسرے اور مغربی بنگال تیسرے نمبر پر
رہا۔ یہاں کل ۷۹ فسادات ہوئے۔ دوسری تمام ریاستیں
جن میں فسادات کی تعداد ۹ سے زیادہ رہی حسب ذیل ہیں
اترپردیش ۴۸، مدھیہ پردیش ۴۴، آسام ۳۲، گجرات ۱۹

[illegible]

مرسیڈیز بینز کار

راشٹرپتی بھون میں ممتاز بیرونی مہمانوں کے لئے چھ دروازوں اور آٹھ نشستوں والی مرسیڈیز بینز-۶۰۰ منگوائی گئی ہے۔ یہ کار مغربی جرمنی سے خریدی گئی ہے اور پریسیڈنٹ کے بجائے صدر ہندوستان کے اسٹیٹ گیراج میں شامل کر دیا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں جو پہلی بینز ۶۰۰ کار منگوائی گئی ہے وہ صرف ممتاز بیرونی مہمانوں کے لئے استعمال کی جائے گی اور صدر جمہوریہ ہند اسے شخصی استعمال میں نہیں لائیں گے۔ ممتاز بیرونی مہمانوں کو اس کار میں طیرانگاہ پالم سے راشٹرپتی بھون لایا جائیگا۔ اس کار میں آٹھ اشخاص کے بیٹھنے کی گنجائش ہے جو کسی بھی ممتاز بیرونی صدر مملکت ان کے محافظین عملہ اور مترجم کے بیٹھنے کیلئے درکار ہوتی ہے۔ صدر جمہوریہ ہند کو مرسیڈیز بینز کار استعمال کرنے کی اس لئے بھی ضرورت نہ ہوگی کہ سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کے دورِ صدارت میں خریدی ہوئی ایک رولس رائس پہلے ہی سے صدر جمہوریہ کے استعمال میں ہے نئی مرسیڈیز بینز ۶۰۰ غالباً ۱۹۵۵ء ماڈل کی ان دو کیڈیلاک کاروں کی بجائے استعمال کی جائیگی جو اب تک ممتاز بیرونی مہمانوں کے استعمال کیلئے مختص تھے۔

صدر جمہوریہ ہند مسٹر وی۔ وی گری چاہتے ہیں کہ راشٹرپتی بھون میں استعمال کی جانے والی کاروں میں ہندوستان میں بنائی گئی کاریں بھی شامل ہوں۔ راشٹرپتی بھون کی موٹروں میں مرسیڈیز بینز ۶۰۰ کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی تھی۔ چند ممالک اپنے صدر مملکت کے دورۂ ہندوستان کے موقع پر بلٹ پروف (Bullet proof) موٹر کے استعمال کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ان کاروں کی قیمت معمولی کاروں کے مقابلے میں تقریباً پانچگنا زیادہ ہوتی ہے۔ اب تک راشٹرپتی بھون میں بلٹ پروف کار موجود نہ تھی۔ اسکی عدم موجودگی کے باعث بعض دفعہ بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ صدر نکسن کے دورۂ ہند کے موقع پر امریکی حکومت نے ان کے استعمال کیلئے دو بلٹ پروف کاریں ذریعہ ہوائی جہاز روانہ کی تھیں۔

صدر جمہوریہ ہند کے ممتاز بیرونی مہمانوں کیلئے جو مرسیڈیز بینز ۶۰۰ کار خریدی گئی ہے۔ اسکے لئے ہندوستانی حکومت کو ۲ لاکھ ۲۰ ہزار روپے قیمت ادا کرنی پڑی۔ اگر محصول ادا کیا جاتا تو اس کار کی قیمت آٹھ لاکھ روپے سے متجاوز ہوتی۔

اقربا پروری

بہار کے اخبارات میں شائع ہونے والے ایک جائزہ میں کہا گیا ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی میں کوئی جگہ صرف اس وقت پر کی جاتی ہے جب کوئی ایسا امیدوار دستیاب ہو۔ اس مقصد کیلئے بعض جگہیں کئی کئی سال تک خالی رکھی گئیں۔ مثال کے طور پر علم نفسیات کے سلسلے میں پروفیسر کی جگہ گذشتہ ۱۵ برس سے خالی ہے اور شعبہ حساب کے پروفیسر کی جگہ ۸ سال سے اور شعبۂ اقتصادیات کے پروفیسر کی جگہ گذشتہ ۴ سال سے پر نہیں ہوئی ہے۔

جائزہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور دوسرے متعلقہ اداروں کی منظوری حاصل کرنے کے باوجود برسہا برس تک جگہیں خالی پڑی رہتی ہیں ●

"پیکر" حیدرآباد ۲۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تھرتھراتے پیکروں کے درمیان

تھرتھراتے پیکروں کے درمیاں
نیم عریاں رنگ
رقصاں

ہم قدم
فاصلے چمکیلے
بے چہرہ لکیر
سبز گہرا سبز

گہرے سبز میں
برف کا ٹکڑا
پگھلتا پھیلتا

ہانپتے رنگوں کے جامد دائرے

ہانپتے رنگوں کے جامد دائرے
منجمد

سایوں میں حرکت روشنی
سرخ سورج

دور تک بکھری ہوئی آوازیں
منتشر

سایوں کی پیلی ہڈیاں
کھوکھلی پیلی

رؤف خلش
۵۴۴، جدید ملک پیٹ
حیدرآباد ۳۶

خواب چکنا چور ہیں

خواب چکنا چور ہیں
دھندلی آنکھوں کی دونوں پتلیاں
ٹھہر جاتی ہیں:
ننگے پن کی گدگدی پر
کینوس پر چند خاکے
دائروں کی طرح الجھی ڈوریاں بن کر
ٹوٹ جاتے ہیں
ڈوبتے سورج کے ٹکڑے
ڈبڈبا جاتے ہیں پلکوں کے جھپکنے میں
رنگ سے لکھ کر مٹا دیتا ہوں میں
بھولی بسری نیکیاں
کچھ کمی ہے میرے اندر
میں ادھورا لمس ہوں
خواب کے چکنے بدن کو
چومنے میں مست ہوں
اگلے طوفاں کی خموشی تاڑنے والے
دھوپ کی پیلی تمازت کو
بدشگونی کہہ کے چلانے لگے ہیں
دھندلی آنکھوں کے حلقے:
کاش یوں گردش کریں
میں اکیلے پن کے انگارے چھو کر
دیکھنے کے کرب سے بچ جاؤں
بینائی سے پا جاؤں نجات
ذہن کے اندر:
ہزاروں کھڑکیاں کھل جائیں

قمر اقبال
ایس ڈی ایس سی او-۱، وزیر آباد ایریا
ناندیڑ (مہاراشٹرا)

غزل
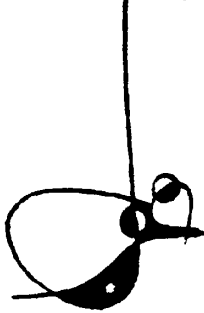
صحرا پہ برستا ہوا بادل نہ ملے گا
ہم سا بھی کوئی شہر میں پاگل نہ ملے گا

جی چاہے گا، فرصت کا کوئی پل نہ ملے گا
کچھ دیر کا یہ ساتھ بھی پھر کل نہ ملے گا

سورج سے ذرا پہلے نکل چلئے سفر پہ
پھر اوس میں بھیگا ہوا جنگل نہ ملے گا

سوچیں تو اسی دشت میں اک عمر کٹی ہے
دیکھیں تو کوئی خواب مکمل نہ ملے گا

آمنہ ابوالحسن
۶۲ - پٹودی ہاؤس کیننگ روڈ
نئی دہلی - ۱

ورشا اور راکیش دونوں بہت ساتھ ساتھ تھے اور میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی عاشق و معشوق کی طرح ایک دوسرے پر مفتوں۔ وارفتہ و فریفتہ تھے۔ راکیش نے عورت کو سمجھا ہی نہیں دیکھا ہی نہیں تھا مگر جب سے ورشا اسے ملی اسے ساری کائنات میں صرف عورت ہی کا جلوہ نظر آنے لگا۔ وہ ورشا کو ایک کتاب کی طرح پڑھ چکا تھا۔ لباس کی طرح پہن چکا تھا۔ خوشبو کی طرح سونگھ چکا تھا۔ میٹھے گھونٹ کی طرح پی چکا تھا۔ فائن آرٹ کے شاہکار کی طرح محسوس کر چکا تھا اور جوں جوں وہ ورشا کو محسوس کرتا جا رہا تھا اس کے اندر کا مرد زیادہ طاقتور و توانا۔ زیادہ گمبھیر و منضبط۔ زیادہ سیانا ہوتا جا رہا تھا۔

ورشا جو اپنی پیدائش سے مرد کو جانتی تھی۔ جس کی زندگی میں مرد بہت بعد میں آیا مگر جس کے آنے سے قبل ہی ورشا نے اسے پہچان لیا تھا۔ مرد کی آنکھیں۔ مرد کے ہاتھ۔ مرد کی چال۔ مرد کی گفتگو۔ مرد کا انداز دیکھ کر ہی وہ بتا دیتی تھی کہ یہ کس قسم کا مرد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے چاہنے والوں کی ایک بھیڑ میں سے بڑی سہولت اور آسانی سے۔ نہایت سبک دستی سے پھر اس نے راکیش کو اپنے لئے چن لیا اور خود کو ایک گلدستہ بنا کر اس کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

اب وہ دونوں ملاقات سے خوش تھے۔ اپنے ملن کے عین لمحے سے آسودہ اور بے فکر۔ ساتھ ساتھ جڑے ہوئے جنہیں نہ دنیا کی ضرورت محسوس ہوتی تھی نہ اپنے مقابل کسی اور چیز کی اہمیت یا احتیاج۔ جو صرف ایک دوسرے میں ہی زندگانی کی ہر ہر خوشی۔ محبت اور عافیت تلاش کرنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ ان انسانوں کی طرح جو خود میں مطمئن رہتے ہیں۔ جنہیں اطمینان اور سکھ اپنے سے باہر ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔

ورشا جب تک کنواری تھی ایک کلی کی طرح نازک، نرم اور ایک ڈنٹھل کی طرح لچکیلی تھی۔ ندی میں بڑی ناؤ کی طرح اپنی غرض و غایت سے واقف۔ پھر جب راکیش اسے ملا تو اس کا کنوارا پن ختم ہو گیا۔ وہ سیراب ہوتی گئی۔ ایک غنچے کی طرح چٹکتی پھول کی طرح مہکتی ہوئی اور اس کا تمام لچکیلا پن ایک ٹھوس اور مثبت شکل اختیار کرنے لگا۔ ندی کو عبور کر کے وہ دریاؤں اور سمندروں کی سیر کرنے لگی اور اسی سیر کے باعث اس نے جانا کہ زندگی کتنی گہری چیز ہے۔ زندگی کتنی بے کنار۔ ستاروں کے جھرمٹ کی طرح چمکیلی۔ مست جنگل کی طرح جھومتی ہوئی۔ گنجان کنجوں کی طرح ڈھکی ہوئی جس کی خاموشی میں بھی ایک گویائی ہوتی ہے۔ جس کی تنہائی میں بھی ایک زندگی اور مہک۔ زندگی جس کی وحشت اور جنون میں بھی ایک رعنائی ہے۔ ایک دلبری۔ ایک نہ ختم ہونے والی تمنا۔ تب ورشا اچانک مکمل ہو گئی اور اسے لگا کہ وہ

یہ صرف ایک ہی مرد زندہ ہے۔ ایک ہی مرد جوان ہے۔ ایک ہی مرد جیتا ہوا ' وہ ہے راکیش۔ باقی کہیں بھی کوئی بھی مرد نہیں۔ اسے راکیش کے سوا کسی مرد کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ایکدوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے قدم سے قدم ملائے جسم و جاں کی تمام لذتوں کے پیالے اپنے وجود کے ہونٹوں سے لگائے وہ دونوں زندگی کے راستے پر گامزن تھے اور قہقہوں کے گلزاروں میں گلابوں کی طرح کھلتے مہکتے بوٹے کائنات کے ہر ہر رنگ اور روپ کو نظر بھر کر دیکھ رہے تھے۔ جمالِ زندگی کو جمالِ نگاہ کی طرح خود میں سموئے ہوئے تھے کہ اچانک راکیش رک گیا اور ورشا کا ہاتھ چھوڑ کر دوڑتا ہوا آگے بڑھا اور چند اجنبی لوگوں سے لپٹ گیا۔ ورشا نے آنکھیں مل کر دیکھا کہیں یہ خواب تو نہیں مگر نہیں یہ حقیقت تھی اور ورشا کو بھول کر وہ سب آپس میں ایکدوسرے سے بغلگیر مسکرا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ ٹھٹھے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ بھال رہے تھے

ورشا نے سوچا وہ بھی لپک کر آگے بڑھے اور اس خوشی میں شریک و شامل ہو جائے مگر پھر ورشا نے سوچا۔ وہاں اسکی ضرورت نہیں۔ وہاں اس ملاقات کے درمیاں وہ ایک اضافی چیز ہوگی اور وہ رکی رہ گئی۔ گھوم کر اس نے قریب بہتے ہوئے چشمے کو دیکھا اور پھر ایک انجانی بے قراری کے ساتھ چشمے میں اپنے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی

خنک پانی اس کے ٹخنوں سے ٹکراتا رہا۔ نرم فضائیں اس کے گالوں کو گدگداتی رہیں۔ تند ہوائیں اس کے آنچل کو چھوتی اسکی زلفوں کو لہراتی رہیں تبھی اس نے راکیش کی آواز سنی جو اسے پکار رہا تھا۔ بڑی بے تابی سے بلا رہا تھا۔ بڑے پیار سے دیکھ رہا تھا اور ابھی ابھی گذرے ہوئے لمحے سے بہت مختلف پھر اس کا پیار راکیش محسوس ہو رہا تھا مگر اجتناب کا ایک ننھا سا چھوٹا سا وہ گلہ جو اب تک ورشا کی ذات میں ٹھہرا ہوا رکا ہوا تھا اور ہلکی سی ترشی بھی رہ گئی تب ورشا کو اپنے ذائقے کی زبان پر برابر محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے شکایت تو نہیں کی مگر اچانک راکیش کی آواز پر فوراً کان دھرنے اسکی طرف دوڑنے لپکنے کی بجائے چپ چاپ انجانی سی پوری بے اعتنائی کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ تب اجنبیوں کا ہاتھ پکڑے پکڑے راکیش خود اسکی سمت آیا اور وہاں سے بولا۔
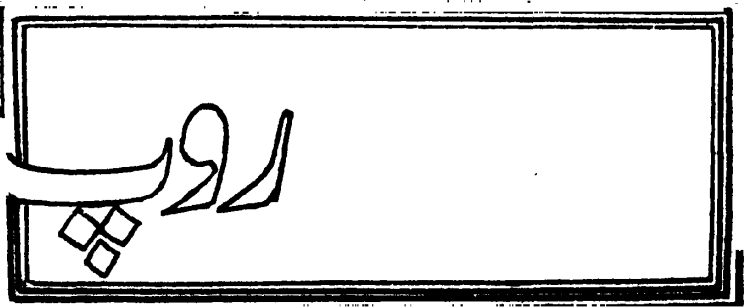
"اب اٹھو بھی اور ان سب سے ملو۔ یہ سب دوست ہیں میرے۔ کالج میٹ۔ شوخ شریر بدمعاش مگر مخلص"

ورشا اٹھ کھڑی ہوئی۔ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سب کو سلام کیا پھر فوراً ہی اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لیں حالانکہ وہ سب کو بغور دیکھنا۔ سب کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنا چاہتی تھی مگر اپنے آپ پر انکی فوقیت کی جلن اب تک اس کے اندر پنہاں تھی اور ایسے میں وہ ہرگز کسی کو دیکھنے محسوس کرنے برداشت کرنے کے قابل نہ تھی جو اس کے اور راکیش کے درمیان آ گئے تھے لہذا وہ نہ جانے کیا کیا دیکھتی رہی مگر اس نے پھر نگاہیں پلٹا کر کسی کو نہیں دیکھا حالانکہ اب وہ سب ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور اس پکنک اسپوٹ پر حسب مزاج ایک ایک چیز کو جانچ پرکھ رہے تھے۔ احساساتی سطح پر بہت مہذب اور باشعور محسوس ہو رہے تھے اور جمالیاتی سطح پر بھی خاصی نزاکت کے حامل۔ جسمانی حیثیت سے بھی مضبوط اور راکیش کے ہم پلہ مگر ورشا اب تک ان سب سے خفا تھی اور اگر چہ کہ ان کا تہذیب یافتہ ہونا۔ باذوق ہونا تنومند ہونا اس نے پورے شعور کے ساتھ محسوس کر لیا تھا مگر ان سے گھل مل جانے کی اجازت ورشا نے ہنوز خود کو نہیں دی تھی اور ان سب کے ساتھ وہ یوں چل رہی تھی جیسے جسم کا ایک حصہ ہو کر بھی کچھ الگ تھلگ سی ہو

صرف اپنے بارے میں سوچنے کی عادت مات ہونی ورشا سے چھوٹ چکی تھی۔ اب تو اسے ہمیشہ راکیش کے بارے میں سوچنے کی عادت ہی پڑ گئی تھی مگر وقت اور مسرت کے اس جھیلے میں جب راکیش اپنے دوستوں کے ساتھ تھا وہ خود کو اس بات پر مجبور محسوس کر رہی تھی کہ الابلا باتوں کا دھیان کرے اور ایک رقیب کی طرح پورے حسد سے راکیش کے دوستوں سے نفرت کرے

اس کا جسم خوب جاگا ہوا تھا۔ شعلے کی طرح لپک رہا موم کی طرح سلگ رہا۔ پگھل رہا۔ جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا اور ایسی گاتی گنگناتی جھومتی فضاؤں میں وہ راکیش کے لمس کیلئے بیتاب تھی مگر اس کے دوست نہ جانے کہاں سے ان کے درمیان ٹپک پڑے تھے اور اسکے تمام احساس۔ تمام خواہش۔ تمام چاہت پر یخ لہر کی طرح چھا کر رہ گئے تھے۔ بھگوان کرے وہ سب مر جائیں۔ ورشا نے پہلی مرتبہ سوچا اور سکڑنے سمٹنے لگی مگر ورشا کی ذہنی، جسمانی اور دلی کیفیت سے بالکل ہی بے خبر وہ سب دنیا جہاں کی باتوں میں مصروف برابر ہنستے رہے۔ قہقہے لگاتے رہے۔ گھومتے پھرتے رہے مزہ لے لے کر راکیش کو اپنا احوال سناتے رہے حتی کہ خاصی طویل اور تفصیلی گفتگو اور ملاقات کے بعد وہ راکیش کو ورشا کے حوالے کر کے پھر دوبارہ ان سے ملنے کا وعدہ کر کے آگے بڑھ گئے تب راکیش نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور دوستی کے نہاں خانوں سے نکل کر اپنی مضبوط مردانہ باہیں یکایک ورشا کے گرد حمائل کر دیں۔ اسکی روٹھی ہوئی آنکھوں میں مانو رہی اندر اتر کر اس کا حال دل پڑھا پھر مسکرا کر اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیے

"پگلی" ـــــ وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور ورشا کو پوری

خاموشی اور چاہت سے پینے لگا۔ ورشا کی جلن۔ ورشا کی تشنگی۔ ورشا کا دکھ قطرہ قطرہ پگھلنے، گھلنے کم ہونے لگا۔ ناراضگی اور شکوے کے دائروں سے نکلنے لگا۔ حتیٰ کہ ورشا پھر ملاطفت کو بالکل بھول بھال کر راکیش کو پھر اپنے جسم وجاں کی طرح محسوس کرنے لگی اور تب اپنی فطری مٹھاس سے بولی۔ "چلو گھر چلیں۔" ورشا کو احتیاط سے سنبھال کر راکیش اٹھ کھڑا ہوا۔ "گھر کیوں یہیں کوئی محفوظ جگہ کیوں نہ تلاش کریں۔" اور وہ دونوں خراماں خراماں بڑھنے لگے۔

یہاں وہاں لوگ تھے۔ ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے اور ماحول کی تمام تر رعنائیاں۔ سب کے گرد احاطہ کئے ہوئے سب کو مسحور کئے ہوئے لہٰذا آس پاس ہوتے ہوئے بھی کسی کو ایک دوسرے کی فکر نہ تھی۔ سب اپنے آپ میں مست اور بے خود تھے اور خود کو بھول کر کسی اور کو دیکھنا یا دکھانا چاہتے تھے۔ راکیش ورشا کو لئے لئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اس بار کسی نے ورشا کو آواز دی۔ ورشا نے گھوم کر دیکھا تو اسکی پرانی پڑوسن اسے بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ ورشا نے راکیش کا ہاتھ دبا کے ہٹا دیا اور بولی
"تم رکو مت۔ چلتے رہو۔ میں بس منٹوں میں آتی ہوں"

وہ رک گئی۔ راکیش آگے بڑھ گیا مگر انتظار کے چند منٹ کچھ زیادہ ہی پھیلنے لگے تو اس نے اکتا کر سوچا ورشا کی واپسی تک کیوں نہ کوئی مناسب جگہ خود ہی ڈھونڈ لے لہٰذا وہ احتیاط سے ادھر ادھر دیکھنے اور تیز تیز قدم دھرنے لگا۔

کافی فاصلہ طے کر لینے کے بعد تالاب کے کنارے فاصلے فاصلے سے اسے چند گپھائیں نظر آئیں جو گھنے پودوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تاریک تھیں۔ گویا راز داری کے خواہشمند لوگوں کیلئے بہترین جگہیں تھیں۔ راکیش مسکرایا اور ایک گپھا کے اندر چلا گیا۔ بہترین مقام ہے۔ اس نے سوچا اور زیادہ بے تابی سے ورشا کی راہ دیکھنے لگا۔

پڑوسن سے چھوٹ کر ورشا بھی سیدھا اسی طرف آئی۔ اس نے بھی اندازہ کر لیا کہ مقام مناسب ہے سو راکیش ضرور یہیں کہیں ہوگا۔

کچھ گپھائیں خالی تھیں مگر کچھ میں راز و نیاز جاری تھے ایسے میں دفعتاً ایک گپھا میں اسے راکیش کی جھلک نظر آگئی۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھی اور دفعتاً راکیش پر جا پڑی۔ راکیش پہلے تو گھبرا گیا پھر اس نے بھی جنونانہ انداز میں فوراً ورشا کو جکڑ لیا۔ جب ورشا نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے ہلکی سی "شش" سے اسے خاموش کرا دیا لہٰذا وہ چپ چاپ بھرپور تعاون کرنے لگی کہ وہ بھی تو راکیش کے لمس کیلئے دیوانی ہوئی جا رہی تھی اور دیوانگی یہاں کچھ دیکھتی سمجھتی ہے۔ دیوانگی تو بس دیوانی ہی ہوتی ہے۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ وصال کے یہ لمحے اسکی تمام زندگی بنکر رہ جائیں مگر کچھ وقفے کے بعد جب راکیش نے خود اسے چھوڑ دیا

پرے ہٹادیا تو وہ دھیرے سے بولی۔
"میں پہلے تالاب پر پہونچتی ہوں۔ تم بعد میں آجانا۔" اور خود سنبھال سمیٹ کر بڑے محتاط مگر تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکلی اور تالاب کی طرف ہولی۔

غروب ہوتے ہوئے سورج نے رشک سے اسے دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔ وہ تالاب کے کنارے جھک کر پانی سے کھیلنے اور پانی کے چھپاکے اپنے منہ پر مارنے لگی۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ —— تب اس نے جھنجلا کر سوچا آخر راکیش آتا کیوں نہیں۔ آنے میں اتنی دیر کیوں کر رہا ہے۔ انھیں یہاں سے نکل کر پدما کے پاس دعوت میں بھی تو جانا ہے۔ اور تبھی راکیش بے تابی سے قدم اٹھاتا نظر آیا۔
پاس پہونچ کر اس نے ہلکی سی خفگی سے کہا۔ "ارے میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں مگر تم یہاں تالاب پر کیا کر رہی ہو۔"
ورشا شوخی سے مسکرائی جیسے وہ راکیش کے اس دھوکے میں نہ آنا چاہتی ہو۔ پھر بولی۔ "بس بس! اب زیادہ بنو مت۔ چلو پدما کے پاس چلیں۔ دعوت کا وقت ہو چکا ہے۔"
"مگر......"
"اُفوہ! اب اگر مگر ختم کرو۔" ورشا نے پوری معصومیت سے کہا۔ "بس اب نکل چلو——!"
"ہاں ہاں مگر پہلے اس گپھا میں تو آؤ پھر پدما کے پاس پہونچ جائیں گے——"

"مگر اب گپھا میں کیوں——؟"
"گویا کہ یہ بھی بتانا پڑے گا اب——"
"پلیز راکیش۔" ورشا نے لجاجت سے کہا۔ "مجھے اتنا بناؤ مت۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو......"
"ہاں کچھ دیر پہلے ہی تو ہم نے مل کر یہ پروگرام طے کیا تھا پھر اب تم مکر کیوں رہی ہو——"
"ہائیں——" ورشا نے حیرت و خوف سے راکیش کو تکا
"بھئی اب دیر نہ کرو۔ وقت کم ہے۔" راکیش نے اسے سمیٹ لیا اور ورشا اس کے ساتھ یوں چلی جیسے چل نہ رہی ہو، گھسٹ رہی ہو پھر گپھا کے اندھیرے میں راکیش نے اسے لپٹایا، اور دھیرے دھیرے اسمیں اترنے لگا تو پہلی بار ورشا اس کا ساتھ نہ دے سکی ورشا کو لگا کہ وہ قطعی بے حس ہے اور اب کبھی جاگ نہیں سکتی۔ لطف کے، انبساط کے، راحت کے لمحے اب کبھی اسکی زندگی میں نہیں آسکتے مگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ دھوکا کھا گئی۔ وہ تو اندھیرے میں بھی اپنے راکیش کو پہچان سکتی ہے۔ پھر وہ کون تھا جو اس قدر خطرناک حد تک راکیش سے مشابہ تھا۔ بالکل راکیش محسوس ہوا۔

مگر اسے اپنے اس سوال کا جواب اب شاید کبھی نہیں مل سکتا۔ کیونکہ وہ اندھیرے کی نذر ہو چکی ہے اور اندھیرے نے اس کے اعتماد کو، خلوص کو، اس کی ناموس کو ہڑپ کر لیا ہے۔ اندھیرا جو خود ایک خطرناک دشمن ہے۔

اور راکیش حیران ہے کہ ورشا کو کیا ہو گیا۔ وہ اچانک اتنا بدل کس طرح گئی ہے مگر ورشا اسے کچھ بتا نہیں سکتی البتہ وہ زبردست طور پر اندھیرے کی عادی ہو چکی ہے اور دن ہو کہ رات ہمیشہ بڑبڑاتی رہتی ہے بتی بند کرو۔ بتی بند کرو.........

راکیش کی سمجھ میں نہیں آتا وہ اس کی زندگی میں مزید روشنی کہاں سے لائے۔ کس طرح اس کے اندھیرے کے خوف سے لڑے۔ خوف جو بے خوف ورشا کی زندگی بن چکا ہے۔ جو ورشا کو اس سے چھین چکا ہے۔ جو اس کی بجائے ورشا پر حاوی ہو گیا ہے مگر یہ کیسا خوف ہے۔ کاہے کا خوف ؟
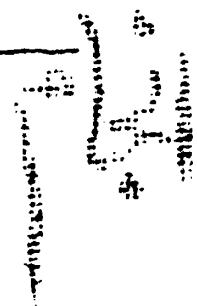
اور اتنی خوبصورت بھرپور زندگی سے ورشا کی دوری راکیش کے لئے ایک معمہ ہے کیونکہ وہ جتنا سوچتا ہے اتنا ہی الجھتا جاتا ہے اور اسے یقین نہیں آتا کہ عورت کا کوئی روپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو مرد کی توانائی ـــ مرد کی خوشی ـــ مرد کی زندگی لے لے۔ ■■

ساجد اثر

معرفت دو ماہی شاخسار - کٹک - ۲

رات کی تاریکیوں کو چیر کر
آس کے سورج نے آ کے
میرے دروازے پہ دستک دی
مگر ـــ کھویا ہوا تھا
میں
اداسی کے بھیانک جنگلوں میں
اس لئے
میری سماعت کے سیہ قرطاس پر
آس کے سورج کی دستک کا
سنہرا لفظ : اپنا اُجلا پن
ثبت کرنے میں رہا
ناکام !
پھر ـــ امید کا سورج بگڑ کر
دور ـــ تنہائی کے اونچے
زرد ٹیلوں کے
عقب میں
چھپ گیا
ـــ کمرے میں تاریکی نئی چنگھاڑنے !!

نظم

ندا فاضلی
معرفت مکتبہ جامعہ
پرنسس بلڈنگ، جے جے ہسپتال
بمبئی-۳

کسی کو ٹوٹ کے چاہا، کسی سے کھنچ کے رہے
دکھوں کی راتیں جھیلیں
خوشی کے درد سہے
کبھی بگولے سے بھٹکے، کبھی ندی سے بہے

کہیں اندھیرا، کہیں روشنی، کہیں سایا
طرح طرح کے فریبوں کا جال پھیلایا
پہاڑ سخت تھا۔۔۔!
برسوں میں ریت ہو پایا

پرکاش فکری
ڈورنڈہ درزی محلہ
پوسٹ آفس ہنو
رانچی-۲ (بہار)

مرگِ آثار حوادث کا خطر ہے اب کے
دشتِ پُر ہول کی راہوں میں سفر ہے اب کے
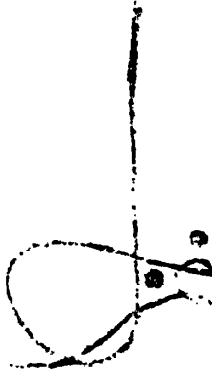
رات آتی ہے تو روتی ہیں بلائیں ہر سو
سب کے سینوں میں اترنے کو ہے خنجر اب کے

مچھلیاں ریت پہ ساحل کی پناہیں ڈھونڈیں
کچھ عجب غیض سے اُمڈا ہے سمندر اب کے

یہ جو موسم ہے خطرناک ارادوں والا
زخم گہرا دے مجھے جائے گا دے کر اب کے

اس کی بے رنگ طبیعت نے بھی کروٹ بدلی
اس نے بھیجا ہے بڑا شوخ کلنڈر اب کے

وہ مرے شہر اگر لوٹ کے آیا فکری
اس کو دیکھوں گا بہت ڈوب کے اندر اب کے

کیا رنگ ہمارے خیالات کو سنوار سکتے ہیں؟ ہمارے عزائم کو بیدار کر سکتے ہیں؟ ہمارے مزاج میں ٹھہراؤ اور سنجیدگی پیدا کر سکتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں اگر کہیں، کیا رنگ ہمارے جذبات کو برانگیختہ کر سکتے ہیں۔ کیا کار کے مالک ایک سرخ چمک دار بھوری یا پیلی کار زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بہ نسبت ایک کالی، نیلی یا ہری کار کے؟ کیا سرخ لباس دور سے اچھا اور قریب لگے گا، بہ نسبت ایک نیلے رنگ کے لباس کے اگر اسی فاصلے سے دیکھا جائے؟

ان تمام سوالات کا جواب ہے "ہاں" کیوں کہ ہر رنگ اپنا ایک مخصوص اثر رکھتا ہے۔ موجودہ علم کیمیا نے رنگوں کے بارے میں بہت سے نئے نئے امکانات پیش کئے ہیں۔ دھند کی طرح سے نرم اور نازک رنگ، یا اتنے تیز اور شوخ جیسے فلیش کی برقی شعاعیں۔ صنعتی کارخانوں نے ان کاوشوں اور امکانات کے نفسیاتی اثرات سے بڑے فائدے اٹھائے ہیں۔ شوروم، دفاتر، جہاز کے اندرونی حصے، کار، ریستوران سب ایسے رنگوں سے منور ہوتے ہیں جو گاہکوں پر ایک مخصوص نفسیاتی اثر اور کیفیت پیدا کر سکیں۔ مختلف رنگوں کے لباس کے استعمال سے کس طرح لوگوں پر ایک اچھا اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ عورتیں اس سلسلے میں ابھی خاصی پیچھے رہی ہیں۔

موٹے طور پر سرخ رنگ دل خوش کن ہے۔ یہ احساس کو بیدار کرتا ہے۔ ہمارے لئے حرارت پیدا کرتا ہے۔ بھوک بڑھاتا ہے (اسی لئے ریستورانوں میں سرخ شیڈ مختلف طور سے استعمال کئے جاتے ہیں) گلابی رنگ دل میں سرور احساس پیدا کرتا ہے۔ پیلا جذبات کو تیز کرتا ہے۔ سکون اور اطمینان کا ضامن ہے۔ قدرت کا ہرا رنگ آسودگی اور فرحت لاتا ہے۔ ہمارے جذبات کی کش مکش اور تناؤ کو دور کرتا ہے۔ نیلا رنگ ہمارے مزاج میں ٹھہراؤ اور سنجیدگی لاتا ہے اور ایک طرح کے اطمینان کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ بھورا رنگ غیر تاثراتی ہے اور جذباتیت کو کم کرتا ہے۔ بیجنی جس میں بہت رنگ ______ ہے دونوں رنگوں، نیلے اور سرخ کی آمیزش ہے، اچھا اور چکا چوند پیدا کرنے والا ہے۔

بے شک ہلکے یا گہرے رنگ تاثر کے اعتبار سے بڑا فرق پیدا کر دیتے ہیں۔ چند پیلے رنگ فرسودہ اور ریفانہ لگتے ہیں۔ اگر انہی رنگوں کو قدرے تیز کر دیا جائے تو وہ چمکدار سنہرے اور دلکش لگنے لگتے ہیں۔ کپڑے کی قسم بھی رنگوں میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ معمولی اور کھردرے کپڑے پر تیز اور روشن رنگ بھدا لگتا ہے۔ اگر کپڑا نفیس ہے اور رنگ میں تھوڑی تبدیلی کر دی گئی تو وہ رنگ بہت جاندار اور

رنگ اور آن

دل فریب ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی دو مختلف رنگ یا ان کے پس منظر میں ایک تیسرا رنگ چہرے کو بالکل ہی بدل دیتے ہیں اور انسان کی خوبصورتی دوبالا ہوجاتی ہے۔

چونکہ رنگ صرف خارج کی ہوئی روشنی ہے اسلئے اس بات کا مطالعہ دلچسپ ہوگا کہ رنگ کے اثرات اس عورت پر کس طرح پڑتے ہیں جو انھیں پہنتی ہے۔ کچھ رنگ جسم کی دلکشی، سرخی کو اور شوخ کردیتے ہیں کیونکہ یہ رنگ اپنے متضاد رنگ۔ یہ گالی بھی روشنی خارج کرتا ہے۔ کبھی کبھی جسم کی بادامی رنگت کو ہرا رنگ اور پکا کردیتا ہے کیونکہ رنگ کا سا ہلکا پیلا پن چہرے کے نیلے رنگ کو جلا بخشتا ہے۔ گلابی رنگ عام طور سے خواتین میں مقبول ہے، لیکن سانولے یا ہلکے پیلے چہروں پر بہت زیادہ نہیں جچتا۔ برعکس اسکے اسطرح گہری رنگت والی عورتیں شوخ سرخ رنگ کے مختلف شیڈ کے لباس پہن سکتی ہیں اور اضافی دلفریبی پیدا کرسکتی ہیں۔ ایک صاف رنگ کے چہرے والی عورت جسکے جسم اور بالوں کا رنگ ایک دوسرے سے شدید طور پر متضاد ہیں یا بالکل الٹیں زرد کے سے ہرے رنگ یا سرخ رنگ کا پہن سکتی ہیں۔ نیلا اور سفید ایک جیسے رنگ اور دنیا میں تمام رنگوں کی آمیزش شے ہر شخص استعمال کرسکتا ہے لیکن بوڑھے یا وہ لوگ جنکے بال سفید ہوگئے ہوں یا ان کے چہروں کے اصلی رنگ زائل ہوکر پھیکے پڑگئے ہوں، انھیں کالے رنگ کے کپڑے نہیں پہننے چاہئیں کیونکہ کالا رنگ روشنی جذب کرنے والا ہے اور چہرے کی چمک اور تازگی کو مزید پھیکا کر دیتا ہے۔

دوسری خاص بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ دن میں کھال کی رنگت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ صبح کے وقت اس کا رنگ قدرے پیلا اور دوپہر کو گلابی ہوجاتا ہے۔ سہ پہر تک اس گلابی رنگت میں کچھ ہلکا پن آجاتا ہے اور شام ہوتے ہوتے جبکہ جسم تھک جاتا ہے۔ کھال کی رنگت صبح سے کچھ زیادہ پیلی ہوجاتی ہے۔

اس طرح ایک عورت شام کے وقت اس رنگ کے لباس کا استعمال کرسکتی ہے جو اسے دوپہر کو موزوں نہیں تھا اور سہ پہر کی چائے کے وقت وہ اس لباس میں بہت دل فریب معلوم ہوگی جو اس کے بدن پر صبح کے وقت بالکل اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اگر ہم کوشش کریں تو جان سکتے ہیں کہ مختلف لوگوں پر مختلف رنگوں کے اثرات کیا اور کیسے پڑتے ہیں۔ اس طرح مناسب رنگوں کا انتخاب ہمارے لئے مصیبت نہیں رہ جاتا بلکہ دلچسپی اور تجربے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے●

ہوورڈ کشلنے

ترجمہ: نجم فاروقی

وقار خلیل
ایوان اردو - پنجہ گٹہ حیدرآباد ۴۰

جھولنا

یہ خوشیاں
یہ مسرت کی بہت ہی مختصر ساعت
جہاں
پل بھر کو صورت آشنا، احباب، رشتہ دار
سبھی مل بیٹھتے ہیں
ایک لمحہ کے لئے، لیکن —
یہ جب اٹھتے ہیں، اپنے بیشتر غم بانٹ لیتے ہیں

مرے گھر، دوسرے لڑکے کی پیدائش پہ
اُس کو پالنے میں ڈالنے کی رسم سے پہلے
عزیزوں، رشتہ داروں
چاہنے والوں کے جھرمٹ میں
سیاست سے نئی تہذیب تک
کتنی ہی رائیں تھیں،
سماجی فرقہ بندی
قیطنت، اور چاند کے تسخیر کی باتیں
۴۰ پیکر حیدرآباد

مرانی زندگانی کے ستم کے
تیرگی کا ذکر، اور افسانہ سویرا کا

بزرگوں سے سنا تھا ہم نے بھی اکثر
کہ خوشیاں ہر بشر کی زندگی میں آتی رہتی ہیں
مگر، اس پالنے کی رسم کے زرکار موقع پر
نہ وہ خوشیاں، نہ وہ گلبار لمحے رقص کرتے ہیں
نہ جانے کون سے زنداں میں ہیں ہم لوگ پابستہ

وہ نومولود، کل جب پالنے سے گھر کے آنگن میں
کبھی گرتا، کبھی گر کر سنبھلتا،
زندگی کی رہ پہ وہ ہوگا خرامیدہ
نہ جانے اُس گلِ نورستہ پر
کیا کیا ستم ہوں گے
سیاست سے نئی تہذیب تک کتنے ہی پیچ و خم
معیشت کی کئی پگڈنڈیوں سے سابقہ ہوگا
یقیں ہے وہ گلِ نورستہ
اس ماحول سے ہو کر
بہاروں کی مہکتی وادیٔ گلپوش سے آگے
بصد عزم و یقیں پھر جانبِ منزل رواں ہوگا

مرا لڑکا بساطِ دہر پر شمعِ یقیں بن کر
شبِ تیرہ کی وادی سے
سحر آسا طلوع ہوگا
مرا لڑکا عقیق، انگشتری میں صبح کا ہیرا

حسن فرخ
معرفت آشا ٹریڈرس ملا کنٹہ۔ حیدرآباد - ۱

ٹوٹا ہوا واسطہ

سچ پہ اصرار کرتے ہو کیوں تم
تمہارا مقدر ہے خالص ملاوٹ

فقط ایک سچائی
جب خون کھولا چکی ہے تمہارا
تو جھوٹی انا کے سمندر میں غوطے لگانے سے
چھٹکارا کیا پا سکو گے
لہو کی روانی پہ یوں تازیانے لگانے سے حاصل
جو باندھے تھے رشتے کبھی تم نے
(جو خون کے سلسلوں سے بھی بڑھ کر تھے
اب ان سے دامن چھڑانے سے حاصل

سچ پہ اصرار کرتے ہو کیوں تم
جسے تم نے سچائی سمجھا ہے
وہ تو فقط ایک زخمی راستہ ہے
تمہاری انا کا وہ ٹوٹا ہوا واسطہ ہے
کہیں واسطوں سے کسی کا بھلا ہو سکا ہے
سچ پہ اصرار کرتے ہو کیوں تم
مجھے کش مکش میں نہ ڈالو
جو سب کہہ رہے ہیں
اُسی "سچ" کو
اپنا سہارا بنالو

سب کو نیزوں پہ اُچھالو یارو
کوئی اخبار نکالو یارو
دل شاعر کی دعا لو یارو
گرتے مصرعے کو اٹھا لو یارو
بزم کا دیکھو تماشہ چپ چاپ
رنگ میں بھنگ نہ ڈالو یارو
گرنے والے تو سنبھل جاتے ہیں
اپنی عزت کو سنبھالو یارو
عقل سے کوئی چلا کر چکر
سوئی تقدیر جگا لو یارو
اپنی ٹوٹی ہوئی تلواروں سے
کچھ تو جھنکار نکالو یارو
ہات پاؤں تو سبھی دھوتے ہیں
بہتی گنگا ہے نہا لو یارو
مچھلیاں پھرتی ہیں بازاروں میں
جال نٹ پاتھ پہ ڈالو یارو
گُل نہ ہو جائے چراغِ سحری
اپنی سگریٹ جلا لو یارو

محمود عشقی
وزیرآباد (ناندیڑ) مہاراشٹرا

زندگی بھی عجیب شے ہے۔ اس میں قسمت اور پڑوسی کبھی اپنی مرضی اور پسند کے مطابق میسر نہیں ہوتے ہیں۔ اور مشکل یہ بھی ہے کہ پڑوسی اور قسمت کے بغیر زندگی کے بازار میں نہ تو رونق آتی ہے اور نہ ہی رونق ہوتی ہے۔ ویسے قسمت اور پڑوسی کا ایک بڑا مصرف آجکل یہ بھی دریافت کر لیا گیا ہے کہ ان دونوں پر ہر طرح کے الزامات آپ جب چاہیں عاید کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح اپنی ہر کمزوری، خامی اور بدتوفیقی پہ پردہ ڈال سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر قسمت نے آپ کو کسی لکھ پتی اسمگلر کے گھر جنم لینے کے بجائے ایک کلرک کے ہاں پیدا کر دیا ہے یا یہی قسمت کے سبب آپ کو کسی

اس طرح آپ کو صبر آتا ہے کہ ایک بد نصیب پڑوسی کے مقابلے میں جسے آپ کے پڑوس اور اپنی قسمت پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔ آپ کتنے خوش نصیب ہیں!
قسمت اور پڑوسی میں ایک بات اور بھی مشترک ہے وہ یہ کہ ان کا دوسرا قدم کیا ہوگا یہ آپ کبھی نہ جان سکیں گے یعنی قسمت کب مہربان ہو جائے گی اور پڑوسی کب خفا ہو جائے گا۔ دونوں ہی آپ کی زندگی پر مسلط رہتے ہیں۔ اور دونوں سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ فرض کر لیجئے قسمت کی طرف سے آپ بھی دھیان ہٹا بھی لیں اور اسے من مانی کرنے بھی دیں۔ تو بھی کوئی خاص فرق

دولتمند گھرانے کا گھر داماد ہونے کے بجائے اپنے غریب ساس سسر کو بھی پالنا پوسنا پڑتا ہے تو اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں آپ کے یا آپ کی شریک حیات کے والدین کے کسی بڑے ارادے کو نہیں محض آپ کی قسمت کو دخل ہے۔ اس لئے بیوی اور ساس سسر کے علاوہ ایسے موقعہ پر آپ کو قسمت پہ بھی اکتفا کرنا چاہیے اور حسن اتفاق سے بیوی کی طرح آپ کو پڑوسی بھی من چاہا نہیں ملا ہے تو اس میں بھلا جھنجھلانے اور کڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس ذرا اپنے پڑوسی کی قسمت اور پڑوسن کے بارے میں بھی سوچ لیا کیجئے۔

[illegible] تیکیہ حیدرآباد

نہیں پڑنے والا ہے۔ لیکن پڑوسی اور آپ کے گھر کے درمیان جو کھڑکی ہے کواڑ یا محض ایک دراڑ ہے۔ اس کی طرف سے آپ آنکھ نہیں بند کر سکتے ہیں اور کان بند کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور عام طور سے پڑوسی ایک دوسرے کے کان سے نہیں دیواروں ہی سے سننے کا کام چلاتے ہیں یعنی ہو سکتا ہے کہ آدھی رات کو آپ نے اپنی بیوی سے گھر کے بجٹ اور بچے کی تربیت کے بارے میں جو تبادلہ خیال کیا تھا اس کا آپ کی بیوی نے تو کوئی نوٹس نہیں

بہانہ لیکن کسی بھی طرح کے پیشوں میں یا آپ کے دفتر
کے باہر بیک اُس کا علم ہو چکا تھا۔ وائرلیس کے موجد
کو انتہائی حیرت انگیز ایجاد کیلئے یقیناً کسی پڑوسی کا شرمندۂ
احسان ہونا پڑا ہوگا۔ اسی لئے کہ پڑوسی پہلے دریافت
ہوا ہے۔ وائرلیس بہت بعد کی دریافت ہے! چنانچہ
بے تار برقی پیغام آپ خواہ مخواہ اب تک مارکونی
کو قابل احترام جانتے رہے ہیں۔ حالانکہ اس انکشاف
کا سہرا مارکونی کے سر نہیں۔ اسی لئے پڑوسی کے سر بندھنا
چاہیے۔ آپ نے یہ کہاوت تو سنی ہوگی کہ مصیبت کہہ
کے نہیں آتی۔ یہی بات پڑوسی کے بارے میں بھی کہی
جا سکتی ہے۔ مجھے آج تک ایسا کوئی پڑوسی نہیں ملا
جو کہہ کے آیا ہو۔ عام طور سے پڑوسی ایسے وقت ہمیں
پڑوسی یعنی ہم سے ملنے آتا ہے۔ جب ہم بہت جلدی
میں ہوتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر جبکہ آپ کو عدالت
یا دفتر میں جلد سے جلد حاضر ہونا ہوگا اور آپ پر گھبراہٹ
اور کھسیاہٹ سوار ہوگی۔ آپکا پڑوسی ضرور آپ کے
گھر میں داخل ہوگا اور کہیگا۔

”ارے بھئی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کوئی گاڑی چھوٹی
جاتی ہے۔ اتنے دن بعد ملنا ہوا ہے۔ آؤ بیٹھو چائے
منگواؤ۔ پان کھلواؤ۔“

اب آپ لاکھ معاشرتی نزاکت اسے سمجھائیں کہ
لیکن اسکی سمجھ میں یہ بات ہرگز نہ آئیگی کہ آپ کو اس
وقت آپ کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ورنہ بیٹھے
چائے منگوانے اور پان کھلانے کی قیمت آپکو بہت
مہنگی پڑے گی۔ یعنی اگر عدالت کے فیصلے کے مطابق
آپ کو شاہی مہمان خانے میں جا کے رہنا پڑے تو ممکن
ہے پڑوسی ہمارے مقابلے میں اسکو بہتر مل جائے لیکن
ہم کو اس سے بہتر زندگی یا ملازمت نہیں ملیگی۔

عام طور سے پڑوسی کو ایک دوسرے کو ایک دوسرے
کے دکھ درد کا ساتھی کہا اور سمجھا جاتا ہے لیکن تجربے
نے ثابت کیا ہے کہ آپکا پڑوسی آپ کے دکھ درد کا ساتھی
تو ضرور ثابت ہوتا ہے لیکن دراصل وہ دکھ درد بھی پڑوسی
ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ بمبئی میں گھر بہت مصیبتوں سے
ملتا ہے لیکن پڑوسی قدم قدم پہ ملتا ہے۔ آپ لوکل ٹرین
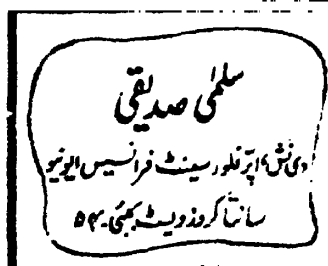
سلمیٰ صدیقی
دی نش، اپر فلور سینٹ فرانسیس ایونیو
سانتا کروز ویسٹ بمبئی۔ ۵۴

میں بیٹھے ہیں۔ بس کے کیو میں کھڑے ہیں۔ امپلائمنٹ
ایکسچینج کے دفتر کے باہر کھڑے ہیں۔ پکچر ہاؤس کے باہر
بلیک کے ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ چاٹ کھا رہے ہیں
فٹ پاتھ پہ سو رہے ہیں۔ یا تکلف برطرف خوبصورت
لڑکیوں کو تک رہے ہیں ہر جگہ آپ کو پڑوسی ملتا رہیگا
گھر البتہ کہیں نہیں ملیگا۔ مجھے ایک بار ایسے
پڑوس میں رہنا پڑا جہاں پڑوس میں میاں بیوی تو
بس دو ہی تھے لیکن بچے نو عدد تھے۔ اور چونکہ بچے
خدا کی نعمت ہوتے ہیں اور جگہ کی کمی اس بڑے شہر
کا اپنا مسئلہ ہے۔ اس لئے ابا نے جو لڑکا یاد

اور جگہ کی کمی کے مسئلے کو اس طرح حل کیا تھا کہ خود
تو اپنے گھر میں رہتے تھے لیکن بچے زیادہ تر پڑوس میں
رہتے تھے۔ اکثر بچوں کی ماں مجھے اپنے بچوں کے درمیان
گھرا ہوا دیکھتیں تو بہت خوش ہو کے کہتیں "دیکھئے بچوں
سے کیسی رونق ہوتی ہے۔ اب آپ اکیلی بیٹھے بیٹھے
کتنی گھبراتیں۔ نہیں تو منٹو، چھوٹو، گپو اور کبھی اشتیاق بیبیا
آپ کا کتنا دل بہلاتی ہیں۔ اجی میں کہتی ہوں بچے
نہ ہوں تو گھر بھوت کا ڈیرا ہے۔" میں بڑی حسرت
سے اپنے گھر کو یعنی بھوت کے ڈیرے کو دیکھتی تھی
اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی تھی۔ اکثر جب میں کہیں باہر
جانے لگتی تھی تو وہ اپنے دو ایک بچوں کو میرے
ساتھ بھیجنے کیلئے اصرار کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ
صبح صبح آتیں اور کہتیں۔

"کیا آپ گولا بے جارہی ہیں؟"

"جی ہاں —" میں جواب دیتی وہ فوراً کہتیں۔

"اچھا تو ایک کام کیجئے ذرا راستہ میں چھبو رمیں نمی
کو اسکی سہیلی ٹھنی کے ہاں چھوڑتی جائیگا .... اور
واپسی میں ساتھ لیتی آئیگا۔" اب پڑوسن کو کون سمجھاتا
کہ وہاں سے گولا بے جاتے ہوئے راستہ میں چھبو رکو
بھلا کیسے گھسیٹا جاسکتا تھا۔ لیکن ہماری پڑوسن
کو شہر کی آبادی میں اضافہ کرنے ہی سے کہاں فرصت
تھی کہ شہر کے جغرافیے پہ بھی نظر ڈال لیتیں۔

کبھی کبھی ہماری وہی پڑوسن جب بہت ہنستی ہوئی
میرے گھر میں داخل ہوتی تھیں تو میں سمجھ جاتی تھی کہ
کسی کو ٹیلیفون کرنے یا کسی کی چغلی کھانے آئی ہیں۔

ٹیلیفون وہ اکثر ایسے نمبروں پہ ملانے کی کوشش کرتیں
جو ٹیلیفون کی ڈائرکٹری میں نہیں وہ شہر کے ٹکٹ پہ
درج ہوتے تھیں۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کی طرح نمبر بھی نہیں
ملتا تھا۔ لیکن اس کا وہ اپنی کم عقلی نہیں میرے ٹیلیفون
کی خرابی بتاتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ مجھے یہ خدمت بھی
سونپ جاتی تھیں کہ فلاں نمبر پہ فلاں خاتون سے
لوکی کی قیمت یا پالک کا بھاؤ پوچھ کے ان کے گھر
جا کے ان کو بتاؤں اور اگر وہ اپنے گھر پہ نہ ہوں تو ان
کے پڑوس میں جا کے ان کی پڑوسن کو بتا آؤں تاکہ جب
شام کو دونوں پڑوسنیں ملیں تو لوکی اور پالک کے موضوع
پر تبادلۂ خیالات ہو سکے۔

میری ایک پڑوسن کو میرے گھر کی ہر چیز سے عشق تھا۔ سرہانے
میرے یعنی میرے کمرے کے پردوں پہ تو وہ فدا تھیں۔
اور چائے کے سیٹ پہ تو جی جان سے نچھاور تھیں۔ اور
قالین کو دیکھ کے تو وہ جیتی تھیں۔ صرف یہی نہیں میرے
بُرے سے بُرے ملازم کی وہ اتنی تعریف کرتی تھیں کہ
وہ بے چارہ میرے ہاں چار دن سے زیادہ نہیں ٹکتا تھا
اور جب میرے گھر کی دوسری چیزیں بھی زیادہ تر انہیں
کے ہاں رہنے لگیں تو میں دوسرے پڑوس میں اٹھ آئی۔
لیکن انھوں نے اس کا کچھ برا نہیں مانا صرف میرا چائے کا
سیٹ اور قالین میری یادگار کے طور پر اپنے گھر میں رکھ لیا

دوسری پڑوسن پہلی پڑوسن کے بالکل برعکس تھیں وہ اپنے
گھر کا سامان بھی لا لا کے میرے ہاں رکھنے لگیں اور وہ سامان
تھا ٹوٹی ہوئی ڈھٹر ڈھینچی، مرغی کا ڈربہ، طوطے کا خالی پنجرا اور

ٹپکتی ہوئی چھت کی بالٹی ـــــ ان نادر و نایاب اشیاء
کے علاوہ جب وہ اپنی بسورتی ہوئی بیوی اور تھکی ہوئی بیمار
ساس کو بھی میرے ہاں رکھنے لگیں تو پھر میں نے اپنا سامان
ٹرنک پر رکھا اور نکل کھڑے ہوا جنگل کی طرف لیکن بمبئی
میں تو جنگل ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا ہے اس لئے
جس جنگل کی مجھے تلاش تھی وہ تو ملا نہیں ایک مکان
ضرور مل گیا۔ اعتبار ہے کہ مکان کبھی اکیلا تو ملتا نہیں ہے
اس کے ساتھ پڑوسی بھی تو ملتا ہے۔ غالب کو پتہ نہیں
کیسے پڑوس میں رہنا پڑا تھا کہ وہ بے چارے عاجز آ گئے کہنے
لگے تھے کہ —
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

ظاہر ہے بے در و دیوار کا گھر وہ پڑوسی سے محفوظ رہنے ہی
کیلئے بنانا چاہتے تھے۔ ورنہ کون بھلا آدمی ہے جو اس
طرح کے گھر میں رہنا پسند کرے گا..... ایک بار غالب
نے یہ بھی تمنا کی تھی کہ وہ ایسی جگہ جا کے رہنا چاہتے ہیں
جہاں ہمسایہ کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو.... نہ ہوئے
آج غالب زندہ ورنہ کم سے کم ان کی ایک آرزو تو پوری
ہو گئی ہوتی یعنی ہمسائے سے تو ان کو نجات چاہیے نہ ملتی
لیکن وہ اپنی آنکھوں سے اتنا ضرور دیکھ لیتے کہ عروس البلاد
بمبئی ہی وہ جگہ ہے جہاں چپہ چپہ پہ آپ کو ہمسایہ ملے گا
لیکن ہم زبان کوئی نہ ملے گا اور اگر حالات یہی رہے تو وہ
دن بھی دور نہیں ہے جب صرف کہنے والے رہ جائیں گے
سننے والے ناپید ہو جائیں گے۔

بمبئی میں جتنے لباس ہیں۔ جتنے مزاج ہیں۔ جتنے جرائم ہیں
اتنے ہی پڑوس ہیں اور ہر پڑوس میں چار چھ درجن بچے بلیاں
اور ٹرانسسٹر ہیں اور جس وقت آپ آرام سے آنکھیں بند
کرنے سے نا چاہیں گے تو پڑوسی کا ٹرانسسٹر چیخے گا —
"ہم تم چوری سے بندھے اک ڈوری سے..... یا پھر یہ
لا تنگ آپ۔ ریڈیو کی صفائی کرنے آتی ہوں" سا چنچل فلمی گیتوں
نے پڑوسیوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں خاصا حصہ
لے رکھا ہے۔ یعنی جذبات آپ پڑوسی سے یا خزانے کی بات
چھوڑیئے قرض کیلئے پڑوسن ہی سے کچھ کام نہ بن سکے تو
وہ فلمی گیت کی زبان میں جب چاہیں پڑوسن تک پہنچا
سکتے ہیں۔

میرے ایک پڑوسی نے ایک دن اپنی ایک پڑوسن کے گھر
کی طرف ٹرانسسٹر کا منہ موڑ کر اور اپنا سانس روک کر
دیکھنا شروع کیا....... ٹرانسسٹر نے موقعہ کی مناسبت
سے گانا شروع کیا کہ —
"میرے سامنے والی کھڑکی میں اک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے"
یہ بول سنتے ہی سامنے والی کھڑکی کھلی اور اس میں سے
چاند کے ٹکڑے کی غالباً دادی نے کمرے کی بالٹی نیچے خالی
کر دی۔ ٹرانسسٹر کے مالک نے گھبرا کے اپنی کھڑکی بند کر لی۔

یوں سچ پوچھئے تو اصلی چاند کا ٹکڑا تو اب بوڑھی دادی ہی
ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ تجربے اور اپالو گیارہ نے ثابت کر
دیا ہے کہ چاند بوڑھی ویران جھریوں والے چہرے جیسا سنسان،
خشک اور بے جان کرہ ہے۔ بالکل پڑوس میں بسنے والی
دادی ماں کے چہرے جیسا!! ■■

زندگی پھول کی پتی میں بسی خوشبو ہے
ایک دو پل کی مہک دے کے بکھر جائے گی
پنکھڑی جھوم کے لے گی جو ذرا انگڑائی
یہ بھی گرد کی مانند اتر جائے گی

ایک نظم

اکمل حیدرآبادی
مالوہ اسٹور۔ فرسٹ روڈ کھار۔ بمبئی ۵۲

ابنِ آدم کو مگر کون یہ سمجھا پائے
وہ تو اس فکر میں غلطاں ہے کئی صدیوں سے
زندگی کو کسی بوتل میں مقید کرلے۔

ابنِ آدم کو مگر کون یہ سمجھا پائے
زندگی پھول کی پتی میں بسی خوشبو ہے
اور خوشبو کو مقید کرنا
ہفت افلاک کو اک بوند میں حل کرنا ہے

ایک غزل

مسعود عابد
ہیڈ ماسٹر۔ نیشنل اسکول
ظہیرآباد (اے پی)

کئی جذبے ہیں لفظوں میں سمائے
کوئی جذبوں کی گہرائی بتائے

دریچے بند ہیں پھر بھی در آئے
کئی بیگانہ وحشی، آوارہ سائے

مسلسل جو کرے پتھراؤ اس کو
کہاں تک کوئی آئینہ دکھائے

صدا میری گھنے جنگل میں گونجی
کہ جیسے پیڑ جھومے سرسرائے

سبھی ہونٹوں پہ مہریں لگ گئی ہیں
مسلسل بولتے جلتے ہیں سائے

تھے کہ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

شہروں میں لوگ مجھے کھوج رہے تھے۔ اور میں جنگل میں درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیوں کو یقین دلا رہا تھا کہ میں بہت بڑا فنکار ہوں۔

میرے جسم کے اندر پھیلی ہوئی روح مجھ سے ڈر گئی اور سمٹ سمٹا کر میرے جسم کے اندر کسی کونے میں بیٹھ گئی اور میں خالی خالی سا ہو گیا۔

نہ سوچ تھی نہ بھوک، ہاتھ، پاؤں، ہونٹ، آنکھ، زبان کی ہر حرکت میرے لئے اجنبی تھی۔ نیند اجنبی، چین اجنبی، اجنبی، اجنبی ـــــ اور پھر میری اجنبی آنکھوں نے ایک دن جنگل کے کنارے ایک جھیل پر ایک جوگن کو دیکھا وہ نارنجی لباس میں تھی۔ اس کی لانبی پلکوں سے ڈھکی سیاہ آنکھوں میں اداسیوں کا شہر تھا۔ اس کی کھلی ہوئی زلفوں میں رات کی روحیں پناہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر میں جیسے سوتے سے جاگ پڑا۔ میرے اندر کی سمٹی ہوئی روح میرے جسم میں پھیل گئی۔ میرے ہاتھ پاؤں، ہونٹ، آنکھ، زبان میرے لئے اجنبی نہ رہے تب میں نے اس سے کہا۔

"تم کون ہو؟"

اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور وہ بھاگنے لگی۔

میں نے اس کی بھاگتی ہوئی تصویر بنائی۔ اس کا عنوان رکھا۔ "اداسیوں کا شہر جب جاگا"

میری یہ پینٹنگ مجھے پھر شہر لے آئی اور اس پینٹنگ نے آرٹ کی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کیا۔ میں دنیا کا ایک بڑا فنکار مان لیا گیا۔ ہاں بہت بڑا فنکار ـــــ

اپنے خوبصورت گھر میں داخل ہو کر میں نے بتی جلائی۔ مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا نئے ڈیزائنوں کے لانبے صوفے پر وہ بیٹھی تھی۔ وہی ماڈل جسے میں نے اپنے اسٹوڈیو میں ما حقا ننگا کیا تھا۔ لیکن وہ اس وقت جدید طرز کے شوخ رنگ کے لباس میں اپنا ننگا پن چھپائے ہوئے تھی۔ لیکن جب اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھیں ننگی ننگی لگیں۔ میں نے سوچا۔

"ان آنکھوں کو بھی لباس کی ضرورت ہے"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اس نے چند لفظ اپنی زبان اور ہونٹوں کی مدد سے خاموش ماحول کو چھیڑنے کے لئے فضا میں بکھیرے۔ جنھیں میں نے جمع کیا تو یہ جملہ بنا۔

"آج میں فنکار سے ملنے آئی ہوں۔ انسان سے نہیں"

میں نے اپنے ذہن میں لفظوں کو ترتیب دیکر کہا۔

"آج میں انسان نہیں فنکار ہوں۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو"

اس نے کہنا شروع کیا۔

"ایک انسان نے ایک رات ایک جذبہ سے مجھے آشنا کیا تھا۔ اب وہ جذبہ لاوا بن کر میرے سینے کے اندر کھول رہا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ پھٹ کر تباہی پھیلائے میں چاہتی ہوں تم اس جذبہ کو شکل دو۔ اور پھر وہ جذبہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کی راہ سے ان کے سینوں میں پہونچ جائے اور پھر ساری کائینات کے سینے میں میرے سینے کی طرح لاوا کھولے"

ماڈل کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ اور جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہنے لگی۔

"پھر تم اس جذبہ کو اسکیچ کرو گے۔ پھر تم ساری کائنات
کے سینے میں وہی جذبہ پیدا کرو گے۔ جواب دو مجھے"
میں نے اس کے ہاتھ تھامنے کے بجائے گریبان پکڑ لیا اور اپنے
ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیر کر بولا۔
"ہاں میں تمہارے اس جذبہ کو اسکیچ کروں گا۔ لیکن
ایک واردات کے بعد۔"
پھر وہ ماڈل بن گئی۔ مادرزاد ننگا ماڈل۔ اور میں خالی کینوس
پر بغیر رنگ کے خالی برش پھیرنے لگا۔ پھیرتا گیا۔

سورج کائنات کے لئے نکل چکا تھا اور میں چاند کے
انتظار میں سورج کو فراموش کر چکا تھا۔
میری آنکھیں ویران ہو چکی تھیں اور میرے اعضا مضمحل،
لیکن میرا برش جوان تھا۔
انقلاب آچکا تھا، میں نے بھوک کو شکل دی تھی، اب کوئی
ماڈل ننگا ہونے تیار نہیں تھا۔ عریاں آنکھوں کو بھی
لباس مل چکا تھا۔
عورتوں کے سوکھے دریاؤں میں باڑھ آ گئی تھی۔
"خزاں" کے قرض کی زنجیروں میں لپٹا گلستان۔ اپنے گرد
لپٹی ہوئی زنجیروں کو کاٹ کر پھینک چکا تھا۔ اور گلستان
کے پھول مہک مہک کر اپنی "مکمل آزادی" کا جشن منا
رہے تھے۔
انسان اپنا نام رکھنا چھوڑ چکے تھے۔ ان کا کوئی نام نہیں
ہوتا تھا۔ ان کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ وہ اپنے پہچان
کے لئے اپنے اپنے نمبر رکھتے تھے اور میں نے اپنا نمبر رکھا
تھا۔ انسان نمبر ۱/۴۴۴۔
اب بارود غذا کے طور پر استعمال ہونے لگی تھی اور سرحدوں
پر بیٹھ گئے تھے۔
میں مر گیا۔ دھواں ہے۔ کہرام ہے۔ جس گلی سے جس شاہراہ
سے میرا جنازہ گذر رہا ہے۔ ہر طرف لوگ قطار در قطار ہاتھ
باندھے کھڑے ہیں۔ ساری دنیا میں میری موت کے چرچے
ہیں۔
اور میں موت سے بھی آگے ایک منزل کی طرف بڑھ چلا
تھا۔ جہاں صرف میں تھا ـــــ صرف میں! میرے سوا
کچھ بھی نہیں۔ جسم کے سارے رشتوں کی حیثیت وہاں
کچھ بھی نہ تھی۔ اور جو کچھ بھی تھا وہ ایک مذاق تھا۔
اور میں روح کے ہاتھ میں برش تھامنے کی کوشش کر رہا
تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں نے جسم کی دنیا کو اپنے برش
سے بدلا ہے۔ اب روح کی دنیا کو بدلوں گا ـــ لیکن ـــ
میں زندہ ہوں ـــــ
کاش میں اپنی موت کو دیکھ سکتا۔ ●

پتھر ابابیلیں اور ہاتھی

خیا شتین
۴۵۱-۳-۱۶ چنچل گوڑہ - حیدرآباد ۲

وہ لشکر
اور وہ ہاتھی
بڑھ نہ سکے
اس پتھر کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے
جسے چادر میں لپیٹ کر رکھا گیا
اُن پر
آسمان میں اڑتی ہوئی ابابیلوں نے
چونچوں اور پنجوں سے
کنکریوں کی بارش کی تھی

آج پھر ویسا ہی ایک لشکر
ہوا میں اڑتے ہوئے ہاتھیوں کے ساتھ
بڑھ رہا ہے
لیکن
وہ ابابیلیں کہاں ہیں
جنھوں نے آسمان سے
کنکریوں کی بارش کی تھی
اور
اب وہ پتھر!!
بیلگر حیدرآباد ۵۰

علی الدین نوید
۴۵۷-۳-۱۶ چنچل گوڑہ۔حیدرآباد-۲

غزل

ٹوٹے گی کسی دن تو کٹھن رات کی دیوار
ہو گا اسی دیوار سے خورشید نمودار
اک شخص مرے ساتھ رہا کرتا ہے اکثر
مجرم کی طرح جس کا ہے سہما ہوا کردار
میں خار کے دامن سے لپٹتا ہوا سایہ
تو پھول کی نس نس سے نکلتی ہوئی مہکار
تپتی ہوئی سانسوں کو خنک چھاؤں میں لیکر
سورج کی تمازت میں جھلستے رہے اشجار
کیا شہر سے دیوانہ کوئی روٹھ گیا ہے؟
سنسان سے لگتے ہیں گلی، کوچہ و بازار

متین سہیلہ
یونین کاربائیڈ انڈیا لمیٹڈ
پوسٹ بکس ۴۶۰ - بھوپال

نئی غزل نئی نسل اور نئی

نئی غزل سے مراد یہ ہر وہ غزل نہیں ہے جو ہر دور میں کہی جا رہی ہے۔ بلکہ وہ غزل مراد ہے جو جدید طرز احساس (MODE OF MODERN SENSIBILITY) کی حامل ہو۔ جدیدیت کوئی دائمی اور قطعی تعریف کی حامل نہیں ہے۔ کل کا جدید آج کا قدیم ہے اور آج کا جدید کل کے لئے قدیم ہوگا۔ حیات ہر لمحہ تغیر پذیر ہے۔ نئی غزل ہر لمحہ تازہ ہے اس تغیر اور تازگی کو اسیر کر لینا ہی دراصل جدیدیت ہے۔ جدیدیت کا مقصد اولین انفرادیت ہے اور انفرادیت جدیدیت کا دوسرا نام۔ جدیدیت روایت سے بغاوت ہے لیکن ہر روایت کچھ عرصہ کے بعد کے بعد دوبارہ نئی زندگی لے کر جدیدیت کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان حقائق کے باوجود کسی صنف ادب کے مطالعہ کے لئے قدیم اور جدید میں حد فاصل قائم کرنی ہی پڑتی ہے۔ جدت، احساس کے ٹھہراؤ کی ایک خاص حد یا نقطہ ہے۔ اس حد سے آگے بڑھنا فوقیت ہے یہی وجہ رہ جاتا فراموش کردی۔ جدید تر نسل کے تعلق سے یہ خیال عام ہے کہ ان کا شعور کمزور ہے۔ ان کی شاعری کا کوئی مسلک نہیں۔ کوئی سمت نہیں۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ کس طرف جا رہی ہے۔ اس کے یہاں عدم ضبط و انتشار ہے خیالات میں بھی اور اظہار میں بھی۔ جدید تر نسل بغاوت اور انحراف کا شعور تو ضرور رکھتی ہے۔ لیکن وہ خود روایت سے واقف نہیں ہے۔ انحراف اور بغاوت کے لئے بھی ضروری ہے کہ شاعر روایت کے تیور و مزاج اور طرز اداکاری سے پوری طرح واقف ہو۔ جدید تر نسل کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی روایت سے بھی صرف سرسری طور پر واقف ہے۔ اسے اپنی زبان کے اظہار و بیان، الفاظ کے معانی اور معانی کی تہوں سے اتنی بھی واقفیت نہیں جتنی تخلیق عمل کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اس کی شاعری میں اظہار بکھرا بکھرا، ٹوٹا ٹوٹا رہتا ہے اور جذبہ یا احساس، قاری تک پہنچنے سے پہلے ہی

ٹوٹ جاتا ہے۔ شاعری میں انتشار اور بحران تو ہو سکتا
ہے لیکن اظہار کی شکستگی نہیں۔ یہی وہ فرق ہے جو نظم اور نثر
میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ جذبہ، احساس یا خیال کو پوری
طرح پہچاننے کی کوشش شاعری میں بنیادی چیز ہے۔ نئی
شاعری میں تاثر کی یہ لازم شدت، ناپید ہے۔ جدید نسل
ہر چیز سے ڈر رہی ہے۔ قنوطیت سے بھی رجائیت سے
بھی ہر عصر حاضر و انداز فکر سے بھی اور لمحاتی طرزِ فکر سے بھی
اس لئے جدید شاعری میں صرف بحران ہے اور بحران کے
اظہار کے لئے، اظہار کا بحران بھی ضروری سمجھ لیا گیا ہے
نئی شاعری پہ اس قسم کے اعتراضات کئے جاتے ہیں۔
اس مضمون کا موضوع چونکہ صرف "نئی غزل" ہے اس
لئے یہاں نئی شاعری کے متعلق بحیثیت مجموعی، اظہار خیال
کرنے کی بجائے صرف نئی غزل کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

جہاں تک نئی غزل کا تعلق ہے، مندرجہ بالا تمام شکوک غلط
نظر آتے ہیں۔ تخلیقی سطح پر نئے غزل گو شعراء کا ذہن بالکل
صاف ہے۔ وہ صرف انتشار کے احساس و شعور ہی کو
اپنا موضوع بناتے ہیں۔ نئی غزل میں اس موضوع کی شمولیت
بھی فطری ہے۔ آزادی کے بعد زندگی کی تمام قدریں زیر
و زبر ہو گئیں۔ معاشرت کے اقدار، اخلاقیات کے تمام
اصول اور انسانیت کے تمام رشتے ٹوٹنے لگے۔ اس
کے علاوہ گزشتہ ربع صدی میں صنعتی فروغ اور یورپ
کے غلط معاشی نظام نے سماج اور معاشرت کا شیرازہ
بکھیر دیا۔ تجارتی ذہنیت نے حساس لوگوں کو تنہائی کے
بیکراں دشت میں لا کھڑا کیا۔ اور وہ اپنی بے بسی سے
عاجز آ کر زندگی کی مثبت اقدار کی نفی کرنے لگے۔ زمانہ
کے ساتھ انسان کا ماحول بدلتا ہے اور ماحول کے ساتھ
اس کا شعور، ادراک اور مسائل بھی بدلتے ہیں۔ ادب
چونکہ اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں بھی
تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اردو شاعری میں ایک
نیا رجحان پیدا ہونا، حالات کا فطری ردِ عمل ہے۔
میرا جی کے یہاں اس ردِ عمل کا پہلا نمایاں نقش نظر آتا
ہے۔ نئے شاعر کے متعلق انہوں نے لکھا ہے:

> "نیا شاعر ایک ایسے چوراہے پہ کھڑا
> ہے، جس سے دائیں بائیں، آگے پیچھے کئی
> راستے نکلتے ہیں، لیکن اُسے پوری طرح نہیں
> معلوم کہ کون سا راستہ اُس نے طے کر لیا ہے
> ماضی کے تجربوں کی کیا اہمیت ہے۔ کب
> تک اُسے یونہی کھڑا رہنا ہے۔ حال کی
> اضطراری کیفیات اس کا کس حد تک ساتھ
> دیں گی۔ کون سے راستے پہ اُسے چلنا ہوگا
> مستقبل کے خطرات اُسے کیا نقصان پہنچا
> سکتے ہیں۔"

یہ جذباتی اور معاشی انتشار، اردو غزل میں ۱۹۵۰ء اور
۱۹۶۰ء کے درمیان ظاہر ہوا۔ خاندانی وحدت کی شکست
انفرادی اور اجتماعی آزادی کے بڑھتے ہوئے تقاضے اس
کے عوامل تھے۔ احساسِ تنہائی کا یہ پس منظر بن کر اردو
غزل میں ابھرا۔

اردو غزل نے روایت سے وابستگی کے باوجود ہر دور میں
شعری مواد کو نئے فکری زاویوں سے روشناس کیا ہے
غزل کی ڈھائی سو سالہ روایت میں کئی مد و جزر آئے ہیں
گزشتہ ربع صدی میں غزل گو شعراء کی ایک نئی نسل
ابھری ہے۔ اس کا ظہور ایک ایسے سماج سے ہوا ہے جس

کا تعلق ایک حد تک ہندوستان کے معاشرے سے بھی ہے۔ اس نسل کا مزاج نیا ہے، مسائل نئے ہیں اور سوچنے کا انداز بھی نیا ہے۔ اس کے مسائل گزشتہ نسل کے مسائل سے قطعاً مختلف ہیں۔ نئی غزل کا مزاج بھی دراصل نئی نسل کا مزاج ہے۔

ہندوستان میں نئی غزل کا سلسلہ دراصل فراقؔ، یگانہ اور شاد عارفی سے شروع ہوتا ہے۔ فراقؔ نے اپنے آہنگ کے ذریعے اردو شاعری کی یک رنگی کو کافی حد تک مسمار کیا۔ مروجہ بحروں کے استعمال کے باوجود مختلف آہنگوں کے ذریعہ انہوں نے غزل میں تنوع کی گنجائش کو ثابت کیا۔ فراقؔ، یگانہ اور شاد عارفی نے غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا اور غزل کی روایت کو ایک نیا موڑ دیا۔ ان شعراء کا مزاج، نئی غزل کے مزاج سے قریب تر ہے۔ اور انہیں نئی غزل کا نظریاتی پیش رو کہا جا سکتا ہے۔

اس دور میں شاعروں کی جو نئی نسل ابھری اس نے روایت سے بغاوت کے جوش میں غزل کی صورت مسخ کر کے اسے "منفی غزل" یا "ہندی" "کویتا" کے طور پر پیش کرنا شروع کیا اور اس طرح نئی غزل کو، ابتداء میں غزل کی پیروڈی بنا کر رکھ دیا۔ غزل کے باطنی آہنگ اور اس کے مخصوص رمزیاتی اور ایمائی طریق کار سے انحراف کر کے محض جذباتی "برہنہ گفتاری" کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ روایتی غزل سے انحراف کی ایسی مثال ہمیں انشاؔ کی غزل میں نظر آتی ہے۔ جس نے بعد میں لکھنؤ کی خارجیت کا رنگ اختیار کیا اور شاعری کو صرف لفظی شعبدہ گری بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے آگے چل کر ہزل کی شکل اختیار کی تھی۔

نئی غزل کی ابتداء میں، ادب کے سنجیدہ قاری کے لئے مایوس کن تھی۔ جب اس کے سامنے اس طرح کے اشعار آئے تو اس کا غزل کے مستقبل سے مایوس ہو جانا فطری تھا۔

چار سمت مورتوں کا ایک صحرا تھا
میں شاہ زادوں کی طرح جس کے بیچ رہتا تھا (صادق)

چاروں طرف بریکیں لگیں، ہاتھ نکالے
رستے کے بیچوں بیچ وہ لڑکی گھبرا گئی ([illegible])

گلدان میں گلاب کی کلیاں مہک اٹھیں
کرسی نے اس کو دیکھ کے آغوش وا کیا (محمد علوی)

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہوگئی ([illegible])

بتیاں جل رہی ہیں کھمبوں پر
جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے ([illegible])

دھوپ رسوئی تک آ پہنچی، اب وہ آتے ہی ہوں گے
پیاز کترنا چھوڑ سہیلی، ورنہ انگلی کٹ جائے گی
(شاہد کبیر)

چند شعراء نے بقول محمد علوی محض خیال کے بخیے ادھیڑ کر شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے

علوی غزل تو کہنے چلے ہو نئی مگر
رکھو نہ تم خیال کے بخیے ادھیڑ کر

آہستہ آہستہ ایسے اجنبی اشعار کا زور کم ہوا اور سلجھے ہوئے سنجیدہ اشعار کے نئے لہجے نے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ احساسِ تنہائی کا پس منظر جب منظر بن کر سامنے آیا تو غزل کے قاری کو اشعار میں اپنے احساسات کا عکس نظر آیا۔

نیا غزل گو اپنی ذات کے بیکراں سمندر میں غوطہ زن ہے

وہ جدت سے زیادہ صداقت کا قائل ہے۔ اس لئے
غزل کے جسم سے روایتی تغزل کا بوسیدہ لبادہ اتار پھینکا
ہے۔ منطقی اور روایتی انداز کی بجائے آج کی غزل ماحول
کے انتشار، فرد کی ذات کے المیہ اور معاشرے کی الجھنوں
کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ نیا شاعر جس ذہنی کیفیت سے
گذر رہا ہے اور تہذیب کے جس موڑ پر کھڑا ہے،
اس لئے احساسات کے اعتبار سے اُسے ماضی قریب
کے شعراء سے دور اور ماضی بعید کے بعض شعراء سے
قریب تر کر دیا ہے۔ نیا غزل گو میر کے اسلوب کو جذباتی
طور پر اپنے لئے موزوں پاتا ہے۔ وہ الفاظ کی جامد منطق
کی بجائے "جدلیاتی منطق" کا قائل ہے۔ وہ الفاظ کو
محض سطحی طور پر استعمال نہیں کرتا بلکہ انہیں گہرائی و گیرائی
عطا کرتا ہے انہیں تجریدی سطح پر آزماتا ہے۔ اور اگر
احساسات کے اظہار میں الفاظ اُس کا ساتھ نہیں دیتے
تو وہ نئی لفظیات تراشتا ہے۔ نئی غزل کی نفسیاتی
ماحول کی شکست و ریخت سے پیدا ہوئی ہے۔ پُرانی
علامتوں کی تکرار اور فرسودہ تلازموں کی بجائے، نیا
غزل گو تازہ تر علامتیں، الفاظ اور تلازمے تلاش کرتا
ہے۔ ترسیل کی ناکامی اور ابلاغ کی کمی کا اُسے شکوہ ہے

سوچ کی سوکھی ہوئی شاخوں سے مرجھائے ہوئے
ٹوٹ کر گرتے ہوئے لفظوں کو میں چنتا رہا (عادل منصوری)

رنگوں کے اہتمام میں صورت بگڑ گئی
لفظوں کی دھن میں ہاتھ سے معنی نکل گئے (محمد علوی)

الفاظ پل صراط پہ جیسے گناہ گار
تلوار سے بھی تیز چمکتی ہوئی صدا
(بشیر بدر)

ہم اپنے دل کی بات کہہ گئے سکون مل گیا
سخن شناس لفظ کا ناز اٹھاتے رہے ([illegible])

سب کچھ بدل گیا ہے مگر لوگ ہیں بضد
جتنا سبھی میں صورت جاناں دکھائی دے ([illegible])

ہم تو روایتوں سے اکتا چکے کبھی کے
لیکن اُدھر رہی ہیں انداز دلبری کے ([illegible])

نقاد کے ہاتھوں میں ہیں تنقید کے تیشے
سہمی ہوئی تخلیق کتابوں میں پڑی ہے (زبیر رضوی)

اک عجب رنگ کے الفاظ کے سانچوں کی طرح
اس کے چہرے کو ذرا غور سے اک پل دیکھو (پرکاش فکری)

شور سے دل کے تو جذبات بھی ہوتے ہیں بلند
ان کو ہر نام کیا ذہن کے بیماروں نے ([illegible])

یہ بوڑھی نسل جب کہ ہمیں مانتی نہیں
اپنے بدن میں اسکا لہو دوڑتا ہے ہو کیوں (باقر صادقی)

کوئی رسول نہیں اس کے اور میرے بیچ
میری کتاب کے اوراق منتشر کر دو ([illegible])

نئی شعری زبان احساسات و افکار کی تبدیلی کا ردّ عمل
ہے۔ دن، رات، اندھیرا، اجالا، سورج، چاند، شام
سناٹا، تنہائی، چراغ، ہوا، دھوپ، آواز، گھر، دریچہ
کمرہ، دروازہ، دستک، سڑک، راستہ، دھند، دھواں
چہرہ، سایہ، پرچھائیں، پتہ، ٹہنی، فصیل، حصار، سمندر
بادبان، جزیرہ، ابر، پتھر، خاک، ریت، راکھ اور
اس طرح کے بے شمار الفاظ غزل میں اک نئی معنویت
کے ساتھ استعمال کئے گئے۔ نئے شاعر نے اپنے
ماحول اور زندگی سے علامتیں وضع کیں۔ اپنے حواس
خمسہ کو اپنا رہنما بنایا اور اس طرح وہ زندگی کے حقائق

حقیقت بہت خوب آیا۔ اس نے صرف مسائل کو ہی کامیابی والے اس غزل کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ لیکن وہ تلخ حقائق پر شکر کا غلاف نہیں چڑھاتا۔

ہر ایک موڑ پہ تقتیل ارمان و آرزو
پہلے تو تیری راہ گذر اس طرح نہ تھی (بشر نواز)

سینے میں جلن، آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے؟
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے؟ (شہریار)

ہر آدمی کو اپنے بکھرنے کا خوف ہے
خود کو سنبھالے بیٹھا ہے دستار کی طرح (عابد حسین عالم)

دل کی بات سمجھنے والے اس بستی میں چند تھے
جن پہ خرد کی سختی دیکھی، وہ دروازے بند ملے (اختر نظمی)

خود ہمیں کچھ روندتے دن رات کچھ کم تو نہ تھے
سینکڑوں صدیوں کے پتھر بھی ہمارے سر پڑے
(فضل تابش)

معیارِ سخن ہوں نہ کوئی عظمتِ فن ہوں
بڑھتے ہوئے پتھراؤ میں شیشے کا بدن ہوں (خورشید احمد جامی)

کون دیتا رہا صحرا میں صدا میری طرح
آج تنہا ہوں مگر کوئی تو تھا میری طرح (رشاد تمکنت)

خدا گواہ فقیروں کا تجربہ یہ ہے
جہاں ہو صبح تمہاری وہاں نہ شام کرو (سلیمان اریب)

میں بھی اک جلتا سورج، دن کے پیچھے صحرا
سارا جیون بھٹکا ہوں پاؤں نے جب چلنا سیکھا (وہاب دانش)

حقیقتوں سے انسانوں کو کیا علاقہ ہے
خدا نہیں بھی ہے لوگو مگر خدا بھی ہے (وقار خلیل)

جو سننا چاہو تو بول اٹھیں گے اندھیرے بھی
نہ سننا چاہو تو دل کی صدا سنائی نہ دے (وحید اختر)

کتنی میٹھی تھی املی
ساجن تھے جب گاؤں میں (ندا فاضلی)

معیاری غزل کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ لیکن اپنے دور کے معیار میں اس طرح محو نہ ہو کہ آنے والا کل اسے قدامت کا طوق پہنا کر رد کر دے۔ نئی غزل اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ تجریدی تجربوں کے ساتھ کلاسیکیت سے وابستگی اس کی خوبی ہے۔ نئی غزل میں زندگی کے حقائق سے قریب تر محسوس ہوتی ہے اس کا ایک منفرد لہجہ ہے۔ ایک خاص رمزیاتی پیرایہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تجریدی تجربوں کے ساتھ کلاسیکیت سے وابستگی اسکی خوبی ہے۔ نئی غزل میں زندگی کے حقائق سے قریب تر محسوس ہوتی ہے۔ اس کا ایک منفرد لہجہ ہے۔ ایک خاص رمزیاتی پیرایہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تجریدی تجربوں کے باوجود اس نے نظم کو خود پہ حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ اور اپنے وقار کو برقرار رکھا ہے

موجودہ دور کے کئی شعراء ایسے بھی ہیں جن کی غزل کو مکمل طور پر "نئی" نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں نیا لہجہ نمایاں ملتا ہے۔ جب نئے طرزِ احساس سے شاعر ہم آہنگ ہو تو پرانے انداز کی غزل کہتے کہتے اسی کے اندر سے ایک نیا لہجہ ابھر آتا ہے۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا نئے غزل گو نے تخلیق کے ایسے سنگم پہ کھڑے ہو کر شعر کہے ہیں۔ جہاں ایک طرف تو معاشرہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا نظر آ رہا ہے۔ دوسری طرف اپنے

وجود کا کرب اُسے جینے نہیں دیتا اور تیسری فکر
اک "نئی ہستی" ابھرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے جو
کبھی تو اس کے وجود میں زلزلے لاتی ہے۔ کبھی اس
کے سینہ کی دیوار سے سر ٹکراتی ہے اور کبھی سائے
کی طرح سنسان جنگلوں میں بھی اُس کا پیچھا کرتی ہے۔
وہ سمجھ نہیں پاتا کہ یہ "دوسری ہستی" کون ہے؟ جس کے
کرب نے اُس کی شخصیت کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے
وہ اپنے وجود کے اندھے کنوئیں ہی سے اس دوسری ہستی
کے ظہور کا منتظر ہے جس نے ایک آسیب کی طرح
اس کے "گھر" پہ قبضہ کر لیا ہے۔

اک ڈوبتے وجود کی میں ہی پکار ہوں
اور آپ ہی وجود کا اندھا کنواں ہوں میں (محسن حنفی)

ہوا کا جسم ہے کیا، خواب کا لباس ہے کیا؟
میں ان تہوں سے نہ ابھر کر خود کو پا لیتا (ذکش ساحلی)

سائے کی طرح ساتھ چلے گی کوئی صدا
سنسان جنگلوں میں اکیلے بھی جا کے دیکھو (فضیل جعفری)

مجھے پہچان لو اس خاک رخوں میں
میں صدیوں بعد پھر ظاہر ہوا ہوں (کمار پاشی)

تنگ کمرے کی سیاہی سے وہ بھاگا ہوگا
وہ جو دروازے پہ ہے میرا ہی سایہ ہوگا (علیم اللہ حالی)

بیچارگی کی رات کے غار سیاہ سے
قیدِ سکوت توڑ کے کوئی صدا بھی دے (زبیر رضوی)

ہم ہیں اپنے وجود کا صحرا
کل بھی تنہا تھے آج بھی تنہا (خورشید احمد جامی)

نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیئے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہو گئی (ندا فاضلی)

مری آنکھیں کہ صحراؤں کے سوکھے [illegible]
دل کو سیراب بھی کرتی نہیں اشکوں کا [illegible]

وہ تعفن ہے کہ گھٹا جاتا ہے دم
کھول دو کمرے کی ساری کھڑکیاں [illegible]

قدموں تلے تھے جتنے سمندر سرک گئے
اب کیا کروں گا دیکھ کے منھ آسمان کا [illegible]

برسوں کا لمس، صدیوں کی لذت بھلا دیا
تھا ایک پل جو عمر بھر کا حاصل نہیں رہا [illegible]

بہت ہی سخت زمیں ہے بہت ہی سخت فضا
کہاں پہ جا کے دبا دوں میں اپنی وحشت کو (عتیق اللہ)

جب نیا غزل گو داخلیت اور خارجیت کے امتزاج
سے غزل کے مخصوص رمزیاتی پیرایہ کو برقرار رکھتے ہوئے
غزل کہتا ہے تو اس کے اشعار دل میں اتر جاتے ہیں۔
چند شعراء ہلکے پھلکے گیتوں کی شکل میں غزل کہہ رہے
ہیں۔ اس میں غزل کا وقار تو نہیں ہوتا مگر تاثیر ضرور
ہوتی ہے۔ ایسی غزلوں کو بھی غزل کا درجہ دیا جا سکتا ہے

غزل کی روایت باقی ہے لیکن روایتی غزل اس نئے
ماحول سے معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ اس مختصر مضمون
میں اہم نئے غزل گو شعراء کے کلام کے تفصیلی مطالعہ
کی گنجائش نہیں ہے۔ بہر حال جس طرح کی غزل کو
صحیح معنوں میں نئی غزل کہا جا سکتا ہے اُس کے چند
اشعار درج ہیں۔

کب کے بکھر چکے ہیں سب اوراقِ جسم و جاں
کھینچے ہے پھر بھی ہاتھ کوئی دھڑکنوں کی ڈور

(منصور سبزواری)

میں زرد شاخِ گل کا نہایت اداس پھول
دنیا وہ تیز تند سا جھونکا کہ دم نہ لے (شکیب ایاز)

خود اپنی ہی نا رسیدہ بہاروں کا گلہ ہے
ہستی ہے کہ صحرا میں کوئی پھول کھلا ہے (ممتاز حقی)

ڈوبی رہتی ہیں آنکھوں میں بے کے سائے
سر پاتوں میں بہتی ندیاں سوکھ چکی ہیں (مظفر حنفی)

زندگی ختم ہو لفظوں کے تعاقب میں مگر
لفظ مل جائیں تو پھر اُن کو سر دار کھو (ٔ[illegible])

سینے کا ریگ زار بھیگا جاتا ہے مگر
گرمی کے باوجود ہیں دریا بھرے ہوئے (سرور کامدنی)

ماضی کی پگھلتی ہوئی دہلیز پہ آ کر
یہ کون ہے جو دیر سے خاموش کھڑا ہے ([illegible])

ہم کو پڑھو کہ زیست کا عنوان ہیں سب
ہم ہیں جبینِ وقت پہ تحریر کی طرح (اویس احمد دوراں)

سب کی سب ناکام رہی ہے یادوں کی تدبیر
وقت کے ملبے کے نیچے ہے ماضی کی تصویر (علیم اللہ حالی)

باقی ہے ایک درد کا رشتہ، سو وہ بھی اب
کس سے نباہیے، کوئی درد آشنا تو ہو؟ (بشر نواز)

لرزتے پردوں میں تو جیسے جھانک کر چھپ جائے
ترے خیالوں میں سناٹا بھی صدا سی لگے (بشیر بدر)

دشتِ تنہائی میں آواز کے گھنگھرو بجتے ہیں
اور ایسا بھی کہ سناٹے کا جادو بھی نہیں (زبیر رضوی)

ریت، تن من کے اڑے، وہ منزل آئی
دل سے ویرانے میں اک درد کا دریا ٹھہرا (باقر مہدی)

کیسے کہیں کہ چار طرف دائرہ نہ تھا
جاتے کہاں کہ خود سے پرے راستہ نہ تھا ([illegible])

ہر ایک زخم ہے رستا ہوا کہ بجھتا ہوا
صلیب پر مری خواہش کا جسم لٹکا تھا (صادقہ)

باہر کی نوک اور پلک سب درست ہیں
اندر کی کائنات میں بحران سا لگے ([illegible])

جو گھر تمہاری مصلحتوں نے بنائے ہیں
آسیب تک نہ رہ سکیں ایسی سرائے ہیں ([illegible])

بہت اونچائی سے اڑنے لگی ہوں
پرندہ ہوں مگر سہما ہوا ہوں (رؤف خلش)

کئی صدیوں سے ساحل پر کھڑا ہوں
میں آنکھوں سے سمندر ناپتا ہوں (کمار پاشی)

بجھ تو گئے کبھی کے کسی شہر بیش
کمرے میں اُسکے دیکھی ہری روشنی تو ہے (مسعود عابد)

رات زنجیر ہلانے کی صدا آئی تھی
صبح دیکھا تو کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں (اکمل حیدرآبادی)

راگ کی لے میں آگ کی لپٹیں، ہونٹوں پر ہوں گی
جب مضراب سے ظلم کی مطرب بربطِ دل کے تار بجے
(راج نرائن راز)

پھیلتا جاتا ہے ٹھنڈی چاندنی کے ساتھ
شعلہ شعلہ لذتوں کی تشنگی کا دائرہ (عادل منصوری)

نئی غزل کا حقیقی لہجہ یہی ہے۔ اس میں اک خاص تازگی ہے، اک نیا آہنگ ہے۔ نئی غزل نے زندگی کی تبدیلیوں کا شعور جزوِ آہنگ بنایا ہے اور نئے غزل گو شعراء نے مروجہ اسالیبِ بیان سے ہٹ کر نئے راستوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ انکے کلام سے نئی سمتوں کا شعور ابھرتا ہے اور نئے فکری زاویے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ تمام عناصر نئی غزل کے تابندہ مستقبل کی دلیل ہیں۔ ■■

عصمت جاوید
محلہ نواب کوارٹرس۔ شاہ بازار۔ اورنگ آباد

لذتِ جبر

سمندر میں طوفان آیا ہوا تھا
ہر ایک شے کو زیر و زبر کرنے والی ہوا
ساتھ طوفان کا دے رہی تھی
کنارا جسے روکتے روکتے پیچھے ہٹتا ہوا
اب کہاں سے کہاں آ گیا تھا
اور یہ طوفان میری رگوں میں مچل کر
اک پگھلتے ہوئے پارے میں جیسے ڈھل کر
نکل بھاگنا چاہتا تھا
مرے جسم و جاں سے اچھل کر
اوہ تم کس قدر رس بھری ہو
سمندر کے کف سے جو بنتی ہے
وہ جل پری ہو
اوہ تم کس قدر ....!
پھر جو طوفان پسپا ہوا
کیف بھٹکا ہوا راہ پر آ گیا
جل پری اڑ گئی
اور کنارے کو کھوئی زمیں مل گئی
تو مجھے یوں لگا جیسے کچھ دیر پہلے تلک
دستِ قدرت میں ہم
دونوں اک آلۂ کار تھے

غزل

یوں تو ساحل پہ میرا جسم ہے پتھر کی طرح
پھیل جائے گا کسی روز سمندر کی طرح
زندگی آج ہے روندے ہوئے بستر کی طرح
ہم کو اس دور میں جینا ہے پیمبر کی طرح
کون سے چہرے سے ملتا نہیں چہرا میرا
ساری دنیا نظر آتی ہے مرے گھر کی طرح
پیکرِ سنگ کو پیراہنِ جاں پہنا کر
ہم بھی پتھرا سے گئے ہیں بُتِ آذر کی طرح
چند فنکاروں کے ہاتھوں میں قلم چلتا ہے
گردنِ زیست پہ چلتے ہوئے خنجر کی طرح
میں بھی یک شگفتہ ہوں، پھر بھی [illegible]
گرچہ کاوش ہوں کتب خانہ میں [illegible] کی طرح

کاوش بدری
۴ مانیکا مستری اسٹریٹ۔ مدراس ۱۲۰

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اور وحید منزل کا ہنگامہ کچھ سرد ہو چلا تھا۔ درختوں اور چھت پر لگے ہوئے قطار در قطار برقی قمقمے خاموش کر دیئے گئے تھے۔ صرف کیکر کی شاخوں میں لگایا ہوا وہ بلب ابھی تک جل رہا تھا، جسکی روشنی میں چاولوں کی دیگ کے نیچے چولہے میں پڑی راکھ میں چنگاریاں سو رہی تھیں۔ مشرقی دیوار کے پیچھے سے چاند نے چپکے سے سر ابھار کر جھانکا تو اس نے اپنے چہرے سے چادر ہٹائی اور آس پاس دیکھنے لگا۔ چار چھ آڑی ترچھی چارپائیاں پڑی تھیں جن پر اور لوگ بھی لیٹے ہوئے نیند میں ڈوبی ہوئی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اندر

...... کچھ دیر بعد آواز آئی۔

"ماموں جان! بستر ٹھیک کر دیا ہے۔ آپ سو جائیے"

اس نے آواز پہچان لی، وہ ثروت ہی تھی۔

"ہاں جاتا ہوں بیٹے! ــــــ اندر تو بہت گرمی ہے" [illegible]

اندر سے آواز آئی۔

اس نے پھر سر اٹھا کر دیکھا، وہ واپس کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ ثروت کا سایہ اب اسے صاف سمجھ میں آ رہا تھا

بڑی آہستگی اور احتیاط سے اس نے چادر کو اپنے جسم سے الگ کیا اور چارپائی سے نیچے پیر لٹکا کر اس طرح چپل ڈھونڈنے لگا جیسے چوری کر رہا ہو۔ صحن اور [illegible]

ہادیہ شبنم

۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر

حیدر آباد-۲۹

سے عورتوں کے قہقہوں اور گیتوں کی آوازیں ابھی بند نہیں ہوئی تھیں۔ فضا کچھ اندھیری، کچھ روشن، کچھ خاموش اور کچھ پر شور سی معلوم ہو رہی تھی۔ لیٹے ہی لیٹے اس نے اپنے جسم کو اوپر کی طرف کھینچ کر سر ذرا سا اونچا کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑا، اندر کمرے کی دیوار پر ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔

پھر وہی سایہ صحن کے جنوبی گوشے میں ایک چارپائی کے پاس آیا۔

"وہی تو نہیں!" اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، لیکن چاند ابھی اتنا اونچا نہیں ہوا تھا اور صحن میں اندھیرا تھا

[illegible]

پار کرتے کرتے اس کے جسم پر چیونٹیاں سی سرسرانے لگیں ایک بار اس نے شانوں کے پیچھے گردن پھرا کر آس پاس دیکھا اور لپک کر دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ پھولوں کے گجروں سے گری ہوئی پتیاں اس کے قدموں تلے چرمرانے لگیں۔ اس نے جلدی سے نگاہیں دوڑائیں۔ کمرہ بالکل خالی تھا، دروازے سے ملی ہوئی دیوار پر پرچھائیوں کا رقص ہو رہا تھا۔ باہر ہوا کے جھونکوں سے بلب ہل رہا تھا اور کیکر کی پرچھائیاں روشنی کے ہلنے کی وجہ سے کبھی بن رہی تھیں اور کبھی مٹ رہی تھیں۔ دوسرے لمحے اس نے دیوار سے اپنی نظریں ہٹائیں۔ مایوسی کے عالم میں

"ٹھہرو نا!"
"کیوں؟ کام ہے کیا کچھ اور؟ .... مگر نہیں بس! ایلیزا کپ
لو اور کو لوئیے۔ مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ اور پھر کل
شادی کے روز تو ایک سکنڈ کی نیند بھی نہیں ملے گی ......
اچھا آجاؤ منّو! اب چلیں گے" ثروت نے منی کو پکارا۔

رئیس کے دل نے ایک لمحے کو دھڑکنا بند کر دیا.......
ہونٹ ذرا سے بھینچ گئے۔ آنکھیں یوں جنبش کرنے
لگیں جیسے چہرے سے آگے نکل آئی ہوں۔ اپنا ٹھنڈا
کانپتا ہوا ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے وہ ثروت
کے کاندھے تک لے آیا.... ثروت نے کوئی نوٹس
نہیں لیا۔ اس کی انگلیاں گلے کی طرف رینگنے لگیں....
گردن پر ٹھنڈا لمس پا کر یکایک ثروت چونک اٹھی۔
ایک لمحہ اس نے رئیس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے
نقوش حیرت اور خوف کے ملے جلے رنگ میں رنگے
گئے۔ گھبرا کے وہ آس پاس دیکھنے لگی۔
"اب..... اب جاتی ہوں میں!"
وہ ذرا سا قریب آگیا۔ "تھوڑی دیر ٹھہرو..... ایسی
جلدی کیا ہے!" اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے پی
لی ہو۔
"جی!؟" ثروت کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اپنی نظریں
رئیس کے چہرے سے ہٹا کر اس نے منی کے چہرے پر
مرکوز کر دیں۔
"اپیا خراب ہے نا منی! اپیا کو مارو" وہ منی کے ہاتھ
سے اس کے گال پر ہولے ہولے چپت مارنے لگا۔
ثروت کے ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹنے لگے۔

[illegible]

وہ اور قریب آگیا۔ مسکراتے ہوئے اس نے [illegible]
میں آنکھیں ڈال دیں۔
"کیا حال ہے؟" وہ اس کے گال پر چٹکیاں بھرنے
لگا۔ ثروت کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ منہ زرد ہو
گیا اور ہونٹ بڑی شدت کے ساتھ کانپنے لگے۔ اس نے
ایک بار اور گھبرائی ہوئی نظروں سے آس پاس دیکھا۔ سامنے
کا برآمدہ خالی پڑا تھا۔ صحن میں خاموشی چھائی تھی۔ البتہ
اندر سے ابھی تک آوازیں آ رہی تھیں..... چاندنی
بڑھ کر ثروت کے جسم کو چھونے لگی۔ رئیس نے اپنا ہاتھ
شانے سے گرا کر کمر کے گرد ڈال دیا اور اسے اندھیرے
میں کھینچ لایا۔
"دیکھو! تمہاری اپیا تو روٹھ رہی ہے منی! اپیا کو پیار کرو"
منی کے ساتھ وہ اپنا چہرہ بھی جھکانے لگا۔ اس لمحے ثروت
کے ہاتھ سے گلاس گر کر چھناک سے ٹوٹ گیا۔ وہ اچھل
کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ثروت الٹے قدموں دروازے
کی طرف کھسکنے لگی۔ دروازے میں پہنچ کر ایک بار خوف
سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے اس نے رئیس کی طرف دیکھا،
اور تیزی سے اندر بھاگ گئی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح کمرے
میں کھڑا رہا۔ پھر لائٹ جلا کر اس نے کانچ کے ٹکڑے
یکجا کر کے ایک کونے میں رکھ دیئے۔ کمرے سے باہر آ کر
اس نے ایک نوکر کے ذریعہ منی کو اندر بھجوا دیا اور اسی طرح
دبے پاؤں چلتا ہوا اپنی چارپائی پر پہنچ گیا۔ اپنے سر کو
اس نے خوب اچھی طرح ڈھانک لیا۔ اس کا دل زور زور
سے دھڑک رہا تھا اور جسم کے روئیں روئیں میں
سنسنی طاری تھی۔ اپنا ہاتھ ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے
وہ ایک عجیب سی لذت محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر پھر اس

آنکھیں رس بھری ہوگئی تھیں۔ اور جسم کے خطوط بڑے دل آویز ہو رہے تھے...... ابھی سال بھر پہلے سوکھا سوکھا سا جسم لئے ماتھے پر چھدرے بال گرائے پھرا کرتی تھی تب اسے ایک بار دیکھ کر دوسری نظر ڈالنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ چند لمحوں کو ثروت کا ہیولیٰ اسکی نظروں سے غائب ہوگیا اور اسکی آنکھوں میں پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ وہی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتی ہوئی، ناچتی ہوئی پرچھائیاں!..... جیسے اس کے مچلتے ہوئے جذبات!..... اس کی اڈہیڑ تاڑ کر رئیس نے آنکھ ماری۔ لیکن بھولا بھولا چہرہ بنائے ثروت نے ایک نظر اسے دیکھا اور دوسری طرف مشغول ہوگئی۔ وہ کھسیانا ہو کر کان کھجانے لگا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے روز ثروت کے گھر آتا۔ اسے دیکھ کر وہ بچوں کے سے بے تکلفانہ انداز میں اسی طرح ملتی جس طرح خالو بابا، کلیم بھائی یا بھائی جان کو دیکھ کر۔ ثروت کے خیال کے ساتھ ہی ہمیشہ اسکی آنکھوں کے آگے پرچھائیاں ناچنے لگتی تھیں۔ لیکن اب کچھ دن سے ان پرچھائیوں میں خالو بابا، کلیم بھائی اور بھائی جان ناچنے لگے تھے۔ ان بھوتوں نے بڑا پریشان کر دیا۔ وہ ہر بار جب ثروت کے گھر سے واپس لوٹتا، یہی سوچتا کہ اب وہاں نہیں جائیگا۔ مگر تین چار دن سے زیادہ وہ اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکتا تھا..... اس کا رواں رواں پیاس سے سوکھ جاتا۔ اور اس کے قدم خودبخود کنویں کی طرف بڑھنے لگتے..... ثروت کے گھر کی جانب [illegible]

..... کنویں کی منڈیر بھی تھی..... دور کہیں [illegible] پانی بھی تھا، مگر رسی نہیں تھی۔ ثروت اس سے [illegible] باتیں کرتی..... سیدھی سادی سپاٹ سی باتیں..... کوئی لچک نہیں، کوئی دھڑکن نہیں..... تنہائی میں جب وہ اسے اپنے خیالوں کی سیج پر لا بٹھاتا تو اس کا سراپا اس کی نگاہوں میں اجاگر ہو جاتا۔ اس کے جسم کے دلکش خطوط اس کے اندر بےچینی کا ایک طوفان برپا کر دیتے۔ لیکن جب وہ سامنے آجاتی تو اس کا جسم اس کے بچپن کی آڑ میں چھپ جاتا..... وہ آگے بڑھنا چاہتا لیکن چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت، اندر کی جانب کھلنے والے کواڑوں کو بند کر دیتی..... اسے ایسا لگتا تھا جیسے ثروت کی عمر آٹھ نو سال کی ہو۔

آج وہ تہیہ کرکے آیا تھا کہ ان کواڑوں کو توڑ دیگا۔ دن بھر اس نے اپنے آپ کو دلکش بنانے پر صرف کر دیا تھا۔ خوشبودار رومال اور سگریٹ کا ایک پیکٹ جیب میں محفوظ کرکے جب اس نے گھر میں قدم رکھا تو وہ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔

"آؤ رئیس میاں! کھانا کھالو۔" ثروت کی اماں نے بلایا۔

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں خالہ اماں!" وہ ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا..... تھوڑی دیر کے بعد پاس کے کمرے سے موسیقی کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کی اوٹ میں جا کھڑا ہوا۔ اندر ثروت کوئی رسالہ ہاتھ میں لئے پلنگ پر کہنیوں کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ پاس ہی ریڈیو دھیمے سروں میں بج رہا تھا.....

"درد منت کش دوا نہ ہوا....."

لیکن آٹھ دن اُسے دیکھ کر ثروت کے چہرے پہ ہلکی سی
شکن تک نہیں ابھری۔ اب وہ ہر اتوار کو درشن دینے لگا۔
ایک گلاس پانی مانگنے کے بعد جب وہ اسے بیٹھنے کا
اشارہ کرتا تو وہ بغیر ہچکچائے، بغیر گھبرائے اس کے قریب
بیٹھ جاتی۔ کیرم کھیلتے میں بار بار اس کی انگلیاں چھوتے
ہوئے رئیس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی لیکن
ثروت کا چہرہ ایسا بے حس رہتا، جیسے اس کا جسم
ان لہروں سے بالکل ہی ناآشنا ہو۔ وہ اس کی معصومیت
سے چھلکتی ہوئی آنکھوں اور ادھ کھلے چھوٹے چھوٹے
ہونٹوں کو دیکھ کر جھنجھلا جاتا۔ اس کے گول بھولے
ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا تو اسے بے اختیار وہ
کانپتے ہوئے ہونٹ یاد آجاتے لیکن اس کے بعد ثروت
کے ہونٹ کبھی نہیں کانپے۔ اس کی عمر جیسے دو سال
کم ہو گئی تھی۔ رئیس کی بے چینیاں روز بہ روز بڑھتی جا
رہی تھیں۔ لیکن ان میں چھپی ہوئی لذت لمحہ بہ لمحہ گھٹتی
جا رہی تھی۔ اس کا یہ پھیکا پھیکا سا عشق اب نہ ہی پایہ
تکمیل پا رہا تھا، نہ ہی وہ اسے خیرباد کہہ سکتا تھا۔
ہر اتوار کو اس کے قدم اس گھر کی طرف ایسے اٹھ جاتے
جیسے اسے ڈیوٹی پر جانا ہو...... اور دن یوں ہی
گزرتے جا رہے تھے۔ ثروت نے امتحان پاس کر کے
اب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اب وہ بے حد
پڑھاکو قسم کی ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی جاتا اس کے
ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی یا پھر وہ کسی نہ کسی کام میں
مصروف نظر آتی۔ لیکن اس روز دستک دینے پر دروازہ
ثروت ہی نے کھولا۔

"بیٹھیے" وہ اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اندر چلی
آئی۔ گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی...... تھوڑی
دیر بعد وہ دبے پاؤں ثروت کے کمرے میں جا نکلا
وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس پاس کھسکتا ہوا وہ اس کے
قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ثروت اس وقت کچھ سنجیدہ
سنجیدہ سی بڑی بڑی سی لگ رہی تھی.... اس کی شوخ
ہوئی نگاہیں اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو چھونے
لگیں۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر اسی نے
بات شروع کی: "بھائی جان سے کچھ کام تھا؟"
"گھنٹے بھر میں آجائیں گے۔" ثروت نے پلکیں اٹھائے
بغیر بڑی رکھائی سے جواب دیا۔
وہ کرسی پر پہلو بدلتے "خالہ اماں ہیں؟"
"جی نہیں..... وہ بھی گئی ہوئی ہیں"
"گھر میں کوئی بھی نہیں ہے!" اس نے بڑے اشتیاق
سے پوچھا۔
"ہوں!.... میں ہوں اور اس وقت آپ بھی تشریف
رکھتے ہیں۔"
رئیس نے اپنے اندر مسرت کے شگوفے پھوٹتے ہوئے
محسوس کیے اور دھیرے دھیرے اپنا پاؤں ثروت
کے پاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔
"کیا ہے؟" ثروت نے ایکدم سے پوچھا۔
گھبرا کر اس نے پاؤں ہٹا لیا "ک.... کچھ نہیں۔ وہ
تم.... کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟"
ثروت نے کتاب سامنے کر دی [illegible]
[illegible] ایک نظر کتاب کو دیکھ کر اس نے رئیس کو
دیکھا۔ سر سے پاؤں تک...... ذرا سا مسکرائی پھر

کتاب چہرے کے سامنے سے ہٹائی " اتنی ہولناک وحشت
کیوں بنا رکھی ہے"
"وہ! ... پیاس لگی ہے"
"ایک گلاس پانی ... چاہیں گے ؟" وہ رئیس کی نقل
کرتی ہوئی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ثروت کے پیچھے
پیچھے چلنے لگا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "نہیں ... پانی
مت لاؤ"
"کیوں؟ آپ کو پیاس لگی ہے نا!"
"مگر پانی نہیں چاہیے ...."
"پھر کیا چاہیے"
"اتنی بھولی بھی ہو کیا ثروت!"
اور دوسرے ہی لمحے وہ بلی کی طرح جھپٹا اور ثروت کو
اس نے اپنی باہوں میں دبوچ لیا۔ ثروت کا سارا جسم
ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے اور وہ اس کی باہوں
میں ٹوٹی ہوئی ڈال کی طرح جھولنے لگی۔ وہ اس کا چہرہ
ہاتھوں میں تھام کر ان کپکپاتے ہونٹوں کو دیکھنے لگا
اس لرزش کو دیکھنے کیلئے وہ کب سے ترس گیا تھا
اس کی آنکھیں جھکنے لگیں، گلے کی نسیں تن گئیں۔ ہونٹ
بھنچ گئے اور ثروت کے ہونٹوں سے ان کا فاصلہ رفتہ
رفتہ کم ہونے لگا..... لیکن دوسرے ہی لمحے
جیسے زلزلہ آگیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا سر کرسی
کے پٹے سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ
گئے اور جب اس نے خود کو سنبھالا تو ثروت بڑے اطمینان
سے اسی کرسی پر بیٹھی انہماک کے ساتھ کتاب پڑھ
رہی تھی۔ وہ غراتے ہوئے شیر کی طرح اٹھا ..... اسی
لمحے دروازے پر کھٹکے کی آواز آئی۔ ثروت دوڑی دوڑی
گئی۔ وہ جلدی سے کپڑے ٹھیک کرتا ہوا ڈرائنگ روم
میں پہنچ گیا۔
"ہیلو ... دیپکا ... آپ نے!"
"ارے! رئیس تو بیٹھا ہے یہاں — تم اکیلی تو نہیں تھیں"
"جی ... جی ہاں ... ہم ... مگر ..." وہ جلدی جلدی مڑ کر
اندر چلی گئی۔ دوسرے لمحے وہ چونک پڑا ... "پانی پیجئے۔
آپ کو پیاس لگی تھی نا!" ثروت پانی کا گلاس تھامے اس
کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے گلاس ہاتھ میں
لے لیا اور ایک ہی سانس میں خالی کر ڈالا۔ اسی وقت سر
میں زخم نے بڑی شدت کے ساتھ درد کرنا شروع کیا۔ وہ
اٹھ کر چلا آیا۔ اس کے بعد ثروت نے کبھی اس سے بات
نہیں کی۔ وہ کچھ دنوں تک پیچ و تاب کھاتا رہا ..... پھر رفتہ رفتہ
ٹھنڈا پڑتا چلا گیا ..... اب کئی دنوں سے اس نے ثروت
کے گھر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھی اس کے دل کے
کسی کونے میں ایک کانٹا سا کھٹک جاتا اور وہ افسردہ ہو جاتا
مگر ویسے اب اسے قرار آگیا تھا۔ وہ صلیب پر لٹکے رہنے
والی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔

چار پانچ مہینے بعد جب وہ کسی کام سے یونیورسٹی گیا ہوا تھا
ثروت کو ایک نوجوان کے ساتھ لائبریری کے زینے اترتے
دیکھ کر اس کے اعصاب غصے سے تن گئے۔ اس نے دیکھا
سنسان زینوں سے دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں
ہاتھ دیئے اتر رہے تھے۔ اس کے اندر کوئی چیز زخمی ہو گئی
.... اور خود بخود اس
کے قدم ان کے قدموں کا تعاقب کرنے لگے۔ وہ یونیورسٹی
کے احاطے سے باہر نکل آئے۔ مگر رئیس کو کسی بات کا ہوش

نہیں تھا۔ وہ اس وقت چونکا جب وہ مڈل ایسٹ ہوٹل میں داخل ہو کر ایک فیملی کیبن میں بیٹھ چکے تھے......

کاؤنٹر پر کھڑے بیرے کو رئیس نے ایک کپ چائے کا آرڈر دیا...... بڑی مشکل سے چائے زہر مار کی اور بل پے کر کے وہ اس کیبن کی طرف بڑھا۔ دروازے تک پہنچ کر اس نے پردہ اٹھایا۔ ثروت کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ وہ اس کے پیچھے جا کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو ثروت! تمہارے لئے کون آئے ہیں۔" سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان نے ثروت سے کہا۔ ثروت نے پلٹ کر دیکھا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی "آپ!" حیرت سے اس نے پوچھا...... پھر سنبھل کر مسکراتے ہوئے کہنے لگی "بیٹھئے"

"آفاق! یہ میرے کزن ہیں مسٹر رئیس.... اور آپ سے ملئے رئیس بھائی! یہ میرے دوست ہیں آفاق"

وہ بجائے آفاق کے ثروت کو دیکھنے لگا۔

"ہاتھ تو ملائیے" ثروت نے اسے چونکا دیا۔

"گلیڈ ٹو میٹ یو (Glad to meet you)" آفاق نے کہا

وہ آفاق کے بازو بیٹھ گیا اور سگریٹ پھونکنے لگا۔ اتنے میں بیرا آ گیا۔

"آپ کیا لینا پسند کریں گے؟" آفاق رئیس سے مخاطب ہوا

"جی...... کچھ نہیں"

"کیوں؟..... کچھ تو لیجئے" ثروت نے بھی اصرار کیا۔

"نہیں.... قطعاً نہیں" سگریٹ پھینک کر رئیس نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ ثروت اور آفاق نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اچھا آپ بھی کچھ لیں گے یا نہیں" ثروت نے ہنستے ہوئے آفاق سے پوچھا۔

"جو تم پسند کرو" آفاق مسکرایا اور ثروت کے چہرے پر ایک روشنی سی پھیل گئی۔

"بیرا.... دو پائن ایپل جوس (Two apple juice)"

بیرا جوس رکھ گیا۔ ثروت مسلسل آفاق سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ رئیس غصّے سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے لگا۔ وہ اسے کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی گہرائی چمک رہی تھی اور چہرے پر کسی اندرونی جذبے کی درخشنی چھائی ہوئی تھی۔ رئیس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گذرے ہوئے لمحوں میں ثروت نے اچانک ہی اپنی عمر کے کئی سال پھلانگ لئے ہوں۔ ایک لمحے کو اسے یوں گمان ہوا جیسے وہ کسی اجنبی لڑکی کے سامنے آ بیٹھا ہو۔ لیکن پھر آفاق پر نظر پڑتے ہی وہ کھول اٹھا۔

"آپ کا اسم شریف؟" وہ اچانک آفاق کی جانب مڑا۔

آفاق نے چند منٹ غور سے اُسے دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔

"مجھے یاد پڑتا ہے ثروت نے ابھی کچھ دیر پہلے ہمارا تعارف کرایا تھا... ویسے مجھے آفاق کہتے ہیں۔"

"آپ کیا کرتے ہیں؟"

"جی میں ایم۔ ایس سی کا اسٹوڈنٹ ہوں"

"رہتے کہاں ہیں؟"

"یہیں...... اسی شہر میں...؟" آفاق نے مسکرا کر ثروت کو دیکھا۔

"جی.... میرا مطلب ہے آپ کا پتہ کیا ہے؟"

"پتے کی ضرورت کیوں ہے آپ کو؟ اگر آپ کو کچھ کام ہے تو میں یہیں موجود ہوں۔"

کیا۔ اور دونوں باہر نکل گئے۔

شام میں پانچ بجے جب ثروت گھر پہونچی تو رئیس دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ ثروت کیلئے یہ متوقع بات تھی۔ مگر حیرت اسے اس پر ہوئی کہ اسکی آنکھوں میں کوئی انتقامی جذبہ نہیں جھلک رہا تھا۔ اندر پہونچنے پر معلوم ہوا کہ گھر میں امی اور شوکت کے سوا کوئی نہیں تھا.... دوسرے دن اس کو اور بھی حیرت ہوئی جب آغا قدیر نے بتایا کہ شام رئیس اسے ملنے بھی نہ آیا..... دو چار روز بیت گئے۔ ہر روز دن میں پر ثروت کی مڈبھیڑ رئیس سے ہوتی....... ثروت بڑی حیران تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ دوسرے روز وہ کالج سے ذرا جلدی واپس آگئی۔ رئیس گھر پر موجود تھا ثروت نے کتابیں رکھ کر صوفے پر پیر پھیلا دیئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

"معلوم ہوتا ہے بہت تھک گئی ہو"... رئیس بولا۔

"میری تھکن تو خیر وقتی ہے" ثروت نے آنکھیں موندے موندے جواب دیا۔ "مگر آپ کیوں تھک گئے....؟"

رئیس ہولے سے ہنسا..... پھر بولا "تمہیں حیرت تو ہوئی ہوگی نا! کہ میں خاموش کیوں ہو گیا.... مگر تم ہی سوچو۔

ثروت! میں تمہارا برا کیوں چاہوں گا.... اگر تم تمہارا بھلا چاہوں!"

ثروت ایسے اچھل پڑی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو.....

پھر رئیس کو دیکھتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی "یہ تو نیا رخ معلوم ہوتا ہے" اور کتابیں لے کر اپنے کمرے میں جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم نے تو ہمیشہ مجھے غلط سمجھا ہے۔" رئیس بولا۔

ثروت کچھ کہے بنا کمرے میں آگئی۔ کتابیں رکھ کر وہ صحن میں چہل قدمی کرتے ہوئے سوچنے لگی کہ "واقعی اسے بار تو میں نے غلط سمجھا ہے"

ٹہلتے ٹہلتے جب وہ ڈرائینگ روم کی کھڑکی کی طرف آئی تو اسے رئیس کی آواز سنائی دی... "ایک گلاس پانی پلاؤ گے شوکت!"

ثروت کے ذہن کا پنڈولم بڑی زور سے بج اٹھا.....

اسکی گونج میں کئی ہزار آوازیں شامل ہو گئیں۔

"ارے تو تو بہت بڑی ہو گئی ہے۔"

یہ گونج ذرا کم ہوئی تو ثروت نے سنا رئیس کہہ رہا تھا۔

"کھڑی کیوں ہو؟ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

■■

[illegible]
میں جانے کے [illegible] درمیاں
خام [illegible]
بن گئے کتنے [illegible] بے چانیاں
رات بھیگی تو یہ دل دھڑکنے لگا
مجھ سے کرنے لگا کوئی سرگوشیاں
ایک کاغذ کی تصویر دلدار بھی
اور آنکھوں میں جلووں [illegible] کا دھواں
تیز برسات اور سنسناتی ہوا
میرے چہروں میں سرشار آب رواں

عبدالرحیم نشتر
غنی جنگل اسٹور۔ انصاری وارڈ
بھنڈارہ

سلطان سبحانی
نشاط بک سنٹر۔ قدوائی روڈ
مالیگاؤں

سوکھے تال اور سوکھی ندیا سوکھے سوکھے پات
اب کے برس بھی برکھا آئی لیکن خالی ہات
کوئی بھی رُت ہو کبھی کبھی تو بہت ستاتی ہے
اک ریشم کی چولی جیسی مسکی مسکی رات
اب تو کوئی ربط نہیں ہے اس میں اور مجھ میں
پھر بھی اکثر کر لیتے ہیں یونہی اک دو بات
جانے کون تھی راہ میں اس کو جب سے دیکھا ہے
چھن چھن سے بجتے ہیں گھنگھرو ساری ساری رات
اچھا جی اک برف ہوں مجھ کو تم سے پیار نہ تھا
تم بھی تو وہ کتاب ہو جس کے سادے سب صفحات

شکست و ریخت میں رعنائیوں کا پیکر ہوں
میں تا بہ حد نظر اک حسین منظر ہوں
صدا کے راز سے واقف نہ چپ سے ہوں آگاہ
کہیں سکوت، کہیں ایک شور محشر ہوں
گزر چکے ہیں کئی راستے قدم سے مرے
مگر میں ایک جگہ راستے کا پتھر ہوں
تمام گردش افلاک مجھ پہ ختم ہوئی
ترا کرم ہے کہ جو میں چلا میں محور ہوں
شکستگی کی فضا راس آ گئی باذل
لیے اپنے ٹوٹے ہوئے جسم میں [illegible] ہوں

باذل عباسی
۲۲-۸-۲۶۸ پرانی حویلی
حیدرآباد

ویدوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم زمانے کی مذہبی حالت کی محفوظ کتابیں ہیں۔ ویدوں یا اس سے قبل کی جو اور مذہبی کتابیں ملی ہیں وہ ناقص حالت میں ہیں، وید کافی ضخیم ہیں۔ ان کو برہمن کے جزو کے طور پر غیر مخلوق خیال کیا جاتا ہے جو کہ کائنات کی تجدید کے وقت اس کے اندرون سے باہر آجاتے ہیں۔ مغربی محققین رگ وید کو دو ہزار سے ایک ہزار قبل مسیح کی تصنیف قرار دیتے ہیں اور بعض لوگ اس کو ایک ہزار سے پانچسو سال قبل مسیح کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آریوں کے ہندوستان اور ایران میں آباد ہونے سے پہلے ان میں یکساں یا ملتے جلتے دیوتا اور رسم و رواج تھے جس کی کہ وید اور پارسیوں کی اوستا شاہد ہیں۔ رگ وید میں منظوم دعائیں ہیں۔ یجروید میں نثری عبارتیں ہیں، جو کہ قربانی اور عبادت کے وقت استعمال کی جاتی تھیں۔ سام وید میں منتر ہیں جو تقریباً سب رگ وید سے لے کر گانے کے لئے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اتھروید کی بہت سے بعد [illegible] کو دوسرے ویدوں کے مقابلے میں [illegible] کے بعد کا تھا، ان ویدوں کا [illegible] دور ہی کی بات ہے۔ اٹھارویں صدی کے [illegible] اور انیسویں صدی کے شروع میں بعض انگریز [illegible] کی کوشش سے یہ کاغذ پر منتقل ہوئے۔ اس سے پہلے یہ صرف سینوں میں محفوظ تھے۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بڑی احتیاط سے ان کی حفاظت کی گئی کیونکہ ان کے الفاظ میں بڑا جادو کا اثر سمجھا جاتا تھا اور تلفظ کی ذرا سی غلطی بہت خطرناک سمجھی جاتی تھی۔

رگ وید

رگ وید میں دیوتاؤں کی شان میں حمدیہ نظمیں ہیں۔ رگ وید کی دیوی اور دیوتاؤں میں اگنی، اندر، سوم، ورن، متر، پوشن، بھاگ، وشنو، رودر، اوشا، سوریہ شامل ہیں۔ اگنی کا مقام دیوتاؤں میں کافی بلند ہے، وہ حفاظت کرتا ہے، وہ دیوتا اور انسان کے درمیان واسطہ بھی ہے اور خود دیوتا بھی ہے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ یہ دیوتا مظاہر

احمد خضر زبیری
معرفت ماہنامہ زندگی۔ رام پور (یو۔پی)

ویدوں کا تعارف

[illegible]

اگنی یہ بات اس سے عیاں ہے کہ اگنی کا ذکر حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ تشبیہ کے طور پر کیا گیا ہے۔ بعض نظموں میں اس کی سنہری داڑھی اور بالوں کا ذکر ہے۔ بعض میں ایک یا کئی شعلہ ور سر، بعض میں شعلہ زبان اور بعض میں شعلہ بار آنکھوں کا ذکر ہے۔ یہ سب آگ کی تشبیہیں ہو سکتی ہیں۔ اس کی پیدائش کا ذکر مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے، وہ زمین پر لکڑی کی رگڑ سے پیدا ہوتا ہے، بادل میں بجلی کی طرح کوندتا ہے اور آسمان میں سورج کی طرح چمکتا ہے۔ ایک نظم میں اس کی دو پیدائشوں کا ذکر ہے، ایک زمین میں، ایک آسمان میں — ایک اور نظم میں اس کی ہزاروں پیدائشوں کا ذکر ہے کیونکہ وہ ہر گھر میں آگ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ کبھی اپنے آپ اپنا بیٹا کہا جاتا ہے اس کا مطلب ہے خود بخود مشتعل ہونے والی آگ — بعض دفعہ اگنی کو دوسرے دیوتاؤں کے ساتھ متحد کر دیا جاتا ہے۔ یہی کہا جاتا ہے کہ اگنی، ورن ہے، وہی مترا ہے، وہی اندر ہے اور سب دیوتا اس کی شکل ہیں —

اندر اندر آریوں کا بہادر دیوتا ہے — وہ آریوں کی حفاظت کرتا ہے اور سیاہ فام لوگوں کو ان کا غلام بنا دیتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے میدان جنگ میں پچاس ہزار سیاہ فام لوگوں کو مار گرایا۔ بعض ایسے واقعات بھی ہیں جن کا ذکر اندر کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ ان واقعات کی کچھ تاریخی بنیاد ملتی ہے جیسے راجہ سوداس کی جنگ

نظموں میں اندر کی تصویر ایک لحیم شحیم اور مضبوط جسم والے دیوتا کی کھینچی گئی ہے۔ اس کی خوراک کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ سینکڑوں آدمیوں کا کھانا کھا جاتا ہے اور بھینسوں کا گوشت کھاتا ہے اور تین تالاب سوم پیتا ہے۔ اس کو نوجوان، غیر فانی اور لازوال کہا جاتا ہے۔ وہ ایک ہیرو کی طرح رتھ میں سوار ہو کر تیر اور کمان سے لڑتا ہے۔ بدھ ازم کی مقدس کتابوں میں اندر کو ایک عظیم الشان اور مقدس حیثیت دی گئی ہے۔ مہابھارت اور پرانوں میں بہت سے اندروں کا ذکر ہے۔ ہر اندر ایک خاص زمانے کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن ژند اوستا جو کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب ہے اس میں اندر کا ذکر اہرمن کے دشمنوں میں کیا گیا ہے۔ رگ وید میں بھی ان لوگوں کا ذکر ہے جو اندر کو نہیں مانتے۔

ورن وید میں جن دیوتاؤں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ہمیں خاص دلچسپی ورن کے ساتھ ہے۔ ورن کا ذکر بالعموم مترا کے ساتھ آیا ہے اس کے ساتھ دیو مالا کے قصے، کہانیاں منسوب نہیں ہیں۔ وہ قادر مطلق اور ہر جگہ موجود ہے اور اخلاقی قوانین کا محافظ ہے، زمین و آسمان اسی کی تخلیق ہیں۔ سورج چاند، تارے، اسی کے حکم سے گردش کرتے ہیں، ہوا اس کی سانس ہے۔ اسی کے حکم سے زمین اور آسمان جدا جدا ہیں، وہ ہمہ بین اور ہمہ دان ہے، زمین آسمان اور اس کے باہر بھی جو کچھ ہوتا ہے اس کو اس کا علم ہے، کوئی آدمی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا چاہے وہ آسمان سے بھی کہیں دور چلا جائے، جو کچھ آدمی کرتا یا سوچتا ہے اس کا بھی اسے علم رہتا ہے، گناہ اس سے بخشوایا جاتا ہے

کے احکام کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ وہ گنہگاروں کو اپنی مضبوط گرفت میں رکھتا ہے، گنہ گار اس سے استغفار کرتے ہیں اور وہ توبہ کو سننے اور معاف کرنے والا ہے۔ جبکہ اور دیوتاؤں سے دنیا کی چیزیں طلب کی جاتی ہیں۔ ورن سے مغفرت مانگی جاتی ہے۔ وہ آسمان میں ایک سنہرے محل میں رہتا ہے، اس کا تخت عظیم الشان ہے اور اس میں ہزاروں ستون ہیں، اس تخت سے وہ تمام آدمیوں پر نظر رکھتا ہے اور سب کو دیکھنے والا سورج اس کے دربار میں حاضر ہو کر سب باتوں کی اطلاع دیتا رہتا ہے —

ورن دیوتا کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ اور سب دیوتاؤں کی خصوصیات سے الگ اور بلند ہیں، ہر چند کہ اس کا ذکر وید میں اگنی اور اندر کے مقابلے میں بہت کم ہے مگر اسکی حیثیت بڑی عظیم الشان معلوم ہوتی ہے۔ وید کے دیوتاؤں میں شاید ہی ایک دیوتا ایسا ہے جس کو خدا کے تصور سے یک گونہ مماثلت حاصل ہے۔

اتھروید میں ایک نظم ورن کی شان میں ہے۔ ٹی۔ ایچ گری فیتھ کا خیال ہے کہ پورے ویدک لٹریچر میں کوئی اور نظم نہیں ہے جس میں خدا کی معرفت کا اتنے پرزور طور پر ذکر ہو۔ بدقسمتی سے یہ نظم بھی ایک جادو کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ گری فیتھ کا خیال ہے کہ نظم اصل میں قدیم ہے اور بعد کو جادو کے لئے اس میں کچھ شعر اور دعا کر اتھروید میں شامل کیا گیا ہے۔

برجاپتی ہمارے لئے ایک اور دلچسپ مطالعہ یہ برجاپتی کی ہے، برجاپتی کا ذکر رگ وید اور اتھروید دونوں صحیفوں میں آتا ہے۔ وہ کائنات کی تخلیقی قوت یا قوتوں کا مظہر ہے۔ وید میں برجاپتی کو زندہ مخلوق کا پروردگار اور مالک کہا گیا ہے۔ یہ القاب سوریہ کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ برجاپتی کا تصور یہ ہے کہ سب دیوتا اور کائنات اسی ہستی سے وجود میں آئے اور اسی کے طفیل میں زندہ اور قائم ہیں۔ براہمن اور دوسرے لٹریچر میں جس میں کرمکانڈ کی رسموں کا ذکر ہے۔ برجاپتی کو بلند درجہ حاصل ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ برجاپتی کے تصور کو ہمارے تصور رب کے ساتھ کسی درجے میں بھی مماثلت حاصل ہے۔

اوشا ادبی خصوصیات کے اعتبار سے، سب سے اچھی حمدیہ نظمیں اوشا دیوی سے متعلق ہیں، اوشا دیوی کا ذکر کبھی بطور ایک دلہن کے کیا جاتا ہے اور کبھی اس کا ذکر ایک مغرور دوشیزہ کے طور پر کیا جاتا ہے۔

سام وید سام وید میں جو منتر ہیں وہ تقریباً سب رگ وید سے لئے گئے ہیں، یہ نظمیں سام یوگ کے موقع پر پڑھی جاتی ہیں۔ یہ ان دیوتاؤں کی شان میں ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس مقدس رسم کی ادائیگی کے موقع پر آتے ہیں ان نظموں کا خاص مضمون پجاریوں کے لئے برکت طلب کرنا ہے، بعض نظموں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے اثر سے وہ آگ جس میں قربانی ڈالی

جاتا ہے، منتر پڑھے جاتے ہیں اور اس کے اثر سے
سوم کا رس مقدس ہو جاتا ہے۔

سام ویدک رسوم کی ادائیگی میں ۹ دن لگتے ہیں۔ پجاری
اسی دوران میں جبکہ وید کی تلاوت کی جاتی ہے سخت
ریاضت کرتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ریاضت
سے پجاری ایک دیوتا کی طرح پاک ہو جاتا ہے۔ تینوں
ویدوں کے پڑھنے والے یعنی رگ، سام اور یجر کے
پڑھنے والے ان رسوم میں حصہ لیتے ہیں۔ اتھروید
کے پڑھنے والے ان رسوم میں شریک نہیں ہوتے
وید پڑھنے والوں کو چھ گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے
ایک رگ وید پڑھتا ہے، دوسرا سام، تیسرا اندر کا
انتظام کرتا ہے، چوتھا آگ جلاتا ہے، پانچواں سب
رسوم کی ادائیگی پر دھیان رکھتا ہے اور چھٹا ایک گرز
لے کر دروازے پر کھڑا رہتا ہے تاکہ کوئی غیر مطلوب
اندر نہ آنے پائے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک ایسا
بھی ہوتا ہے جو ان ساری رسوم کا ذمہ دار ہوتا ہے
اور جس کی طرف سے اور جس کے فائدے کے لئے
یہ سب کیا جاتا ہے، رسوم کے پورا ہونے کے بعد
برہمنوں کو انعام و اکرام ملتا ہے۔ سوم کا رس جس کو
نذر میں خاص اہمیت حاصل ہے نشہ آور ہوتا ہے
اس رس کو خود دیوتا سمجھا جاتا ہے اور کبھی اگنی اور
اندر کو بھی اسی کا مظہر کہا جاتا ہے۔

یجر وید - یجر وید میں وہ منتر ہیں جو نذر کے وقت
پڑھے جاتے ہیں، یج کے معنی ہیں عبادت
کرنا اور "وید" کے معنی ہیں "جاننا" اس طرح یجر کے
معنی ہیں: نیاز کے منتر اور رسم کا علم۔ جب نیاز
چڑھائی جاتی ہے تو یجر وید میں سے مختلف منتر
پڑھے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر نئے چاند اور
پورے چاند کے موقع پر ہر گرہست کے لئے
نذر و نیاز فرض ہے۔ ہر نیاز میں دو دو روز لگتے ہیں۔
پہلے روز ابتدائی کام کئے جاتے ہیں جیسے کہ مشرق
اور شمال میں آتشدان بنائے جاتے ہیں اور مغرب
کے آتشدان سے آگ لائی جاتی ہے۔ اسی روز روزہ
اور دوسری ریاضتوں کی نیت کی جاتی ہے اور دودھ
کی نذر چڑھائی جاتی ہے۔ پہلے روز برہمن جو نذر
چڑھانے میں سارا کام انجام دیتا ہے۔ پلاش کی شاخ
کاٹتا ہے اور اس سے گائے کے ان بچھڑوں کو
الگ کرتا ہے جن گایوں کا دودھ دوسرے روز
نذر میں چڑھایا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ جب تک
اس قسم کی تفصیلات پر نظر نہ ہو یجر وید کے معنی نہیں
سمجھے جا سکتے۔

اتھروید اتھروید کو دوسرے ویدوں کے برابر درجہ
بعد کو حاصل ہوا۔ اس کے پڑھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا بعض مخفی طاقتوں کا
شکار ہے۔ لوگ اپنی حفاظت کے لئے جادو منتر
سے کام لیتے ہیں یا تو وہ خود ان بری طاقتوں سے رحم
کی التجا کرتے ہیں یا پھر دوسری بھلی طاقتوں سے امداد
مانگتے ہیں۔ جن طاقتوں سے امداد طلب کی جاتی ہے
ان میں رگ وید کے دیوتا بھی شامل ہیں اور ان کے
ساتھ ساتھ دعائیں اور التجائیں خود بھوت پریت
اور خود بیماری سے بھی کی جاتی ہیں۔ اس سے اس

زمانے کی طرزِ عمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کا
خیال تھا کہ ان جادوؤں میں خود جادو کا اثر ہے اور
ان کے ذریعہ انجام کم کی جاتی ہے اور دیوی دیوتا یا
مخفی طاقتوں کو مدد کے لئے مجبور زیادہ کیا جاتا ہے
تلفظ کی صحت اور رسم کی ادائیگی سب سے اہم ہے۔
اور اسی میں ساری تاثیر ہے۔ اتھر وید میں جنگ میں
فتح، مباحثے میں کامیابی، دولت کے حصول، گھر میں
خوش حالی، کسی لڑکے، لڑکی کی محبت حاصل کرنے
جوئے میں کامیابی، بیماری اور [illegible]
حاصل کرنے کے لئے منتر دئے گئے ہیں۔ [illegible]
چڑیل، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے خلاف منتر
ہیں۔ وید، برہمن، بادشاہ، گائے، اور [illegible]
بکری کی شان میں حمدیہ نظمیں بھی ہیں۔ اتھر وید سے قدیم
زمانے کا طرزِ معاشرت ان کا سیاسی اور معاشی [illegible]
اور ان کے خانگی حالات پر بھی کچھ روشنی
پڑتی ہے۔ ■■

شفیق حیدرآبادی

غزل

(اوج صاحب کی غزل سے متاثر ہو کر)

ہمیں نہ دیر ہی پیارا، نہ ہے عزیز حرم
سکونِ دل ہے کافی تری نگاہِ کرم

ہماری طرح اگر تم جیو، تو مانیں ہم
ہر ایک سانس پہ اندر کبھی تو باہر دم

ہیں ایسے مست نہیں تشنگی کا ہم کو غم
ہر ایک حال میں ساقی رکھیں گے تیرا بھرم

ستم پہ ناز اگر ہے تو کیجئے گا ستم!
کہ ہر ستم کو بھی سمجھیں گے ہم تمہارا کرم

خود اپنی آپ کی پہچان تھی بہت مُبہم
نہ تم کو جانتے، پہچانتے نہ خود کو ہم!

نہیں مسیح کی حاجت، جنوں کے ماروں کو
ہمارا درد ہی قاتل ہے، درد ہی مرہم

وفورِ شوق میں لغزش پہ اختیار نہیں
اٹھا تو ہم بھی رہے ہیں بہ احتیاط قدم

قدم قدم پہ اُجالا ہے، سب یہ کہتے ہیں!
نظر نظر میں اندھیروں کا ہے وہی عالم؟

دکھاتے پھرتے ہیں، مجروح چاک دامانی؟
اِدھر بھی دیکھتے ہیں، تار تار جا بجا سے ہم!

یہ کش مکش بھی خدا جانے رنگ کیا لائے!
جنوں بھی آج جلالی ہے، زلف بھی برہم

ابھی کسی نے فقط نام ہی لیا تھا ترا!
بس اتنی بات پہ کیوں ہوگئی ہیں آنکھیں نم؟

تمہارا عذر یہ معقول تو نہیں لیکن
خُدا کا واسطہ، کھاؤ نہ تم خدا کی قسم!

یہ معجزہ کہ طلوعِ سحر کے موقع پر
شکستہ حال تھے، ترشے ہوئے تمام صنم

عجیب سا ہے یہ اندازِ طالب و مطلوب
ہے دستِ عشق سوالی تو خالی ہاتھ صنم

زباں رکھتے ہیں، اہلِ زباں نہیں ہیں شفیق!
قلم ہے ہاتھ میں، لیکن نہیں ہیں اہلِ قلم!

بدنام نظر
۲- جان نگر دہ سری لین - کلکتہ - ۱۴

آدرش وادی

ہوائیں موت کی بو
زمیں بنجر
ہمالہ برف کا تودا
ندی پھیلی ہوئی لمبی بیماری کی
تپتا اژدہا رنگ

عبادت ایک بدبو پیپ اگلتے نقش بدن کا
مذاہب ادھ ننگے بڈھے جو اک جھٹکے سے گر جائیں
مری تہذیب اک دیمک لگی دیوار
پرانی ادھ مری ہوئی بڑھیا کہ جس کے منہ پہ مکھی بھنبھناتی ہے
کتابیں گھٹنوں کا کام کرتی ہیں
نصیحت اور ایڈریس ٹیپ ریکارڈر کی زینت ہیں
مساجد جوتوں کی دوکان
کلیسا قبر، گردواروں میں کرپانوں کی اک بہتی ہوئی ندی

غبارے جیسا پھولا پیٹ معدہ
مرے دیہات خالی ڈھول
اور شہر والوں کے چہروں پہ گندے دانت، پیلے ہونٹ، پچکے گال
ننگی چھاتیاں، رانوں کی دوکانیں
مرے جنگل کسی خارش زدہ کتے کی صورت اپنے دھڑ میں بیماریاں رکھے
مرے کھانے کے ٹیبل پر ہیں کچھ پھینکے ہوئے ٹکڑے

مرے سونے کے کمرے میں ہیں سیہ رت جگے اور بستروں پہ دھامن سانپ
میں اک آدرش وادی ہوں مری بستی ہے اک آدرش بستی

سرقہ

م۔ ناگ

ست گرنی امر روڈ ناگ پور۔۹

جس دن میرے ناشر نے منع کرنے پر بھی کتاب کو
پریس سے پکڑ کر ڈلوا لیا تھا ــــ بالکل اسی دن میں نے
صوبہ کے کچھ ذہین شعرا کا مجموعہ کلام نکالنے کا طے کیا
ناشر کے ڈرانے اور ترغیب کے ڈر نے سے کتاب نکالنے
میں مجھے کوئی تحریک نہیں ملی تھی۔ بلکہ یہ وہ دن تھا جب
میں نے ایک ایسے شاعر کو کتاب کے متعلق بتایا
جو مدت سے اچھا لکھتا تھا اور اسے چھاپنے کی ہمت
کوئی بھی نہ کرتا ــــ یہی نہیں بلکہ میں نے اس سے
یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی چند بہترین تخلیقات، ایک پاسپورٹ
سائز فوٹو اور مختصر سا تعارف لاکر دے۔ ساتھ ہی میں نے
ادھر اُدھر بھی خطوط لکھ دیئے ــــ مجھے اسے دوبارہ
کہنا پڑا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھتا اور خوش ہوتا تھا
ــــ زندگی میں پہلی بار اس کی عید ہوئی تھی اور وہ ہر
ملے سے خوشیوں کا رس نچوڑ نچوڑ کر پیتا رہا اور خوب ہنستا
ہنساتا رہا ــــ میں نے ایک نیا انسان اس میں دیکھا۔
وہ بولا "شاعری نے اسے کچھ نہیں دیا۔ اس لئے اس
نے اس کی لڑکی چھین لی ــــ اسے پاگل کر دیا ــــ وہ
شاعری کو کب کا چھوڑ چکا ہوتا، مگر شاعری ہی اسے نہیں
چھوڑ رہی ہے۔"

اب اس کا حلیہ یکدم بدل گیا تھا۔ ہپی ٹائپ بال اس
نے کٹوا دیئے۔ کپڑے ڈھلے ڈھلے پہننے لگا۔ اب
بالوں میں تیل ہوتا اور سینڈل پر پالش ــــ اور چہرے
پر خوشیوں کے پھول ہی پھول! مجھے خوشی ہوئی کہ ایک ذرا
سی بات جو میرے لئے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس
کیلئے عید کا سامان مہیا کر گئی ــــ وہ بہت دنوں سے
میرا دوست تھا۔ اور میں ہمیشہ اس کی خوشی چاہتا رہا۔ مگر
ہمیشہ یہ سوچتا رہا کہ اس کے لئے بھلا میں کیا کر سکتا
ہوں؟ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ بہت دنوں سے لکھ رہا
ہے اور بہت اچھا لکھ رہا ہے۔ لیکن کوئی اسے شائع
نہیں کرتا۔ جب بھی کہیں غزلیں یا نظمیں بھیجتا ہے
معذرت ناموں کے ساتھ واپس لوٹ آتی ہیں۔ کبھی

کبھی تو اسے یہ شک بھی گزرتا کہ کہیں پوسٹ والے تو
دھوکہ نہیں دے رہے ہیں کہ پرچے تک پہنچاتے نہیں
اور واپس لاکر دے جاتے ہیں۔ رجسٹری ڈاک سے
غزلیں بھیجنے پر بھی جب وہ واپس آنے لگیں تو اس نے
جھلاہٹ بھرے خطوط ان ایڈیٹروں کے نام لکھ کر جو
اس کی رچنائیں بنا دیکھے ہی لوٹا دیتے تھے۔ خطوط میں
جی بھر کے گالیاں دے کر وہ اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرتا
خطوں میں ان پر کئی طرح کے الزام لگاتا کہ وہ گروپ بندی
کا شکار ہیں۔ اور بھانجہ بھتیجہ وادی ہیں۔ اور رشوت خور
ہیں اور ایڈیٹر بن کر اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔

اسکی تخلیقات میں جانے کیسا پاٹزن ہوتا جو ایڈیٹر لوگوں کو
ہضم ہی نہ ہوتا۔ بس ادھر کھلایا اور ادھر پھر سے قے کر
دیتے تھے۔ اپنی تخلیقات کے واپس آنے پر وہ اس
طرح ماتم کرتا مانو اس کا باپ مر گیا ہو ——— ایک دو مرتبہ
اس کے "ماتم" میں بھی شریک ہوا تھا۔ میں نے کہا
تھا کہ بے شک وہ بڑا شاعر ہے اور ایک نہ ایک دن
ضرور چمکے گا۔
"لیکن وہ ایک دن کب آئیگا بھیا جی" وہ چیخ پڑا اور
آبدیدہ سا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی اس کے حال پہ ہنسی آتی
اور کبھی کبھی ترس۔

وہ اکثر بیمار رہتا۔ چونکہ اپنے آپ کو ایکدم بھلا چکا تھا
کھانا اور شراب خوب پیتا۔ کبھی پروفیسر کی تھیسس
کا کوئی پیج لکھ دیتا۔ کبھی شادیوں میں آرڈر دینے پر
سہرے لکھتا اور کبھی محرم کے مہینے میں مرثیے لکھ

لکھ کر چھپا رہتا۔ پیٹر کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا
تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے جو کسی آفس میں کام کرتا
تھا۔ اسے کہیں ایل۔ ڈی۔ سی بنا دیا۔ مگر دو ایک سال
بعد وہ وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ بتایا گیا کہ وہ وہاں کا
کام نہیں کرتا، الٹے شاعری کرتا ہے۔ مگر شاعری تو جیسے
اسے کھا گئی تھی۔ وہ سارا سارا دن اسی میں رکا رہتا۔ کبھی
اس شاعر کا دیوان چھان رہا ہے۔ کبھی اس شاعر کا
دیوان ——— مگر جب وہ اسکول کی کتابیں نہ پڑھتا تو گھر
والے شاعری کو خوب گالیاں دیتے۔ جو جانے کس جنم
کی پاداش میں بھگتنا پڑتی ہے اور کھانا پینا حرام اور نیند
خراب کر کے رکھ دیتی ہے۔ ماں کہتی "یہ لڑکا کبھی آگے
نہیں بڑھ سکتا۔" بھائی کہتا "[illegible] future [illegible]
[illegible] mark"۔ اس نے شعر کہہ کہہ کر چار پانچ کاپیاں
ختم کر ڈالی تھیں۔ نہ اسے اور کوئی مشغلہ پیارا تھا۔ بس
شاعری اور محض شاعری۔ جب وہ بیمار ہوتا میں اس کی
مزاج پرسی کو جاتا ——— بات گھوم پھر کر وہیں آ جاتی۔
"یہاں فنکار دیکھے جاتے ہیں، فن نہیں" اور اگر
میں کسی ایڈیٹر کا بھانجہ، بھتیجہ ہوتا تو کب کا چھپ گیا
ہوتا۔ اکثر کہا کرتا ——— "سالی ایسی ایسی رچنائیں
چھپ جاتی ہیں جو چھپنے لائق نہیں ہوتیں" ——— نیند
میں بھی بڑبڑاتا ——— "سالے اپنے والوں کو چھاپتے
ہیں۔"

اب وہ میرے بنگلہ پر آکر بیٹھنے لگا۔ ورنہ ہمیشہ
چھوٹے ہوٹلوں میں اونگھتا رہتا اور صرف دو طرح کی باتیں
کرتا۔ ایک تو یہی چھپنے چھپانے والی بات اور دوسرے

قریب آیا لیکن میں نے اسے پچکارا بھی نہیں ——

اُس رات میں ایک ضروری کام سے بمبئی چلا گیا۔ وہ مجھے راستے بھر یاد آتا رہا ہے۔ اس کے پرانے کارنامے اسکی جھنجھلاہٹیں —— "آپ گدی کب چھوڑیں گے بزرگوار کوئی نیا فنکار آئے تو کہاں بیٹھے" بزرگوار کے حمایتی چاقو لے کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ تب سے وہ پھر چاقو رکھنے لگا تھا لیکن لوگ پاگل پاگل کہہ کر اسکی ہنسی اُڑا رہے تھے —— میں نے اسکی نیا کنارے لگا دی ہے۔ کسی حد تک! یہ سوچ کر میں غبارے جیسا پھولنے لگا۔

تین دن بعد گھر پہنچا تو بیوی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ شیرنی کی طرح دھاڑی ——

"بدمعاش لوگوں کو پال کر تم کتنا گر گئے ہو" چونک کر پوچھا کہ کیا بات ہے —— تو بولی ——

"وہ اسی مسٹنڈے سے پوچھو" —— لیکن بعد میں خود ہی بتایا کہ "وہ کل آیا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ وہ سیدھا کرتی کے کمرے میں دور تک چلا گیا —— وہ کپڑے بدل رہی تھی۔ کرتی نے پہلے شرافت سے کام لیا مگر وہ باہر نہیں گیا۔ اور پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگا۔ کرتی نے چیخ کر مجھے بلایا۔ میں دوڑی دوڑی گئی۔ تب وہ بدمعاش کرتی کا ہاتھ پکڑ چکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا۔ میں وقت پر پہنچ گئی ورنہ کرتی کا کیا حشر ہوتا....." میری بیوی نے مجھے غیرت دلائی۔ "تم اس ذلیل اور بدمعاش کی تخلیقات اپنے مجموعے میں چھاپ رہے ہو جس نے تمہاری.....

..... پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ تم اسے عظیم کہتے ہو؟ کیا شاعر ایسے ہوتے ہیں!؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی —— "کرتی رو رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا پھر بھی وہ روتی رہی۔ تم نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے —— تم اسے پولیس میں دے دو!" بیوی الیکٹرک کرنٹ جیسی تپ رہی تھی۔ "آج اس نے ہاتھ پکڑا ہے —— کل آگے بھی بڑھ سکتا ہے......" میں بھر گیا۔ موڈ آف ہو گیا —— جی بھر کے غصہ آیا۔

میں نے فائل کھولی۔ فائل میں اسکی تخلیقات بھی تھیں۔ اسکی تصویر اور اس کا تعارف بھی۔ ایک دن بہت پہلے وہ بولا تھا: "اپنی ساری تخلیقات جلا ڈالتا ہوں" میں نے حیرت ظاہر کی تھی۔ "کیوں بھلا" تو اس نے جواب دیا تھا: "کیا فائدہ! ان دنوں ٹھنڈ خوب پڑتی ہے اور میرے پاس سویٹر نہیں —— اپنی تخلیقات کی دھونی رما کر کم از کم اپنا بدن تو گرما لونگا پکاسو کی طرح۔" بیوی ابھی تک بڑبڑا رہی تھی "تم اس سے ڈرتے ہو۔"

میں نے دانت پیسے اور اسکی تمام غزلیں نکالیں اور پھاڑ پھاڑ کر پھینکنے لگا۔ اسکی تصویر کے بھی چار ٹکڑے کر دیئے۔ اور تعارف کے بھی! بیوی نے غصے میں بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دوبارہ اٹھایا اور چار چار کے آٹھ آٹھ کر دیئے۔

"وہ تمہاری تنہائی میں گھس کر بھی چھید کر رہا ہے" بیوی بولی

وہ بات سنتا ہے پتہ لگ گیا تھا کہ اس نے کیا
بہا صفحے ہاتھ سے گندا کیا ہے — اس کے بال بکھرے
ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا — میں اٹھا اور
چیخ پڑا — "تم بھاگ جاؤ کمینے — میری نظروں
سے دور چلے جاؤ — میں تمہیں پولیس میں دیدونگا"
اسکی گھگھی بندھ گئی تھی — تبھی اس کی نظر بکھرے
ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں پر گئی۔ اور وہ فوراً پہچان گیا
کہ یہ اسکی تخلیقات کے ٹکڑے ہیں اور تصویر کے ٹکڑے
اور سوانح حیات کے ٹکڑے! وہ بت بن گیا — "تم
نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ شرم نہیں آتی بدمعاش
— آرٹسٹ بنے پھرتے ہو —"

میں کروٹ بدل کر سو گیا — میرے اندر جانے کیسی
ہڑبونگ مچی تھی کہ اتنے میں میرا ٹائیگر میرے پاس آیا
اور میری پائنتی آکر بیٹھ گیا۔ پھر آدھ فٹ کی زبان
نکال اور میرے تلوے چاٹنے لگا۔ پھر میرے پاس
میرے قریب آیا — کچھ ایسا درد اور پیار تھا اسکی
آنکھوں میں کہ میں نے اس کا جرم بھی معاف
کر دیا۔ جس میں اس نے میرے نتھنے پر بھی کر دی

کونوں سے پکڑ کر ٹھایا تھا۔ میں سب کچھ بھول کر
اسکی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا — وہ کھڑا رہا —

میں سمجھنے والا تھا کہ وہ اپنی کہانی سمیت لے کر چلا
جائے گا۔ مگر وہ اٹھا اور میری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔
پھر اپنے دونوں ہاتھ نیچے ٹیک دیئے — اب
اس کے چار پاؤں تھے۔
چار پیروں سے چلتا ہوا وہ میری پائنتی آیا — اسکی
آنکھوں میں عجیب سا درد تھا اور وہ دور دور تک جانے
کیا خلاء بے نام سا! چہرہ سرخ تھا — جانے
کس جذبے کے خوف سے سرخ!!
پھر اس نے اپنی زبان نکالی — لپلپاتی لمبی
— اور پھر — اور پھر میرے پیروں پر گر کر میرے
کھردرے تلوے چاٹنے لگ گیا!!؟ ●●

ایک نظم

علی ظہیر

رات کے دھندلے غاروں میں
میں اکیلا پڑا تجھ کو ہی سوچتا تھا
سرد راتوں میں بستر پہ کروٹ
لحافوں کے اندر
کہاں تک میں تنہا بدلتا رہوں
تری گوشت کی گرم تیرگی کا
وہ گشتہ لطیفہ
میرے بدن میں حل کر رہا رات بھر جلتے رنگ کا
زندگی خوف کی ایک بنیاد ہے
کیا بُرا تھا اگر برف لمحوں کو آج
اپنی بے تابی حرارت سے گرماتا میں
کل اُداسی کی بیادر میں لپٹی ہوئی
پیلی آنکھیں دریچوں سے در آئیں گی

•

۹۷۹-۱-۲۲ - ڈیوڑھی راؤ رمبھا
حیدرآباد - ۲۴

لطف الرحمان
خاتون منزل۔ محلہ سرائے
بھاگل پور۔ بہار

ایک غزل

میں اپنے آپ سے، تجھ سے الگ بھی ہوں اک شخص
انجانی سمتوں سے ایسی بھی اک صدا آئی
لہو لہان کوئی مجھ میں، تجھ سے مل کے جدا
عجیب ذائقہ دینے لگی ہے تنہائی
وہ اپنے بوجھ تلے دب کے رہ گیا ہوگا
کل اس کی آنکھ میں دیکھی عجیب گہرائی
کچھ اور اجنبی طرح اس کو اب بکھرنے دو
کہاں کہاں سے سمیٹوں گا اپنی رسوائی
بہت قریب بھی آ کر کوئی رہا نہ قریب
ہمیشہ دور سے اس کی مجھے صدا آئی
میں چل رہا ہوں بیک وقت کتنی راہوں پر
کہ بٹ گئی ہے مری شخصیت کی گیرائی

[illegible] چار چیزیں
پاسبان، [illegible] وغیرہ۔ میں کہتا ہوں حیدرآباد
اب کہاں! حیدرآباد کی شہرت تھی چار خزانوں پر!
جواہرات کا خزانہ، دولت کا خزانہ، اسلحہ کا خزانہ
اور علم کا خزانہ۔ ان میں سے تین خزانے خالی ہو گئے
البتہ علمی خزانہ آج بھی وافر مقدار میں موجود ہے
پہلے یہاں ایسے دماغ موجود تھے جو چلتے پھرتے علم
کا خزانہ تھے۔ نواب عمدۃ الملک امیر کبیر کی ذات
دکن میں نہایت ہر دلعزیز تھی۔ شہر بھر میں یہ "مجھلے
میاں" عربی، انگریزی اور سنسکرت [illegible]
کے مالک تھے۔ شاعری میں علامہ گرامی اور حضرت [illegible] کے
تلامذہ تھا۔ جس [illegible] کے بزرگ تھے۔ اسی ہزار روپیہ
قرض حسنہ کے طور پر مستحقین و احباب کو دیا اور معاف
کردیا۔ صرف ایک صاحب سے جنہوں نے قرض لینے
ہی سے انکار کیا تھا مقدمہ کی نوبت آئی اور مقدمہ
جیت لینے کے بعد انہیں بھی بخش دیا۔ جوش صاحب
ان سے بخوبی واقف ہیں اور حقیقتاً جوش ان کو استاد بھی
سمجھتے ہیں (علامہ گرامی کے شاگرد اور مرہون منت بھی!)

حباب آفرید
دواخانہ محمودیہ۔ دھوبن کی مسجد
دارالسلام حیدرآباد

حیدرآباد کے علمی خزانے

میاں" کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ریاضی کے
علوم میں اپنا ہمسر نہ رکھتے تھے۔ عربی، فارسی سے
بخوبی آگاہ تھے۔ مہاراجہ بہادر (شاد آنجہانی)
اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور ایسی انجمن تھے
کہ جس میں کسی مذہب کا عالم یا ادیب غیریت محسوس
نہ کرتا تھا۔ سر سالار جنگ ثالث دنیا بھر کے معلومات
کی انسائیکلوپیڈیا تھے۔ انکی نظر انسان کے جوہر کو
تاڑ جاتی تھی۔ مولانا ریاض احمد صاحب تھے جو ضعیفی
ان بزرگ سے میری ملاقات بلاناغہ ہوا کرتی تھی اور یہ سلسلہ
"عالم منزل" کوچۂ چراغ علی۔ اب ان بنگلوں میں آغا خانیوں
کا عبادت خانہ اور مدرسہ وغیرہ ہے) کے بکنے تک مسلسل
جاری رہا۔ اس کے بعد "حضرت ریاض دکن" دبیل گوڑہ
کے کرایہ کے مکان میں منتقل ہو گئے تھے اور اسی مکان
میں ایک دن اپنے جس شعر کے ذریعہ مجھے رنجیدہ کردیا تھا
وہ لوحِ دل پر نقش ہے۔ شعر یہ تھا ؂

"ہوا کھانے کے دن اب ہو چلے گلزارِ امکاں میں
کہ جنبش دھیمی دھیمی پائی جاتی ہے رگِ جاں میں"

مہاراجہ بہادر اور نفرآں مکاں اس خاندان کا بڑا لحاظ فرماتے تھے۔ اور حضرت سلطان العلوم رحمۃ اپنا مخصوص خاص ان بزرگ کو سمجھتے تھے اور اکثر کنگ کوٹھی کے "شاہی مشاعروں" میں یاد فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہوش صاحب نے حضور سے کہکر یہ مصرعہ دعوت ناموں میں رکھوایا؎

"نرالی شرط تھی رنگِ حنا سے"

ریاضِ دکنی کی گرہ نے مصرعہ کو اپنا لیا۔ گرہ لگائی تھی؎

"نہ مل جانا کہیں خونِ وفا سے"

جن ہستیوں کے نام میں نے گنوائے ہیں یہ شخصیتیں کسی اسکالر کے لئے بجائے خود ایک یونیورسٹی کا حکم رکھتی تھیں۔ مولانا ابراہیم علی صاحب (صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی) سید علی گوشہ میں فروکش تھے۔ بٹی باؤلی میں لیکر بار آتے تھے لیکن علمی شان یہ تھی کہ "تحفۃ المومنین" لکھ کر عرب و عجم کی گردنیں اپنے آگے خم کروالی تھیں۔ مفتی ضیاء یار جنگ کو حضور "ضیاء الشمس" سے مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب شطرنج کے دھنی اور کھانے کھلانے کے رسیا تھے۔ ایک "شاہی دعوت" میں قلمیاں "سرو" ہو رہی تھیں۔ حضور نے قلمی کی بابت دریافت فرمایا! کہنے لگے :۔ "ذرا اور خستہ ہوجاتیں تو قیمہ کا بوجھ نہ سہار سکتی"۔ آج غالبؔ کی دلی کسی نہ کسی عنوان نقشہ پر موجود ہے۔ لیکن "میرا حیدرآباد" اس پر سے تک غائب بقول شاعر؎

بدل گئی ہے کچھ ایسی صورت ہے اہلِ جغرافیہ کو حیرت
لکھا ہے نقشہ پہ نام "بھارت" ہراہے ہندوستاں نہ اردو

اس گئی گذری حالت میں گو ویسے ماحول تو [illegible] نہیں آتیں جو بہ دیدہ دل میں اتر جائیں لیکن علمی خزانے فہرست شدہ کتب خانوں کے علاوہ تنہا موجود ہیں کہ بجائے خود فہرست طلب! چند سے متعارف ہوئیے :۔

محمد ہاشم صاحب (انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ جلد روڈ پر) انچارج تھے اب چل پھر کر کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور انکی محنت حساس طبیعتوں میں رشک کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے۔ ایکدن مجھے جیب کُتروں کے چوک میں مل گئے۔ میں نے کہا آپ اِدھر کدھر! ایک کاغذ دیکر پتا پوچھنے لگے۔ میں نے کہا "یہ تو حافظ دین محمد ہیں' ان سے آپ کا کیا واسطہ!" مسکرا کر کہا "ان کے پاس کتابیں ہیں' دیکھنے جارہا ہوں"۔ میں نے پتا سمجھا کہ "یہ جو سامنے بڑی مسجد نظر آرہی ہے' اس سے بائیں طرف مڑ کر سیدھے چلے جائیے۔ وہاں آپ کسی بھی بچے سے "اندھے حافظ صاحب" کا گھر پوچھیں گے تو بتلادیگا"۔ بات رفع دفع ہوگئی۔ کچھ روز بعد ہاشم صاحب پھر کہیں مل گئے۔ میں نے پوچھا "کہیے حضرت کیا بنا!" جب انھوں نے بتلایا کہ "حافظ" کے پاس پانچ چھ سو کتابیں ہیں اردو کی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں نے کہا "حافظ جی کو میں ایک عرصہ سے جانتا ہوں لیکن یہ بات آج میرے علم میں آپ لا رہے ہیں کہ ان کے پاس چھوٹا موٹا کتب خانہ ہے"۔ خیر اس واقعہ سے اتنا معلوم ہو گیا ہوگا کہ حیدرآباد کے "نابینا" تک کیسے باذوق ہیں۔

جہاں تک مجھے اندازہ ہے اور مجھے معلوم کیا گیا ہے
حال صدر صاحب بھی علم اپنے شوقِ تحقیق بہت سا
چھوڑ دار شعری وغیرہ سے بے نیاز لیکن پابند صوم و صلوٰ
ۃ اور اکثر کتابیں خریدنا ان کے "اعمال نامہ" میں درج
ہے۔ لیکن ہمیں اسکی خبر نہ تھی۔ ہوا یہ تھا کہ جب کتابوں
کا ذخیرہ صندوقوں سے ابل پڑا۔ بھائی ارشد کو الماری
کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر کسی ہراج خانہ سے کئی چھو
ٹی بڑی الماریاں خرید لائے اور ان کو ہمارے بیٹھنے کے
کمرے میں رکھا۔ جب کتابیں اندر سے باہر آنا شروع
ہوئیں تو الماریاں بھر گئیں۔ انہی کے گھر میں مجھے ۱۳
مارچ سنِ رواں کو "سید نور محمد صاحب قادری" سے تعارف
حاصل ہوا۔ یہ نشست صبح سے شام تک جاری
رہی۔ سید صاحب دل موہ لیتے ہیں۔ فارسی میں بھی
شعر کہتے ہیں۔ اور "بزمِ سعدی" میں سناتے ہیں۔
اس سے ہٹ کر قدیم شاہی سکوں کی شناخت اور
عبارت خوانی میں۔ میرا خیال ہے ہندوستان میں ان
کا جواب مشکل سے ملیگا۔ چند سکے نذر کرتا ہوں

نادر کے سکہ کا شعر ؎

"نادرم در ملکِ ایران قادرم بر ہر دیار
لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار"

محمد عادل بیجاپوری ؎

جہاں زایں دو محمد گرفت زینت و جاہ
یکے محمد مرسل دوم محمد شاہ

اورنگ زیب کا اشرفی ؎

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

جہانگیر کے سکہ کا شعر ؎

سکہ زد در احمد آباد از عنایات اللہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

(سید صاحب نے بتایا یہ شعر آصف قادری)

ٹیپو کے سکہ کا مصرعہ ؎

"دینِ احمد در جہاں روشن ز فتحِ حیدر است"

مجھے یاد ہے کہ یہ دلچسپ اور معلومات آفریں صحبت
اردو کے اس شعر پر ختم ہوئی ؎

"ملے ہے اشرفی داغِ دل کر زخمِ جگر
ابھی خیر ہتیلی میری کھجائے ہے آج"

نواب دوست محمد خاں علم دوست اور ادب شعار
رئیس ہیں۔ "مسلم لاج" میں ان کا کتب خانہ ضخیم ہے
ہمارے بزرگوں سے ان کے مخلصانہ تعلقات قائم رہے
مجھے اس کتب خانہ کی ترتیب کا کچھ موقع ملا ہے اور
ان کی دی ہوئی چند کتابیں میرے پاس محفوظ ہیں۔

کرنل حمایت علی بیگ کے اعلیٰ درجہ کے ذوق سے بہت
کم لوگ واقف ہوں گے۔ انگریزی، فارسی اور اردو کی
کتابوں کے عاشق ہیں سخن فہم ایسے ہیں کہ سخن سنج ہونے
کا گمان ہوتا ہے۔ ان کا خوبصورت کتب خانہ سینکڑوں
کتابیں خارج کر دیے جانے کے باوجود قابلِ لحاظ ہے
اردو، فارسی کے پسندیدہ اشعار کی دو ڈائریاں "چنے
ہوئے پھول" کا نام دیکر ادب کے اس محسن نے اپنی
کوشش سے تیار کر کے احباب و اہلِ ذوق کی خدمت میں
پیش کیں۔ حمایت بھائی کی دوسری ڈائری میں جو ان کی

پیکر سعید آباد ۸۹

سالگرہ کے دن میرے حصہ میں آئی تھی۔ احسن مارہروی کی یہ رباعی مجھے کبھی نہ بھولے گی ؎

"سازندوں کا انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن
بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں"

نواب طاہر علیخاں السلم (ہز ہائی نس شہزادہ برار کے پرائیویٹ سکریٹری برسوں رہے) اردو فارسی انگریزی کے علاوہ یورپ کی بیشتر زبانوں سے آگاہ ہیں، نظام کالج میں جرمنی زبان کے استاد بھی رہے ہیں۔ اب کبھی کبھی "بزم سعدی" کی روداد کے ضمن میں نام پڑھنے میں آتا ہے یا برس میں ایک دن لیک گڈہ کے قل میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ ان کا کتب خانہ قابل دید ہے

آغا فرخ شیرازی اس وقت اس شہر میں فارسی زبان پر اتھارٹی ہیں۔ یہی حال علامہ ہندی مرحوم کا عربی میں تھا۔ کسی نے نہ پہچانا کہ ہندی کیا شئے ہیں! بیروت یونیورسٹی" اور جامعہ ازہر" کی تازہ ترین تعلیمات ہندی کے گھر آتی تھیں۔ انگریزی، مصری اور ایرانی علما ہندی سے بخوبی واقف تھے۔ انتقال سے چند روز قبل ہندی نامپلی کے بازار میں ایک دکان پر مل گئے تھے۔ بہت دیر تک کھڑے کھڑے باتیں کی تھیں۔ اسی دکان سے دو مرتبہ پانی منگوا کر پیا تھا۔ اس ملاقات کے کچھ ہی دن بعد خدا معلوم "تشنگی" ہندی کو کہاں لے گئی

مولانا ریاض الحق [illegible] رہتے ہیں۔ مجنوں [illegible] کی کتابوں [illegible] سے "کوکر" میں پکا کر دو وقت کھانے [illegible] کرتے ہیں اور مطالعہ میں غرق رہتے ہیں۔ یہی حال مولانا عبدالمقتدر صاحب کا ہے۔ راجہ کرن پرشاد کرن [illegible] کی مٹی ہوئی تہذیب و شائستگی کا مکمل نمونہ ہیں۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے ہیں۔ شہر کی ادبی انجمنوں نے "رئیس الشعرا" کا لقب پیش کیا ہے۔

(عم محترم) حکیم محمود الرحمٰن خاں 'غبار' بھی اس شہر میں اسی حیثیت کے مالک ہیں جو غالب کے وقت دلی میں حکیم محمود خاں کی تھی۔ مریضوں کے علاوہ شعرا، ادبا اور اہل حاجت کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اردو فارسی کے ہزار ہا شعر زبان پر رہتے ہیں۔ سیکڑوں ادبی واقعات کے حافظ ہیں۔ مشاعروں کیلئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیا کرتے ہیں۔ گھر کے بالاخانہ میں کتابوں کی ڈھیک لگی ہے۔ چچا بغیر پڑھے کسی کتاب کو اوپر نہیں بھجواتے اور ایک کتاب کے مطالعہ میں ہفتوں بلکہ مہینوں صرف ہو جاتے ہیں۔

اسی شہر کے شجاعت اللہ شجاعت سے مجھے معاف فرمانا، اہلِ ادب کے بیشتر شعرا ناواقف ہوں گے۔ آفتاب حسین صاحب ایڈووکیٹ کی سنی سنی مشاعروں سے آج تک بے نیاز ہے جنھوں نے جشن مصر کے اجلاس کے روشن دالانوں پر ٹاٹ کو دیکھ کر کہا تھا ؎

دیکھ کر اجلاس اول چُست یہ مصرعہ ہوا
محفلِ انصاف میں بھی ٹاٹ کے پیوند ہیں

[illegible] میں پچھلے سال تین سو ... ایک "احسن الاخبار"
نکلا کرتا تھا جس کی زبان فارسی ہوا کرتی تھی۔ اس اخبار کا
[illegible] حساب نہ ہوتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب
چونکہ [illegible] کے ماہر تھے انھیں اس اخبار کی دو تین سال
کی تمام جلدیں حیدرآباد ہی میں ملی تھیں اور انھوں
نے اس اخبار کے مضامین کا ترجمہ "دلی کا آخری سانس"
کے نام سے شائع کیا تھا اور اسی ترجمے سے فائدہ اٹھا کر
میر احمد علی خاں نے 'ظفرنامہ' لکھا اور طبع کروایا تھا۔

میں نے کسی اردو ڈائجسٹ میں غالباً دلی کے اشوکا ہوٹل
کے اشتہار کے ضمن میں یہ پڑھا تھا کہ 'شاہی غذاؤں کی قلمی
فارسی کتاب حیدرآباد ہی سے دستیاب ہوئی ہے جس کا
ترجمہ کروا کر یہ ہوٹل "طعام شاہی" کی لذتوں کو عوامی میز
پر چن دیا کرتا ہے۔ حیدرآباد کے قدیم کتب فروش
مطالعے کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ جہاں کتاب کا نام لیا
اور انھوں نے اسکی تاریخ بیان کردی نہ صرف یہ بلکہ مطلوبہ
کتاب کے مضامین اور عبارت وہ فرفر سنا دیں گے اور
گاہک ان کے ادبی ذوق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔
اقبال میاں کی قلمی تصویریں کس کی نظر سے گزری ہیں۔
بھنسالی [illegible] کا فن کاغذ پر ہوتا ہے۔ یہ شہزادہ برار کی سرکار
سے ایسے وابستہ رہے کہ شہزادہ نے جیتے جی انھیں
الگ نہیں کیا۔ انھوں نے دلی کے تاریخی میلہ "پھول والوں
کی سیر" اپنے آرٹ کے ذریعہ کروائی تھی اور یہ لمبی چوڑی تصویر
باغ عامہ کے اجنتا پویلین میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ
پر تھی۔ میں جب بھی باغ عامہ سے گزرتا ہوا اسے دیکھا کرتا
تھا۔ معلوم نہیں اب وہ مرقع کیا ہوا اور کدھر گیا۔ اسی طرح
پٹیل [illegible] کی [illegible] عمارت کے بالائی حصہ میں [illegible]
تصویریں بنا بنا کر بہت [illegible] دیا کرتے تھے۔

خود ہمارے گھر میں سید نبی احمد رضوی (جو اب کراچی میں
ہیں) رہا کرتے تھے۔ یہ ایسے آرٹسٹ ہیں کہ چاول کے
ایک دانہ پر انھوں نے ساتوں آسمانوں کی تصویریں بنائی
تھیں اور اپنا نام بھی "این۔ اے۔ رضوی" لکھ دیا تھا۔
مہاراجہ بہادر سالار جنگ ثالث اور نواب [illegible]
ان کے قدردان تھے۔ لندن کی نمائش میں ان کے چاول
گئے تھے اور اہل یورپ ایک ایک چاول پر شاہی خاندان
کے کئی کئی چہروں کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ وہاں
کے اخبارات نے ان کا فوٹو لے کر تعریفیں چھاپی
تھیں۔ اور ان سب سے چھوٹی تصویر بنا کر بھیجی تھی اور
یہ لکھا تھا کہ یورپ اس سے چھوٹی قلمی تصویر نہیں
بنا سکتا۔ یہ تصویر میں نے دیکھی تھی۔ اس کا سائز "پور" کے
برابر تھا۔ اہل یورپ نے انھیں وہاں آنے کی دعوت
بھی دی تھی لیکن یہ نہ جا سکے۔ میرے پاس ان کے
کئی چاول تھے۔ [illegible] نے چاولوں کو خرد برد
کر دیا اور میں دانہ دانہ کیلئے محتاج ہو گیا۔ ٭

ریڈیو کی گھر گھراہٹ اور اخباروں کی چیخ
آنے والیوں کے سہمے ہوئے لبوں پر انا للہ وانا علیہ
راجعون کا ورد....
ٹینک، گولیاں، آگ، دھواں اور خون.....
شرمار تھی مائیں، شرمار تھی ہوائیں۔ شرمار تھی لڑکیاں، شہید تھیں
زخمی اور.....
میری بجیا کی آنکھوں میں سلگتی ہوئی گرد۔
کس ہیبت ناک جنگل میں تم اپنا ہمسفر کھو آئیں بجیا کوئی
تمہاری مدد کو نہیں آیا؟ اپنے بھی نہیں غیر بھی نہیں کسی
نے تمہاری زخمی چیخیں نہیں سنیں، لیکن وہاں کوئی غیر
نہیں تھا..... یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟
تمہاری وہ ننھی منی کلیاں کہاں بجیا جنہیں تم سینے
سے چمٹائے رہتا تھا، وہ بھی اس جنگل میں تم سے بچھڑ
گئیں، تمہارا ہمسفر بھی تم سے بچھڑ گیا اور پھر بھی تم خوش
ہو؟ بجیا تم روتی بھی نہیں ہو، چیختی بھی نہیں ہو، تم اتنا
چیخو اتنا چلاؤ کہ ہمارے کان بہرے ہو جائیں، ہماری
آنکھیں اندھی ہو جائیں کہ ہم کچھ دیکھ نہ سکیں، احساس
کی رگیں شل ہو جائیں کہ کچھ سوچ نہ سکیں، تصور کی
بینائی زائل ہو جائے کہ تمہاری آواز کے ساتھ ساتھ
یہ تمہارے ساتھ اور کوئی عکس نہ ابھرے بنہ تمہارے
ہمسفر کا نہ ان کلیوں کا۔ یہ چیخو بجیا تمہیں میری قسم چیخو
کیا تم اپنی چیخیں اور اپنے آنسو بھی اپنوں کو دے آئی
ہو۔
ان اپنوں کو، جنکی محبت، چاہت اور اپنائیت پر تمہیں
اتنا اعتماد تھا کہ تم نے ان کے لئے چنبیلی کے اس پودے
کی طرف سے بھی آنکھیں موند لیں، جسے ہم نے مل کر
لگایا تھا، روز پانی دیتے تھے، جن کے پھول تمہیں بیحد
پسند تھے۔ تم انہیں جوڑے میں سجاتی تھیں، ان
اپنوں کی وجہ سے تمہیں ہم پر اعتماد نہ رہا اور ہم غیروں
نے کتنی آہوں کو سینے میں گھونٹ کر مسکراتے ہوئے
تمہیں الوداع کہا تھا۔
الوداع بجیا میں تم ہی سے مخاطب ہوں۔ تم سے
میں نہیں جانتا تھا وہ شخص جو مجھے مشرقی روڈ کے بس
پر ملا تھا اتنا بڑا مکار ہوگا۔
اسکی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ اس کا چہرہ
مختلف زاویوں سے مختلف آدمی کا معلوم ہوتا تھا۔ میں

شفق کبیر گنج سہسرام (بہار)
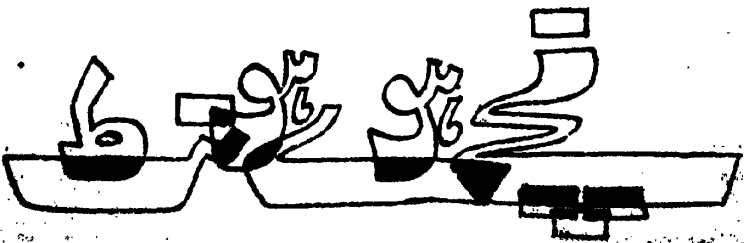
[illegible] دیکھا تو وہ
چھوٹا تھا وہ جب اس کے بغل میں بیٹھا تو پہلے سے قطعی
مختلف معلوم ہوا۔ اور جب اس نے میری طرف دیکھا
۔۔۔ وہ تیسرا چہرہ تھا۔
اس کے جسم پر متنوع رنگوں والا بشرٹ تھا جس پر
جگہ جگہ تصویریں تھیں۔
کہیں جھنڈا پھہراتے ہوئے، کہیں ہار پہناتے ہوئے
کہیں جلوس کہیں سولی۔۔۔ کہیں گولیاں، لاشیں
اور لاشوں سے بہتا ہوا خون۔ مجھے اس کی اس
احمقانہ پسند پر ہنسی آگئی۔
اپنا نام بتا سکیں گے؟
وہ بڑے زور سے چونکا، کھڑکی کی طرف سے نظریں
پھیر کر مجھے دیکھا پھر اس کے لب ہلے۔
کیوں؟
یونہی۔
سفر میں مسافروں کے نام کی کیا اہمیت۔۔۔۔۔
اسکی آواز سرگوشی سے آگے نہ بڑھی۔
میں نے پھر اسے غور سے دیکھا۔ وہ بہت معصوم تھا
اپنی تصویروں والی بشرٹ کیلئے قطعی مناسب۔
مجھ سے ایسے وقت میں خاموش نہیں رہا جاتا
جب کوئی میرے قریب ہو، ہم سفر کے اکتا دینے
والے لمحات سے نجات کیلئے یہ غیر ضروری تو نہیں؟
اور سفر بھی جس کا آغاز بھی ہوا اور انجام بھی۔
میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔
وہ زیر لب مسکرایا، اور اپنے پیروں کو پھیلا کر بولا،
جب سے میں نے جنم لیا ہے تب سے اب تک
سفر کر رہا ہوں اور اب سے موت تک سفر کرونگا
پھر تو آپ نے بہت سی جگہیں دیکھی ہوں گی۔
میرے اس بچکانہ سوال پر وہ کچھ خوش ہو گیا پھر
انگڑائی لیتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے بولا، اب
تو یہ بھی یاد نہیں کہ کتنی جگہیں دیکھی ہیں۔ سمجھ لیجئے
دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں میں نے
کچھ دن قیام نہ کیا ہو۔
اخلاقی نقطۂ نظر سے آپ نے لوگوں کو کیسا پایا،
مختلف ممالک کے۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔
میں سمجھ گیا۔ لوگوں کا اخلاق تعلیم اور آب و ہوا پر
منحصر ہے، کہیں میرا خیر مقدم ہوا، جلوس نکالا گیا، پھولوں
کا ہار پہنایا۔ نعرے لگائے گئے اور کہیں مجھے سولی
پر چڑھانے کی کوشش کی گئی، گولیوں سے چھلنی کر دینا
چاہا، جان بچانی مشکل ہو جاتی ہے کبھی کبھی۔
پر کیوں؟ آپ مجرم تو نہیں ہیں۔
وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا پھر بھی اس کی آواز مجھ سے
آگے نہ بڑھ سکی، اس نے میری بات کو نظر انداز کر کے
کہا۔ بہت دنوں سے میں مشرق کی سیر کر رہا ہوں۔
خاص کر مسلم ممالک کی۔۔۔ وہ کچھ دیر کیلئے خاموش
ہو کر باہر دیکھنے لگا پھر خود ہی بولا، یہ قوم افغانستان کا سب
ہے۔ میری دلی تمنا اس ملک کی سیر کی تھی لیکن
پہلے کے حکمراں بہت سخت تھے۔ انھوں نے
ملک کی سرحدوں پر کڑا پہرہ لگا دیا تھا۔ اور ملک
بھر میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ میں جہاں نظر آجاؤں
ہلاک کر دیا جاؤنگا۔ لیکن موجودہ حکمرانوں نے سنسر شپ
ختم کر دی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میرے تعاون سے

وہ اس پوزیشن میں ہیں، انھوں نے مجھے اتنی محبت دی ہے کہ میں ہر شخص کے دل میں رہنے لگا کوئی ایک پل کیلئے بھی مجھے اپنے سے دور کرنے کو تیار نہیں۔ میں تو انکی لاعلمی میں بھاگ آیا ہوں، مجھے یہ خوف تھا انکی محبت مجھے ان تک محدود نہ کر دے اور میرا مشن ادھورا رہ جائے۔

پھر اب کیا ارادہ ہے؟

یہ میرے اصول کے خلاف ہے، ویسے میں دو بھولوں

بس کئی جگہوں پر رکی، کئی اترے، کئی نئے چڑھے۔ وہ ایک کونے میں سمٹا سمٹایا بیٹھا تھا جیسے نئے چڑھنے والوں کی نظروں سے خود کو بچانا چاہتا ہو۔

اگلا اسٹاپ میری منزل تھی، اس لئے میں نے اپنا سامان سمیٹ لیا، لیکن اسکی منزل .....

میں نے اسے آگاہ کیا۔

کیا آپ کانٹوں کی باڑھ عبور کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

بس رک چکی تھی۔ مجھے اترنا تھا۔ میں اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ہوا اٹھ گیا، وہ خاموش رہا۔ میں بس سے نیچے اتر گیا۔ کنڈکٹر نے گھنٹی بجائی، چلنی سڑک پر بس زنائیں سے چلی اور میرے پاس سے گزرنے لگی تب اس نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔

میری اطلاع تمہیں مل جائے گی۔

اور چند ماہ پہلے سسکیوں کی آواز فضا میں ابھرا
اور تہذیب جنم لیتی رہی۔

سسکیاں، چیخوں اور کراہوں میں تبدیل ہو گئیں۔ طیاروں کی گھڑگھڑاہٹ، گولیوں کی تڑتڑاہٹ، ملتی آگتی زخمی، چیخیں، لاشیں، آگ اور دھواں۔

شرمار تھی مائیں، شرمار تھی ہوائیں، شرمار تھی زخمی اور

.....

میری بچیا کی آنکھوں میں سلگتی ہوئی گرد۔

اس بھیانک جنگل میں وہ اپنا سب کچھ کھو آئی۔

اپنا ہم سفر، اور ننھی منی کلیاں، جنہیں وہ سینے سے چمٹائے رہتا تھا۔

انہوں نے اپنوں کے خون سے چہروں پر نقش بنائے

مسافر! کاش تم مجھے مل جاؤ تو میں تمہیں اپنی بچیا کو دکھاؤں۔

میری بچیا آج رو بھی نہیں سکتی، چیخ بھی نہیں سکتی بول بھی نہیں سکتی، اسکی چیخوں اور آنسوؤں کا خزانہ بھی انہوں نے لوٹ لیا ہے۔

تم جو ساری دنیا کی سیر کرتے پھرتے ہو، کیا تم نے پلٹ کر کبھی وہاں کا منظر بھی دیکھا ہے؟؟ ●●

اسلم عمادی
۲-۴-۱۰۰ - ہمایوں نگر
حیدرآباد - ۲۸

ایک سمندر

سمندر جل رہا ہے
جل رہا ہے
نمک کا کف
سسکتی موج پر ترچھے پڑے ساحل کے اوپر
کھیلتا ہے۔!
چمکتے قافلے بوبی جہازوں پر
دھواں سا کر رہے ہیں

سمندر جل رہا ہے
شہر میں گھس جائے گا

ہر ایک، روزن، در، دریچہ
میں رواں ہوگا
ہر اک دیوار لرزے گی
درختوں کی جڑیں پھنسنے لگیں گی

سمندر جل رہا ہے
کروڑیں لیتی ہوئی سانسیں
بھڑکتی جا رہی ہیں
مگر کیا بات ہے
ہر قطرہ
بیزار کشش ہے
بکھرتا جا رہا ہے۔!

ڈاکٹر جوناس ناگالہا
ترجمہ: ظہیر نیازی
پوسٹ بھرکنڈہ - ہزاری باغ - بہار

خدا

بائیں ہاتھ میں بائبل
داہنے ہاتھ میں بم!
یہ ہیں خدا کے "خاص بندے!"
بڑی "اعلیٰ" ہے نسل!!
خدا شمالی امریکہ کا ہے!
وہیں کا پیدائشی شہری
وہ قدیم اور عظیم زبانیں نہیں جانتا
صرف انگریزی جانتا ہے
ذرا موٹے تلفظ سے!
وہ جنت میں نہیں رہتا!
وہ بستا ہے واشنگٹن میں!
وہ ساری دنیا پر راج کرتا
سوچتا ہے:-
اس کا سامراج لافانی ہے!
.... وہ گوروں کو
جنت کے ٹکٹ دیتا ہے
اور کالوں کو دوزخ کے!!

راگ راگنیوں سے بھرے کلاسیکی گیت اگر سنگیت کی جوانی
ہیں تو لوک گیت اس جوانی کا بالپن جس میں بھرے بھولے
بالک کی سبھی سرل اور الھڑ عادتیں موجود ہیں۔ اس کا صاف
دل، نفرت و کپٹ سے خالی دل لوک گیتوں کی جان ہے۔ ان
میں انسانی زندگی کے ان ابتدائی تصویروں کے درشن ہوتے
ہیں جبکہ وہ بناوٹی اخلاق کے بندھنوں سے جکڑا ہوا نہیں
تھا۔ جیون کی صفائی اور جذبات کی پاکیزگی کا جیتا دل کو
متاثر کرنے والا بیان ان لوک گیتوں میں ملتا ہے آسانی

بھی مرد ان گیتوں کو گاتے ہیں اور اس طرح ان گیتوں
میں مردوں کے ذریعہ لڑائی کا جذبہ بھی بھر دیا گیا ہے۔ پھر
ان لوک گیتوں کا پالن خاص کر عورتوں ہی نے کیا ہے۔
ان گیتوں میں جو ایک معروف ہے کہ ان کا بھاؤ صرف
ہے وہ عورتوں کا ہی لہجہ کہا جا سکتا ہے۔ ان گیتوں سے
عورتیں محنت کی وجہ سے پیدا ہونے والی تھکن کو بھی
دل بہلانے کا موضوع بنا لیتی ہیں۔ دل بہلاوا کیا،
سمجھئے یہ لوک گیت ان کی زندگی کی دلچسپیاں ہی بن جاتے

کملیشوری کون

کل گیتوں میں نہیں اور یہی سبب ہے کہ اس کو دھرتی کے
گیتوں میں لوک گیت یعنی دنیا کے گانے کا خطاب دیا گیا

ان گیتوں کا موضوع کنبہ کی اور خانگی زندگی، پریم، بیاہ، ساس
سسر کا برتاؤ، بھائی بہن کا پیار، سکھ دکھ، رحم، مزاج
سبھی کچھ رہا ہے۔ پر ان کا تعلق زیادہ تر عورتوں ہی سے
ہے۔ مردوں نے ان کی نقل ضرور کی ہے۔ ہل چلاتے
وقت، ناؤ کھیتے وقت، یہاں تک کہ لڑائی کے وقت

ہیں۔ چکی چلاتے سمے، دھان کوٹتے سمے، کھیتوں میں
کام کرتے وقت ان میٹھے گانوں میں اپنے کو بھول جایا
کرتی ہیں۔

بیلا پھولے آدھی رات
گجرا میں کیسکے گلے ڈالوں

گاتی گاتی مگن ہو کر بیلے کے پھول کی طرح ہی خوش دل
رہا کرتی ہیں۔ بیٹے کے پیدا ہونے کے وقت سوہر گا
کرنے بچے کا استقبال کرتی ہیں، پھولی نہیں سماتیں۔

کیا وقت کا اثر بھی سنتوش نہیں ہوتیں۔ چنانچہ وقت
کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی الجھنوں نے ان خوشی کے
گیتوں کو بھی ابھرنا نہیں چھوڑا۔ وقت کا اثر ان پر پڑا اور
پڑنا بھی چاہیے۔ کیونکہ لوک گیت انسان کے دل کا آئینہ
ہیں۔ جب طبیعت بے چین ہے، دکھی ہے تب ان شانتی
بھرے گیتوں میں بھی اشانتی کا پھیلاؤ کوئی روک نہیں
سکتا۔ پہلے وہ عورتوں کی ذات جو خوشی میں بکھیر کا دھن
بھی ملا کر سنتوش نہیں تھا آج

میں ان بولی راجہ موہ اگھور نہ لاگے دیجو!

گانے میں بھی ملائش نہیں ہے۔ وہ مانو جاتی جو پہلے گوری
کی موہنی صورت گاتے گاتے پاگل ہو جاتی تھی آج ساون
کجری وغیرہ بھلا کر بھوک کے مارے تڑپ رہی ہے اور
گوری کی موہنی صورت دیکھ کر بھی کلیجہ میں پیڑا نہیں ہوتی۔

بھوکیا کے مارے برہا بسر گیا
بھول گئے کجری کبیرا
دیکھ کے گوری کی موہنی صورت
اب اٹھے نہ کلیجوا میں پیر

یہاں تک کہ بنگال کے اکال سے دکھی انسانیت اپنے
درد کو لوک گیتوں میں سمیٹے بنا نہ رہ سکی ان گیتوں نے
اس درد کو بھی جذب کیا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے پھیلا ہے بنگال

یہاں ہیں کسان بھی اپنے سنہرے دنوں کو بھول گیا ہے جبکہ
کھلیانوں کو اناج سے بھرا دیکھ کر وہ اپنے کو زمین کا بادشاہ
سمجھتا تھا۔ اب تو اس کے گانوں میں بھی ایک دکھ بھری
آواز آنے لگی ہے۔

گھر میں نہ کھرچی باہر ملے نہ دان
گاؤں کے لک ہر سے وٹے چین
دے کے بیل جو بیچ گیا مہاجن کے ہاں

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج کل کی الجھنوں نے لوک گیتوں
میں بھرے ہوئے جذبات کو بدل لیا۔ پھر بھی لوک گیت
اپنے دل کی آواز الگ نہ کر سکا۔ اپنے دل کے چھوٹے
چھوٹے جذبات بھی وہ برابر داخل کرتا رہا۔ پھر سے
ذکر ہے اور دکھ میں بھی وہ ایسے راگ الاپنا چاہتا ہے
جو کچھ دیر کیلئے اسے اس اشانت سنسار سے باہر لے جا سکے
اور آنند دے سکے۔ وہ آنند جو وہ پاتا ہے ان لوک گیتوں
میں ہے۔ مراد تالوں پر بنائے گیتوں میں نہیں۔ اب
بھی گھر گھر ساون میں ساون، بارہ ماسے، کجری وغیرہ
اسی امنگ سے گائی جاتی ہیں جتنا پہلے۔ اتنا ضرور ہے
پہلے لوگوں کو فرصت زیادہ تھی، فرصت کیا بے فکری زیادہ
تھی۔ اس لئے ساون میں مہینوں کجری کی دھن سی بندھ
جاتی تھی۔ بھادوں میں رم جھم بوندوں کے گانے، ہولی
میں ہولی اور دھمال گا کر مہینوں رنگ رلیاں کیا کرتے تھے
پر اب اتنا سمے کہاں۔ اور پھر دھن بھی کہاں۔ جو کھانے
پینے میں مہینوں خرچ کیا جا سکے ان کمیوں نے ضرور ان
گانوں میں بھی کمی کر دی ہے۔ پھر بھی شادی کے وقت
جب منڈپ کے نیچے عورتیں اپنی سریلی اور بے سری
آوازیں گانے لگتی ہیں

او بابل موہے کاہے کو دینا بدیس
میں تو بابل تورے انگن کی چڑیا
چگت چگت اڑ جاؤں
بھیا کو دینا اونچی اٹری
ہمیں کاہے کو دینا بدیسی

کونسی ایسی عورت ہوگی جسکی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو بوند آنسو نکل نہ پڑیں گے۔ میں سوچتی ہوں کٹھور دل کا دعویٰ رکھنے والے مرد بھی ان گالوں پر رومال کی آڑ میں اپنی آنکھیں پونچھ نہ لیتے ہیں۔

لائی لولائی پوبھیا آج سے بھئی پرائی

کس بھائی کے دل میں اپنی بہن کے بچھڑنے کا درد نہیں پیدا کر دیتی ہے۔ ان گیتوں میں اب بھی زیادہ تر وہ کرونا بھری ہوئی ہے جو پتھر دل کو بھی پگھلا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ پشو پکشیوں تک یہ کرونا پھیلی ہوئی ہے۔ کسی ایک ہرن کی کھال سے رانی کوشلیا نے کھنجڑی بنائی ہے ہرنی اس اپنے ہرن کی کھنجڑی ہی اس سے مانگتی ہے پر وہ نہیں دیتیں۔ اس پر ہرنی کی حالت دیکھئے۔

جب جب باجے کھنجڑیا
سبد سُنی ان کہے
ہرنی ٹھاڑی ڈھکریا کے نیچے ہرن کا لبوا ہے

ہرن کے کھال سے بنی ہوئی کھنجڑی جب جب بجتی تھی تب ہرنی کان اٹھا کر اس کی آواز سنتی تھی اور اسی ڈھاک کے نیچے کھڑی ہو کر وہ ہرن کی یاد کرتی اس میں کتنی پاوکتا ہے کتنا دکھ اور کتنی دل پر چوٹ۔ لوک گیتوں کا یہ خاص گن ہے۔ ان لوک گیتوں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس سائنٹفک سنسار کا اب بھی ان پر اتنا اثر نہیں پڑا ہے۔ وہ تو سب کو بھی کسی دکھائی دینے والی مثال کے ذریعہ بتلاتے ہیں

کھیلت کودت بھوبر بھیا لگ آئے
اکھیا بھینت گئے ودیسوا ہو رام
بھر گئے بنیا لہر گئے اُرِیا
تبھوں نہ آئے تارے ودیسوا ہو رام

وہ بنیا کا جھاڑ جو وہ بالپن میں لگا کر گئے تھے اب پھول رہا ہے پھل رہا ہے پر پردیسی کے آنے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ وقت کا لمبا کو جانے کے پیڑ سے کتنی کوملتا سے بتا دیتی ہے۔

اس کے علاوہ لوک گیتوں میں نہ جانے سوکن کے گانے ضرور مقام پاتے ہیں اور اس میں سارا قصور سوکن پر ہی رکھا جاتا ہے۔ مرد اس کا دوشی نہیں سا ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ پریمی اپنی پریم کی جانے والی چیز میں کوئی بھی دوش نہیں دیکھ سکتا۔ اور اسی لئے ساری گالیاں بے چاری سوکن ہی پر پڑتی ہیں۔

سوتیا دکھ دے گئی

ہی ان کے منہ سے گانے کے روپ میں نکلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ادب سماج کا آئینہ ہے۔ پر ادب بھی سماج کو اپنے اصلی روپ میں ظاہر نہیں کرتا۔ پر لوک گیت اپنا سب کچھ گیتوں میں بھر دیتا ہے۔ کچھ چھپانا نہیں چاہتا اور اسی لئے لوک گیت انسان کے دل کا آئینہ سا بن جاتا ہے۔

یہاں تک کہ ایک عورت کے دل میں جو جذبات اس کا پتی آنے پر اٹھتے ہیں وہ بھی ان گیتوں کے بہانے چھپے ہوئے نہیں رہتے۔ آج بارہ برس کے بعد کسی عورت کا شوہر ودیس سے واپس آیا ہے۔ وہ سورج سے پرارتھنا کرتی ہے کہ اے سورج تم آج دھیرے دھیرے چل کر آؤ اور رات بڑی کر دو

موہے ہردا واس جن کہیو مرگ مت بولیو!
موری چھتیا بھر جلنی جائے تو یہ جن پھاٹیو!
آج کر ہو بڑی رات چندا۔ تم ادی ہجا

پیکر میں بھی گھبراوٹ ہے

جیسے گانے سینما ہال میں بھی دیکھنے سننے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ بھارت کی کیا سنسار کی سبھی بولیوں میں یہ لوک گیت انسان کو آنند دینے کا سادھن بن گیا ہے اور ہمیشہ سے بنا رہا ہے۔ فرصت کے وقت لوک کے ویکتی ان لوک گیتوں میں وہی آنند اٹھاتے ہیں جو سرگ کے دیوتا گندھرووں کے گانے میں۔ ان گانوں میں کبھی تو عورتیں ہی حصہ لیتی ہیں کبھی مرد ہی اور کبھی عورت مرد دونوں ہی ان گانوں کا آنند لوٹتے ہیں۔ جن میں سوال و جواب ہوتے ہیں۔ ان گیتوں کی بھاشا اتنی سرل، مدھر گنوں سے بھری ہوتی ہے کہ وہ سبھی کو اپنا لیتی ہے اور سبھی اس کو اپنی چیز سمجھتے ہیں۔ اپنے ہی ہردے کی آواز۔ اپنے ہی جذبات کی خاص احساس [illegible] گانوں میں۔

جی کا جنجال ہوا باجرا
راشن میں کا ایک بھلا

تک سننے کو ملتا ہے۔ پرنتو اب شہر والوں میں پڑھے لکھے [illegible] وہ کوملتا، وہ سرلتا اور وہ مٹھاس جو ان لوک گیتوں کی جان ہے آج ان میں کم ہوتی جا رہی ہے۔ آج انسان پوچھتا ہے

راہی کہاں ہے بدھ کا مارگ
اور کہاں ہیں پریم کی گلیاں

اور ایسا ہونا ہی چاہیے۔ اس لیے کہ آج زندگی [illegible] میں وہ کوملتا، وہ سرلتا اور وہ مٹھاس باقی نہیں رہی ہے۔ ●

غزلیں

اپنا دل ٹوٹا ہوا ہے دیر سے
زندگی ہم سے خفا ہے دیر سے
دل کا اجڑا شہر کب کا بس چکا
اس کا خط ہم کو ملا ہے دیر سے
اس کو سمجھا کر کہ پتھر دل ہیں ہم
کوئی ہم کو تک رہا ہے دیر سے
دھند سے کہہ دو کہ رستہ چھوڑ دے
قافلہ ٹھہرا ہوا ہے دیر سے
ڈھونڈ کر لایا تھا میں بھی روشنی
میرا گھر بھی جل رہا ہے دیر سے

فیروز
علاپٹی۔ موتی ہاری۔ بہار

کتنی صدیوں کی بے کفن لاشیں
ایک پل میں مل گیا سورج
صبح آئی تو مسکرا اٹھا
شام تیور بدل گیا سورج
روشنی کو اچھال کر ہر سو
ظلمتوں کو نگل گیا سورج
دشتِ غم میں ٹھہر گئی ہے رات
اور آگے نکل گیا سورج
دن کا قد گھٹ گیا ہے اے فرحت
کون کہتا ہے ڈھل گیا سورج

فرحت کیفی
لوز کار نر۔ مدراس ۔ ۴

[illegible] حیدرآباد

فلم نگری سماجی پیش کش

(ایسٹ مین کلر)

تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے

فلم ساز و ہدایت کار: سوہن لال کنور

موسیقی: شنکر جے کشن

منوج کمار - پران - پریم چوپڑہ - پریم ناتھ - ناظمہ اور دوسرے

کہانی :- سچن بھومک
عکاسی: کے۔ ایچ کپاڈیہ
گیت : ورما ملک
آرٹ : کے۔ بابو بھائی
منظر نامہ : رام کیلکر
مکالمے : ویدراہی
تدوین نند کمار

لال پتّی چاندنی

یکایک اُسکی نیند اُچٹ گئی۔ حالانکہ وہ کافی تھک گئی تھی، صبح ہی سے اٹھنا جینا ئیے تھا۔ مگر اس نِہائی سی چھوئی نے اسے جگا ڈالا۔ دائیں طرف اس کا سات سالہ بیٹا اپنی دادی کے پہلو میں لیٹے گہری نیند میں ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرکے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی بوڑھی ساس کے پوپلے منہ سے کاربن ڈائی آکسائڈ ہلکے شور کے ساتھ وقفہ وقفہ سے خارج ہو رہی تھی۔

آنگن میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ اس نے دیوار سے لگی ہوئی چارپائی کو بادام کے درخت کے سائے میں بچھا دیا اور لیٹ گئی۔ اور ذہن کا دروازہ کھول آئی۔ چودھویں کا چاند مشرقی دیوار سے اوپر آچکا تھا مگر بادام کے پیڑ کی اوٹ میں تھا۔ پھر بھی چاندنی مچل کر نکل نکل پڑتی اور کبھی کرنوں کی گدگدی سے بادام کے پتّے کھلکھلا پڑتے۔ اس کا بھی جی چاہنے لگا کہ اسے بھی کوئی گدگدی کرے۔ چاند کی کرنیں پتوں سے الجھ کر اس کے وجود سے بھی الجھ رہی تھیں ان کے مساس سے اسکے بدن میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھنے لگیں۔ ویران ریگستان میں نقش ابھرنے لگے۔

یکایک ایک پتّہ ہوا کی شرارت کی تاب نہ لاکر ٹوٹ کر ڈولتے ہوئے اسکے چہرے پہ آگرا۔ برسات کے موسم کے بعد سے پتّے پر جمی ہوئی دھول کی خوشبو اسکی نس نس میں رچ گئی۔ اس نے پتّے کو اٹھایا، وہ چاندنی میں دیکھنے لگی۔ بادام کا پتّہ تھا جو سوکھ چلا تھا، سرخ ہو چلا تھا۔ اب بھی اسکے کنارے سبز تھے، انہیں پیلی تھیں زندگی کی رمق موجود تھی۔

"کیا یہ مّیرا اس کا وجود ہے؟"

"نہیں نہیں.... ہاں ہاں.... نہیں.... ہاں.... نہیں اور ہاں کی تکرار میں اس کا دماغ بوجھل ہونے لگا تو اس نے خود کو تسلّی دی۔

"گھبراتی کیوں ہو یہ بھی تو زندگی کا ترجمان ہے"

چھت سے بلّی مشرقی دیوار پر کود پڑی اور بے چینی سے گھومنے لگی۔ چاند بلند ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ بادام کا سرخ پتّہ ہے یا کسی نازنین کا مہندی رچا ہاتھ مہندی رچا ہاتھ ---- اس دن سرخ گھونگھٹ سے اسکی مہندی رچے ہاتھ باہر جھانک رہے تھے تو انھوں نے بڑھ کر تھام لئے تھے۔ "میں بچپن سے دیکھتا آرہا ہوں کہ ہمارے آنگن میں کھڑے بادام کے درخت کے پتّے ایسے ہی سرخ ہوتے ہیں، مجھے بے حد پسند ہیں۔" انھوں نے جھک کر چوم لیا ہتھیلی کی پشت جل اٹھی۔ پھر وہ ہونٹ کلائی کی طرف بڑھے، سرخ چوڑیوں میں جگہ بنا کر کلائی کا گندمی رنگ چومنے لگے۔ خون سلگنے لگا

وہ سنگی مجسمہ سا ہوگئے تھے۔ نرم بازوؤں پر۔ دھاریں گلی کے نشانوں پر اور سرک گئیں، پھر وہاں سے پھسل کر نیچے گر پڑے۔۔۔۔ وہ اور۔۔۔۔ آخر کوئی خود کو سمیٹے بھی تو کتنا، یکدم ٹوٹ کر بکھر گئی۔۔۔۔

اسکے ہاتھ میں دبا ہوا پتہ ٹکڑوں کے بکھر جانے سے مڑ تڑ گیا۔ سانسیں تیز تیز چلنے لگیں وہ کچھ پھسل سی گئی تھی۔ دیوار کے منڈیر پر گھومنے والی بلی کبھی تیزی سے گھومنے لگتی کبھی سست ہوجاتی۔ کبھی چیختی کبھی چپ ہوجاتی۔ کبھی چھت پر پہنچ جاتی پھر لوٹ آتی، چیخنے لگتی اسکی آواز میں عجیب کرب تھا۔

چھتے کے مدرس نما سوراخوں کے بھر جانے سے جس طرح شہد ٹپکتا ہے اسی طرح پتوں کے درمیان بنے ہوئے روزنوں سے چاندنی اسکے سینے پر ٹپک رہی تھی، رینگ رہی تھی۔ چوٹ سے چوڑی ٹوٹ کر کلائی میں دھنس گئی۔ کلائی پر ننھا سا خون کا قطرہ ابھر آیا۔ کرچی کا کلائی میں دھنسنا اسے اچھا لگا۔ چاندنی حرارت پہنچا رہی تھی۔

چاند اونچا ہو کر چھتری کی طرح پھیلے ہوئے درخت کی گردن تک پہنچ گیا تھا۔ بلی چیختی ہوئی دیوار پر ٹہل رہی تھی ٹہلتے ٹہلتے اس نے دیوار پر جھکی ہوئی ڈالی سے اپنا مست والا بدن رگڑنا شروع کی۔ دفعتاً اپنے اگلے پیر کے ناخنوں سے ڈالی کو اچھال کر چھیلنے لگی۔ چھال گر گئی کچھ دیر بعد رک کر ڈالی کو گھورتی رہی۔ شاید ردِعمل کی نظر

خالد سعید
نزد نیشنل ہائی اسکول
گلبرگہ (میسور اسٹیٹ)

اسے اپنے سینے میں بھی چبھن سی محسوس ہوئی کاش وہ بلی اپنے تیز ناخنوں سے اس کا سینہ بھی کھرچنا شروع کردے۔ بلی اپنے عمل کا جواب نہ پاکر چھلانگ بھر کر اور تنے کو تھامے تیزی سے اوپر چڑھنے لگی۔ پتوں میں چھپی چھوٹی چڑیاں چیختی چلائیں، پھڑپھڑائیں اور اُڑ گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ بلی ان سب پر جھپٹ پڑے، اپنے پنجوں میں دابے لے، انھیں اپنے نوکیلے دانتوں سے چبا ڈالے۔ وہ مٹھی میں دبے ہوئے پتے کو مسلنے لگی۔ ہوا اُن پر مرجھائی

چاند بادام کے درخت کے سر پر پہنچ گیا۔ آنگن میں پڑی ہر چیز چمک اٹھی۔ آنگن میں پھیلے ہوئے سرخ زرد پتے دیوار کے سینے سے لگی ہوئی ترئی کی بیل، اوندھا پڑا ہوا گلاس اور اسکا شہدی رنگ کا دھبہ۔۔۔۔۔

اسکی منتظر آنکھیں بجھنے لگی تھیں۔ اسکے کان سن پڑنے لگے تھے کہ دروازہ چرچرایا، آنگن میں بکھرے ہوئے پتے چرمرائے۔۔۔۔ قدموں کی دھمک قریب ہونے لگی۔۔۔ ہوا سہمی ہوئی تھی۔ اظہار ناراضگی کیلئے اس نے کروٹ لی تو بڑھ کر نرمی سے انھوں نے تھام لیا۔ پہلو میں کوئی آبیٹھا۔ اتھاہ خاموشی۔ پھر خود ہی پگھل گئی دھیمے سے گنگنائی "چھوڑ دیجیے میری نازنیں"

"۔۔۔"

"آپ نے بہت دیر کردی۔ راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھی" زلفیں امرائن میں پھنسی ہوئی تھیں۔

"ــــــ"

"میں نے تو چاہا تھا کہ مُنّو کے ساتھ سو جاؤں ......
سوچا آپ اکیلے .... پچ پچ" :

"تو وہاں سے بھی اٹھا لاتا تمہیں" اسکی زلفیں چھوٹنے لگیں۔ اب وہ اسکی پیشانی پر بکھری لٹوں کو دھکیل کر جھلانے لگا۔ اُسے اُن کا یہ فعل اچھا لگا۔ آنکھیں موندے پڑی رہی۔ ہوا اسکی زلفوں کے سنگ شرارت کر رہی تھی۔ دور کہیں بلی چیخ رہی تھی۔ دور دور کر اس کی آواز ابھرتی ڈوبتی۔ چاند بڑھا جا رہا تھا۔ بادل کے ٹکڑے تیرتے ہوئے اس کے قریب آ رہے تھے ــــ چاند اپنی کرنوں کو سمیٹے بدلی کے پیچھے جا چھپا ــــ اس نے اپنے ہاتھوں پر دو انگارے سے محسوس کئے، بدن کے سمندر میں لہریں تیزی سے اٹھنے لگیں، بھنور بننے لگے، موج در موج، شور، سناٹا ...... اسکے جسم کا شہد چوری ہونے لگے" اف وہ ہٹ جائیے .... چاندنی کو تو راہ دیجیے دیکھوں ایسا جھکے چلے آ رہے ہیں۔ کوئی دیکھ لے تو ؟"

"کون دیکھے گا ؟"

"اگر پھوپی ہی اٹھ آئیں تو ؟"

"تو کیا ــــ انھیں کا تو بیٹا ہوں" وہ شرما گئی۔ پھر وہ اسے سمیٹے لگا۔ کبھی چوڑیاں کھنک جاتیں، کبھی کوئی چوڑی چٹک جاتی۔ بادام کے سوکھے پتے چٹخنے لگے۔ چٹخنے کا شور ..... ادوائن رسمانے لگی .... بادام کے پتوں سے چھن کر آنگن میں چاندنی جگہ جگہ

[illegible] بکھرے پتوں [illegible] برسانے لگی۔

آخر بنجانی چاندنی سرد پڑنے لگی۔ منڈیر کا سایہ رفتہ رفتہ بڑھنے لگا۔ ہوا خنک ہو چلی تھی۔ چاند رات بھر کی مسافت سے تھک کر مغربی دیوار کے پیچھے گر پڑا۔ آنگن سناٹے میں ڈوبا پڑا تھا۔ کمرہ کے دوطرفی دروازے کی اوٹ میں بیٹھی سب کچھ دیکھتی بڑھیا اٹھ کر باہر آئی۔ دالان کے مدھم سائے میں بچھے پلنگ پر لیٹی بہو کو دیکھا جو میٹھی نیند میں کھوئے ہوئے بھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ ساڑی پھٹی ہوئی تھی، پلو کے ہک ٹوٹے ہوئے تھے۔ چھاتیاں جھانک رہی تھیں، دمک رہی تھیں، شاید تھوڑی سی چاندنی ان میں اٹک گئی تھی۔ ان پر ہلکی سی خراشیں بھی پڑی ہوئی تھیں، مٹھی میں بادام کے سوکھے پتے دبے ہوئے تھے، تڑے مڑے شکستہ سے۔ بڑھیا کی آنکھیں بھر آئیں۔ صحن کا دروازہ بند کرکے لوٹ گئی۔ بڑھیا نے صندوق میں سے اپنے بیٹے کی تصویر نکالی۔ "بیٹا میں بڑی ظالم ہوں۔ آٹھ سال سے وہ جل جل کر راکھ ہو رہی ہے۔ ہر پورے چاند کی رات تیرے جھوٹے سپنے دیکھ کر بہلتی ہے۔ میں نے تیری امانت سمجھ کر خیانت نہ ہونے دی۔ پر اب .... " اسکی آواز گڑگڑا گئی۔ "آٹھ سال سے ہر چاند کی رات اسکے ساتھ جاگتے جاگتے میں بھی تھک گئی ہوں۔ کل ہی اسکے لئے کوئی بر ڈھونڈ دوں گی" ٹپ ٹپ آنسو اسکے بیٹے کی تصویر پر گر رہے تھے۔

●●

نشہ کی نئی بلا یعنی ہوا باز
ایل ایس ڈی

سریش سریواستو
۱۷/۱۷ ایچ کاؤس جی پٹیل
اسٹریٹ بمبئی-۱

ایک زمانے میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ آپ کے مکان سے جو بھی کالج سب سے قریب ہو وہی ایل۔ ایس۔ ڈی کا سب سے قریبی اڈہ بھی ہوتا تھا۔ اس کے ایک کیپسول (یعنی ایک خوراک) کی قیمت تین سے پانچ شلنگ تک ہوتی تھی۔ بہت سے طالب علم اس کی تجارت بھی کرتے ہیں۔ "ایل۔ ایس۔ ڈی کوئی نشہ نہیں ہے" اس قسم کے نعروں سے متاثر ہو کر بہت سے طالب علم اس کے عادی ہو چکے ہیں۔

ایل ایس۔ ڈی "سائیلو سائبین" سے سو گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ سائیلو سائبین میکسیکن ان گڑ کرمٹے سے حاصل ہونے والی ایک منشی شئے ہوتی ہے۔ ایل۔ ایس۔ ڈی منشی کوکین سے بھی دو سو گنا اور مسکالائن سے سات ہزار گنا تیز ہوتی ہے۔

اس سے رنگ دیتی کی دو سے ڈھائی سو مائیکرو گرام تک کی معمولی خوراک لینے کے بعد ۱۵ سے ۴۵ منٹ تک کے اندر ہی استعمال کرنے والا بالکل خالی الذہن ہو جاتا ہے۔ اس کا وقت اور خلا کا تصور مسخ ہو جاتا ہے۔ تمام رنگ اس کی نظروں میں ابھر نمایاں ہو جاتے ہیں اور ہر آواز بہت گہری اور دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس نشہ کا استعمال کرنے والے بہت سے لوگ تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ آواز کی لہروں کو فضا میں حرکت کرتے ہوئے بھی دیکھ سکتے ہیں۔

ان کی آنکھوں کے آگے رنگ تھرکنے لگتے ہیں اور آوازیں رنگین دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ان کی تمام تر ذہنی حس خوف دہشت اور انتہائی مسرت کے درمیان جھولنے لگتی ہے اور ذہن ایک دائرے میں محصور ہو جاتا ہے۔

آج ایل ایس۔ ڈی کوئی نئی ایجاد نہیں ہے۔ زمانۂ قدیم میں لوگ اسے دوا کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ صدیوں پہلے یورپ کی دائیاں وہاں کے مخصوص اناج "رائی" کے بیکار بیجوں سے نکلنے والے سیاہی مائل گیروے رنگ کی ایک شئے کا استعمال زچگی کے سلسلے میں کرتی تھیں۔ اسی شئے کو "اسپکل" ایرگاٹ کہا جاتا ہے اور یہ "کلوو سیپس پرپوریا" نامی ایک قسم کی کائی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کائی کے ذرّے جب رائی کے بیج میں داخل ہو جاتے ہیں تو ایرگاٹ کی پیدائش ہوتی ہے۔

دائیوں کو جب یہ پتہ ملا کہ "ایرگاٹ" بہت ہی منشی تیکر [illegible]

شئے ہے تو انھوں نے بہت احتیاط سے ہی اس کا استعمال کرنا شروع کیا۔ اگر نقلی دردِ زہ کے وقت اسے غلطی سے بھی کھلا دیا جائے تو فوراً موت واقع ہو سکتی ہے لیکن حقیقی دردِ زہ کے وقت اس کا اثر کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔

۱۹۳۸ء میں سوئٹزرلینڈ کے سائنس داں البرٹ ہافمین نے "ایرگاٹ" میں پائے جانے والے ایک عنصر لائسرجک ایسڈ کے بارے میں بہت سے تجربے کئے۔ پچیسویں تجربے کے بعد انھوں نے ایل۔ ایس۔ ڈی کو اس کی موجودہ شکل میں دریافت کیا۔ اپنی دریافت کی ہوئی ایل۔ ایس۔ ڈی نگلنے کے بعد انھوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کئے "میں وقت کی تمام بندشوں سے ناآشنا ہو گیا تھا۔ زماں و مکاں میرے نزدیک منتشر ہو گئے تھے۔ مجھے یہ دہشت کھائے جا رہی تھی کہ میں پاگل ہونے جا رہا ہوں۔ سب سے بری بات یہ تھی کہ مجھے اپنی حالت کا پوری طرح احساس تھا لیکن میں اسے کسی بھی طرح روکنے کی حالت میں نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو میں خود کو اپنے جسم سے باہر محسوس کرنے لگتا تھا تب میں سوچتا تھا کہ میں مر گیا ہوں۔" آگے چل کر ان کا یہ قول صحیح بھی ثابت ہوا۔ وہ عارضی طور پر پاگل ہو گئے۔

ایل۔ ایس۔ ڈی کے بارے میں کئے جانے والے مسلسل تجربوں کی بنا پر دماغی بیماریوں کے ڈاکٹروں نے مان لیا تھا کہ یہ چیز شرابیوں اور پاگلوں کے علاج کیلئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس کے بارے میں بیس سال تک مسلسل تحقیقات ہونے اور تقریباً دو ہزار سائنسی مضامین شائع ہونے کے بعد بھی ابھی تک اس کا کوئی ڈاکٹری استعمال دریافت نہیں کیا جا سکا

اس نشے کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے نتیجے میں شدید ردعمل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹروں کا خیال ہے مستقل ذہنی شکست کے بعد بھیانک صورتحال پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے اس کے استعمال سے روحانی زوال، شخصیت کے زوال، بے رنگی کے ذریعے قوت تخلیق کے ختم ہو جانے اور جسم کے کسی بھی حصے کے بیکار ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

ڈاکٹر میمن ایم کوہن اور مائیکل جے میر شیلو نے انسانی بیج (کروموسوم) پر ایل۔ ایس۔ ڈی کے اثرات کا مطالعہ کیا جس سے بہت اہم نتائج ظہور میں آئے۔ پتہ یہ چلا کہ ایل ایس ڈی سے انسانی کروموسوم اسی طرح ضائع ہو جاتے ہیں جس طرح روشنی کے زہریلے اثر سے یا ایکس رے کے اثر سے کچھ چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ ایل۔ ایس۔ ڈی کی مقدار جتنی کم یا زیادہ ہوتی تھی اثر بھی کم یا زیادہ ہوتا تھا۔ ایل۔ ایس۔ ڈی کی تین سو مائیکروگرام یا اس سے زیادہ کی خوراک انسان کا توازن ہمیشہ کیلئے برباد کر سکتی ہے۔

پورٹ لینڈ کی ایک نوجوان ماں نے حمل کے پہلے مہینے میں ایل ایس ڈی کی صرف ایک خوراک لی تھی۔ نتیجے کے طور پر اس کے جو بچہ پیدا ہوا وہ شروع سے ہی بہت سنگین بیماریوں میں مبتلا تھا۔ اس کی بڑی آنت کی نلی میں کوئی رکاوٹ تھی اور اس کے چہرے کا داہنا حصہ بائیں حصے کے مقابلے میں بہت بڑھا ہوا تھا۔

اس کا غذی جوان سے اکتا گیا ہے جی
مجنوں کی داستان سے اکتا گیا ہے جی

توڑوں گا اس کے حلقۂ جذب و کشش کو میں
ٹوٹے ہوئے مکان سے اکتا گیا ہے جی

اظہار لفظ و معنی کا محتاج کب رہا
سچ مانیئے زبان سے اکتا گیا ہے جی

ٹکرا نہ جائے سر سے یہ خدشہ ہے سدا
اب نیلے سائبان سے اکتا گیا ہے جی

نیلے سمندروں سے ابھارو نئی زمین
الفاظ کی چٹان سے اکتا گیا ہے جی

صفدر
اردو ہائی اسکول۔ مدوڈ۔
امراوتی

اس دور کے انسان کا جب ذکر چلا ہے
تاریخ کے اوراق نے منہ پھیر لیا ہے

سولی پہ چڑھا ہے تو کبھی زہر پیا ہے
جینے کی تمنا میں وہ سو بار مرا ہے

وہ جس سے کہ ہلکا سا بھی رشتہ نہیں میرا
مڑ مڑ کے وہی شخص مجھے دیکھ رہا ہے

بڑھ سکتی نہیں وقت کی تاریک نگاہیں
کیا کیا مری تصویر کے ماتھے پہ لکھا ہے

سانسوں کا یہ سیلاب ہے کہ جسموں کا نگہبان
گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں کھڑا ہے

ایس۔ ایم۔ طارق
مسلم مسافر خانہ۔ کلاک ٹاور
(جبل پور)

ہراساں، شب کا لشکر ہر طرف ہے
فغانِ نور بر در ہر طرف ہے

وہی دیوارِ خستہ اور اداسی
کہاں جاؤں، مرا گھر ہر طرف ہے

سبھی آنکھیں ہیں تری آنکھوں جیسی
مری تعبیر پیکر ہر طرف ہے

جو تیرے سرخ ہونٹوں پر کھلا تھا
وہ لفظِ خواب آور ہر طرف ہے

یہاں کا سامنا ہے پانیوں کا
جزیروں میں سمندر ہر طرف ہے

سعید قدرت
۱۲/۲ آرمینی اسٹریٹ
کلکتہ-۱

محسن مجروح

۸۰ - بی - فرنی پلہ
(گورکھ پور)

یہ کیا کہ زندگی کی علامت نہ کچھ رہے
آوازِ پا تو ہو کبھی زنجیر تو بجے
لکھ لکھ کے چومتا ورقِ گل پہ تیرا نام
قائم ہیں آج بھی مری وحشت کے سلسلے
وا کر دے آج بند دریچے کے سب
کیا جانے کل تو کتنے حجابوں میں پھر ملے
اڑتے ہوئے سلگتے بگولوں کے سامنے
صحرائے آرزو میں کوئی پھول کیا کھلے
ڈالی گئیں خرد کی کمندیں ہزار ہا!
مجروح فاصلے ہیں بہرحال فاصلے

واحد پریمی

نزد موتی مسجد۔ سبزمنڈی۔ بھوپال

اپنا گھر ہے کہ ایک وحشتِ یاس
زندگی ہے کہ "رام کا بن باس"
راکھ کا ڈھیر بن گیا ہوں میں
جب بھی جاگا ہے شعلۂ احساس
اپنے عالم میں ہم مقید ہیں
خستہ دل، خستہ حال، خستہ لباس
تلخیوں سے بھرا ہے جامِ حیات
کام آئی نہ اُن لبوں کی مٹھاس
دربدر ہم بھٹکتے پھرتے ہیں
عہدِ حاضر ہے کتنا قدر شناس
مے تو بس مے ہے بارہا واحد
ابر سے بھی بجھی نہ اپنی پیاس

رفیق الزماں

۲۱۔ رانڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ ۲

کیا اس نگر میں کوئی مجھے ہم نوا ملے
ہر شخص کا وجود جہاں لاپتہ ملے
کب سے یہ سوچتا ہوں کہ جاؤں کسی کے قریب
لیکن ہر ایک گام وہی فاصلہ ملے
میں ایسا دشت ہوں کہ جہاں اک سکوت ہے
جھانکو تو اس مکان کے اندر خلا ملے
کٹتے ہی سانس لیتے ہیں پھولوں کے شہر میں
اے کاش پتھروں کا ہی اب سلسلہ ملے
پگھلا نہ دے وہ مرمر کی صورت کہیں مجھے
سورج جو میرے جسم کے اندر پڑا ملے

سہیل اختر

آرٹ انٹرپرائیزس
وجے نگر کالونی - حیدرآباد - ۲۸

آپ نے آج تک دوسروں کے تعلق سے بہت کچھ سنا اور جانا ہے - مگر کیا کبھی آپ نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ آپ کیا ہیں؟ ــــ کیا ابھی تک آپ نے اپنے آپ کو دریافت نہیں کیا ہے - اگر ایسا ہے تو آئیے آج خود کو پہچانئے - اپنے آپ کو پرکھئے اور دیکھئے کہ آپ کیا ہیں

ذیل میں چند سوالات دیئے گئے ہیں جنہیں مختلف حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے ــــ آپ کو صرف ان سوالات کے آگے 'ہاں' یا 'نہیں' لکھنا ہے - یہ مشق ہر حصہ کے لئے ہوگی - پھر آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ کس حصہ میں آپ نے سب سے زیادہ ہاں کی ہے - بس وہی حصہ آپکی صحیح تعریف ہوگی ــــ ساتھ ہی آپ کو یہ جاننے میں بھی مدد ملے گی کہ کن کن خصوصیات کے جراثیم آپ میں زیادہ پائے جاتے ہیں - کسی حصہ کے سارے سوالوں کے جوابات اگر آپ نے ہاں میں دیئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اس کی تعریف پر سو فیصدی پورے اترتے ہیں - مثلاً اگر آپ نے ادیب کے سلسلے کے سارے جوابات ہاں میں دیئے ہیں تو آپ سو فیصدی ادیب ہیں - اگر تین چوتھائی ہاں میں دیئے ہیں تب بھی آپ ادیب ہیں لیکن اگر آپ نے صرف نصف یا نصف سے زائد سوالوں کے جواب ہاں میں دیئے ہیں تو اس کا مطلب ہے آپ میں اس کے جراثیم موجود ضرور ہیں مگر ان کی افزائش کی ضرورت ہے - اور اگر آپ خود کو ادیب سمجھتے ہیں اور آپنے 'ادیب' کے سارے سوالوں کی نفی کی ہے تو براہ کرم اپنی غلط فہمی رفع کیجئے -

اگر بیک وقت تیسرے اور چوتھے حصے "کیا آپ احمق ہیں" اور "کیا آپ جینیس ہیں" کی قابلیت ملتی ہے اور سب سے زیادہ ہے تو لیجئے آپ کو شناخت کرنے کا فیصلہ خود قاری پر چھوڑا جاتا ہے -

کیا آپ ادیب ہیں؟

۱ - کیا آپ کا کوئی قلمی نام بھی ہے .... (   )

۲ - کیا آپ قلم سے زیادہ اپنی تعریف پر بھروسہ کرتے ہیں .... (   )

۳ - کیا آپکو پبلشروں سے الرجی ہے .... (   )

۴۔ کیا آپ کو یہ شکایت ہے کہ قاری آپ
کی تحریریں دریافت نہیں کرتے .... (   )
۵۔ کیا آپ فاقہ کرتے ہیں .... (   )
۶۔ کیا آپ اپنی نجی زندگی میں اپنی ہی کتاب
کے ولین ہیں .... (   )
۷۔ کیا آپ ہمیشہ اپنے ذاتی خیالات کے برعکس
قلم اٹھاتے ہیں .... (   )
۸۔ کیا آپ مفلسوں اور غریبوں کے اسلئے غمخوار
ہیں کہ ان پر لکھی ہوئی کہانیاں آپ کو اسکاچ
اور شیمپئن دیتی ہیں .... (   )
۹۔ کیا آپ قریبی گلی میں بھٹکنے والے خارش زدہ
کتے یا اسرائیل کی جارحانہ پالیسی پر کوئی افسانہ
لکھ سکتے ہیں .... (   )
۱۰۔ کیا آپ کو اپنے گھر میں کام کرنے والی سیاہ فام
ملازمہ کی آنکھوں میں بھی رنگین ڈورے نظر
آتے ہیں .... (   )
۱۱۔ کیا آپ آہستہ آہستہ کرکے پانچ سال میں اچھے
ناول کی ساری کاپیاں بانٹ لیتے ہیں ...... (   )
۱۲۔ کیا آپ کتابیں صرف مانگ کر پڑھتے ہیں ... (   )
۱۳۔ کیا آپ نے کم از کم ایک تجریدی کہانی لکھی ہے (   )
۱۴۔ کیا آپ کی ساری کہانیاں خود آپ کی سمجھ
سے بالاتر ہیں .... (   )

کیا آپ انٹلکچوئل ہیں؟

۱۔ کیا آپ کاہل ہیں .... (   )
۲۔ کیا ہفتہ میں ایک وقت شو بہانا
آپ کیلئے باعث ہے .... (   )
۳۔ کیا ہمیشہ آپ کو کوئی نہ کوئی عارضہ لاحق رہتا ہے (   )
۴۔ کیا دو قدم چل کر آپ ہانپنے لگتے ہیں --- (   )
۵۔ کیا آپ اپنے صحت مند حریف کی صحت
سے صحت باتیں ہنسی کھیل میں اڑا دینے کے
عادی ہیں .... (   )
۶۔ کیا آپ کے ویڈنگ کارڈ پر اپنے گھر کی بجائے
کسی کافی ہاؤس کا پتہ چھپا ہے .... (   )
۷۔ کیا آپ کافی ہاؤس میں کافی پینے کے علاوہ
اور سب کچھ کر گزرتے ہیں .... (   )
۸۔ کیا دنیا میں آپ کچھ بھی نہ بن سکے ...... (   )
۹۔ کیا آپ بیکار ہیں .... (   )
۱۰۔ کیا آپ دلیپ کمار کی اداکاری آلو لپسند نہیں ہے (   )
۱۱۔ کیا آپ پکاسو، بیگم اختر، سہراب اور رچرڈ برٹن
کے بارے میں جانتے ہیں .... (   )
۱۲۔ کیا آپ جنگ کی خبروں سے زیادہ کرکٹ
کی کومنٹری سننے کیلئے بیتاب رہتے ہیں --- (   )
۱۳۔ کیا آپ دنیا کی کسی بھی ٹاپک پر لگاتار دو
گھنٹے تک بولنے کا آرٹ جانتے ہیں ---- (   )
۱۴۔ کیا آپ کتابوں کو پڑھنے سے زیادہ ہاتھ
میں لٹکائے پھرنے کی چیز سمجھتے ہیں ..... (   )
۱۵۔ کیا آپ نے ابھی تک کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے (   )
۱۶۔ کیا کسی دقیانوسی چشمہ کے بغیر آپ کو نظر نہیں آتا (   )
۱۷۔ کیا آپ رنگین بش شرٹ پہنتے ہیں ..... (   )
۱۸۔ کیا آپ پرولتاریہ کے معنی جانتے ہیں .... (   )

کیا آپ احمق ہیں؟

۱. کیا آپ نے کبھی قرض نہیں لیا ...... (   )

۲. اگر غلطی سے قرض لے بھی لیا تو کیا آپ نے
واپس کر دیا ...... (   )

۳. کیا آپ اپنے دوستوں پر جان دیتے ہیں ...... (   )

۴. کیا آپ نے ساری زندگی میں ایک ہی سچا عشق
کیا ہے ...... (   )

۵. کیا آپ کسی سے مستعار لی ہوئی کتابیں واپس
کر دیتے ہیں ...... (   )

۶. کیا آپ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں ...... (   )

۷. کیا آپ نے ایک بار بھی وعدہ خلافی نہیں کی ...... (   )

۸. کیا آپ کسی کی زبان کو پرامسری نوٹ سمجھتے ہیں ...... (   )

۹. کیا آپ رشوت نہیں لیتے ...... (   )

۱۰. کیا آپ رشوت دیتے ہیں ...... (   )

۱۱. کیا آپ کم از کم ایک عدد بری عادت کے
متحمل نہیں ...... (   )

۱۲. کیا آپ احباب کو چائے پلا کر خوش ہوتے ہیں ...... (   )

کیا آپ جینئس ہیں؟

۱. کیا آپ نے ابھی تک اپنے پیسوں سے سگریٹ
نہیں پیے ...... (   )

۲. کیا آپ بیک وقت کئی لڑکیوں سے عشق
لڑانے کی اہلیت رکھتے ہیں ...... (   )

۳. کیا آپ کسی فردِ واحد سے ادا کیے بغیر مسلسل
قرض لیتے رہے ہیں ...... (   )

۱۴۳ "پیکر" حیدرآباد

۴. کیا ہر کام پر دھڑکنے کے بجائے آپ ہمیشہ
خوش رہتے ہیں ...... (   )

۵. کیا آپ دوست کی مرغ چھین پر صدق دل
سے ایمان لے آتے ہیں ...... (   )

۶. کیا آپ خود کہنے سے زیادہ بڑے خشوع و خضوع
سے دوسروں کی باتیں سننے میں یقین رکھتے ہیں ...... (   )

۷. کیا کسی لڑکی نے کبھی آپ کو گھور کر دیکھا ہے ...... (   )

۸. کیا آپ لڑکیوں کی بے تکی باتوں پر ہنسنے کا
سلیقہ رکھتے ہیں ...... (   )

۹. جب آپ کو ہنسی نہیں آتی تو کیا آپ زور زور
سے کھانسنے لگتے ہیں ...... (   )

۱۰. کیا آپ ناراضگی مول لئے بغیر اپنی بیوی کی
فرمائشات ٹال جاتے ہیں ...... (   )

۱۱. کیا آپ پچھلے تین سالوں سے ایک عدد
ساڑھی کے وعدے پر بیوی کو بہلاتے رہے ہیں ...... (   )

۱۲. کیا آپ کا اپنا کوئی الو بھی ہے ...... (   )

۱۳. کیا آپ بے روزگار ہوتے ہوئے بھی برسرِ
روزگار نظر آتے ہیں ...... (   )

کیا آپ شاعر ہیں؟

۱. کیا آپ بوڑھے ہیں ...... (   )

۲. کیا دہکتا ہوا حسن آپ کیلئے صرف شاعری
کی چیز رہ گئی ہے ...... (   )

۳. کیا آپ ترنم جانتے ہیں ...... (   )

۴. کیا آپ کی آواز بھدی ہے ...... (   )

۵. کیا آپ مسلسل دو گھنٹے طعبِ کرنے کی صلاحیت

رکھتے ہیں............... ( )

۶۔ کیا لوگ آپ سے بدکتے ہیں.......... ( )

۷۔ کیا آپ صرف شاعروں میں بیٹھتے ہیں.... ( )

۸۔ کیا آپ وقت بے وقت اٹھتے بیٹھتے غزلیں نہیں سناتے.............. ( )

۹۔ کیا آپ شاعر نہیں ہیں............ ( )

۱۰۔ کیا آپ کو اس کا قلق ہے کہ آپ کے اشعار کوئی بھی سننے کو تیار نہیں ہوتا.......... ( )

۱۱۔ کیا اپنی بیوی سے اکثر آپ کی جھڑپیں چلتی رہتی ہیں ( )

۱۲۔ کیا گپ ہانکنے میں آپ کو ملکہ حاصل ہے.... ( )

۱۳۔ کیا آپ پریشان پریشان سے رہتے ہیں... ( )

۱۴۔ کیا سودا حالی آپ کیلئے گالی ہے.... ( )

۱۵۔ کیا آپ کے نزدیک آمد سے زیادہ شاعری میں شیروانی کو دخل ہے.......... ( )

۱۶۔ کیا آپ غالب کو جانتے ہیں...... ( )

۱۷۔ کیا آپ کے نزدیک شاعری کی دو ہی قسمیں ہیں، جدید شاعری اور جدید شاعری...... ( )

۱۸۔ کیا شاعری میں آپ نکتہ سلجھانے کی بجائے الجھانے کا فن جانتے ہیں...... ( )

۱۹۔ کیا آپ کے قلب میں واردات ہوتی رہتی ہیں... ( )

۲۰۔ کیا راہ چلتے آپ کے ذہن میں ادھورے مصرعے اس طرح گردش کرتے رہتے ہیں جیسے کوئی ریکارڈ اٹک گیا ہو........... ( )

۲۱۔ کیا آپ انتہائی غیر شاعرانہ ہیں...... ( )

۲۲۔ کیا عشق میں ناکامی کے بعد آپ نے خودکشی کی بجائے شاعری اختیار کی ہے...... ( )

کیا آپ فلسفی ہیں!

۱۔ اگر سکندر اعظم آپ کے در پر حاضر ہو کر آپ کی فرمائش پوچھتا کہے تو کیا آپ اُسے دھوپ چھوڑ کر ہٹ جانے کا مشورہ دیں گے ( )

۲۔ تو کیا آپ کو یہ فکر ستا رہی ہے کہ زمین موسمی کی طرح کیوں گول ہے۔ سنگترے کی طرح گول کیوں نہیں ہے ( )

۳۔ کیا آپ نیکر پہنتے ہیں.......... ( )

۴۔ کیا لوگ آپ کو بیوقوف سمجھتے ہیں..... ( )

۵۔ کیا آپ اتنے زیادہ بولنے سے احتراز کرتے ہیں کہ لوگ آپ کو گونگا بہرہ سمجھنے لگیں...... ( )

۶۔ جب آپ خاموش ہو کر کمرے سے [illegible] ہیں تو کیا آپ اندر ہی اندر اپنا [illegible] ( )

۷۔ کیا معمہ حل کرنے سے زیادہ معمے پیدا کرکے خوش ہونا آپ کی عادت ہے............... ( )

۸۔ کیا آپ کے سر پر بال نہیں ہیں........ ( )

۹۔ کیا آپ کسی بال کی کھال نکال کے بتا سکتے ہیں ( )

۱۰۔ کیا آپ کا معدہ خراب رہتا ہے...... ( )

۱۱۔ کیا آپ ہومیوپیتھی کی دوا کھاتے ہیں..... ( )

۱۲۔ کیا آپ ہاتھ گھما کے ناک پکڑنے کے عادی ہیں ( )

۱۳۔ کیا آپ بالوں میں کبھی کنگھی نہیں کرتے... ( )

۱۴۔ کیا آپ کے بیوی بچوں کو آپ سے شکایت رہتی ہے ( )

۱۵۔ کیا آپ کے قول و فعل میں فرق ہے.... ( )

۱۶۔ کیا آپ کو سر اور پیر میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا ( )

۱۷۔ کیا آپ جب بھی کہتے ہیں اُلٹی ہی کہتے ہیں ( )

۱۸۔ کیا آپ کو دنیا کا یہ سکون پسند ہے...... ( )

۱۹۔ کیا آپ اور [illegible] نہیں ہیں.......... ( )

انیتا بارہ سال کی ہو گئی ہے۔

—— آج سے کروڑوں سال پہلے اسی زمین پر۔

—— اس کے بعد وہ ساور لو ٹھ ٹھا ئیگروں کے بارے

میں پڑھائیں گے۔۔۔۔۔

انیتا شمی ہانکتی ہوئی اپنے پاس بیٹھی سمترتی سے بولی۔

سمترتی ایک بھولی سی لڑکی ہے۔ بولی "تو کیسے ماسٹر جی کے

لئے چپ ہو رہی۔ دل ہی دل میں وہ سوچنے لگی کہ

کی تعداد میں کتنے صفر ہوتے ہیں؟ سمترتی کی نظر پاکر

اپنے کاپی کے ایک کونے میں کروڑ کی تعداد لکھنے لگی۔

"کیا لکھ رہی ہو؟ پریم پتر؟" جھل سمترتی نے انیتا کی چٹکی

لے کر پوچھا۔

انیتا نے بیزاری سے سمترتی کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

من کی بات جان گئی رے لڑکی؟۔۔۔۔ کچھ ہے کیا؟"

پہلے تو سمترتی کی باتوں کو انیتا کچھ بھی نہیں سمجھ پائی لیکن

جب اسے یاد آیا کہ اس کے اسکول آتے وقت ماں نے

سمجھایا تھا: "دیکھ کسی سے نہیں کہنا! کوئی اگر پوچھے کہ کیوں

اسکول نہیں آ رہی تھی تو کہہ دینا ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں

تھی۔۔۔۔ سمجھی؟"

تب وہ جھٹ سے سمترتی کے برے مطلب کو پا گئی

"—— آج سے کروڑوں سال پہلے۔۔۔۔۔"

اس کے بعد ماسٹر اور کیا کہنے والے ہیں، انیتا ٹھیک ٹھیک

سمجھ رہی تھی۔ اپنے تیز دماغ سے۔ لیکن بدمعاش سمترتی کو

اپنے بارے میں اور کچھ نوٹ کرنے کا موقع نہ دیتے کے

—— پریم پتر؟ اب اگر وہ سوچے گی۔۔۔۔۔ تو ویسے

کچھ لکھنے کا حق، شاید اسے مل گیا ہے؟

انیتا پریم پتر کے بدلے اپنے اس حق کے بارے میں

سوچنے لگی۔ یہ حق اب تک کیوں نہیں تھا۔

—— "تم نے یہ کام کب سے شروع کیا ہے سمترتی؟"

"کون سا کام" سمترتی ہنسی۔

—— انیتا کے چہرے پہ اچانک سرخی دوڑ گئی۔

شام ہی سے انیتا کے پتا جی دفتر سے لوٹ کر اپنے اسٹڈی

روم میں ایک کتاب لیکر بیٹھ گئے تھے —— اسکول

سے لوٹتی ہوئی انیتا گھر کی اس عجیب سناٹے کو بھی

[illegible]

جیسے ماں کے جانے کے بعد گھر کی "رونق" سے

انجانی سنسان گھر میں اپنے پتاجی کو ایسے چپ

چاپ بیٹھ کر پڑھتے ہوئے دیکھنا اس کے لئے نئی بات نہیں

تھی۔ لیکن آج اچانک اپنے پتاجی کو دیکھ کر کیوں سوچنے

لگی وہ اس کے پتاجی ہیں کیا؟

انیتا چپ چاپ دبے پاؤں سے گھر کے اندر آگئی۔

—— ممی...... یہ لفظ انیتا کے حلق سے کیا نکلا

وہ تھک سی ہی نکل گئی۔ شاید وہ چاہتی نہیں تھی کہ گھر

کے سنسان ماحول میں خلل پڑے۔ یہ ساکت ماحول

اسے کچھ ڈرا سا رہا تھا۔

انیتا کا اسکول سے لوٹنا اس کے پتاجی نے دیکھ

لیا تھا۔ اسٹڈی روم سے ہی بولے: —— "رسوئی میں

ناشتہ رکھا ہے کھا لو۔"

انیتا کا شک ٹھیک نکلا یعنی ماں گھر پر نہیں ہے۔

"تیری ماں ضروری کام سے اپنے میکے گئی ہیں۔ آج

رات تک جانے لوٹیں گی یا نہیں۔"

"وہ لوٹیں گی نہیں؟" انیتا کی آواز خوشی اور خوف کے بیچ

ڈبل سی ڈگمگانے لگی۔ اس کی زندگی میں شاید یہ پہلا دن

تھا جب اسے ماں کی غیر موجودگی میں گھر اچھا لگا تھا۔

انیتا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے

اپنی ڈائری سے ایک ورق پھاڑ لیا۔ اور قلم لے کر بیٹھ گئی

لیکن لکھے کیا؟

پریم پتر کیسے لکھا جاتا ہے؟ انیتا نے ڈری ڈری سی

نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ اسے پریم پتر لکھنا نہیں آتا۔

تو کیا اسے اپنے اس حق سے ساری زندگی محروم رہنا

پڑے گا؟

تو کیا ایک پل کو اس نے سب کاغذ پھاڑ ڈالے۔ لیکن کچھ

بدصورت لائنوں کے سوا اسے کچھ نہ دکھا۔ اس نے تھکے

موقع ملنے کے باوجود پریم پتر نہ لکھ سکنے کے سبب وہ

اور بھی ڈر گئی۔ لیکن اچانک اسے کچھ سوجھا۔ اسے

یاد آیا کہ الماری میں خطوط کا ایک بنڈل ہے۔ اس میں

کچھ تو ویسے خط ہوں گے ہی۔ انیتا ماں کے بیڈروم کے

اس الماری تک پہنچی —— اس کو شک ہوا۔

اس کی ماں کیا اتنی بھولی ہے کہ الماری کو کھلا چھوڑ گئی

ہوگی؟ لیکن اس کا یہ شک بے بنیاد تھا۔ ماں خود

بھولی ہے۔ ماں کی صورت کو یاد کر کے وہ دل ہی دل میں

ہنسی۔ لیکن...... کیا خطوط کا پلندہ وہیں ہوگا جہاں

پچھلے سال دکھا گیا تھا؟ اس کو بڑی حیرت ہو رہی تھی۔

انیتا نے الماری کا دراز کھولا۔ پلندہ اس میں تھا۔

—— چٹھی یا پریم پتر؟ انیتا اس بنڈل کو کھولے

یا نہیں؟ وہ یہی سوچنے لگی۔

ایک دن یہ سب پریم پتر ہی لگتے تھے۔ لیکن آج؟ صرف

خطوط ہی ہیں۔ انیتا نے اپنے آپ کو مضبوط پایا اور

بلا تامل پلندہ کھول دیا۔

لال، ہرا، نیلا —— قسم کے کئی طرح کے رنگوں میں

سے اپنی پسند کے مطابق انیتا نے ایک ہری چٹھی چنی

تو یہ ہے اس کی ماں کا پریم پتر؟ انیتا کے رونگٹے کھڑے

ہو گئے —— کس کس نام لکھی گئی ہیں یہ چٹھیاں؟

انیتا کو معلوم ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے اس کی ماں

کی چٹھیاں جو اس کے پتا کو لکھی گئی تھیں، اس کے اس

دنیا میں آنے کا سبب بن گئی تھیں۔

انیتا کو ماں کی غیر موجودگی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ ہر چٹھی کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی رقیق شئے اس کی چھاتی کے اندر خشک ہو رہی ہو۔ یہ کس کے نام لکھی گئی ہے؟ یہ چٹھی دیکھنے سے قبل اس نے لفافے پر لکھے پتے کو دیکھا۔

اچانک اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ایڈریس کس کا ہے؟ کس کا نام ہے یہ؟ یہ تو اس کے پتا جی کا نام نہیں ہے۔

اچانک اس کے دل میں آیا کہ یہ خط پتا جی کو دکھایا جائے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اچانک اسے ماں پر رحم آگیا آخر کیا لکھا ہے اس بھولی نے؟ انیتا اپنی ماں کا پریم پتر پڑھتے پڑھتے رک گئی۔

لکھا تھا: "پریتم! آج سے کروڑوں سال ......"

انیتا کو ہنسی آگئی۔ اسے وہ صبح یاد آئی جب ماسٹر جی پڑھا رہے تھے۔ یہ پریم پتر ہے؟ اپنی بھولی ماں کے لئے اس کے دل میں رحم کا جذبہ اور بڑھ گیا۔ آہستگی کے ساتھ وہ ہنسنے لگی اور سوچتی رہی ...... کہ بھولی ماں نے اسکے بعد سادھوؤں، تھگوں، لٹیروں کے بارے میں لکھا ہوگا .....

پھر وہ آگے کے ایک اور جملے میں کھو گئی۔

"...... تاریکیوں اور بادلوں سے گھری رات میں تو کیلے اور پتھریلے راہ میں، میں تمہارے پیچھے دوڑی ہوں! کروڑوں سال، خیر، بھالو، سانپ اور خوفناک چہرے لگا کر دھروا اور پرہلاد کو ڈرانے کی طرح ......"

انیتا کا سنہرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بار بار ماں کے خط کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اوپر لکھے پتے کو بھی دیکھ رہی تھی۔ انجانے آدمی کے نام ...... پھر بھی اس کے سینے میں کانٹا چبھنے کا سا درد ہو رہا تھا۔

پریم پتر لکھنے کے طریقے کو قابو میں کر لینے کے بعد بھی انیتا کو اس نام کی کنجی نہیں مل رہی تھی۔ پریم پتر جلنے والا انجانے کس آدمی کے نام لکھا جاتا ہے؟ مطلب تک نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

"انیتا!" مسان نگر میں کسی مرد کی آواز سن کر چونک پڑی۔ جھٹ سے پلنڈے کو بند کرتے ہوئے انیتا نے ایک بار پھر ایڈریس کے نام کو دیکھا۔

"انیتا!" اس کے پتا جی نے پھر پکارا۔

—— انیتا اپنے پتا کے بلانے کا جواب دئے بغیر دبے قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ دبے قدموں سے انیتا اپنے اسٹڈی روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لیکن نہ جانے کس طرح وہ اپنے اسٹڈی روم کی بجائے اپنے پتا جی کے اسٹڈی روم کے بند کیواڑ کے پاس پہونچ گئی۔ کیواڑ کی "دراز" سے اندر جھانکا۔

پھر اچانک بادھیا کے جھونکے کی طرح کیواڑ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

"آپ کا نام کیا ہے، پتا جی!" انیتا کے منہ سے اچانک ہی یہ سوال نکلا۔

—— انیتا کے پتا جی نے کتاب پر سے نظر اٹھا کر باوہ سال کی بیٹی کو دیکھا۔

"میرا نام"؟ شاید وہ بھی بھول گئے تھے اور ان کے گھبرانے کے انداز سے انیتا مسکرا پڑی:

"آپ کو اتنے سارے نام کس نے دئے ہیں؟" انیتا پتا جی کے اور بھی نزدیک آگئی۔ —— "آپ کیا کیا ہیں؟ ہے بھگوان!"

●●

پھندا

حب سرشار

زندگی آگ میں جلتے ہوئے لمحوں کے بدن
خشک پتوں کی طرح
منتشر ہو گئے خوابوں کے سراب
کل کے خاکے میں ہوا آج کا خاکہ مدغم
گاہے شام تک ایک اک لمحہ بھی
صدیوں کا سفر لگتا ہے
زندگی کون سی خواہش ہے؟
کہاں ہوتی ہے؟
آدمی؟
صرف جنم قیدی ہے۔!

تعفن

یوسف ندیم
۵۳۔ سروج نگر۔ یوسف گوڑہ۔ حیدرآباد۔ ۴۵

ہر اک مصیبت، ہر اک قیامت
ہر ایک لعنت گوارا کروں
مگر یہ جذبے؟
کہ ہر جہت شعلگی ہے جاری
سڑک سڑک ہے لہو کا منظر
ہر اک نفس آرزو کا مدفن
خیال کی لاش: اک تعفن

غزل

سلیم شہزاد
نشاط بک سنٹر۔ قدوائی روڈ
(مالیگاؤں)

کچھ لوگ ساری رات تھے بیدار گاؤں میں
پوجا کی صبح چل گئی تلوار گاؤں میں

پائل بجا کے پاس سے گوری نکل گئی
ہوتا ہے یوں ہی پیار کا اظہار گاؤں میں

شامل ہیں یوں تو سب ہی مگر دور دور سے
آباد ایسے گھر بھی ہیں دو چار گاؤں میں

ہر کوئی جس کی بُو پہ ہے وحشی بنا ہوا
آوارہ ہرنیوں کی ہے اک ڈار گاؤں میں

بکھرا ہے اس کا رنگ دھنک کی کمان سا
بارش ہوئی تھی رات دھواں دھار گاؤں میں

پاس آ کے کھیل کھیل میں دونوں "بگڑ گئے"
کوئی ہوا نہ ان سا گنہ گار گاؤں میں

لوگوں نے پتھروں میں انہیں قید کر دیا
اترے جو دیوتاؤں کے اوتار گاؤں میں

پنگھٹ پہ اب بھی سب کو اسی کا ہے انتظار
پردیسی ایک آیا تھا اک بار گاؤں میں

پھر کیا پناہ اس کے احاطے میں لیں سلیم
سائے میں بیٹھنے نہ دے، دیوار گاؤں میں

اسلم عمادی

تبصرے

تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

روشنی کی کرن

(افسانوں کا مجموعہ)

مصنف: رضاء الجبار

ناشر: بزم خلوص - ۹۳۸-۴-۲ کاچی گوڑہ

حیدرآباد ● قیمت: ۴ روپے

رضاء الجبار ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو زیادہ تر نیم ادبی حلقوں میں مقبول ہوتے ہیں اور یہ افسانوں کا مجموعہ ان کے ایسے ہی افسانوں کا انتخاب ہے جو کہ عوام کے لئے دلچسپی فراہم کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔

افسانہ ادب لطیف کا ایک حصّہ ہے اور ادب لطیف سے مراد ایسی تخلیقات ہیں جو کسی فاصلے اور سانچے کی بجائے پرکار اور مرتکز فکر کی پیداوار ہوں۔ افسانہ سے مراد ہی یہ ہے کہ وہ کہانی یا داستان نہ ہو بلکہ اس میں خود خالق کی محسوسات کا ارتکازی اظہار ہو مثلاً افسانہ نگار یہ نہیں کہتا کہ "جون کا مہینہ تھا" بلکہ وہ جب جون کا ذکر کرے گا تو اس کے ساتھ اس کے بارے میں اپنے شعوری نظریہ کا بھی اظہار کسی نہ کسی طور کر دے گا۔

رضاء الجبار کے افسانوں میں اکثر افسانہ نگار کا دخل - IN VOLVEMENT. رسمی ہے اور افسانہ نگار ہر بات کا ایک خارجی شخصیت کے طور پر معائنہ کرتا ہے اور ہلکے ہلکے فکری لمس بھی دے دیتا ہے۔ ظ۔ انصاری صاحب نے تعارف نامہ میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ "رضاء الجبار فن افسانہ نگاری میں دھیرے دھیرے ترقی کر رہے ہیں لیکن میں نے یہ بات محسوس نہیں کی۔ رضا کے تمام افسانوں میں، میں نے ایک ہی انداز دیکھا یعنی پلاٹ پر قدم قدم چلنا۔ اس کے باوجود رضاء الجبار کے ان افسانہ نگاروں سے بہتر ہیں جو صرف لیلیٰ مجنوں قسم کے افسانے لکھ کر چھپ رہے ہیں اس تمام مجموعہ میں "ادبی منڈیر" اور "نیوا ڈیل" ہی ایسے کچھ افسانہ نگاری کے زندہ عناصر ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم نے اگر منٹو، بیدی، غلام عباس، ندیم قاسمی، کرشن چندر کے افسانے پڑھے ہوں تو پھر رضاء الجبار کے افسانے کیوں پڑھیں۔ ادب تو ہمیشہ جدت اور ندرت چاہتا ہے۔ پکی ہوئی اور سہی اُن ہوئی باتوں پر افسانے کیوں لکھے جا رہے ہیں۔

امید ہے کہ رضاء الجبار اپنے افسانوں میں تحریک پیدا کریں گے اور زندہ رہنے کی کوشش کریں گے۔ سرورق اچھا ہے، طباعت ستھری ہے لیکن قیمت زیادہ ہے۔ ●

ارمغان کیرالا (ایس ایم سرور)

قیمت: ایک روپیہ پچیس پیسے

پتہ: پوسٹ وِنڈو پرمبا۔ تلاپورم (کیرالا)

زیر تبصرہ مجموعہ ملابار کے رہنے والے ایک ایسے نوجوان شاعر کی نظموں کا انتخاب ہے جس کی مادری زبان ملایالم ہے۔ ایسے پُر آشوب دور میں جبکہ اردو کی نگری میں اردو کا دیس نکالا ہو رہا ہے ایک غیر زبان رکھنے والے کے دل میں اردو سیکھنے کی تڑپ کا پیدا ہونا اور اُس زبان میں شعر لکھنا ایک نہایت قابل تحسین بات ہے جس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ایسی کتابوں کو خرید کر اپنی ادب دوستی کا ثبوت دیں۔ مجموعہ میں شامل نظموں میں قومی و ملی جذبات کا اظہار حالی اور اقبال کی سلسلے میں ہے

ہماری فلمی موسیقی اور اجارہ داری

[illegible]

جھری تلیا اور راج نند گاؤں ہندوستان کے دو گمنام چھوٹے
سے قصبے ہیں۔ آپ ہندوستان کے نقشے پر نظر دوڑائیں تو
بمشکل انہیں تلاش کر سکیں گے۔ لیکن ان دو قصبوں میں فلمی
موسیقی کے شائقین کا سب سے بڑا اجتماع پایا جاتا ہے
اس بات پر آپ کو اس وقت یقین لانا پڑے گا جب کہ آپ
ہمارے ریڈیو اسٹیشنوں کے پیش کردہ اشتہاروں پر
اعتبار کریں۔ آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو سیلون کے تمام
فرمائشی پروگرام ہندوستان کے کسی اور مقام سے زیادہ
ان دو گمنام قصبوں کے شائقین کے ناموں سے پٹے
ہوئے نظر آتے ہیں۔ وودھ بھارتی کے کسی بھی پروگرام
منورنجن، مدھر گیت یا بیلا کے پھول میں جھری تلیا اور راج نند
گاؤں کے ان نام نہاد باشندوں کے نام آپ آسانی
سے کسی بھی تازہ ہندی فلم کے گانے کے ساتھ سن سکتے
ہیں۔ اس طرح جھری تلیا اور راج نند گاؤں موسیقاروں
کی [illegible] اور چند دوسرے موسیقاروں کی اجارہ داری
کے زیر [illegible] ہو چکے ہیں۔ چونکہ فلمی موسیقی کو آج کل ایک
طرح سے قومی موسیقی کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اس لئے

جس انداز میں ان موسیقاروں کے گانے پابندی سے
براڈکاسٹ کئے جاتے ہیں اس سے فلمی موسیقی کے
باشعور شائقین میں تشویش کا پایا جانا فطری ہے۔ آج
جب کہ لتا منگیشکر، محمد رفیع، کشور کمار اور آشا بھونسلے
کی آوازیں تمام زبان داری اور علاقہ داری رکاوٹوں
کو دور کر چکی ہیں، فلمی موسیقی چند چالاک بزنس ایجنٹوں
اور ایک اجارہ دارانہ شہرت پسندی کے رحم و کرم
پر چھوڑ دی گئی ہے۔

یہ بات بظاہر حیرت انگیز نظر آتی ہے لیکن یہ حقیقت
ہے کہ بمبئی میں چند موسیقار باقاعدہ طور پر پبلسٹی کے
نمائندوں کو بطور ایجنٹ رکھے ہوئے ہیں جن کا کام
ان کی ریلیز ہونے والی فلم کے گانوں کی پبلسٹی ہوتا ہے
یہ ایجنٹ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنے
نمائندوں کو پوسٹ کارڈ وافر تعداد میں برابر سپلائی
کرتے رہتے ہیں۔ یہ نمائندے ان پوسٹ کارڈوں
پر فرضی فرمائشوں کے ساتھ فرضی نام لکھ کر دوبارہ

کر یا ریڈیو سٹیشنوں کو وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے ہیں۔
ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ان نام نہاد فرمائشوں کا آل انڈیا
ریڈیو میں باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے تاکہ جب
بھی کہیں کسی گوشہ سے تنقید ہو تو یہ نام انہیں بتائے
جا سکیں۔ اس کے باوجود عوام اس بات پر تعجب کئے
بغیر نہیں رہ سکتے کہ جھمری تلیا اور راج نند گاؤں آخر
کیسے وودھ بھارتی کے فرمائشی پروگراموں کے اتنے
بڑے سرپرست بن گئے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ آل انڈیا
ریڈیو کے فرمائشی پروگرام گانوں کی خوبیوں یا مقبولیت
کی اساس پر ترتیب نہیں دیئے جاتے بلکہ انہی
نام نہاد فرمائشوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو
خوش قسمتی سے حکومت کے ان دوسرے محکموں کی
طرح دفتریت کا شکار نہیں ہے اسی لئے وقتاً
فوقتاً چند موسیقاروں کو ان کے گانے اپنے اسٹیشنوں
پر براڈکاسٹ کرنے سے پہلے انہیں مطلع کرتا
رہتا ہے۔ لیکن آل انڈیا ریڈیو کی یہی کارکردگی
چند موسیقاروں کے لئے اپنے رقیبوں کو نقصان
پہنچانے کا ذریعہ بن چکی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ
ان موسیقاروں کی نام نہاد مقبولیت پائیدار بنانے
میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ اس کی تازہ
ترین مثال حال ہی کے ایک واقعہ سے دی جا سکتی
ہے جب کہ ایک گانے کو جسے آل انڈیا ریڈیو
کی سلکشن کمیٹی نے پہلے تو بجانے کے لئے نامنظور
کر دیا تھا، بعد میں براڈکاسٹ کرنے کے قبول کر لیا
اس کی وجہ ایک متعلقہ موسیقار کی مداخلت بتائی جاتی
ہے جس کا آل انڈیا ریڈیو کے حلقوں میں کافی رسوخ

پایا جاتا ہے۔

موسیقی کی ہندی فلموں میں اہمیت کا اندازہ اس
حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج کل کسی کلر فلم
کے پورے بجٹ کا آٹھواں حصہ موسیقی کے لئے مختص
کیا جاتا ہے۔ ایک رنگین اے کلاس فلم پر تقریباً چالیس
لاکھ روپے صرف کئے جاتے ہیں۔ گویا ایک اے
کلاس رنگین فلم کی موسیقی کے لئے پانچ لاکھ روپے
مختص کئے جاتے ہیں۔ اس طرح فلمی موسیقی کی نام نہاد
تخلیق بھی پیسہ کمانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن چکی ہے
نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ معاہدوں کو اپنی گرفت
میں لینا چند موسیقاروں کا شعار بن گیا ہے۔ اسی لئے
اسی سال ۱۹ اپریل کو سنے میوزک ڈائرکٹرز ایسوسی
ایشن کی طرف سے وزیر اعظم کو ایک یادداشت پیش
کی گئی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ موسیقاروں کی تین چوتھائی
اور ایک دو دوسرے موسیقاروں نے جنھیں کسی قدر
مقبولیت محض اپنے ناجائز اور ناپاک طریقوں کی وجہ
حاصل ہوئی ہے فلمی صنعت میں اجارہ داری کا جھنڈا بلند کر رکھا
ہے۔ ان موسیقاروں کے پاس تکمیل کے قریب فلموں میں سے
نوے فیصدی فلمیں پائی جاتی ہیں یا موجود ہیں۔ اس طرح صرف
(۱۰ فیصد کی فلمیں اور ۱۲۴) موسیقاروں کے حصہ میں آتی ہیں جو
غیر اخلاقی طریقوں سے جھوٹی مقبولیت کے حصول کے پیچھے
نہیں دوڑتے۔ اس طرح روز بروز فلمی موسیقی کا معیار چند
موسیقاروں کے اجارہ دارانہ رویہ کی وجہ سے گرتا جا
رہا ہے۔
فلمی موسیقی کا گرتا ہوا معیار چند ایسے لوگوں کے لئے

[illegible]

[illegible] سے ... کسی مہارت کی ضرورت
نہیں۔ بس ایک موسیقار آرکسٹرا ترتیب دینے والے
اور ایک باکمال اپنے بیک سنگر کی ضرورت ہے۔
اور آرکسٹرا ترتیب دینے والا ایک گانے کی آدھ
تک نصف کام تو کر ہی لیتا ہے۔ باقی نصف کا
دارومدار پوری طرح گانے والے پر ہوتا ہے۔ یہی
سبب چند چوٹی کے صداکاروں میں اس خیال کا
محرک بنا ہے کہ ان کے بغیر موسیقاروں کے لئے ایک
دن بھی کام کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے
موسیقار نئے گانے والوں کو گانے کا موقع نہیں دیتے
کیونکہ نئے گانے والے ان منجھے ہوئے صداکاروں
کی طرح ایک مردہ دھن میں جان نہیں ڈال سکتے
اس سے ہٹ کر آج کل کے یہ چوٹی کے صداکار تو
ان چند موسیقاروں کے ہمراہ اپنا ایک اسٹائل رکھتے
ہیں اور حقیقتاً "موسیقی کی تخلیق" کرتے ہیں، کسی اور
موسیقار کو نہ تو خاطر میں لاتے ہیں۔ اور نہ ان کی عزت
کرتے ہیں۔

موسیقی کی تخلیق آج کل خیال خام بن کر رہ گئی ہے۔
زیادہ تر موسیقار ٹکسال کے سکوں کی طرح دھنیں
ڈھالتے ہیں۔ ان دھنوں پر نہ انفرادیت کی چھاپ
ہوتی ہے اور نہ اسٹائل کی ندرت ظاہر ہے ایک
موسیقار جب بیک وقت چالیس فلموں کی ترتیب
دینے کا بیڑا اٹھاتا ہے تو اس سے انفرادیت کی
[illegible] ہوگی۔ یہ وجہ ہے کہ آج کی
زیادہ فلموں میں موسیقی ترتیب دینے کے لئے ایسے
اپنی اختراع و قابلیت سے ہٹ کر دوسرے وسائل
تلاش کرنے بیٹھتے ہیں۔ افغانستان، عالم عرب
اسپین، لاطینی امریکی ممالک اور یورپ سے روز
ہی ان ملکوں کی موسیقی کے ٹیپ اور ریکارڈ ہمارے
ایرلائنس کے پائلٹ، ائیر ہوسٹس اور بیوپاری
لے آتے ہیں۔ اسی غیر ملکی مسالہ سے ہماری موسیقی
کو سجایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پرانی مقبول دھنوں
کو گنگنا کر اور انہیں نئے آرکسٹرا کے ساتھ پیش
کر دینا یا ہندوستانی سنگیت، پنجابی لوک گیت کی
دھنوں کو الٹ پلٹ کر کے پیش کر دینا ہی ان
موسیقاروں کی روزی کا ذریعہ بن چکا ہے۔ اس سے
ہٹ کر ایسے نوجوان اور باصلاحیت فنکار جو ان
نام نہاد مقبول موسیقاروں کے ہاں اس غرض سے
آتے ہیں کہ وہ ان کی مدد کریں گے تاکہ انہیں بھی اپنے
فن کے مظاہرے کا موقع ملے، ان سے کہا جاتا
ہے کہ وہ مائیکروفون کے سامنے اپنی تخلیقات
پیش کریں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ کہاں
تک مائیکروفون کے لئے اپنی دھنیں موزوں ثابت
کر سکتے ہیں۔ ان نوخیز موسیقاروں کی دھنوں کو بڑی
احتیاط سے ریکارڈ کر لیا جاتا کر محفوظ کر دیا جاتا
ہے۔ بعض مقبول موسیقاروں کے ہاں باقاعدہ طور
پر کچھ کلاسیکی موسیقی سے واقفیت رکھنے والے
موسیقار اور سازندے ملازم ہیں۔ ان بدقسمت
لوگوں کی بنائی ہوئی دھنوں کا بھی بڑی [illegible]

یہ گنے چنے موسیقار استعمال کرتے ہیں اور اپنی دھنیں بنا کر پیش کرتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ نام نہاد موسیقار صرف اسی پر اکتفا نہیں کر پاتے بلکہ اپنی دھنوں کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لئے کسی بھی غیر اخلاقی طریقہ کو اپنانے سے نہیں جھجکتے۔ ان میں سے بعض موسیقار تو ایسے بھی ہیں جو اپنے کسی بھی مخصوص گانے کو مقبول عام ریڈیو پروگراموں میں نمایاں بنانے کے لئے دس ہزار روپے سے لیکر بیس ہزار روپے تک خرچ کرتے ہیں۔ بہترین موسیقی کے اعزازات کے لئے ان لوگوں کے درمیان ہمیشہ ایک دوڑ ہوتی رہتی ہے اور بڑی سے بڑی قیمت دے کر یہ اعزاز خرید سے جاتے ہیں۔ خود بمبئی میوزک ڈائرکٹرس اسوسی ایشن کے قائم کئے ہوئے سال کی بہترین موسیقی کے اعزاز کے لئے بیان کیا جاتا ہے کہ چند موسیقاروں نے ایک لاکھ روپیہ تک خرچ کیا۔ چونکہ ان فلمی موسیقاروں کے معاوضہ کا زیادہ تر حصہ کالے روپے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کالا روپیہ یہ اپنے حریف موسیقاروں کو نیچا دکھانے کے لئے کھلے بندوں خرچ کرتے ہیں۔ اس کے کئی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے حریفوں کے پورے تازہ ترین ریکارڈز مارکٹ سے خرید لئے جائیں۔ پہلے پہل تو یہ حریف موسیقار بڑا خوش ہوتا ہے کہ چلو میرے سب ریکارڈز بک گئے ہیں۔ لیکن بعد میں اُسے پتہ چلتا ہے کہ تین مہینے کے وقفہ کے ختم ہونے تک جس کے دوران اُس کے ریکارڈوں کی نئی کھیپ بیکر حیدرآباد ۱۲۲

بازار میں [illegible]
اسٹیشنوں پر [illegible]

ایک اور طریقہ یہ ہے کہ حریف موسیقاروں [illegible]
فلم کی ریلیز کے موقعہ پر جب کہ فلم [illegible]
مختلف زر خرید لوگوں کو بڑے بڑے [illegible]
کے باہر بھیجتے رہنا۔ اس طرح عوام میں یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ ان گانوں کی عام لوگوں [illegible] قدر نہیں ہے اور وہ انہیں ناپسند کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد موسیقار — ہندوستان بھر کے تمام جیوک باکسوں کو اپنے ریکارڈز کی مفت سپلائی کرتے رہتے ہیں۔ ایک بار مقبولیت حاصل کر لینے کے بعد یہ موسیقار ہر قیمت پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اس کے لئے ریڈیو اسٹیشنوں کے افسروں کو اس غرض کے لئے روپے دیتے رہنا کہ وہ ان کے حریفوں کے گیت ریڈیو پر بجنے نہ دیں، زیادہ سے زیادہ معاوضے حاصل کرنے کے لئے پروڈیوسروں کو طرح طرح کی ترغیبیں، سہولتیں اور لالچ دینا، اپنے خرچ پر انکے لئے گانے ریکارڈ کروانا یا اپنے معاوضہ کے بجائے پروڈیوسروں سے کسی علاقہ کے تقسیمی حقوق لے لینا، بہت عام بات بن چکی ہے۔

۔ہی چوٹی کے موسیقار کبھی اپنے گانوں کی ریہرسل کے دوران اپنے گروپ سے ہٹ کر کسی اور شخص کو اپنے میوزک روم میں داخل ہونے نہیں دیتے۔ کیونکہ انہیں میوزک روم میں گھسنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ [illegible]

بزنس اور داڑھی

پتہ چلا ہے کہ ۱۹۷۰-۷۱ء کے دوران ہندوستان پرتیار کردہ فلموں نے ۵ کروڑ روپے کا غیر معمولی بزنس کیا ہے۔ اس بزنس کا سہرا اسپیکر کے صدر اے۔ ایم طارق کے سر ہے۔ کچھ حلقوں کا کہنا ہے کہ جب سے طارق صاحب نے داڑھی رکھوائی ہے تب سے ہماری فلموں کی غیر ملکی مانگ میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ داڑھی فلمی دنیا کے لئے نیک شگون بن گئی ہے۔

یش چوپڑہ کی بی آر فلمز سے علیحدگی

بی۔ آر۔ چوپڑہ نے اپنے بیٹے روی چوپڑہ اور داماد تلک راج کو اپنے یونٹ میں شامل کر لیا ہے اور انہیں باقاعدہ پروڈکشن کے مختلف شعبوں میں تربیت دی جا رہی ہے۔ اس سے یش چوپڑہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد بی۔ آر۔ فلمز کے یونٹ کی باگ ڈور ـــــ روی چوپڑہ اور تلک راج کے ہاتھوں میں ہوگی تب انہیں اپنے مقام کے تعین میں دشواری ہوگی۔ اسی لئے انہوں نے بی۔ آر۔ فلمز سے علیحدگی کے بعد آزادانہ طور سے فلمیں پروڈیوس اور ڈائرکٹ کرنے شروع کر دی ہیں۔ حال ہی میں ان کی اپنی فلم "داغ" کا مہورت دلیپ کمار کے ہاتھوں ہوا جس نے یش چوپڑہ اور بی۔ آر۔ چوپڑہ میں ملاپ کرانے کی بہت کوشش کی۔ اس واقعہ کے بعد بی۔ آر۔ چوپڑہ نے مہورت میں شریک ہو کر اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دیا۔

۱۲۶ نیّر حیدرآباد

باپ [illegible] ۱۲

ایس۔ ڈی۔ برمن [illegible]
نہیں کیا تھا [illegible]
کی فلم "امر پریم" کے لئے ایک [illegible]
کروایا۔ اس گانے کو بھی خواتین [illegible]
لئے آنند بخشی نے لکھا ہے۔

شیر میرے یار

ہاتھی اور ساتھی کی غیر معمولی کامیابی کے بعد پروڈیوسر ڈائرکٹر چنپا دیور جنھوں نے "ہاتھی میرے ساتھی" بنائی تھی اسی بات کو سامنے رکھ کر ایک اور فلم "شیر میرے یار" بنانے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے لئے دھرمیندر کو لیا گیا ہے جو اپنی شخصیت کے اعتبار سے ایک شیر کے دوست کے فرائض بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ اس فلم کی موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کے سپرد ہوگی جن کی موسیقی جنگلی جانوروں کے شور سے بڑی حد تک مشابہت رکھتی ہے۔

میرے جیون ساتھی

"ہاتھی میرے ساتھی" کی کامیابی نے راجیش کھنہ اور تنوجہ کو پھر ایک بار شلپکار کی فلم "میرے جیون ساتھی" میں یکجا کر دیا ہے۔ دوسرے اداکاروں میں نذیر حسین، سندر، کے۔ این سنگھ اور ہیلن شامل ہیں۔ فوٹوگرافی اور ہدایت کاری روی نگائچ کی ہے۔ گانے [illegible] مجروح کے لکھے ہوئے [illegible] بنائی ہیں۔

بین الفلمیان

● گرودت فلمز کے یونٹ کے لئے اس ادارے کی جانب سے "ورسوا" بمبئی میں سمندر کے کنارے ایک بلڈنگ تیار کی جارہی ہے۔ توقع ہے بہت جلد مکمل ہوجائے گی۔

● دھرمیندر اور وجیا مالنی سیون آرٹ فلمز کی فلم "راجہ جانی" میں ایک ساتھ آرہے ہیں۔ موہن سہگل کی ہدایت اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کی ہوگی جبکہ گیت آنند بخشی لکھ رہے ہیں۔

● جیتندر اور جیہ بھادوری تری مورتی فلمز کے جھنڈے تلے بننے والی فلم میں پہلی بار آرہے ہیں۔ موسیقی راہول دیو برمن کی ہوگی۔ گلزار نے اسے لکھا ہے اور وہی ڈائرکشن بھی کریں گے۔ اس فلم میں پران اہم رول ادا کر رہا ہے

[illegible] کی فلم کے [illegible] کو وحیدہ [illegible] ڈی برمن [illegible] انتخاب نہیں کیا گیا ہے۔

● جیتندر اور راکھی آشا [illegible] فلم میں ایک ساتھ آرہے ہیں۔ [illegible] فلم کو سبیر گنگولی ڈائرکٹ کریں گے جبکہ موسیقی [illegible] پیارے لال کی ہوگی۔

● پروڈیوسر جے اوم پرکاش کی فلم "آنکھوں آنکھوں میں" کی شوٹنگ ان دنوں گجرات میں ہورہی ہے۔ راکھی، راکیش روشن اس فلم کے اہم کردار ہیں۔ موسیقی شنکر جے کشن کی ہے۔

● نتن فلمز کی "یہ سچ ہے" ، مہورت شوٹنگ کے بعد مکمل کرلی گئی ہے۔ ریحانہ سلطان، ضیاء [illegible] مرنال مکرجی اس کے اہم ستارے ہیں۔ کہانی و ہدایت [illegible] ساگر

ہے۔ بکھرا: کچھ ادھورا سا معلوم ہوتا ہے۔ تیسرے پریم کا چہرہ ہیرو کی روایتی معصومیت کو ظاہر نہیں کرتا۔

پروڈیوسر ڈائرکٹر چیتن آنند نے دوسرے اداکاروں کا بڑا موزوں انتخاب کیا ہے۔ راجکمار نے بڑی اچھی اداکاری کی ہے اور مکالمے اپنے مخصوص انداز میں بہت اچھے بولے ہیں۔ پران نے اپنی روایتی اداکاری کی ہے لیکن بڑی کامیابی کے ساتھ۔ دوسرے اداکار یا ہیں مکو، سجاتا، کامنی کوشل، اچلا سچدیو، وینا، ساودھنا کھوٹے، سونیا ساہنی، اندرانی مکرجی، جینت، ہیرو، ترلوچن، شیرا، دھرمون بہت اچھے ہیں۔ پرتھوی راج کپور اوسط رہے۔ ہنگل اپنے مختصر رول میں بہت خوب ہیں۔ مدن موہن کی موسیقی پنجاب کی لوک دھنوں پر مبنی ہے یہ اور بات ہے کہ یہ لوک دھنیں اب تک کئی بار بلکہ بار بار کئی دوسری فلموں میں پیش کی جا چکی ہیں۔ پھر بھی مدن موہن نے ان مانوس دھنوں کو اپنے مخصوص فنکارانہ انداز میں اپنایا ہے۔ کیفی کے گیت ان کے مکالموں کی طرح بیحد خوبصورت ہیں جال مستری کی فوٹوگرافی فلم کے موڈ کو بہت اچھی طرح برقرار رکھتی ہے۔ سیٹ بڑے حقیقی ہیں سوائے ان چند سیٹوں کے جو ہیر اور رانجھا کی قبر کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بے حد مصنوعی لگتے ہیں۔ چیتن آنند کی ہدایت کاری بے حد فنکارانہ اور بھرپور ہے اور وارث شاہ کی ہیر کے ساتھ انھوں نے پورا انصاف کیا ہے۔ مختصراً "ہیر رانجھا" ایک بے حد فنکارانہ اور خوبصورت فلم ہے۔

بڈھا مل گیا

یہ فلم رشی کیش مکرجی نے بنائی ہے۔ صاحب ذوق فلمی

۱۳۰ "پیکر" حیدرآباد

شائقین کے لئے رشی کیش مکرجی کی ہر فلم ایک دعوت فکر و نظر ہوتی ہے لیکن زیر نظر فلم اپنے نام کی طرح بے حد ہلکی اور معمولی ہے۔ یہ فلم جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک کامیڈی ہے۔ رشی کیش مکرجی نے اس سے پہلے بھی اناڑی اور میم دیدی جیسی اچھی کامیڈی فلمیں بنائی ہیں۔ جن میں مقصد اور مزاح کا بڑا خوبصورت امتزاج موجود تھا۔ "بڈھا مل گیا" مقصد سے یکسر عاری ہے اور جہاں فلم کا پہلا حصہ مزاح کے چند اچھے لمحے فراہم کرتا ہے وہیں فلم کا دوسرا حصہ سنسنی خیز فلموں کے تمام باکس آفس فارمولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ فلم مجموعی طور پر تماشائی کے ذہن پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتی اور تماشائی یہ سوچنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ فلم رشی کیش مکرجی نے بنائی ہے۔ فلم میں سب سے اچھی اداکاری اوم پرکاش نے بڈھے کے رول میں کی ہے۔ ویسے اس رول کی کامیابی کا سہرا ہدایت کار یا مکالمہ نگار کے بجائے اوم پرکاش کو ہی جاتا ہے۔ دیوین ورما بھی اپنے رول میں کامیاب ہے۔ نیا ہیرو نوین نشچل مزاحیہ اداکاری کے لئے قطعی ناموزوں ہے۔ نئی اداکارہ ارچنا کی اداکاری میں ابھی کچا پن ہے اور اسے جذبات نگاری پر بھی قابو نہیں ہے۔ پال مہندرا کے مکالمے مزاح کو ابھارنے میں ناکام ہیں۔ جیونت پتھارے کی فوٹوگرافی اچھی ہے۔ راہل دیو برمن نے کچھ دھنیں دی ہیں۔ بحیثیت مجموعی "بڈھا مل گیا" ایک اوسط درجہ کی فلم ہے جو تعداد میں لوگوں کو مطمئن کر سکیگی! ورنہ عوام کو۔

●●

SARGAM CHITRA PRESENTS

THEIR PRESTIGE PICTURE

SAMPOORNA DEVI DARSHAN

(IN ORWO COLOUR)

A FILM SAGA THAT WILL TOUCH THE DEPTH OF YOUR SOULS

Producer
S. J. RAJDEV

Director
SHANTI LAL SONI

Music: **S. N. TRIPATHI**

Staring:

AASHISH KUMAR, SUSHMA, PADMA RANI, SHABANA AND OTHERS

SARGAM CHITRA
EVER GREEN BUILDING, NAAZ COMPOUND,
BOMBAY-4

V. Regd No. ,8068/61 "PAIKER" Postal Regd. No. H. 16..
AN URDU MONTHLY MAGAZINE
Editor : AZAM RAHI
3-6-214, Himaytnagar, Hyderabad-29 A. P.

Cover printed at Vistas Printers, Hyd-27

ایک مکمل ماہ نامہ

دسواں سال • بارھواں شمارہ

پیکر

دسمبر ۱۹۸۱ء

مدیر:
اعظم راہی

مدیر: صدر دفتر: ۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد ۲۹
اعظم راہی
دیگر دفاتر: ۱۹ اسٹیشن روڈ، اروان نمبر ۲، ویو، بمبئی ۴۰۰۰۴۳
سرورق: ۶۵۔ بی، دوسرا بلاک، راجہ جی نگر، بنگلور۔ ۱۰
سعید بن محمد

عنوانات:
غوث محمد

کتابت:
جمیل الرحمٰن
مسعود جاوید

قیمت سالانہ:
بارہ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ

'پیکر' میں شائع ہونے والے افسانوں، ناولوں وغیرہ میں
نام، مقام، کردار اور واقعات فرضی ہیں، اور
ان سے کسی بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔
'پیکر' میں شائع ہونے والی تمام تخلیقات غیر مطبوعہ
ہیں ان کے نقل کی صورت میں حوالہ دینا ضروری ہے
اعظم راہی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے
پرنٹو پریس کے لیے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار مینار حیدرآباد ۲ میں چھپوا کر
۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد ۲۹ سے شائع کیا

اس شمارے میں:

ظہیر غازی پوری ۔ ہزاری باغ

ستمبر کے "پیکر" میں رضوان احمد اور ترپی کلیشور کے خطوط نظر سے گذرے۔ اب اس خط کی روشنی میں ترپی کلیشور کو سمجھنا بے حد دشوار ہو گیا ہے۔ انھوں نے اس خط میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ اردو، سندھی اور پنجابی کو دیوناگری لپی اپنانی پڑے گی۔ بنگلہ، تامل اور تلگو وغیرہ کے لئے ایسی کوئی بات ترپی کلیشور نے نہیں کہی جبکہ یہ زبانیں بھی دیوناگری میں نہیں لکھی جاتیں۔ اردو، سندھی اور پنجابی کا نام خصوصی طور پر کیوں لیا گیا؟ کیا اس لئے کہ یہ تینوں ہی زبانیں عربی و فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ یہاں ان کی نیت پر شبہ کرنا قطعی فطری اور نفسیاتی بات ہے۔ اس لئے کہ رسم الخط بدلنے کی مہم ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہے۔ اسے سازش کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ دراصل مقصد یہ ہے کہ ان زبانوں کو دیوناگری کا جامہ پہنانے کے بعد انھیں ہندی میں ضم کر دیا جائے۔ ہندی رسائل میں اردو کہانیوں کے لئے لفظ "اردو" کبھی استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ

ہم پیکر حیدرآباد

کے لئے تحریر کردہ اردو کے مکالمے، نغمے اور کہانیاں ہندی کے سرٹیفکیٹ سے نوازی جاتی ہیں۔ اردو کو ایک زندہ اور جاندار زبان تسلیم کرنے والے ترپی کلیشور نے اس زیادتی، زبردستی اور ظلم اور ناانصافی کے خلاف کتنی بار آواز اٹھائی ہے۔ اردو میں لکھی گئی کہانی کو "اردو کہانی" کے ریمارک کے ساتھ کتنی بار شائع کیا ہے۔ اردو کو اس کا جائز حق اور مقام دلانے کی خاطر کتنی لڑائیاں لڑ چکے ہیں۔ اردو اور ہندی کا الگ الگ وجود وہ خود تسلیم کرتے ہیں لیکن جہاں اردو کے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے وہ اپنا دامن صاف بچا جاتے ہیں اور اپنی سوچ کو جن سنگھ کی سوچ سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ ایک فنکار کی ایسی دو رنگی پالیسی کیوں ——؟

ترپی کلیشور چاہے کسی کی آڑ لے کر کہیں لیکن یہ بات کہ لپی نے بھارت کے وبھاجن (تقسیم) میں بڑا پارٹ ادا کیا ہے خود ان کے دماغ میں بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ جب زمین آزادی سے بڑی نہیں ہوتی تو آزادی کے بعد وبھاجن کی بات اردو لپی کے ساتھ کیوں جوڑ دی گئی جبکہ آزادی کی لڑائی میں اردو زبان کی جد و جہد اور قربانیوں کا جواب تلاش کرنا مشکل ہے۔ ترپی کلیشور نے ناگری رسم الخط کی حمایت کرنے والوں میں جناب آل احمد سرور کا نام نامی پیش کیا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ انھوں نے ایسی باتیں کب کہیں۔ البتہ مجھے یہ معلوم ہے کہ دلی یونیورسٹی میں منعقدہ اردو رسم الخط سیمینار (۲۹ جنوری ۱۹۷۰ء) میں جناب آل احمد سرور نے جو خطبۂ استقبالیہ پیش کیا وہ اس کے برعکس ہے

[illegible] یا ماہرِ [illegible] رسا یا ضیا جالندھر یا ڈاکٹر گوپی چند یا عصمت چغتائی، زبان کسی کی جاگیر نہیں ہے کہ جب چاہیں کوئی فیصلہ صادر کردیں اس سے قطع نظر ان میں سے کوئی بھی لسانیات کا ماہر نہیں۔ پھر ایسی باتیں ہوا میں اچھالنے کا انھیں کیا حق پہنچتا ہے جبکہ ہندوستان کے مشہور لسانیات، ساہتیہ اکاڈمی کے صدر نشین، نیشنل پروفیسر آف انڈیا جناب سنیتی کمار چٹرجی کے خیال کے مطابق ——

"جب تک سارا ہندوستان ایک طرح کے رومن رسم الخط کو تمام ہندوستانی زبانوں کے لئے منظور نہیں کر لیتا۔ میرے خیال میں کسی ایک رسم الخط کو ہندوستان کی تمام زبانوں پر لادنا اور زیادہ الجھنیں پیدا کرے گا۔ ایک رسم الخط سے دوسرا رسم الخط بدلنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کوٹ بدلنا۔"

کلیشوری بقیہ تیرہ زبانوں کے رسم الخط بدلنے کے لئے فضا ہموار کریں۔ اردو غریب کو ابھی بخش دیں یہ تو ابھی اپنے جائز حقوق بھی نہیں پا سکی ہے۔ سرکاری یا نیم سرکاری زبان کی حیثیت سے بھی تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ آخر اس مظلوم زبان کا رسم الخط وہ سب سے پہلے کیوں بدلوانا چاہتے ہیں۔ کیا اس سے انھیں کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے؟

ناوک حمزہ پوری۔ سوندا

"خط و خال" میں گنہگار ہندی سے ملاقات ہوگئی۔ میں انجناب سے واقف نہیں۔ پیکر کی وساطت سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک گنہگار ہیں۔ دعویٰ کے لئے دلیل چاہئیے سو وہ اُن کی تحریر میں مل گئی۔ اوج کا یہ شعر ہے

سمجھ نہ لیں حرم و دیر کم سواد کہیں

یہ کیا کیا یہ کہاں چھوڑ آئے نقشِ قدم

عجیب سا کیوں ہے؟ بے معنی کیسے ہے؟ سوال یہ ہے کہ شعر میں تخاطب کس سے ہے؟ عرض ہے کہ تخاطب خود اپنی ذات سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ کم سواد کسے سمجھیں؟ عرض ہے کہ کسی کو نہیں۔ یہ تو صرف ایک اندیشہ ہے جو حرم و دیر میں نقشِ قدم چھوڑنے پر شاعر کے دل میں پیدا ہوا ہے کہ کہیں اسے کم سواد نہ سمجھ لیا جائے۔

زحافات کی رعایت سے فائدہ اٹھانے پر اوج "گنہگار" کی نظروں میں گنہگار ہیں۔ عرض ہے کہ بھیا! اساتذہ شعراء میں سے ہی سہی ایک آدھ شاعر کا ہی نام بتاؤ جو ایسی "مجبوری" سے پاک صاف گذر گیا ہو۔

رہا سوال داغؔ کی شوخی اور اوجؔ کے خوف و ہراس کا عرض ہے کہ داغؔ اپنے حالات اور زمانے کے ترجمان تھے اور اوجؔ اپنے حالات اور زمانہ کا ترجمان ہے۔

تاجور سامری۔ دہلی

میرے ان دیکھے دوست اعظم راہی۔ آپ کو پہلی مرتبہ یہ خط لکھ رہا ہوں اور اس کا ذریعہ بھی آپ کا پیکر ہے آپ کے مضمون "ادب اور غداروں کے مکروہ چہرے" سے مجھے بڑی حد تک اتفاق ہے لیکن آپ نے سرِ ورق پر کیا چھپوا دیا ہے؟ اس سے اس مقالہ کی تردید ہوتی ہے۔ ممکن ہے آپ مجھے جانتے ہوں۔ میں ایک گمنام اور گوشہ نشین شخص ہوں اور اپنے نظریۂ حیات کے کارن اکیلا ہوں۔

راہی قریشی۔ گلبرگہ

پرکاش فکری کے مصرعہ ؎

"زخم گہرا وہ مجھے جائے گا دے کر اب کے"

میں تعقید کا عیب بری طرح کھٹکتا ہے۔ عزیز الرحمان
نے اپنی غزل میں "پتھر بہ دست" استعمال کر کے
اردو اور فارسی زبانوں کی زبردست خدمت انجام
دی ہے۔ اب اس کے اتباع میں "اینٹ بدست"
یا "ڈھیلا بدست" سے بھی غزل کی توقیر کی جا سکتی ہے
شفیق حیدرآبادی کا مطلع ہے ؎

ستم پہ ناز اگر ہے تو کیجئے گا ستم
کہ ہر ستم کو بھی سمجھیں گے ہم تمہارا کرم

اس میں "کیجئے گا" کے ساتھ "آپ کا" ہونا
چاہیئے۔ کیونکہ "تم کیجئے" کوئی نہیں بولتا۔ "آپ
کیجئے" بولتے ہیں۔

مقبول سلیم۔ ناندیڑ

آپ کے پرچے نے بہت ہی کم عرصہ میں بہت ہی
زیادہ ترقی کر لی ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی
ہے مگر سرخیاں لکھنے والے صاحب کا تو جواب
ہی نہیں۔ اردو کے بہت ہی کم میگزین سرخیوں کی
طرف دھیان دیتے ہیں۔

آپ کے زاویے "ادب اور غداروں کے مکروہ
چہرے" پڑھے۔ پسند آئے۔ مضمون جہاں بہت
سی چیزیں سوچنے کے لئے فراہم کرتا ہے تو وہیں
بہت سی ایسی چیزوں کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے
جس کو ناپختہ ذہن اپنائے ہوئے ہیں۔ پچھلے ماہ ــــ
نذیر اختر کے خط کا یہ جملہ "ہندوستانی ادب میں عرف فرد"

"فرد کی ذات" ذات کے کرب کے احساس [illegible]
احساس کے اظہار کا نام ہے۔" ماہنامہ کتاب کے
مضمون سے لیا گیا تھا۔ اس میں غلط "عرف" کا
اضافہ کیا گیا ہے جس نے پورے جملے کے مضمون
میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔

شفیق۔ سہسرام

"پیکر" بہت خوبصورت اور معیاری ہوتا جا رہا ہے
لیکن بھی تخلیق کا نام اور فنکاروں کا نام جس
انداز میں لکھوا رہے ہو، وہ اچھا نہیں لگتا۔ معلوم
ہوتا ہے کسی بچے نے لکھا ہے۔
کرشن چندر کا افسانہ بہت اچھا ہے۔ بہت دنوں
بعد ایک اچھا افسانہ پڑھنے کو دیا ہے۔

شمیم فاروقی۔ رانچی

آپ کا مضمون "ادب اور غداروں کے چہرے" کافی
چونکا دینے والا ہے۔ کرشن چندر اور آمنہ ابوالحسن
کی کہانیاں پسند آئیں۔ غزلوں میں مظہر امام، پرکاش
فکری کی تخلیقات نے متاثر کیا۔ عادل منصوری اور
ندا فاضلی کی نظمیں اچھی لگیں۔

شان بھارتی۔ بھوا

اپنی تخلیق کو اہمیت دے کر بھیجئے کی بات سمجھ
میں نہیں آئی۔ اگر اہمیت تحریر بھی کر دی جائے
تو کیا آپ اسے بالکل بے چوں و چرا قبول فرمائیں گے؟

★ تخلیق کو اہمیت دینے سے مراد یہ ہے
کہ اپنی تخلیق صاف ستھرے کاغذ کے ایک طرف
حاشیہ چھوڑ کر لکھی جائے اور گھسیٹنے کی بجائے واضح
تحریر درج ہو۔ ہمارے بیشتر قلمکاران باتوں کو اہمیت [illegible]

آندھراپردیش میں اُردو کے ساتھ جو ناانصافیاں کی جارہی ہیں، اب
یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں! ایک
مدت سے طلبہ ریاست میں اردو کالجس اور اردو میڈیم جماعتوں
کے قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں طلبہ کی
انجمنیں بھوک ہڑتال اور مظاہرے بھی
کرچکی ہیں۔
لیکن انجمن ترقی اُردو کی خاموشی اردو حلقوں میں
سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ اُردو کی حق تلفی پر روزانہ اخبارات میں
خبریں شائع ہورہی ہیں
اُردو حلقوں اور عوام میں ایک بے چینی سی پھیلی ہوئی ہے۔ اس موقع پر
ریاستی انجمن ترقی اُردو کے عہدیدار
اُردو کے جائز حق کے لیے لڑنے کے بجائے انتخابات
لڑنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں
ہوسکتا ہے اس موقع پر اُردو کے نام پر انجمن کے عہدیدار
اخباروں میں
اپنے نام نہاد، بیزارکن بیانات
کا سلسلہ شروع کردیں
مگر اُردو کے بہی خواہوں کو اب ان پر بھروسہ کرنے کے بجائے موجودہ
بحران کو اپنے طورپر دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے

— پیکر حیدرآباد

سندھی زبان، عربی رسم الخط

تیسری کل ہند سندھی کانفرنس پچھلے دنوں اجمیر میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سندھی زبان کے لئے عربی رسم الخط کو قائم رکھا جائے۔ کانفرنس میں شرکت کرنے والے (۵۰۰) وفود میں سے تقریباً ۸۰ فیصد نے عربی رسم الخط کو برقرار رکھنے کے حق میں رائے دی۔

دیوناگری رسم الخط کی تائید میں صرف دس فیصد ووٹ آئے۔ یہ کانفرنس آل انڈیا سندھی سیوا سنگھ کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں سندھی رسم الخط کی تبدیلی کے نزاعی مسئلے پر خصوصیت سے غور کیا گیا۔ کانفرنس نے ایک قرارداد بھی منظور کی جس میں مرکزی حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ رسم الخط سے متعلق کانفرنس کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔ کانفرنس نے حکومت سے فی الفور سندھی ادبی بورڈ کے قیام کا بھی مطالبہ کیا اور درخواست کی کہ عربی رسم الخط کے ساتھ سندھی زبان کو ہندوستان میں پروان چڑھانے کے لئے ایک کروڑ کی رقم مہیا کی جائے۔

پاکستانی افواج: اعداد و شمار

۱۹۶۵ء کے بعد پاکستان نے اپنی افواج میں کس قدر اضافہ کیا ہے؟ انسٹی ٹیوٹ آف ڈیفنس اسٹیڈیز اینالسس نے اس بارے میں ایک مواد مرتب کیا ہے اس کے مطابق پاکستان نے اپنی گراؤنڈ فورسس میں (۹۰) فیصد اضافہ کیا ہے۔ پاکستان کی بری فوج کی تعداد (۳۹۲۰۰۰) نفوس پر مشتمل ہے جب کہ ۱۹۶۵ء میں ان کی تعداد (۲۰۸۰۰۰) ہی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستانی فوج میں انفنٹری کے (۶) ڈویژن تھے جبکہ اس وقت اُس کے ہاں انفنٹری کے (۱۲) ڈویژن موجود ہیں۔ پاکستان کے ہاں ۱۹۶۵ء کی طرح اب بھی دو بکتر بند ڈویژن اور ایک بکتر بند بریگیڈ موجود ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں بکتر بند ڈویژن (ARMOURED DIVISION) کے ہاں تمام پیٹن ٹینکس یا جبلیے اور بکتر بند بریگیڈ کے پاس شرمن ٹینکس تھے۔ بعد ازاں انھوں نے چین سے (T-59) ٹینکس، سوویت یونین سے (T-55) ٹینکس اور بعض دوسرے ذرائع سے مزید پیٹن ٹینکس بھی حاصل کئے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران پاکستان کو جو نقصانات برداشت کرنا پڑے اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے ہاں اس وقت ایک بکتر بند ڈویژن ہے جو زیادہ تر (T-59 اور T-55) ٹینکس پر مشتمل ہے اور اس کے علاوہ پیٹن ٹینکس کا ایک ڈویژن بھی اس کے ہاں موجود ہے۔ اس نے شرمن ٹینکس کی بجائے پیٹن ٹینکس ہی حاصل کر لئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پاکستان نے ۱۹۶۵ء کے بعد سوویت یونین سے (۱۳۰) ملی میٹر کے (۲۰۰) میڈیم گن اور چین سے تقریباً (۳) ڈویژنز کے لئے فوجی سامان اور آرٹیلری حاصل کر رکھی ہے۔ پاکستان نے اپنی مسلح افواج کے تقریباً پانچ ڈویژن کو بنگلہ دیش روانہ کیا ہے اور اس کی بقیہ افواج مغربی پاکستان میں متعین ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً (۲۵۰۰۰) فوجی "آزاد کشمیر" کے بھی پاکستان

۴۰ پیکر حیدرآباد

[illegible]

بحریہ: ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی بحریہ میں (۸۰۰۰) نفوس شامل تھے جبکہ ۱۹۸۸ء میں ان کی تعداد بڑھ کر (۱۰۰۰۰) تک پہنچ چکی ہے۔ ان میں (۲۰ تا ۲۵) فیصد بنگالی باشندے شامل تھے جو زیادہ تر بحریہ کے فنی شعبوں سے وابستہ تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں علیحدہ کر دیا گیا ہے اور ان کی جگہ اب ان شعبوں میں مغربی پاکستان کے باشندوں کو متعین کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے ہاں ایک آبدوز کشتی تھی۔ اس دوران اس نے فرانس سے مزید تین آبدوز کشتیاں حاصل کر لی ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان بحریہ میں ایک ہلکا کروزر، دو تباہ کن جہاز، تین ڈسٹرائر اسکارٹس، دو تیز رفتار آبدوز شکن فریگیٹس اور آٹھ مائن سویپرس تھے۔ وہ اس وقت بھی جوں کے توں اس کے پاس موجود ہیں۔ یہ بھی اطلاعیں موصول ہوئی تھیں کہ پاکستانی بحریہ کے قبضہ میں میڈجیٹ آبدوز کشتیاں بھی ہیں جو اپنے محاذ سے (۲۰۰ تا ۳۰۰) میل کے فاصلہ تک نشانہ لگا سکتے ہیں اور جہازوں کو تباہ کر سکتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پاکستان نے اس قسم کی (۱۲) آبدوز کشتیاں اٹلی سے حاصل کی ہیں۔

فضائیہ ۱۹۶۵ء میں پاکستانی فضائیہ میں (۲۰۰) لڑاکا طیارے شامل تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اب اس کے ہاں (۲۸۵) لڑاکا طیارے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے تمام لڑاکا طیارے امریکہ سے حاصل کردہ تھے۔ اس وقت پاکستان کے ہاں چین سے حاصل کئے ہوئے (مگ-۱۹) فائٹر بمبار اور تقریباً (۲۶) فرانسیسی میراج فائٹر بمبار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان ایرفورس نے مزید (۳۰) میراج پہلے ہی فرانس کو آرڈر دے رکھا ہے مگر کہا جاتا ہے کہ فرانس کو اسلحہ کی سربراہی پر فرانسیسی حکومت کے امتناع کے باعث پاکستان کو اس کی سربراہی نہیں ہوئی ہے۔

مارینر ۹ اور مریخ

مریخ کے مدار میں امریکہ کے مارینر ۹ کے ساتھ ساتھ سوویت یونین کا خود کار خلائی اسٹیشن مارس ۲ بھی داخل ہو گیا ہے۔ مارینر ۹ کا وزن ۹۹۰ کیلوگرام ہے۔ جبکہ روس کا خلائی جہاز اس سے کئی گنا زیادہ وزنی ہے۔ یہ دونوں سیارے چھ ماہ کی مسافت طے کرنے کے بعد مریخ کے مدار میں داخل ہوئے ہیں اور روس نے اپنے خلائی اسٹیشن سے ایک کیپسول مریخ کی سطح پر اتار دیا ہے۔ جس نے وہاں پہنچ کر سوویت پرچم لہرا دیا ہے۔

روس کا ایک اور خلائی اسٹیشن مارس ۳ عنقریب مریخ کے مدار میں داخل ہو جائے گا۔ روسی سیاروں کے تعلق سے معلومات مفقود ہیں اس لئے ہم یہاں مارینر ۹ کی تفصیلات دے رہے ہیں۔ امریکہ کا خلائی جہاز مارینر (۹۰) دن تک مریخ کے مدار میں گردش کرتا رہے گا اور وہ انتہائی ترقی یافتہ اور حساس آلات سے لیس ہے جن میں بعض طاقتور ٹیلی ویژن کیمرے بھی شامل ہیں۔ یہ کیمرے آئندہ تین ماہ کے دوران ۱۳۸۰ کیلو میٹر کی اونچائی سے مریخ کے ابر، اس کی سطح اور دوسرے طبعی حالات کے تعلق سے مسلسل کھوج کرتے رہیں گے۔ ایسی اشیاء کی بھی شناخت کر سکیں گے جن کا قطر صرف ۵۰ میٹر ہی کیوں نہ ہو۔ زمین کے مدار کے پرے مریخ ہی زمین سے چونکہ سب سے قریبی سیارہ واقع ہوا ہے اور کچھ تو اس کے سرخ رنگ کے باعث نظام شمسی کے دوسرے

پیکر حیدرآباد ۹

سیاروں کے مقابلہ میں ہمیشہ سائنسدانوں نے مریخ سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ بعض حیثیتوں میں زمین اور مریخ میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ جب مریخ زمین سے بالکل قریب ہوتا ہے تو زمین سے اس کا فاصلہ ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ کیلو میٹر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ سوائے زہرہ (وینس) کے زمین سے بالکل قریب ہوجاتا ہے۔ مریخ، مشتری (جوپیٹر) سے بھی زیادہ روشن یا تابناک ہے اور نہ صرف اپنی روشنی کے باعث بلکہ اپنے سرخ رنگ کی وجہ اپنی انفرادیت کا حامل ہے اور اسی لئے رومیوں نے اسے جنگ کے خدا کا نام دیا تھا۔ مریخ کا قطر ۶۷۹۰ کیلو میٹر ہے اور کرۂ ارض کے مقابلہ میں ½ سے کچھ ہی زائد ہے۔ اسی لئے مریخ کی کشش ثقل کرۂ ارض کی کشش ثقل کے مقابلہ میں صرف ⅓ ہی قرار دی جاتی ہے۔ قبل ازیں مریخ کو روانہ کئے جانے والے مارینر خلائی جہازوں نے پتہ لگایا ہے کہ مریخ پر فضائی یا ہوائی دباؤ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ کرۂ ارض پر ۳۰ ہزار میٹر کی بلندی پر ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر تقریباً خلا ہی پایا جاتا ہے۔

یونسکو

یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن (U.N.E.S.C.O) کا قیام ۱۹۴۶ء میں عمل میں آیا۔ یہ اقوامِ متحدہ کا ایک اہم ذیلی ادارہ ہے جس کی رکنیت دنیا کے تقریباً (۱۲۵) ممالک پر مشتمل ہے۔ اقوامِ متحدہ کے اس تعلیمی سائنسی اور تہذیبی ادارہ کی تنظیمی ہیئت اس طرح تشکیل دی گئی ہے کہ اس کے رکن ممالک کی ایک جنرل کانفرنس دو سال میں ایک مرتبہ منعقد ہوتی ہے۔ یونسکو کا بنیادی

۱۰ ایکڑ حیدرآباد

مقصد جیسا کہ اس کے دستور میں صراحت [illegible] عالم کے درمیان تعلیم، سائنس اور کلچر کے [illegible] کو فروغ دے کر بین الاقوامی امن کو مستحکم کرنا ہے۔

اس کے علاوہ کلیرنگ ہاؤس سرویسز، غیر حکومتی ادارہ جات کو امداد اور مختلف موضوعات پر کتابیں بھی یونسکو شائع کرتا ہے۔ اس کے رکن ممالک کی درخواست پر راست امداد بھی دی جاتی ہے۔ اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ اس کا دو سالہ بجٹ (۷۷ء۴) ملین ڈالر پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس عرصہ میں یونسکو، اقوامِ متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے تحت تقریباً (۵۹ء۶) ملین ڈالر بھی صرف کرے گا۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح یونسکو ہندوستانی عوام کو بیرونی ممالک میں فنی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے فیلوشپس مہیا کرتا ہے۔ یونسکو نے ہندوستان میں فنی اور سائنسی تعلیم کی ریسرچ کی ترقی کیلئے کئی ایک بڑے پراجکٹس شروع کر رکھے ہیں۔ اس طرح یو۔ این۔ ڈی۔ پی کے ایک خصوصی فنڈ کے تحت یونسکو نے گذشتہ کئی سال سے تقریباً (۳۰) بیرونی پروفیسروں کی خدمات جدید قسم کے سامان اور فیلوشپس کے ذریعہ درگاپور، الہ آباد، ورنگل، بھوپال، ناگپور، جمشید پور اور منگلور کے ریجنل انجینئرنگ کالجوں کی مدد کی ہے۔

الغرض جہاں سیاسی میدان میں اقوامِ متحدہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا ہے وہیں یونسکو جیسے ادارہ نے قابل قدر کام کیا ہے۔

ڈالر بحران امریکہ نے ڈالر کی شرح تبادلہ میں ۱۰ فیصد سے زیادہ کمی کا اعلان کر دیا ہے۔ ●●

زمین قسطوں میں مر رہی ہے

وہاب دانش
لوور بازار۔ رانچی (بہار)

نہ کوئی لمحہ، نہ کوئی ساعت اٹل
کہ جس کے برہنہ لب سے
لذیذ باتوں کا عکس پھوٹے

جو آئینہ تھا، وہ ریزہ ریزہ
بکھر کے مٹی میں مل چکا ہے
تمام چہروں کو بے یقینی کی زرد دیمک نے
انتہائی سے زاویوں میں
جگہ جگہ سے کتر لیا ہے

عجیب دلدل
عجیب گہری ذلیل کھائی
تمام جسموں کے آگے پیچھے
جو راستہ ہے وہ تنگ اتنا
کہ تھرتھراتی سی پنڈلیوں سے
سیاہ بوندوں کا درد جاری
نہ سانس اتنی بلند و برتر
کہ بھول جائے ہوا کی چھاتی

تمام زندہ ـــــ تمام مردہ
قدم جمائے زمین کے مرکز پہ تھم گئے ہیں
سیاہ لمحوں کی قبر اوڑھے

غزل

گردِ سرے نہ فصیلیں ترے کام آئیں گی
کچھ ہوائیں تو مری سمت مدام آئیں گی

یہ مسافت کہ چلے جائے گی رستہ رستہ
منزلیں یوں تو نئی گام بہ گام آئیں گی

کچھ تو دل آپ ہی بجھتا سا چلا جاتا ہے
اور ـــ کیا کیا نہ ہوائیں سرِ شام آئیں گی

اس اندھیرے میں نہ اک گام بھی رکنا یارو
اب تو اک دوسرے کی آہٹیں کام آئیں گی

بین کرتی ہوئی سمتوں سے نہ ڈرنا باقی
ایسی آوازیں تو اس راہ میں عام آئیں گی

باقی
۲۶/۱۶۰، راجندر نگر
نئی دہلی ۔ ۶۰

پیکر حیدرآباد ۱۱

نہ جانے کس ستم ظریف نے اس بستی کا نام آدرش نگر رکھ
دیا تھا۔ ورنہ چہار اطراف سے بے رونقی اور نحوست ٹپکتی ہوئی
پہاڑی گھری اس گھری پہاڑی کھنڈ میں آباد بستی میں کوئی بھی اصول یا
آدرش نہیں تھا۔ جس طرح زمین دوز نالے میں کثرت سے چوہے ہیں
ٹھیک اسی طرح کیچلی، سرکیرے، اور یوں لگتا ہے کہ گھروں کی اپنی
چار دروں اور گلی اینٹوں سے بنی کوٹھریاں ہیں جن میں سب لوگ اس
برس سے یہاں رہ رہے تھے۔ نیشنل ہائی وے آبادی کے بیچ کو چھوتا ہوا
ہیں چاروں طرف سے گزر جاتا ہے مگر کسی نے کبھی اس انسانی
مرگھٹ میں سے اٹھنے والے دھوئیں کے سوا آدرش نگر کا کچھ نہیں
دیکھا تھا۔

آدرش نگر جہاں کاروباری رقابتیں تھیں۔ خاندانی دشمنیاں
تھیں۔ اغوا سے زنا تک کے جرائم ہوتے تھے۔ جوا بھی چلتا رہتی
تھی۔ لوٹ کا مال بکتا تھا۔ معصوموں کے سودے ہوتے تھے۔ چاقو زنی
اور جیب تراشی کے مزے تھے۔ موت کا دھندا تھا اور جہاں
پلنے والے پلیگ کے چوہے اپنے جراثیم نواحی آبادیوں میں پھیلاتے
رہتے تھے۔

آدرش نگر جہاں بھجو بھڑوا رہتا تھا جو پاکٹ ماری کرواتا تھا جو
بکنی طوائف کے لئے بکنگ کرتا تھا۔ بکنی جسے وہ میرٹھ کی ایک
طوائف سے خرید کر لایا تھا لیکن بکنی جو اس کے بس کی بات نہیں
تھی جو منہ زور گھوڑے کی مانند سوار کو ہی الٹ دیتی تھی۔ اس
لئے بھجو نے اسے بیوی کی بجائے بیلائی کا مال اور روزی کا
ذریعہ بنا لیا تھا۔ بکنی جو کسی ہرنی کمان کی طرح جوان تھی۔ جو دھڑلے
سے بیڑی اور شراب پیتی تھی اور نشے میں بہک کر وہ گالیاں
بکتی تھی کہ اس طرف گشت لگانے والے سپاہی بھی اس

م۔ک۔ مہتاب
(WZ) 434 شیونگر
نئی دہلی - 18

[illegible] ہو کر کھلے عام [illegible]
تو پولیس کی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ سب
سے کہتی تھی یہ جاؤ [illegible] اور یہ کسی حد تک
درست تھا کیونکہ بھت تو اپنی کوٹھری سے بہت کم نکلتی تھی
اس کی سب ضروریات بجری ہی پوری کیا کرتا تھا۔

اس بستی میں بجاتو دادا کالا نامی رہتا تھا۔ جس کا اصل نام کیا
کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھی کالا نامی کہتا تھا۔
شاید اس کا اصل نام کوئی تھا ہی نہیں بجز نام میں کیا رکھا
ہے۔ آپ کسی کو کریم کہہ لیں یا کالا نامطلب تو اُس کی توجہ
اپنی جانب مبذول کرنا ہے۔ پولیس کچہری والے بھی اُسے
اسی نام سے پکارتے اور لکھتے تھے وہ اپنے کام میں
ایسا ماہر تھا کہ اگر بستی کے دور دور میل کے دائرے میں کہیں
بھی جاتو چل جائے پولیس شبے میں اُسے ضرور بلا بھیجتی
تھی۔

کالا نامی بستی میں تیار ہونے والا دیسی دارو بھی بستی کے مزدوروں
اور نواحی بستیوں کے حاجتمندوں کو مہیا کرتا تھا۔ کالے
اور کنجی میں ان بن رہتی تھی کیونکہ کنجی کالے کو پیٹھ پر ہاتھ
نہیں رکھنے دیتی تھی۔ کالے اور جھبو میں دشمنی تھی کیونکہ جھبو
کنجی سے بات کرنے کی جی فیس مانگتا تھا۔

بستی میں شریفا بدمعاش بھی رہتا تھا جو شہر میں پھر کر
لڑکے ورغلاتا اور انہیں پاکٹ مارنا سکھاتا۔ اُس کا
عام دائرہ کار بس سٹینڈ اور ریلوے پلیٹ فارم تھے
شریفے کی کالے اور جھبو دونوں سے نہیں بنتی تھی کیونکہ
اُن دونوں سالے شریفے کے کچھ شاگرد ورغلا کر پاکٹ

[illegible] ہو گئے تھے۔

بستی میں شرفا بھی بستے تھے اور بدمعاش بھی۔ مہذب
بستیوں اور آدرش نگر میں فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں
نچلے درجے کے بدمعاشوں کو شریف کہا جاتا تھا۔ ان میں
دشمنیاں تھیں کاروباری رقابتیں تھیں۔ ہر فرد بجائے خود
ایک کردار تھا۔ ہر روز پولیس ادھر گشت کرتی تھی کیونکہ
کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب آدرش نگر کا کوئی
فرد کسی واردات کے سلسلے میں تھانے طلب نہ کیا گیا ہو۔

لیکن یہ جرائم تو بستی کی زندگی کا تازہ خون تھے جس پہ یہ معاشرہ
پل رہا تھا۔ جب بستی میں کچھ نہیں ہوتا تو جھبو زور سے گالی دے کر
کہتا: "اب اس بستی پر ضرور کوئی آفت آئے گی۔ سب
شریف ہو گئے سالے۔"

بستی کے شرفا مثلاً بھٹی چلانے والوں، جھگیوں میں بیٹھ کر
ملاوٹیں کرنے والوں، مزدوروں اور ارد گرد کی بستیوں
میں چوریاں کرنے والی عورتوں اور مردوں میں بھی چشمک
رہتی۔ اور نہیں تو پانی کے نل پر تھم گتھا عورتیں ہوتیں۔ خوب
بالٹیاں چلتیں۔ کنجی دروازے پر ٹاٹ ہٹا کر کالے
کو آواز دیتے ہوئے کہتی۔
"ابے کالے! دیکھ تو کیسے بدمعاش کہلاتے ہیں۔ ذرا بستی
کے شریفوں کا حال بھی دیکھ لے۔"

یہ جھگڑے اور پولیس کے چکر تو بستی کا معمول تھے۔ ہاں اب
کچھ دنوں سے ساری بستی میں خوف و ہراس کی ایک لہر

پھیلی ہوئی تھی جس سے شریف بھی پریشان تھے اور بدمعاش بھی۔ گلیوں میں دھندلی بتیوں کے نیچے میٹنگیں ہوئیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا۔ گذشتہ پانچ برسوں میں کمیٹی آدرش نگر والوں کو کئی نوٹس دے چکی تھی کہ بستی خالی کر دو یہاں شہر کی خوبصورتی کے لئے جھیل بنے گی، کھیل کا میدان بنے گا کلب بنے گا باغ لگے گا۔ لیکن یہ لوگ نوان پڑھ تھے نوٹس کے کاغذ پر تھوکتے اور اُسے نالی میں پھینک دیتے۔ مگر اب تو کچھ دن سے کمیٹی میں کوئی دبنگ قسم کا افسر آگیا تھا اس نے آخری نوٹس بھیج دیا تھا کہ فلاں تاریخ تک سب لوگ بستی خالی کر کے شہر سے پانچ میل دور کے گاؤں چلے جائیں جہاں اُن کے لئے پکے کوٹھے بنا دیئے گئے ہیں۔ حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں کمیٹی انہیں زبردستی اٹھا کر وہاں لے جائے گی۔

جھجو نے گالیاں بکتے بکتے نوٹس کجن کو سنایا اور پاؤں کے نیچے مسل دیا۔ کجن نے بیڑی کا آخری کش لیکر بیڑی نالی میں پھینکی اور ایک نہایت غلیظ گالی دیکر بولی۔

"جھجو تو ایک رات اُس افسر کو ادھر لا تو۔ صبح کان پکڑ کر بستی سے نہ نکلے تو کہنا۔ بڑا آیا ہے لاٹ صاحب کا بچہ۔ اس کے باپ کی بستی ہے یہ کہ وہ یہاں جھیل بنائے گا۔ ہم نے یہ بستی بسائی ہے ہم یہاں جیسے چاہیں رہیں، اس کی ماں کا کیا اکھڑتا ہے۔ ابے کالنے" وہ سامنے جھگی میں بیٹھے کالے کو آواز دیتے ہوئے بولی۔ "کہاں مر گئے ہیں سبے شہر کے چاقو والے اب بھیر نا اس لاٹ صاحب کی انتڑیوں میں جو ہمارے گھر گرانے آرہا ہے۔ اُس حرامی سے پوچھو کہ گاؤں میں اس کا باپ آئے گا میرے پاس؟"

۱۴ اپریل حیدرآباد

کہنے نے دیا سلائی سلگا کر پاؤں تلے مسل ڈالی ... لگا ۔

"تیری ماں کا آلو بخارہ۔ جب نشے میں ہوتی ہے تو کرنٹ مارتی ہے۔ آج نشہ اتر گیا ہے تو لگی ہے کالے کو مدد کے لئے پکارنے۔ ابے جا نا بجو کر جو بڑی کینچن کھاتا ہے کتے کی اولاد کہتا تھا تمہاری جھگی گرا دوں گا۔ کینچن ونیکس نہیں دیتا۔ جیسے یہ بستی اس کے باپ کی جاگیر ہو۔ سالے تو کالے کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر میرا خوف نہ ہوتا تو یہ بستی کب کی اٹھ چکی ہوتی۔ جا جا کر کمیٹی والوں سے کہہ دے جس کی ہمت ہے وہ کالے سے پنجہ لڑا کر دیکھ لے۔"

"زبان سنبھال کر بات کر کالے۔" بجو کو غصہ آگیا۔ "انتڑیاں گلی میں بچھا دوں گا۔ مجھے معلوم ہے جس بدذات شریفے کی شہ پر تو اکڑ رہا ہے۔ وہ کتے کا جنا تو پولیس کا ٹاؤٹ ہے۔ دیکھ لینا کسی دن تیری گردن بھی کٹوا دیگا۔"

اتنے میں شریف بھی لالو کبابی کے ساتھ وہاں آپہنچا۔ دونوں کے ہاتھوں میں کمیٹی کے نوٹس تھے۔ شریفے نے بجو کی زبان سے اپنا نام سن لیا اور معاملے کی تہہ تک پہنچے بنا ہی گالی بکنے لگا۔

"کون ہے ماں کا خصم شریفے کی بات کرنے والا ہم نے دیکھے ہوئے ہیں سب چوہدری۔ خود تو رنڈیوں کی کینچن کھاتے ہیں اور لوگوں کو پولیس کا ٹاؤٹ بتاتے ہیں۔ دیکھوں گا اب سب کتنے کتنے پانی میں ہیں۔ لے آگیا ہے تیرا باپ کوئی بڑا افسر۔ اٹھا اب اپنے باپ کی جاگیر اور چل نئے گاؤں۔ اب یہ تیری ماں بھی تجھے نہیں بچا سکے گی۔"

شریفے لالو نے آنکھوں میں بھر کے نوٹس
کلو کے سامنے پھینک دیئے۔ کجن نے نئی بیڑی سلگائی
اور اپنے کھلے بالوں کا مٹھا سا جوڑا سر پر لپیٹتے ہوئے
جھٹ کلو کی مدد پر بول اٹھی۔
"گندے کیوں بکتا ہے بے گبھرو کی اولاد۔ چھجو تیری ماں کا۔
... چودھری نہیں تو اس کے پاس کیا فیصلہ کرانے آئے
ہو۔ جاؤ نا بہت لوکنی ہے۔"

دونوں ہاتھوں سے سر پر جوڑا لپیٹتے ہوئے کجن کا جنبھر کے
بات جیسا سینہ قدرے بے نقاب ہو گیا اور کالے
بلاؤز کا نچلا حصہ بھی کسی ہوئی کمر سے کافی اونچا اٹھ آیا۔
الو کبابی کی گرسنہ نگاہیں کجن کے سرخی مائل سپید
گوشت میں گڑ گئیں اور وہ بھولے ہوئے ہونٹوں پر زبان
پھیرتے ہوئے بولا۔
"بھائی! آپس میں کیوں لڑتے ہو کالے۔ میری مانو تو سب
نوٹس اکٹھے کر کے ایک رات کجن کے ہاتھ کمیٹی کے اس
افسر کے پاس بھیج دو۔ دیکھو پھر تمک کام ٹھیک ہوتا
ہے یا نہیں۔ مجھے بھی عمر بھر کا تجربہ ہے۔ اس بھڑوے
نے ایسا کباب کب کھایا ہوگا؟"
"کچھ شرم کر بے کمینے" کانا لالو پر جھپٹ پڑا۔ "کجن
ہماری بستی کی عزت ہے۔ تیرا مطلب ہے ہم سب
مر گئے ہیں کیا؟"

چھجو منہ سے کچھ نہ بولا۔ مگر غصے میں اس کی آنکھیں سرخ
ہو گئیں۔ اس نے دیسی شراب کی خالی بوتل الو پر پھینکی
مگر وہ وار بچا گیا اور بولا— "چودھری ناراض کیوں
ہوتے ہو۔ اگر یہاں تم نہیں رہ سکتے تو چپکے سے بوریا بستر
لپیٹو اور چلے جاؤ گاؤں۔ وہاں سب ایک مکان اور
باعزت شہری بن جائیں گے۔ یہیں کہیں گھر کے مکان
میں گے۔ چھوڑو اس نوٹس بازی کو۔"
"ابے شریفے! تو آج سویرے سویرے کس حرامی کی اولاد کو ساتھ
لے آیا ہے۔ بڑا آیا ہے وزیر کا بچہ ہمیں مشورے دینے
جیسے ہم تو یہاں سب پاگل کی اولاد بیٹھے ہیں۔ اس
بے وقوف سے پوچھو کہ مکان تو وہ بناتا ہے جس نے
اولاد کے لئے جائداد چھوڑنی ہو۔ ابے، تو کل دم پہ آیا
تو کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کس کی اولاد ہے۔ وہ کس کے
لئے جائداد بنائے گا۔ کانے کو جاتا اور بنیئے کے لئے
شکار چاہیئے۔ کجن کو تازہ گراہک نئے اپنے مطلب کے
آدمی درکار ہیں۔ شریفے کو اپنے سکول کے لئے لونڈے
اور دارو کے خریدار چاہئیں کیا وہ تیرا باپ وہاں سپلائی
کرے گا۔ البتہ تیرے کباب وہاں بکتے رہیں گے مگر
ہم بھوکے مریں گے تو تیرے کباب بھی کون خریدے گا۔"
چھجو چودھری نے گویا اپنا فیصلہ دے دیا۔

"میں نے تمہاری سب کمیٹیاں اور نجر دیکھ رکھے ہیں جو
تم اپنی خیر مناؤ چودھری۔ میرا تو مدراس میل کا ٹیم ہو رہا
ہے۔ میرے شاگرد سٹیشن پر چلے گئے ہوں گے۔" اور کانا
بیڑی سلگاتا ہوا گلی سے باہر چلا گیا۔
"یہ سب یونہی مرنا چاہتے ہیں تو انہیں مرنے دو۔ کبھی
بدمعاشوں میں بھی اتفاق ہوا ہے۔" الو نے شریفے
کو بازو سے پکڑا اور واپس لے گیا۔
نوٹس کی تاریخ آئی اور نکل گئی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ شاکو

کانا جھنتا گھاڑی کر کے لوٹا تو اس کی جیب اور سر بھاری
ہو رہا تھا۔ کنجن سج دھج کر دروازے کے ٹاٹ کے پاس
کھڑی تھی۔ کالی سوتی ساڑھی میں اُس کا گورا بدن چاند
کی مانند چمک رہا تھا۔ وہ کلائی پر بندھے موتیے کے
ہار کو بل دے رہی تھی۔ کانے نے اُسے آنکھ سے
اشارہ کیا اور جیب سے نوٹوں کی دستی نکال کر لہراتا
ہوا بولا۔
"کیا حال ہے بیگم۔ آج یہ سب نوٹ تمہارے
ہو سکتے ہیں۔"
"جا جا۔ یہ حرام کی کمائی کسی اور کو کھلا۔"
"کنجن دیکھ لے۔ کانا آج تو تیری منت کر رہا ہے۔ چاند
سدا نہیں چمکے گا۔"
"کیوں تو مجھے جا تو مار دے گا کیا۔ بلاؤں جمو کو۔"
"تو تو خود ہی جا تو ہے میری جان۔ جا تو بیچارا تو کیا چلے
گا۔ ہاں دیکھ لیا نا کانے کا اثر رسوخ۔ کانے سے
کمیٹی تو کیا خود سرکار بھی ڈرتی ہے۔ سب معاملہ فٹ
کرا آیا ہوں۔ ایک تو کتے کی دم ہے جس پر اثر نہیں ہوتا
لے لے نوٹ بھر موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔"
لیکن کنجن نے زور سے کانے کی جانب تھوک دیا اور جھگی
کا پردہ ہٹا کر اندر چلی گئی۔ کانا بھی اس کی جانب تھوک
کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا اور دارو پینے لگا۔

صبح ابھی کانا سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ بستی کے چاروں
طرف پولیس کی سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔ ٹین کے چھپر
دھڑا دھڑ گرنے لگے۔ مٹی اور گرد اڑنے لگی۔ ٹرک
بھر بھر کر بستی سے نکلنے لگے۔ ٹرک بھی ہڑتال دار
۱۶ ایپکر حیدرآباد

چادریں تھیں، گملے اور تختے تھے، بڑے [illegible]
اور بلیاں تھیں، تندور تھے، چارپائیاں تھیں [illegible]
کی کائیں تھیں، طوطوں اور چکوروں کے پنجرے تھے
خرگوش، مرغیاں، کبوتر اور بکریاں تھیں۔ معلوم ہو
تا تھا گویا ایک پوری تہذیب ایک جگہ سے اکھاڑ کر
دوسری جگہ لے جائی جا رہی ہے۔

رات کی تھکی ٹوٹی کنجن اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی تو اس کی
طرف جیسے بھونچال آ گیا تھا۔ معاملے کو سمجھا تو گھبرا گئی
ایک ٹرک کی طرف زور سے تھوک کر بولی۔
"آ گئے ہیں حرامی جاگیردار۔" پھر کانے کی جھگی کے
پاس جا کر آواز دی۔
"ابے کانے! اٹھ!! آ گئے ہیں تیرے ابو۔ ماں
کا خصم کہتا تھا۔ سرکار کی ہڈی پسلی برابر کر آیا ہوں۔"

کانا آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا
رہا اور بولا۔
"بیگم صاحبہ۔ دل کی آہ بہت بری ہوتی ہے۔ بستی
تو کیا پورے شہر کو جلا دیتی ہے۔ رات تو نے میری
بے عزتی کی۔ دکھی دل نے بددعا دی کہ سب کا بیڑہ
غرق ہو جائے اور دیکھ لو ہو رہا ہے۔"
"چل چل۔ بڑا آیا ہے، پیر فقیر کتے کی دم۔ وہ دیکھ
تیرے تاؤ اب تیرا مکان گرانے آ رہے ہیں۔ انہیں
بھی بددعا دے۔"

کنجن کا مکان گرنے لگا۔ کانے کے مکان اکھڑنے لگے۔ سامان

کانا بھنتا گالی گاڑی کر کے لوٹتا تو اس کی جیب اور سر بھاری ہو رہا تھا۔ کنجن سج دھج کر دروازے کے ٹاٹ کے پاس کھڑی تھی۔ کالی سوتی ساڑھی میں اس کا گورا بدن چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ وہ کلائی پر بندھے موتیے کے ہار کو بل دے رہی تھی۔ کالے نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا اور جیب سے نوٹوں کی دستی نکال کر لہراتا ہوا بولا۔

"کیا حال ہے بیگم۔ آج یہ سب نوٹ تمہارے ہو سکتے ہیں۔"

"جا جا۔ یہ حرام کی کمائی کسی اور کو کھلا۔"

"کنجن دیکھ لے۔ کانا آج تو تیری منت کر رہا ہے۔ چاند سدا نہیں چمکے گا۔"

"کیوں تو مجھے جیا تو مار دے گا کیا۔ بلاؤں جھجو کو۔"

"تو تو خود ہی جا تو ہے میری جان۔ جا تو بیچا تو کیا چلے گا۔ ہاں دیکھ لیا نا کالے کا اثر رسوخ۔ کالے سے کمیٹی تو کیا خود سرکار بھی ڈرتی ہے۔ سب معاملہ فیٹ کرا آیا ہوں۔ ایک تو کتے کی دم ہے جس پر اثر نہیں ہوتا لے لے نوٹ پھر موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔"

لیکن کنجن نے زور سے کالے کی جانب تھوک دیا اور جھگی کا پردہ ہٹا کر اندر چلی گئی۔ کانا بھی اس کی جانب تھوک کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا اور دارو پینے لگا۔

صبح ابھی کانا سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ بستی کے چاروں طرف پولیس کی سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔ ٹین کے چھپر دھڑا دھڑ گرنے لگے۔ مٹی اور گرد اڑنے لگی۔ ٹرک بھر بھر کر بستی سے نکلنے لگے۔ ٹرک جن پر تمام دار ۔۔۔

١٦ اپریل حیدرآباد

چادریں تھیں کی لُنگی اور تختے تھے۔ ۔۔۔ اور بلیاں تھیں، تندور تھے، چارپائیاں تھیں ۔۔۔ کی کابکیں تھیں، طوطوں اور چڑیوں کے پنجرے تھے خرگوش مرغیاں کبوتر اور بکریاں تھیں۔ ۔۔۔ تھا گویا ایک پوری تہذیب ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لے جائی جا رہی ہے۔

رات کی تھکی ٹوٹی کنجن اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی تو بو طرف جیسے بھونچال آ گیا تھا۔ معاملے کو سمجھا تو گھبرا گئی ایک ٹرک کی طرف زور سے تھوک کر بولی۔

"آ گئے ہیں حرامی جاگیردار۔" پھر کالے کی جھگی کے پاس جا کر آواز دی۔

"ابے کالے! اٹھ!! آ گئے ہیں تیرے ابا۔ ان کا خصم کہتا تھا۔ سرکار کی ہڈی پسلی برابر کر آیا ہوں۔"

کانا آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور بولا۔

"بیگم صاحبہ۔ دل کی آہ بہت بری ہوتی ہے۔ بستی تو کیا پورے شہر کو جلا دیتی ہے۔ رات تو نے میری بے عزتی کی۔ دکھی دل نے بددعا دی کہ سب کا بیڑہ غرق ہو جائے اور دیکھ لو ہو رہا ہے۔"

"چل چل۔ بڑا آیا ہے، پیر فقیر کتے کی دم۔ وہ دیکھ تیرے تاؤ اب تیرا مکان گرانے آ رہے ہیں۔ انہیں بھی بددعا دے۔"

کنجن کا مکان گرنے لگا۔ بھاگنے کے لیے کنجن اکھڑنے لگے سامان

اعتراض نہیں کرتا۔ بلکہ تھکا ہارا کانا شام کو لوٹتا تو کنجن اس کے پاس آ بیٹھتی۔

ایک شام کانا اور کنجن بیٹھے دودھ جلیبی کھا رہے تھے کہ کانے نے کنجن سے پوچھا۔

"کنجن ہمارا تو ادھر بھی کام اب فٹ ہو گیا ہے تمہارا بھی کچھ بنا ہے یا نہیں۔"

کنجن کافرادا انگڑائی لیتی ہوئی بولی: "خدا سب کا رازق ہے کانے — پتھر میں کیڑے کو رزق دیتا ہے تو کیا مجھے نہیں دے گا۔ اس بغل والی بستی میں تو آدرش نگر کے بڑے رئیسوں سے بھی موٹے سیٹھ اور عیاش بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک مرغی بھی مل جائے تو ہفتہ بھر اچھی گوشت روٹی چل جاتی ہے۔ اس ننگی بستی کے لئے تو ایک ایک روپے کے لئے نہ جانے کس کس کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔"

کانے نے اپنے حصے کی جلیبیاں کنجن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے زیادہ بھوک نہیں ہے تو اور جلیبی کھا لے۔"

"کانے مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔" کنجن جلیبی کا گرم رس انگلی سے چاٹتے ہوئے بولی۔ "یہیں اجڑ کر بستی کو کیا حاصل ہوا۔ ہم سب کے کام دھندے یہاں بھی چل نکلے ہیں۔ جو آدرش نگر میں روپیہ کماتا تھا یہاں سوا کماتا ہے۔"

"کنجن کی گندی بستی تو صاف ہو گئی ہے۔" کانے نے جواب دیا۔

"کہاں صاف ہو گئی ہے۔ پہلے بدبو [illegible] گردن پر آ گیا ہے۔ کمیٹی نے گندگی کا ڈرم ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا تو کون سا تیر مار لیا ہے۔ گندگی تو ہمارے اندر ہے ہم جہاں بھی جائیں گے بدبو ہی پھیلائیں گے پھر کمیٹی کے افسروں نے ان بچوں کو اور دھکے شاہی پر ہزاروں روپے کاہے کو خرچ کر ڈال دیئے؟"

"کنجن! تو تو آج بڑی عقل کی باتیں کر رہی ہے۔ یہ بھی بتا دے کہ ہماری عرض کب قبول ہو گی؟" کانے نے گڑوی میں سے اور دودھ کنجن کے گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جب تیرے دماغ کی گندگی صاف ہو جائے گی۔ جب تو کوئی شریفوں والا کام کرنے لگے گا۔" یہ کہتے ہوئے کنجن اپنے مکان کی جانب بھاگ نکلی۔

"کہاں جا رہی ہے کنجن۔ اری۔ اری یہ دودھ..." کانے نے اسے آواز دی۔

"وہ دیکھ۔ جمو ایک بابو کو لئے آ رہا ہے۔"

اور وہ اپنے دروازے کا بوریا ہٹا کر اندر چلی گئی —

■■

۱۹ پیکر حیدرآباد

جوابِ طلب امور کے لیے رفیوجی اسٹامپ کے ساتھ ڈاک کے ٹکٹ لگے ہوئے لفافے روانہ فرمائیے

حرف حکایت

خوش گلشن سے مہکتے ہوئے گل کی جانب
جب بڑھا دستِ طلب تو
یہ لبِ گل سے صدائیں آئیں
بکھری لمحوں کی ہے پابند مری زیست مگر
سو برس تک تو تمہیں جینا ہے
پھر یہ بوالہوسی کس طرح
لمحہ بھر کیلئے خوشبو کی طلب میں مجھ کو
توڑ کر شاخ سے
محبوب کی زلفوں میں لگاتے کیوں ہو
میری خواہش ہے جنوں
فاتحِ قلبِ انساں
روک لو دستِ طلب
ورنہ ناخن کی بھی ہلکی سی خراش
باعثِ مرگِ گلِ تازہ ہے
ویسے سورج کی تپش سے
کبھی جلتے ہیں پھولوں کے بدن
دولتِ درد بھی پھولوں کو عطا ہوتی ہے
ہم تو چپ چاپ ہر اک درد سہے جاتے ہیں
ہم سے اٹھتا نہیں احسانِ فغاں
روک لو دستِ طلب
بکھری لمحوں کی یہ پابندِ حیات
کامراں ہوگی اگر
سب میں مسرت بانٹے

ایچ۔ ایل۔ ناگے گوڑہ
ترجمہ حمید الماس
فیکٹریز اینڈ بائلرز آفس
انفنٹری روڈ۔ بنگلور۔۱

نجیب رامش
بورڈ آف
سکنڈری
ایجوکیشن بلڈنگ بھوپال

اک سلگتے صحرا سے اک سلگتے صحرا تک
یہ سفر کیا ہم نے، کوفۂ تمنا تک
کس سے جاکے مل آؤں، کس کے گھر پہ دستک دوں
دفتروں کی بھیڑ ہے، گم ہے گھر کا نقشہ تک
دل کی خیریت کہئے، کس کے روبرو جاکر
زخم زخم پھرتا ہے ان دنوں مسیحا تک
اسکے پاس بیٹھا ہوں اسکو یاد کرتا ہوں
کسقدر بدل ڈالا، وقت نے وہ چہرہ تک
میں بکھر گیا اس پر، اس قدر تعجب کیوں
آج کی صدی میں تو، ٹوٹتا ہے ذرہ تک
جانے کس کا قائل ہوں، کیسی بد دعا ہے یہ
تیرے ساتھ چل چل کر، تھک گیا ہے رستہ تک

اسلم عمادی

۳۰ - ۴ - ۱۰۶ ہمایوں نگر، حیدرآباد ۲۸

حیدرآباد میں اردو

۱۹۴۷ میں تقسیم ہند کے بعد ۔۔۔۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادب میں جس مقصدیت کا تصور تھا وہ بڑی حد تک پورا ہوا۔ لیکن یہ تھوڑی سی تبدیلی ترقی پسند نظریات اور تحریک میں جمود کا باعث بن گئی اس کے بعد تشکیک کا ایک دور مختصر عرصہ کے لئے ادب میں جاری رہا۔ اور اس طرح مقصدی شاعری نے ۱۹۵۵ء کے بعد اپنا اثر کھو دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شعراء کے پاس مضامین کی یکسانیت اور عنوانات کے دائرے کی محدودیت تھی۔ اکثر و بیشتر شعراء مانگے کے خیالات پر سہارا کر بیٹھے تھے۔ رومانیت اور حسنی خیزی نے دوبارہ دخل در معقولات شروع کر دیا۔ انسانیت کے مسائل کثرت سے وحدت کی طرف سفر کرنے لگے۔ گاندھی، مارکس، لینن کے فلسفے محض (GENERALIZATION) عام شدگی کے نتائج تھے۔ اوسط حل سب کا حل نہیں ہوتا، ہاں ایک حد تک معاشرتی بہتری پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اس ماحول نے زور کم کیا تو ہر ایک اپنے اطراف گھومنے لگا۔ کرب، نشاط، کشمکش، مسرت، تلاش، آرزو، سب کھلے ہوئے میدان سے ہوتے ہوئے اپنے محور میں آ گئے۔

اس کے نتیجے میں، ملک کے دوسرے حصوں کی طرح حیدرآباد میں بھی ایک نئے شاعرانہ ماحول نے جنم لیا۔ اردو شاعری کے دورِ جدیدیت میں جو کردار حیدرآباد نے ادا کیا ہے وہ کچھ ڈھکا چھپا نہیں۔ اس شاعری کا واضح تصور ۱۹۶۰ء کے اطراف سامنے آیا۔ چنانچہ اس سال کو اس مضمون کے لئے ازل قرار دیا جا سکتا ہے۔ نئی شاعری کے بارے میں حیدرآباد خوش قسمت ہے کہ یہاں پر کافی تعداد میں نئے شعراء اور تازہ مزاج فہم موجود ہیں۔ لہٰذا یہاں پر ان اہم شاعروں کا معروضی انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

پہلے ان شاعروں کا جائزہ پیش ہے جن میں بعض تو ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جنھوں نے بدلتے ہوئے رجحانات کو نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی شاعری میں سمویا۔ اس کے علاوہ ایسے نوجوان شاعروں کا بھی

شاعری ۱۹۶۰ء کے بعد

ذکر ہے جنھوں نے پچھلے دس بارہ سال کے عرصہ میں جدید اردو شاعری کو واضح اور متعین سمتیں عطا کی ہیں۔

مخدوم محی الدین

اس نسل کی ابتداء مخدوم محی الدین سے کی جا سکتی ہے۔
مخدوم اصل میں ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں میں سے
تھے۔ انھیں اپنی عوامی شاعری کے ذریعہ پہچانا جا چکا
تھا۔ لیکن مخدوم کا رخشِ قلم اپنی عصری شاعری کے بھی
ہم رکاب تھا۔ بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کی
شاعری زمانے کے ساتھ ساتھ لفظ و معنی کا پیرہن
بدلتی رہتی ہے اور مخدوم انہی میں سے ایک شاعر تھے۔
انھوں نے زخم سے گل، درد سے خوشبو کی طرف سفر کیا
تھا۔ ان کی شاعری میں خارِ زیرِ گل کا لطف آتا ہے۔
لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد ان کی شاعری چونک سی پڑتی ہے۔
اس سلسلے میں ان کی فکر میں تجسس داخل ہو گیا تھا۔
وہ شناساؤں کے پہچاننے کے لئے دوبارہ تگ و دو
کرنے لگے۔ ان کی شاعری میں "میں" سے زیادہ "ہم"
کی کارکردگی نظر آتی ہے اور ان کے لہجے میں موسیقیت
اور دھیما پن محسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان
کی نظم "اپنا شہر" دیکھئے:

یہ شہر اپنا عجب شہر ہے کہ راتوں میں
سڑک پہ چلئے تو سرگوشیاں سی کرتا ہے
بلک کے زخم دکھلاتا ہے
رازِ دل کی طرح
دریچے بند، گلی چپ، نڈھال دیواریں
کواڑ مہر بلب
گھروں میں میتیں ٹھہری ہوئی ہیں برسوں سے
کرایہ پر ——!! (اپنا شہر)

اس نظم کے اندر شناسائی فکر کا ایک عجب سا ماحول
پیدا کیا گیا ہے اور شاعر کے اندر چھپے ہوئے درد،
اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے ہوئے دریچوں،
خاموش گلیوں میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مخدوم
کی شاعری کی ایک اور خوبی پردے کے اندر چھپا ہوا
شکوہ ہے۔ جو ہمیشہ ماحول اور الفاظ کے بیم و رجا
میں جھانکتا رہتا ہے۔ ان کی آخری نظم "رت"
میں سے

مداوا کیا ہے؟

چاند کو پیمانہ بناؤ

رت کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے کالے آنسو

رت سے کہہ دو——

کہ وہ پھر آئے

کالے آنسو، چاند کا پیمانہ، مداوا، رت کی آنکھیں——

زخم خوردہ سا ماحول پیدا کر دیتے ہیں اور اس پر لہجے کی استفساریت رنگ آمیزی کرتی ہے۔ مخدوم اپنی نظم میں الفاظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معانی میں—— سراسر فرق پیدا کر دیتے ہیں جس سے ان کے لہجے کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔ نہرو کی موت پر ان کی نظم اس کی عمدہ مثال ہے۔

مخدوم کے آخری مجموعۂ کلام "بساطِ رقص" کے "گلِ تر" والے حصّہ میں بیشتر ایسی نظمیں پائی جاتی ہیں جو ان کے نئے ادب سے انسلاک کی ضامن ہیں۔ وہ ایک عظیم شاعر تھے اور حیدرآباد کی ادبی فضا میں ایک مجدد کا مقام رکھتے تھے۔

خورشید احمد جامی

خورشید احمد جامی حیدرآباد کے اُن اہم شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کا تعلق کبھی کسی ادبی تحریک سے نہیں رہا اور جن کے کلام نے عوام اور خواص دونوں میں مقبولیت حاصل کی۔ اس کا سبب ان کی شاعری میں تشبیہات اور استعارات کا بھرپور استعمال ہے۔ جامی کی شاعری میں دور دور تک یاس کا سایہ نہیں ملتا۔ اس میں زندگی خیزی جھلکتی ہے۔ جب دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامی کسی نئے شہرِ سخن کی تعمیر میں محو ہیں۔ ان کے لہجہ میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ جامی نے تشبیہات کے استعمال میں جس پرکھ کا استعمال کیا وہ ان کے پیرو اور "چربہ ساز" نہ کر سکے۔ اسلئے آسانی سے ان کے اشعار کی شناخت کی جا سکتی ہے۔

جامی خود شناس اور خود حساب شاعر تھے۔ اسی لئے ان کی غزلیں باوجود معیاری ہونے کے زیادہ رسائل میں شائع نہ ہوئیں۔ انھوں نے سعی ہی نہیں کی۔ ایک اور خوبی جو جامی کے اشعار میں پائی جاتی ہے وہ مرصّع صناعی ہے۔ انھوں نے معصومیت کے ساتھ بھی جو باتیں کہہ دی ہیں، وہ قاری کو یکایک اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔

جامی کی شاعری میں غنائیت تو ہے لیکن سستی رومانیت نہیں۔ عشق تو ہے لیکن فلسفیانہ باتیں نہیں۔ ان کی شاعری عام اور وسط معاشرے کے لئے ہے اور زندہ رجحانات کی تابع دار ہے۔ مثلاً۔

سنسان راستوں پہ تری یاد نے کہا

حالات کا فریب بھی کتنا حسین تھا

جامی جو زندگی سے زیادہ عزیز تھے

ان کو بھی زندگی کی طرح بھولنا پڑا

شہر میں، شہر کی سڑکوں کے دھڑکتے دل میں

ریگ زاروں کی سلگتی ہوئی تنہائی ہے

صحرا کا سلگتا ہوا احساس ہوں جامی

ذرّوں کی طرح دہر میں بکھرا ہوا تو ہو

جامی کی آواز کا نکھراپن یہ بتاتا ہے کہ وہ شعر گوئی میں حسنِ بیان پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ جامی نئے ادب کے بہت اہم اور اچھے شاعر تھے۔ اُن کا ذکر

[illegible] کے درمیان رہے گا۔

سلیمان اریب

جالنا کے بعد تیسرا اہم شاعر سلیمان اریب ہے جس نے
مخدوم ہی کی طرح مقصدی ادب سے خالص اور نئے ادب
کی طرف مراجعت کی تھی۔ سلیمان اریب کی شاعری میں
پختگی کا احساس ۱۹۶۰ء کے بعد پیدا ہوا۔ یہ ان کے
اپنے مدبرانہ مشاہدے و مطالعہ کا بھی نتیجہ ہے۔ اریب
کو ایک مدیر کی حیثیت سے پہچانا گیا اور ان کی شاعری
کا اعتراف قدرے تاخیر سے ہوا۔ وہ جدید سے جدید
ترکی قواش کو بہتر سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی
شاعری کا جھکاؤ سماجی افادیت کی طرف تھا۔ جدت
طرازی کے سبب انھوں نے بعض اوقات اپنے وقار
کو دھکا پہنچایا لیکن اریب کی شاعری کا سب سے دلچسپ
عنصر ان کی شکستہ "انا" ہے۔ انھوں نے "ہم" پر
"میں" کو ترجیح دی اور اس سے ان کے کلام میں
بہت عمدہ اضافے ہوئے۔

اریب کا مزاج نظموں کے مقابلے میں غزلوں میں زیادہ
واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری خالی پن،
خوابیدگی اور جذباتیت سے مملو ہے۔ نظموں میں
ان کا کردار سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر عموماً
اور اظہار خیال ان کی شاعری کے واضح DIMEN-
SIONS. ہیں۔ مثلاً ؎

زندگی شعر کا موضوع تو ہو سکتی ہے
شعر کے اور جو عنوان ہیں، گر وہ نہ رہیں
اس پہ کیا بحث کریں؟
بحث پھر بحث ہے

عورت پہ ہو، لونڈے پہ ہو یا جنس پہ ہو

(لاجنسیت)

جب کوئی فرض صداقت کا چکانے کے لئے
زہر کا گھونٹ نہ سہی جام بھی پی لیتا ہے

- - - - - - - - - - - - - - - -

میں اسے دیکھ کے چپکے سے کھسک جاتا ہوں
یہ تو میں خود ہوں وہ احمق، جس کی
اپنی رسوائی میں تسکینِ انا ہوتی ہے

(تسکینِ انا)

اریب نے شاعری میں بالکل واضح زبان استعمال کی
ہے۔ ان کی نظمیں اعتراف و تبصرہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان
کی غزلوں میں غنائیت فعال قوت ہے اور تحت میں
بڑی تیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ؎

شراب و شعر میں عریاں تو ہو گئے لیکن
رخائے ذات کے پردے ہر ایک چاک میں ہیں
لالہ و گل کی طرح پیچھے ہے دامانِ نگاہ
ہم نے اس طور سے زخموں کو سجا رکھا ہے
تمھاری میری رفاقت ہے چند قدموں تک
تمھارے پاؤں کا چھالا ہوں پھوٹ جاؤں گا

سلیمان اریب ایک باہمہ شاعر تھے۔ یہ ان کی خوش قسمتی
تھی کہ انھوں نے اپنے رجحان کو سنبھال کر رکھا تھا۔ اور
بلاخوفِ تنقید اپنے نظریات کا اظہار کرتے تھے۔

عزیز قیسی

عزیز قیسی نئی شاعری کے ان ستونوں میں سے ہیں
جنھوں نے اپنی منفرد فکر سے اہم مقام حاصل کیا ہے
عزیز قیسی کا حیدرآباد سے ہمیشہ سے ادبی اور فکری

تعلق رہا ہے۔ فکرِ معاش نے گرچہ انھیں ہم سے کچھ دور
کردیا ہے لیکن وہ حیدرآباد کے ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں
نے اردو ادب و شعر میں نئی آواز پیدا کرلی ہے۔

قیسی کی شاعری نے گرچہ ۱۹۶۰ء سے پہلے ہی اپنی اہمیت
منوالی تھی لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد انھوں نے اپنا لب و لہجہ
یکسر بدل دیا۔ وہ وجود و حیات کے مسائل کو گہری اور
پُرتجسس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی نیم علامتی فکر سے
اور شاعرانہ نظر سے بڑی خوبصورت نظمیں کہہ جاتے ہیں
قیسی کی نظموں کو ان کی غزلوں پر بلاشبہ ترجیح حاصل ہے
اس لئے کہ یہی ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ ظلمت،
روشنی، ہستی، خواہش، امید، حواس، وقت یہ سب
وہ غیر مرئی اشیاء اور محسوسات ہیں جن کی گرمی ہم زندگی
کے پیکر میں محسوس کرتے ہیں اور پاتے ہیں۔ قیسی نے اپنی
شاعری میں ان اشیاء و محسوسات کو کلیدی مقام عطا کیا
ہے۔ ان کی فکر کسی طرح ترقی پسندوں اور مقصد پرستوں
کی نعرہ بازی کی اسیر نہیں۔ قیسی تجربوں اور ندرت کو
زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور نئے جہتوں کی تلاش
میں کوشاں ہیں۔

یہاں پر قیسی کی شاعری کے اس پہلو کا ذکر ضروری ہے
جو عجیب ہے۔ یعنی قیسی کی شاعری دو رنگوں میں بٹی
ہوئی ہے اور دونوں رنگ تقریباً ایک دوسرے کی ضد
ہیں۔ پہلا لہجہ وہ کہ جس میں وہ ایک تیز ذہن اور
شاعرانہ تخیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ مثلاً ؎

وہ مجھ سے کہتی ہیں
تم بھی تو روز اپنے بدن کے فولاد
دل کے شیشے کو یوں ہی بھٹی میں جھونکتے ہو
تو دیکھ لو
رات رات، دن دن، [illegible]
مری طرح تم بھی مر رہے ہو
(مری طرح سب ہی مر رہے ہیں)
مگر نگاہیں بچائے رکھنا۔

(یکمشت گرد [illegible])

میں جیتا ہوں اس مٹی پر
—— جس سے گھر بنتے ہیں
جس سے قبریں بنتی ہیں
جس کا ذرہ ذرہ اسود کا ہے
ان کا جن میں "میں" "ہوں" جو مجھ میں ہیں

("میں")

دوسرا لہجہ اس شاعر کا ہے جو شاعر کم اور فلسفی زیادہ
ہے۔ اس لہجہ میں ایک حد تک اقبال کی شاعری کی
پرچھائیں محسوس ہوتی ہے ؎

ترے درک و ہوش و حواس کی
مرے وجد و وہم و قیاس کی
یہی ایک پل تو اساس ہے
یہی ایک پل میرے پاس ہے

("بین العدمین")

قیسی کی شاعری کا ماحول محنت زدہ اور تھکا ہوا ہے
وقت نے اس کے مناظر پر زنگ لگادیا ہے اور
شاعری اس زنگ کو چاٹتی نظر آتی ہے۔ قیسی کا زاویۂ
نگاہ چمکدار اور روشن رہگذر سے ہوتے ہوئے ایک
بے بس اور مغموم انجام تک پہنچتا ہے۔ زبان و بیان
میں خوبصورتی اور تعلیم یافتہ شائستگی ہے جو ان کے [illegible]

[illegible] سے۔ جسے اہلِ نظر کسی درجہ [illegible] میں نہیں۔

شاذ تمکنت

شاذ تمکنت کا شمار حیدرآباد کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے چند برسوں میں اپنی واضح اور خوبصورت شاعری کی مدد سے مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ انھوں نے اپنی آواز اور اپنی غزلیات میں حسین اور اچھوتی تشبیہات اور تراکیب کا لطف بھر دیا ہے۔ ان کے پاس خیالات کی حکمت اور ندرت نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کے لہجے میں شوخی و سادگی کی ایک پرکیف آمیزش ہے۔ ان کی شاعری سے ایک تنہا اور خوشحال شخص کا پیکر ڈھلتا ہے۔ شاذ نے "تراشیدہ" کی اشاعت کے بعد اپنے فن میں بہت ترقی کی ہے۔ اب وہ اپنے لہجے میں تصنع کے بجائے سادگی پیدا کر رہے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ ان کی شاعری متحرک ہو گئی ہے۔ انھوں نے ان دنوں نظموں کے مقابلہ میں غزلوں پر دباؤ بڑھا دیا ہے۔

شاذ کی نظموں میں ڈرامائیت، STRUCTURE اور جان ہے۔ ان کی زبان اور انداز بیان میں خفیف اور فراق کا رنگ صاف صاف محسوس ہوتا ہے اور "[illegible] پن" کی بجائے تسلسل ملتا ہے مثلاً ؎

چاند جگمگاتا ہے
تھال جیسے کندن کا
ہر کرن کے سینے میں
پھوٹتی ہیں جھنکاریں
یہ پھوار سی خنکی
یہ گھٹا سی دھاریں
....
تو اگر میری ہوتی
رنگ ہی دگر ہوتا۔

(حجابِ ناز)

ان کی نظموں میں "حسرتِ بیدار" "مخدوم" "دائرہ" اہم اور خوبصورت نظمیں ہیں۔ زبان دیکھئے ؎

پلکیں نیندوں کے جنوں، آنکھیں شبستاں کے چراغ
سخنِ زیرلبی، مشک کے جھونکے جیسے!!
("دائرہ")

ان کی غزلیں ارتکازِ جذبات سے عاری ہیں۔ اسی لئے ان پر احمد ندیم قاسمی اور ماہر القادری کی غزلوں کا سایہ محسوس ہوتا ہے۔ شاذ کی نظموں کا ٹھہراؤ ان کی غزلوں میں بھی محسوس ہوتا ہے۔ وہ متانت اور وضاحت کو چنتے ہیں۔ ان کی غزلیں زبان کے لحاظ سے بوجھل نہیں ہوتیں بلکہ معنی خیز ہوتی ہیں ؎

بنا حسنِ تکلم، حسنِ ظن آہستہ آہستہ
بہر صورت کھلا وہ کم سخن آہستہ آہستہ

دامن ہے دور اور گلے نارسا کے ہیں
گویا ہمارے ہاتھ فقط اب دعا کے ہیں

کیا یہ دنیا مرے ہاتھوں سے نکل جائے گی
دستِ کوتاہ! تری بے خبری کیسی ہے

کیوں آج مجھ سے ہیں یہ بھی بہلنے کی باتیں
یہ کیسے بھول گئے تم رلا بھی سکتے ہو؟

شاذ کی غزلوں پر غالب کی آسان زبان والی غزلوں کا

کا دھوکا بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ وجدانی کیفیت کا
نتیجہ ہے۔ شاذ نے موجودہ نظم میں بہت خلوص سے
کام کیا ہے اور ان کی شاعری ان کی فن کاری سے
بھرپور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاذ تمکنت ادبی
افق پر زبان و بیان کا نمائندہ ہے۔

راشد آذر

راشد آذر ایک خاموش اور گھریلو ماحول کے شاعر
ہیں۔ ان کی شاعری میں اپنا پن اور خردمندی کا ایک
امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں سلیس و سادہ
زبان میں باوزن انداز سے عملی تجربہ ہوتی ہیں۔ اب
تک ان کے دو مجموعہ ہائے کلام "نقشِ آذر" اور
"صدائے تیشہ" چھپ چکے ہیں۔ ان کے پاس کسی
لاشعوری سوچ اور دروں بینی کی تلاش غیر ضروری ہے
راشد آذر کی نظمیں PRE-DETERMIND پلاٹ
پر لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ جس میں وہ ہر پہلو کو کھول کھول
کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ جس سے ان کی شاعری
کا تاثر کم ہو جاتا ہے ؎

جوڑے میں گجرے کی خوشبو
آنکھوں میں کاجل کے ڈورے
اس امید میں تم بیٹھی ہو
میں آؤں تو دن بھر کے دکھ
دونوں آپس میں بانٹیں گے

تم کو مجھ سے یہ شکوہ ہے

میں بھی ایک طوائف بن کر
لاج شہر کی بیچ رہا ہوں

تم میرے بچے کی ماں ہو
سارے شکوے سر آنکھوں پر
لیکن میں یادوں کے پیچھے
یا تتلی کے رنگ چرانے
پاگل بن کر دوڑ رہا ہوں
یہ مجھ کو الزام نہ دینا

(یادیں، تتلیاں، [illegible])

شاعری میں عمق پیدا کرنے کے لئے تخفیف اور آہنگ
سے اکثر فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ آذر کے پاس واقعیت
کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جو ترقی پسند تحریک کے
زمانہ کی شاعری کا خاصہ رہا ہے۔ اس کے باوجود
آذر نے ۱۹۶۰ء کے بعد اپنے لب و لہجہ میں
نمایاں تبدیلی کر لی ہے۔

وقار خلیل

وقار خلیل حیدرآباد کے ایسے شاعروں میں شامل
کئے جاتے ہیں جو فطرتاً زود گو ہیں۔ وہ کئی سمتوں
کے شاعر ہیں۔ انھوں نے بچوں کی نظمیں، قومی نظمیں،
موضوعاتی نظمیں اور نئی نظمیں سب کہی ہیں۔ اسی
لئے ان کے بارے میں کسی ایک رخ سے گفتگو نہیں
کی جا سکتی۔ وقار خلیل ترقی پسند تحریک کے زمانہ سے
لکھ رہے ہیں لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد ان کی شاعری
میں نیا رنگ جھلکنے لگا ہے۔ وہ نئی تراکیب بنانے
کی بجائے الفاظ کو ان کے ہی معانی میں اور ان ہی
تراکیب میں استعمال کرتے ہیں جیسے کہ وہ ہیں۔

[illegible]
پھیں نظر آتا ہے اور شاعر سعدی کی آواز نظر آتی
ہے۔ وقار کی شاعری میں شیفتگی کی نرمی اور اقبال
کی رعب کی عظمتی دونوں ملتے ہیں۔ ان کی سب
سے خوبصورت نظم "سیلِ معانی" ہے جس میں شاعر
نے موجوں کے اتار چڑھاؤ سے فائدہ اٹھایا ہے۔
موجوں کا غول دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور پھر
اسی رفتار سے کم ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح ایک یا
دو لہریں وجود میں آتی ہیں۔ وقار کی یہ نظم دو لہروں
پر موجود ہے ؎

فکر ہے یا کوئی بہتی رودِ نیل
یم بہ یم طوفاں بہ طوفاں، جو بہ جو
جس کی تہہ میں سنگریزوں کی طرح بجھتے شرر
جس کے سینوں میں دبے ہیں
ناسپاسیٔ شب و روزِ تمنا کے نقوش
جو کبھی تھے شعلۂ حسنِ خیال

وقار کی زبان میں جو ٹھہراؤ ہے وہ ان کی نظم میں
باوقار اہمیت پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی غزلوں میں
جدت طرازی کے ساتھ ساتھ پرانا پن ہے جو میٹھا ہوتا
ہے۔ اس کے سبب کچھ شیر و شکر کا مزہ ملتا ہے ؎

سوچتے چہروں پہ جلتے ہوئے آثارِ حیات
یک بیک وقت کا عرفاں ہوا ہو جیسے

پڑھتے ہیں سوزِ ہجر کے لمحات میں کتاب
ہم بھی اچھالتے ہیں خرابات میں کتاب

دیکھو تو زندگی کی حسین شاہراہ پہ
اب بھی ہجومِ نوحہ گراں ساتھ ساتھ ہے

ان کا ایک اچھا نظم "بچپن سے بلوغ تک" ان کی نظم
ستھری مزاجی کی آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام کے
بارے میں یہ رائے دی جا سکتی ہے کہ متقدمین
اور موضوعاتی شاعری کے مقابلے میں وہ فطری اور
نئی شاعری کو زیادہ اہمیت دیں اور اضافہ کریں

تاج مہجور

تاج مہجور نئی نظم میں اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں۔
یہ نظمیں کہنے میں جتنے فراغ دل ہیں، اتنے ہی چھپنے
چھپانے کے معاملہ میں تنگ دل واقع ہوئے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ وہ مقامی حلقہ سے باہر زیادہ جانے
پہچانے نہیں گئے۔ ان کی شاعری اکثر تبدیلی سے متاثر
ہوتی ہے۔ زماں و مکاں کی تبدیلی انسانوں اور لمحوں
میں خاصا فرق پیدا کر دیتی ہے۔ تاج ۔۔۔ ہر نئی تبدیلی
پر حیرت سے نظر کرتے ہیں۔ ان کے مضامین انسانی رشتوں
اور شہروں کے بدلتے ہوئے پرتو ہیں۔ تاج کی نظمیں
پلاٹ سے پیدا ہوتی ہیں۔ نہ تلی۔ اس کی وجہ سے
ان کا میدانِ فکر، مختصر اور محدود ہے۔ وہ مروجہ قوانین
سے بغاوت کرتے ہوئے گھبراتے ہیں اور اپنی نظم میں
قاری کی دلبستگی کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ یہ رجحان
شاعر کے لئے تو اچھا ہوتا ہے لیکن شاعری کے لئے
نہیں۔ تاج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔
انھوں نے افسانوی انداز کو اپنایا ہے جو ایک خاص
TREND- ہے۔ ؎

بہت مدتوں بعد اک دن اچانک
مجھے راہ چلتی ہوئی مل گئی وہ

جب میں نے اس کو بتایا
کہ دل میں ابھی تک
تری آرزو کی لیلیٰ کنواری
. . . .
مسلسل ترا راستہ دیکھتی ہے
. . . .
تو وہ مسکرائی
. . . .
کہا اس نے مجھ سے
"مگر اب تو میں ــــ
چھوڑیئے دوسری بات کیجئے
کہیں کوئی اچھا مکان ہو تو کہیئے
مگر اس کے نزدیک،
اچھا سا ایک ماڈرن اسکول بھی ہو"
("دوسری بات")

کل تیرگیٔ شب میں جدا ہو گئے تھے ہم
آج اس حسین شب میں ہماری نظر کے نور
کھیتوں سے، کا بوں سے، ٹیلوں سے خوشی خوشی
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے نکلیں گے ساتھ ساتھ
اک روشنی کی موڑ پہ مل جائیں گے گلے ـــــ
("روشنی کی موڑ پر")

تاج اپنی نظم کے اطراف ایک خاص ماحول پیدا کرتے ہیں تاکہ ان کی نظمیں سمجھنے میں قاری دشواری نہ محسوس کرے اس ماحول کی پیدائش کے لئے انھیں لفاظی سے کام لینا پڑتا ہے لیکن جو باتیں وہ کہتے ہیں نہ تو وہ بہت گہری ہوتی ہیں، نہ ان میں کوئی نفسیاتی اور فکری نکتہ ہوتا

حکیم یوسف حسین خاں

حکیم یوسف حسین خاں کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جو قدیم نظریات کو نئی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام "خوابِ زلیخا" میں شامل بیشتر نظموں میں یہ بات موجود ہے۔ ان کا لہجہ اگرچہ نیا فرد ہے لیکن سجاوٹ اور گنگ مزاجی روایت سے قریب ہے ۔

اے عدم! اے عدم! اے عدم! السّلام
پھر بنا دے مجھے سرِّ لوح و قلم
اب میں گھبرا کر مٹتی فنا ہے مری
میں عدم رہ سکوں تو بقا ہے مری
("مراجعت")

نفسِ گل کا اعتبار ہی کیا
پھول نے خود بھی خودکشی کر لی
کیونکہ ہر صبحِ نو جو آتی ہے
تتلیاں اور ساتھ لاتی ہے
("حادثہ")

حکیم یوسف حسین خاں کے تعلق سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کی شاعرانہ عمر ان کی طبعی عمر کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۹ء کے اطراف پہلی نظم کہی جبکہ ان کی عمر کوئی ۷۰ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری میں عبوری دور کی ناپختگی یا اپنے ہمعصر شاعروں کے اثرات نہیں ملتے البتہ ایک سیلی ہوا احساس پایا جاتا ہے اور ان میں وہ عنصر کم ملتا ہے جسے جذبہ کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں معمولی مسائل اور

[illegible] کرتی
ان کی بہت سے ... ان کی مشہور نظم "وحشت" [illegible] کی
تحریک سے شروع ہوتی ہے لیکن آخر میں آکر وہ
"انسان دوستی" کا حرف آخر بن جاتی ہے۔
اگر رحیم صاحب اپنے کینوس کو وسیع کریں تو ان کی
شاعری میں اور جلا پانے کے کافی امکانات ہیں۔

رؤف خلش

۱۹۶۰ء کے بعد نیا لب و لہجہ اور نئی فکر لے کر آنے
والے شاعروں میں رؤف خلش بہت اہم اور ممتاز
ہیں۔ رؤف خلش 'نئے' پر کشمکش، حیران و غم خوردہ
ماحول کی پیداوار ہیں۔ ان کی شاعری میں درد و غم سے
انس سا لگتا ہے ـــ پیار ـــ ہر چیز سے پیار ـــ جلتی
ہوئی آگ سے، بہتے ہوئے پانی سے، ٹوٹتی ہوئی کرن
سے۔ اسی لئے ان کی شاعری مانوس معلوم ہوتی ہے۔
انھوں نے اپنا ماحول ہندوستانی دیہی زندگی سے حاصل
کیا ہے۔ ماگھ، پوس، ساون بھادوں، گروانی گوپال،
اشوک و کلنگا سب کے سب علامتیں خالص ہندی
ہیں ؎

جانے کب تک شہروں کی آبادی میں
پت جھڑ کے دیوتا راس رچائیں
جانے کب تک
اگنی کے بادل منڈلائیں
بیتے موسم لوٹ نہ آئیں

("بیتے موسم")

خلش کی شاعری میں کوئی رنگین عینک نہیں ہے وہ
کسی بھی چیز کو اور کسی بھی احساس کو اپنے ترتیب شدہ

[illegible] ہاں ان کی نظم و غزل کے پس منظر
میں صدمہ کا ایک ہلکا سا اثر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی
بعض نظموں میں لہجے کی یکسانیت کا یہ حال ہے کہ اگر ان
نظموں کو ملا دیا جائے تو ایک نئی نظم حاصل ہو اور یہ ان
کی شاعری کی ایک صفت ہے ؎

آئینے دل کے تراشوں تو ہے آشفتہ سری
سنگ اندازوں کی بستی میں ہے شیشہ گری
غم پرستی کی لگن جانے کہاں لے جائے
راستے آج نظر آتے ہیں گہرے سائے

("دکھتی رگیں")

سالہا سال سے میں
کتابوں، خیالوں کے معنوی سانچوں میں جکڑا ہوا
وقت کی شور کرتی مشینیں
ڈھالیں ان تعفن بھرے مکتبوں کو
کتابوں، خیالوں کے معنوی سانچے
مقبرے بن گئے ـــ

("خوابوں کی چاندنی")

ان کی غزلوں میں یہ لگن زیادہ ابھر کر آتی ہے اور ان
میں نظموں کے ہی موضوعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
ان کی غزلوں میں جدیدیت کا احساس ہوتا ہے۔ خلش
نے اکثر اپنے تجربات پر نظر ڈالی ہے۔ وہ غم زدہ شخص
کی طرح اپنے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں ؎

بے نشاں منزلو کس سفر کی کہانی لکھوں؟
تھک گئی سوچ ہر موڑ پر ذہن جلتا رہا
مرے اعتماد کا حاصل یہی ہے
بکھر کر ٹوٹ کر تم سے ملا ہوں

جھنجھلا کے کیوں نہ چھین لوں لوٹا ہے وہ عذاب

پھر وقت گھومتا ہے لئے درد کی زکات

رؤف خلش نے اپنی شاعری کے در و بام کسی مخصوص شاعر کی مدد سے نہیں بنائے ہیں بلکہ انھوں نے اپنا منفرد لہجہ وضع کیا ہے۔ ان کی نظموں میں انتظار، الجھن اور واہمہ کو خاص مقام حاصل ہے۔ فی الواقع وہ نظموں کے شاعر ہیں۔

حسن فرخ

نئی شاعری میں ایک خاص تعداد ان شعراء کی ہے جو شک و شبہ کی نظر سے ہر فلسفہ کو دیکھتے ہیں۔ ان شعراء میں حسن فرخ بھی ایک نام ہے۔ حسن فرخ ۱۹۶۰ء کے بعد آنے والے شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری نہ گنجلک ہے نہ الجھی ہوئی انھوں نے جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ ذرا سا نشتر انگیز ہے۔ لیکن اس میں ترشی تیزی نہیں۔ حسن فرخ زندگی کے اطراف لمحوں کی تلاش میں گھومتے ہیں۔ جب انھیں کوئی اہم لمحہ مل جاتا ہے تو اسے زیب دیوان کر لیتے ہیں۔ ان کی نظمیں عنوانات کے لحاظ سے بھی دلفریب ہوتی ہیں۔ حسن فرخ کے خیال میں کوئی فلسفہ، کوئی مسلک موجودہ پیچیدگی کا حل نہیں ہے وہ انسان کے چہرے میں بڑھتے ہوئے کھردرے پن تدریاکاری کو محسوس کرتے ہیں اور ڈوبتے ابھرتے ہوئے جزیروں کو دیکھتے ہیں۔ انھیں ہر لمحہ پر شبہ ہے۔ وہ پھر بھی بڑی متانت سے اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں ؎

ہڈیاں، گوشت کے خوبصورت غلافوں میں

پھر سے پہنے ہوئے

کھلکھلاتی ہوئی، رات کے اوڑھے اوڑھنے

مکانوں کے دروازوں کو

کل برہنہ ملی تھی مجھے

اصطلاحوں کا پیراہن اوڑھے ہوئے زندگی

("کل برہنہ ملی تھی مجھے")

میں نے ہر غم کو جِلا بخشی ہے

دلِ گیتی کو دھڑکنے کی ادا بخشی ہے

اک کلی مجھ سے مگر پوچھتی ہے

تم میں پہلی سی وہ معصومیت اب کیوں نہ رہی؟

("سوال")

کوئی چہرہ، کوئی اک واقعہ

لاشعوری رو کی گرہیں

گن تو سکتا ہے

مگر سلجھا نہیں سکتا

(امکان کے دہلیز پر)

حسن فرخ کی نظموں میں توانائی محسوس ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے کینوس میں اور رنگ آمیزی کریں تو ان کی نظمیں اردو کا اہم سرمایہ بن جائیں۔ انھوں نے نئے تصورات کی تلاش میں کئی قسم کے اجتہاد کئے ہیں اور ان کے پاس جو سب سے خاص چیز ہے وہ یہ ہے کہ ان کی نظم ابتداء اور آخر دونوں مقامات پر زیادہ باوزن ہو جاتی ہے۔ اس سے ان کے اندرونی کرب کا ابلاغ بآسانی ہو جاتا ہے۔ حسن فرخ "شکست خوردگی" کی

... جذبے کا احساس زیادہ رکھتے ہیں اور ان معنوں احساسات میں واضح فرق ہے۔

اکمل حیدرآبادی

اکمل حیدرآبادی ایک خاموش قسم کے شاعر ہیں۔ نئے رجحانات کا ان پر معتدل اثر ہے۔ اس کے باوجود وہ جدیدیت کے قائل ہیں۔ ایک بات جو اکمل کی شاعری میں ہے وہ ان کا بیانیہ DESCRIPTIVE انداز ہے۔ اس میں بالکل نیم شاعرانہ سلاست پائی جاتی ہے۔ اگر وہ اس انداز کو رمزیت یا اشاریت کی طرف موڑ دیں تو ان کی شاعری کا میدان کافی وسیع ہو سکتا ہے۔ ان کی نظم "جدید قاری" نظموں میں اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی نظموں میں ندرت اور بدلتے ہوئے سماج کا اثر مانوس حد تک ہے۔ انھوں نے ہیئت، ڈرامائی زیر و بم، لہجہ کی تبدیلی کو اپنی شاعری میں راہ نہیں دی کیونکہ وہ بالکل سیدھے ہوئے اور سادہ انداز میں باتیں کہتے ہیں ؎

نصف صدی کے بعد بھی لیکن پیشِ نظر عنوان
وہی ہیں!
ابروئے جاناں، چشمِ غزالاں
جام و سبو اور سنبل و ریحاں
جانے کتنی دور روایت سایہ بن کر ساتھ رہے گی
جانے کتنی صدیوں ہم پر صدیوں کی یہ چھاپ رہے گی
(صدیوں کی چھاپ)

اکمل کے اندر کا چھپا ہوا فن کار چاہتا ہے کہ اس کے مشاہدے اور الفاظ کو برتنے کا انداز بھی اسی قدر نیا اور تازہ ہو جس طرح کہ اس کے موضوعات نئے اور تازہ ہیں۔ اکمل ایک کم گو شاعر ہیں۔ انھیں ابھی نئی جہتوں کی تلاش میں جستجو کرنا ہے۔

غیاث متین

غیاث متین ایک سنجیدہ اور گہری فکر کے حامل شاعر ہیں۔ وہ روایات اور میلانات کی پابندی سے گھبراتے ہیں۔ ان کی نظمیں بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اور ان کی سوچ علامات کی پیداوار ہے۔ متین کی نظموں میں شکست و ریخت کا عمل جاری رہتا ہے جس کی وجہ سے ان کے قول میں بوقلمونی پیدا ہو جاتی ہے۔ متین کے لہجہ میں تجریدیت بھی جھلکتی ہے اور اخترالایمان کا کھردرا پن بھی۔ بعض اوقات وہ اپنی شاعری میں غیر شاعرانہ علامات بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ان کی نظم "کچی اینٹوں کا پل" قابلِ مطالعہ ہے ؎

ہر پتھر میں چھپی ہوئی اک صورت ہے
جو سوچ رہی ہے
سورج کے آئینے میں جو شکل بھی ہے
وہ اندھی کالی
دیواروں سے چپکی ہیں ٹوٹی پرچھائیں

- - - - - - - - - - - - -

اپنی اپنی قبر سے اٹھ کر
راتوں میں کیوں
کچھ لوگ مٹا دیتے ہیں
سادے کاغذ پر کتنی ہی تصویریں ہیں
رات پگھلتے سورج کا منہ دیکھ رہی ہے
اب سو جاؤ ــــ!!

اس بات کا قوی امکان ہے کہ اپنی نظموں کے ذریعہ

دعوتِ فکر دینے والا یہ شاعر اپنے قول کی FRE-
QUENCY میں اضافہ کرے گا اور اسعد نظم کے دامن
کو مالا مال کرے گا۔

مصحف اقبال توصیفی

مصحف اقبال توصیفی ایک بہت گہرے شاعر ہیں نظمیں
ان کا وسیلۂ بیان ہیں۔ وہ اپنے قاری سے ذہنی اشتراک
چاہتے ہیں۔ نظموں میں ایک نیا اور حیرت انگیز خیال
ملتا ہے۔ وہ احساسات کے پس منظر پر اپنی خیالی تعمیر
کو ابھارتے ہیں۔ جس سے ایک بالکل نیا اور سلیقہ مند
لہجہ ابھرتا ہے۔ مصحف اقبال شروع شروع میں بہت
سارے شاعروں کی طرح ۱۹۶۰ء کے بعد پاکستانی رسائل
میں چھپنے کو زیادہ ترجیح دیتے رہے۔ اس نے ان
کا نام ہندوستانی قاری کے لئے نیا نظر آتا ہے۔ اگر
ان کی نظموں کے مختلف حصص کو مناسب لہجوں میں
پڑھا جائے تو ایک زیادہ معنی خیز شاعری نظر آتی ہے ؂

مجھے وقت کے چند قطروں میں حل کر کے
میرے لہو سے
ایک اک پل نچوڑا گیا ہے
- - - - - - - - - -
میں چلتا ہوں
اگلا اسٹیشن آنے سے پہلے
اندھیرے کے زینے سے
چپ چاپ باہر نکل جاؤں گا

(زگیان کے جنگل میں)

مصحف کی نظموں میں وقت ایک اہم رکن ہے۔ وہ
وقت کو پل سے لیکر صدیوں تک ناپتے ہیں۔ حوالہ
۳۲ پیکر حیدرآباد

بالا نظم میں وقت کا الاؤ ہے یعنی ... مسیح کی ولادت سے پہلے "تاگرا" میں اس نے
بہت اہم مقام حاصل کیا ہے۔ مصحف کا بیان بھی
بہت فنکارانہ ہے۔ وہ تراکیب اور بندشوں میں
ایک طویل بیان کو محو کر دیتے ہیں ؂

وہ آرہا ہے
وہ اقلیدسی شکل اسکی مثلث نما ہونٹ
لہجے کی مخصوص گمبھیرتا
وہی جانے پہچانے فقرے
- - - - - - - - - - -
"مداری! پٹارے میں کیا ہے؟
وہی بین، سانپ ـــ اور کوئی تماشہ؟"
("سفید پوش")

وہ ابتداء میں "درمیانی ترقی پسند" شاعروں سے متاثر
رہے لیکن ان کی بعد کی نظموں میں نیا پن ہے اور ہیئت
میں تجربہ ان کی شاعری کے لئے اضافی نہیں ہے مصحف
کی شاعری کا سب سے بڑا حسن لہجے اور عمل میں تبدیلی
ہے۔ ان کے تجربات میں ڈرامائیت کا احساس زیادہ
ہوتا ہے۔ مستقبل میں مصحف کی شاعری سے بہت
سی توقعات منسلک ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ

ہندوستانی عورت ہمیشہ پیار کا ایک حسین نقطہ
رہی ہے۔ گاؤں کی کلاسیکی سانولی کا املاء ہمارے
قدیم ادب کا رنگین شعبہ ہے۔ لیکن موجودہ ماحول
میں عورت اپنی تمام علمیت اور قابلیت کے ساتھ
کس طرح اپنے رومان کا اظہار کرے گی اور اس نئی

[illegible]

شوکی کی نظمیں ... کا نمونہ ہیں۔ زبان پر ان کو
قدرت حاصل ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں معنی خیز
اور تمثیلات میں گہرائی ہے۔ شوکی اپنے اظہار کے لئے
منظر کا وسیلہ لیتی ہیں۔ منظر جا بجا درونی کیفیات
سے اس طرح ہم آہنگ اور ہم مزاج منتخب کرتی ہیں
اور پھر ایسی زبان میں بیان کرتی ہیں گویا اشک تصویر
ہو۔ شوکی کی محبت میں فراق ہی فراق ہے۔ لیکن
فراق میں وہ غم اور وہ درد نہیں جو ایک زخمی عاشق
کے دل میں ہو۔ اس محبت میں ایک خود اعتمادی ہے
اور نسوانی انا ہے۔ اس کے باوجود کہ نئے شاعروں
نے رومانی نظمیں لکھی ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ شوکی
اپنے طرزِ اظہار میں یکہ و تنہا ہیں ؎

مجھے خبر نہیں پنچھی، خبر نہیں مجھ کو
تجھی کو کوئی پتہ ہو تو مجھ سے کہہ دینا
کہ ہر نواح کی خوشبو ترے مشام میں ہے
کہ دیس دیس کی پرواز کام ہے تیرا
مجھے خبر نہیں پنچھی، خبر نہیں مجھ کو
نہ پوچھ مجھ سے، میرا ماہ کس مقام میں ہے

(فصلِ نیک فال ۶۲)

بہتی اندھیرے ہیں، سونے سبھی اجالے ہیں
کہیں بھی فطرتِ بے تاب کو قرار نہیں
بلند و پست سبھی اپنے دیکھے بھالے ہیں

- - - - - - - - - - - - -

... تو یہ حسرت رہ گئی کچھ دیا
... خوش تو طلوعِ سحر سے پہلے ...
دہانہ گیا ہے حیاتِ دو دم کا فسانہ

(دلِ ناداں ۶۳)

شوکی کی نظم میں جو علامتیں ہیں وہ اکثر قدرتی مناظر
سے لی گئی ہیں۔ ان کی ترکیب ہی بہت پُر کمال ہے۔
مناظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونا عورت ہی کا حصہ
رہ گیا ہے۔ مرد مناظر کو پکڑنے میں اس قدر حساس
نہیں جتنی کہ عورتیں۔ اس لئے مرد کی قوتِ آزادی
گھن گرج میں سلب ہو گئی اور عورت اپنی حسین
اور لطف انگیز خصوصیات سے بے بہرہ ہو یہ
ممکن نہیں ؎

اور سنہری دھانی نقطوں والی دھرتی کا بھری
پاٹ گئی تاریک ڈھلانوں کو
سارے نشیب ہیں قدِ آدم، اونچے جنگلوں میں
بسرا ... کی نرمل جیسے تیر سی چمکیلی دھار بہتی ہے
اور بہار آئی

(رُت ۱۹۷۰)

شوکی اگر رومانی ماحول سے باہر نکل آئیں تو ان کے لئے
ادب کا بہت کھلا میدان ہے۔ وہ اپنی شعری خصوصیت
کو قائم رکھتے ہوئے جدید رجحانات کی عکاسی کریں تو
اردو نظم میں قابلِ قدر اضافہ کریں گی۔

حیدرآباد کی ابھرتی ہوئی خاتون شعراء میں اشرف رفیع،
زبیدہ رضا اور سیدہ حمیدہ جانی پہچانی ہیں لیکن ان کی شاعری
میں نئے رنگ کی جھلکیاں بہت کم ملتی ہیں اس لئے ان
کی شاعری کا ... جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔

اب ان شاعروں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن میں بعض تو ایسے شاعر ہیں جو ترقی پسند تحریک کے زمانے سے شعر کہتے رہنے کے باوجود اپنا واضح لب و لہجہ نہ بنا سکے۔ تاہم ادھر کچھ عرصے سے نئے رجحان کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان نوجوان شاعروں کا بھی ذکر ہے جن کی فکر میں نئے ذہن کی دھیمی دھیمی آنچ موجود ہے اور مستقبل میں ان سے اچھی توقعات کی جا سکتی ہیں۔

مغنی تبسم

مغنی تبسم ـــ ترقی پسند تحریک کے زمانے سے شعر کہتے رہنے کے باوجود اپنا کوئی لب و لہجہ نہ بنا سکے۔ اس سے ہٹ کر وہ اپنی فن دانی، تنقید اور عروض دانی کے سبب مشہور ہوئے لیکن اس میں بھی ان کا کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں رہا۔ اب وہ اپنی شاعری میں نئے لہجے کو داخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور نئی نظم کے میدان میں ہیئتی تجربے کرتے رہتے ہیں۔ مغنی تبسم کی نظمیں اکثر درمیانی طول کی ہوتی ہیں۔ نہ طویل نہ بالکل مختصر۔ ایک مصرعہ کو توڑ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ لہجے میں پراسراریت کا شبہ ہوتا ہے۔ مثلاً

وہ\
تیرا\
مقدر\
نہیں\
تھا\
تری آگ تھی

("اندھیری رات کا سفر")

اس کے برخلاف انھوں نے اپنی نظم "رائیگاں" میں ایک طویل RAPID STATEMENT کو عاجل انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کے لہجے میں کچھ معنی خیزی پیدا ہوتی ہے ؎

ہاتھ میں یہ قلم وزن رکھتا ہے لیکن\
یہ میں کس طرح مان لوں کہ حالہ ہے کوہ گراں\
تم سناتے ہو صدیوں کی تاریخ میں کیسے\
باور کروں جب کہ دنیا مرے ساتھ پیدا ہوئی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغنی ـــ نظم لکھتے وقت اپنے قابو میں رہتے ہیں۔ اور وجدان ان کی شاعری کا میں داخل نہیں ہوتا۔ اسی لئے ان کی نظموں میں CRAFTING۔ ملتی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں اکثر مکالماتی نبان کا انتخاب کرتے ہیں۔ "رائیگاں" "سوال" "آنکھ ملتے ہوئے" "اندھیری رات کا سفر" ہر نظم میں انھوں نے اسی مخصوص انداز کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے مکالماتی لہجے میں کبھی تو حاضر و متکلم دونوں ہوتے ہیں تو کبھی صرف حاضر یا صرف متکلم موجود ہوتے ہیں۔ جس سے خود کلامی یا گفتگو کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری پر راشد، میراجی، مجید امجد اور تصدق حسین خالد کا اثر بھی ملتا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی نظموں میں تفصیل کے مقابلہ میں اختصار کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ جسکی وجہ سے ان کی نظمیں قاری سے زیادہ دلچسپی اور فکر مانگتی ہیں۔

انور معظم

انور معظم حیدرآباد کے خاموش ترین شاعروں میں سے ہیں۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ ان کو شاعر

[illegible] نہیں تھے۔ ان کی شاعری بہت
ہی سادہ اور سطحی انداز کی ہے۔ وہ اکثر فطرت اور
قدرتی مناظر سے نغمے اٹھاتے ہیں۔ ان کی شاعری
میں اختر الایمان اور احمد ندیم قاسمی کا رنگ جھلکتا
ہے۔ وہ اپنا مخصوص انداز ہنوز بنا نہیں پائے۔
یوں تو انھوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد جدید طرز کی نظمیں
لکھی ہیں۔ پھر بھی ان کی شاعری "رومانی ترقی پسند"
اثرات سے نجات نہیں پاسکی ؎

نگار سحر بن سنور کر نکھر کر
دھندلکوں سے باہر اجالوں میں آئی
کہ مشتاقِ دیدار بے تاب ہوں گے

- - - - - - - - - - - -

مگر آج سب اس سے یوں بے خبر تھے
کہ جیسے وہ ان کے لئے اجنبی ہو
(پہلا دن)

بھنورے نے گرجتے ہوئے قہقہوں میں
یہ مجبور تنکے سے پوچھا

- - - - - - - - - -

مجبور تنکے نے گردش کی ـــــ
ـــــ بڑھتی ہوئی بے بسی میں یہ مانا
"یہ سچ ہے کہ رفتار کا تو ہی خالق ہے
میں صیدِ رفتار ہوں"
اور دریا
وہ اک تیسرا شخص
خاموش
یہ گفتگو سن رہا تھا

انھوں نے طویل منظوم ڈرامے اور خاکے بھی لکھے
ہیں۔ اور اس میں وہ نسبتاً کامیاب ہیں۔ ان کی بیشتر
نظمیں موجودہ خودغرضی اور بے نیازی سے متاثر ہیں
بیانیہ ہوتے ہوئے بھی ان کی زبان میں خیالات کی
زیادتی دلچسپی فراہم کرتی ہے۔ ان کے فلسفیانہ
نظریات میں یکسانیت ہے۔

صلاح الدین نیّر

صلاح الدین نیّر حیدرآباد میں ترنم کے شاعر کی حیثیت
سے مقبول ہیں۔ انھوں نے عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا
ہے۔ اگرچہ ان کی "کثرتِ شاعری" اور اس کی "کثرتِ
اشاعت" نے انھیں شہرت تو بخشی مگر نمایاں لب و
لہجہ کے شاعروں میں ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ البتہ ادھر
کچھ عرصہ سے ان کی شاعری میں نئے رجحانات کا پرتو
جھلکنے لگا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اب وہ
خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ان
کی شاعری کا میدان رفتہ رفتہ کھل رہا ہے۔ نیّر کی غزلوں
میں حیدرآباد کے مشہور شاعر شاہد صدیقی مرحوم کا
گہرا اثر ہے ؎

برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا
زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے
نرم آغوش ہو یا بسترِ گل ہو نیّر
سونے والوں کو تو کانٹوں پہ بھی نیند آئی ہے

وقت قاتل ہی دلوانے کو ہوش آنے سے
خود بخود پاؤں کی زنجیر پگھل جاتی ہے

ان کے مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" کی اشاعت کے بعد کی
تخلیقات نئے ماحول سے ہم آہنگ ہوتی جارہی ہیں۔

ان کی جتو اور عنت حوصلہ شکن نہیں ہے۔ نیر کی نظموں میں غزلوں جیسا تحرک نہیں ہے۔ اسی لئے صرف ان کی غزلوں کو ہی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ توقع ہے کہ نیر آگے ہمیں بہتر شعری سرمایہ دیں گے۔

مسعود عابد

مسعود عابد کم شائع ہونے والے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی شاعری میں نئے مزاج کا اثر ہے۔ عابد کی زبان میں سادگی ہے اور وہ علامات پر تشبیہات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی نظموں کو پڑھ کر ہلکا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں مقصد کے انداز کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ان کے مضامین ہیں ــــ وہ عام مسائل جن سے ہر ایک دوچار ہوتا ہے۔ ذاتی فکر اور ذاتی تجربہ کے مقابلہ میں سماجی اندازِ فکر گہرا نہیں ہوتا ؎

ثبت پھولوں کے دہن پر ہیں
خموشی کی ہزاروں مہریں
سلب ہے قوتِ گویائی بھی
ہر طرف ایک سکوں ایک فسوں طاری ہے

(اسٹوڈیو)

لیکن اب تو
موڑ پہ اس تاریک گلی کے
اک دروازہ اور کھلا ہے
روشن دانوں سے رس رس کر
نور کی دھاریں پھیل رہی ہیں

(نیا در)

عابد کا زاویۂ نظر ہمیشہ اس بات سے متاثر ہے کہ چیزیں اور شکلیں بدل جائیں گی لیکن مسائل وہی کے وہی ــــ

رہیں گے اور احساسات میں تبدیلی نہ ہوگی ـــ ان کی زبان اور بیان پر قابو ہے اور ان کا فکر ... ہے۔

علی الدین نوید

علی الدین نوید حیدر آباد کے نئے شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ نوید کی شاعری میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آسان طرز سے ہٹ کر کہتے ہیں۔ ان کے پاس غزلوں کا نیا پن ہے۔ نوید کی شاعری میں لا مرکزیت نہیں ہے۔ وہ جدید ہو کر بھی تجریدی انداز کے قائل نہیں اور لفظیات میں ایک مقصد کا اظہار کرتے ہیں ؎

ہر صبح میں پتھر کی طرح سخت بنا ہوں
ہر شام میں شیشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں

میرا وجود جذب ہوا تیرے جسم میں
اب مجھ کو اپنے جسم کے اندر تلاش کر

ٹوٹے گی کسی دن تو کٹھن رات کی دیوار
ہوگا اسی دیوار سے خورشید نمودار

جیسے خلا زمیں پہ نہیں آسماں پہ ہے
کچھ یوں دعا کو ہاتھ اٹھائے ہوں رات بھر

نوید کم گو ہیں لیکن ان کی تخلیقات بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ امید ہے کہ وہ زبان میں اچھے تجربے کریں گے اور اپنے طرز کو واضح کریں گے۔

رحمان جامی ان شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی شاعری سہل ہے۔ ان کے سمجھنے میں محنت اور ذہنی کاوش درکار نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں معصومیت بہت زیادہ ہے۔ کبھی کبھی ان کی

[illegible] ان کے

محسوس نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس ... ان کے

شعر کو شعر آسانی سے پہچان سکتی ہے۔

محفل میں بے شمار سوالوں کی بھیڑ تھی

میں سادہ لوح تھا کہ جوابوں میں کھو گیا

مجھ سے ملنے کو بڑی دور سے تم آتے ہو

اور جب آتے ہو آئینہ سا دکھلاتے ہو

تم سے ہر بات میں کہہ دیتا ہوں اپنے دل کی

بات وہ کہنے کے قابل جو نہیں ہوتی ہے

بات وہ سننے کے قابل جو نہیں ہوتی ہے

جانے کیوں تم سے کوئی بات نہیں چھپ سکتی

(زندان)

رحمان جامی ایک سنجیدہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اچھلنے اور تماشہ بننے کے بجائے سوچنے اور سمجھنے کو پسند کیا ہے۔ توقع ہے کہ وہ شعر میں رمزیت اور ایمائیت کو بھی جگہ دے کر اپنی انفرادیت برقرار رکھیں گے۔

قطب سرشار

قطب سرشار ایک باوزن احساس کے نئے شاعر ہیں۔ جن کی دلچسپی روایت شکنی اور نوآمیزی سے ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں پر پھر بھی روایت اور اقدار کا سایہ نظر آتا ہے۔ یوں تو وہ ہر بدلتے ہوئے رجحان کو اپنے اندر داخل کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود احتیاط اور مزاج کی صلح پسندی نے کھل کر آگے آنے نہیں دیا ہے

سر برہنہ ایک سچائی کا شجر

تنہا کھڑا ہے

پتے پتے خشک پتے بکھرے ہوئے ہیں۔

(ز خسارات کا پس منظر)

فسردہ خاکوں کے پیرہن سے

ٹپکتا ہے قطرہ قطرہ

یہ خشک آنکھیں

— یہ خشک آنکھیں نہ رو سکی تھیں

قلم کی آنکھوں سے رو رہا ہوں

(ز ابلاغ)

سرشار کا مستقبل نمایاں ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنی نظموں میں طوالت کی بجائے اختصار سے کام لیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرشار ایک ٹوٹے ہوئے احساس کے شاعر ہیں جن کا انسلاک کسی خاص فلسفہ سے نہیں ہے۔ ابھی ان کا اپنا نقطۂ نظر مکمل شکل میں نہیں آیا ہے۔

رؤف خیر

رؤف خیر ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ اندرونی کرب، خالی پن، تنہائی کے موضوعات ان کی نظموں اور غزلوں میں ابھرتے نظر آتے ہیں۔ رؤف خیر نے عصر ادب سے ہم آہنگ ہونے کی بہت کوشش کی ہے۔ رؤف خیر کے لہجہ میں تیزی، چبھن، ہنگامہ خیزی نہیں۔ ابھی ان کے لہجہ میں ٹھہراؤ بھی نہیں۔ بلکہ ایک عام انسان کا لہجہ ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے لیکن مشتعل نہیں ہوتا۔ ان کی زبان میں چستی نہیں ہے۔ خیر نے تشبیہ، استعارے اور علامات کے مقابلہ میں خیال کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

ہم اپنے قتل کا اب کس سے خوں بہا چاہیں

ہم اپنے قتل کا اب کس سے خوں بہا چاہیں
ہر آئینے میں تو قاتل ہمیں دکھائی دیے تھا

ہر بار بدل دیتے ہیں لوگ اپنی نقابیں
بے چہرگیٔ زیست کی کیا کیا نئی گروہ ہے

کسی کے سنگِ ملامت سے اور حسد سے بچاؤ
مجھے جنوں سے بچاؤ مجھے خرد سے بچاؤ

خیر نظموں میں صرف ایک طرز کے خیال نہیں رکھتے اور ان کی نظمیں عنوان کی تابع ہوتی ہیں۔ خیر ایک محنتی شاعر ہیں، انھیں موضوعاتی ریخ سے باہر نکل کر کام کرنا چاہیے۔

علی ظہیر

علی ظہیر حیدر آباد کے ایک نئے شاعر ہیں جن کی فکر نے نئے رجحانات سے گہرا اثر لیا ہے۔ ظہیر کی نظموں میں ابہام اور لسانی بندشوں کی بجائے سادگی اور روانی ہے۔ ان میں نغمہ کا اثر بہت ہے۔ ظہیر نغمہ کو گویا اپنی نظموں کے لئے دیوار و در اور اپنے اظہار کے لئے ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہیں ؎

جب مرا لطفِ سخن چھینا گیا
ٹھنڈے لاوے کی چٹانوں کی طرح

سوچ سینے کے سیہ خانوں میں خاموش ہوئی
زرد سوکھے ہوئے پتوں کی قطاریں ہر سو
راستے ڈھک گئی

آج راہوں کے مقدر میں کوئی چاپ نہیں

(جب مرا لطف سخن چھینا گیا)

ظہیر کے پاس سوچنے اور بیان کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں بشرطیکہ وہ ان کو برتنے کے معاملہ میں مزید احتیاط سے کام لیں۔ ان کی شاعری سے کافی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

باذل عباسی

باذل عباسی ایک معتدل لہجہ کے نئے شاعر ہیں۔ ان کے پاس تراکیب کا ایک سرمایہ ہے لیکن انھیں چاہیے کہ ان تراکیب کو اس طرح استعمال کریں کہ ان کے معانی کو نئی جہت ملے۔ ان کے مضامین ہیں: شکستِ قیدِ جسم، انسانیت کی بے وقعتی اور یکسانیت۔ وہ ایک غم زدہ شخص کی طرح مناظر کی طرف دیکھتے ہیں اور ہر منظر سے اچانک مایوسی کی تلاش کرتے ہیں ؎

میں اپنے جسم کا قیدی کہاں کہاں بھٹکوں
کہ قیدِ جسم سے ہونا ہے اب رہا مجھ کو

مرا سراغ نہ پاؤ گے لاکھ سر مارو
کہ سطحِ خاک پہ پھیلا ہوا سمندر ہوں

نہ سرِ راہِ تفکر کوئی کوندہ لپکا
ابرِ آوارہ سے پانی کا نہ قطرہ ٹپکا
نغمۂ شوق کے ہونٹوں پہ تراوش نہ ہوئی
لفظ جلتے رہے، اظہار کی پرسش نہ ہوئی

(نا آفریدہ)

ابھی باذل کی شاعری پوری طرح سامنے نہیں آئی ہے پھر بھی وہ اپنے اندازِ بیان کے لئے نیا ذہن اور نئی شکل تلاش کریں تو ان کی فکری قوت اور کھل کر سامنے آئے گی۔

حیدر آباد کے ان تمام شعراء کا ذکر اس مضمون میں آگیا ہے جن کی شاعری میں زندگی کی لو اور جان ہے یا بھی شاعری

[illegible] ہیں جو شدید
سے نئے شعر کے علمبردار بن سکتے ہیں۔ ان میں واضح
طور پر غیاث صدیقی، جاوید مقصود اور علی اصغر
ہیں۔

اس جائزے میں وحید اختر کا ذکر نہیں ہے۔ کیونکہ
وہ اپنے آپ کو یو۔پی کے شاعر کی حیثیت سے نمایاں
کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ساہتیہ اکیڈمی
اتر پردیش میں اپنا مجموعۂ کلام "پتھروں کا مغنی" پیش
کر کے خود کو اسی علاقہ کا شاعر منوالیا ہے۔ ویسے یہ
حقیقت ہے کہ وحید اختر کی شاعری کا لب و لہجہ۔
حیدرآبادی ماحول اور تہذیب کا مرہونِ منت ہے۔

★

(ادارہ)

اسلم عمادی

اسلم عمادی حیدرآباد کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں
جو اس صدی کی چھٹی دہائی کے اواخر میں میدانِ شعر و
ادب میں داخل ہوئی۔ انھیں پڑھنے کے بعد یہ احساس
ہوتا ہے کہ شاعر جتنا حساس اور باشعور ہے، اتنا ہی
خلاق بھی ہے۔ عمادی کی غزلوں میں ایک ٹھوس
وقار اور تمکنت ہے۔

قطرے کی طرح ڈھلکتے رہے آئینوں پر
خود سے بھی بات نہ کی ہم کو غرور ایسا تھا
متصل یوں کہ جدا ہوں تو شکستہ ہو جائیں
ایک آواز کا تھا فاصلہ دوری ایسا تھا!

عمادی کی نظم پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے
شعور کی آنکھیں خامشی کے ساتھ ان کے لاشعور
کی حرکتیں دیکھ رہی ہیں اور ان کی انگلیاں قلم کو
اپنی لمبی لمبی باہوں میں دبائے نظم تخلیق کرنے میں
معروف ہیں ؎

میں نے خود کو گھول دیا ہے
پھیل رہا ہوں
میری لہریں ساری زمیں کو
اپنا رس اپنی آوازیں بخش رہی ہیں

- - - - - - - - - - - - - - - -

میں شیشہ تھا، ٹوٹ گیا ہوں
وقت کے قدموں سے لپٹا ہوں
("دریافت")

جو بات اسلم عمادی کی شاعری میں نمایاں ہے، وہ
ہے اپنے لہجہ پر ان کا اعتماد۔ ایک نئے شاعر کے لئے
یہ بات بہت مشکل ہوتی ہے کہ وہ اپنی نہج اور لہجہ
ڈھونڈ لے۔

●

بنگلہ دیش کے نام

کیف احمد صدیقی
میونسپل کالج۔ سیتاپور (اترپردیش)

کہاں ہے
لہو کی وہ بے خواب آنکھوں کی سوئی ہوئی نیند
آخر کہاں ہے
بجھاؤ اُسے میرے نزدیک لاؤ
زمین آسماں کی حدوں سے بھی آگے
سلگتی ہوئی زنگ آلود
تاریکیوں کی طرف جا رہی ہے

ہواؤں میں
امن و اماں کے فرشتوں کی لاشوں کی بدبو
بکھرنے لگی ہے
نفس در نفس آفتابی تمازت پگھلنے لگی ہے
مگر وقت کی بلغمی کھانسیوں کی وہی کیفیت ہے

سنو
وقت کے آہنی رہگزاروں میں کب تک
بھٹکتے رہو گے
یہ سورج تو یوں ہی دہکتا رہے گا
مگر روشنی تو بہت ہی بڑی چیز ہے
اب تمہیں
اپنے جسموں کی خاکستری کے لئے بھی
کبھی ایک شعلہ میسر نہ ہوگا
چلو اب بھی موقع ہے
اپنے لہو کی سلگتی ہوئی خاک میں
ڈوب جاؤ

اسلم آزاد
شعبۂ اردو
پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ

اگرچہ بارہا اس کا گلا مروڑا ہے
ترے خیال نے پھر بھی نہ ساتھ چھوڑا ہے
سراغ مل نہ سکا دل کے قتل کا، یعنی
سیاہ رات نے اک نقش بھی نہ چھوڑا ہے
فضا میں جس نے اڑائے ہیں قہقہوں کے غبار
وہ نوبیاہتا کتنا حسین جوڑا ہے
اچھلتی کودتی بڑھتی چلی ہی آتی ہے
ندی کے رخ کو ادھر آج کس نے موڑا ہے
چمکتا رہتا ہے ہر لمحہ مثل رنگ ہوس
ہمارے دل پہ عجب اس نے نقش چھوڑا ہے
لہو کا رنگ فضا میں بکھر گیا اسلم
ہوا کے جسم میں نشتر سا کس نے توڑا ہے

سانپ

رات کا دوسرا پہر سردی میں ڈوب کر جمنے لگا تھا۔ چراغ کے اطراف روشنی کا کرہ مرکز کی جانب سکڑنے لگا۔

"اللہ رحم کر ــــ" ایک نسوانی آواز تاریکی کی دبیز دیواروں سے چھن کر آئی۔

"کیا بات ہے ــــ اندھیرا کیوں ہوگیا ــــ؟" کوئی پریشانی سے بولا۔

"قسمت ہی تاریک ہے۔ مٹی کا تیل ختم ہوگیا ہے جاؤ کہیں سے مانگ لاؤ۔ میرا تو دم گھٹنے لگا ہے۔ جاؤ جلدی کرو" تاریک کمرہ سے سسکیاں بدستور چھن رہی تھیں عورت کی آواز سن کر کوئی بے تحاشہ گھر سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ اس کے قدم بڑی تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر وہ کواڑ کھٹکھٹانے لگا۔

"کون ہے ــــ؟" اندر سے ایک خواب زدہ آواز آئی

"میں ہوں۔ ایک ضروری کام تھا" اسکی آواز التجا کی طرف مائل تھی۔

"اچھا اچھا ــــ تو ہے ــــ ٹھہر" دکان کا کواڑ کھلا۔

"گھر میں مٹی کا تیل ختم ہوگیا ہے ــــ تجھ کو تو پتہ ہے ــــ میری بیوی بیمار ہے۔ ــ اسے اندھیرے میں ہول آتا ہے ــــ آدھا لیٹر تیل دیدے ــــ تجھے تکلیف تو ہوگی صبح پیسے دیدوں گا ــــ اندھیرے میں کچھ سوجھتا ہی نہیں ــ" آواز کی کپکپاہٹ چھپانے کیلئے اس نے کھنکار

"تیل ــــ!؟" دوکاندار کو جیسے بڑی حیرت ہوئی۔

"دوکان میں تو نہیں ہے ــــ پر ٹھہر ــــ گھر اندر دیکھتا ہوں" اور جب وہ واپس باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لالٹین تھی "کل لا دینا ــــ جورو کا جی خراب ہے تو چلی کو گاؤں کیوں بھیج رکھا ہے ــــ بھلا کیوں نہیں .... ــــ"

دوکاندار کا یہ جملہ دروازے کے کواڑوں سے کٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا ــــ پہلے آدھے نے سڑک پار ہونے تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ لالٹین جلا کر اسے کمرہ میں کرتا ہوا بولا "اب کیسی ہے ــــ؟"

"ــــ .... بھلا کیوں نہیں لیتا۔ ایک سے دو بھلے بیٹی سے جی لگے گا تو حالت کچھ سنبھل جائیگی" بقیہ آدھا زخمی جملہ گھسٹتا ہوا اس کے سوال کے جواب میں سسکیوں اور کراہوں کی شکل میں کمرہ سے برآمد ہوا۔ ایک نسوانی ہاتھ نے لالٹین لے لی۔

"کیسی ہے اب ــــ؟" وہ بیقراری سے بولا۔

"چپ رہو جی" کپکپاہٹ کی آواز آئی۔ لالٹین صندوق پر رکھی تھی۔ سردی سے اسکا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ روشنی میں اسے صرف صورت نظر آئی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس نے اپنی آنکھوں کو مضبوطی سے بھینچ رکھا تھا۔ زخمی ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ رہ رہ کر سر پٹک رہی تھی۔ اس سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ وہاں سے ہٹ کر وہ سجدہ میں گر گیا۔ بہت دیر تک اس کے آنسو مٹی کے فرش میں جذب ہوتے رہے۔

[illegible]

[illegible] جب ...

بجلی کی بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ میری جھونپڑی سے کچھ
فاصلے پر چھپ کر میں باہر سے دیکھا کرتا تھا۔ اکثر لڑکے
ہوتے تھے اور کھڑکیوں سے جھانکتے تھے جیسے ان کی اپنی
کہانیاں اور میری پڑی ہو تھی اور کچھ دیر بعد انہیں کچھ
تو مل گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم چھپتے لگے۔ لوگ واپس ہو گئے
معلوم نہیں لوگ اپنے بچوں کو کہاں سے یوں کس طرح پھینک
پاتے ہیں۔" ایک بوڑھے نے حیرت ظاہر کی۔

"بھیا کلجگ ہے۔ رام جانے کس کا پاپ تھا۔" رام کشن
نے تبصرہ کیا۔

"تو پھر بتاتا کیوں نہیں۔ تیرا نام بھی تو رام ہے۔ ہی ہی ہی"
بدھو نے اپنے دانتوں کی نمائش کر دی۔ سب لوگ ہنس پڑے۔

"سردار کہاں ۔۔۔ تو کیوں چپ ہے۔" "ارے ہاں تیری
جورو کا جی اب کیسا ہے۔" سردار خان کو چپ پا کر بدھو کو جیسے
کچھ یاد آ گیا۔

"اب اچھی ہے۔ رات بڑی تکلیف سے گزری۔ کل تو اگر
لالٹین نہ دیتا تو آج صبح سے اس کی میت کی تیاری کرتا ہوتا"

"ارے ۔۔۔۔ برے شبد منہ سے کیوں نکالتا ہے۔" رام کشن
نے اسے ٹوکا۔ "بھگوان اسے اچھا کرے۔ پر کیا روگ
ہے اسے؟"

"کمر پر سرطان کا گلڈ ہے۔ دل بھی کمزور ہے۔ خون بہتا ہے
بھیا مجھ سے تو اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔"

"تو دھیرج رکھ ۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹری
علاج کرا بھلا۔" رام کشن کی آواز میں بڑا خلوص تھا۔

"ڈاکٹری علاج ہی ہے۔ کچھ فائدہ بھی ہے۔ صبح سے تو

[illegible]

جیسے اس جملے کے بعد خاموشی چھا گئی۔

سردار کہاں۔ اس سوال کے جواب کے لیے سب ہی تیار
کیا گیا تھا جب "بدھو نے بات کا رخ پھیر کر اصل واقعہ
کی طرف موڑ دیا۔ لیکن اس واقعہ میں جیسے مزا کیا تھا
"میں ۔۔۔ میں کیا کہوں۔" سردار خان جیسے اپنی بیوی کی
قبر میں سے بولا۔ اس کی آواز نے سب کی گردنوں تک ایسا
خول چڑھا دیا جس میں سے وہ لوگ نہ تو بول ہی سکتے
تھے اور نہ ہی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ ان سب
سے رخصت ہو کر مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا وہ دالان
میں داخل ہوا۔ رات کے واقعات ایک بار پھر اس کی
نگاہوں میں پھر گئے۔ اور پانی بن کر آنکھوں میں تیرنے
لگے۔ راستے بھر وہ یہ واقعات تو دیکھتا رہا تھا۔ غلام محمد
کے پاس کھڑے ہو کر اس نے انہیں رومال میں جذب کر لیا
اس کے قدم ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک گئے۔ کوٹھے سے فرار ہونے
والی بیمار سرگوشیوں میں سے جو اچانک اس کے ہاتھ
لگ گئی وہ تھی۔

"اماں اس دن میں گھر میں اکیلی تھی ۔۔۔۔۔ بدھو چچا بابا کو
پوچھتے ہوئے سیدھے گھر میں اندر چلے آئے اور میری
طرف بڑھتے ۔۔۔۔۔۔"

سردار خان کو یوں لگا جیسے بدھو نے مٹی کا تیل چھڑک
کر اسے آگ لگا دی ہو۔ ■

ممتاز یوسف
سلیم منزل۔ منظور پورہ
اورنگ آباد

لہو کی داستاں ہزار

خاطر حافظی
اوے گنج، باغ آئینہ بی ۵، لکھنؤ

لہو کی داستاں ہزار
لہو ہزار رنگ ہے
ہر ایک قطرہ خون کا جوان سر خیال لئے
مچل رہا ہے جسم میں ابھان اگر میاں لئے
نشان رنگ رنگ ہے
لہو کی داستاں ہزار
لہو ہزار رنگ ہے
شہید جسم و جاں کا عذاب دائمی نہیں
فضا سے جو کشید ہے شراب دائمی نہیں
شکار رنگ رنگ ہے
لہو کی داستاں ہزار
لہو ہزار رنگ ہے
زمیں سے آسمان تک کئی چراغ جل بجھے
شکستہ آرزو کے بت خلا میں ٹوٹتے رہے
فشار رنگ رنگ ہے
لہو کی داستاں ہزار
لہو ہزار رنگ ہے
خیال کے حدود تک ثبات این و آں غلط
شعور ذات کے لئے شعور جسم و جاں غلط
وقار رنگ رنگ ہے
لہو کی داستاں ہزار
لہو ہزار رنگ ہے

۴۴ پیکر حیدرآباد

نسیم چمن
۲۷، کوٹھی روڈ۔ اجین (مدھیہ پردیش)

غزل

میں کیا تمہارے جسم کے سانچے میں ڈھل گیا
خود اپنی دسترس سے میں آگے نکل گیا
اک اژدھا نگل ہی رہا تھا مجھے کہیں
بستر میں سوتے سوتے کوئی شخص اچھل گیا
محفوظ تھا میں کچی فصیلوں کے درمیان
بیٹھے بٹھائے گھر سے میں باہر نکل گیا
سو کر اٹھا تو لوگوں کو کہتے ہوئے سنا
اک رات میں زمین کا نقشہ بدل گیا
ہر فلسفے کو زیست کی ٹھوکر پہ مارتا
میں وقت کی حدود سے آگے نکل گیا
سورج نگل نگل کے گزارا ہر ایک سال
اب کے برس میں سرد ہواؤں میں جل گیا

رہی تھی۔ لیکن وہ لڑکی کی خوبصورتی سے حیرت زدہ نہیں تھا
بلکہ حیرت اسے مشابہت پر ہو رہی تھی۔ چند روز قبل ایسی ہی
ایک لڑکی ستی سے اسکی ملاقات نٹ راج ہوٹل میں ہوئی
تھی۔ لیکن وہ ایک مسلمان لڑکی تھی۔ ہوٹلوں میں بکنے والی
ایک آبرو باختہ لڑکی تھی اور تصویر والی لڑکی جو ستی سے صورتاً کافی
حد تک ملتی تھی۔ وہ ایک شریف اور باعزت گھر کی دیوی تھی
دنیا میں بہت سارے انسان ایک دوسرے سے ملتے
ہیں لیکن ضروری نہیں کہ چہرے کی مشابہت کا اثر کردار پر
بھی ہو۔ تصویر والی لڑکی کے چہرے پر کس قدر بھولا پن تھا
اسے اپنے خیال پر افسوس ہونے لگا۔ ایک دیوی کا مقابلہ
وہ ہوٹلوں میں بکنے والی نیچ ذات کسی لڑکی سے کر رہا تھا۔
دل ہی دل میں وہ اپنی سوچ پر لعنت بھیجنے لگا۔ ایک طرف
وہ افسوس کر رہا تھا تو ذہن میں ستی سے ملاقات کے مناظر
ابھرتے جا رہے تھے۔ راجو نہیں چاہتا تھا کہ ایسے اچھے
وقت میں اسے اپنے کردار کی ناپاک تصویر نظر آئے۔ لیکن نہ
چاہنے کے باوجود ستی کی ادائیں تصویر کا روپ لئے واضح
ہونے لگیں ___!

نٹ راج شہر کا ایک مشہور ہوٹل تھا۔ اور اس کا بار عیاشی
کیلئے سب سے محفوظ اور پرسکون جگہ تھی۔ باہر سے آنے والی
لڑکیوں اور ان عورتوں اور مردوں کیلئے یہ نہایت ہی محفوظ جگہ
تھی جو مشرقی تہذیب میں بھی جنسی آزادی کا پورا پورا لطف لینا
چاہتے تھے۔ بار کے اوپر آرام دہ کمرے تھے اور ان میں
بہترین انتظام تھا۔

اس وقت بار میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ ہلکی سردی کی رات
[illegible] ہو آئی۔

تھی۔ راجو چند ہی [illegible]
جس کے اردگرد وہ لڑکیاں تھیں جو خوش شکل نوجوان [illegible]
چھیڑ کر رہی تھیں۔ یکایک راجو چونک پڑا۔ احساس کی [illegible]
میں چمک آگئی اور وہ کافی دلچسپی سے نوجوان لڑکی کو دیکھنے لگا

لڑکی بڑی خوبصورت تھی۔ بروکیڈ کے سفید فراک میں اس کی چست
فضا میں اس کا گداز جسم کافی دلکش لگ رہا تھا۔ گھونگھریالی لٹیں
جیسے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایسے جیسے کہ ستاروں سے بھرے
موتیا کے بیلوں میں تازہ پھول کھلے ہوں۔ سامنے کی میز پر
لڑکی کے بالائی جسم کے نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ لڑکی چاروں
جانب سرسری نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ اور جب اس کی نظر
راجو پر پڑی اور اسے اپنی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے پایا تو وہ
خود بخود مسکرا اٹھی۔ راجو کو لگا جیسے اس کی آنکھوں میں بجلی
کا کوندا چمک گیا ہو۔ اس نے بے اختیار لڑکی کو اپنے پاس
آنے کا اشارہ کیا۔ وہ زیر لب مسکرائی اپنی نازک کمر کو بل دیتی
اس کی طرف آنے لگی۔ پہلی میز سے ایک نوجوان نے اسے
مخاطب کیا "ڈارلنگ"

"ایکسکیوز می" لڑکی میٹھی آواز میں بولی "میں اس میز پر
جا رہی ہوں!" نوجوان نے اپنے سینے کو کبوتر کی طرح نکال کر
راجو کو دیکھا۔ سرخ اور تندرست راجو کو دیکھ کر وہ منہ بنا کر
بولا "ایڈجسٹ"

"کون ڈارلنگ ___؟" ایک بھدے شکل والی لڑکی نے اس
نوجوان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نوجوان نے لڑکی کے کولہے میں چٹکی لیتے ہوئے کہا "میرا
دل!___" "اوں" وہ کراہ کے بے رخی سے دیکھنے لگی۔
لڑکی کے تکلیف دہ انداز پر سارے لوگ بے ساختہ ہنس

[illegible] میں ماحول
[illegible] جنسی کیفیت رکھی تھی۔

لڑکی راجو کے مقابل بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ چند زاویوں سے
اعتدال کی حد تک خوبصورت تھا۔ گندمی رنگ، چوڑی پیشانی۔
گول چہرہ اور لمبی ناک، تیر کی طرح ابرو کے نیچے جھیل سی آنکھیں
جیسے پرسکون سطح پر کرنوں کا جال۔ گلابی لپ اسٹک نے اس
کے پتلے ہونٹوں کو گلاب کی ملائم پتیوں کی طرح بنا دیا تھا اور
آنکھیں بھی اس قدر حسین تھیں کہ چند لمحوں کیلئے راجو اس میں کھو
سا گیا۔ سینٹ کی تیز خوشبو کے ساتھ اس کی جوانی بھی تیز اور
اُبلتی ہوئی تھی۔

"کیا پینا پسند کرتی ہو؟"

"بیئر" وہ لب چاٹتے ہوئے بولی۔

"ارے یہ تو ۔۔۔"

"پلیز" اس نے ٹھنک کر بات کاٹ دی اور کہا "میں بہک بہک
سے گھبرا جاتی ہوں!" لڑکی کا یہ نخرے والا انداز اپنے اندر بہت
سیکس اپیل رکھتا تھا۔ راجو نے بہت ہی پیار کی نگاہوں سے
دیکھ کر پوچھا "تمہارا نام"

"ستی"

"بس ۔۔۔!" راجو نے کہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس قسم کی
لڑکیاں اپنی خوبصورتی کی طرح نام بھی مختصر رکھتی ہیں۔

"کیوں ۔۔۔" ستی نے ذرا تکلف سے پوچھا "اس سے آگے اور
کیا چاہیے۔؟"

"میٹھی آواز میں کہو۔ جیسے زبان پر گھلتا رس" راجو اس کے
ہاتھ کو دبا کر بولا "آئی ایم سوری"

جواباً ستی نے اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں"

[illegible] مسکراہٹ [illegible] دھن نے بار میں
ہیجان پیدا کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیئر اور وہسکی کے
گلاسوں میں دوستانہ جنگ چلنے لگی۔ کچھ لوگ ستی کو غور
بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور راجو ان لوگوں کو یوں دیکھ
رہا تھا جیسے پہلی بار اس کے ہاتھ بہت ہی شاندار کھلونا لگ گیا ہے
دل ہی دل میں وہ اپنی ذہانت پر ہنستے ہوئے بولا "چلو"

ستی نے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ کہاں ۔۔۔ یہ
اس لئے کہ وہ اس وقت آنے اور جانے کا مقصد خوب جانتی
تھی۔ وہ راجو کی باہیں پکڑے اوپر آئی۔ اور راجو کے ساتھ
ایک کمرے میں کے اندر آ کر پلنگ پر گر سی گئی۔ ستی کو گرم جوشی
کرتے ہوئے راجو نے پوچھا "روز کتنا کما لیتی ہو؟"

"وہ آدمی پر منحصر ہے" ستی مسکرائی اور خوش لہجے میں کہا۔
"کبھی تو خوب۔ نہیں تو ۔۔۔"

کمال بل دیا کر وہ ستہ آمار نے لگا پھر اس نے پوچھا "اور
اس سے گزر ہو جاتا ہوگا؟"

"ارے واہ۔ تم تو الیکشن میں لڑنے والے کسی امیدوار کی
طرح پوچھ رہے ہو" ستی اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔
"میں اکیلی نہیں جیتا جی۔ میرے علاوہ دو اور بہنیں ہیں۔" اور
یکایک کچھ سوچ کر بل اٹھ کر اس نے تیوری چڑھا کر کہا "لیکن
ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ اب میں تمہارے کسی سوال کا جواب
نہیں دوں گی"

ستی کی ہر ادا میں نزاکت تھی۔ راجو لاجواب سا ہو گیا اور خفت
مٹانے کیلئے وہ بیرے کو آرڈر لکھانے لگا۔

آدھی شب گزر چکی تھی۔ ساری دنیا خاموش تھی۔ راجو پلنگ
پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ ستی کے جھنجھوڑنے پر وہ ہڑبڑا کر

پیکر حیدرآبادی

جاوید مقصود

۲۲-۳-۲۲۲، حسینی محلہ۔ حیدر آباد-۲۴

پھر نگاہوں، دلوں کے وسیع دائرے تنگ ہونے لگے
وہ مثلث کہ جس کا اہم زاویہ
میرا ہم نام تھا
دائرہ بن گیا
دائرہ تنگ ہوتا گیا
دائرہ بے مکانی کا تھا اک نشاں
دائرے کا تھا انجام بے حاصلی
ہم کو اپنی بضاعت پہ جو ناز تھا
مٹ گیا
کتنے بے نام چہروں سے رشتہ جڑا
کتنے بے روح اجسام ساتھی بنے
اپنے شانوں پہ سر دوسروں کے سجائے ہوئے
لوگ سقراط خود کو سمجھتے رہے
ایسے مصنوعی دانش وروں کا پھر اک
دائرہ بن گیا
بستیوں اور شہروں میں جو کی تجارت بھی
اُن کو دشتِ جنوں سے بھی نسبت رہی
شاعری کی دکاں جن کی ٹھپ ہو گئی
ایسے کم ظرف نقاد بننے لگے
ایسے تاجر
مری ہر تمنا کی بے حاصلی پر ہنسے
جسم ہی جسم ہے جن کا زادِ سفر
کاسۂ روح خالی ہے ان کا اگر
کیوں گلہ ہے انھیں
(روح سے ان کا رشتہ ہی کیا!)

●

ایک عرصہ تلک میں انہی دیوتاؤں کا تھا
ہم سفر
اب چلا ہے پتہ
کہ وہ بے نام چہرے فقط عکس تھے
وہ تو بے روح بے جسم بے ذہن تھے
ایک سکے کی تابش کے محتاج تھے
ایک سکہ جو ہے دائرے کی طرح
دائرہ — جس کا ہر زاویہ سے ہے
مرکز کا بس ایک ہی فاصلہ

●

وقت کے بحرِ امواج کی تھاہ میں
سیپ بیٹھی رہے گی یونہی بے گہر
آبِ نیساں کبھی بھی نہ برسے گا اب
لاکھ موجوں کے بنتے رہیں دائرے

مجتبیٰ حسین
۸۴-۵-۱۶ فرحت نگر۔ دبیر پورہ
حیدرآباد-۲۴

ادیب میری یادداشتیں

میں جب بھی جورد گاہ کے کمرہ نمبر ۲ پر جاتا اور ادیب کے ہمراہ کسی ایسے شخص کو دیکھتا جو میرے لئے اجنبی ہوتا تو میں فوراً وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش شروع کر دیتا۔ کیونکہ ایک اجنبی شخص کی موجودگی میں ادیب سے ملنا کم از کم میرے لئے بہت تکلیف دہ ہوا کرتا تھا۔ ایسی صورتوں میں وہ میرے پیچھے پڑ جاتے اور کہا کرتے "اچھا ہوا تم آگئے۔ ان سے ملو یہ فلاں صاحب ہیں۔ لکھنؤ سے آئے ہیں۔ تم انہیں ذرا وہ لطیفہ تو سنا دو"

میں انجان بن کر کہتا۔ "کون سا لطیفہ؟"

"ارے وہی لطیفہ جو تم نے میرے بارے میں گڑھا ہے۔ وہی مستری والا!"

میں شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا ہوں کیونکہ ادیب مجھے پہلے مجبور کیا کرتے تھے کہ میں اس لطیفہ کو ہر نئے آنے والے شخص کے سامنے سناؤں۔ میں ان کی بات کو ٹال جانے کی کوشش کرتا مگر وہ مسلسل اصرار کرتے کہ "موصوف بھی تم سے یہ سننا چاہتے ہیں۔"

میں رونی صورت بنا کر لطیفہ سنانا شروع کر دیتا۔ "آپ صاحب سنیے۔ لطیفہ صرف اتنا ہے کہ ادیب اپنے مکان کی کمپاؤنڈ وال کو اونچا کرنا چاہتے تھے۔ ایک بڑا مستری نے اس کام کا ٹھیکہ اپنے ذمہ لے لیا۔ بدقسمتی سے یہ مستری سخن فہم ہونے کے علاوہ ادیب کا مداح بھی تھا۔ گویا کریلا وہ بھی نیم چڑھا۔ اب وہ ہر روز ادیب کے گھر پہنچتا اور پوچھتا کہ کمپاؤنڈ وال کی تعمیر کا کام کب سے شروع ہونے والا ہے۔"

ادیب کہتے "بھئی ابھی تو پیسے کا بندوبست نہیں ہو پایا ہے پیسہ آئے گا تو میں دیوار کی تعمیر کے لئے وہ مال خریدوں گا اور تمہیں اطلاع دوں گا۔"

اس کے باوجود مستری پھر روزانہ ادیب کے مکان پر پہنچ جاتا اور دیوار کی تعمیر کے لئے اصرار کرتا۔ ادیب بہت ...

سنائے بغیر ادیب مجھے جانے نہیں دیں گے۔

میں پھر لطیفہ سنانا شروع کر دیتا اور انھیں کی سہولت کے لئے
کہنے لگتا "اس لطیفہ کو سمجھنے کیلئے آپ کو شاہ نوری صاحب
سے واقف ہونا ضروری ہے۔ شاہ نوری ادیب کے اسسٹنٹ
کے طور پر "صبا" کا کام کرتے ہیں۔ ایک دن ایک صاحب
اپنے چپراسی کے ذریعہ ادیب کو ایک خط بھیجنا چاہتے تھے
انھوں نے اپنے چپراسی کو بلا کر کہا "یہ خط لے کر کمرہ نمبر ۲۴
پر جاؤ۔ اور وہاں سلیمان ادیب کو دے آؤ۔" چپراسی نے
ادیب کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے کہا "اگر آپ ان
کا حلیہ بیان کر دیں تو مجھے پہچاننے میں آسانی ہوگی" ان
صاحب نے کہا "ارے تم سلیمان ادیب کو نہیں جانتے؟
لمبے لمبے بال رکھتے ہیں، اونچے پورے ہیں، گورا رنگ
ہے" چپراسی نے پھر بھی انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا
تب ان صاحب نے کہا "ارے بھئی! سلیمان ادیب کو
کون نہیں جانتا۔ مشہور شاعر ہیں۔ چہرے پر چیچک کے داغ
ہیں۔ کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں۔"

اس پر چپراسی نے اچانک اپنے دماغ پر زور دیتے ہوئے
پوچھا "صاحب! آپ کا اشارہ کہیں ان صاحب کی
طرف تو نہیں ہے جو اکثر شاہ نوری صاحب کے ساتھ
پھرتے رہتے ہیں۔"

اس پر ادیب پھر ایک بار قہقہہ لگا کر کہتے "دیکھئے صاحب!
یہ حیثیت ہو گئی ہے ہماری کہ لوگ شاہ نوری کے توسط
سے ہمیں پہچاننے لگے ہیں جیسے ہماری کوئی حیثیت ہی نہ
ہو گی" میں یہ لطیفہ سنا کر کافی مطمئن ہو جاتا کیونکہ ادیب
کے بارے میں میرے پاس صرف تین ہی لطیفے تھے۔
ادیب اکثر پوچھتے "تم نے میرے بارے میں صرف تین
ہی لطیفے کیوں بنائے ہیں؟"

میں کہتا "ادیب صاحب! سچ تو یہ ہے کہ میں چاہوں تو
میں سینکڑوں لطیفے بنا سکتا ہوں لیکن مجھ سے یہ نہیں
ہو سکتا کہ میں ایک ہی لطیفہ کو سینکڑوں مرتبہ سناؤں
میں تو یہ تین لطیفے بنا کر ہی پچھتا رہا ہوں۔ جب بھی باہر
سے کوئی مہمان آتا ہے یا کوئی ادبی شخصیت آتی ہے
تو آپ اکبر اعظم بن جاتے ہیں اور میں صرف ملا دوپیازہ
بن کر رہ جاتا ہوں۔ آخر یہ میری بھی تو کوئی حیثیت ہے"
ادیب اس بات پر بھی مسکراتے۔

میں نے بہت سی زندہ دل شخصیتیں ایسی بھی دیکھی ہیں
جو اپنے بارے میں لطیفے سن کر ناک بھوں چڑھانے
لگتی ہیں مگر اس معاملہ میں ادیب کا حال جداگانہ تھا۔
وہ اپنے بارے میں ہونے والے مذاق کو عام کرنا چاہتے
تھے۔ بلکہ ایک نوبت تو وہ بھی آتی تھی جب لطیفہ گھڑنے
والا خود ایک لطیفہ بن جایا کرتا تھا۔

ادیب کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۵۲ء میں گلبرگہ میں
دیکھا تھا۔ ہم لوگوں نے گلبرگہ میں ایک کل ہند مشاعرہ
کا اہتمام کیا تھا جس میں ادیب شرکت کرنے کے لئے
آئے تھے۔ میں اس مشاعرہ کا منتظم تھا۔ میری عمر یہی
کوئی سترہ سال ہوگی۔ گویا یہ وہ عمر تھی جہاں سے
آدمی لغزشوں کا آغاز کرتا ہے۔ اس عمر میں اچھا شعر
کا مفہوم تو سمجھ لگتا ہے لیکن شعر پر عمل کرنے کی
ہمت اس میں نہیں ہوتی۔ آدھی رات کا وقت تھا
جب ادیب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شولاپور سے گلبرگہ
کے اسٹیشن پر اترے تھے۔ ادیب اپنے ساتھیوں

[illegible]
[illegible] ہے خلوص [illegible]
[illegible] ایک آٹوگراف بک
[illegible] میں پورے مشاعرہ کا مقصد تھا اس لئے
[illegible] انتظامات کی گڑبڑ میں بے خلوص
کے آٹوگراف لینے کا موقع نہ مل سکا۔ اسی غم شِیشن
پر [illegible] اپنا آٹوگراف بک سب سے پہلے ادیب
کی جانب [illegible] انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھتے
ہوئے کہا "رات کے ڈیڑھ بج رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی
وقت ہے آٹوگراف دینے کا"

شاہد صدیقی نے جو بازو ہی کھڑے تھے اچانک کہا "ادیب
تم وقت نہ دیکھو بلکہ فوراً اپنا آٹوگراف دے دو۔ یہ لوگ
کل تمہاری شاعری سن لیں گے تو شاید تم سے آٹوگراف
لینے نہ آئیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مشاعرے
سے پہلے ہی آٹوگراف دے دو تمہیں دوسروں کی غفلت
سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

ادیب نے ہنستے ہوئے کہا "ایسی بات ہے تو پھر مجھے
ابھی اپنے آٹوگراف دے دینے چاہئیں۔" یہ کہتے ہوئے
ادیب نے فوراً قلم نکالا اور آٹوگراف بک پر دستخط کردیے
مشاعرہ میں ادیب نے بڑی جاندار نظم سنائی۔ مجھے ادیب
کی اس نظم کے کئی بند آج بھی یاد ہیں اور وہ آٹوگراف
بک آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ پھر کئی برس بیت
گئے۔ میں بنگلور سے حیدرآباد آگیا اور ادبی محفلوں میں
ادیب سے لگاتار اور مسلسل ملاقاتیں ہونے لگیں اور
مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ادیب [illegible] بہت سے [illegible] کہا جا سکتا ہے خالہ زاد
لئے گھومتا ہے۔ چنانچہ ادیب کے اطراف بہت سے
لوگ خالہ زاد جمع رہا کرتے تھے۔ میں نے جب بھی ادیب
کو دیکھا انہیں خالہ زاد لوگوں میں گھرا ہوا دیکھا۔ وہ خالہ زاد
گھنٹوں دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتے اور بڑا خلوص سے
بحثیں کیا کرتے تھے۔ کمرہ نمبر ۱۱ اصولاً تو "صبا" کا دفتر
تھا مگر عملاً یہ ادیب کے دوستوں کا اڈہ تھا۔ وہ صبح میں
اس ارادے سے اپنے گھر سے نکلتے تھے کہ دفتر میں
بیٹھ کر کام کریں گے لیکن "صبا" کے دفتر پر پہنچتے تو دوستوں
کے نرغے میں پھنس جاتے دن بھر گپیں ہوتیں۔ چائے
کے دور چلتے اور محفل کمرہ نمبر ۱۱ سے اٹھ کر سڑک پر بیٹھ
رہتی۔ ادیب ہر روز اپنے ساتھ بیگ لے کر آتے لیکن
کبھی اس بیگ کو کھولنے کی نوبت نہ آتی۔ یہاں تک کہ
"صبا" لیٹ ہو جاتا۔ خریداروں کے خطوط آنے لگتے
ایجنٹ یاد دہانی کرانے لگتے۔ لیکن ادیب کی بے نیازی
میں کوئی فرق نہ آتا۔ میں ادیب سے کہا کرتا "صبا اردو
کا واحد ماہنامہ ہے جو سال میں چار مرتبہ پابندی سے
شائع ہوتا ہے۔" ادیب کے اطراف بھانت بھانت کے
لوگ جمع رہتے تھے۔ ایسے لوگ بھی رہتے تھے جن سے
کوئی شاعر یا ادیب چند منٹ کے لئے بھی بات نہیں کرسکتا
تھا مگر ادیب ان سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ ادیب
کی ذات ایک ایسا گھاٹ تھی جس پر شیر اور بکری دونوں
ایک ساتھ پانی پیا کرتے تھے۔ حیدرآباد کا کوئی بھی مشاعرہ
ادیب کے بغیر نہ تو کامیاب ہو سکتا تھا اور نہ ہی فیل ہو سکتا
تھا۔ بہت کم شعراء ایسے ہوں گے جن میں بیک وقت
مشاعرے کو کامیاب بنانے اور اسے فیل کرنے کی اتنی

دنیا کی ان باتوں پر ہنستے ہنساتے تھے آپ کو
یوں لگا جیسے غالب کے بعد اگر اردو شاعری نے کوئی بڑا شاعر
پیدا کیا ہے تو وہ خود ہیں۔ اس وقت گردن اٹھا کر دنیا کی
طرف یوں دیکھتے جیسے وہ ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھ گئے ہوں۔
اسی موڈ میں اریب کی اپنے ساتھیوں سے ان بن ہو جایا
کرتی تھی۔ دوستوں سے خوب لڑتے جھگڑتے مگر دوسرے دن
ملتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا بلکہ وہ دوستوں
سے ہنس کر پوچھتے کہ انھوں نے رات میں کس کس کو کیا کیا کہا
تھا اور پھر خود ہی اپنی باتوں پر ہنستے تھے۔

پھر اریب ایک دن اچانک بیمار ہو گئے۔ کسی نے بتایا کہ
ان کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ ان دنوں ادب میں ترسیل کے مسئلہ
پر رسالوں میں بڑی بحث چل رہی تھی۔ ایک دن اریب
سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا "اریب صاحب! آپ تو سچ
مچ ترسیل کا مسئلہ بن کر رہ گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب
سے آپ کی آواز بیٹھ گئی ہے آپ کو ترسیل کا مسئلہ بڑی آسانی
سے سمجھ میں آگیا ہوگا۔"

اریب نے بیٹھی ہوئی آواز میں ہنسنے کی کوشش کی لیکن ان
کی آنکھوں نے بڑا زوردار قہقہہ لگایا۔ اریب کے ہونٹ کم مسکراتے
تھے۔ اور ان کی آنکھیں زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر چند دن بعد
ملے تو ان کے گلے میں پلاسٹک کا ایک خول چڑھا ہوا تھا۔ میں
نے پوچھا "یہ کیا ہے"

کہنے لگے "ضعف نے گلے میں پٹہ باندھ دیا ہے۔"

میں نے کہا "اریب صاحب! آپ تو ہمیشہ پٹے تڑاتے رہے
ہیں۔ اس پٹے کی کیا اہمیت ہے؟"

بولے "مگر کسی پٹے کو توڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔" اریب نے
یہ بات اس وقت کہی تھی جب ان کی زندگی کا پٹہ ٹوٹنے کا

[illegible] حیدرآباد

تھے پھر چند دنوں [illegible]
اور ہم سب [illegible]
میں ان کے پاس جلد جلد جانے لگا۔ موت اریب کے بہت
قریب آگئی تھی مگر اریب پھر بھی موت سے بہت دور تھے
وہ ہمیشہ یونہی مسکراتے جیسے پہلے مسکرایا کرتے تھے۔ اریب
کی مسکراہٹ کینسر کے غدود سے بہت دور تھی۔ کینسر نے اریب کو
تو زیر کر لیا تھا لیکن وہ ان کی مسکراہٹ پر کوئی کمند نہیں
پھینک سکی تھی۔

اسی اثنا میں مخدوم بھی چل بسے۔ مخدوم کے جنازہ میں بھی
میں نے اریب کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ جیسے وہ جانتے
تھے کہ انہیں مخدوم کی موت پر آنسو نہیں بہانا ہے کیونکہ
مخدوم سے ان کی جدائی بہت عارضی ہے۔ صرف چند دنوں،
چند مہینوں کی بات۔ اسی لئے انھوں نے دوسروں کو ہی
کھل کر رونے کا موقع دیا اور خود ہنستے رہے۔ مخدوم کے
جلسۂ تعزیت میں اریب نے ایک مضمون پڑھا تھا اس مضمون
کے ردعمل کے طور پر ان پر انڈے بھی پھینکے گئے۔ اس واقعہ کے
بعد اریب کے جذبات کافی تلخ ہو گئے تھے اور دوستوں کے
لئے بھی ان کے رویے میں تبدیلی آگئی تھی۔ ایک دن عابد
روڈ پر نظر آئے تو مجھے دیکھ کر انجان بن گئے۔ مجھے یوں لگا
جیسے اریب اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان پر
انڈے میں نے ہی پھینکے تھے۔ میں نے بھی انھیں چھیڑنا
مناسب نہیں سمجھا۔ اسی اثنا میں اسعد اللہ برلن سے
آگئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے "چلو آج کی شام اریب
کے ساتھ گزاریں گے۔"

میں نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ اریب مجھ سے کچھ

[illegible]

[illegible]

کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔" مگر [illegible] نہ رہنے دیں گے [illegible] "ثبوت لیکن ثبت" میں پڑ گئے۔ [illegible] تب مجھ پر کچھ بھید منکشف ہوئے مگر پہلے انھوں نے یہ سے مطلب پوچھا کہ "یہ بھی اتنا تو بتاؤ ادبی حلقوں میں حرف کا جو کچھ [illegible] کرتے ہو۔ آج بھی کا جو [illegible] کھانا [illegible] پر کچھ اثر کرے تو میری بات کا اثر دیکھنا۔"

میں نے مسکرا کر پلیٹ میں سے کباب اٹھا کر منہ میں ڈال لیا میں غالباً چاہتا تھا کہ اس محفل میں کوئی گفتگو ایسی نکلے جس سے ادیب کو تکلیف پہنچے مگر ادیب نے دو پیگ کے بعد [illegible] پھر بولے۔ ادیب کہنے لگے: "مجھ پر پرسوں والے سپیکر کے گیا تم اس بات کو درست سمجھتے ہو؟" میں نے جو کچھ طرح سے کہا: "ادیب صاحب! الکحل کے پینے کی بات کو درست یا نادرست سمجھنا تو ایک الگ بات ہے۔ لیکن کیا یہ درست بات ہے کہ آپ مجھے شراب پینے والوں میں شامل سمجھیں؟"

میرا جملہ سنتے ہی ادیب جھومتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھے مجھے گلے سے لگایا۔ پھر ٹیبل کے نیچے سے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیہ نکال کر مجھ سے قلم مانگا اور سگریٹ کی ڈبیہ کو پھاڑ کر لکھنے لگے: "حسین کی قسم صحیفہ کی قسم کہ میں نے تمہیں کبھی ایسا نہیں سمجھا۔ میں تمہیں بہت بڑا مزاح نگار سمجھتا ہوں۔ تم رشید احمد صدیقی اور پطرس کا تسلسل ہو۔"

پھر اسی کاغذ کے دوسرے رخ پر لکھ دیا۔ "حسین کی قسم مجتبیٰ حسین بے حد پیارا ہے۔ میں مجتبیٰ کے خلاف کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔" پھر اس کاغذ کو میرے حوالے کر کے کہنے لگے: "لو۔ اس کاغذ کو اپنے پاس دستاویزی ثبوت کے طور پر محفوظ رکھو۔"

میں نے کہا: "ادیب صاحب! آپ نے کہہ دیا یہ بہت کافی ہے۔ دستاویزی ثبوت لے کر کیا کروں؟"

بولے: "دنیا دستاویزی ثبوت کے بغیر کسی سچائی کو قبول نہیں کرتی۔"

پھر کوئی نزاعی بات نکلی تو ادیب پھر اٹھ کر ٹیبل کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیہ تلاش کرنے لگے۔ اس رات وہ میں انھیں روکتے رہے مگر اس دن انھوں نے اُس بار میں ایک بھی خالی ڈبیہ پڑی رہنے نہیں دی۔ بات بات پر دستاویزی ثبوت تقسیم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے بیرے سے کہا کہ "بار میں سگریٹ کی جتنی بھی خالی ڈبیاں پڑی ہوئی ہیں انھیں فوراً یہاں سے ہٹا دو۔" بیرے نے کہا: "اب میں کیا ہٹاؤں۔ ساری ڈبیاں تو آپ کے ساتھی نے اٹھا لی ہیں۔"

اس دن کے بعد میں نے ادیب کو پھر کسی بار میں نہیں دیکھا۔ پھر وہ دواخانہ میں داخل ہو گئے۔ موت آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھنے لگی۔ مگر ادیب موت کے قدموں کی آہٹ سے بے نیاز جانی پہچانی زندگی کے قدموں کی چاپ سنتے رہے۔ میں اکثر ان سے ملنے دواخانہ چلا جاتا اور ان کے چہرے پر مسکراہٹ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

غالباً ۸ ر اگست ۱۹۷۰ء کو میں کرشن چندر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ مل کر ادیب کو دیکھنے دواخانہ گئے۔ ادیب کے سیدھے ہاتھ پر ایک زخم ہو گیا تھا اور اسی دن دواخانہ میں اس کا آپریشن

ہوا تھا۔ اریب پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ بات
کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ کرشن چندر کے قدموں کی آہٹ سن
کر انھوں نے آنکھیں کھولیں پھر سمندر کی ایک لہر کی طرح اریب
کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس وقت اریب بات
نہیں کر سکتے تھے صرف مسکرا سکتے تھے۔ انھوں نے غالباً
یہ محسوس کیا کہ ان کے بات نہ کرنے سے کرشن چندر خفا ہو
جائیں گے۔ اسی لئے انھوں نے اپنے بات نہ کرنے کا وزنی
ثبوت فراہم کرنے کے لئے اپنے دائیں بازو سے کپڑا ہٹایا
اور اپنا گہرا زخم دستاویزی ثبوت کے طور پر کرشن چندر کو
جتلا دیا۔ کرشن چندر کی آنکھوں میں اچانک آنسو آگئے مگر وہ
ضبط کرتے رہے۔ کرشن چندر نے کہا۔ "اریب یہ تمھیں کیا
ہو گیا۔ ارے بھئی! یہ تو ہمارے مرنے کے دن ہیں۔ تم ہم
سے پہلے آگے کیسے جا سکتے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"
کرشن چندر کا یہ جملہ سن کر اریب کی مسکراہٹ کے سمندر میں ایک
طوفان سا اٹھ گیا اور اس طوفان میں ہم سب بہہ گئے۔
کرشن چندر فوراً باہر نکل آئے۔ اریب کے زخم کو وہ برداشت
کر گئے تھے لیکن اریب کی مسکراہٹ کو برداشت کرنے کی ان
میں طاقت نہیں تھی۔ وہ فوراً باہر نکل آئے اور دروازے
کے سامنے ہی اچانک بیٹھ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور میں نے فوراً انھیں تھام لیا۔
اس وقت تو ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم اریب کو سنبھالتے
کیوں کہ اریب کمرہ کے اندر اکیلے رہ گئے تھے لیکن مشکل
تو یہی تھی کہ اریب کا کرب خود اریب تو بڑی آسانی سے
سنبھال لیتے تھے لیکن ان کا کرب کوئی دوسرا آدمی برداشت
نہیں کر سکتا تھا۔ کرشن چندر کو بازو کے کمرہ میں لٹایا گیا اور
فوراً ڈاکٹر کو طلب کیا گیا تاکہ وہ کرشن چندر کا معائنہ کر سکے

اب موت اریب کے بالکل قریب آگئی تھی [illegible]
میں اخبار الٹا کر سب سے پہلے اریب کا تبصرہ پڑھتا تھا
اور جب مجھے یہ تبصرہ پڑھنے کی توقع میں [illegible]۔ انھی دنوں
میں میرے مضامین کا دوسرا مجموعہ "قطع کلام" بھی شائع
ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اریب اس کتاب کو کبھی پڑھ نہ سکیں گے
لیکن مجھے انھیں اپنی کتاب دینے کی بڑی جلدی تھی۔
۲ / ستمبر کی رات کو میں اپنی کتاب دینے کے لئے اریب کے
پاس گیا۔ ان کی زندگی میں اب صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ مجھے
بڑی نقاہت سے دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کتاب کے لئے
شکریہ ادا کیا۔ پھر اشارہ سے بتایا کہ وہ کچھ پڑھنے کے قابل
نہیں ہیں۔ مجھے اشارہ کیا کہ میں کتاب کو کھولوں۔ میں نے
کتاب کا پہلا ورق پلٹا۔ ہاتھ کے اشارہ سے پوچھا کیا لکھا
ہے۔"
میں نے زور سے کہا۔ "اریب صاحب! یہ میری کتاب کا
"پس و پیش لفظ" ہے۔ سب لوگ "پیش لفظ" لکھتے
ہیں مگر میں نے "پس و پیش لفظ" لکھا ہے۔"
یہ سنتے ہی اریب کے کمزور، نحیف اور خشک ہونٹوں پر
مسکراہٹ بڑی دور تک پھیل گئی۔ اتنی دور تک کہ جب
مسکراہٹ ختم ہو گئی تو اریب کو اپنے ہونٹ پھر اپنی جگہ پر
واپس لانے میں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں لگتا تھا
جیسے یہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ اب پھر کبھی واپس نہ ہو گی۔
جیسے یہ مسکراہٹ سمندر کی لہر بن کر ایک انجانے سفر پر روانہ
ہو گئی ہے۔ اریب کی یہ مسکراہٹ میرے دل میں ایک خنجر کی
طرح اتر گئی۔ میں چپ چاپ اس خنجر کو اپنے دل میں چھپائے
اور اریب کے ہونٹوں پر اپنی دی ہوئی مسکراہٹ کو جوں کا
توں چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اور اس کے چند گھنٹوں

[illegible]

[illegible] اریب کو خدا کا واسطہ اس دنیا کی آخری مسکراہٹ دے دو
اریب کی آخری مسکراہٹ ابھی تک میری آنکھوں میں پھیل
رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اریب کے ہونٹوں سے
یہ آخری مسکراہٹ چھین لوں اور اریب سے کہوں اریب
صاحب یہ میری ادھوری مسکراہٹ مجھے واپس کر دیجئے
ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ میں آپ
کو مسکراہٹ عطا کروں اور آپ میرے سینہ میں خنجر اتار
دیں۔

میں چاہتا اریب سے یہ آخری مسکراہٹ چھین لینا چاہتا تھا
اس لئے کہ یوں کہ اریب کی زندگی کی غلطیاں ہیں اور آخری مسکراہٹ
تھی۔ جس میں اریب کی زندگی کا سارا اسرار اور سارا کرب
سمٹ آیا تھا۔ مجھے تو یوں معلوم ہوا تھا جیسے اریب
کے ہونٹوں سے ان کی آنکھیں ٹپ ٹپ ٹپکنے لگی ہیں
اور زندگی قطرہ قطرہ بن کر خشک ہونے لگی ہے۔

●●

تنہائیاں ہیں کرب ہے چاہت کے نگر میں
کتنے ادھورے سپنے دیے اُس نے نظر میں

کیا پائلوں نے گیت نیا گا لیا کوئی
سنگیت کسی نے چھیڑ دیا لہر لہر میں

کتنی کڑی ہو دھوپ مگر ڈھل ہی جائیگی
کیوں اس طرح پگھلتے ہو لمحوں کے قہر میں

جو کچھ بھی اُس نے لکھا تھا وہ لفظ بہہ گئے
تھے صرف آنسوؤں کے نشاں اُسکے بستر میں

اب دشت میں چلے ہیں کہ شاید پتہ ملے
انسان کو ہم نے ڈھونڈ لیا شہر شہر میں

فضا کوثری

۸۹۲۔ رضوریہ اسٹریٹ، بنگارپیٹ
(میسور اسٹیٹ)

اپنا وجود پھونک نہ دے تن بدن کی آگ
محسوس ہو رہا ہے یہ تاروں کی چھاؤں میں

مجھ کو حصارِ جسم مقید نہ رکھ سکا!
بکھرا ہوں رنگ و نور کی صورت فضاؤں میں

ہر چند اپنے پاؤں جمائے کھڑا ہوں میں
پھر بھی کوئی اچھال رہا ہے خلاؤں میں

ممکن ہے وہ خدا کو فراموش کر بھی جائے
لیکن مجھے وہ یاد کرے ہے دعاؤں میں

غرّہ تھا اپنے دل پہ بہت ناز تھا مگر
وہ بھی تو اب نہیں ہے مرے ہمنواؤں میں

عروج احمد عروج

اسٹار لائبریری۔ صدر بازار
جالنہ۔ مہاراشٹرا

کاش خوابوں کی ردا اوڑھ کے سو سکتے
عقل و دانش کے یہ پتھر تو ڈبو سکتے
دشتِ احساس میں ہم [illegible]
سلسلہ شہرِ تمنا سے ملا سکتے
سیڑھیاں لے کے گئے آواز کی پر دم بھی
کب اندھیرے میں [illegible] کر سکتے
آزما کردہ گناہوں کا اعادہ کر کے
گزرے لمحات نہیں لوٹ کے آیا کرتے
زندگی تو نے کئی روپ دکھائے ہم کو
کاش اک روز ترا ہم بھی تماشا کرتے

حباب ہاشمی

حبیب بلڈنگ۔ [illegible]
رائے بریلی۔ اترپردیش

راشد نے اپنے بنگلے کی خوبصورت "فرینچ ونڈو"
سے جھانک کر باہر دیکھا۔ دن بھر کے سفر سے تھک کر
سورج کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ مغربی افق کی طرف
جھکا، اپنی بکھری کرنوں کو سمیٹ رہا تھا۔ آسمان میں
چاروں طرف سرخ رنگ پھیلا ہوا تھا اور اس کا عکس
جھیل کے نیلگوں سینے پر پڑ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا
جیسے پانی میں سینکڑوں من سیندور گھول دیا گیا ہو۔
سفید پرندوں کے غول چہچہاتے ہوئے گھونسلوں
کی طرف لوٹ رہے تھے۔

اس نے ایک طویل سانس لی اور کھڑکی پر پڑا ہوا پردہ

ٹھیک کر کے ہٹ گیا۔ آج اس کے ذہن پر پھر انہیں
بے معنی سی اداسیوں کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس
کی سمجھ میں نہ آتا کہ کبھی کبھی وہ بلا وجہ اتنا اداس کیوں
ہو جاتا ہے؟ اس کے پاس دولت تھی، عزت تھی
شہرت تھی، سب کچھ تھا۔ وہ اپنی دولت سے دنیا
کی ہر شے خرید سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی اسے اپنی

زندگی بڑی بے معنی اور غیر دلچسپ معلوم ہونے لگتی

وہ اپنے اس عجیب سے جذبے کو کوئی معنی نہ پہنا
سکتا۔ بس بیٹھے بیٹھے اسے اپنے ذہن پر عجیب سے بوجھ
کا احساس ہونے لگتا۔ وہ شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں
اور کلبوں کا مستقل ممبر تھا۔ وہاں کی رنگینیوں میں وہ
اپنا دل بہلا سکتا تھا لیکن جب بھی اس پر ان نامعلوم
اور بے معنی سی اداسیوں کا دورہ پڑتا تو دنیا کی ساری
رنگینیاں بالکل بے معنی معلوم ہونے لگتیں۔ اسے
اپنے اکیلے پن کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگتا
وہ محسوس کرنے لگتا کہ اس کے چاروں طرف خاموشی

اور سناٹے کی چادریں سی تنی ہوتی ہیں۔ جن سے گذر کر
کوئی سریلی آواز، کوئی کھنکتی ہنسی اس تک نہیں
پہونچ سکتی۔ اس کے ایک اشارے پر دودھ جیسی
لڑکیاں ہنس سکتی تھیں۔ قہقہے لگا سکتی تھیں لیکن ان
بناوٹی قہقہوں کو خرید کر اس کے دل کو سکون نہ ملتا۔
وہ محسوس کرتا کہ وہ کانچ کے ایک بہت بڑے خول میں

[illegible] انگلیوں کو چھوتے ہوئے تھر
تھرکتے ہوئے دیکھ تو سکتا ہے لیکن ان کی آواز سن
نہیں سکتا۔ اس کی نگاہ پھر ایک نئے جسم کی
خوشبو سے بہک اٹھتی تھی لیکن یہ سب کر کے اس کے
دل کو سکون نہ ملتا۔ اس کے جسم کی پیاس تو بجھ جاتی
لیکن روح پیاسی ہی رہ جاتی —

اس نے بڑی بے دلی سے "ایوننگ سوٹ" پہنا۔ بڑی
بے دلی سے ٹائی کی "ناٹ" بنائی اور "لا بیلا ڈی پیرس"
نائٹ کلب کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب اس کی ٹیکسی "ٹوپیٹا" کلب کے کمپاؤنڈ میں داخل
ہوئی تو شام ڈھل چکی تھی۔ سورج جھیل کی اتھاہ گہرائیوں
میں ڈوب چکا تھا۔ آسمان کے کنارے اب سرمئی ہو گئے
تھے۔ کالا رنگ بڑی سرعت سے سرخ رنگ کو نگلتا
جا رہا تھا —

بار کاؤنٹر پر رک کر اس نے "ڈبل اسکاچ" کے تین
پیگ پیئے اور سگریٹ سلگا کر "ریکریشن" ہال کی طرف
چل دیا —

آج یہاں ایک مشہور فرانسیسی رقاصہ کا پروگرام تھا
لیکن بہت سی میزیں اب تک خالی پڑی تھیں کیونکہ
کشمیر کی جان لیوا سردیاں شروع ہو چکی تھیں موسم بہار
کا لطف اٹھانے کے لئے ملک کے مختلف گوشوں سے
آئے ہوئے سیاح واپس جا چکے تھے۔ اس لئے ہال
میں سوائے چند مقامی لوگوں کے کوئی اور نظر نہیں آ رہا
تھا —

روشنیاں بجھ گئیں۔ صرف اسٹیج رنگ برنگی روشنیوں
سے جگمگانے لگا۔ آرکسٹرا نے فرانسیسی دھن چھیڑ
دی اور سنہرے بالوں والی خوبصورت فرانسیسی
رقاصہ ناچنے لگی۔ راشد کی نظریں رقاصہ پر جمی ہوئی
تھیں لیکن وہ اسے دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس کے ذہن
میں عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ اچانک ایک
شیریں آواز نے کانوں میں رس گھول دیا "کیا میں
یہاں بیٹھ سکتی ہوں"۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے میں لڑکی کا چہرہ تو
دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن جسم کا ایک دھندلا
سا خاکہ ضرور نظر آ رہا تھا۔ وہ کافی دراز قد اور سڈول
جسم والی معلوم ہوتی تھی۔

راشد لڑکیوں کا بڑا رسیا تھا۔ جسموں کی پوجا
کرنا اس کا مذہب تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید
وہ بڑے تپاک سے لڑکی کو بیٹھنے کی اجازت دے
دیتا لیکن اس وقت لڑکی کا اس طرح اپنی تنہائی
میں مخل ہونا اسے بڑا ہی گراں گذرا —

"میرا خیال ہے کہ ہال میں بہت سی میزیں ابھی خالی
ہیں" اس نے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا۔
"لیکن مجھے اکیلے تفریح کرنے میں لطف نہیں آتا۔
خیر اگر آپ مناسب نہیں سمجھتے تو . . . . ." وہ
جانے کے لئے مڑی۔

اچانک راشد کو احساس ہوا کہ وہ لڑکی سے بڑی
بداخلاقی سے پیش آ رہا ہے۔ "کوئی بات نہیں" وہ
جلدی سے بولا۔ "تشریف رکھئے۔" اس نے اپنے
لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی آواز
کی خشکی اور کھرکھراہٹ خود اس سے بھی چھپی نہ رہ سکی

"شکریہ..." لڑکی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس نے
شاید راشد کے لہجے کی تلخی کو محسوس نہیں کیا تھا یا پھر
وہ جان بوجھ کر اُسے نظر انداز کر گئی تھی۔
ـــــ راشد اس لڑکی کی طرف سے بالکل لاپرواہ رقص
دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تیس، چالیس منٹ بعد جب
ہال میں روشنی ہوئی تو اس نے ایک جماہی لی اور یونہی
سرسری طور پر لڑکی کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر جیسے اس
پر سحر سا ہو گیا۔ وہ پتھر کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا۔
اور پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔
لڑکی خوبصورت تھی، بے پناہ حسین۔ راشد نے اپنی
ساری زندگی میں اتنی حسین لڑکی نہ دیکھی تھی ـــــ
.... یونان کے کسی قدیم بت تراش نے
ایک دیوپیکر مورتی سے بت تراش کر کرسی پر رکھ دیا
ہو ـــ!

"کیا آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گے؟" بت کے
نازک ہونٹ ہلے اور جیسے چاندی کی کئی ننھی ننھی گھنٹیاں
ایک ساتھ بج اٹھیں۔ عجیب سا سنگیت تھا اُس کی
آواز میں جیسے تانبے کا دھلا دھلایا صاف ستھرا
برتن برکھا کی پہلی ہلکی ہلکی پھوار میں رکھ دیا گیا ہو ـــ
راشد چونک پڑا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔ اب
اُسے احساس ہونے لگا کہ وہ مسلسل گھورے جا رہا
ہے۔ اُسے شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے لڑکی کے
چہرے سے نظریں ہٹائیں اور جھینپے ہوئے انداز
میں بولا ـــ

"میرا نام راشد ہے اور آپ کا...؟"
"نیلم"

نیلم سے اس کی یہ پہلی ملاقات [illegible]
سا تھا کہ وہ اُسے برسوں سے جانتا ہے [illegible]
میں غیر معمولی طور پر دلچسپی لے رہی تھی۔ [illegible]
[illegible]
گئے تھے اور چہرے پر خوشی کی [illegible]
اس سے قبل وہ مختلف لڑکیوں سے مل چکا تھا لیکن
نیلم پہلی لڑکی تھی جس سے مل کر اس نے محسوس کیا
تھا کہ اس کی روح کی جنم جنم کی پیاس بجھ گئی ہے
اس سے تھوڑی دیر بات چیت کر کے اُسے محسوس ہوا
کہ اس کے وجود کا بکھرا ہوا خلا بھر چکا ہے اور اس
کا وجود مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے گرد تنہائی، خاموشی
اور سناٹے کی چادریں کٹ چکی ہیں۔ وہ [illegible]
سے آباد ہو چکا ہے۔

چند منٹوں کی ملاقات میں وہ اس طرح بے تکلف
ہو گئے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے
ہوں۔ وہ اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے ایک دوسرے
کے لئے ہی پیدا کئے گئے ہوں۔

"مجھے خوشی ہو گی اگر کسی روز آپ میرے گھر تشریف
لائیں۔" اس نے نیلم سے کہا۔
"کسی روز کیوں، آج ہی کیوں نہیں؟" نیلم مسکرا کر بولی۔
"سچ!" راشد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا
"جی ہاں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں۔"
"میں تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں ـــ چلئے باہر
میری کار موجود ہے۔"
"ابھی نہیں۔" وہ راشد کی بے چینی سے لطف اندوز
ہو کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "مجھے ایک ضروری کام

[illegible]

[illegible] بھی اپنے کمرے [illegible] گا

زمین کے [illegible] وہ اٹھ کھڑا ہوا اور نیلم کو اپنا

"پروپوزل" [illegible] سے چاہتا۔

جلد سے جلد گھر پہنچ کر شادی کی تیاریاں کرنا

چاہتا تھا۔

آٹھ بجے برف گرنے لگی۔ طوفانی ہوائیں چلنا شروع

ہو گئیں۔ برف کھڑکیوں سے اندر گرنے لگی۔ اس نے

نوکروں کو کھڑکیاں بند کرنے کا حکم دیا اور کرسی

پر بیٹھ کر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ ایک بھیانک

سوال رہ رہ کر اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ "اگر

برف باری بند نہ ہوئی تو ...؟" اس کے آگے

سوچ کر وہ کانپ اٹھتا تھا۔

آہستہ آہستہ ہواؤں کا شور کم ہوتا گیا۔ دور کسی

کلاک نے شاید دس بجائے۔ گھنٹوں کی آواز

سناٹے کا سینہ چیرتی ہوئی دور تک پھیل گئی۔ وہ

تھوڑی دیر تک فضا میں آواز کی تھرتھراہٹ کو

محسوس کرتا رہا پھر دھیرے دھیرے آگے بڑھا

اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھڑکی کھولنے لگا۔

برف باری میں اب وہ پہلی سی شدت باقی نہ

تھی۔ اب برف بہت آہستہ آہستہ ہو رہی تھی جیسے

کبھی کبھی روئی کے پھائے برس رہے ہوں۔ چاند بادلوں کی

اوٹ سے نکل آیا تھا۔ اور اس کی دودھیا روشنی

[illegible] سے [illegible] ہو گا

[illegible] جب چاند جھیل کے پانی پر [illegible]

تو وہاں ایک سماں تھا۔ جھیل کے سینے پر [illegible]

[illegible] چاندی پھیلی ہوئی ہے۔ ہوا کے تیز

جھونکے شاخوں کے پتوں سے اٹکھیلیاں کرتے

ہوئے گزر رہے تھے اور پتوں کے آپس میں ٹکرانے

سے بڑی روح پرور موسیقی پیدا ہو رہی تھی جیسے اندر

سبھا کی اپسرائیں اپنے ستار بجا رہی ہوں۔

سردی اب بہت بڑھ گئی تھی۔ برفانی ہوا جسم کو

چیرتی ہوئی ہڈیوں کے گودے تک پہنچ رہی تھی۔

رگوں میں خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس

نے کھڑکی بند کر دی۔ مفلر کو اچھی طرح گردن کے

گرد لپیٹ لیا۔ اسٹر کے کالر کھڑے کر لئے۔

آتش دان میں کوئلے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اس نے کوئلے

ڈالے۔ آگ دہکائی اور کرسی آتش دان کے قریب کھینچ

کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں جلتے ہوئے کوئلوں پر لگی

ہوئی تھیں اور دماغ مستقبل کے حسین خوابوں میں کھویا

ہوا تھا۔ سپنوں کے نہ جانے کتنے حسین محل اس نے بنا

ڈالے تھے۔

اس نے اپنی زندگی سے متعلق بہت ہی اہم فیصلہ کر لیا

تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ نیلم کو ہمیشہ کے لئے اپنا

کر وہ اپنی ویران زندگی میں بہاریں سمیٹ لے گا۔ اس

نے آج ہی نیلم کو شادی کے لئے "پروپوز" کرنے کا

ارادہ کر لیا تھا۔ یہ سب کچھ کتنی جلد اور کتنے رومانک

انداز میں ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کوئی لڑکی اس کو اتنی جلدی اس قدر متاثر کر سکتی ہے۔

آتش دان میں کوئلے دہکتے رہے۔ دہک دہک کر راکھ ہوتے رہے۔ رات گذرتی رہی۔ کلاک ٹاور نے ساڑھے دس بجائے۔ وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی جیسے کلاک ٹاور پر بھروسہ نہ ہو لیکن واقعی ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ بے چین ہو گیا۔ ایک سوال تیر کی طرح اس کے دل کو چیر گیا۔ "کیا وہ نہ آئے گی؟" — "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور آئے گی۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔" اس نے آپ کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

چند منٹ اور گذر گئے۔ لیکن یہ چند منٹ اُسے پہاڑ جیسے معلوم ہوئے۔ اچانک اُسے ایسا محسوس ہوا کہ دروازے پر کوئی اپنے نرم نرم ہاتھوں سے دستک دے رہا ہے۔ اس نے غور سے سنا۔ دستک کی آواز میں چوڑیوں کی کھنکھناہٹ بھی شامل تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ کہیں یہ اس کا وہم ہی نہ ہو۔ لیکن نہیں یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ دروازے پر کوئی پیہم دستک دے رہا تھا پھر کوئی اُسے سریلی آواز میں پکارنے بھی لگا۔

"راشد صاحب ... مسٹر راشد ـــ"

وہ لپک کر دروازے کی طرف بڑھا اور ایک جھٹکے میں دروازہ کھول دیا۔ وہ آگئی تھی۔ نیلما آگئی تھی ـــ

اس نے سفید ساٹری سفید ساڑی پہن رکھی تھی۔ اور چاند کی ٹھنڈی دودھیا روشنی میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ راشد کو لگا کہ اس کے چہرے پر مریم کا سا تقدس ہے۔ اس کے چہرے کے چاروں طرف نور کا ہالہ سا گردش کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ مسکرائی جیسے کلی چٹکی ہو۔ پھر وہ کسی خواب کی طرح آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر آگئی۔

"معاف کرنا راشد مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

"تم آ تو گئیں نیلم۔" راشد بڑے جذباتی انداز میں بولا۔ "اگر تم نہ آتیں تو میں صدیوں تک تمہارا انتظار کرتا رہتا۔"

نیلم ایک بار پھر بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی راشد نے آگے بڑھ کر اُسے باہوں میں سمیٹ لیا جذبات کی رو میں بہہ کر وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ نیلم سے اسکی ملاقات صرف چند گھنٹے پرانی ہے اور اُسے ابھی ایسا کرنے کا حق نہیں ہے۔

لیکن نیلم نے بھی کوئی مدافعت نہ کی۔ وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح راشد کی گود میں آگری۔ پوری قوت سے اس سے چمٹ گئی۔ اس کے نازک ہونٹ ہلے اور مدھم سی آواز نکلی۔

"سَو روپے ـــ میں ایک رات کے سَو روپے لیتی ہوں!"

■■

۴۸ پیکر حیدرآباد

افسردہ راتوں کا درد

شعیب شمس
شاستری نگر۔ موتی ہاری۔ بہار

[illegible]
[illegible]
ایسی راتوں میں جلتا ہے مرا تنہا وجود
میرا احساس
مری فکر
مرا جذبِ دروں
تب کوئی کہتا ہے ہنس کر مجھ سے
"شب کے سناٹے کی چادر اوڑھو
رات کی کالی جٹاؤں میں چھپا لو خود کو"
اور
میں کالے سمندر میں سمٹے جاتا ہوں
سوچتا ہوں
اسی ظلمت سے کرن پھوٹے گی

راز امتیاز
لوز کارنر۔ مدراس-۲

غزل

لبِ خموشی کی شہرت کو معتبر نہ کرو
مری حیات کے قصے کو مختصر نہ کرو
شکستگی کے تقاضے بھی کچھ نہ کچھ ہونگے
بہت گلہ کرو دل سے پہ اس قدر نہ کرو
کسی سے پیار کرو تم تو ہم بھی خوش ہونگے
ہماری طرح مگر اتنا ٹوٹ کر نہ کرو
کبھی کبھی دلِ ناداں کی بات بھی سن لو
ہر ایک کام خداؤں سے پوچھ کر نہ کرو
کسی خیال کسی شخص کے تو دل سے لگو
بدن چرا کے بہت زندگی بسر نہ کرو

منیر عالم منیر
پوسٹ آفس ہیراتا سیہور۔ مظفرپور (بہار)

دوسرا رخ

کل بھی ریگِ صحرا میں
ایک چیخ ابھری تھی
کوئی مر گیا ہوگا
ریت کے بگولوں میں
کوئی کھو گیا ہوگا
آج پھر دیا شاید
کوئی چیخ ابھری ہے

کن سے ملنا ہے؟ شمیم سے! آئیے آئیے تشریف
رکھئیے۔ کالج سے بس اب آتا ہی ہوگا۔ تم اس کے
دوست ہو۔ اچھا اچھا! عابد تمہارا نام ہے۔ تمہارے
والد کا نام علیم تو نہیں۔ وہی تو کہوں کہ صورت شکل تو
کچھ جانی پہچانی معلوم ہو رہی ہے۔ کیا کہوں، بڑھاپا آ گیا
نظر کمزور ہو گئی ورنہ پہلی نگاہ میں ہی پہچان لیتا ویسے
ایک مدت بھی تو ہو گئی تمہیں دیکھے ہوئے۔ تم اس
وقت چھوٹے سے تھے یہی کوئی نو دس سال کے
اپنا شمیم بھی تو تمہارا ہم عمر ہی ہے۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی
نہ شمیم کو تمہارے بغیر چین، نہ تم کو شمیم کے بغیر قرار۔
تمہارے والد ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟ ارے
ان کا انتقال ہو گیا کب ہوا؟ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن
بڑی بری خبر سنائی تم نے۔ چار سال ہو گئے ان کے
انتقال کو۔ مجھے خبر نہ ہوئی۔ ہائے میرا لنگوٹیا یار اس
جہان سے اٹھ گیا اور مجھے پتہ ہی نہیں۔ کیا بتاؤں
اس دیہات میں آ کر تو زندگی دو بھر ہو گئی ہے۔ شہر
میں تھا تو اکثر تمہارے والد سے ملاقاتیں ہوتی تھیں
چاہنے والے احباب کی اب صرف یادیں رہ گئی ہیں۔ انہی
یادوں کے سہارے زندگی گزار رہا ہوں۔ ہائے کیا
[illegible]
اخلاق وغیرہ تو تمام کے تمام تم میں ہیں۔ [illegible]
کی طرح مانتے تھے۔ مگر نیک لوگ دنیا میں زیادہ دن
رہتے کہاں ہیں۔ رخسانہ ان سے کافی گھلی ملی تھی۔
اب بھی اکثر پوچھا کرتی ہے۔ رخسانہ کو نہیں جانتے، ہاں
ایک زمانہ گزر گیا۔ تمہیں یاد کیا ہوگا۔ رخسانہ اور شمیم
دونوں بہن بھائی کے ساتھ ہی تو تم دن بھر کھیلا کرتے
تھے۔ علیم مرحوم رخسانہ کو بالکل اپنی بچی کی طرح مانتے
تھے۔ رخسانہ کے پاس تو ابھی تک وہ کھلونا محفوظ
ہے جو علیم نے اس کی آٹھویں سالگرہ کے موقع پر
دیا تھا۔ مجھے یاد ہے تم میں اور رخسانہ میں اکثر
جھڑپیں ہو جایا کرتی تھیں۔ تم اس کے بالوں کو زور سے
پکڑ لیتے تھے اور وہ اپنے بڑے بڑے ناخن تمہارے
چہرے میں چبھو رہی تھی۔ اس کے باوجود تم دونوں
میں کتنی محبت تھی۔ صبح کو لڑتے۔ دوپہر کو پھر ہنس
ہنس کر کچی بیریاں کھانے باغ کے گئے۔ اور تم دونوں
کی ایسی محبت دیکھ کر ہی علیم نے تمہاری اور رخسانہ کی
نسبت اسی وقت طے کر دی تھی۔ مگر افسوس کہ وقت
کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ علیم اپنی آرزو پوری کئے بغیر اس
سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اب بھی کیا ہوا تمہاری
والدہ ماشاء اللہ حیات ہیں۔ میں ہوں۔ یہ رشتہ
اب مکمل ہو سکتا ہے۔ علیم مرحوم کی آرزو اب بھی پوری
ہو سکتی ہے۔ ورنہ ان کی روح سدا بے چین رہے گی۔
تمہیں رخسانہ سے ملاؤں۔ بڑی پیاری بچی ہے پچھلے
سال اس نے میٹرک کیا ہے۔ گھر کے سارے کام
وہی سنبھالتی ہے۔ اس کی والدہ تو اب بوڑھی ہو گئیں

[illegible] حیدرآباد

پچھلے ماہ کے رسالوں کی قابلِ مطالعہ تخلیقات

آج ہندوستان میں اردو ادبی پرچوں کی ... اور پڑھنے والوں کی تعداد میں اطمینان بخش ہے لیکن آج کے قاری کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہر تخلیق کا مطالعہ کرے۔ ہم نے اس خیال سے کہ قارئین کم از کم اہم قابلِ مطالعہ تخلیقات سے محروم نہ رہ جائیں۔ یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ آئیے ہم آپ کو چند منتخب تخلیقات بتاتے ہیں، جو ہماری نظر میں ان پرچوں کی جان ہیں ●●

ماہنامہ اقدار، شمس الہدیٰ روڈ، کلکتہ۔ ۱۷ (شمارہ ۴)

مضمون : "زبان کی تبدیلی اور لپی" سہیل بخاری

افسانے : "پامال قدریں" ام امیری
"تلاش" شفق

نظمیں : "جسم کی وسعتوں میں نظر بند پرند"
وہاب دانش
"لیب رپورٹ" بدنام نظر
"خوف جو زندہ ہے" خلیل تنویر

ماہنامہ آہنگ، بیراگی، گیا (شمارہ : ۱۷)

مضمون : "اپنی تلاش میں" کلیم الدین احمد

افسانے : "اسیرِ زیست" انور خاں
"راستے اور کھڑکیاں" انور خاں
"پتھراؤ" انور خاں

نظم : "جبرِ حیات" شاہد کلیم

غزلیں : سید احمد شمیم۔ عبداللہ کمال
چندر پرکاش شاد

ماہنامہ شاعر، پوسٹ بکس ۴۵۲۶، بمبئی، شمارہ ۱

مضمون : "زبان کی لاابدیت" عرفان احمد

افسانے : "حرفِ وفا" ستیہ پرکاش سنگر
"پھر اس کے بعد چراغوں میں ..."
اکرام جاوید

نظمیں : "مرثیہ" ندا فاضلی
"جز خود میں تشکیل ہو رہا ہے"
من موہن تلخ
"نئی اکائی" ظفر غوری

غزلیں : عرش صہبائی۔ رفیق الزماں۔
حیدر نایاب

ماہنامہ شب خون ۳۱۳۔ رانی منڈی۔ الہ آباد ۳
(شمارہ : ۶۶)

مضمون : "ادب اور آدرشی وابستگی" وارث علوی

افسانے : "ایک قتل کی کوشش" اقبال مجید
"پانی سے گاڑھا لہو" پریم ناتھ در

نظمیں : "چشم زدن" بلراج کومل
"ایک نظم" صادق

ماہنامہ سب رس، ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ
حیدرآباد۔ ۴ (شمارہ : ۱۱)

مضمون : "شہر حیدرآباد کی اردو بول چال"
باقر کاظمی

([illegible]) [illegible]

افسانے : "آنکھیں سانپ بن گئی ہیں" عمر تمکین احمد

"ثنایہ" علیہ پروین

نظمیں : "وہ آیا" اختر یوسف

"محراب"، "کیڑا" قمر اقبال

"زدِ رفاقت" حامد اکمل

غزلیں : غلام مرتضیٰ راہی، آزاد گلاٹی، کیف احمد صدیقی

ماہنامہ کتاب' گوئن مارکٹ لکھنؤ - ۳

(شمارہ ۹۸)

افسانے : "تیسری رات" شوکت علی

"شکستیدہ" حسین الحق

نظمیں : "الف لیلیٰ کی آخری صبح" عزیز قیسی

"دشتِ ہو" عزیز قیسی

"تعاقب" اسلم عمادی

غزلیں : سلطان اختر، مصور سبزواری، سیف سہسرامی

قطب شاہین
۱۲۔ واٹرلو اسٹریٹ۔ کلکتہ ۱

زندگی مغموم ہے

دھان پٹ سن اگتے تھے ہگلی ندی کے آس پاس
پھیلی ہے اب ہر طرف سڑتی ہوئی لاشوں کی باس
ڈولتی، منجدھار میں بے گھاٹ ساری کشتیاں
اور کناروں پر کھڑی ہیں بے دھواں سب چمنیاں
اب کسی گوری کے کولہے پر نہیں گاگر کوئی
اب نظر آتی نہیں جھوسے کے سر پر ٹوکری
بیٹھوکی[1]، ترجا[2] وہ بھٹیالی[3] نہیں اب ہونٹوں پر

زندگی مغموم ہے، خاموش ہے شام و سحر
جسم بے حس کو جو کر دیتا تھا حرکت آشنا
اب کہاں باقی رہا اے زندگی! وہ کھیمٹا[4]
جس کے دامن میں تھرکتی تھی بہار رنگ و بو
اب اسی پدما[5] میں لہراتا ہے انساں کا لہو

۱، ۲، ۳ بنگال کے لوک گیت
۴ بنگال کا لوک ناچ، ۵ دریا

غزل

آئی جو شام شہر کا منظر بدل گیا
کمرے میں تیری یاد کا اک بلب جل گیا

خوشبو سمیٹ رکھی تھی لمحوں کے پھول کی
آنکھیں کھلیں تو وقت کا [illegible] گیا

نظروں کا تھا سراب کہ کالی غزل کے
اک اجنبی کا پاؤں کنوئیں میں پھسل گیا

زنجیر کس نے ڈال دی لفظوں کے پاؤں میں
معنی کا جسم سوچ کی لہر میں پگھل گیا

بس ہنس کے کون ہنستا ہوا کر رہا گلہ
ہے کون وہ جو وقت کے سانچے میں ڈھل گیا

پیاری لگی ہے نیند مجھ کو پریت شہر کے ساتھ
تنہائیوں میں تو مرا جی بہل گیا

مجمع لگا ہوا ہے ٹریفک بھی بند ہے
شاید کسی کا خواب ٹرک سے کچل گیا

منیر سہسرامی
جی۔ ڈی کمپنی۔ بجلی روڈ۔ آرہ (بہار)

حسین خاں
دارالسلام۔ مغل پورہ۔ حیدرآباد ۲۰۰

جنیٹکس (GENETICS) سے متعلق اہم معلومات

کوئی ذی حیات جسم یک جنسی نہیں ہوتا بلکہ مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے ذروں سے مل کر بنا ہوا ہوتا ہے۔ ان ذروں کو اصطلاح میں "خلیات" (حجرے یا کوٹھریاں) کہا جاتا ہے۔ ایک کوٹھری کو "خلیہ" کہتے ہیں۔ خلیوں کی گنتی کتنی ہی کیوں نہ ہو پورے جسم کی جتنی خصوصیات اور صفتیں ظاہر میں ہمیں نظر آتی ہیں وہ سب کی سب ایک ایک ذرے کی اپنی ذات میں بھی تمام و کمال جمع ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ (۱) پیدا ہونا یعنی اپنے جیسے دوسرے ذرے کو تخلیق کر لینا (تولید و تناسل) (۲) بڑھتے جانا (نشو و نما) (۳) تحریک کو قبول کرنا اور اس کا ردِ عمل ظاہر کرنا (احساس اور حرکت) (۴) مختلف قسم کے مواد کو جذب کرنا اور ان کو کیمیاوی طور پر تبدیل کر کے ان مواد جیسا بنا لینا جو خلیہ میں پہلے ہی سے موجود تھا اور جن کے جذب ہونے پر خلیہ نہ صرف توانا رہتا تھا بلکہ زندہ بھی کہلایا کرتا تھا (تغذیہ) (۵) غیر ضروری مواد کو دور کرتے رہنا (اخراج فضلات) اور آخر میں (۶) انحطاط یعنی موت سے ہمکنار ہو کر بکھر جانا۔ یہ تمام ضروری خصوصیات (علامات حیات) ہر اس ذرے میں موجود ہوتی ہیں جن کے مجموعے سے ایک زندہ کہلانے والا جسم بنا ہوا ہوتا ہے۔

متقدمین کے بموجب علامات حیات کبھی تو اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ علانیہ نظر آجاتی ہیں اس لیے ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا یعنی وہ "بالفعل" موجود ہوتی ہیں اور کبھی وہ اتنی خاموش اور دبکی چھپی ہوتی ہیں کہ فوراً تو سمجھ میں نہیں آتیں لیکن مناسب حالات مہیا ہونے پر وہ ظاہر ہو جایا کرتی ہیں جیسے درختوں کے

چر بیلے + شکریلے + لجیلے اجزا کی ترتیب = قانون [illegible]

ذہنوں میں ایسی صورت میں متقدمین کا فیصلہ یہ ہے کہ علامات "بالقوی" ہوتی ہیں۔ یعنی حقیقت میں موجود تو ہوتی ہیں لیکن ظاہر نہیں ہوتیں۔ سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔

کسی خلیہ میں اس کے زندہ رہنے کا انحصار ان اجزاء پر ہوتا ہے جن سے خلیہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ (اجزائے ترکیبی) ایک لفافہ ہوتا ہے جس میں خلیے کے اجزاء بند ہوتے ہیں۔ (غلافِ خلیہ) یہ موہوم سی ایک جھلی ہوتی ہے مگر اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اپنے اندر سے بعض مواد کو آرپار گذر جانے دیتی ہے اور بعض کو باہر ہی روک دیتی ہے۔ اس طرح سے اس کا اصلی کام صرف لین دین کی حد تک محدود ہوتا ہے لیکن اس میں انتخاب کر لینے کی جو قابلیت ہوتی ہے وہ بہت اہم سمجھی جانی چاہیے۔ جھلی کے اس لفافہ میں ایک نیم سیال مادّہ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ زندگی اصل میں اسی مادّے پر منحصر ہوتی ہے کیونکہ سارا تغذیہ، سارے ارواح اور سارے قویٰ اسی مادّے سے وابستہ ہوا کرتے ہیں۔

یہ مادّہ متوازن اور ہر لحاظ سے درست ہو تو خلیہ کی زندگی اور اس کے افعال کا ہر شعبہ بھی متوازن اور درست رہتا ہے۔ اس میں ذرا سا بگاڑ زندگی اور اس کے افعال دونوں کو اسی تناسب سے بگاڑ دیتا ہے جس تناسب سے خرابی واقع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مادّے کو "سرمایہ" (مادّۂ حیات) کا لقب دیدیا گیا ہے۔ نسل کا قانون متعین کرنے میں بھی یہی مادّہ یعنی مادّۂ حیات بہت دخیل ہوتا ہے جس کی تفصیل

اس مضمون میں [illegible] خلیے کے اجزائے ترکیبی میں اور بھی کئی اجزا شامل [illegible] اور اگرچہ خلیہ کا ہر کام زندگی سے لے کر موت تک سب ہی اجزاء کے اشتراک عمل سے ہوا کرتا ہے لیکن یہاں ہم اس خیال سے ان کا تذکرہ نہیں کریں گے کہ یہ بیان گنجلک اور ناقابل فہم نہ ہو جائے۔ قانونِ نسل سمجھنے کے لئے باقی اجزاء زیادہ اہم بھی نہیں ہیں۔ اہم صرف دو اجزاء ہیں۔ ایک تو مادّۂ حیات اور دوسرا اسی مادّۂ حیات کی ایک اور شکل جو نیم سیال ہونے کے بجائے تقریباً منجمد ہوتی ہے اور ایک گٹھلی کی طرح نیم سیال مادّۂ حیات میں تیرتی رہتی ہے۔ اسے "نواۃ" (چھوٹی گٹھلی) کہا جاتا ہے۔ در حقیقت مادّۂ حیات ہی کی دوسری شکل ہوتی ہے مگر یہ مادّۂ حیات کے مقابلہ میں نسبتاً [illegible] ہوتی ہے۔ نسلی خلیے یعنی تولید اور تناسل کی قابلیت رکھنے والے خلیے کبھی "نواۃ" کے بغیر نہیں ہوا کرتے تولید اور تناسل ہو چکنے کے بعد البتہ بعض خلیے ایسے بھی بن جاتے ہیں جن میں نواۃ موجود نہیں ہوتی جیسے خون کے سرخ جسیمے۔ مگر یہ جسیمے اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنے جیسے دوسرے جسیمے پیدا کر سکیں۔ اس طرح سے مادّۂ حیات کی غیر موجودگی میں تولید اور تناسل بھی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ گویا "نواۃ" اور مادّۂ حیات تولید اور تناسل (ترتیبِ نسلی) کے لئے لازم اور ملزوم ٹھہرتے ہیں۔

یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک خلیہ جن مادّوں سے تشکیل پاتا ہے۔ اور جن کے بغیر فنا ہو سکنے کا

[illegible] توازن پر زندگی کا انحصار!

[illegible] چار دن [illegible] جاتا ہے۔ ان اشیاء کو [illegible] صرف تین عناصر کے ملنے سے کر اور ان کو آپس میں ملا کر ترتیب دیا ہے۔ ان کے نام آپ نے بھی سنے ہوں گے یعنی چربیلے اجزاء (Fats) شکریلے اجزاء [illegible]) اور لحمیلے اجزاء (Proteins گوشت جیسے) تھوڑا سا پانی سیل بنانے کے لئے اور ہر قسم کے طعام انجذاب کرانے کے لئے بہر صورت ضروری ہوتا ہے اس لئے وہ تو خیر لازم ہوا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ خلیے کی ساری پونجی اتنی ہوتی ہے کہ ایک دو تین کہہ کر ایک انگلی پر گنی جا سکتی ہے۔ کسی خلیے کو اگر ہم اس کے اجزاء میں بانٹنا چاہیں تو بیان کئے ہوئے تینوں مادوں سے ہم باہر نہیں جا سکتے۔ کہنے کو یہ دعویٰ بہت بہت سادہ ہے لیکن ایک اور حقیقت جو آپ کو اس سے بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوگی اور جو حیرت ناک حد تک آپ کی دلچسپی کو ٹھیس پہنچائے گی وہ یہ ہے کہ سارے چربیلے، شکریلے اور لحمیلے مادے صرف چار عنصروں (Elements) کو ملا کر بنا لیئے گئے ہیں۔ ان میں سے آپ کسی کو اٹھا لیجئے۔ اس کے اجزائے ترکیبی الگ الگ کرتے چلے جائیے جب آپ اس عمل کے خاتمہ پر پہنچیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ سارا کھیل صرف تین عناصر کا تھا۔ یعنی کاربن ہائیڈروجن اور آکسیجن کا۔ لحمیلے مادوں میں ایک عنصر زیادہ ہوتا ہے جو نائٹروجن کہلاتا ہے۔ اس طرح سے سو عناصر کی لمبی چوڑی فہرست میں سے انسانی خلیے کے حصّے میں صرف چار عناصر آئے ہیں کہ وہ ان کو ساتھ لے کر سارا ہنگامۂ حیات برپا کر رہا ہے۔ باقی عناصر سے کہیں کہیں اس کی شناسائی ہو جاتی ہے ورنہ دوسرے ساتھیوں سے اس مسافر کو کوئی خاص سروکار نہیں ہوا۔

خلیاتی سطح کے اجزائے ترکیبی اور ان کی ساخت کے متعلق اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سادہ سادہ سا ہے تو سہی مگر پھر بھی بہت سی علمی (سائنسی) اصطلاحات اور طرز اظہار لئے ہوئے ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ایک عام قاری کا ذہن ممکن ہے کہ پوری طرح ان تمام معلومات کو اپنے اندر محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس لئے ترسیل کے اس المیہ کو دور کرنے کے لئے وہ باتیں جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں اب کی بار اس طرح دہرائے دیتے ہیں کہ پھر کسی کو بھی ہم سے شکایت باقی نہ رہ جائے۔ یوں فرض کیجئے کہ ہمارے پاس چار طرح کے رنگوں کی مٹی ہے۔ کاربن کے ک، ہائیڈروجن کی ہ، آکسیجن کی آ اور نائٹروجن کے ن کو بھلا دیجئے۔ اس کی بجائے ک سے کالی، ہ سے ہری آ سے اودی اور ن سے نیلی مٹی یاد رکھئے۔ اب اگر ہم ان میں سے ہر ایک کا ایک ایک حصّہ برابر لیں اور انھیں گوندھ کر ایک اینٹ بنا لیں تو اس کا جو رنگ ہوگا وہ ایسا رنگ ہوگا جو چاروں رنگوں کی برابر برابر مقدار کے ملانے سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ اس اینٹ کو ایک طرف رکھ دیجئے اور سوچنے کے

بقیہ [illegible]

کُن فیکون کے چاک پر بیٹھے ہوئے کمہار کا [illegible]

کے لئے چھوڑ دیجئے۔ اتنے عرصہ میں آپ دوسری اینٹ بنائیے لیکن اب کی بار کے یعنی کالا رنگ زیادہ اور ہاتی رنگ اسی تناسب سے کم کر دیجئے۔ اس طرح جو اینٹ بنے گی وہ پہلی اینٹ سے نہ صرف مختلف ہوگی بلکہ یقینی طور پر جداگانہ ہوگی۔ اب ذرا دل پر ہاتھ رکھئے اور فرمائیے کہ یہ عمل اگر آپ کرتے چلے جائیں تو آپ کتنی طرح کی اینٹیں بنانے کے قابل ہو جائیں گے۔ میری رائے میں تو ان کی گنتی ناممکن ہے۔ خدا جانے آپ کی کیا رائے ہے؟

دستِ قدرت نے بھی انسانی خلیہ کے ساتھ بالکل یہی عمل کیا ہے۔ کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن کے سالمات لے لئے ہیں۔ اس نے ان کی مقدار میں نہ صرف بدلی ہیں بلکہ ایک ہی مرحلہ پر اُن مقداروں کو نہیں بدلا ہے۔ جیسا جیسا مصلحت کا تقاضہ دیکھا ہے، مقدار میں بھی اسی لحاظ سے تبدیلی کر لی ہے۔ اُس نے مرحلے کو بھی بدل دیا ہے اور وقتاً فوقتاً ضرورت کے لحاظ سے قدرت کا یہ ہاتھ اینٹوں کی شکل کو بھی مختلف کرتا چلا گیا۔ کُن فیکون کے چاک پر بیٹھے ہوئے اس کمہار کے کمال کا ایک خفیف سا اندازہ آپ کو اس بات سے بھی ہو جائے گا کہ جہاں ترکیبوں کے اختلاف کے ساتھ ساتھ اس نے سالمات کو یہ قدرت بخش دی ہے کہ وہ مثبت (Proton) منفی (Electron) اور نہ مثبت نہ منفی (Neutron) ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی کے

۸ے پیکر حیدرآباد

ساتھ اپنا دامن باندھے رکھے وہاں اس [illegible] کو بدل کر اور ہر مرحلہ کو تبدیل کر کے کبھی کہیں [illegible] کہیں یہ عمل بھی کر دیا ہے کہ ایک آدھ کوئی دوسرا عنصر یا اس کا سالمہ بھی ساخت میں شریک کر دیا ہے یا ایک آدھ کوئی اور عنصر یا اس کے سالمہ کو کسی منزل پر اس سے الگ بھی کر دیا ہے۔ اس طرح سے جمع در جمع، ضرب در ضرب، تقسیم در تقسیم اور تفریق در تفریق کر کے اس خالق حقیقی نے اتنی قسم کی اینٹیں تخلیق کر ڈالی ہیں (اس پر سے لطف یہ کہ ان اینٹوں سے مکانات بھی تعمیر کر ڈالے ہیں) کہ بظاہر کہنے کو عناصر صرف چار ہیں۔ دیکھنے کو مادۂ حیات میں صرف تین ہی مادّے آمیز ہیں لیکن سچ پوچھا جائے تو نباتات اور حیوانات (بشمول حضرتِ انسان) تعداد میں اتنے ہو گئے ہیں کہ ان کی گنتی اور ان کے اقسام خود بنانے والے ہی کو معلوم ہوں تو معلوم ہوں۔ انسان کا دماغ تو آج تک اُن کی فہرست پوری طرح تیار نہیں کر سکا ہے۔ میرے نزدیک تو یہ بھی مشتبہ ہے کہ آئندہ بھی کبھی جنابِ انسان اس قابل ہو سکیں کہ اس تعداد کا عشر عشیر بھی ان کی شمار کی حد میں آ جائے۔ اپنے متعلق البتہ انسان نے تھوڑی بہت معلومات بہم پہنچائی ہیں اور انہی کا خلاصہ ہم بھی یہاں پیش کئے دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن اور تھوڑے سے نائٹروجن کے سالمات

[illegible] سے حیوان، نباتات و انسان کی تخلیق!

[illegible] (مثلاً [illegible] اور خلیہ [illegible]) اور خلیے (مثلاً عضلہ) بن جاتے ہیں اور پھر ان تینوں کے آمیزہ سے وہ سرمایہ (یعنی لازم و مادۂ حیات) وجود میں آجاتا ہے۔ جو خلیہ کے اندر اس کے غلاف سے گھرے ہوئے جُزو میں محفوظ ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی بتاچکے ہیں کہ خلیے خصوصیت سے بہت فرق کے ساتھ ہزاروں شکلوں صورتوں اور رنگوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہی حال ان کے افعال کا بھی ہے۔ افعال کے نقطۂ نظر سے بھی خلیے الگ الگ ہیں۔ ان دونوں نوعیتوں میں (مادۂ حیات کے فرق اور فعل کے فرق میں) بظاہر کوئی رشتہ دکھائی نہیں دیتا لیکن علم الافعال (فزیالوجی) جیسے جیسے ترقی کرتا گیا یہ حقیقت واضح ہوتا گیا کہ غیر متعلق دکھائی دینے کے باوصف بھی خلیہ کا مادۂ حیات اور اس کا فعل ایک دوسرے سے قریبی طور پر مربوط ہوا کرتے ہیں۔ جب کبھی خلیہ کے ان اجزاء میں ردو بدل ہو جاتا ہے جن پر خلیہ مشتمل ہوتا ہے تو خلیہ کا فعل بھی بدل جایا کرتا ہے اور جب کبھی خلیہ کا فعل بدلتا ہے تو خلیہ کے مادۂ حیات میں بھی کچھ نہ کچھ کیمیاوی تبدیلی پہلے ہی سے اثر پذیر ہوچکی ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھا کرتے ہیں۔

خلیہ کے مادۂ حیات اور اس کے فعل کا باہمی ربط چونکہ بنیادی معاملہ ہے اور اس کو سمجھے بغیر نفس مضمون کو سمجھنا یا سمجھانا دونوں بہت دشوار ہوتے ہیں اس لئے مزید وضاحت کی خاطر ہم اس کی ایک مثال بھی یہیں دیئے دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے:

جگر کا خلیہ ہشت پہلو، سرخ سیاہی مائل اور قد میں گردہ کے خلیہ سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔ دونوں خلیوں کا مادۂ حیات ہوتا ہے۔ بہر صورت مادۂ حیات ہی لیکن کیمیا کی میزان سے اگر دونوں کو تولا جائے تو دونوں خلیوں کے مادۂ حیات ک، ھ، الف اور ن پر مشتمل ہونے کے باوجود ان کے اوزان اور آمیزہ میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ دونوں کا کام بھی (فعل) اسی لئے ایک جیسا نہیں۔ کاموں میں بھی بعد المشرقین ہوگیا ہے۔ ایک انگوری شکر کو نشاستہ بنا کر نشاستہ حیوانی کی شکل میں اسے ذخیرہ کرتا ہے اور فولاد کی ایک خاص قسم کو اپنے جسم میں روک کر خون کے دانوں کو اس کا تدارک دیتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ غذا سے صفراوی زہروں کو الگ کرکے صفراء کی تھیلی کو بھرتا رہتا ہے اس کے برعکس دوسرا خلیہ یعنی گردہ کا خلیہ صرف پانی کو جذب کرتا رہتا ہے اور بعض خاص قسم کے نمکین مواد تیار کرکے اس پانی میں شامل کرتا رہتا ہے جس کو قارورہ بنا کر جسم سے باہر بھیجا جانا صحت کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہی کیفیت جسم کے دوسرے خلیوں کی بھی ہوتی ہے۔ سب کے عناصر اور ان عناصر سے ترکیب پاکر بننے والے ثانوی مواد ایک ہی ہوتے ہیں۔ ان کا تناسب جداگانہ ہوتا ہے۔ اس جداگانہ تناسب کے باعث ہر ایک خلیہ کا فعل بھی جداگانہ ہوگیا ہے اور یہ افعال مختلف اعضائے

جسم کے ہر خلیے میں تولید و تناسل کی خصوصیت ہوتی ہے

اور متضاد سب ہی کے طرح کے ہو گئے ہیں۔

علم الحیات (BIOLOGY) جاننے والوں کو جب تک
یہ اندازہ نہ ہوا تھا کہ مادۂ حیات اور فعل آپس میں
بمنزلۂ ہمزاد ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت تک یہ علم اعلیٰ
مبہم، محدود اور غیر تسلی بخش تھا۔ اس میں قدم قدم پر
پہیلیوں سے سابقہ پڑا کرتا تھا معموں کی توجیہ تو کسی
نہ کسی طرح کر ہی لی جاتی ہے مگر اس سے تشفی کی بجائے
تشنگی اور بڑھتی تھی اور کئی طرح کی دوسری پیچیدگیوں
میں بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح کافی عرصہ تک
اندھیرے میں ناوک اندازی کی جاتی رہی مگر جونہی یہ
اشارہ ملا کہ ایک خلیہ کا فعل دراصل اس پر منحصر ہے کہ اس
کے کیمیاوی اجزاء کا کیا تناسب ہے تو گویا ظلمت چھٹ
گئی اور سپیدۂ سحر نظر آنے لگی۔ دنیا کے مختلف مقامات
پر مختلف ماہرین حیات نے گروہ در گروہ ہو کر بھی
اور اپنے اپنے طور پر الگ الگ بھی خلیہ کے فعل اور
اس کی کیمسٹری کے باہمی رشتہ پر ساری توجہ مرکوز
کر دی اور کسی نے کوئی خلیہ اور کسی نے کوئی، کسی نے
ایک فعل اور کسی نے پورے عضو کے مجموعی افعال
کو چن کر اپنی تحقیق اور کاوش کا موضوع بنا لیا۔ اس
میں باریک بینی کی زیادہ ضرورت تھی اور یہ غواصی
راس بھی ان ہی محققین کو زیادہ آئی جن کی طبیعت
میں بال کی کھال نکال لینے کا ملکہ تھا۔ دنیائے تحقیق
میں ایک تہلکہ مچ گیا اور اس کے بعد اب تک اس
علم نے جو ترقی کی ہے اور کم سے کم مدت میں اس
کے اندر جتنی زیادہ سے زیادہ کشادگی اور وسعت
پیدا ہو گئی ہے اس کا طرح میں [illegible]
اپنی مثال آپ ہے۔ وہ پیر تاک بھی [illegible]
رنگ بھی۔

یہاں ہمارا جی تو چاہتا ہے کہ قانون نسل (LAW
OF HEREDITY) پر کچھ کہنے سے پہلے قانون حیات
پہ ایک سیر حاصل گفتگو کر لی جائے کیونکہ قانون نسل
بہر صورت قانون حیات ہی کا تابع ہوا کرتا ہے لیکن
اگر ہم نے ایسا کیا تو ایک تو موضوع سے بے وفائی
ہو گی اور دوسرے مضمون غیر ضروری طور پر طویل بھی
ہو جائے گا۔ اس لئے ہم اپنے رجحان طبع سے درگذر
کرتے ہیں اور خود کو قانون نسل تک ہی محدود کئے لیتے
ہیں تاہم اپنے قارئین سے ہم اتنا ضرور کہے دیتے
ہیں کہ وہ مذکورۂ بالا ہر دو قوانین کو خلیہ کے مادۂ حیات
اور اس کے فعل کی طرح کوئی جداگانہ چیزیں نہ سمجھیں
جیسا کہ وہ اب تک سمجھتے آئے تھے۔ وہ دونوں بڑی
حد تک ایک ہی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اجمال
ہے تو دوسرا تفصیل، ایک جزو ہے تو دوسرا کل، ایک
محض ایک حرف ہے تو دوسرا پوری ضخیم کتاب،
جو ان ہی حروف کو ملا کر لکھی گئی ہے۔

خلیہ کے مادۂ حیات اور اس کے فعل کا باہمی رشتہ
دریافت ہونے سے پہلے قانون نسل کے سلسلہ میں صرف
اتنا معلوم تھا کہ اس مادۂ حیات میں نوات کے اندر
نقطے نقطے ہوتے ہیں جن کی تعداد ہر ذی حیات میں
مقرر اور معین ہوتی ہے اور یہ تعداد سدا مقرر اور معین ہی
رہا کرتی ہے۔ اس میں کمی اور بیشی نہیں ہوا کرتی چنانچہ

نوبل انعام یافتہ ہندوستانی سائینسداں ڈاکٹر کھورانا کا [illegible]

خلیوں میں جو تناسل اور تولید کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی تعداد ۴۶-۴۸ بیان کی جاتی تھی۔ ان میں دو نقطے کم کر دیئے جاتے تھے اور اس کمی کی توجیہہ یہ کی جاتی تھی کہ انسانوں میں دو جنس ہوتی ہیں۔ ایک مذکر اور ایک مؤنث۔ اب چونکہ یہ نقطے اس تعداد کو پیشِ نظر ہی مقرر کئے جاتے تھے ہیں کہ جس تعداد سے نسل کو چلنا جاتا ہے تو مذکر اور مؤنث کی شناخت بھی اس میں کوئی نہ کوئی گنجائش تو کسی صورت سے نکال ہی جانی چاہیے نقطوں کی تعداد میں دو کا اضافہ کر دینے میں یہ مصلحت تھی کہ اس طرح کے الٹ پھیر کر دینے سے نسل کے ساتھ ہی ساتھ جنس کا تعین سمجھانا بھی قرینِ از قیاس ہو جاتا تھا۔ اصل میں جو مفروضہ کار فرما تھا وہ یہ تھا کہ تولیدی خلیوں میں صرف نسل ہی کی نہیں بلکہ جنس کی افزائش کا خاصہ بھی ہوتا ہے لہذا ہو نہ ہو ان ہی خلیوں میں کہیں نہ کہیں جنس کا تعین کرنے کی قوت بھی چھپی ہوئی ہونی ہی چاہیے جنس کبھی مونث نکلتی تھی کبھی مذکر لہذا اس سقم کو دور کرنے کے لئے یہ ترکیب نکالی گئی کہ دو نقاط کا اضافہ کر دیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ ہو نہ ہو جنسی خصوصیات اگر وابستہ ہوں گی تو ان ہی سے ہوں گی ورنہ تولیدی خلیوں کے اندر کیوں ہوتے دوسرے اور خلیوں میں بھی کیوں نہیں ملتے۔ ان میں بھی انہیں واقع ہونا چاہیے۔ اس منطق سے واقعہ بھی یہ ہے کہ جنس کی پیدائش اور تعین کا پیچیدہ مسئلہ سلجھانے میں کافی مدد ملی۔ کہا یہ جانے لگا کہ یہ دونوں نقاط اگر مردانہ خصوصیات کے حامل ثابت ہوں (ایکس ایکس) تو تقسیم کی صورت میں یہ بس خلیہ میں چلے جائیں گے جس کی تقسیم سے جتنے خلیے پیدا ہوں گے۔ ان سے بن کر بننے والا جسم مذکر ہوگا۔ ایسا اس وقت بھی ہوگا جب ایک مذکر نقطہ اور دوسرا مؤنث نقطہ (ایکس وائی) ساتھ ساتھ ہو جائیں کیونکہ مردانہ خصوصیات تو غالب ہوا کرتی ہیں۔ لہذا انثی خصوصیات کبھی سر ہی نہیں اٹھا سکیں گی البتہ تقسیم کے وقت انثی خصوصیات کے حامل دونوں نقطے ایک دوسرے کے ہمراہ آ جائیں تب ان کے مجموعہ سے خلقت پانے والا جسم مؤنث ہی ہوگا اس صورت میں وہ مذکر ہو ہی نہیں سکتا۔ حکومت گویا مجموعی تھی اور فیصلہ اس پر منحصر رہتا تھا کہ غلبہ کرا وکس جانب ہے۔ کبھی مردانہ خصوصیات رکھنے والے نقاط اور کبھی زنانہ اداؤں کے تاز پروردہ نقاط کا غلبہ ادھر یا ادھر ہوتا کیوں تھا۔ یہ معاملہ ایک چیستان ہی تھا۔ لغت میں کیسے کا جواب تو تھا کیوں کا کوئی تشفی بخش جواب نہ تھا۔

خلیہ اور اس کے مادۂ حیات کے حقیقی رشتہ کا انکشاف ہونے پر جب تحقیقات کا میدان وسیع ہوا اور اس میں نہ صرف علم کیمیا (کیمسٹری) کی روزافزوں ترقی نے شریکِ غالب بن کر حصہ لینا شروع کر دیا بلکہ جوہری خوردبین کی ایجاد نے بھی معلومات کو بڑھانے میں ہاتھ بٹایا تو پھر پتہ یہ چلا کہ وہ مادۂ حیات جو خلیہ کے غلاف میں بھرا رہتا ہے گو نواۃ سے باہر ہوا کرتا ہے وہ بڑی حد تک صرف تغذیہ اور تنمیہ یعنی غذائی عمومیات اور نشوونما کی کفالت کیا کرتا ہے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ

[illegible] بے جان مادّہ خلیے کی پیدائش ممکن ہے!

[illegible] مادّۂ حیات [illegible] تک جا رہی
ہیں [illegible] بے جان مادّہ جو
[illegible] (نواۃ) کہلاتا ہے وہ مرکز اصلی کا درجہ رکھتا
ہے اور نہ صرف یہ کہ خلیے سے اس کے جملہ افعال
(جس میں سارے کیمیاوی اعمال بھی شامل ہوتے
ہیں) ان کو صادر کراتا رہتا ہے بلکہ وہ خود ہی نسل کا
تعین بھی کرتا ہے۔ جنس کا تعین بھی وہی کرتا ہے
اور جنس کا انتخاب بھی اسی کے سپرد ہوتا ہے۔ اتنا
ہی نہیں، جس جسم سے وہ خلیہ تعلق رکھتا ہے جس
کا یہ نواۃ ہوتا ہے اس جسم پر مرتب ہونے والے اثرات
کی صورت میں اس کے سارے موافق یا مخالف
ردِ عمل کی تحریک کا منبع بھی یہی مادّۂ حیات ہوتا ہے
گویا ایک خلیہ میں اقتدار اعلیٰ نواۃ کے قبضہ میں رہتا
ہے اور اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے دوسرے
اور حکم بجالانے والی قوتیں اس کے باقی مادۂ حیات
کو اپنی قیام گاہ بنائے رکھتی ہیں۔

تحقیق نے یہ بھی تصفیہ کر دیا ہے کہ مادۂ حیات ہو یا
نواۃ کے اندر جو مواد جاگزیں ہوتے ہیں وہ مواد
ہوں یہ دونوں کے دونوں زیادہ تر مادوں کی اس
قسم سے تعلق رکھنے والے مادے ہوتے ہیں جو
مولدِ لحمیہ (PROTEINS) کہلاتی ہے۔ فرق صرف
اتنا ہوتا ہے کہ مادۂ حیات جن مادوں پر مشتمل ہوتا
ہے وہ کیمیاوی لحاظ سے کم پیچیدہ ہوتے ہیں اور
نواۃ کی تحقیق میں جو موادِ لحمیہ شریک ہوتے ہیں وہ
بہت ہی بہت پیچ در پیچ ہوا کرتے ہیں۔ پیچیدگی

کے اس سوال پر کچھ چھنداتی صفات اختیار کرتے
ہیں کہ نچوڑ سے ہوئے رس کے درجہ سے گزر جاتے
ہیں اور ایسا رس بن جاتے ہیں جسے نہ صرف یہ کہ
بار بار نچوڑا گیا ہو بلکہ نچوڑ نچوڑ کر چھان بھی لیا گیا ہو۔
خلیہ کا مادۂ حیات اگر گوشت کا شوربہ ہوتا ہے تو نواۃ
کے موادِ لحمیہ یوں فرض کر لیجئے کہ یخنی (ماء اللحم) ہی نہیں
بلکہ یخنی کی روح ہوا کرتے ہیں۔ کیمیاوی زبان میں گوشت
لحمیہ منہضمہ (DIGESTED PROTEIN) ہو کر
پہلے تو امینو ایسڈز (حموض لحمیہ) میں تبدیل ہوتا ہے
پھر آگے چل کر حموض لحمیہ (AMINO-ACIDS) کے
درجہ سے بھی گزر جاتا ہے۔ اب وہ حمض نواتی۔
(NUCELIC-ACID) بن جاتا ہے۔ حال تک تقریباً
۱۳۰ نیوکلک ایسڈز دریافت ہو چکے ہیں۔
کسی خلیہ کا وجود میں آنا (پیدائش)، اس کا کسی نہ
کسی ذی حیات نوع جیسا بن جانا (تناسل) اس
نوع میں اس کا نر یا مونث کا روپ قبول کر لینا
(انتخاب جنس)، ایک جیسے خلیوں کا ایک ہی مقام
پر اپنی نوآبادی قائم کر لینا (عضو سازی) اپنے لئے
ایک خاص فعل چن لینا اور تازندگی وہی ایک فعل
انجام دیتے چلے جانا (شعورِ فعل)، فعل کو خوبی کے
ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لئے باہم سے سربراہ
ہونے والے مادوں میں تغیر اور تبدل کر کے انھیں
اپنے مصرف کے قابل بناتے رہنا (تخریب تعمیر)
آثارِ زندگی، حرکت، ردِ عمل اور احساس جیسی صفات
اپنے اندر پیدا کر لینا، عمر بھر ان میں ترقی برابر فرق

"امینوایسڈ" کی کمی و بیشی نسلوں میں اختلاف کا باعث

نہ ہونے دینا (برقراری صحت) اور آخر کار ہوتے ہوتے
توانائی کے ذخیرہ سے استفادہ کرنے کے قابل نہ رہنا
اور عمر کی میعاد بتلانے والی گھڑی کی ٹِک ٹِک کا ایک
دن رک جانا (موت) یہ تمام کی تمام باتیں ہی نہیں بلکہ
کائنات میں ہونے والا جس قدر شور اور غوغا ہے
وہ سب کا سب آج کے سائنس کا یہ کہنا ہے کہ
یہ سب کا سب خواص ذاتی کی بدولت جاری وساری
ہے۔ خواص نہ ہوں تو زندگی نہ ہو، زندگی نہ ہو تو ذی
حیات اور غیر ذی حیات میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔
زندہ اجسام بھی ایسے ہی ہو جائیں جیسے پتھر کا کوئی
ٹکڑا ہوتا ہے۔ لڑھکایا تو لڑھک گیا، چھوڑ دیا تو
بے حس، بے حرکت ایک ہی جگہ پڑا رہا!۔

خلیے کی پیدائش کے متعلق پچھلے علم النسل کا کہنا یہ
تھا کہ ایک تو وہ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے خلیے
سے پیدا ہوتا ہے یعنی یہ سلسلہ آدم تا ایں دم خلیہ ہی چلا
آیا ہے۔ دوسرے ان کا نظریہ یہ بھی تھا کہ جو محرکات
اس عمل کو شروع کرتے ہیں وہ خلیے کے اندر نہیں ہوتے
اس میں باہر سے آکر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ انسان غذا
حاصل کرتا ہے وہ غذا خون بنتی ہے، خون سے
مختلف مادے بنتے ہیں ان ہی میں رسیلے یا
HORMONES شامل ہیں جو بعض منہ بند گلٹیوں
سے چپکے چپکے ترشح پاتے ہیں اور خون میں اندر
ہی اندر شریک ہوتے رہتے ہیں ان میں سے بعض
کا عمل اعضائے تولید و تناسل کو نمو دینا ہے اور قدرت
نے یہ خصوصیت صرف ان ہی کو سونپی ہے کہ وہ

اپنی کیمیاوی تحریک ان اعضا کو دے سکیں جو
خاص طور پر تولید اور تناسل ہی کا کام لیتے ہیں۔
تمام محرکات باپ کے خلیے سے بیٹے کے خلیے میں برابر
منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد کو ورثہ ملا
کرتا ہے۔ رہا یہ امر کہ کبھی بیٹا کیوں پیدا ہوتا ہے اور
کبھی بیٹی کیوں تو یہ تو پہلے ہی کہہ دیا جا چکا ہے کہ خلیے
میں جو نقاط (کروموسومز) ہوتے ہیں وہی نسلی اور جنسی
دونوں خصوصیات کا مخزن بھی ہوتے ہیں۔ ان کے
بٹنے سے یہ الٹ پھیر ہوتا رہتا ہے اس سے زیادہ
سمجھنے سمجھانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

پچھلے پانچ سال میں علم النسل تحقیقی معلومات میں
حیرت انگیز اضافہ کیا ہے، یہ انقلاب ہر سمت میں ہوا کوئی
جہت اس سے خالی نہیں رہی اور اس کی بدولت نہ
صرف یہ کہ سابقہ کی بعض پہیلیاں بوجھے جانے کے قابل
ہو گئی ہیں بلکہ ان کے متعلق جو نظریے مدون پائے گئے
تھے ان کی تشریح اور تفصیل بھی ممکن اور آسان ہو گئی
ہے۔ اتنا ہی نہیں، نسل کے قانون کے متعلق جو نئے
انکشافات ہوئے ہیں ان کی بدولت اس قانون کی کئی
دفعات میں جگہ جگہ ترمیم اور جگہ جگہ تصحیح کے علاوہ اس
کی بہت سی اہم دفعات کی تنسیخ بھی عمل میں لائی جا رہی ہے
ایسا بھی ہو رہا ہے کہ کہیں کہیں سے اس قانون کو یکسر
نئے سرے سے لکھنا بھی پڑ رہا ہے اور اس طرح سے
سابقہ قوانین کا اخراج یا ان کی تجدید عمل میں آ رہی ہے
یہ کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ اتنی گوناگوں اور اس
قدر چوطرفی ہے کہ بہت ممکن ہے آئندہ چند سال بعد

کیمیاوی تبدیلی ہزاروں شکلوں اور رنگوں کو جنم دیتی ہے

پیدا ہوتا پیش کیا جانے لگے کہ پورا کا پورا قانونِ نسل
ستتر سے اسّی کے درمیانی عرصہ میں مرتب کیا
گیا تھا۔ اس سے قبل اس قسم کا کوئی قانون
موجود نہ تھا اور جو موجود تھا وہ الف سے لے کر
ی تک بالکل غلط تھا حالانکہ سائنس یعنی علم
میں اکتشافات کے متعلق یہ حقیقت ہمیشہ سے تسلیم
شدہ ہے کہ کوئی اکتشاف بنیاد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔
بنیاد پہلے موجود ہوا کرتی ہے بعد کو رکھی نہیں جاتی۔
نئے قانونِ نسل نے جن پرانے مسلّمات کو تسلیم کیا ہے
ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ خلیہ اور نواۃ دونوں مواد
لحمیہ ہی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس علم نے
اس بنیادی حقیقت کو صرف تسلیم ہی نہیں کیا اس
نے بڑی حد تک اس کی توثیق بھی کر دی ہے اور یہ
بھی معلوم کر لیا ہے کہ وہ کون کون سے مواد لحمیہ ہیں
جن سے سب تو نہیں البتہ بعض بعض خلیے ترکیب
پاتے ہیں۔ اس نے چند موادِ لحمیہ کے متعلق یہ پتہ بھی
چلا لیا ہے کہ وہ شروع سے لے کر آخر تک تبدیلی کے
کن کن مراحل سے گذرتے ہیں۔ ہر مرحلہ پر ان کی ترکیب
اور ساخت میں کیا اور کتنا فرق پڑ جاتا ہے اور تمام مراحل
سے گذر کر بالآخر آخری مرحلہ پر وہ کونسی ہیئت اور
صورتِ نوعیہ اختیار کر کے اس پر قناعت کر لیتے ہیں
ایسے موادِ لحمیہ اب تجربہ خانوں میں شیشے کی نلکیوں
میں محفوظ بھی کر لئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں
نئے علم نے ہماری معلومات میں بہت سے نئے
اضافے بھی کئے ہیں۔ اس نے بعض ایسے نئے مواد
لحمیہ بھی دریافت کئے ہیں جو اب تک نامعلوم تھے
اس طرح کے موادِ لحمیہ سے ترکیب پانے والے بعض
مرکب موادِ لحمیہ بھی نئے سرے سے دریافت ہوئے
ہیں اور یہ ثبوت بھی بہم پہنچا لیا گیا ہے کہ جب کبھی
موادِ لحمیہ کی ساخت (اجزا کا تناسب) تبدیل ہوتی
ہے تو کون سی تبدیلی کا خلیہ کے فعل پر کیا اثر ہوتا ہے
اور کس تبدیلی سے خلیہ کا کون سا فعل کتنا بدل جاتا
ہے۔ یہ تحقیقات ابھی جاری ہیں اور وہ فہرست جو
ابتداء میں ایک یا دو مرکبات کے نام سے شروع
ہوئی تھی آئے دن لمبی ہی لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ اب
مرکبات کی تعداد ہزاروں پر آتی جا رہی ہے سائنسدان تو
یہ کہتا ہے کہ یہ تعداد کبھی نہ ختم ہونے والی تعداد ثابت
ہو گی کیونکہ کہنے کو تو چاروں عناصر کو ۴ ضرب ۴ یعنی ۱۶
سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان سولہ طرح کے مرکبات کو
چونسٹھ طرح کے مرکبات کو ۲۰ ضرب ۲۰ اگر کیا جاتا
ہے تو اتنے مرکب تیار ہو سکتے ہیں کہ ان کا کوئی حساب
ہے نہ حد۔ اس کے باوجود بھی ہائے رے انسان!
انسان ایک دفعہ جس بات کے پیچھے پڑ جاتا ہے بس پڑ ہی
جاتا ہے پھر وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اہلِ علم —
(سائنس داں) بھی اپنی دھن کے پکے ہوتے ہیں وہ
اٹوٹے ہونے کے باوجود بھی اس سعی ناتمام کو جاری
رکھے ہوئے ہیں اور بڑی شد و مد کے ساتھ یہ مہم
چلا رہے ہیں۔ زندگی اور ہے بھی کیا۔ وہ بھی تو ایک
دوامی عمل ہے اور ایسی ہی کوششوں کا دوسرا نام
ہے جو مسلسل ہوتی ہیں اور جو ناقابلِ شکست ہی نہیں

علمِ نسلیات میں ترتیب دی [illegible] خلیوں کی [illegible]

جاتی ہیں۔

خلیہ میں جو مواد لحمیہ ہوتے ہیں ان کے متعلق اب یہ نظریہ کارفرما ہے کہ وہ ایک ایسا مادہ ہوتے ہیں جو کڑیوں سے مرکب ہوتا ہے۔ اسے آپ زنجیر سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ زنجیر میں کڑیاں ہوتی ہیں کڑیاں بڑھاتے چلے جائیے، زنجیر بھی لمبی ہوتی چلی جائے گی مگر اس کا تسلسل پھر بھی قائم رہے گا۔ اسی طرح موادِ لحمیہ کی بھی کڑیاں ہوتی ہیں اور قانونِ نسل کے ماہرین کا کہنا یہ ہے کہ مختلف طرح کی کڑیوں کے ملتے چلے جانے سے اور مختلف تعداد میں ان کے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے چلے جانے سے یہ سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی سلسلے کی وسعت پر اصل میں خلیہ کی سادگی یا پیچیدگی کا دارومدار ہوا کرتا ہے۔ جتنی کڑیاں کم ہوں گی اتنا خلیہ بھی سادہ ہوگا، جتنی کڑیاں زیادہ ہوں گی خلیہ بھی اسی قدر وسیع افعال ظاہر کرے گا۔ کیچوا مٹی نگل لیتا ہے اور صرف ذرا سا نباتاتی عنصر کیا کرتا ہے، انسان سب کچھ چٹ کر جاتا ہے اس کے اندر سے سونا چاندی اور نہ جانے کیا کیا بغیر کھودے ہی نکالا جا سکتا ہے۔ ان ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ ذی حیات مخلوق میں ارتقاء کے جتنے بھی مدارج دیکھنے میں آتے ہیں وہ سب کے سب اسی قانون کی پابندی کے باعث بنے ہیں اور اسی قانون پر عمل آوری سے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔ ایسا جیسا ایک خلیہ والا جسم ارتقاء کی نچلی سیڑھی پر اسی لئے نظر آتا ہے کہ اس خلیہ میں موادِ لحمیہ کے زنجیرے محدود ہے

جتنے بھی ہوتے ہیں اس کے برعکس جو ترقی یافتہ ہیں کر ارتقاء کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ کر جا بیٹھے ہیں۔ وہاں سے مجھے تو ان کا یہ مقام محض اس لئے حاصل ہوگیا ہے کہ ان کی نگہ میں سینکڑوں قسم کے زنجیروں سے مل کر بنے ہوئے سینکڑوں قسم کے سینکڑوں خلیے شریک ہوگئے ہیں اسی بات کو اختصار کے ساتھ ہم یوں بھی کہہ سکتے کہ غرض لحمیہ کی تعداد گھٹنے یا بڑھنے سے مختلف قسم کے خلیے وجود میں آئے ہیں اور مختلف خلیوں کی تعداد میں کمی و بیشی ہونے کی وجہ سے مختلف نسلوں کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ نسلوں کے مابین اختلاف اور امتیاز کا بنیادی سبب اصل میں یہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کھورانا کی دریافت کا نچوڑ بھی یہی حقیقت ہے جو اوپر بتائی گئی ہے۔ اسی پر ڈاکٹر کھورانا کو نوبل انعام بھی عطا کیا گیا ہے۔ انھوں نے ایک طرف تو پروٹینز کا تجزیہ کر کے اور ان کو تحلیل کر کے ان عنصر کو الگ الگ شناخت کیا ہے جو ان پروٹینز کی ساخت میں داخل ہوتے ہیں۔ اس طرح سے انھوں نے ان پروٹینز کا وثوق کے ساتھ تعین کر دیا جن پر خلیہ مشتمل ہوتا ہے۔ دوسری طرف کھورانا جی نے مختلف کڑیوں اور پھر ان کڑیوں سے ترتیب پا جانے والے زنجیروں کو دوبارہ مرتب کر کے یہ ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ جو کچھ دعویٰ وہ کر رہے ہیں حقیقت میں واقعہ بھی بعینہٖ ویسا ہی ہے۔ جیسا انھوں نے ایک بہت ہی سادہ قسم کے زنجیر کے اجزا علیحدہ علیحدہ

[illegible] حیدرآباد

[illegible] کی کاشت بھی کی جا سکتی ہے

[illegible] ترتیب سے پھر
ایک بار جو [illegible] جس سلسلہ [illegible] ترتیب
سے وہ سادہ خلیے کے اندر واقع ہوتے تھے سلسلہ
کرنے پر وہ تمام خصوصیات از خود پیدا ہو گئیں جو
انھی جیسے زندہ خلیے میں کہ جسم میں قدرتی طور پر
موجود تھا کرتی ہیں یوں کہیے کہ کھورانا صاحب نے اپنی
تجربہ گاہ (معمل) میں مگر زندہ جسم سے بالکل بے تعلق
کر کے نہ صرف یہ کہ ایک خلیہ گھڑ لیا بلکہ گھڑ چکنے کے
بعد جب دکھایا تو اس میں اب ــــــ جان بھی
پڑی ہوئی تھی۔ یہ آخری عمل انھوں نے نوبل انعام
پانے کے بعد کیا ہے اور اس میں تن تنہا صرف ان
کی کوششوں کو دخل نہیں ہے کیونکہ دنیا میں کئی ــ
مقامات پر یہی تجربے یعنی تجزیہ، تحلیل اور باردگر ــ
گروہ بندی (RE-GROUPING) کا کام انجام
پا رہا تھا۔ یہ کام بے حد طویل اور بڑا چکردار ہے، محض
ایک ڈاکٹر کے بس کا نہیں کیمیا دانوں کی جماعت،
حیاتیات کے ماہرین کے گروہ اور کافی فنی عملہ کے
تعاون کے بغیر اس کا صحت کے ساتھ پورا ہونا ممکن
نہیں۔ اس کام کے لئے تفصیل کے ساتھ جتنی معلومات
مہیا ہونا لازم تھا۔ ان کا بیشتر حصہ دوسری تجربہ
گاہوں (لیبارٹریز) میں تکمیل کو پہنچ چکا۔ کھورانا صاحب
نے ان کو ایک جگہ کر دیا۔ اپنی جدت طبع سے اور اپنی
کوششوں سے دریافت کئے ہوئے حقائق کا اس
میں انھوں نے اضافہ فرما لیا۔ اب پہلی جو انھوں نے
کی وہ یہ تھی کہ وہ خود وہ عمل پہلے کر گذرے جو آگے
چل کر [illegible] دریافت جانشینوں میں سے کوئی ایک
جان ڈر گذرنے والا تھا کھورانا کی دریافت پچاس فیصد
کر دوسروں کی دریافت کی مرہون منت ہے لیکن
چونکہ علمی دنیا میں یہی طریقہ کار رہا ہے کہ جو پہلا قدم
اٹھائے سہرا انھی کے سر بندھنا چاہیے چنانچہ اس
معاملے میں جیت کھورانا ہی کو ہوئی ہم بھی انھی کو شکریہ
زندہ باد کہتے ہیں!

آئیے اس نئی دریافت کو سامنے رکھ کر ایک بار پھر،
پہلے کی بہ نسبت ذرا اور زیادہ یقین کے ساتھ یہ سمجھ لیں
کہ اس کی رو سے جنس اور نسل کیوں کر متعین کی جاتی
ہے۔ ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ آسان ہے بلکہ اس کی توضیح
میں تو بہت ہی بہت آسان اور نہایت درجہ سہل
ہے۔ ایک دفعہ جب یہ تصفیہ ہو گیا کہ مواد حیات یعنی
حموض لحمیہ (امینو ایسڈز) اور حموض نواتی (نیوکلک
پروٹینز) یعنی کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن
کے سالمات کے بنے ہوئے مرکبات مختلف ترکیبوں
اور مختلف مرحلوں پر ترتیب دینے سے نہ صرف یہ کہ [illegible]
ذی حیات کائنات کی تخلیق ہو سکتی ہے ــــ اور
ذی حیات کائنات کی صرف اس قدر ہے کہ وہ
ایک کے عدد سے لے کر اربوں طرح کے خلیوں
کے کروڑوں طور پر اکٹھا ہو جانے سے ظہور میں آتی
ہے ــــ تو اس مفروضہ سے کون انکار کرے گا
کہ ایک خلیہ میں جو مادے موجود ہوتے ہیں تو ان
مادوں میں اگر وہ رد و بدل کر دیا جائے جو لازمی
ہے (مذکر) تو وہ خلیہ ان خلیوں ہی کو جنم دے گا جن

والی خصوصیات رکھنے والے ...

[illegible] خصوصیات پیدا ہوں گی اور اگر خلیہ کے [illegible] ... ہو کر دینے سے خلیہ کا کل خصوصیات کچھ مخصوص ترکیب (COMBINATION) کی جانب راغب ہوجائے جو اس خلیہ کی کیمسٹری اور اس کے اجزاء سے ملتی جلتی ہوتی ہیں جو کہ خصوصیات رکھنے والے خلیہ کے اندر پوشیدہ ہوتی ہیں تو پناہ بخدا! نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ بیٹوں سے مایوس ہوجانا پڑے گا۔ ایسی خصوصیات رکھنے والا خلیہ نصیب میں بیٹیاں ہی بیٹیوں کو لکھوا کر لے آئے گا!

مذکورہ بالا قانون کا اطلاق جب ہم نسل پر کرتے ہیں تب بھی ہمیں وہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے جو جنس کے سلسلہ میں اطلاق کرنے پر ہم اوپر حاصل کر چکے ہیں۔ ہندوستانی، چینی، آریائی، حبشی، دراوڑی، میکسیکی اور یہ جو مختلف انواع و اقسام کی رنگ برنگی نسلیں ہیں جن سے ہمارا یہ کرۂ یعنی کرۂ ارض باغ و بہار دکھائی دیتا ہے۔ ان کے مختلف اور گوناگوں اور انواع و اقسام ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے خلیوں کی بناوٹ میں جو موادِ لحمیہ داخل ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے ذرا ذرا سے مختلف ہوتے چلے گئے ہیں، درختوں میں سینکڑوں طرح کے درخت اسی وجہ سے ہیں۔ سمندر میں لاکھوں قسم کی مچھلیاں، مگرمچھ اور دریائی گھوڑے وہ بھی اسی وجہ سے ہیں، جنگلوں میں ہرن، شیر، تیندوے اور بندر جو کودتے پھاندتے اور بھاگتے دوڑتے دکھائی پڑتے ہیں یہاں تک کہ بعض غیر معروف گھونگھے اور پتھروں پر چپکی

[illegible] ... [illegible] مختلف رنگ [illegible] ... خصوصیات (مثلاً پلازم) نے اپنا توازن اور اپنا تناسب اور ان کیمیاوی آمیزوں کی نسبت سے بدل لیا ہے جس نسبت اور فرق کے ساتھ وہ سب ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں۔

میرے ایک استاد نے اس ضمن میں مجھ سے ایک بڑے مزہ کی بات کہی۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسے ہم مختلف قسم کی گھڑیوں کو ان کے کل پرزے نوچ نوچ کر ایک جگہ ڈھیر کر دیں۔ اس ڈھیر میں سے اگر کوئی شخص کسی گھڑی کے صحیح کل پرزے چن دے سکے اور ان کو ٹھیک ٹھیک ان کی صحیح جگہ پر پھر سے بٹھا دے سکے تو گھڑی فوراً ٹک ٹک کرنا شروع کر دے گی لیکن اگر اُس گھڑی کا ایک معمولی سا پیچ (اسکرو) بھی غلط بیٹھ گیا یا اس کی جگہ پر اس سے ملتا جلتا اسکرو زبردستی ٹھونس ٹھانس کر بٹھا لیا جائے تو گھڑی اول تو چلے گی ہی نہیں اور اگر چل بھی دے تو غلط وقت بتانے لگے گی۔ ذی حیات جسم کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے لیکن استادِ محترم نے جو تشبیہ تلاش کی میری رائے میں وہ صحت سے زیادہ بیماری کی حقیقت اور ماہیت سمجھانے کے لئے موزوں ہے۔ سرطان اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔ خلیہ کا مادۂ حیات کیمیاوی محرکات کا اثر قبول کر کے احساسِ برتری میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایسے خلیوں کو بنانے لگتا

[illegible]

[illegible]
معروف ہیں کہ اعتدال سے خود بھی ہٹے ہوئے ہوتے
ہیں بلکہ دوسرے خلیوں کو بھی مجبور کرنا شروع
کر دیتے ہیں کہ وہ بھی اعتدال سے ہٹ جائیں۔
سرطان کے خلیے دو سے چار اور چار سے آٹھ
ہو کر فوراً دو رخی لگنا شروع کر دیتے ہیں، جہاں
جی میں آیا وہیں پڑاؤ ڈال دیتے ہیں اور اس کے بعد
اندھا دھند ایسی توڑ پھوڑ اور ہڑپ جھڑپ
کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ ان کی یلغار
سے بس خدا ہی بچائے تو بچائے، انسان تو ابھی
تک اس پر قادر نہیں ہوا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی گھڑی کی اور گھڑی کر
رہی تھی ٹک ٹک۔ مجھے کچھ تفریح کی سوجھی میں
نے عرض کیا کہ استاد محترم میں ٹھہرا شاگرد کچھ سمجھ
گیا، کچھ نہیں سمجھا۔ بہت سی باتیں مان بھی گیا
ہوں اب اتنا اور سمجھا دیجئے کہ ـــــ گھڑی کو کنجی
کون دیتا ہے؟

استاد کی گھڑی بند ہو گئی!

استاد تو خیر تھے استاد ہی، ان کی گھڑی اگر بند ہو گئی
تو کچھ زیادہ تعجب کی بات بھی نہیں البتہ اگر آپ کا کہنا
یہ ہے کہ قانونِ نسل کے ماہر اور اس کی شرح کرنے
والے اساتذہ وہ بھی آپ کے سوال پر مہر بہ لب
ہو جائیں گے اور آپ کا منہ تکنے لگیں گے تو آپ کا
اندازہ بے جا نہیں ہے۔ اُن کے پاس اس سوال کا
اور اس جیسے دوسرے سوالات کا جواب موجود ہے

[illegible] اس سلسلے استفسارات کے جواب دے
ہیں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ نوزاتی لچھوں کے زنجیرے
صرف زنجیرے نہیں ہوتے۔ یوں کہئے کہ ان کی
حیثیت ایک فیتہ کی سی ہوتی ہے جو لمبا ہوتا ہے
اور جو پٹا ہوا ہوتا ہے اور نوزاتی لچھوں سے مل کر
بنتا ہے۔ لچھے قطار در قطار اور شانہ بہ شانہ
ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔ لچھوں کی تعداد
جتنی زیادہ ہوگی ـــــ اسی لحاظ
سے فیتہ لمبا ہوگا۔ لچھوں کے مختلف گروہ جس
قدر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہوں گے
فیتہ اتنا ہی چوڑا بھی ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر دو
جڑ شخوں کے مابین ایک ایک خالی حصہ بھی ہوتا
ہے جو کیمیاوی تعامل کے نقطۂ نظر سے نہ مثبت ہوتا
ہے نہ منفی لیکن یہ خالی حصہ جسے وقفہ کہنا زیادہ
درست ہوگا کہیں زیادہ ہوتا ہے کہیں کم۔ اب
چونکہ یہ تمام مجموعہ ایک سالماتی عمل ہوتا ہے اس
لئے اپنی توانائی خود پیدا کرتا رہتا ہے اور [illegible]
اس کی اپنی ذات کے لئے اور سارے تعاملات
(RE-ACTIONS) کے لئے اس کو کمک ہوتی
ہے۔ زندگی کا حقیقی سرچشمہ یہی توانائی ہوتی ہے
سالمات کو ضرب در ضرب کر لیجئے، توانائی کی کل
مقدار معلوم ہو جائیگی، خلیوں کو جمع در جمع کر لیجئے
چھوٹے چھوٹے کاموں سے مل کر بنا ہوا جو بڑا
کام جو ایک بڑے ذی حیات کا فعل کہلاتا ہے
اس کا پورا پورا اندازہ آپ کو ہو جائے گا۔

پیکر حیدرآباد ۸۹

[illegible]

یہاں تک جو جواب ہمیں ملا تھا وہ اس سوال کا
جواب تھا کہ "کون" اس مشین کو چلاتا ہے
جسے زندہ جسم کہتے ہیں۔ قانونِ نسل کے محقق اس
پہیلی کو بھی بڑی حد تک بوجھ لینے کے دعویدار ہو گئے
ہیں کہ یہ مشین "کیسے" چلتی ہے۔ اُن کا قول ہے
کہ خلیوں کو والوز کہئے اور خلیوں سے مل کر بنے
ہوئے جسم کو آپ ٹرانسسٹر سے تشبیہ دے
لیجئے۔ انسانی ٹرانسسٹر میں جو والوز (ٹیوب)
ہوتے ہیں وہ دھات اور کانچ کے بنے ہوئے
نہیں ہوتے۔ لحمیہ نواتی اور ان کی زنجیروں سے
مل کر بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ خلیہ میں کئی کئی زنجیریں
ہوتے ہیں جن کی تشریح کئی بار دُہرادی گئی ہے
یہ زنجیرے حقیقت میں سالماتی زبان کی تحریر
ہوتے ہیں جو حرفوں کی بجائے نشانات کے اشاروں
میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ اشاروں کا پردہ اگر دور
کردیا جائے تو ان زنجیروں پر جو لمبائی چوڑائی اور
فاصلے سے لحمیہ نواتی چسپاں ہوتے ہیں وہ حروف
کہلائیں گے، اُن کے آپس میں ملنے سے لفظ بن جائیں گے
اور پھر اسی طرح لفظوں کو باہم ملاتے چلے جائیں تو
فقرے اور عبارت وجود میں آتی چلی جائے گی۔
اس طرح سے نیوکلیو پروٹین کا لپٹا ہوا فیتہ ایک
طرح سے اشاروں کی زبان میں لکھے ہوئے احکام
کا گویا ایک پروانہ ہوتا ہے۔ کاتبِ قدرت نے
جو حکم اس ورق پر چھاپ دیا ہے خلیہ کے لئے
اس سے انحراف کرنے کی بال برابر نہ تو گنجائش

[illegible]
نیز غرض [illegible]
تمام زندگی وہی حکم بجالایا کرتا ہے جو ابتدائے آفرینش
نے اُس کے لئے انتخاب کردیا تھا اور جسے پہلے پہل
کی شکل میں کندہ کرکے تولید کے وقت ہی اس کی
امانت میں دے دیا تھا۔

خلیہ کے عمل کا خلاصہ وہی ہے جو ابھی ہم نے بتایا۔
خلیہ اسی لئے تخلیق کیا جاتا ہے۔ اب آپ صرف تھوڑی
زحمت کیجئے، بہت سے نتیجے لے لیجئے اُن کو اکٹھا
کرلیجئے اور اُن کے افعال کو بھی آپس میں ملا لیجئے۔
ہمیں یقین ہے کہ قانونِ نسل کا کوئی نکتہ آپ کو ایسا
نہ ملے گا جس کو بہ آسانی سمجھ جانے میں آپ کو کسی
دشواری کا سامنا کرنا پڑے! ●●

ادب نامہ

• مرتب : یوسف ندیم
• قیمت : دو روپے
• ناشر : سروج پبلیکیشنز
۵۳۔ سروج نگر حیدرآباد۔ ۴۵

"ریختہ سے بنگلہ دیش" حیدرآباد کے نوجوان صحافی یوسف ندیم کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس میں بنگلہ دیش کے موضوع پر ملک کے مختلف نامور شاعروں کی تخلیقات کو یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ ملک کے بعض گوشوں سے یہ اعتراض کیا جا رہا تھا کہ بنگلہ دیش کے مسئلہ پر مسلم اقلیت اور پریس خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

یوسف ندیم نے اس کتاب کو مرتب کر کے ان شبہات کا منہ توڑ جواب دیا ہے۔ ۱۳۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۷۶ شعراء کے کلام کے علاوہ مختلف مشاہیر کے پیامات اور تاثرات شامل ہیں۔ بعض ایسے غیر اہم اصحاب کے پیامات بھی شریک کئے گئے ہیں جن کی شمولیت نے یقیناً اس کتاب کے موضوع اور وقار کو دھکا پہنچایا ہے۔ تخلیقات بھی نمائندہ ہیں لیکن بعض تخلیقات موضوع سے ہٹی ہوئی ہیں۔ پتہ نہیں مرتب نے انھیں کیوں شامل کر لیا۔ جہاں تک کتاب کی ترتیب و تدوین کا تعلق ہے، مرتب نے اس میں سنجیدگی کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ کتابت و طباعت میں بھی احتیاط نہیں برتی گئی ہے۔ اس کے باوجود کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دو ماہی 'غنچہ' (بچوں کا رسالہ)

مدیر : خورشید شیدائی
قیمت : ۴۰ پیسے
پتہ : ۱۶۔ چاندنی چوک اسٹریٹ
کلکتہ۔ ۱۶

بچوں کے ادب پر سنجیدگی سے بہت کم توجہ کی گئی ہے کرشن چندر کے بچوں کے ناولوں سے قطع نظر۔۔۔ شفیع الدین نیر، سراج انور، سیف سیوہاروی اور حامد اللہ افسر وغیرہ نے بچوں کی ذہنی پرداخت کو مد نظر رکھتے ہوئے نثر و شعر کا قابلِ لحاظ سرمایہ ہمیں دیا ہے۔ بچوں کے لئے نکلنے والے رسالوں میں کھلونا (دہلی) پیام تعلیم (جامعہ ملیہ۔ دہلی) پھلواری (دہلی) کلیاں (لکھنو) اور نور (رام پور) کو اہم مقام حاصل ہے۔ زیرِ نظر رسالہ غنچہ بھی کلکتہ سے بچوں کے لئے نکلتا ہے اور بچوں کی لکھی ہوئی تخلیقات کو نمایاں طور پر شائع کرتا ہے۔ یقیناً یہ کوشش لائق ستائش ہے۔ بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذہنی مقابلہ اور معلوماتی مقابلہ جیسے مستقل فیچر بھی رکھے گئے ہیں تاکہ اُن کی ذہنی نشو و نما ہو سکے۔ بہر حال بچوں کا ایک اچھا ماہوار رسالہ نکالنے پر ادارہ قابلِ مبارکباد ہے۔

اہل وفا (مضامین)

● احسن علی مرزا ● ایک روپیہ

● ناشر: نیا آدم پبلیکیشنز

کشن منڈی حیدرآباد

حیدرآباد کے مشہور صحافی احسن علی مرزا کی یہ کتاب ان کے اپنے پانچ طبع زاد مضامین پر مشتمل ہے جن کا موضوع "ہندو روس دوستی" ہے۔ ان میں سے ایک مضمون "روسی بڑی خالہ سے ہندوستانی بڑی خالہ تک" پیکر میں بھی چھپ چکا ہے۔ مرزا صاحب اپنے واضح ترقی پسند نظریات کے ساتھ ایک سلجھے ہوئے انشاپرداز ہیں۔ ناشر نے انھیں "راسخ العقیدہ سوشلسٹ" لکھا ہے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ان مضامین میں موضوع کی سماجی افادیت سے قطع نظر مرزا صاحب کا طنزیہ و تیکھا انداز بیان ان کی تحریر کو دلچسپ و دلکش بنا دیتا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مرزا صاحب کا تعارف کراتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے کہ مرزا نے سویت یونین کو کتابوں اور رسالوں سے بڑھ کر خوابوں میں دیکھا ہے اور خواب یوں بھی اندیشوں اور ارمانوں ہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ کتابت اور طباعت گوارا ہے۔ اور سرِورق سیدھا سادہ۔ قیمت ایک روپیہ مناسب ہے۔

اگر یہ کتاب اچھے پیمانے پر شائع کی جاتی تو زیادہ قابلِ قدر ثابت ہوتی۔

چند مشاہیر (مضامین)

● عبدالاحد اعظم آبادی ● دو روپے

● ملنے کا پتہ: اعجاز ہوٹل

اُردو بازار۔ گورکھپور

عبدالاحد اعظم آبادی گورکھپور کے ایک بزرگ ادیب ہیں اور انھوں نے زیر نظر کتاب میں ملکی و بیرونی ملک کی انیس ۱۹ سرکردہ شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات کو مضامین کی شکل میں پیش کیا ہے گو کہ احد صاحب نے "عرضِ حال" کے تحت دیباچے میں اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اُن کی ابتدائی کاوشوں کا نتیجہ ہے تاہم مضامین پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا علم محدود نہیں اور انھیں ادب کے علاوہ سیاسی و سائنسی علوم سے بھی گہرا شغف رہا ہے۔ ان کی تحریر سلیس اور موثر ہے اور شخصیتوں پر ان کے تاثرات اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ جہاں یہ مضامین مختلف شعبۂ حیات کے سرکردہ شخصیتوں کا احاطہ کرتے ہیں وہیں دلچسپ معلومات بھی فراہم کرتے ہیں لکھائی چھپائی ٹھیک ہے ●●

"بے وقوف جوہر" کو فلم انڈسٹری سے نکال باہر کرو!

جہاں کسی فلم میں سیاسی موضوع کو جگہ دی جائے وہاں فلم ساز پر بڑی گراں بار ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ یہ فلمیں تاریخ کو جواب دہ ہونے کے ساتھ ساتھ موجودہ اور آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ مگر ہندوستانی فلم ساز ہمیشہ سے سیاسی موضوعات پر گھٹیا اور گھٹیا فلمیں بناتے رہے ہیں۔ اس طرح کی فلموں کی ایک تازہ مثال آئی۔ ایس۔ جوہر کی فلم "جوائے بنگلہ دیش" ہے جس میں جوہر نے ایک سنگین قومی مسئلہ کو ایک بگڑی اور گندی فلم میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس فلم میں جنسی لذت اندوزی کا سامان ملتا ہے اور یہ فلم بنگلہ دیش پناہ گزینوں کے مسئلہ کی آڑ میں انتہائی بھونڈے اور چھچھورے انداز کی "جوہر چھاپ فلم" ہے جس سے ہماری قومی اقدار کی سخت توہین ہوتی ہے۔ یہ فلم یقیناً غیر ملکوں میں دکھائی جائے گی تب ہندوستان جو بنگلہ دیش کا سب سے بڑا حامی ہے، کیا منہ دکھائے گا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے فلم ساز جو پیسے کمانے کے لئے اپنی اولاد کو بھی پردے پر ننگا کر سکتے ہیں، کیوں فلم انڈسٹری میں موجود ہیں جبکہ روپیہ کمانے کے لئے وہ قحبہ خانے بھی چلا سکتے ہیں۔

حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسے فلم سازوں کو جو عوام کے شعور کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، فلم انڈسٹری سے نکال باہر کرے اور سنسر بورڈ سے اس سلسلہ میں جواب طلب کرے اور اس کے ممبروں پر سخت احتساب کرے کیونکہ یہ وہی بورڈ ہے جو مارک رابسن کی گاندھی جی پر بننے والی فلم ——— 'NINE HOURS TO RAMA' پر تو ممنوع کرتا ہے لیکن ہمارے ملک کے کئی مارک رابسنوں کی فلموں کو خوشی خوشی "عام نمائش" کا سرٹیفکیٹ عطا کرتا ہے۔

ستیہ جیت رے: نرالی منطق

ستیہ جیت رے نے ایک مضمون میں (اپنی فلموں کو چھوڑ کر) ہندوستان میں بننے والی نئے ڈھنگ کی آرٹ فلموں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انھوں نے دستک، آنند، چیتنا، گڈی اور بدنام بستی جیسی فلموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صرف محدود بجٹ سے بڑے اسٹار اور فلمی گانوں کے بغیر فلمیں بنائی جائیں تو کیا ایسی فلمیں محض اس لئے آرٹ فلمیں کہلائیں گی کہ وہ ایک اچھوتا موضوع رکھتی ہیں۔ ستیہ جیت کی یہ نرالی منطق قابلِ مذمت ہے۔ کیونکہ آج کمرشیل فلموں کی جھوٹی چمک دمک میں کچھ باہمت فلم ساز اچھوتے موضوعات پر آرٹ فلمیں بنانے کی جرأت کر کے عوام کے ذوق کو بلند کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک نیک فال ہے۔

راجیش کھنہ کا احساسِ کمتری

نئی اداکارہ ریحانہ سلطان آج کل جہاں جاتی ہیں انہیں دیکھنے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض اسٹوڈیوز میں جہاں راجیش کھنہ کی فلموں کی بھی شوٹنگ تھی ریحانہ سلطان کو کام کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے اس قدر ہجوم ہو گیا راجیش کھنہ کو احساسِ کمتری ہونے لگا۔ حال ہی میں ریحانہ سلطان کی تازہ فلم "پریم ہے" مکمل کر لی گئی ہے۔ تپن سنہا کی اس فلم میں ریحانہ سلطان ایک نئے بنگالی اداکار مرنال مکرجی کے مقابل پیش ہو رہی ہے۔ ساتھ میں منموہن کرشن، آشا نڈکرنی اور جانی واکر ہیں۔ موسیقی برج بھوشن کی گیت نقش لائل پوری کے ہیں۔

چٹکلیاں

● حیدرآباد کی ایک باصلاحیت گلوکارہ ونی جیارام آج کل کئی فلموں میں پلے بیک دے رہی ہیں۔ ونی جیارام کے گانے رشی کیش مکرجی کی فلم "گڈی" میں کافی پسند کئے گئے ہیں۔ پتہ چلا ہے کہ موسیقار نوشاد نے بھی ونی جیارام کی آواز کو "پاکیزہ" کی پس منظر موسیقی میں استعمال کیا ہے۔

● "بھون شوم" کے شہرت یافتہ ہدایت کار مرنال سین کی تازہ ہندی فلم "انٹرویو" کو نیدرلینڈ کے انٹرنیشنل فلم فیسٹول کے لئے ہندوستان کی حکومت کی طرف سے بھیجا جا رہا ہے۔ اس فلم میں سبھی نئے اداکار ہیں۔

● پتہ چلا ہے فلم "تم سا نہیں دیکھا" کی ہیروئن امیتا نے پچھلے دنوں مار دھاڑ فلموں کے ہیرو کامران سے شادی کر لی ہے۔ یہ کامران کی تیسری شادی ہے۔

● گوند سریا کی پچھلی فلم "سرسوتی چندر" سنجیدہ حلقوں میں کافی پسند کی گئی تھی۔ اب فلم "انگارے" بنا رہے ہیں۔ مرکزی کردار سنجیو کمار اور راکھی ادا کر رہے ہیں۔ موسیقی چترگپت کی ہے۔

● ایس۔ مکرجی کے بیٹے شومو مکرجی کی فلم "ایک بار مسکرادو" جنوری ۷۲ء میں ریلیز کی جا رہی ہے۔

جیا اور امیتابھ کا رومان

بعض فلمی دنیا کے لیے اداکار امیتابھ بچن اور فلمی دنیا کی گڈی جیا بھادری فلمی پردے پر ایک ساتھ آنے کے علاوہ ایک دوسرے کے بھی کافی قریب آ چکے ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ رندھیر کپور اور ببیتا کی شادی کے موقع پر یہ دونوں کسی شادی شدہ جوڑے کی طرح ایک دوسرے سے پیش آ رہے تھے۔ امیتابھ بچن کا کہنا ہے کہ جیا بھادری ایک بے حد اچھی اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ جیا بھادری بھی امیتابھ بچن کی صلاحیتوں اور ذہانت کی معترف ہے۔ دونوں کی باہمی پسندیدگی انہیں قریب لے آئی ہے

● پچھلے دنوں راہول دیو برمن نے سپی فلمز کی "سیتا اور گیتا" کے لئے لتا منگیشکر کی آواز میں ایک گیت ریکارڈ کروایا جسے آنند بخشی نے لکھا ہے۔ فلم میں ہیما مالنی کے ساتھ دھرمیندر اور سنجیو کمار کام کر رہے ہیں۔

● ۲۴ نومبر کو بمبئی کے عالی شان برابورن اسٹیڈیم میں فلمی دنیا کی بنگلہ دیش امدادی کمیٹی کی جانب سے کیریکٹر ایکٹر پران نے ایک شاندار تفریحی پروگرام پیش کیا جس کے ذریعہ بنگلہ دیش کے پناہ گزینوں کی امداد کے لئے ۵ لاکھ روپے اکٹھے کئے گئے۔

● بی۔ آر۔ اشارہ کی ہدایت میں بننے والی فلم "ضرورت" حال ہی میں مکمل ہو گئی۔ اس میں وجے اروڑہ، رینا رائے اور منموہن کرشن کام کر رہے ہیں۔ موسیقی برج بھوشن کی ہے اور فوٹوگرافی فلم انسٹی ٹیوٹ کے سدرشن ناگ کی ہے جس نے فلم "چیتنا" میں بھی فوٹوگرافی دی تھی۔

● راج کھوسلہ اپنی آئندہ فلم "راستے کا پتھر" کے لئے امیتابھ بچن کے ساتھ ایک نئی اداکارہ نیتا کھینی کو پیش کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ شتروگھن سنہا، کشتی چھایا، امیت سین اور پریم چوپڑہ کام کریں گے۔

فلمی نشریات اور دھاندلیاں

نومبر کے پیکر میں فلمی موسیقی کی اجارہ داری پر ٹائمز دہلی کی ایک رپورٹ کا ترجمہ شائع کیا گیا تھا جس میں وودھ بھارتی اور ریڈیو سیلون کی فلمی گانوں کی نشریات پر بدعنوانیوں کے الزامات لگائے گئے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نے ان الزامات کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات کا فیصلہ کیا ہے۔ "فلم ورلڈ" کے مطابق آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر ڈی۔ این۔ ڈکنٹ کا تبادلہ کر دیا گیا ہے۔ وزارت اطلاعات و نشریات ـــــ آل انڈیا ریڈیو سے فلمی موسیقی کی نشریات میں معیار برقرار رکھنے کے حق میں ہے۔ اس کے حکام کا کہنا ہے وہ کسی بھی قسم کی بدعنوانی کو برداشت نہیں کریں گے۔ اس سے پہلے میوزک ڈائرکٹرز اسوسی ایشن نے بھی حکومت سے ایسی ہی شکایت کی تھی۔

۱۹۷۱ء ممتاز کے لیے مایوس کن

۱۹۷۱ء جہاں ریحانہ سلطان اور جیا بھادری کے لئے ایک مبارک سال ثابت ہوا ہے وہیں تیزی سے ابھرنے والی اداکارہ ممتاز کے لئے مایوس کن ثابت ہوا ہے حالانکہ ۱۹۷۰ء میں ممتاز کی کئی فلموں (سچا جھوٹا، بندھن، دو راستے) نے سلور جوبلی منائی تھی۔ لیکن اس سال ممتاز کی گنتی کی چند فلمیں بھی سوائے ــ پریم جی کی "دشمن" کے کامیابی کی کم ہی گنجائش رکھتی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ممتاز نے وجے آنند کی فلم "تیرے میرے سپنے" سے بہت سی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ لیکن اس فلم میں ممتاز کی بجائے ہیما مالنی کو کام کا زیادہ موقع دیا گیا۔ حالانکہ ممتاز نے اس فلم میں بڑی بھرپور اور کامیاب اداکاری کی تھی۔ اس بناء پر اُس کا خیال تھا کہ وجے آنند اُسے اپنی دوسری فلموں میں ہیروئین کا رول دے گا لیکن وجے آنند نے اپنی ایک فلم میں ہیما مالنی کو اور دوسری میں شرمیلا ٹیگور کو لینے کا فیصلہ کیا ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب پروڈیوسر راجیش کھنہ اور جیتندر کے مقابل ہیروئین کے رول کے لئے ممتاز کے بجائے اس سے نسبتاً کم عمر اداکاراؤں جیسے ریکھا یا راکھی وغیرہ کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ دیوآنند کی "ہرے رام ہرے کرشنا" میں بھی جس میں ممتاز ہیروئین ہے۔ دیوآنند نے ممتاز کی بجائے زینت امان پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اس طرح زاہدہ کے بعد ممتاز بھی جلد ہی دیوآنند کے دل سے اتر گئی ہے۔ یہ بات ممتاز کے لئے لمحۂ فکر ہے۔

سفید جھوٹ

● خواجہ احمد عباس نے جو اپنی عمر کے ۵۰ برس فلمی دنیا میں گذار چکے ہیں، اپنی ایک رپورٹ میں شنکر جے کشن کو فلمی دنیا کی پہلی موسیقار جوڑی قرار دیا ہے۔ حالانکہ عباس صاحب خوب جانتے ہیں کہ فلمی دنیا کی پہلی موسیقار جوڑی حسن لال بھگت رام کی ہے جنھوں نے بڑی بہن، افسانہ، اجے، عدل جہانگیر وغیرہ جیسی فلموں میں ہٹ گانے دیئے ہیں۔ لیکن اگر وہ اس حقیقت کا انکشاف کردیں تو اُن کے چہیتے شنکر جے کشن کی پبلسٹی کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہ سفید جھوٹ بھی خوب ہے

● پچھلے دنوں آل انڈیا ریڈیو اردو سروس کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے مہندر کپور نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ان کی پہلی فلم "نورنگ" ہے۔ حالانکہ نوشاد نے پہلی مرتبہ فلم "سوہنی مہیوال" میں انھیں گانے کا موقع دیا تھا اور اُس سے اچھا گانا وہ آج تک نہیں گا سکے۔ مہندر کپور کا یہ سفید جھوٹ اُن کی احسان فراموشی کو ظاہر کرتا ہے

● جائے مکرجی نے پچھلے دنوں اپنی شادی اور اپنے لڑکے کی پہلی سالگرہ منانے کی خوشی میں پارٹی دی۔ جائے مکرجی کی بیوی نیلم ایک طلاق شدہ عورت ہے جس کی ایک تین سالہ بچی بھی ہے۔ جائے مکرجی اور نیلم کا رومان بعد میں جائے مکرجی کی صورت میں خود ایس۔ مکرجی قطعی اس شادی کے حق میں نہیں تھے۔

نگاہ

گڈی

اے۔ آر صدیقی

رشی کیش مکرجی کی تازہ فلم "گڈی" حقیقتاً ایک ہدایت کار کی فلم ہے۔ گو "گڈی" کی کہانی کا مرکزی خیال ہندوستانی فلموں کے لئے نیا اور انوکھا ہے لیکن اس خیال کو پردے پر پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"گڈی" دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رشی کیش مکرجی کسی بھی خیال کو بڑی خوبی سے سلولائیڈ میں ڈھال سکتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ رشی کیش مکرجی ہندوستانی فلموں میں ایک ہی ہیں۔

"گڈی" کی کہانی ایک ایسی لڑکی کے اطراف گھومتی ہے جو فلموں کی بڑی شائق ہے اور خاص طور پر دھرمیندر کی فلمیں اور دھرمیندر اس کی کمزوری ہیں۔ اداکار دھرمیندر کے فلمی روپ سے وہ اتنا پیار کرتی ہے کہ اپنے لئے پسند کئے ہوئے ایک لڑکے سے جسے وہ خود بھی ناپسند نہیں کرتی ہے، شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ آخرکار اس کے ماما (اتپل دت) کو اداکار دھرمیندر کے ساتھ مل کر ایک ناٹک کھیلنا پڑتا ہے جس کے دوران "گڈی" کو فلمی دنیا کے کھوکھلے پن کا اندازہ ہوجاتا ہے اور وہ چمک دمک کے پیچھے چھپی ہوئی سطحیت اور تصنع کو دیکھنے میں کامیاب ہوجاتی ہے اور اس طرح زندگی کے حقائق کو تسلیم کر لینے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ اس کہانی میں رشی کیش مکرجی نے طرح طرح کے رنگ بھرے ہیں کہیں تو بڑے حقیقت آمیز شاٹ ہیں کہیں مزاح کی لطیف چاشنی ہے اور کہیں طنز کے بڑے تیکھے تیر ہیں لیکن کہیں بھی ان کی گرفت کہانی پر سے ہٹتی نہیں ہے۔ اس کام میں گلزار نے ان کی بڑی مدد کی ہے۔ گلزار کا دلچسپ منظرنامہ اور خوبصورت لیکن برجستہ مکالمے پھر ایک بار انھیں فلم انڈسٹری کا ایک اعلیٰ پایہ کا مصنف ثابت کرتے ہیں۔ مکالموں کی برجستگی بعض معمولی مناظر کو بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ "گڈی" کے مرکزی رول میں نئی اداکارہ جیا بھادری نے غضب کی اداکاری کی ہے۔ ایک نوخیز لڑکی سے لے کر ایک سمجھدار اور بالغ نظر لڑکی تک سارے مراحل طے کرنے میں اس کی جذبات نگاری نے فن کا کمال پیش کیا ہے۔ دھرمیندر نے بہ حیثیت دھرمیندر اداکاری کی ہے اور واقعی "اداکاری" کی ہے۔ نیا اداکار سومیت خوبصورت شخصیت کا مالک ہے اور اُسکی اداکاری بھی بھلی ہوئی ہے۔ اتپل دت کی زندہ دل شخصیت بھی فلم کی جان ہے۔ سُمیتا سانیال اور اے۔ کے۔ ہنگل بھی خوب ہیں۔ وسنت ڈیسائی کی دھنیں پیاری ہیں اور انھیں نئی گلوکارہ وانی جیرام نے خوب گایا ہے۔

مجموعی طور پر "گڈی" ایک بڑی خوبصورت اور بامقصد فلم ہے

پیکر حیدرآباد ۷۱ ۹

فلم نگر کی سماجی پیشکش

(ایسٹ مین کلر)

تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے

فلم ساز و ہدایت کار: سوہن لال کنور

موسیقی: شنکر جے کشن

منوج کمار - پران - پریم چوپڑہ - پریم ناتھ - ناظمہ اور دوسرے

کہانی :- سچن بھومک
عکاسی :- کے۔ ایچ۔ کپاڈیہ
گیت :- ورما ملک
آرٹ :- کے۔ بابو بھائی
منظر نامہ :- رام کیلکر
مکالمے :- وید راہی
تدوین :- نند کمار

SARGAM CHITRA PRESENTS

THEIR PRESTIGE PICTURE

SAMPOORNA DEVI DARSHAN

(IN ORWO COLOUR)

A FILM SAGA THAT WILL TOUCH THE DEPTH OF YOUR SOULS

Producer
S. J. RAJDEV

Director
SHANTILAL SONI

Music: **S. N. TRIPATHI**

Starring:

AASHISH KUMAR, SUSHMA, PADMA RANI, SHABANA AND OTHERS

SARGAM CHITRA
EVER GREEN BUILDING, NAAZ COMPOUND,
BOMBAY-4

R. N. Regd. No. [illegible]/61 "PAIKER" Postal Regd. No. H.
AN URDU MONTHLY MAGAZINE
Editor: AZAM RAHI
3-6-214, Himayatnagar, Hyderabad-29 A. P.

Cover printed at Vistas Printers, Hyd-

"PAIKER"

South India's Largest Circulated Urdu Monthly

March 1972

Re. 1/-

ایک مکمل ماہنامہ

گیارہواں سال • تیسرا شمارہ

پیکر

مارچ ۱۹۷۲ء

مدیر:
اعظم راہی

سرورق
اور
عنوانات:
غوث محمد

کتابت:
محمد غالب

قیمت:
ایک روپیہ
سالانہ:
بارہ روپے

صدر دفتر ۲۱۴-۶-۳ حمایت نگر حیدر آباد — ۲۹
دیگر دفاتر: ۲۱۸ تیسرا مالا اردن چمبر تاردیو۔ بمبئی ۳۴
۶۵ - بی دوسرا بلاک راجہ جی نگر بنگلور، ۱۰

'پیکر' میں شائع ہونے والے افسانوں، خاکوں وغیرہ میں نام، مقام، کردار
اور واقعات فرضی ہیں اور ان سے کسی
بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے
'پیکر' میں شائع ہونے والی
تمام تخلیقات غیر مطبوعہ ہیں، ان کے نقل کی صورت میں حوالہ دینا ضروری ہے

اعظم راہی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے
پرنٹو پریس کے لیے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر
۲۱۴-۶-۳ حمایت نگر حیدر آباد۔ ۲۹ سے شائع کیا

اس شمارے میں

بدیع حسینی۔ حیدرآباد

کئی ماہ گذرے ایک نظم آپ کے موقر
پرچے 'پیکر' کے لیے روانہ ضرور کی تھی۔ لیکن تازہ
شمارے میں ایک انتہائی بے سروپا اور لغو
نظم گیانی، اگیانی "میرے نام سے شائع
ہوئی ہے جس کو دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ ممکن
ہے سہواً اس نظم کے ساتھ میرا نام لکھ دیا
گیا ہے۔ بہرحال چونکہ اس نظم سے میرا کوئی
تعلق نہیں ہے۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ
آئندہ شمارے میں تصحیح کردی جائے گی۔

● آپ کی مرسلہ نظم "تصادم" کو اصلاح
شدہ شکل میں "گیانی اگیانی" کے عنوان سے
شائع کیا گیا تھا۔ جسے آپ نے ایک انتہائی
بے سروپا اور لغو نظم قرار دیا ہے۔ آپ کا یہ
اعلان انتہائی تعجب خیز ہے کہ اس نظم سے
آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ یہاں ہم آپ کی مرسلہ
نظم جوں کی توں شائع کر رہے ہیں اور اس کے
نیچے اصلاح شدہ نظم بھی شائع کی جارہی ہے
قارئین اور آپ دونوں [illegible]
ہیں کہ آپ کا نظم سے تعلق ہے یا [illegible]
ہے کہ کسی غیر کی نظم پر آپ کا نام چھپا دیا
گیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ دونوں
نظموں کا پھر ایک بار موازنہ کرکے فیصلہ
کریجیے کہ ان میں سے کونسی نظم بے سروپا
اور لغو ہے۔ قارئین سے بھی ہم گزارش
کرتے ہیں کہ وہ اس تعلق سے اپنی رائے کا
اظہار کریں۔ (ادارہ)

مرسلہ نظم (تصادم)

پھول کھلے ہوں
یا
پت جھڑ ہو
صحرا میں آندھی آئے
یا
دریا میں طوفان
بالک ہنستا ہے

بالک
نٹ کھٹ
تتلی کے پیچھے دوڑے
تتلی جب ہاتھ نہ آئے
روتا ہے
بالک ہے نادان
اگیانی
لیکن تم تو گیانی ہو

[illegible]

بالک کی اک ذرا سی آہٹ سے

ہو گئے اتنے پریشاں

گویا اک بھونچال ہے

●

اصلاح شدہ نظم: "گیانی اگیانی"

●

بالک نٹ کھٹ

تتلی کے پیچھے دوڑے

تتلی جب بھی ہاتھ نہ آئے

روئے

بالک ہے نادان، اگیانی

لیکن تم تو گیانی ہو

طوفانوں سے لڑتے ہو

بالک کی اک ذرا سی آہٹ سے

ہو گئے اتنے کیوں حیراں؟

غلام مرتضیٰ راہی - علی گڑھ:

کتابت پر خاص توجہ رکھئے۔ چند شعراء

کے کلام میں فنی بے راہ روی پائی جاتی ہے۔

نئے ناموں کو منظر عام پر لانا مستحسن۔ مگر

شروع میں ان کے کلام کا مناسب احتساب

بھی ضروری ہے۔ آپ کی محنت اور لگن کے

سائبان کمیوں کو ٹھہرنا نہیں چاہیئے۔

صادق - ناندیڑ

اس بار پیکر کا سرورق بہت خوبصورت

اور معیاری ہے۔ اس معیار کو قائم رکھئے

[illegible] ہیں [illegible]

مضامین پیارا سے ایک "مسیحا" ظاہر کرتے

ہیں کہ آپ مصوری کی طرف بھی خصوصی توجہ

دے رہے ہیں۔

عبدالرحیم نشتر - بھنڈارہ

پیکر کے خاص نمبر میں آپ کا دھماکہ خیز

مضمون "ادب اور غداروں کے مکروہ چہرے"

پڑھا۔ اس پر تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ مگر۔

کفیل آذر - بمبئی

کئی ماہ پہلے احمد وصی نے پیکر دیا تھا

بالکل ویسا ہی تھا اور اس کے بعد ادھر ادھر

سے خبریں ملتی رہیں کہ پیکر پابندی سے نکل

رہا ہے۔ اس کامیابی کے لئے مبارکباد

قبول کرو۔ بمبئی اور پھر فلم انڈسٹری میں آ کر

آپ سے کٹ گیا ہوں۔ اب تو اپنا شعر

کہنا اور رسالوں میں چھپنا بھی خواب سا

لگنے لگا ہے۔

فاروق شفق - کلکتہ

صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے پرچہ

بہت خوب ہے۔ منظومات کا حصہ کافی وقیع

اور متوازن ہے لیکن افسانوی حصہ آپ کی

توجہ چاہتا ہے۔ اسی طرح اچھے مضامین

کی تلاش بھی آپ کے لئے ضروری ہے۔

ادبی رسائل میں اچھے مضامین کی کمی کی بیماری بہت عام ہے۔

شان بھارتی، سجاد حنباد

بانی پر ابوالفیض سحر کے مضمون کو صرف جوش عقیدت کہا جاسکتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جدید شاعری کی میزان پر بانی پوری طرح نہیں اترتے، افسانوں میں اقبال متین اور رضیا کرناٹکی خاص طور پر پسند آئے۔ شعری حصہ کا انتخاب غالباً لاٹری نکالنے کی شکل میں کیا گیا ہے ورنہ سلیمان اطہر جاوید، شاہد جمشید پوری، فخر رضوی، سلیم صدیقی، انجم عرفانی، حفیظ فضا کی تخلیقات (جسے تیسرے درجے کا بھی نہیں کہا جاسکتا) کیسے شریک اشاعت ہوگئیں؟

ظفر اوگانوی۔ کلکتہ

میں پچھلے چھ مہینے سے اپنی علالت کے چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔ اقدار بھی شاید دم توڑ گیا۔ آپ نے جس خلوص کے ساتھ اقدار کو زندہ رکھنے کی سبیل بتائی تھی اس کے لیے شکرگزار ہوں۔ لیکن اس سے پہلے یہ بیچارہ جاں بحق ہوگیا۔ اور اسی بنا پر آپ کو جواب بھی نہیں دے سکا۔ نادم ہوں۔

قاضی سلیم کی کتاب
نجات سے پہلے
کو حکومت مہاراشٹر کا انعام

پچھلے دنوں حکومت مہاراشٹر نے اردو کے مشہور اور جدید شاعر قاضی سلیم کے مجموعہ کلام "نجات سے پہلے" کو ادبی انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔
ادارہ پیکر قاضی سلیم کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

بیان تفصیل و ملکیت
ماہنامہ پیکر حیدرآباد

تحت دفعہ ۸ رجسٹریشن آف نیوز پیپرز رول ۱۹۵۶ء

۱۔ مقام اشاعت:
۳-۶-۲۱۴ حمایت نگر حیدرآباد۔ ۲۹

۲۔ وقفہ اشاعت: ماہنامہ

۳۔ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر
اعظم راہی

۴۔ مالکان:
اعظم راہی ۲۔ عالیہ خاتون ۳۔ ادیبہ شبنم

۵۔ قومیت:
ہندوستانی

میں اعظم راہی اقرار کرتا ہوں کہ میرے یقین و معلومات کی حد تک تفصیلات بالا صحیح ہیں۔ دستخط

زاویئے **پیکر** اداریہ

پچھلے چند برسوں میں ادبی رسائل اور عوام میں ایک خلیج
سی حائل ہو گئی ہے
کیا یہ خلیج پاٹی جا سکتی ہے؟
رسائل جو فن کاروں کو عوام سے روشناس
کروانے میں ایک کڑی ثابت ہو سکتے ہیں
کیا واقعی ایسا ہو رہا ہے؟
فن کاروں کا واسطہ یا بالواسطہ عوام سے ہونا چاہیئے
یا نہیں،
اگر ہونا چاہیئے تو کن بنیادوں پر
یہ چند سوال ہیں جن پر ہمیں سنجیدگی سے
غور کرنا نہایت ضروری ہے۔
اس بارے میں ہم آپ کی رائے جاننے کے خواہشمند ہیں

اپریل ۱۹۷۱ء کا اداریہ ——— غور و فکر کے لیے

سی آئی اے

(سنٹرل انٹیلیجنس ایجنسی)

واشنگٹن پوسٹ کے نمائندہ خصوصی جیک اینڈرسن کے انکشافات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہند پاک جنگ کے دوران کس طرح امریکی نظم و نسق مخالف ہند سازشوں میں الجھا رہا۔ جیک اینڈرسن نے اپنے ایک تازہ ڈسپاچ میں اس امر کا انکشاف بھی کیا ہے کہ امریکہ کی سنٹرل انٹیلیجنس ایجنسی کا ایک مخبر وزیر اعظم اندرا گاندھی کی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کیا کرتا تھا۔ اور اس کی پہنچ ان کے دفتر تک تھی جیک اینڈرسن نے بتایا کہ اس دوران صدر نکسن کو ان کے مشیر خصوصی ہنری کیسنجر نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان کے خلاف سخت رویہ اختیار کریں۔ جیک اینڈرسن نے اس سلسلہ میں سی آئی اے کے بعض ایسے کاغذات حاصل کیے ہیں جنھیں امریکہ کے اس جاسوس

ادارہ نے انتہائی راز کے دستاویزات قرار دیا تھا۔

امریکہ کے سابق صدر مسٹر ہنری ٹرومین نے سنٹرل انٹیلیجنس ایجنسی قائم کی تھی اور کہا گیا تھا یہ ادارہ جنگ کی صورت میں امریکہ کو اس کے دشمن ملک یا ممالک کی راز کی سرگرمیوں سے باخبر رکھے گا۔ لیکن اس کی تشکیل کے پانچ سال بعد ہی صدر ٹرومین کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کی سرگرمیاں اور اس کی تخریبی کاروائیاں ساری دنیا میں امریکہ کی بدنامی کا سبب بن رہی ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس بر سر اقتدار تنظیم کی مذمت کے باوجود صدر ٹرومین بھی اہم پالیسیاں وضع کرنے میں اس کی رپورٹوں کو پیش نظر رکھا کرتے تھے۔

جب امریکہ کے عالمی مفادات کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو سی آئی اے کی کارکردگی نے بھی وسعت اختیار کر لی اور اس کے مقرر کردہ جاسوس آفریقہ اور ایشیا کے کئی ممالک میں پھیل گئے۔ جہاں جہاں امریکی سرمایہ پہنچا وہاں وہاں سی آئی اے کے ایجنٹوں نے بھی اپنے قدم جما لیے۔ امریکی خفیہ پولس کے ایک سابق آفیسر فلکس نے اس ادارے کے تعلق سے بتایا تھا کہ اس ادارے کی عالمی ذمہ داریاں لامحدود ہیں، ٹوکیو۔ مدراس

[illegible] میں اچانک کر لیتا ہو
[illegible] دانشوروں کی عالمی کانفرنس کے
نام سے اپنے خرچے سے تعلیم یافتہ
لوگوں کے اجتماع سے کوئی بھی قرارداد منظور
کرالینا اس کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں۔
جس ملک میں بھی امریکی مفاد پر کوئی ضرب
پڑتی ہے تو سی آئی اے کوئی ایسا چکر چلا دیتی
ہے کہ لوگ امریکہ کو بھول کر خود باہم
دست وگریباں ہو جاتے ہیں ۱۹۴۸ء
میں سی آئی اے کو یہ اختیارات دیئے گئے کہ
وہ امریکی مفاد کے تحفظ کی خاطر خفیہ سرگرمیاں
کسی بھی ملک میں جاری رکھے۔ لیکن یہ بھی
کہہ دیا گیا کہ ایسی سرگرمیوں کے انکشاف
کی صورت میں حکومت امریکہ ان سے بے
تعلقی کا اعلان کردے گی۔ تاکہ اس کی رسوائی
نہ ہو۔ خود امریکہ کے دانشوروں نے اسے سازشوں
کی تنظیم کا نام دے رکھا ہے۔ اسے جس ملک
میں گڑبڑ یا سازش کرنی ہوتی ہے اس کے
ایجنٹ کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاتے ہیں۔
اور متعلقہ ملک کے کچھ لوگوں کو خطیر رقم
دے کر اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔ ایسے افراد کی
مدد اور ان کے اشتراک و تعاون سے سی
آئی اے اپنی خطرناک سازشوں کا آغاز کرتا
ہے پیش کالجس اور سپاہیوں کے گروہ میں سی آئی
اے کے ایجنٹ پکڑے گئے ہیں۔ ویٹ نام،
لاؤس، کمبوڈیا، گھانا۔ نائیجیریا بولیویا
اور کانگو میں اب تک جتنی بھی خطرناک سازشیں
ہوئیں۔ ان سب کے پیچھے سی آئی اے کا ہاتھ
کار فرما ہے۔ عرب ممالک میں بھی سی آئی
اے کے ایجنٹ اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف
ہیں اور ہندوستان و پاکستان کو بھی انہوں
نے ایک عرصے سے اپنی جولانگاہ بنا رکھا ہے

عالمی صحافت پر تحدیدات

انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ نے اپنی
سالانہ رپورٹ میں انکشاف کیا کہ مختلف ممالک
کی حکومتوں، سرمایہ داروں اور تشہیری
اداروں کی جانب سے مختلف نوعیت کے دباؤ
و اثرات کے باعث عالمی صحافت کی آزادی
کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔

اس رپورٹ میں جس کو انسٹی ٹیوٹ کے فرنچ
ڈائریکٹر مسٹر اونسٹ میئر نے شائع کیا ہے بتایا
کہ ترقی یافتہ و ترقی پذیر دونوں ہی ممالک میں صحافت
پر مختلف نوعیت کی تحدیدات عائد کی جارہی
ہیں۔ اور ایک صحافی کی آزادی تحریر میں کمی
واقع ہو رہی ہے۔ صحافتی اداروں کے ذرائع
چونکہ محدود ہوتے ہیں اس لئے وہ انفرادی
طور پر رپورٹنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے
اور رپورٹنگ کے مقصد سے زیادہ سرکاری
اعلانات و بیانات پر ان کا انحصار ہوتا ہے
انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کی جاری کردہ

اس رپورٹ میں مزید یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ مغربی ممالک میں آزادی صحافت کے جو بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں انکے باوجود وہاں آزادی صحافت کو سنسرشپ سے بھی بڑا خطرہ درپیش ہے۔ چونکہ ایک صحافی اپنی تحریر کے دوران ہمیشہ اس بات سے فکرمند رہتا ہے کہ اس کی تحریر کا نتیجہ نہ معلوم اس کی خدمت پر کس طرح اثر انداز ہو۔ ترقی پذیر ممالک میں صورت حال اس سے بھی نازک ہو چکی ہے۔ صحافت کی آزادی سلب کرنے کی خاطر ان ممالک میں اخبارات کی اشاعت کو بند کر دیا جاتا ہے یا ان کی اشاعت کچھ عرصے کے لئے معطل کر دی جاتی ہے یا حکومت ان پر بالجبر قابض ہو جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں اشاعت کے لائسنس منسوخ کر دیئے جاتے ہیں۔ نیوز پرنٹ کی سربراہی میں کمی کر دی جاتی ہے یا ان کے سرکولیشن میں موانعات پیدا کی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ اس رپورٹ میں کئی اور نوعیت کی تحدیدات کا ذکر کیا گیا ہے جو آئے دن مختلف ممالک کی حکومتوں کی جانب سے آزادی صحافت پر عائد کی جا رہی ہیں۔ حکومت اور تشہیری اداروں کے ان اقدامات کے مقابلے کی خاطر ادارے اپنے انضمام کے ذریعہ بڑے اور متحد گروپس تشکیل دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ نتیجتاً اخبارات کی جانب سے

[illegible] ظاہر ہونے والی [illegible] کی بجائے یک سالہ [illegible] برطانوی اخبارات اب تک [illegible] اثرات اور حکومت کے دباؤ سے آزاد [illegible] ہیں۔ حالیہ عرصہ میں برطانیہ میں بھی بعض گوشوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ریڈیو ٹیلی ویژن پر سنسرشپ اور اس قسم کی دوسری تحدیدات عائد کی جائیں لیکن خوش قسمتی سے اب تک حکومت برطانیہ نے ان مطالبات کو مسترد کر دیا ہے۔ اور ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اداروں نے بھی ان مطالبات کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ امریکہ میں ویٹ نام سے متعلق پنٹاگان دستاویزات پر اخبار نیویارک ٹائمز کے حق میں امریکی سپریم کورٹ کے تاریخی فیصلے کے باوجود بھی آزادی صحافت میں مداخلت کی جاتی رہتی ہے۔ اخبار [illegible] ونسق ان کے لئے طرح طرح کے موانعات پیدا کرتا رہتا ہے۔ ایشیائی ممالک نے بھی آزادی صحافت پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی ہیں، ہانگ کانگ جاپان اور فلپائن کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسکے باوجود خود جاپان میں بھی مخصوص محکمہ یا وزارت کے قول پر مشتمل رپورٹرس کلبوں کا وجود جن کی رکنیت بھی تحدید عائد ہے خبروں کی آزادانہ ترسیل کے لئے ایک طرح کی رکاوٹ کا باعث ثابت ہو رہی ہیں۔ سوویٹ یونین میں مغربی ممالک کے صحیفہ نگاروں پر پابندیوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مخدوم محی الدین

بھری بہار پہ الزام آگیا اے دوست
چمن پرست تہہ دام آگیا اے دوست
ہجوم یاس ابھی اور بڑھنے والا تھا!
تری نگاہ کا پیغام آگیا اے دوست
جہاں بھی میں نے کسی کو پکارنا چاہا
مری زباں پہ ترا نام آگیا اے دوست
بڑے مزے سے تری یاد میں گزر جاتی
خیالِ گردشِ ایّام آگیا اے دوست
گئی چمن سے بہاروں کی عیش سامانی
مری رہائی کا ہنگام آگیا اے دوست
گزارنا شبِ غم کا محال تھا لیکن!
ترا خیال سرِ شام آگیا اے دوست

(غیر مطبوعہ) (مخدوم کی یاد میں)

احسن علی مرزا
۳-۵-۸۲/۹
کنگ کوٹھی
حیدرآباد-۱

مخدوم سے ایک ادھورا انٹرویو

۱۹ سال پہلے کا تاشقند اتنا بدل سکتا ہے۔ یہ بات میرے ذہن وخیال میں بھی نہ تھی... مخدوم تہک تہک کر افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کا حال سنا رہے تھے کشادہ صحن انگور کی بیلوں اور مختصر سے خانہ باغ کے مکانات کی جگہ نئے فلیٹس نے لے لی ہے زلزلے نے ازبکستان کے اس شہر کو تہس نہس کر دیا تھا۔ لیکن سوویت یونین کے شہریوں نے اپنی محنت سے ایک نیا شہر تعمیر کر کے "تو شب آفریدی چراغ آفریدم" کے قول کو سچ کر دکھایا۔

مخدوم کے سفر کی داستان بڑی دلچسپ اور طویل ہے۔ کابل، تاشقند، سمرقند، ماسکو باکو، تبلسی، اس دفعہ تو مخدوم نے افغانستان اور سوویٹ یونین کے کئی شہروں کی سیر کی ہے کابل میں ہمارے سفر کی شریک حیات چندر لیکھا کی ذہانت، وضعداری اور مہمان نوازی سے لے کر تاشقند میں غفور رضا کے وارڈ روب تک مخدوم نے صرف ایک گھنٹہ کی بات چیت میں کتنی ہی باتیں سنائیں اور پھر بڑے ہی پراسرار انداز میں انکشاف کیا۔ اس سفر میں ہم نے ایک شعر بھی کہا ہے۔ ایک شعر! میں سوچ رہا تھا کہ مخدوم نے تو دو تین نظمیں لکھی ہوں گی۔ دل ہی دل میں ان لوگوں کو کوس رہا تھا جنہوں نے مخدوم کی ۶۰ ویں سالگرہ منا کر ان

میں بڑھاپے کا احساس پیدا کردیا ہے
لیکن جب مخدوم نے اپنا نوزائیدہ شعر سنایا
تو اندازہ ہوا کہ مخدوم ـــــ دل کی طرح عمر
پسند تو نہیں وطن پرست ہیں اور ان کی وطن
پرستی ان کے سن و سال سے بے نیاز جوانی کے
دور سے گزر رہی ہے۔ مخدوم کا ایک شعر آپ
بھی سن لیجئے ؎

کابل ہو سمرقند ہو کہ بابِ تبلیسی
ہندوستاں کا درد نہاں ساتھ ساتھ تھا

مخدوم کے اس "درد نہاں" کی وسعتوں نے کون
و مکاں کو محیط کرلیا ہے۔ ہندوستاں کا درد
نہاں ! اس نے سمرقند اور تاشقند میں بھی
کتنے ہی گل کھلائے۔ مخدوم کہنے لگے تاشقند
اور سمرقند کا ذکر تو رامائن میں بھی ملتا ہے
ہندوستان کی اس قدیم کتاب میں اس کا تکشش
کھنڈ کے نام سے اور سمرقند کا سمر کھنڈ کے
نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ مخدوم نے افروایشیائی
ادیبوں کی کانفرنس کے علاوہ تاشقند میں
منعقدہ علی شیر نوائی کے میوزیم کے رسم افتتاح
میں بھی شرکت کی اور اس دفعہ بھی جارجیا
اور آذربائیجان کی سوویت جمہوریتوں کی بھی
سیاحت بھی کرلی۔

میرے استفسارات پر مخدوم نے بتایا کہ
افروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں خود ان
کے علاوہ سجاد ظہیر، گوپال ہلدر، رنجیت جی
ایڈیٹر ملاپ، ملک راج آنند اور ملایالم کے
ادیب اور شاعر شنکر کرپ بھی شامل تھے
پاکستان کے کسی ادیب یا شاعر نے اس میں
شرکت نہیں کی، عرب ممالک کے علاوہ
ایشیائی اور افریقی ممالک کے ۲۵۰ ادیبوں
اور شاعروں کے منجملہ ۵۲، ادیبوں نے تقاریر
کیں اور مقالے پڑھے۔ ایک مباحثہ بھی
منعقد ہوا۔ جس میں ادیبوں، شاعروں اور
مصنفوں نے ادیب کے رول، روایت اور
تجدد اور قومیت، بین الاقوامیت کے
موضوع پر اپنے افکار و خیالات کا اظہار
کیا۔ افروایشیائی وفود کے علاوہ امریکہ
اور چیکوسلواکیہ کے ادیبوں اور شاعروں
نے بھی کانفرنس میں فراٹرنل ڈیلیگیٹس
کی حیثیت سے شرکت کی اور اس پر اختتامی اجلاس
میں بالاتفاق آرا یہ اعلان کیا گیا کہ ساری
دنیا کے ادیب شاعر اور دانشور اپنے قومی
مسائل کے اختلاف کے باوجود امن، آزادی
اور سوشلزم کی ترقی اور استحکام کے لئے مل کر
کام کرسکتے ہیں۔ جدیدیت کے تعلق سے
یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ کوئی ادیب یا شاعر
خلا میں بیٹھ کر کچھ نہیں لکھ سکتا اسے اپنے
گرد و پیش سے رشتہ جوڑنا ہی پڑتا ہے جہاں
تک تکنیک کے تجربات کا تعلق ہے ان کی
حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ بشرطیکہ
یہ تجربے اچھے اور معقول ہوں۔

مخدوم صاحب نے بتایا کہ انہوں نے بعض
آفریقی اور عرب شاعروں کی نئی تکنیک
پر لکھی ہوئی نظمیں بھی سنیں اور یہ نظمیں کافی
پُر اثر تھیں۔ آفریقی ادیبوں کے تعلق سے
مسٹر مخدوم نے بتایا کہ بہت سے آفریقی
ممالک کی زبانیں ابھی تک بولی کی منزل
پر ہیں۔ اس کے باوجود افریقی ادیب بہت
اثر آفریں انداز میں لکھتے ہیں۔ اور سوشلزم
پر انھیں بڑا اعتماد اور ایقان ہے۔

تاشقند کی عام سماجی زندگی کا ذکر کرتے
ہوئے جناب مخدوم نے بڑے دلچسپ
انکشافات بھی کئے۔ ان کے بیان کے
مطابق انھیں اپنے قیام کے دوران تاشقند
کی ایک قابل احترام شخصیت جناب نبی
جان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔
انقلاب روس کے وقت نبی جان بہت
چھوٹے تھے۔ انقلاب کے بعد وہ متعدد سرکاری
عہدوں پر فائز رہے اور اب وظیفہ لے کر
امن چین کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ان کے
خوش منظر مکان کے دیوان خانے میں رسول
کریم اور خلفائے راشدین کے ناموں کے
طغرے آویزاں ہیں۔ ایسے کیلنڈر بھی
[illegible] میں ایک خاتون کو مصلے پر بیٹھ
کر دعا کرتے دکھایا گیا ہے۔ مخدوم نے جناب
نبی جان کو چھیڑنے کے لئے پوچھا!
حضور یہ طغرے اور یہ کیلنڈر کیا ہندوستان
سے لائے گئے ہیں۔ نبی جان صاحب کا چہرہ
سرخ ہو گیا۔ انہوں نے کہا نہیں یہ سب
یہ تو میرے شہر کے ہیں! بات چیت کے دوران
ریڈیو تاشقند کا ایک نمائندہ بھی جناب نبی جان
سے ملنے کے لئے آیا۔ وہ ایک ٹاک ریکارڈ
کرنا چاہتا ہے۔ بہت سے سوالات کے بعد
جب ان سے پوچھا محترم آپ کی سب سے
بڑی خواہش کیا ہے تو انہوں نے بڑے فخر
و انکسار سے کہا بھائی میں نے دنیا دیکھ لی
اب میری آرزو ہے کہ حج بیت اللہ کا شرف
حاصل کروں اور باقی عمر یاد الٰہی میں گزار دوں۔

نبی جان بیحد مقدس و محترم شخصیت ہیں مذہب
کے پابند لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ
کافی وسیع النظر بھی واقع ہوئے ہیں۔ ان
کے لڑکے اور لڑکیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ
ہیں اور سب سوویٹ یونین کی نئی نسل کی
نمائندگی کرتی ہیں۔ نیا لباس پہنتی ہیں۔ رہن
سہن کے نئے انداز کو پسند کرتی ہیں ـــــ
لیکن نبی جان صاحب اب کسی بات پر معترض
نہیں ہوتے۔ وہ نوجوانوں کی سرگرمیوں کی
حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مخدوم نے کہا کہ
جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ کمیونسٹ ممالک
میں مذہب کو ختم کر دیا گیا ہے۔ وہ کچھ نہیں تو
ایک دفعہ تاشقند اور سمرقند کی سیاحت
کر لیں۔ مسٹر مخدوم نے یہ بھی بتایا کہ تاشقند

[illegible] مسٹر مخدوم نے بتایا کہ تاشقند سے مسلم بورڈ کے زیر اہتمام اسلامیات کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا جاتا ہے اور اس میں اسلامی فلسفہ اور شریعت پر تحقیقی مضامین شائع ہوا کرتے ہیں۔

جناب مخدوم نے تاشقند اور ہندوستان میں شادی کی رسموں کی مشابہت کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں شادیوں میں کافی دھوم دھام رہتی ہے۔ شہنائی، قرنے، دف، براتیں، حد یہ ہے کہ دولہا اور دلہن کو ایک دوسرے کے دامن میں گرہ دے کر الاؤ کے چکر کاٹنے بھی پڑتے ہیں۔ یہ رسم ہمارے ملک کے ہندو شادیوں میں منائی جانے والی پھیرن کی رسم سے لی گئی ہے اور تاشقند کے شہریوں کو اعتراف ہے کہ انھوں نے ہندوستان سے جسے وہ اپنے صدیوں کا دوست مانتے ہیں، بہت سی چیزیں لی ہیں۔

مسٹر مخدوم کو علی شیر نوائی کے پانچ سو پچیسویں جشن کے سلسلے میں تعمیر کردہ علی شیر نوائی میوزیم کی رسم افتتاح میں شرکت کا بھی موقع ملا۔ ان کے بیان کے مطابق یہ عمارت بے حد خوبصورت اور حسین ہے اور رسم افتتاح کے موقع پر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ جونہی مہمان محل میں داخل ہوئے، چست پوشاک پہنے ہوئے شہنائی نوازوں نے اپنا شہنائی کی دلنواز سروں سے استقبال کیا۔ علی شیر نوائی کی غزلوں میں جن پھولوں کا ذکر ملتا ہے اس موقع پر ان پھولوں کی ایک گلدستہ ترتیب دی گئی اور زیادہ سے جاذب نظر بنانے کیلئے طبل طرطلے اور ایسے خوبصورت پر ندبھی نمائش میں رکھے گئے تھے جن کی چہکار اور خوش رنگی نے علی شیر نوائی کو متاثر کیا تھا۔ مدرسہ الغ بیگ کے ایک بڑے محراب میں علی شیر نوائی کا تحریر کردہ ایک غنائیہ بھی پیش کیا گیا۔

مخدوم صاحب نے تاشقند یونیورسٹی اور جامعاتی طریقہ تعلیم کے بارے میں بھی ضروری معلومات حاصل کیں۔ تاشقند میں جامعاتی تعلیم دو زبانوں میں دی جاتی ہے ایک تو روسی میں اور ایک ازبکی زبان میں۔ ان کے علاوہ ایک بیرونی زبان بھی طلباء کو سیکھنی پڑتی ہے۔ تاشقند یونیورسٹی میں اردو و ہندی کے شعبے بھی ہیں۔ ان شعبوں میں زیر تعلیم دو لڑکیوں غفورو اور ولیم کی صاف اور فصیح اردو سے مخدوم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

تاشقند و سمرقند میں نوجوانوں اور بوڑھوں

کے انداز فکر میں فرق واختلاف کا ذکر کرتے ہوئے مخدوم نے بتایا کہ اب وہاں لڑکیوں میں (Miniskirt) رائج ہو رہے ہیں۔ لیکن چند دنوں پہلے تک لمبے کرتے نہ پہننے والی لڑکیوں کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اب بھی بازاروں میں minikirt پہن کر جانا پسند نہیں کیا جاتا۔ اس سے ہٹ کر بوڑھوں کو نئے فلیٹس سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ وہ پرانے صحن رکھنے خانہ باغ کے ان مکانوں کو یاد کرتے ہیں جو حالیہ زلزلے کی نذر ہو گئے۔ ان کے برعکس نئی نسل فلیٹس کی زندگی کو پسند کرتی ہے۔

مخدوم نے کہا کہ نئی اور پرانی نسل کی پسند اور ناپسند کا یہ ٹکراؤ کسی بھی صورت میں اس منزل پر نہیں پہنچا کہ نئی نسل بیزارگی اور مایوسی کا شکار ہو جائے۔ بوڑھے نئی نسل کی شکایت بھی کرتے ہیں تو اس میں بزرگانہ شفقت کا رنگ غالب رہتا ہے۔

سمرقند — جسے حافظ شیرازی نے "خال ہندوش" کے صلہ میں بخش دینے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ اب صرف تازہ بہ تازہ سیبوں کا شہر نہیں رہا بلکہ اس شہر کے بسنے والوں کے گالوں پر بھی سیبوں جیسی سرخی جھلکنے لگی ہے۔ غالب کے دادا [illegible] اسی خاک سے اٹھے تھے۔ اور سمرقند کے شہری اس بات کا بڑے فخر سے تذکرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے غالب کے جشن صد سالہ کی تیاریاں شروع کر دی ہیں اور اس موقع پر اس گلی کو جو اب ایک بڑی شاہراہ کی شکل اختیار کر چکی ہے، "شاہراہ غالب" کے نام سے موسوم کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا گیا ہے۔ جشن کی تیاری کمیٹی اس موقع پر ایک ساونیر بھی شائع کر رہی ہے جو غالب کے کلام، ان کی شخصیت اور ان کے انداز فکر کے متعلق بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہوگا۔

بر سبیل تذکرہ جناب مخدوم نے بتایا کہ آفرو ایشائی کانفرنس کے موقع پر بھی افریقہ اور ایشیا کے مشہور شاعروں کی نظموں پر مشتمل ایک خوبصورت کتاب بھی شائع کی گئی ہے جس میں خود ان کی بھی دو نظمیں شامل ہیں۔ انہوں نے اس امر کا انکشاف بھی کیا کہ ۱۹۷۰ء میں آفرو ایشائی ادیبوں کی کانفرنس کا اجلاس ہندوستان میں منعقد ہوگا۔ مخدوم سوویت یونین کی جمہوریتوں اور آفرو ایشائی ادیبوں کی کانفرنس کے سرسری تذکرہ کے بعد کابل کا احوال سنانے لگے۔ حالانکہ دلی سے تاشقند جاتے ہوئے انہیں اپنے ہوائی جہاز کے قدرے دیر سے پہنچنے کی بنا

[illegible] دن کابل میں رک جانا پڑا تھا۔ اس
اعتبار سے سفر کی داستان کا آغاز مجاہدانِ
حریت پختونوں کی سرزمین سے ہونا چاہیے تھا۔
لیکن کانفرنس کے ذکرِ خیر نے سفر کی پہلی منزل
کو تاثرات کا آخری پیراگراف بنا دیا۔ مخدوم
کے الفاظ میں افغانستان جیسے عصرِ حاضر
کی روشنی بڑی دیر سے نصیب ہوئی۔ کُشان
قبیلہ کی حکمرانی کے ۵۰۰ سالہ دور میں ہندستان
کی تہذیب و ثقافت سے بہت متاثر ہوا۔
لغمان، جلال آباد اور خاڈا میں بھی جائیے
——— ایسا محسوس ہوگا جیسے ہم امرتسر کے
بازاروں سے گزر رہے ہیں۔ خاڈا میں تو
بدھ مت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔
شلوار اور کرتہ جو شمالی ہند اور پنجاب میں
بہت مقبول ہے افغانستان کا قدیم ترین لباس
ہے۔ کابل کے بازاروں میں آج بھی برقعہ
پوش خواتین نظر آتی ہیں لیکن جب بھی ہوا کا
ایک ہلکا سا جھونکا برقعہ کے زیریں حصہ کو ہٹا
دیتا ہے تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس ملک کی خواتین
بھی اسکرٹ پہننے لگی ہیں، کم عمر لڑکیاں
MINIS بھی پہننے لگی ہیں۔

مخدوم نے کہا ابھی ہندستان اور پاکستان کو
چھوڑ کر ہر طرف نئے انقلاب کی ہوائیں چل
رہی ہیں، پسند، مزاج، مذاق سب بدل
رہا ہے۔

مخدوم کا جملہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ ایک ٹیکسی
ان کے کوارٹر کے آگے رکی ——— اور عزیز قیسی
اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ اتر پڑے۔
یار زندہ صحبت باقی ———

مخدوم کو با دلِ ناخواستہ خدا حافظ کہہ کر
ان کے کوارٹر سے باہر نکلنا ہی پڑا۔ ——

دو مختصر نظمیں

واحد پریمی

سبزی منڈی نزد موتی مسجد

بھوپال-۱

احساس

غم کا پیکر ہے آدمی کیا ہے
آج محسوس ہو رہا ہے مجھے
اک مصیبت ہے زندگی کیا ہے

زندگی

شامِ غم دل کا داغ جلتا ہے
اس طرح جیسے رات ہونے پر
جھونپڑی میں چراغ جلتا ہے

خواب کے نشے میں تعبیر کو جھٹلاؤں نہیں
اب یہ سوچا ہے فریب اور کوئی کھاؤں نہیں
کسی ذرّے کو نہ خورشید نہ مہتاب کہوں
کسی قطرے میں سمندر کوئی دکھلاؤں نہیں
زہر امرت نہ بنا ہے نہ بنے گا لوگو
سحرِ الفاظ سے اب ذہنوں کو پتھراؤں نہیں
کون بستی ہے ذرا آنکھ تو مل کر دیکھوں
پیڑ ہر راہ میں موجود ہیں اور چھاؤں نہیں
جب چلوں کوئی صدا چلتی ہے پیچھے پیچھے
مڑ کے دیکھوں تو صدا کار کوئی پاؤں نہیں
کچھ نہ کرنے پہ بھی پہلے تھی پشیمانی بہت
اب یہ عالم کہ گناہوں پہ بھی پچھتاؤں نہیں

بشر نواز
محلہ گھاٹی ۔ اورنگ آباد

اجنبی کی باتوں میں جب خلوص پائے گی
سادگی تصور کی دل کو پھر ستائے گی
ساحلِ تمنا پر نیند اڑ گئی سب کی
اب وہ موج کس کس کو گود میں سلائے گی!
بخش دو مرا ماضی، میری عمر لوٹا دو
ورنہ صبحِ امکاں کی نبض ڈوب جائے گی
جسم کے سمندر میں ڈوبنا تو آساں ہے
روح کے جزیرے تک کس کی ناؤ آئے گی؟
اور ہم سے کیا ہوگا، اپنے دل کو سمجھا لیں
صبح ہو نہ ہو لیکن رات بیت جائے گی
یوں مجھے نہ ملنے دو، دیکھنا تھکن میری
تیز رو زمانے کے ساتھ ساتھ جائے گی

مظہر امام
آل انڈیا ریڈیو ۔ پٹنہ

نام کے آوارہ لفظ

تاج مہجور
۵۲۲-۲-۲۰ سرائے بواہیر حیدرآباد-۲
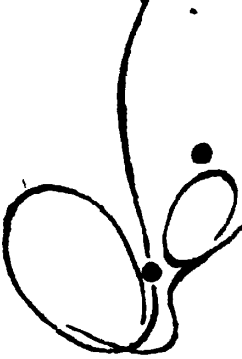
رات
میں نے جسم کے جنگل میں کاٹی
اور دن
جستجو کی سیڑھیوں کے بیچ سے
شہرت کے مٹیالے کھنڈر کے
سربلند مینار پہ
چڑھنے میں ضائع کردیا
سانس پھولی فکر کی
اور تھک گئے دانش کے پاؤں
تب لگائی مصلحت نے
وقت کے ٹوٹے دریچے سے چھلانگ
میں نے دیکھا
میرے اپنے نام کے
آوارہ لفظ
صبح کے اخبار پہ
ترتیب سے موجود تھے

کاوش بلہری
۱۳/۳ مانیکا مستری اسٹریٹ - مدراس-۱۴

نارسائی کا بہر حال گلا رہتا ہے
کیا کسی فکر کے عالم میں خدا رہتا ہے

زندگی روشنیٔ طبع رسا سے پوچھے
پھر بھی ماحول میں کیوں اتنا خلا رہتا ہے

ناتراشیدہ سہی سنگِ تصور رہنا
کم سے کم درد کے کوچے میں پڑا رہتا ہے

کتنے الفاظ بکھر جاتے ہیں میرے لب سے
صرف اک نام تمہارا ہی جدا رہتا ہے

جانے کب دن کی تھکی ماندی سحر لوٹ آئے
ہمہ شب ذہن کا دروازہ کھلا رہتا ہے

دور تک کرب مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک سائے کے سوا شہر میں کیا رہتا ہے

برگِ آوارہ سے کچھ کم نہیں کاوش کا مزاج
سوچ ہی سوچ میں ہر سمت پڑا رہتا ہے

نعیم نے پیر پھیلا دیئے اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ دس منٹ سے تن کر بیٹھے بیٹھے اسے تکان کا احساس ہونے لگا تھا۔ اُن سے دیکھ کر ایک دو اور خود کو آرام دہ حالت میں لے آئے۔ وہ کُل آٹھ تھے اور انٹرویو کے لئے پکارے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ انٹرویو ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ انہیں ویٹنگ روم میں بٹھلا دیا گیا تھا۔ ویٹنگ روم

ملازمت بھی کس قدر ضروری ہے اس نے سوچا۔ ملازمت کرنے کی اسے بالکل خواہش نہ تھی اسے تو یہاں نیلوفر کا خیال کھینچ لایا تھا۔ اُسے تو گھومنا پھرنا یار باشی، فلمیں دیکھنا یا پھر نیلوفر کے گھر جا کر کہیں اُس یا اس کے ساتھ سمندر کے کنارے سیر کو جانا پسند تھا لیکن زندگی کیا اس فراغت سے گذرتی ہے۔ یہاں ملازمت بھی ضروری ہے تاکہ

گھیرے کے اندر

ایرکنڈیشنڈ تھا اور آرام دہ صوفے بچھے ہوئے تھے۔ اتنا آرام تو انہیں کم از کم دیا ہی گیا ہے۔ اس نے سوچا اور سر کو صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ اسے نیلوفر کا خیال آیا۔ تیکھے نقوش بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ دبلا پتلا جسم، تمام خوبصورتی اور شادابی چہرے میں سمٹ آئی تھی۔ پروقار انداز اور رکھ رکھاؤ جس سے سنجیدگی کی بجائے شگفتگی ظاہر ہوتی تھی۔

آدمی چار دیواروں میں رہ سکے اپنا اور اپنی محبوبہ کا پیٹ بھر سکے۔

ایک منحنی سا آدمی جس کے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں اور جو نیلے رنگ کا ایک کوٹ جس کی چمک ختم ہو کر شاید مدت ہو چکی تھی۔ ایرکنڈیشنڈ روم کا دروازہ کھول کر داخل ہوا۔ انٹرویو شروع ہو رہا ہے۔ اس نے بتایا۔ پہلا آدمی جو منحنی

انور خان

۲۷ تیسری پیرخان اسٹریٹ
دوسری منزل روم نمبر ۳۲
بمبئی - ۸

تھا۔ جانے کھڑے ہو کر ٹائی درست کی، کوٹ کو شانے جھٹکا کر ٹھیک کیا اور ٹہلنے لگا۔ منحنی سا آدمی باہر چلا گیا۔

"مجھے ڈی۔ اے گبری کہتے ہیں۔ آپ کی تعریف؟" پاس بیٹھے ہوئے شخص نے نعیم سے پوچھا۔

"مجھے نعیم کہتے ہیں۔"

"آپ کہیں ملازمت کر رہے ہیں" گبری نے پوچھا۔

"بے رگھوناتھ" منحنی سے آدمی نے کمرہ کا دروازہ کھول کر جھانکتے ہوئے کہا اور لوٹ گیا۔

بے رگھوناتھ متوازن قدموں سے چلتا ہوا ایرکنڈیشنڈ روم کے باہر چلا گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار تھے اور ایک ہاتھ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

"جی نہیں"، نعیم نے گبری کو بتایا "ملازمت کے سلسلے میں یہ میرا پہلا موقع ہے۔"

"اوہ!" رگھوناتھ نے کہا "آپ نے گریجویشن کس مضمون سے کیا ہے؟"

"تاریخ" نعیم نے بتایا "اور آپ نے؟"

"اکنامکس" رگھوناتھ نے جواب دیا۔

"آج کل اکنامکس کا بڑا ڈیمانڈ ہے" نعیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کے لئے جانے کے امکانات زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔"

"یہ میرا چودھواں انٹرویو ہے" رگھوناتھ نے کہا۔ "اور ہم دونوں تقریباً ہر انٹرویو میں ساتھ ساتھ بلائے گئے ہیں۔"

سامنے بیٹھے شخص نے لقمہ دیا۔

نعیم نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا نام کے بی پاریکھ ہے" اس نے سر کو خم کر کے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

نعیم نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"میں نے کیمسٹری سے بی ایس سی کیا ہے" پاریکھ نے بتایا۔

"منیجر کی جگہ کے لئے سائنس گریجویٹ کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے" نعیم نے سوچا۔ لیکن تاریخ کے گریجویٹ کی بھی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ نعیم کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ پھر نیلوفر کے متعلق سوچنے لگا۔ اور وہ نیلوفر کے خیالوں میں کھو ہی جاتا اگر پاریکھ کی آواز پھر اسے متوجہ نہ کر لیتی۔

"کیوں نہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں" وہ کہہ رہا تھا۔

"آخر ہمیں دو تین گھنٹے ساتھ گزارنے ہیں۔"

'ملازمت بھی کیسی مجبوری ہے۔' نعیم نے سوچا۔ ہمیں ان لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ ایسی باتیں کرنی ہوتی ہیں جن کی ہمیں کوئی خواہش نہیں ہوتی

سب نے اپنا تعارف کروایا۔ سب ہی آرٹس
سائنس یا کامرس کے درجہ اول کے گریجویٹ
تھے۔ نعیم کے علاوہ سب ہی کہیں نہ کہیں ملازم
تھے۔ کوئی ٹیچر تھا، کوئی کلرک کوئی سیلزمین
کوئی کیمسٹ۔ گپتا نے سب کی توجہ اپنی طرف
کھینچ لی۔ اس نے طبیعات سے بی ایس سی کیا
تھا۔ اسے بہتر فی صدی نمبر ملے تھے۔ اس کا
ایک پیر کٹا ہوا تھا۔

سب کا خیال تھا کہ اس کے نمبر اتنے شاندار
ہیں کہ اسے اچھی سی ملازمت ملنے میں کوئی دشواری
نہیں ہونی چاہیے تھی۔

"اب تک میں اٹھارہ انیس جگہ انٹرویو دے چکا
ہوں۔" گپتا نے بتایا کہ "ہر انٹرویو میں مجھ
سے یہی کہا جاتا کہ وہ مجھے ضرور رکھ لیتے لیکن
اس نقص کی وجہ سے مجبور ہیں۔"

نعیم کو اس سے ہمدردی ہوئی۔ بے چارہ لقمے
کی تلاش آدمی کو کس قدر مجبور کر دیتی ہے۔
پھر بھی یہ کہیں کام تو کر رہا ہے۔ پھر اس پر
کیوں قناعت نہیں کر لیتا۔ لیکن درجہ اول
کا گریجویٹ اور وہ بھی بہتر فی صد نمبر لئے
ہوئے وہ کیسے ایک چھوٹی سی ملازمت پر تکیہ
کرلے۔ دوسرا المیہ۔ افسوس آدمی لقمہ کی تلاش
میں نکلتا تو ہے لیکن پھر مرتبہ کا خیال اسے چین
نہیں لینے دیتا، بہتر اور بہتر اور بہتر ملازمت
یعنی زیادہ اور زیادہ اور زیادہ پیسوں کی ملازمت
ہم بھی اپنی شخصیتوں کو کیسے کیسے کمزور سہاروں
پر کھڑے کرتے ہیں۔

منحنی سے شخص نے دوبارہ کمرے میں جھانکا
پارکھ کو بلایا گیا۔ پارکھ فائل سنبھالتا ہوا چلا
گیا۔ سب ایک دوسرے سے بات چیت میں
مصروف تھے۔ نعیم پھر اپنے خیالوں میں چلا گیا
تم خود کیوں نہیں ایک چھوٹی سی دکان کھول
لیتے ہو یا کسی دکان میں سیلزمین ہو جاتے؟
یہ تو نسبتاً آسان ہوگا۔ وہی جھوٹا غرور۔ کیا
نیلوفر تب مجھ سے شادی کرنے پر رضامند
ہوگی؟ ہو سکتا ہے۔ اس کے گھر والے مخالفت
کریں۔ یہ جھوٹا غرور، یہ روزی کی تلاش،
ہمارے بنیادی جذبوں پہ کیا اپنا اثر ڈال دیتی
ہے۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ اسے خیال آیا کہ
راستے میں یعقوب ملا تھا۔ اور کیسے کترا کے گذر
گیا تھا۔ اس کے پیر زمین پر نہیں ٹکتے،
کیونکہ اب وہ ایک غیر ملکی کمپنی میں ایگزیکیٹیو
ہو گیا ہے۔ اب تو اسے اپنا علاقہ بھی اچھا نہیں
لگتا۔ وہ چاہتا ہے سمندر کنارے بنے ہوئے
بنگلوں میں رہے، وہیں کے لوگوں میں ملے جلے۔
اف، روزی کی تلاش مختلف علاقوں میں بھی
کس قدر بعد پیدا کر دیتی ہے، اس نے سوچا
وہ لوگ جو ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے
ہنسی مذاق کرتے تھے کس قدر مختلف ہو جاتے ہیں۔
منحنی سے شخص نے پھر جھانکا اور نعیم کا نام پکارا۔

نعیم نے اپنی سندوں کی فائل اٹھائی اور منحنی

اس کے پیچھے چل دیا۔ اس شخص نے اسے جلدی جیسے کمرے کے باہر دھکیل دیا۔ نعیم اچانک بہت نروس ہو گیا۔ اس نے رومال سے پیشانی تھپتھپائی اور انگلیاں چٹخانے لگا۔

دو منٹ بعد چپراسی نے باہر آ کر سر کے اشارے سے اسے اندر جانے کے لئے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ کافی بڑا تھا۔ دبیز زرد قالین پر چلتے ہوئے اسے کافی دور ایک بڑی سی میز کے قریب پہنچنا تھا، جہاں تین عمر رسیدہ آدمی موٹی عینکوں کے پیچھے سے اسے گھور رہے تھے۔ اور اس کے قریب پہنچنے کے منتظر تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا جیسے چاہتا ہو جتنا زیادہ وقت لگے اتنا ہی بہتر ہے۔ انٹرویو سے پہلے انتظار کی صورت اس کے اعصاب پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا پہلی بار اسے احساس ہوا۔ اچانک اسے بے انتہا تکان محسوس ہوئی۔

میز کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ درمیان میں بیٹھے شخص نے اسے بڑی شفقت سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ کرسی میں دھنس گیا۔ وہ لوگ اپنے سامنے کاغذات دیکھنے لگے۔ وہ ان کے حملوں کے شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تین پختہ عمر کے، تجربہ کار آدمی بہت

بڑے اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"اس سے پہلے آپ نے کہیں ملازمت کی ہے؟" ایک نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"کیا آپ شام کے اخبار پڑھتے ہیں؟" دوسرے شخص نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آج شام کے اخبار کی اہم خبر کیا تھی؟"

"کسی نے کسی کو چاقو مار دیا۔" نعیم نے جواب دیا۔

"کیا؟"

"کسی نے کسی کو چاقو مار دیا" نعیم نے اس کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب آج کی اہم خبر سے تھا۔

"شام کے اخبار میں اور کیا اہم خبر ہوتی ہے!" نعیم نے پوچھا۔

اس شخص نے اقوام متحدہ میں کسی تقریر کے متعلق کچھ بتایا۔

اسے کیا لینا اقوام متحدہ کی تقریروں سے۔ نعیم نے سوچا۔ ان لوگوں کے نزدیک پیشہ ور سیاست دانوں کے بیانات کی اتنی اہمیت ہے، اور آدمیوں کے مرنے جینے کی انہیں کوئی پرواہ نہیں۔

انہوں نے اس سے اس کے مشغلوں کے متعلق پوچھا۔ کھیل کی سندیں دیکھیں۔ رانچی ٹرافی کے

اسکور پوچھے۔ آسٹریلیا کی ٹینس ٹیم کے کھلاڑیوں کے نام پوچھے۔ وہ اکتا گیا۔ بھلا ملازمت سے ان باتوں کو کیا نسبت۔

"مہاراشٹرا کا گورنر کون ہے؟"

"مسز وجے لکشمی پنڈت"

"اس وقت کون ہے۔"

"وجے لکشمی پنڈت"

اس شخص نے بتایا کہ مسز وجے لکشمی پنڈت باہر گئی ہوئی ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں ہائیکورٹ کے چیف جسٹس گورنر کا عہدہ سنبھال رہے ہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

اٹھتے ہوئے اس نے تینوں آدمیوں کو دیکھا۔ نعیم کو وہ بھی کمرے کے فرنیچر کا ایک حصہ معلوم ہوئے۔

وہ باہر آگیا۔ باہر کی گرمی سے اس نے اپنے جسم میں کچھ توانائی محسوس کی۔ دماغ پر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا۔ اس نے خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

اس نے نیلوفر کے گھر جانے کا ارادہ کیا ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سوٹ میں خود کو کسی حد تک جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا بجائے نیلوفر کے گھر جانے کے وہ اپنے مکان پر آیا۔ سوٹ اتار ٹی شرٹ اور پتلون پہنی اور چپل پیروں میں ڈال کر باہر نکل آیا۔

ایک گھنٹہ بعد سمندر کنارے وہ نیلوفر کے ساتھ بیٹھے ہوئے بے حد سکون محسوس کر رہا تھا پھر وہی دنیا تھی وہی سمندر، اجلا اجلا نیلوفر اور دوسرے شخص یک بیک ایک الاؤ کا منظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا اسے خیال آیا کہ اسے اپنے آپ سے اپنے ماحول سے باہر نکل کر اس باہر کی دنیا میں اس کے اپنے پیمانوں کے مطابق اپنا مقام بنانا ہوگا ورنہ وقت کی گردش کے ساتھ اس کی اپنی دنیا کا تحلیل ہو جانا لازمی ہے۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے خود کو بے حد کمزور محسوس کیا، جیسے وہ ننھا سا، کمزور بچہ ہو۔ ہوا کے خنک جھونکے اس کے جسم پر یورش کر رہے تھے۔ وہ ان کی چبھن کو محسوس کرنے لگا۔

بے دست و پا

عتیق اللہ

۳ - مارگیٹ۔ اُجین

ایک کے بعد ایک خطرے کا نشاں
لال گہرا ——— لال ——— جس کے
ایک سو کھی اور کرخت کھوپڑی
بے زباں و بے نگاہ ——— بے حرکت اور صامت
نصب ہیں ہر اک زندہ مقبرے پر تختیاں
"داخلہ ممنوع ہے"

اور ادھر میں
اپنے تلووں کی مسلسل خارشوں سے اس قدر ہلکان ہوں
ناخنوں کی تیز دھاروں سے برابر نوچتا ہوں -
خون چشیدہ لذتوں کے لمبے لمبے اژدہے
کھردری ——— زہریلی ——— نوکیلی زباں سے کر رہے ہیں وار مجھ پر
بے سروپا خوف کے بدشکل سایوں نے مرا گھیراؤ کر رکھا ہے
اور ——— اب ان دائروں سے اک قدم باہر نکلنا
——— میرے قابو میں نہیں ہے

قمر اقبال۔ وزیر آباد۔ ناندیڑ

وہ بے لباس ہوا یوں کہ مجھ سے شرما کر
بدن کو ڈھانپ لیا گیسوؤں کو بکھرا کر
ہر ایک بات ادا کب ہوئی ہے لفظوں میں
کہ اس قدر بھی نہ الفاظ پر بھروسہ کر
نہ پوچھ قاصدِ کمسن پہ کتنا پیار آیا
ترا پیام دیا کل جو اس نے تتلا کر
کیا ہے خود کو نظر بند تو نے کیوں آخر
کبھی تو کھول کے کھڑکی گلی میں جھانکا کر
جو ہو سکے تو تمہیں توڑ دو یہ سب رشتے
کہ ہم تو ہار گئے اپنے دل کو سمجھا کر
کرو نہ ہم سے گناہ و ثواب کی باتیں
کہ جی رہے ہیں کسی طرح جی کو بہلا کر
جو ہاتھ گردنِ مہتاب تک قمرؔ پہنچا
الجھ گیا وہ ستاروں کے جال میں آ کر

بے داغ تصویر کے واسطے

ظہیر صدیقی
"جیون پرکاش" فریزر روڈ۔ پٹنہ-۱

ٹوٹتی
ریزہ ریزہ سمٹتی ہوئی
ساعتوں کی کوئی سطح سادہ نہیں
ایک وقفہ کا دامن بھی
دھبوں سے خالی نہیں
یہ نظر کا نہیں
اصل میں اک تضاد نظر کا کرشمہ ہے
ورنہ یہ اوراق مہتاب بھی
(جتنے لگتے ہیں)
اجلے نہیں
منہ کھلی اور لڑھکی ہوئی رات سے
لمحہ لمحہ بھبکتی ہوئی روشنائی
زیادہ سیہ ہے

وہی کوئلے
جب شروعات تقریب کے
دھیمے دھیمے سلگتے الاؤ میں جلنے لگیں
اس گھڑی
اور جب بیچ کے مرحلے میں دہکنے لگیں
اس گھڑی
اور جب ختم تقریب کی راکھ میں
آنکھ ملنے لگیں
اس گھڑی بھی
سفیدی کا خالص تصور نہیں

اپنی مرضی کی
بے داغ تصویر کے واسطے
کینوس
کوئی سادہ نہیں ●

اردو شاعری میں محسوسات اور جذبات کی
ہمہ رنگی تو بہت زیادہ رہی ہے لیکن فکر کا
عنصر نسبتاً بہت ہی کم رہا ہے۔ ہمارے شعرا
جہاں کئی دوسری خامیوں کا شکار رہے
وہیں مشاہدے تفکر اور سوچ بچار کی صلاحیت
کم رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے ذہنوں کو اپیل کرکے
نہ Inspire کر پائی۔ یہ بات میں نے غالب
اور اقبال کو علیحدہ رکھکر کہی ہے۔ اور اس
سلسلے میں وہ مستثنیات میں سے ہیں۔ غالب
حقیقتاً بہت بڑے شاعر تھے۔ وہ ایک ہمہ
گیر اور ساتھ ہی ارفع داخلی شخصیت کے
مالک تھے۔ انھوں نے مشاہدہ، احساس
تفکر اور تخیل کا ایک اونچی سطح سے انجذاب
کیا اور ان سب کا ایک خاص امتزاج
پیش کیا۔ اقبال کی شخصیت میں یہ توازن
برقرار نہ رہ سکا اور ان کی شاعری کا بہت
سارا حصہ ان کی فکر کی گراں باری کی نذر
ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ان کے بنے بنائے مخصوص
نظریوں نے چیزوں کو بس ایک ہی نقطۂ
نظر سے دیکھنا سکھا دیا۔ اور اسی لیے برخلاف
غالب ان کی فکر میں زندگی کی وسعت نہ
آ سکی۔

یہ بات چھیڑنی اس لئے ضروری تھی کہ قاضی
سلیم کی شاعری میں جو چیز سب سے پہلے
ہمیں متوجہ کرتی ہے وہ ہے ان کا تفکر یہاں

[illegible] شاعرانہ فکر نہیں بلکہ فرد
کو دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کی کوشش
ہے یعنی فلسفیانہ فکر۔ وہ محض محسوسات
کے شاعر نہیں، ان کے یہاں اپنی شکستوں
اور محرومیوں کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ اپنی جذباتی
زندگی کے مختلف رنگوں کو نظموں میں نہیں
بھرتے۔ ان کے یہاں ان کی اپنی ذات
کا غم قطعی نمایاں نہیں ہوتا لیکن یہ شاعری
غیر محسوساتی یا نری متفکرانہ نہیں۔ ان
کا تخلیقی عمل کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ
اطراف واکناف کا کوئی منظر یا حادثہ
ان کے احساس کو چھیڑتا ہے اور احساس
فکر کی لہروں کو جنم دیتا ہے۔ یہ فکر کی لہریں
نظریات و اصطلاحات کے روپ میں
نہیں بلکہ محاکات کے طور پر رونما ہوتی ہیں
اور وہ ان ہی محاکات کو لفظوں میں ڈھال
دیتے ہیں اور احساس فکر کی رگوں میں لہو
کی طرح دوڑتا رہتا ہے، انہیں حرکت و
توانائی عطا کرتا ہے اور یہی چیز تو تفکر
کو شاعری بناتی ہے ورنہ یوں تو وہ بس
منظوم فلسفہ ہو کر رہ جائے۔

قاضی سلیم کی شاعری ہمارے اپنے عہد کی شاعری
ہے۔ اس کا پس منظر ہمارا موجودہ دور، عصری
زندگی اور ہمارا گرد و پیش کا ماحول ہے۔
زندگی، سماج، دنیا، یہ سب ناقص ہیں۔

سید بشارت علی
لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا
کریم نگر، آندھرا پردیش

قاضی سلیم کوئی بنا بنایا، منضبط نظام فکر یا کوئی میکانکی، ڈھلا ڈھلایا نظریہ نہیں رکھتے۔ ان کا اپنا کوئی مسلک نہیں۔ ان کا ذہن غیر مشروط ہے وہ اپنے اطراف واکناف کو فکرمند آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی فکر تلنے بلنے بننا شروع کر دیتی ہے

قاضی سلیم کی انفرادیت، ان کے سوچنے کے ڈھنگ، موضوع کو جاننے اور گرفت میں لینے، تاثر اور فکر کے مختلف پہلوؤں ——— کا احاطہ کرنے، ان کے اظہار اور پیش کرنے کا انداز اور الفاظ اور زبان کا استعمال ان سب میں نمایاں ہے

قاضی سلیم کو الفاظ کی نئی جہتوں کا ان میں چھپی ندرت اور وسیع امکانات کا بھرپور ادراک ہے۔ ——— ——— ان کے مشاہدے، تخیل، فکر اور اظہار کا ایک خاص امتزاج اور اس کی پرواز کا احساس ہمیں ان کی شاعری میں ملتا ہے ——— جس کی اعلیٰ ترین مثال غالب کی شاعری ہے

چیزوں کو اب ان سے [illegible]
محسوس کرنا شروع کیا جس دن سے اس نے
سوچنا شروع کیا میر نے کہا ہے ؎

جب جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میر
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا ہوئے؟

لیکن زمانے کی خرابی کے دائمی ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے حیران ہونے کا وصف بھی دائم ہے اور انسان اپنی اپنی فکر صلاحیت، شعور و ادراک کے اعتبار سے حیران ہوتے رہے ہیں۔ لیکن حیرانی ہی سب کچھ نہیں ہوتی انسان ان خرابیوں کو دور بھی کرنا چاہتا ہے اور ایک فن کار کیلئے اس کا ذریعہ اس کا فن ہے۔ فن کار یا شاعر سماج سیوک یا سیاست داں نہیں ہوتا۔ وہ زندگی سماج اور ماحول پر تنقید کرتا ہے انہیں بہتر بنانے کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن یہ کام وہ ایک واعظ، خطیب یا ڈکٹیٹر کی حیثیت سے نہیں کرتا۔ وہ عمل کے لئے بھی نہیں اکساتا بلکہ وہ داخلی طور پر ہمارے دل کی دھڑکنوں کا ہم نوا ہو کر، ذہنوں کو جھنجھوڑ کر، ہماری فکر میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا ہے اور عمل ہمیشہ فکر ہی کے تابع ہوتا ہے۔

قاضی سلیم کی شاعری بھی اسی طرح ان کی ذات اور ماحول کی غیر ہم آہنگی اور تصادم سے جنم لیتی ہے۔ یہی غیر ہم آہنگی ان کے [illegible] کرب و اذیت میں مبتلا کرتی ہے [illegible] کے یہاں اس کرب و اذیت کا محسوسات و جذبات کی ہلچل اور ہنگاموں کا اظہار نہیں ملتا۔ ان کے یہاں نہ جذباتیت ہے نہ تلخی، وعظ و پند ہے نہ کوئی پیغام۔ اس کے برخلاف تفکر کی وہ فضا ملتی ہے جسے ان کے محسوسات اور ان کا کرب تخلیق کرتا ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کی فکر کس ڈھنگ کی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر کیا ہے یا وہ اپنے اطراف پھیلی زندگی، حادثوں، اشیاء اور ماحول کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

قاضی سلیم کوئی بنا بنایا، منضبط نظامِ فکر یا کوئی میکانیکی ڈھلا ڈھلایا نظریہ نہیں رکھتے۔ ان کا اپنا کوئی مسلک نہیں۔ ان کا ذہن غیر مشروط ہے۔ وہ اپنے اطراف و اکناف کو فکر مند آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کی فکر تانے بانے بننا شروع کر دیتی ہے۔ یہ فکر قطعی غیر میکانکی ہوتی ہے یہاں فکر کی ایک لہر دوسری لہر کو اور دوسری تیسری لہر کو جنم دیتی ہے۔ اور وہ بہت ساری لہروں کو اپنی گرفت میں اکثر بڑی کامیابی سے لے لیتے ہیں۔ یہ فکر ــــــ محاکاتی شکل میں ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی نظم میں مختلف

[illegible]
[illegible] موجودہ دنیا کا احساس ہوتا ہے
جس نے فکر کو گہرا اعتماد ان کی فکر کو اگر
کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ ہے تنقیدی
فکر یہ تنقید اس لئے کہ وہ ہمارے ماحول
کی ہمارے موجودہ عہد کی زندگی کی اصلاح
چاہتے ہیں۔

یہاں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارے اپنے
عہد میں خرابی کی شکل کیا ہے؟ ہماری دنیا
اور ہماری زندگی تضادات سے بھری پڑی
ہے۔ یہ بہت وسیع بھی ہے اور مختصر بھی
افراد لاچار و بے بس بھی ہیں، جابر و قادر
بھی ہم نے آبا و اجداد سے ورثہ میں کچھ
روایتیں بھی پائی ہیں۔ ہم نے بہت کچھ
روایت شکنی بھی کی ہے۔ ہم نے اپنی عقل
کے ذریعہ کائنات کو سمجھنے کی غیر معمولی
کوششیں کیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد
سے نئی نئی آسائشیں اور سہولتیں بھی
فراہم کی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم اپنی ایجاد
کردہ مشینوں کے غلام بھی ہو کر رہ گئے
ہیں۔ اور اپنی پرسکون زندگی میں خلل بھی
ڈالا ہے۔ اور میکانیکیت بھی پیدا کرلی
ہے۔ ہم نے مسلمہ عقائد و نظریات کو شکوک
نظروں سے دیکھا ہے۔ لیکن خود کوئی مستحکم
اور وسیع نظامِ فکر تخلیق نہ کر سکے ہمارے

[illegible] اور [illegible] کی [illegible]
کی حد فاصل بھی ٹوٹ چکی ہے۔
قاضی سلیم کی شاعری اس ناموافق ماحول
اور ان کی حساس ذات کے ٹکراؤ اور کشمکش
کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ان کی ذات شکست
و ریخت کی عجیب منزلوں سے گزرتی ہے۔
ان کے فہم و ادراک پر نئی نئی حقیقتیں منکشف
ہوتی ہیں۔ وہ خود کو بے یقینی اور تشکیک
کے بھنور میں پھنسا پاتے ہیں۔ زندگی
اور ذات لایعنی اور بے مصرف نظر آتے
ہیں۔ وقت اور فاصلے کی زنجیروں میں گھرے
ہونے کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اور ان
کی فکر گویا اس ناموزوں اور نامکمل دنیا کی
ان کے اپنے لئے تکمیل کر دیتی ہے اور یوں
وہ نفسیاتی طور پر اپنی نظموں کے ذریعے
اپنی ذات اور اپنی شخصیت کی تکمیل کر
پاتے ہیں۔ آئیے ان کی فکر کی چند لہروں کو دیکھتے
چلیں۔

آج بھی دیر تلک سنتا رہا
تانیے
ساعتیں
شام اور سحر
منزلیں کٹتی رہیں، وقت چلا
دھیرے دھیرے مری رگ رگ میں لہو کی گردش
دور و نزدیک کی بے درد کشاکش سے ملی
گھڑ گھڑاہٹ سے ہم آہنگ ہوئی

اک تھکا ہوا ہوں ———

اک ایسا تسلسل ہوں کہ جیسے کوئی معنی ہی نہیں
پچھلے جذبات سے ہر ضرب نئی ۔
ایسے مل جاتی ہے جیسے اس میں
کسی احساس کا فریاد کا وقفہ بھی نہیں ۔

●

وقت کا بوجھ
پتھر ملی چپ
اونچے اونچے پہاڑ
میں پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی گھاس پر
پتی پتی کی تحریر پڑھتا ہوں اسرار میں غرق ہوں

ایک چرواہا بھیڑوں کا گلہ لئے آ گیا
سبزہ زاروں پہ معصوم بھیڑیں بڑھیں ۔
دیکھتے دیکھتے
پتی پتی کی تحریر ———
——— اسرار سب چر گئیں

●

بارہا ایسی تنہائیوں میں
——— کہ جب تیرگی بول اٹھے
ذائقہ موسموں کا زباں پر یکایک بدل جائے
——— ہم سب یہی سوچتے ہیں
کہ شاید کوئی اور ہیں
مگر ——— کون
وقفۂ عمر میں کس نے سمجھا ہے

——— [illegible] کے منظر میں

●

اجنبی اجنبی دھند لو بہہ رہا ہے کہ جیسے
——— یہاں کوئی زندہ نہیں
جیسے اس قطعہ ارض کا حشر ہو بھی چکا
جانداروں کے پنجر سبھی کھو گئے
حسن بے جسم ہے
انگلیاں ہڈیوں کی سطح کھوجتی کھوجتی تھک گئیں
جیسے برگد کی پاربتیاں
قطرۂ آب کی آس میں
سوکھی بنجر زمیں کی طرف بڑھ رہی ہوں

●

ساری بستی ہے سہمی ہوئی
لوگ سب فلسفے
باندھ کر بھاگ اٹھے
مجھ پر اب کوئی ہنستا نہیں

●

اب یہ دھرتی میرے لئے
ایک شکستہ آمیز ہے
اس کی چکنا چور سطح پر ہاتھ پھرا کر دیکھو
خون کی دھارا بہہ نکلے گی

●

جس چیز نے عہد جدید میں یعنی نشاۃ ثانیہ کے
بعد انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر سب سے
زیادہ اثر ڈالا ہے وہ ہے سائنس اور ٹکنالوجی

[illegible]

تمام مستقل اور خدشوں سے کائنات
اور فطرت کو اپنی گرفت میں لے لینے کی جستجو
میں منہمک ہے۔ انسانی علم کا دائرہ روز
بروز پھیلتا جا رہا ہے تسخیر کائنات کے
امکانات بھی اسی اعتبار سے بڑھتے جا رہے
ہیں۔ لیکن سائنس کی لائی ہوئی برکتوں کے ساتھ
جو لعنتیں انسان کے نصیب میں آئی ہیں
وہ ایک سائنس داں نہیں بلکہ ایک فنکار
ایک شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ قاضی سلیم
کی ایک نظم ہے "وائرس" اس نظم میں دور
دیس سے ہمارے ساحلوں پر وائرس کے
آنے کا تذکرہ ہے یہاں دور دیس سے مراد
کوئی مخصوص دیس نہیں بلکہ عقلی سائنس
اور ہمارے ساحلوں سے مراد ہمارے ملک کے ساحل
نہیں بلکہ ہماری ساری دنیا اور زندگی ہے

سنا ہے دور دیس سے
کچھ ایسے وائرس ہمارے ساحلوں پہ آ گئے
جن کے تابکار سحر کے لیے
اجرت اور زہر ایک ہیں
اب کسی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں
کسی دوا کا درد سے کوئی واسطہ نہیں
ہم ہوا کی موج موج سے
درد کھینچتے ہیں چھوڑتے ہیں سانس کی طرح
لہو کی ایک بوند زخم بن گئی۔

یہ سب اس لیے ہوا کہ انسانی عقل اور علم نے
تعمیر کے ساتھ تخریب کو بھی جنم دیا۔ شاعر
مسیح وقت یعنی انسان کے ضمیر سے مخاطب ہے

مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا
دیار علم کے چراغ کا
کھلا بجھا بکھر گیا
دھواں دھواں بکھر گیا
سنو کہ چیختا ہے "کام - کام ---- کوئی کام"

اب مسیح وقت کے پاس کیا چارۂ کار رہ گیا ہے کیا
عملی اقدام کر سکتا ہے۔ شاعر دو ٹوک فیصلہ
سنا دیتا ہے:

کچھ نہیں۔
جاؤ ساحلوں کی سمت ہو سکے تو روک لو
اس نئے عذاب کو
یا خدا کی آخری شکست تک
سمندروں کی ریت چھانتے رہو۔

اور انسان ساحلوں پر وائرس کو روکنے کے
بجائے خدا کی آخری شکست ہونے تک
سمندروں کی ریت چھاننا پسند کرتا ہے

۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان لکھی ہوئی
قاضی سلیم کی ایک نظم ہے "پرواز" جس

[illegible] نیلے [illegible]
چلنے کی دعوت دی ہے اس لئے کہ
انجانی فردوس میں شاید اپنا بھی کچھ حصہ ہے
خوف وعقیدت کے پردے اور ہٹیں کچھ اور ہٹیں

اور ساتھ ہی زمین سے ناآسودگی:
اس دھرتی کے سینے پر
تاریک گڑھوں کے زخم ملے
رینگتے کیڑے، سانپ، دفینے، سرفضائیں، بند ہوا
کتنی ہا ہاکار مچی
کھوج میں سونے چاندی کی
پاتال تلک بیکار چلی
جو زہر تھا اپنا بانٹ چکے
اپنی اپنی لاشوں سے دھرتی کے گڑھے سب پاٹ چکے
نئے نئے ارمانوں کو ہے خواہش نئے مزاروں کی
یا کہ خلا میں کھینچ رہی چاہت چاند ستاروں کی
جو کچھ بھی ہو
آؤ پس دیوار چلیں
گہرے نیلے گنبد کے اس پار چلیں

اور جب گہرے نیلے گنبد کی اور انسان نے
پرواز کی، خوف وعقیدت کے پردے ہٹائے
تو انہوں نے آرم اسٹرانگ کے نام ایک نظم
لکھی:
سائنس دھرتی کی جیسے اکڑنے لگی
شش جہت میں گھٹاٹوپ اندھکار میں

[illegible]
بوجھل سی بھولی
— پوچھتی پھر رہی ہیں
راستہ کس طرف جا رہا ہے

....
خلاؤں کے بے آب ساگر تھے چلے آ رہے ہیں
خلاؤں کے بے آب ساگر میں ہم
— جیسے رم خوردہ بے پاؤں اور بے زمیں
چوکڑی بھر رہے ہیں
راستہ کس طرف جا رہا ہے

اب شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ یہ پرواز کا
نتیجہ بھی بے حاصلی ہی نکلا۔ وہ خدا کی زبانی
کہلواتا ہے:
زادِ رہ پھینک دو
اپنی بے حاصلی کے سبک ہاتھ پھیلاؤ"

انسان بہرحال اپنی فوقیت جتاتے ہوئے
جواب دیتا ہے:
"— جیسے فرشتے"
خدا کی سمت سے جواب ملتا ہے:
"ہاں فرشتوں کی مانند جو عرش سے فرش تک
آتے جاتے ہیں
— سب راستے
ساری سیمائیں جن کے لئے بے اثر ہیں"
تب جیسے ہمیں اپنی کوشش اور ظاہری فتح

قاضی سلیم کی انفرادیت ان کے سوچنے کے
ڈھنگ، موضوع کو جاننے اور گرفت میں
لینے، تاثر اور فکر کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ
کرنے، ان کے اظہار اور پیش کرنے کا
انداز اور الفاظ اور زبان کا استعمال‘
ان سب میں نمایاں ہے۔ وہ اپنے موضوع
کو بڑے ہی ہمہ گیر ڈھنگ سے اپناتے
اور نبھاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے
کہ ان کا کوئی بنا بنایا نظریہ نہیں‘ وہ کسی
ازم کو پیش نہیں کرتے وہ کسی خاص مسلک
کما پہنتے بھی نہیں۔ ان کے موضوعات‘
ان کی نظموں میں معامیت کو چھوڑ کر بڑی
وسیع فضا میں سانس لیتے ہیں۔ سوائے ایک
نظم "ٹورسٹ" کے جس کا ایک حصہ ہے:

کھنڈر کھنڈر تلاش کر چکے
سب خزانے ختم ہو گئے
تمہارے میوزیم میں سج گئے
—— اب ہمارے پاس کچھ نہیں
سپیرے راجے جادوگر
ایما انڈیا کا ہسٹری نشان بن گئے

—

اس کے برخلاف فسادات کے موضوع پر جو
نظم ہے "اس جہنم میں" اس میں انہوں نے
مذہب اور خدا کے ساتھ بے پایاں عقیدت

[illegible] انسان کی فطرت کی تفسیر
مذاہب کے افسانوں سے مبہم مماثلت اور
بعض کا وقت اور مقام دونوں سے بلند
ہو کر جائزہ لیا ہے دیکھئے،

سینکڑوں اجداد گذرے
عقابی پیتلیوں سے کوئی خلیہ
اس زمیں کے اندھے جوہڑ میں گرا تھا
تبھی شاید وہ سب کچھ کھو چکا تھا
سینکڑوں اجداد گذرے
سب پریشاں ہیں
اسے کس نے چھپایا ہے
ہر اک کو یہ گماں ہے دوسرے نے
اپنے سینے میں چھپا کر رکھ لیا ہے
سبھی کی آنکھیں کھوکھلے ناخنوں کے کاسوں میں
چھپکلی کی اک کٹی دم کی طرح
تڑپتی پھڑپھڑاتی ہیں
تبھی تو شہر میں ہلچل مچی ہے
گلی میں شور بڑھتا جا رہا ہے
"جلا دو —— پھونک دو —— نابود کر ڈالو
چیر دو ہر جسم ——
اندر جھانک کر دیکھو
سڑک پر خون بہتا ہے
اسے چکھو
خدا کا ذائقہ شاید ملے گا

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قاضی سلیم کی نظموں

[illegible] مختلف محاکات [illegible]
طرح ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مختلف محاکات
کوئی منطقی یا میکانیکی ربط نہیں رکھتے اور
اُردو میں یوں تو نظموں کا سرمایہ کچھ کم نہیں ہے
لیکن ہماری نظمیں جہاں اچھی نظم کی کمی کا
خوبیاں نہیں رکھتیں وہیں ان میں یہ عیب
بھی پایا جاتا ہے کہ وہ پلان بنا کر ریاضت
اور منتخب محاکات Fixed Images
کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ اس صورت میں
یہی ہوتا ہے کہ موضوع کی کھلی فضا اور ورمزیت
نظم میں پوری طرح اجاگر نہیں ہو پاتی۔
اور نظم بیانیہ طرز اظہار کا نمونہ ہو کر رہ
جاتی ہے۔

اس سلسلے میں آیئے ہم قاضی سلیم کی ایک
نظم "نوحہ" دیکھتے چلیں جو انہوں نے ایک
معصوم بچے کی موت کے سانحے پر لکھی ہے۔
اس نظم میں شاعر خود تو بہت کم بولتا ہے اور
محاکات خود بولتے چلے جاتے ہیں۔ اور نظم
کو بڑی اشاراتی بناتے ہیں۔ موضوع کی
رمزیت اور وسعت دونوں نظم میں سمو دی
گئی ہیں۔

عذاب!
کس قدر عذاب!!
عود کا دھواں بکھر گیا
لوگ آئے اور چلے گئے
—— پھر شے [illegible]
جسمِ کی سلگتی آنچ سے

اب نظم کا مرکزی کردار یعنی بچہ اور پھر اس کی ماں
ابھرتی ہے:

کروڑوں سال کا یہ سلسلہ
اور اس میں ایک سال بیسویں صدی کے بیچ
ایک سال
—— صرف ایک سال! اس کو کیوں ملا؟
کیوں وہ آیا کس لئے
عذاب
کس قدر عذاب
تو نے کیوں پلایا دودھ اپنا۔
—— اب اسی کے زہر سے
سبز ہوگا انگ انگ، بال سب سفید ہوں گے
—— تیرے پیار سے ابلتے خون میں
سنپولے رینگ آئیں گے
کس نے لکھ دیا تھا لوح پر
تیری ہی کماں سے نکلے تیر سے
سینہ تیرا زخم کھائے
—— کس نے لکھ دیا تھا لوح پر

اور پھر عدم کی کائنات اور ان تمام لوگوں
کا کارواں ابل پڑتا ہے جو عالم ارواح میں
بستے ہیں:

[illegible]

غار عدم پورسے میں سب چلے
غار عدم پورسے میں پھل اپنی اپنی روح کا
گلے لگا کے چلے
دھواں دھواں سے لوگ آسماں سے پرے
عرش کی بلندیوں پہ اپنی اپنی لاش اٹھائے
لے چلے
اور وجود و عدم، حیات و موت کا اتصال:
کروڑوں سال کے وہ فاصلے
ایک پل میں مل گئے
زمیں کے اس نئے شگاف سے
دیکھنا ہو دیکھ لو
چراغ لاؤ سب ذرا ذرا سی مٹی ہاتھوں میں
لئے بڑھو

آؤ دیکھ لو
باپ کو بلاؤ وہ بھی دیکھ لے
باپ کو بلاؤ وہ خدا کا اک رسول ہے۔
دیکھ لے
وہ بھی دیکھ لے
وہ فرشتہ جا رہا ہے
دکھوں کی آخری وحی جو لایا تھا
——— وہ جا رہا ہے دیکھ لے
اس کا کام ختم ہو گیا
لوگو جلدی جلدی اپنے کام پورے کر لو گھر چلو
ہم جیسے خود عدم میں پہنچ گئے ہوں اور اپنے

[illegible] چلے گئے ہوں جیسے یہ سطح
کی زندگی کی تگ و دو، یہ رنگا رنگ ہماہمی
اور کائنات کی بوقلمونیاں گویا سب کا
کھوکھلا پن، ان کی بے کیفی اور ان کی فنا
ہم پر منکشف ہو گئی لیکن بہت جلد ہم پھر زمین پر
لوٹ آتے ہیں۔ گورکنوں کی تکرار ہمیں جھنجھوڑ
کر عرش سے فرش پر لا پٹکتی ہے:
ہم زمیں سے دور ——— دیر تک
کیسے رہ سکیں گے ——— لو سنو
"عمر ایک سال ہی سہی ہم کو کیا
آستانۂ حضور شاہ کی
تین فٹ جگہ تو گھر گئی
کل کسی بڑے کی قبر کے ہمیں
پچاس ملتے ——— چپ رہو
فاتحہ پڑھو ———
عذاب!
کس قدر عذاب!!

قاضی سلیم کی شاعری میں نئے اور انوکھے
استعاروں کا استعمال ملتا ہے۔ ہماری قدیم
شاعری میں مروجہ تشبیہوں، استعاروں
اور علامتوں کو اپنائے رکھنے کی روایت
اس قدر زیادہ رہی ہے کہ ساری شاعری
کی فضا گھٹی گھٹی سی محسوس ہوتی ہے۔ اور
اور ساتھ ہی عام بول چال کی کھلی اور سادہ
زبان اور پرتکلف شاعرانہ زبان میں بہت

زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ جیسے شعرا نے بڑے پیمانے پر اس جمود کو توڑا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جدید شاعری بھی کلی طور پر خامیوں سے مبرا نہیں۔ جدید شاعروں کے گروہ میں ذاتی اپج رکھنے والوں سے کہیں زیادہ چند برگزیدہ شاعروں کے نقالوں کی بھیڑ بھاڑ زیادہ نظر آتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کے تخلیق کردہ نئے استعارے، علامتیں اور اصطلاحیں بھی گویا روایت کی طرح اپنائی جا رہی ہیں۔ جہاں تک قاضی سلیم کا تعلق ہے وہ اس مرحلے پر بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ جہاں تک علامتوں کے استعمال کا تعلق ہے وہ ان کی اپنی تخلیق کردہ ہیں لیکن ان کی علامتیں مغلق یا ناقابل فہم نہیں ان کی نظموں کی فضا خود ان کی علامتوں کی ترسیل کرتی ہے اور زبان کی حد تک انہوں نے دوسرے جدید شاعروں کی طرح اردو شاعری کی محدود اور پر تکلف شاعرانہ زبان کے استعمال سے انحراف کیا ہے۔ بظاہر ان کی زبان اکھڑی اکھڑی سی نامانوس محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ زبان ہمیں ان موضوعات سے اس قدر قریب کر دیتی ہے کہ ہم ان کی تمام ترکیفیتوں کو بے اختیار اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ اس لئے ان کی زبان اور الفاظ کا استعمال ان کے مزاج سے ہم آہنگ اور ان کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ شاعری فنون لطیفہ میں شمار کی جاتی ہے اور فنون لطیفہ کی بنیاد حسن پر ہے یا کم از کم ان میں حسن کا عنصر شامل رہتا ہے۔ اگرچہ کہ وہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ شاعر کو خود اپنی زبان میں حسن پیدا کرنا ہوتا ہے چاہے وہ اپنے طور پر کسی ڈھنگ سے زبان کا استعمال کرے اور قاضی سلیم کو الفاظ کی نئی جہتوں کا، ان میں چھپی رمزیت اور وسیع امکانات کا بھرپور ادراک ہے اور ساتھ ہی ان کے مشاہدے تخیل، فکر اور اظہار کا ایک خاص امتزاج اور اس کی پرواز کا احساس ہمیں ان کی شاعری میں ملتا ہے جس کی اعلیٰ ترین مثال غالب کی شاعری ہے۔ عظیم شاعری، شاعری کے تمام بنیادی عناصر اپنے اندر خاص تناسب اور ترفع میں سمائے رکھتی ہے اور قاضی سلیم کی شاعری میں اس مقام تک پہنچنے کے لئے وسیع تر امکانات موجود ہیں۔

عطا صدیقی

۳۷ - کوٹھی روڈ - اجین

قہقہہ زیست کے ہر غم پہ لگایا جائے
خود کو اتنا بھی نہ سنجیدہ بنایا جائے

اپنے ماضی پہ بہت ناز ہے اب تک ان کو
وقت کو حال کا آئینہ دکھایا جائے

تلخیٔ زیست کے ہم نے تو پئے جام بہت
زندگی آج تجھے زہر پلایا جائے

دیکھے صورت جو کوئی تو اسے آ جائے ترس
غم کے معیار کو اتنا نہ گرایا جائے

غور کیجے تو حقیقت کی جھلک ہے ان میں
میری باتوں کو ہنسی میں نہ اڑایا جائے

آئے نظر حسین وہ منظر سمیٹ لے
کاغذ پہ اس کا نقش بنا کر سمیٹ لے

خالی نہ رہنے پائے ترا دامنِ خلوص
یاروں نے جو چبھوئے ہیں نشتر سمیٹ لے

فردا کے آسماں پہ پھیلا دے شفق نئی
ماضی کی داستاں کا دفتر سمیٹ لے

بکھرے پڑے ہوئے ہیں جو تخلیق کے گہر
تو اپنے لاشعور سے چن کر سمیٹ لے

آئے جو تیرے بعد نہ ٹھوکر اسے لگے
حائل جو راہ میں ہیں وہ پتھر سمیٹ لے

یہ نیلی نیند کا جادو
نیا کردار اک پردے پہ ابھرا
یہ خوش آئند مستقبل کا ضامن ہے
یہ چہروں کی دکانیں
یہاں سے راستے بے راہ ہو کر
خود میں واپس لوٹ جاتے ہیں
ہوا کے ناخنوں پر نیل پالش لگ چکی ہے
صحیفوں کی یہ مالا وقت کی گردن
مرے تلوے کے نیچے گہری کھائی ہے
ادھر بائیں طرف اک پیڑ کا مندر
ہزاروں ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے
اُدھر وہ سامنے
ڈیڑھ اینٹوں کی مسجد بنی ہے
بس اک پتلی گلی ہے بیچ میں
دونوں طرف جس میں دکانیں ہیں
سیاہ و سرخ اُجلے
گوشت کے بت بک رہے ہیں
لذیذ انگور کا رس چھت کی ہڈی سے ٹپکتا ہے

[illegible]
[illegible] ہے پیٹ میں اس کے ایک کا منہ ہے
جہاں تقریریں بنتی ہیں
یہاں سورج سوا نیزے پہ اترا ہے
یہاں سب سوکھتے جاتے ہیں
گندم، آدمی، کرسی، لہو وعدے
یہ اچھا شہر ہے اس شہر میں آدم نہیں کوئی
تکمن اک لال سا
اس شہر کے ماتھے پہ رکھا ہے
یہاں جھنڈوں کی آبادی ہے
یہاں ہر راستے پر موڑ پر جھنڈے ہی ملتے ہیں
یہ قبرستان ہے اس کا مجاور
(نحیف و ناتواں ضعف قویٰ سے)
اپنے لمبے ناخنوں سے
کربِ تنہائی گھٹنوں کو چاٹتا ہے
آگلتا ہے مگر سورج کے ٹکڑے
غلامی ایک لعنت ہے
یہ نافہمی یہ تفہیماتِ غالب"
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں
چلو واپس کسی رستے کی صورت
ہم اپنے آپ ہی میں لوٹ جائیں
ہماری خوشبوئیں ہم کو بلاتی ہیں

پلر نام نظم
۳- جان نگر دوسری لین۔ کلکتہ-۱۴

تخلیق: کرشن بلدیو وید

اردو عکس: عشرت ظہیر

سعدیہ دواخانہ

باری روڈ۔ گیا

...ے پہل کی تھی اور یہ کہ اس چیز کی گمشدگی

اور اس کی تلاش شروع کر دی۔ ممکن ہے کمی کا احساس

اور تلاش کی شروعات یکایک نہ ہوئی ہو۔ لیکن اس

میں کوئی شک نہیں کہ تلاش کے پہلے دور میں وہ ایک دوسرے

کی نظر بچا کر الگ الگ اس چیز کے لئے بے چین رہے

جس سے یہ اندازہ لگا لینا شاید غلط نہ ہو کہ ان

دنوں میں انہیں اس چیز کے گم ہو جانے کا اتنا ہی

غم تھا جتنا اسے گم کر ڈالنے کے لئے ایک دوسرے

کے مجرم ٹھہرائے جانے کا خوف ویسے اندازے

اور بھی لگائے جا سکتے ہیں مثلاً یہ کہ ان میں سے

ہر ایک دوسرے پر یہ ثابت کر دکھانا چاہتا تھا

کہ وہ چیز گم کسی کی بھی غفلت سے کیوں نہ ہوئی

ہوئی اسے پھر سے کھوج نکالنے کا اہم اور مشکل

کام اسی نے کیا تھا یا یہ کہ وہ اپنی تلاش کو ایک

دوسرے سے خفیہ اس لئے رکھ رہے تھے کہ

مل جانے پر چپ چاپ اس چیز کو اپنے پاس رکھ

لیں۔ بہر حال تلاش کا پہلا دور خفیہ تو تھا لیکن

خوفناک نہیں تھا اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ

جلد یا بدیر وہ چیز انہیں مل ہی جائے گی۔ چنانچہ

ان میں سے ایک جب گھر میں نہیں ہوتا، کسی

کام یا سوچ میں ڈوبا ہوا ہوتا۔ اپنے کمرے

میں بند ہوتا، سو رہا ہوتا، بیمار یا بدحواس

ہوتا تو دوسرا دبے پاؤں اس چیز کو ادھر

اُدھر ٹٹولتا رہتا، لیکن ظاہر ہے کہ تلاش کا

یہ طریقہ ادھورا تھا۔ عام طور پر عورت کا یہ

وطیرہ رہا تھا کہ وہ کسی بھی گمشدہ چیز کی تلاش

میں سدا گھر الٹ پلٹ کر ڈالتی اور اس وقت

تلاش

چھین لیتی نہ لینے دیتی جب تک وہ چیز اسے مل نہ
جاتی یا اس کے بدلے میں ویسی ہی کوئی چیز اور
اور مرد کی عادت تھی کہ کسی بھی چیز کے گم ہوتے
ہی اس کے ہوش وحواس بھی ساتھ ہی گم ہو جاتے
اور اس وقت تک گھر سر پر اٹھائے رکھتا جب تک
کھوئی ہوئی چیز مل نہ جاتی۔ اب وہ دونوں اپنی
اپنی عادت کے برعکس خاموشی سے اس چیز کو
ڈھونڈ رہے تھے اور اس لئے اور زیادہ چوکنے
تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے ان کی احتیاط کم
ہوتی گئی۔ اب مرد اگر باہر ہوتا تو عورت سارا
سامان الٹ پلٹ کر ڈالتی اور کوشش کرتی
کہ اس کی واپسی سے پہلے اسے پھر سے سنوار
دے۔ عورت کہیں گئی ہوتی تو مرد مکان کا کونا کونا
چھان ڈالتا اور کوشش کرتا کہ اس کی واپسی سے
پہلے سامان کو سمیٹ لے۔ اور اب دونوں کوشش
کرتے کہ دوسرا زیادہ سے زیادہ دیر تک گھر سے
باہر رہے۔ عورت مرد کو گھر سے باہر بھیجنے کے
بہانے تراشتی رہتی اور مرد وں کو کبھی بیمار ہونے
کا بہانہ بنا کر ان میں ایک گھر بیٹھ جاتا تو دوسرا
اندر ہی اندر اس بہانے سے جھنجھلاتا رہتا۔
کبھی رات کو اندھیرے میں ایک دوسرے کو
سوتا سمجھ کر اندھیرے میں دھیرے دھیرے
تلاش شروع کر دیتا۔ آہٹ ہو جاتی تو پیاس
یا پیشاب کا بہانہ پیش کر دیتا۔ الگ الگ بستر
میں پڑے وہ رات بھر کروٹیں بدلتے رہتے
گویا اب دونوں کو شک ہونے لگا تھا کہ دوسرا

تھا [illegible]
ان کی باہمی خاموشی اور بھی گہری ہوتی [illegible]
گئی۔ اگر کوئی ان سے ملنے آ جاتا تو وہ کسی [illegible]
ذکر پاتے۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی
کہ دوسرے کو بیٹھک میں بٹھا چھوڑ کر جلدی
سے دوسرے کمروں کی تلاشی لے آئے۔
اور ان کے دوست اکثر انہیں چھیڑتے، کہتے
تم اتنے چپ چاپ کیوں رہنے لگے ہو، خیریت
تو ہے؟ خانہ جنگی تو نہیں ہو رہی ہے؟—
اور وہ ان مذاقوں پر مناسب طریقے مسکرا
بھی نہ پاتے، اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی
الٹ پلٹ کی ہوئی چیزوں کو لے کر ان میں
تکرار ہو جاتی، ان کا آپس کا شک آنکھوں
تک امڈ آتا۔ اب الماریوں اور دروازوں کے
پٹ بالکل کھلے رہنے لگے تھے سوٹ کیس ادھر
ادھر بکھرے رہتے۔ بستر بیٹھک اور کرسیاں
اکھڑی ہوئی رہتیں، کتابیں الٹی سیدھی
لیٹی رہتیں، کوٹوں کی جیبیں باہر نکلی رہتیں
اور دروازوں کے جبڑے کھلے رہتے۔ قالینوں
میں شکنیں پڑی رہتیں۔ کپڑے پاؤں سے
الجھتے رہتے۔ برتن ٹھوکریں کھاتے رہتے،
محسوس ہوتا گھر میں سے ابھی ابھی کوئی چور
نکل کر گیا ہے۔ لیکن اب نہ وہ شکایت کرتے
نہ ایک دوسرے کے شک کی پرواہ، اب
وہ ایک دوسرے کے لئے تنہا رہنے کے لمحات
مہیا کرتے، اکثر ہوتا یہ کہ مرد ایک کمرے میں

[illegible]
تھا۔ پھر ایک دن مرد نے محسوس کیا شاید
عورت نے مرد کو آسانی کے لئے ٹال لیا جائے
کہ عورت نے مرد کو اندھیری سیڑھیوں میں
سے جھانکتے ہوئے کسی چیز کی طرف ایک ٹک دیکھتے
دیکھ لیا، چند لمحے وہ خاموش کھڑی رہی اور
جب وہ جھک کر اس چیز کو اٹھا ہی رہا تھا تو
آہستہ سے بولی: "مل گئی کیا؟" اور مرد چونک کر
سیدھا ہو گیا۔ لیکن اس کی ایک مٹھی بند دیکھ کر
عورت نے اپنی بے قرار انگلیوں سے کھول دیا
اور مرد کی کانپتی ہتھیلی پر رسی کا ایک کسمساتا
سانپ دیکھ کر ہنس پڑی اور مرد نے ایڑیاں
اٹھا کر اس رسی کو اتنے زور سے زمین پر دے
مارا جیسے کوئی گندا گلاس توڑ رہا ہو۔ عورت کے
ہونٹ اس کے دانتوں پر سمٹ آئے اور ان کی
تلاش کا نیا دور شروع ہو گیا۔ وہ مکان کو آپس
میں بانٹ لیتے اور کھولتی ہوئی خاموشی میں ڈوبے
اپنے اپنے حصے کی تلاش لیتے رہتے۔ تھک جاتے
تو بیٹھ کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے
جیسے وہاں بھی اسی چیز کو ڈھونڈ رہے ہوں۔
پھر اٹھ کر ایک دوسرے کے گرد نظریں
دوڑاتے اور تلاش دوبارہ شروع ہو جاتی۔
اندھیرا ہو جانے پر ساری بتیاں ایک ساتھ
جلا دی جاتیں۔ بلب ننگے کر دیئے جاتے اور
گھر میں رات بھر آگ سا جگمگاتا رہتا اور دن
بھر ان کی آنکھوں میں انگارے سے دہکتے رہتے

[illegible]
دیوانے میں بھٹک رہے ہوں۔ اب کبھی تو وہ
سارے سامان کو قرینے سے سنوار کر رکھ دیتے
اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کونوں میں جھانکتے اور
کبھی سب کچھ سمیٹ کر ایک جگہ ڈھیر لگا دیتے
اور پھر اس ڈھیر کو ادھیڑنا شروع کر دیتے۔
کبھی انہیں ہو جاتا کہ اب وہ چیز ملے گی ہی نہیں
اور اب تو ان کی آنکھوں میں کرب بھی دکھائی
دیتا ہے، لیکن وہ اس بے یقینی کو زیادہ دیر
زندہ نہ رہنے دیتے، سوچتے ملے گی، کیسے نہیں
اگر تھی تو یہیں کہیں ہو گی اور ان کی آنکھیں
پھر بے باک ہو اٹھتیں۔ اب ان کے یہاں
کوئی آتا نہ وہ کسی کے یہاں جاتے، لیکن
اگر کہیں جانا ضروری ہو جاتا تو ان میں سے
کوئی ایک بہانہ بنا کر پیچھے رہ جاتا اور دوسرا
اسی بہانے کے سہارے جلدی لوٹ آتا
اور ان میں جو جتنی دیر گھر سے باہر ہوتا گم صم
سا ہوتا۔ لیکن اچانک سب کے سامنے اپنے
جیبوں یا بٹوے کی تلاشی لینے لگتا یا کھڑا
ہو کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگتا۔ دوسرے حیران
ہوتے اور اس طرح آہستہ آہستہ یہ بات
پھیلنے لگی کہ ان دونوں کو کسی لاعلاج وہم نے
دبوچ لیا ہے۔ وہ اکثر اپنے اپنے کام سے غیر
حاضر رہنے لگے اور جاتے بھی تو کھوئے کھوئے
سے اسی چیز کے بارے میں سوچتے رہتے اور
کام یوں ہی پڑا رہتا۔ کسی سے کوئی بات نہ

کرتے تو انہیں لگتا جیسے اب وہ سب بھی انہیں
دور سے دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتے۔ اور
اور دوسروں کے درمیان ہونے پر بھی وہ
اکیلے اور اپنے اپنے میں سمٹے رہنے لگے۔
ایک دن انہیں نوکری سے بھی ایک ساتھ جواب
مل گیا اور ان کا سارا وقت اسی چیز کی تلاش
میں صرف ہونے لگا۔ ابھی تک ان کی تلاش
میں صرف ہونے لگا۔ ابھی تک ان کی تلاش
مکان تک محدود تھی۔ اب اکثر ان میں سے
ایک مکان کے اندر بھٹک رہا ہوتا تو دوسرا
باہر لان کو روندتا ہوتا۔ ہمسائے حیران ہوتے
مگر کوئی پوچھنے کی ہمت نہ کرتا۔ اب مرد کی داڑھی
بڑھی رہتی عورت کے بال بکھرے رہتے، دونوں
کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی رہتیں، ان کی
آنکھیں ہمیشہ نیچے کی طرف جھکی رہتیں،
کپڑے شکنوں سے آلودہ رہتے اور کمرے قریب
قریب کباڑ خانہ۔ اور پھر وہ مکان سے دور
ان راستوں اور گلیوں میں بھٹکتے ہوئے نظر
آنے لگے، جہاں پہلے وہ سیر کیا یا کسی کام سے
جایا کرتے تھے۔ اب انہیں شبہ تھا کہ ضروری
نہیں کہ وہ چیز گھر میں یا گھر کے آس پاس ہی
گم ہوئی ہو۔ اور اب آوارہ بچوں کی ٹولیاں
ان کا پیچھا کرنے لگیں کیونکہ افواہ پھیل چکی تھی
کہ وہ دونوں بالکل باولے ہو گئے ہیں۔ ان کی
تلاش کا آخری دور تب شروع ہوا جب ایک
روز مرد نے عورت سے یا شاید عورت نے مرد سے

[illegible]
کرتے [illegible]
بھی چھپی ہو سکتی ہے۔ اور [illegible]
سے ادھر ادھر مڑ مڑ کے دیکھتے [illegible]
پرانے دوستوں، واقف کاروں [illegible]
کے گھروں میں چوری چھپے گھسنے کی کوششیں
میں لگے رہتے ہیں۔ کئی بار پکڑے جا چکے ہیں، کئی
بار پٹ بھی چکے ہیں۔ لیکن باز نہیں آتے۔ اور
جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کیا ڈھونڈ
رہے ہیں تو کچھ بتا نہیں پاتے اور اب حالت
یہ ہو گئی ہے کہ انہیں اس چیز کا نام تک یاد
نہیں اور اب اسے وہ بیان کرنے کی کوشش
کرتے ہیں تو ان کے منہ سے کچھ مہمل آوازوں
کے سوا کچھ نہیں نکلتا جس سے شاید ہی اندازہ
لگایا جائے گا وہ چیز کبھی ان کے پاس
تھی بھی یا نہیں۔ لیکن ان کی تلاش جاری ہے
حالانکہ اب کوشش یہ کی جا رہی کہ کسی روز
انہیں پکڑ کر کسی پاگل خانے میں ڈال دیا جائے
دیکھئے کیا ہوتا ہے...... !! ـــ

بے چین راتوں کی آہٹ

امیر عارفی
شوکت منزل - دودھ پور - علی گڑھ
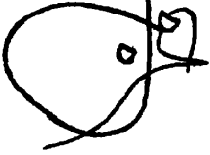
میری بات کو سن لے گوری
میں ہوں کالی رات !
رات میں کتنے راز چھپے ہیں
بات میں کتنی بات
اپنے دل کو تھام ذرا تو
کھلے نہ کوئی راز ؟
کیا کب سے پوچھ رہا ہوں
غصہ تھوک کے کچھ تو بول !
کوئی نہیں ہے پاس ترے اب
کہہ دے دل کی بات
کتنے لمحے ملے ہیں تجھ کو
کام میں ان کو لا
صبح کے ہونے سے پہلے ہی
اپنے دل کی بات بتا !
رونے سے کیا ہوگا گوری
گذرے گی جب رات !
میں دل کا سناٹا ہوں
بکھرا تو پھر آؤں نہ ہات !

منیر کوٹی - سیتا پور - یوپی

رات بھر ہم مزار شب میں رہے
صبح - میدان حشر میں نکلے
دن کے صحرا میں کانپتا سورج
یخ زدہ دھوپ منجمد سائے
سارا ماحول فکر میں غلطاں
فلسفی وقت ، سوچتے لمحے
پھر وہی خواب دیکھ لیں نہ کہیں
ہم اسی ڈر سے رات بھر جاگے
جب یہ دنیا نہ سن سکی ہم کو
اپنی آواز ہی میں ڈوب گئے

فیض الحسن

توسط مظہر عالم صاحب، محلہ موتی ہاری (بہار)

مجھے دیکھو کہ میں اک آئینہ ہوں
مجھے سمجھو میں خود ہی فلسفہ ہوں
گھنے سایوں میں بھی جلتا رہا ہوں
سمندر پی کے بھی تشنہ کھڑا ہوں
کہیں سے روشنی مجھ کو صدا دے
فصیلِ شب پہ میں تنہا کھڑا ہوں
زمیں پر مثلِ اوراقِ پریشاں
جدھر دیکھو ادھر بکھرا پڑا ہوں
حصارِ خامشی کو توڑ کر اب
صداؤں کے سحر میں گھر گیا ہوں
پڑا ہوں وقت کے ملبے میں کب سے
اٹھا لو مجھ کو جنسِ بے بہا ہوں
نہ جانے کن گناہوں کا ہے بدلہ
کہ پھر اک بار سولی پر چڑھا ہوں

محمود عشقی

وزیر آباد۔ ناندیڑ (مہاراشٹرا)

خوف سے جسم ہو چکا ہے تر
امتحان اور آگیا سر پر
گھر میں بستر لگا ہوا ہے مگر
اونگھتا پھر رہا ہوں سڑکوں پر
مجھ کو پتھر نے کہہ دیا اندھا
چلتے چلتے جو لگ گئی ٹھوکر
کاٹ کر زندگی کی ڈوری کو
میرے پہلو میں چھپ گیا خنجر
موقلم کی ذرا سی جنبش سے
ایک پل میں بگڑ گیا منظر
سب میں کمزوریاں تھیں پوشیدہ
صرف جھنڈے پہ گیا اختر
ہو گئے اہلِ شہر میرے خلاف
گشت میں ہے شکایتی محضر

پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔

میں پوچھتا ہوں، اس بچہ کا باپ کون ہے۔

خاموشی!

تم ـــ وہ بچہ تمہارا ہے۔

خاموشی۔ دھواں ہی دھواں۔

تم اپرادھی ہو، تمہیں اس کی سزا ملنی ہی چاہیئے۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا گزر گیا۔ کھڑکی کے نیلے پھول لرز گئے۔ پھر ایک لمبا کش، پھر دھواں پھیل گیا۔

دھواں ـــ دھواں

نیلو کبھی دتا پرکاش کے بستر کی زینت بنا [illegible] پلنگ کی ـــ اور کبھی ہم دونوں کے [illegible] دو دو سرے بہار بن کر ہمارے گلوں میں [illegible] گئی۔

اس وقت ہم کتے بن جاتے۔ ایک دوسرے کی باری کا انتظار کرنے لگتے۔ بالکل کتوں کے مانند ہم ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے لگتے۔ ایک دوسرے کو کاٹ کھاتے

ہرگز نہیں۔ مجھ پر جھوٹا الزام تھوپا جا رہا ہے۔ میں نے کوئی اپرادھ نہیں کیا۔ اور پھر اپرادھ کس شئے کا نام ہے، میں نہیں جانتا۔ بلکہ کوئی نہیں جانتا۔ بغیر سوچے سمجھے ہم اپرادھی بن جاتے ہیں۔ اپرادھی بنائے جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہم سب اپرادھی ہیں اور ہم سب معصوم، جن سے کبھی کوئی اپرادھ سرزد نہیں ہو سکتا۔

پھر خاموشی ـــ ہوا کا جھونکا ـــ نیلے پھولوں پر کوئی اثر نہیں۔

پھر وہ بچہ ـــ ؟؟؟

میں نہیں جانتا وہ کس کا بچہ ہے، کون اس بچہ کا باپ ہے۔

وہ ملہی بے آب کی طرح تڑپنے، مچلنے لگتی ـــ اور پھر مستی میں آکر کسی بے باک کتیا کی طرح بھونکنے لگتی۔

سچ تو یہ ہے، ہم ...... ہی تو ہیں۔ ہم نے اپنے چہروں پر نقاب ڈال رکھی ہے۔ ہر نقاب کا رنگ ایک ہی ہے ـــ شرافت! شرافت ـــ یہ تو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ اور ورثہ میں ملی چیز سب کو عزیز ہوتی ہے!

میں اور دتا پرکاش بے حد شریف آدمی ہیں۔ شرافت کا خون ہماری رگوں میں دوڑتا ہے۔ ہماری بات میں وزن ہوتا ہے۔ قول و عمل میں تضاد ممکن نہیں ـــ!

پھر وہ بچہ ـــ ؟؟؟

اوس کے ننھے ننھے قطرے نیلی نیلی پنکھڑیوں پر موتی کے مانند چمکنے لگے۔ کچھ قطرے زرد دانوں سے گزر کر نیلے پھول

[illegible] پھر وہ [illegible] بیٹھ

جبھی تو وہ مجھ سے ملنے آتا تھا۔

بیلا شراب پیتی ہے تو پیتی ہے ــــ اور مستی میں اکثر
اناپ شناپ بکنے لگتی۔

"میں تم سے پیار کرتی ہوں.... اصغر سے بھی....
تم دونوں میری زندگی ہو... تمہارے علاوہ مجھے
کوئی چھو نہیں سکتا..... وہ معصوم راہب بھی
نہیں، جو مغرب کے راستے میرے گھر آتا ہے...
بہت دیر تک بیٹھتا ہے... مجھے درس دیتا ہے

ڈاکٹر صاحب بے حد شریف آدمی ہے۔ شریف لوگ
کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ سچ سنتا ہے اور سچ ہی
بولتا ہے ــــ۔
دھواں ــــ ایش ٹرے ــــ دھواں... !
میں بھی شریف النفس ہوں۔ میں بھی سچ سنتا
ہوں اور سچ ہی بولتا ہوں!
بچے کے باپ کا نام ــــ؟؟
پھر سگریٹ نے دم توڑ دیا اور نیلے پھول خاموش
دیکھتے رہے!

مجھے دین اور دنیا سمجھاتا ہے۔ پند و نصیحت کرتا ہے
..... کہہ رہا تھا میرے ساتھ پلنگ پر سو جاؤ...
جانتے ہو میں نے کیا کہا ــــ ؟؟ آہاہا۔ ہا۔ میں نے
دھکے مار اسے باہر نکال دیا۔ پوچھو کیوں ــــ ؟ نہیں!
... وہ بہت ڈرپوک ہے..... ڈرپوک چوہا ہے۔
وہ صرف مغرب سے آتا ہے۔ تمہاری طرح مشرق
سے نہیں آتا۔ وہ تمہاری طرح بے باک نہیں۔ ہاہا
... اور... اور... اور میں اس کے ساتھ کس طرح
سو سکتی جبکہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں...
... بتاؤ۔ بتاؤ"
اس کا شراب پی کر جھومنا ہماری شرافت کو کالک
لگنے کے لئے کافی ہوتا ہے، لیکن ــــ!

ہاں ــــ کل میں دتا پرکاش سے ملتا ہوں۔ اس
کے سامنے دونوں سچ رکھتا ہوں۔ اس کا ایک
اور میرا ایک ــــ اور اس سے کہتا ہوں تو بھی
سچا ہے اور میں بھی سچ تو پھر رکھ دے بچے کے
باپ کا نام!!

سلطان شمیم
۶۳-۱۱-۱ نزد صدر ڈاکخانہ
اورنگ آباد
(مہاراشٹرا)

تماشہ

روز ہنستے زخم سہہ لیں
گوہرِ سیال رو لیں
روح کے اندھے کنوئیں میں
یاد کی کنکریاں پھینکیں
دل کا دامانِ دریدہ
درد کے کانٹوں سے سی لیں
نت نئے چہرے سجا کر
زندگی کا ڈھونگ رچا لیں
کچھ نہ کر سکنے کے غم میں
زہرِ جاں کا جام پی لیں
روز مر لیں، روز جی لیں!!

ظفر غوری
۲۴۴ - اعظم بلڈنگ
سرائے کائستھان
کوٹہ - راجستھان

تن کا لباس پاؤں کا جوتا پھٹا ہوا
ہر شخص ہے غبارِ سفر سے اٹا ہوا
ہر نقش اپنے آپ میں ہے نقشِ ناتمام
خانوں میں آج کل ہے ہر انسان بٹا ہوا
بادل کے رتھ میں سیر کناں بنتِ آفتاب
رنگوں کی دھوپ چھاؤں سے بن ہے پٹا ہوا
کب آئے وہ جہاز ادھر راہ بھول کر
تنہا ہے یہ جزیرہ زمیں سے کٹا ہوا
محسوس ہو رہا ہے وہ تنہائی کا خلاء
رہتا تھا کوئی جسم میں جاں سے سٹا ہوا
آیا تھا وہ بھی توڑ کے اپنے وجود کو
مرکز سے اپنے میں بھی ظفر تھا ہٹا ہوا

حیدرآباد کے علمی خزانے

حباب آفرید
دواخانہ مخدومیہ ۔ دھوبن کی مسجد ۔ آغاپورہ ۔ حیدرآباد

کسی بھی شہر کو دیکھنے کا صحیح طریقہ میرے خیال میں یہ ہے کہ وہاں کی پیدل خاک چھانی جائے اور کوچہ و بازار کی سیر کی جائے ۔ یہ ذوق میں اکثر ان لوگوں میں دیکھتا ہوں جو "فارنرز" کہلاتے ہیں اور ہمارے شہر میں عجیب سا حلیہ بنائے گھومتے نظر آتے ہیں ۔ ان کے گلوں میں کیمرے پڑے ہوتے ہیں ۔ بعض تنہا بعض ہمیم دربغل ۔ یہ زندہ دل سیاح بازاروں کی تاریخی عمارتوں کی اور دکن کے ماتمی جلوسوں کی تصویریں اتارتے ہیں گلیاری سے شاہ راہوں تک میں نے انہیں گزرتے دیکھا ہے یہ لوگ سیاحت کا اصلی لطف اٹھاتے ہیں برخلاف اس کے اگر کوئی ہوائی اڈہ یا نامپلی اسٹیشن پیا اتر کر شہرت یافتہ مہمان نوازی کا شکار ہو جائے وہ کام و دہن کو لذت یاب کر سکتا ہے ۔ فراٹے بھرتی موٹر میں شہر کی وسعتوں پر طائرانہ نظر ڈال سکتا ہے لیکن اس غریب مسافر کو کیسے معلوم ہو کہ یہاں کے علمی دماغ کدھر رہتے تھے اور اب کہاں آسودہ ہیں ۔ یہ طریقہ سیاحت سے محروم اور ذائقوں سے زیادہ قریب آشنا کر دیتا ہے ۔ اور ایسے مسافر بعض اوقات اپنے میزبان کی ذہنیت کا شکار ہو جاتے ہیں ۔

حیدرآباد میں صغر خاں کے طویلے سے ملحق (جہاں اس وقت دلی دربار ہوٹل ہے) مختار کرمانی کی پان کی دکان تھی ۔ مختار کرمانی ایک عالم اور صاحب تصنیف باپ (مولوی محمد منظور صاحب قبلہ مرحوم لکچرر اورنگ آباد انٹر کالج) کے صاحبزادے تھے اور یہ پانوں کی دکان کیا تھی اچھا خاصا علمی حلقہ تھا ۔ مدینہ ۔ صدق ' ترجمان القرآن

اور سید احمد ودی کا لٹریچر اسی دکان پر ملتا تھا۔
علمی بحثیں ہوتی تھیں۔ ادبی رسائل نکالنے کے
منصوبے باندھے جاتے تھے۔ ادیبوں شاعروں
کے علاوہ خوش باشوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔
یہاں دن رات آنے والوں میں ابراہیم جلیس
سرور ڈنڈا، شاہد صدیقی، سلیمان اریب،
مس اعشرت، وحید اللہ خاں (ہاشم علی خاں
جج کے بھائی) ثروت رضوی، رئیس الدین
فریدی، احمد علی علوی، کوشل، شراج ڈیجر
ملاپ) اور ابن علی (نائب کوتوال تھے (یہ محفوظ
علی صاحب کے فرزند تھے جو مولانا محمد علی جوہر
کے اخبار ہمدرد میں مزاحیہ کالم لکھا کرتے
تھے۔) ۱۹۴۶ء میں ماہنامہ "ایوان" کا اجرا
اسی جگہ سے عمل میں آیا تھا جسے احمد مکی اڈٹ
کرتے رہتے تھے اس رسالے نے ۴۹ء میں ادا کار
نمبر "سلشہ" میں حیدرآباد نمبر نکالا تھا۔
یہ رسالہ ۱۹۵۳ء تک سالناموں کے ساتھ
مسلسل جاری رہا۔ گویا احمد مکی اس ادبی حلقہ
کے روح رواں تھے۔ جہاں رات کے ایک ایک دو
دو بجے تک مباحث اور علمی سرگرمیاں رہا کرتی
تھیں۔ مجردگاہ کی بالائی منزلوں سے وحشی علیگ
اور مسلم ضیائی بچوں کا ماہنامہ "تارے" نکالا کرتے
تھے اور اعجاز صدیقی (براز یل آرٹیکل والے)
جھوم جھوم کر جگر صاحب کے شعر سنایا کرتے
تھے۔ وحشی بکری کی طرح پان چباتے صورت
سے اسم با مسمیٰ اور ناک میں بولا کرتے

[illegible]
کا اندازہ ہوتا تھا۔ بلکہ [illegible]
انہیں غضب تھے مسلم ضیائی نے [illegible] پیا
فائل مجھے پڑھنے کو دیا تھا۔ جو برسوں بعد میں نے
ملتا جیسے میں نے ان کی خواہش پر قبلہ جوش
صاحب کے حوالہ کر دیا تھا جبکہ وہ پہلی مرتبہ
پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد آئے ہوئے تھے
جگر صاحب مرحوم اپنی وضع کے ایسے پابند
تھے کہ جب کبھی حیدرآباد آنا ہوتا' اعجاز صدیقی
کے گھر دتر پ بازار کے سوا کہیں نہ ٹھہرتے
اکثر براز یل میں نشست رہتی اسی تعلق
کی بنا پر ازراہ تفنن اعجاز صاحب مرحوم کو
میں "لخت جگر" سے مخاطب کیا کرتا تھا اور وہ
خوش ہوتے تھے۔ جگر صاحب کے انتقال
کے بعد مذاقاً ایک دن میں نے اعجاز صدیقی
سے کہا تھا کہ "جگر روڈ" اصل میں اس روڈ
کا نام ہونا چاہیے جہاں آپ کا گھر ہے مجھے
کیا معلوم تھا کہ واقعی ایسا ہو جائے گا۔ بغرض
معظم جاہی مارکٹ کے گرد و نواح میں ابو
الحسنی صاحب سبزی (سشن جج) معلوم علی
صاحب والی صاحب "مکاتیب بین السلطنۃ"
کیسی کیسی پاکیزہ صورتیں رہا کرتی تھیں۔ اب
ان صورتوں کو نظریں ڈھونڈتی ہیں۔ یہ شہر
علماء، فضلاء، شرفاء، شعراء۔ صوفیا، حکما
عرفاء کا جیتا جاگتا دیار تھا۔ خدا جانے اسے
کس کی نظر لگ گئی۔

داغ نے کہا تھا کہ

"خانے کے جہاں میں یہ بھی سرکار دکن"

اقبال نے کہا تھا کہ

"نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں"

اور امیر مینائی نے دعا دی تھی کہ

"یہ شہر بنام حیدرآباد رہے"

اب اس شہر کی آبادی منتشر ہے زیادہ تر اس مخلوق پر جس کے ورود نے حیدرآباد پر "اُدھر ہوائیت" کی گہری چھاپ لگائی تاہم کچھ مقامات رہ گئے ہیں کہ جنہیں دست برد زمانہ سے محفوظ کہا جا سکتا ہے۔ اگر آپ "چھتہ بازار" کی سیر کریں، وہاں اب جس جگہ "شفاخانہ عیسیٰ" ہے مطبع حیدری اور کتب خانہ حیدری تھا اس کے مالک آغا ابوالقاسم (ایرانی) تھے جو سٹی کالج میں پہلے فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ مطبع سے "حیدری جنتری" نکالتے اور کنگ کوٹھی میں صیغہ نکاح جاری کرتے تھے۔ اور آگے چلئے بائیں طرف مکتبہ ترابیہ ملے گا جس کے مالک تراب علی صاحب فارسی میں شعر کہتے ہیں نطقی تخلص کرتے ہیں اور "بزم سعدی" کے رکن ہیں۔ منڈی میر عالم کی سمت مڑنے پر نواب عنایت جنگ مرحوم کے مکان "حسینیہ" میں لب سڑک ایک بورڈ پر "دارالمطالعہ وکتب خانہ حسینی" لکھا ہوتا۔ اس کے

سے ملحقہ "تہور جنگ" کی یادیں وابستہ تھیں۔ نواب تہور جنگ ریاست کے امیر اور آصفجاہ سابع کے اتالیق تھے ان کے دونوں بیٹے دونوں شہزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ (عنایت جنگ شہزادہ برار کے اور رشید جنگ شہزادہ شجیع کے اتالیق رہے) تہور جنگ اور ان کے بیٹے عنایت جنگ کی موت پر رشک آتا ہے کہ ان باپ بیٹوں نے حالت مرض میں دکن کو چھوڑا اور ارض کربلا میں جا کر ابدی نیند سو گئے۔

چھتہ سے بائیں جانب ندی کے کنارے کنارے چلئے ایک زندہ ہستی "صمصام شیرازی" کی ملے گی۔ ان کا جریدہ "شیراز" ہفت روزہ برسوں نکلا کیا۔ اس جریدہ میں اعلیٰ اخلاقی مضامین، بہترین سائنسی معلومات اور دنیا بھر کی اہم خبروں کے علاوہ آصفجاہ سابع کے مختلف النوع مضامین بکثرت شائع ہوتے تھے۔ دوسرے معنوں میں اس جریدہ کو شاہانہ سرپرستی حاصل تھی۔ "یادگار سلور جوبلی اور حیدرآباد کے جاگیردار" ان کا شیرازی کارنامہ ہیں۔

"مکتبہ ابراہیمیہ" کی ایک زمانہ میں نہ صرف شہر بلکہ ہندوستان بھر میں دھوم تھی یہ زمانے تک عابد روڈ پر قائم رہا۔ اب اس جگہ

[illegible]

کے مالک مولوی عبدالحق اردو کے دوسرے
عبدالحق تھے۔ نام بھی ملتا ہوا اور کام بھی
ایک جیسا۔ ذی علم ایسے کہ مکتبہ کبھی خالی نہ ہے گاہک
آئے نہ آئے مطالعہ جاری۔ پانوں کی ڈبیہ
بٹوہ میز پر اور عینک سے جھانکتی ہوئی
آنکھیں کتاب پر لگی رہتی تھیں۔ فقر کی تعلیم
وجدی شاہ نے انہیں ایسی دی کہ لاکھوں
ہی کمایا، کٹوری ایک نہ رکھی۔ ان کے مطبع نے
اُردو و فارسی کی نہ معلوم کتنی کتابیں چھاپیں
پولس ایکشن کے بعد انتہائی عسرت میں اور
ایک مدت حالت مرض میں بسر کی لیکن کسی
پڑوسی کو حال کی اطلاع نہ ہونے دی اور
اس عالم میں جو کچھ پاس رہا مہمان نوازی
میں صرف کرتے رہے۔ آغاپورہ میں رہا
کرتے تھے۔ یہیں میں ایک رات بمبئی کے
قلندر "عارف بابا" سے ملا تھا۔ جو ان کے مہمان
تھے عارف علیگڑھ کے گریجویٹ اور رامپور
کے متوطن تھے۔ کچھ دنوں بعد دارالترجمہ میں
بھی کام کیا۔ لیکن اپنی وارفتہ مزاجی کی بدولت
دنیا کی آلائشوں سے جلد چھٹکارا پالیا۔
مے نوشی کی بدولت ان کا شمار "خرابات کے
اولیائے کرام" میں ہوتا تھا۔ یہ ہر وقت
سرشار رہا کرتے تھے۔ بمبئی ان کا مستقر ہو
گیا تھا، وزیر ہوٹل بھنڈی بازار میں صبح
شام نشست رکھتے تھے۔ چند سال قبل [illegible]

[illegible] بر محل ہے۔

• حق مغفرت کرے [illegible]

غرض مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد کا پہلا
دارالاشاعت تھا جس نے ڈاکٹر زور، پروفیسر
عبدالقادر سروری، پروفیسر سید محمد، فضل
الرحمٰن پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
اور نصیر الدین ہاشمی وغیرہم کی تصانیف کو
سب سے پہلے شائع کیا۔

میرا جب بمبئی جانا ہوتا، صبح شام ان سے
ملاقاتیں رہتیں۔ حیدرآباد میں بادشاہ کے استعمال
کی ہر شئے "خاصہ" کی چیز کہلاتی تھی۔ خاصہ
کی پنسل دوسری جگہ کے بجائے اسی مکتبہ سے
جایا کرتی تھی۔ اب یہ مکتبہ معظم جاہی مارکٹ
کے قریب پیشاوری میوہ فروش کی دوکان
کے متصل ہے، وہی شوکیس وہی کتابیں نہ بزنس
نہ گاہک لیکن مکتبہ کا وجود برقرار اور دوکان کا
کرایہ جاری۔ جب تک میاں ضیاء الحق ادارہ
رہنمائے دکن سے منسلک نہ ہوئے تھے آکر مکتبہ
کھول لیتے اور رات میں بند کر کے چلے جاتے۔ آج
بھی مکتبہ کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ ضیاء الحق
نے یہ ذمہ داری پھالیہ فروش کو سونپ دی
ہے۔ کبھی کبھار خود بھی آجایا کرتے ہیں۔

میرے ایک دوست کے گھر میں انگریزی

[illegible] کتاب بکڈپو
دیکھ کر یہ پا کیں تو اس کا نام "تذکرہ [illegible]"
رکھ دیا جائے۔

اتوار کے اتوار آپ کو یہاں عابد روڈ سے چار مینار
اور لاڈ بازار تک کتابوں کا طویل بازار ملے گا۔
بند دکانوں کے سامنے سینکڑوں ہزاروں
کتابیں بیک نظر دیکھی جا سکتی ہیں جنھیں
سلیقے سے جاکر رکھا جاتا ہے۔ آندھرا بنک
و سلطان بازار کے روبرو حد نظر تک یہ
بازار ہر روز لگا رہتا ہے۔ آج کل انگریزی
کتابوں کا زور ہے، کہیں کہیں اردو کتابیں
دکھائی دیتی ہیں۔

حبیب نگر کے چوراہے سے بائیں جانب داہنے
ہاتھ پر "اردو گشتی کتب خانہ" ملے گا جسے میر
بشیر احمد نے اولاً ۱۹۲۵ء میں مالگزاری روڈ
پر قائم کیا تھا۔ اس زمانہ میں بشیر صاحب ممبروں
کے گھر پر کتاب پہنچایا کرتے تھے اور اس کتب
خانہ میں دکن کے پچاس سالہ روزنامہ "رہنمائے
دکن" کا پندرہ بیس سالہ فائیل مکمل موجود تھا۔
کوئی دس برس سے ان کا کتب خانہ حبیب نگر
میں ہے اور پچاس ساٹھ ممبر استفادہ کرتے ہیں۔

اسی محلہ میں ٹیک کی مسجد سے قریب عبداللہ
رشدی کتب فروش تھے۔ یہ موزشس کے امام مانے
جاتے تھے وہیں انتقال کیا۔ کھانا بہت
خوب پکاتے اور لباس نفیس وعمدہ پہنتے تھے۔
مسجد میں جمعہ کو خطبہ دیتے اور نماز پڑھاتے
تھے۔ کئی زبانوں کے ماہر اور اردو کے ادیب
وشاعر تھے۔ سیماب اکبرآبادی کی نظم "مہ اعظم"
کا جواب "شہاب ثاقب" لکھ کر چھپوایا تھا۔
مشاعروں میں کم جایا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ راجہ پرتاب گیر کے
محل میں (جہاں اب کان اور حلق کا دواخانہ
ہے) ایک مشاعرہ تھا، ہم ساتھ گئے تھے۔
ان کا سنایا ہوا یہ شعر جو بہت زیادہ پسند کیا گیا
تھا میرے حافظہ میں آج تک تازہ ہے ۔

خون ناحق رنگ لائے گا بہ شکل انتقام
غیرت حق جوش میں آکر الٹ دیگی نقاب

رام کرشنا تھیٹر کے سامنے ایک اردو کتب خانہ
اور مطالعہ گھر ہے جو حیدرآباد کے بزرگ تاریخ
داں اور اردو کے محسن، جناب ہارون
خاں شیروانی کی تحریک پر ۱۹۶۰ء میں حکومت
کی جانب سے قائم کیا گیا۔ یہاں اردو کی
چار ہزار کتابیں ہیں۔ مہربان حسین صاحب
لائبریرین اور احمد خاں صاحب چوکیدار
ہیں۔ یہ کتب خانہ دو گھنٹہ صبح اور دو گھنٹہ
شام کھلتا ہے۔ البتہ اتوار کے دن
اس کے اوقات بڑھا دیئے جاتے ہیں صبح ۹
سے بارہ اور شام ۴ سے ۸ ۔ ●●

نذیر اختر

چوک بازار - ناندیڑ

آنکھیں بجھی بجھی سی دل لخت لخت دیکھ
خوابوں نے میرے کھائی کہاں پر شکست دیکھ

کچھ دیر بیٹھ، اپنی سنا، میرا حال پوچھ
یوں بار بار اپنی گھڑی میں نہ وقت دیکھ

سورج لہو کی جھیل میں پھر غرق ہو گیا
پھر آئی شام میرے لیے خوں بدست دیکھ

خوابوں کے برف زار میں تجھ کو ملے گا کیا
سر پھوڑنا ہے تجھ کو کوئی سنگ سخت دیکھ!

ہیں میری خواہشات طلبگار جسم کی!
تو ہے مجسمہ تو کوئی بت پرست دیکھ!

پھر گاگروں کی تھاپ پہ اٹھنے لگے ہیں گیت!
جھولوں سے ہیں سجے ہوئے سارے درخت دیکھ

دشمن کی بد کلامی پہ کیوں ہے بری بھلا
لہجے سے بھی تیرا بھی لہجہ کرخت دیکھ

غزل

احتشام اختر

شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی.
علی گڑھ

نیلے گگن پر
کالا دھواں پھر
پھیل گیا ہے
جھیل میں کوئی عکس نہیں ہے
دھوپ نہیں اب آتی گھر میں
چاند اور سورج قتل ہوتے ہیں
امن کی باتیں کرنے والے
اپنے گھر کے آنگن میں پھر
لمبی قبریں کھود رہے ہیں
آنے والے کل کی ہیبت
اور خود اپنے خون کا رشتہ
دفن کریں گے

سلیم شہزاد

نشاط بک سنٹر، قدوائی روڈ، مالے گاؤں

جکڑ رہے ہیں مرے ہی پھیلائے جال مجھ کو
خلاؤں میں لے چلا ہے میرا زوال مجھ کو

چڑھی ہوئی ہے ندی نہ ٹک اب تو ڈوبنے دے
بدلتے ساحل، یوں آج کل پر نہ ٹال مجھ کو

بشا وشا پھیل جاؤں گا تو زرکہ چھٹ نہیں
دبا سکے گا نہ زخم کا اندمال مجھ کو

گپھاؤں میں تن کی، وہ ندگی جاگنے لگی ہے
بنوں میں بھٹکا رہے ہیں وحشی غزال مجھ کو

میں اپنی منزل کا فاصلہ بھی نہ جان پایا
لگے ہیں اب تک ہزار ہا نوری سال مجھ کو

کہیں تراش کا ناگ آ کر نہ بیٹھ جائے
دبا خزانہ ہوں آس کا، آ نکال مجھ کو

صدف ہوں میں بے گہر تجھے کیوں ہوس ہے میری
کبھی کسی موج میں، سمندر اچھال مجھ کو

گلی پرانی تھی وہ مگر اس نئی گلی میں
بدل ہی دینی پڑی سلیم اپنی چال مجھ کو

دکھا کے رنگیں صدف نہ یوں آزماؤ مجھ کو
سمندروں کی کہانیاں مت سناؤ مجھ کو

خیال ہوں، رہ نوردِ لاسمت ہوں ازل سے
محیط کیا کر سکو گی تم اے دشاؤ مجھ کو

ندی کنارے کی ریت، کھیتوں کی گیلی مٹی
ہے یاد اس کے بدن کا، ابتک کساؤ مجھ کو

مرے مقابل ہیں میرے اپنے بنائے سورج
چھپا لو اپنی سیاہیوں میں گپھاؤ مجھ کو

اکیلے پن میں خموشیوں سے کرو نہ باتیں
میں ہوں تمہارے ہی ہیت کا گیت گاؤ مجھ کو

چھپا ہے سرگوشیوں میں بس ایک نام میرا
نہ میرے پردے میں یوں مجھی سے چھپاؤ مجھ کو

کہیں گرا دو کہ اڑ چکی ہے ہوس کی رنگت
لیے پھرو گی کہاں کہاں اے ہواؤ مجھ کو

سلیم اس جل پری کی یادیں نہ پھر ستائیں
سمندروں کی کہانیاں مت سناؤ مجھ کو

غزلیں

میگی کے ہونٹ بہت خوبصورت ہیں،

وہ جب بات کرتی ہے تو میں اس کی باتوں

کی خوبصورتی پر کبھی بھی دھیان نہیں دیتا

بلکہ صرف اس دائرہ کو دیکھتا ہوں جو میگی

کے ہونٹوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دل

میں پتہ نہیں چپکے سے یہ خیال کیوں آجاتا

ہے کہ اپنے ہونٹ میگی کے ہونٹوں پر

رکھ دوں شاید اس کے دل کے سمندر

میں میرے لئے کوئی ارتعاش پیدا ہو ــــ

فیروز عابد

معرفت محمد قاسم مودی

۱۲/۱۴ پٹوار بگان لین۔ کلکتہ

ویسے یہ بات نہیں کہ میگی مجھے اپنے آپ کو آفر

نہیں کرے گی ــــ

میگی آوارہ ہے

میگی فاحشہ ہے

میگی رنڈی ہے ــ !

لیکن نہ میں میگی کو آفر کرتا ہوں نہ میگی مجھے

آفر کرتی ہے کیونکہ ہم ایک ہی فلیٹ کے

الگ الگ کمرے میں رہتے ہیں۔ اس لئے

فلیٹ کی کا رشتہ آڑے آتا ہے ــــ

اس قسم [illegible]

سوچتا ہوں میگی پر ایک کہانی لکھوں کہ

کیا لکھوں گا وہی نا جو اوپر کہہ چکا ہوں۔

یا یہ کہ میگی اینگلو انڈین ہے اس کی ایک بہن

بھی تھی جولیا۔ اس کا ایک عاشق بھی

تھا ولیم ــــ ایک دن ولیم نے شراب کے

نشہ میں دھت میگی کے اتنے بوسے

اتنے بوسے کہ میگی نڈھال ہو کر سو گئی

تھی اور آنسوؤں کے بیچ اس نے کہا تھا۔

"تم مجھے اتنا چاہتے ہو؟ اتنا ــــ"

اور دوسرے دن جب میگی دفتر سے لوٹی

تو اس نے اپنے کمرے میں آہٹ کے ساتھ

آوازیں بھی سنی تھیں۔ اور جب Key

Hole سے جھانک کر دیکھا تھا تو وہ ساکت

رہ گئی تھی، ولیم جولیا کے ساتھ.......

اور پھر اسی رات وہ اپنے آفس کے باس

کے ساتھ جس کی وہ اسٹینوگرافر تھی ننگی سوئی

تھی۔ اور اور

میگی فاحشہ ہو گئی۔

بہت پرانی ہے یہ کہانی ایسا تو ہوتا ہی

رہتا ہے اور اس کا حل بھی کیا ہے ــــ

"ہلو رائٹر، کیا سوچ رہے ہو ــــ" یہ

مسٹر زمن کی آواز ہے ــــ مسٹر زمن اسی

فلیٹ کے تیسرے کمرے میں رہتا ہے۔ آج

کھردیاں ـــــ ویران ـــــ لکیروں

کی نصیب میں ـــــ

"مسٹر دین کھردرا، نرم، باسلیقہ اور بے سلیقہ تمام ہتھیلیوں سے نقاب الٹتا رہتا ہے ـــــ افلاس، بیماری اور دکھ کو کھرچنے کی تدبیریں بتاتا ہے ـــــ مگر خود وہ میگی کے پیار میں سلگتا رہتا ہے۔ یہ جان کر بھی کہ

آج ایک سارواڑی سیٹھ دے گیا ہے۔ وہ بیچنا اپنی کھردری ہتھیلی پر روپے کا درخت اگانا چاہتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا "ہندوستان اور پاکستان میں جنگ کب ہوگی کیونکہ ابھی سے اسے بے بی فوڈ کو گودام میں بند کرنا ہے ـــــ وہ یہ جانتا ہے کہ ہر شخص اپنے مستقبل کا تحفظ چاہتا ہے۔ ننھا بچہ بھی تو باپ کا مستقبل ہے۔ اس کی بقا کے لئے وہ دس روپے کا بے بی فوڈ بیس پچیس

میگی آوارہ ہے ـــــ وہ میگی کے پیار کو کبھی بھی اپنے دل سے کھرچ نہیں سکتا ـــــ وہ اکثر تنہائی میں سسک سسک کر روتا ہے اور کہتا ہے "او گاڈ وہاٹ اے ہل آئی ایم ـــــ پلیز ہیلپ می، ہیلپ می ـــــ میگی میگی ـــــ" چاہت میں نفرت اور نفرت میں چاہت یہ مسٹر دین کا دل ہے ـــــ "کیا بات ہے کہانی کار تم کیوں اداس ہو ـــــ مگر نہیں تم کو تو اداس رہنا ہی ہوگا ورنہ اداسیوں کی نقاب

میں ضرور خریدے گا ـــــ اس کو میں نے پرسوں بلایا ہے۔ وہ مجھے سو روپے دے گا Three Castle کا یہ پیکٹ دے گا اور انگلش برانڈی کی ایک بوتل دے گا ـــــ اس نے میری ہتھیلی پر روپے کا بیج بو دیا تاکہ موقع دیکھ کر اسے اکھاڑ لے ـــــ پیوگے برانڈی، اسٹوری رائٹر ـــــ آؤ اپنے کمرے سے ـــــ اس کی بات میرے دل کو چھو کر گذر گئی لیکن دل نے اسے اپنے دریچے میں منتقل نہیں کیا کیونکہ

مارواڑی سیٹھ کا کام ہی ہے دولت کو سمیٹنا
—— دنیا کی سب سے امیر قوم یہودی ہے اور
ہندوستان کی مارواڑی —— اور اگر ایک
مارواڑی نے ایسا سوچا تو کیا برا کیا —— دولت
تو اس کی رگوں کا خون ہے ——

میری سوچ نے کمرہ میں سناٹا کر رکھا تھا کہ ایک
دروازہ پر کسی کی دستک نے سوچ پر مسٹر من کی
موجودگی کی چادر اڑھا دی۔

"کم ان پلیز ——"

"آئیے مسٹر ابے بنرجی کیسے ہیں؟ ——"

"بھالو آچھی (اچھا ہوں) ——" اس نے ایک
پمفلٹ میرے سامنے پھینکتے ہوئے کہا ——
عجیب مغرور اور حاکمانہ لہجہ تھا ابے کا ——
"کالی پوجور چاندہ نیتے کیو استے چھیلو' دیبے نا
ایک پویشا دیبے نا (کالی پوجا کا چندہ لینے کوئی
آیا تھا' مت دینا ایک پیسہ بھی مت دینا)
—— پتہ نہیں ابے بنرجی کس روم میں یہ کہہ
رہا تھا۔

ابے بنرجی میرے مالک مکان آشو بنرجی کا لڑکا
ہے —— آشو بنرجی ہمارے علاقہ کا ایم ایل
اے ہے۔ آشو بنرجی کے سات لڑکے ہیں اور دو
لڑکیاں ——

آشو بنرجی ایم ایل اے ہے یعنی سیاسی رہنما
اس کے لڑکے پتہ نہیں سیاست سے واقف

بھی کیا [illegible]
دیکھے تا اس کا [illegible]
پیسہ بھی چندہ مت دینا پالیٹکس ہو تو
—— یہی لڑکا درگا پوجا کے موقع پر کیسے
زبردستی مجھ سے بطور چندہ کے لے گیا تھا
اور آج ایسی بات کہہ رہا ہے گویا درگا دیوی
تھی اور کالی دیوی نہیں —— سوچتا ہوں
سیاست میں ماں بہن کی بھی تمیز نہیں رہتی ہوگی
میرا خیال ہے پہچان کی زندگی میں یہ اپنا پیچ
قائم کئے ہوئے ہے۔ آشو بنرجی پہلے علاقہ کا
کونسلر تھا اور آج ایم ایل اے ہے —— اس کے
ساتوں لڑکے زندگی کی ہر خوشی سے واقف ہیں
—— رات کے اندھیرے میں چوری کی خوشی
زنا بالجبر کی خوشی، شراب کا دھندہ کرنے
والوں سے شراب حاصل کرنے کی خوشی۔
—— قتل کی خوشی۔ معاشی بدحالی کو فروغ
کی خوشی اور اسی قسم کی ان گنت خوشیوں
سے وہ گلے ملتے آئے ہیں —— سیاست
کیا ہے —— ؟ کیا بات ہے اسٹوری رائٹر
کیا تم پر آج سوچ کی وحی نازل ہو رہی ہے
—— میں نے دیکھا مسٹر من Three
Castle انگلیوں میں دبائے تھا لیجئے
جا چکا تھا اور اس کا پھینکا ہوا پمفلٹ میری
گود میں پڑا تھا۔
لے جاؤ مسٹر من اس پمفلٹ کو اپنے سا
چپکا دو اسے کسی تھیلی کی تصویر کے بغل میں

بیتی ہوئی [illegible]
بھی ——— [illegible] شرمندہ
کر رہی تھی "کیا ہوا؟ کہانی لکھو کر ——— زندگی
کے حسن کی بات کیسے کی جائے ——— بیتا
اچھا تھا کل کا انسان جو ننگا رہتا تھا،
اشاروں میں بات کرتا تھا، جانوروں سے
خوف کھا کر غاروں میں پناہ گزیں ہوتا تھا۔
——— اور آج انسان انسان سے خوف
کھاتا ہے۔ رات کی خاموشی، تنہائی اور
اکیلے پن میں نہیں بلکہ کھلی شاہراہ میں بھیڑ
کے بیچ ——— کہیں سینے میں کسی کا چاقو نہ
اتر جائے ———

"ہاں رمن تم برانڈی کی بات کر رہے تھے نا
——— لاؤ آج ایک چلو میں بھی پی لوں ——"

"اسٹوری رائٹر، آج تمہارا دماغ صحیح تو ہے
——— تم برانڈی پیو گے" مسٹر رمن کی
زندگی میں میری طرف سے حیرت کا پہلا
دن تھا۔

"تم کیوں پیتے ہو رمن ——— ؟"

"میں اس لئے پیتا ہوں کہ ان گنت ہتھیلیوں
کے گناہ نے مجھے گناہ گار بنا دیا ہے ———
تنہائی میں میری سوچ مجھے ننگا کر دیتی ہے
اور میں اس ننگے پن سے بھاگنے کے لئے پیتا
ہوں ——— شراب میرے لئے سنول کا کام
کرتی ہے ——— مگر تم کیوں پینا چاہتے ہو۔ تم
تو زندگی اور مسامات کی بات کرتے ہو ——"

[illegible] گناہ ہے عجیب سا لگ رہا تھا۔ بہت
سچا بہت کڑوا!

"رمن میں بھی تمہاری طرح ہوں۔ تم ہتھیلیوں
میں گناہ دیکھتے ہو اور میں ان میں سچائی
ڈھونڈتا ہوں ——— میں آنسو اور دکھ میں
خوشی کی اس لہر کا پتہ لگانا چاہتا ہوں جو
کہیں قریب ہی کسی کی چٹکی میں پھنسی ہوئی
ہے ——— لیکن میری تلاش اب تک اپنی
منزل نہیں پا سکی ہے ——— پتہ نہیں یہ
صرف میرا گناہ ہے یا میری طرح دوسرے
اسٹوری رائٹروں کا بھی ——— آج مجھے
یہ سوچ تڑپا رہی ہے ——— اسی لئے پینا
چاہتا ہوں ———"

"اچھا اسٹوری رائٹر، تم آج اپنی سوچ کے
نام پر پیو اور میں میگی کے نام پر پیتا ہوں
کیونکہ مجھے اس دنیا میں میگی کی ہتھیلی ہی
وہ واحد ہتھیلی نظر آئی جس پر گناہ کا نشان
نہیں نظر آیا ——— " رمن برانڈی کی بوتل
لانے اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

"میگی ———"

"میگی گناہ گار نہیں، یہ رمن کی پامسٹری
کی آواز تھی یا اس کی محبت کی آمانت ———"

میں نے کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا
میگی کے کمرہ میں بتی جل رہی تھی، میں واپس
اپنی جگہ پر آ گیا اور میگی کے متعلق سوچتا رہا

[illegible]

[illegible] ہاتھ میں خالی برانڈی کی بوتل تھی ——

"یہ تو خالی ہے —— میں نے کہا۔

"ہاں ہم سب کوری ڈور میں کھڑا ہو کر پی گیا۔

—— میگی کتنا ہنگامہ ہے، اس کے کمرہ میں

تمہارا ایم ایل اے آشو بنرجی شراب پیتا

ہے اور COOL سگریٹ پیتا ہے اور میگی کے

ساتھ ...... میگی تم کو ہم بہت اچھا

سمجھتا تھا ——" رمن فرش پر اکڑوں

بیٹھ گیا ——

میری سوچ پتہ نہیں کہاں کہاں سے گھوم

آئی —— انتہائی بلندی اور انتہائی پستی

ہر جگہ زندگی کو تلاش کرتی رہی ——

"نہیں ہم تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا

—— تم کو شرم نہیں آتا تم ہم کو ایسا

بات بولتا —— تم یہاں سے چلے جاؤ۔

—— یہ آواز میگی کی تھی۔

میں نے اپنے کمرہ سے جھانک کر دیکھا میگی

آشو بنرجی کے بڑے بیٹے بھانو بنرجی پر برس

رہی تھی۔

"تم کو جانا ہوگا —— تم پڑوسی ہے ورنہ تم کیسے

نائی ہو جائے گا۔ تم کو اٹھا کے لے جائیگا۔

اور اگر زیادہ بات کیا تو یہ دیکھتا ہے ماچس

جگہ پھونک دے گا ——" بھانو بنرجی یہ

کہہ کر چلا گیا۔ باپ میگی کے کمرے میں ہے

[illegible]

[illegible] شوہر بھی [illegible]

پیسہ کا واسطہ [illegible] تھی —— [illegible]

ہوتی ہے —— انسان پیدا ہوتا [illegible]

اس کا بھی ہے ——

یہاں رہ گیا تھا ایک بھوکی دوسری [illegible]

والے کی آواز سے آنکھ کھلی —— "باہر [illegible]

آپ کا بغل کا میم صاحب ......؟"

میگی کا سرد جسم چھت سے لٹکا ہوا تھا۔

بے گناہ سچائی نے خودکشی کر لی تھی ——!

●●

تنبیہ

ابھی تشکیک کے پردے
اٹھانے کی سعیٔ موہوم ہے جاری
وہی الجھنوں کی گرہیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں
دشت امکاں میں پھر
وہی اک صدا گونجتی رہتی ہے اب تک

نہ جاؤ تم
حدوں سے پرے
کھو جاؤ گے، گمراہ ہو جاؤ گے
نہ متحمل ہو سکو گے
چہرۂ تاباں کے تم
حدوں سے پرے نہ اب تم تجاوز کرو
رک جاؤ بھی!
—— دیکھو سگنل گر چکا ہے۔

جلیل تنویر
۴۸۔ فرز روڈ۔ کالونی۔ گلبرگہ

مختار شمیم
گورنمنٹ گرلز کالج۔ اجین

غزل

عیش کے چھلاووں سے، رنج و غم کی چالوں سے
کس طرح نکل آئے کوئی ان وبالوں سے
سوختہ نصیب اپنے دل کے داغ دھوتے ہیں
زندگی سجاتے ہیں جانفزا خیالوں سے
خواہشوں کا میلہ ہے، دل مگر اکیلا ہے
ذہن خود پریشاں ہے اپنے ہی سوالوں سے
رات غم کا پہرا تھا اب جو صبح جاگی ہے
خونِ آرزو ہوگا ہائے ان اجالوں سے
حال پوچھئے کس کا، کس کو یاد رکھئے گا
خود کو بھی نہیں دیکھا ہم نے کتنے سالوں سے

ٹیگور کا ترانہ جن گن من ادھی نایک ہندوستان کا قومی ترانہ اور ہماری عظمت اور قومی یکجہتی کا نشان بن چکا ہے اس موضوع کے تحت شاعر کے خیالات کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔ ٹیگور نے اس ترانہ میں جس قومی یکجہتی کا پیام دیا ہے وہ ہندوستان کی عظمت دیرینہ کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ جس طرح شیکسپیئر کے ڈراموں کا ماخذ انگلستان، یونان اور روم کی قدیم تاریخیں ہیں اور ان کے شعری ادراک میں عیسائیت ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح سے ٹیگور نے اپنے اس ترانے میں، ویدوں، پرانوں اور شاستروں سے اکتساب کر کے قومی یکجہتی کے شعور کو جو ضیا بخشی ہے اور روشنی کا جو چراغ جلایا ہے وہ پورے دنیا کے ادب کے لئے مشعل راہ کا کام دے رہا ہے۔ ٹیگور کے پورے ادب کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے

[illegible] کے گیت گائے ہیں اور دنیا کو ہم [illegible] سندیش دیا ہے جس میں آفاقیت بھی ہے اور روحانیت بھی۔ لیکن ٹیگور کی یہ آفاقیت اور روحانیت ماضی کے دھندلکوں میں ہی انسان کو نہیں چھوڑ دیتی بلکہ اس کے تابناک مستقبل کا پیام دیتی ہے۔

اس وقت ہم تاریخ انسانی کے ایک بڑے تخلیقی دور سے گذر رہے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں رائج الوقت معاشی نظام اس عہد کے مذہبی، سیاسی اور معاشی غور و فکر پر بہت گہرے اثرات ڈال رہے ہیں۔ یہ اثرات اتنے دور رس ہیں کہ فوری طور پر ان سے نجات حاصل کرنا بھی ممکن نہیں ہے اس لئے کہ سیاسیات میں کوئی بھی صاف اور سادہ سلیٹ سے کام کا آغاز نہیں کرتا بلکہ کام

سری نواس لاہوٹی

اردو ہال۔ حمایت نگر۔ حیدرآباد۔ ۲۹

[illegible]
...ـے بلکہ ٹیگور کا سیاسی شعور پروان
چڑھ رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان
کی قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔
اور ۱۸۵۷ء کے واقعات نے قومی اتحاد
کی بنیاد کو ڈانواں ڈول کر دیا تھا، ہندوستان
کی وحدت چکنا چور ہوگئی تھی۔ اور قومی یکجہتی
کا شعور منزل کی تلاش میں کھڑا ہوا تاریخ
کے اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا تاکہ
وہ قومی بیداری کی نئی راہ پر گامزن ہو سکے۔
میں اس بات پر اس لئے بھی زور دے رہا ہوں
کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ہندوستان
کی تاریخ تغیر اور تبدل کا زبردست منظر
پیش کرتی ہے۔ اور ان قدروں کو جنم دیتی ہے
جو ماضی سے رشتہ رکھنے کے باوجود تقریباً
نئی ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دلی لٹ چکی تھی۔
اور شعر و شاعری کی محفلوں سے دھواں اٹھ
رہا تھا۔ اور ادب کے قدرداں برائے نام
باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو
زمانے کے ہاتھوں بچا نہیں تھا۔ ٹیگور کے
تخلیقی ذہن کے لئے ان واقعات نے ایک
پس منظر کا کام دیا۔ اور نئی سوجھ بوجھ کے ساتھ
انہوں نے شاعری کو اپنے اظہار کا ذریعہ
بنالیا اس لئے کہ ادب میں "شاعری ہی سب
سے زیادہ مرکب، ترقی یافتہ اور نازک

ہمیں ان کی شاعری میں ملتا ہے جو ان زمانہ
کے داخلی اور خارجی حالات و واقعات کے
اقدار کا سنگم بن جاتی ہے جس میں رقص و وجد
بھی ہے، فن تعمیر کا حسن بھی اور موسیقی اور
مصوری کے جلوے بھی۔ اس لئے کہ شاعری
کو کامل فنی نمونہ بنانا فنکار کی شخصیت و
انفرادیت اس کے جذبات کے گداز، اس کے
تخیل کی پرواز، اس کے ادراک کے توازن،
اس کے نفیس و اعلیٰ ذوق اسکی سلجھی ہوئی قوت
انتخاب، اس کی صلاحیت، ترکیب و تعمیر
اور اس کی ہنر مندیٔ پیش کش پر منحصر ہے۔" اور
ان تمام باتوں میں ٹیگور کو ماہرانہ چابکدستی
حاصل تھی۔ اسی بنا پر ہم ٹیگور کے فن شاعری
کی جانچ عروض کے اوزان و پیمانوں سے
نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لئے پختہ سیاسی
اور سماجی شعور درکار ہے جس کے بغیر ہم اس
شاعرانہ لذت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے
جو ٹیگور کی شاعری کا حصہ ہے جس کی بنیادیں
اور محرکات ویدانتک فلاسفی ہیں۔

ادبیات میں جب قومی یکجہتی اور وحدت کا ذکر
آتا ہے تو اس کی نوعیت بھی فلسفیانہ ہو جاتی
ہے کیونکہ ہر ادیب ایسے اہم تصورات کا ذکر
کرتے وقت کسی نہ کسی فلسفہ کی پناہ لیتا
ہے اور زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ ادیب کا تعلق

جو ہمیشہ زمانے اس ماحول سے ہوتا ہے اس
کی صدائے بازگشت اس کی تخلیقات میں
گونجتی رہتی ہے۔

بیسویں صدی کے ہندوستان میں اس کی دو
بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ ایک طرف گرودیو ٹیگور
ہیں تو دوسری طرف علامہ اقبال۔ اور یہ
دونوں ہندوستان کی ادبی تاریخ کے اتنے
بڑے ستون ہیں کہ ان کے بعد آنے والے
ادیب اور شاعر ان دونوں عظیم شاعروں
کے مختلف النوع فلسفیانہ خیالات سے
دامن نہیں بچا سکتے۔ بظاہر یہ دونوں ایک
دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن
گہری نظر سے ان دونوں کی شاعری کا مطالعہ
کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کی شاعری
کے ڈانڈے روحانیت سے جا ملتے ہیں۔
جہاں یہ دونوں ایک نظر آتے ہیں۔

اقبال جمہوریت، اجتماعیت اور نجات کے
حصول کا وسیلہ مرد مومن کو قرار دیتے ہیں
اور ان کی شاعری اسلامی تعلیمات کے اقدار
کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف بھگوت گیتا
کے انسان کامل یا [illegible] کی
جلوہ آرائی ہمیں ٹیگور کی شاعری میں ملتی
ہے مگر اس بنیادی تصور حیات کی یکسانیت
کے باوجود ٹیگور کے ادب میں قومی یکجہتی

[illegible]
عقائد سے [illegible] نہیں کی تلاش ہے [illegible]
کے ادب میں قومی یکجہتی [illegible]
[illegible] ان کے ذہن اور نفسیات کا سمجھنا
بھی بہت ضروری ہے جن صوفیا دانشوروں
نے ٹیگور کے ذہن کو سہارا دے کر پروان چڑھایا
تھا اس میں اس انفرادیت کا کوئی مقام
نہیں ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے بطن
سے پیدا ہوتی ہے جہاں شخصی آزادی کا تصور
عقائد اور مسابقت کی صورت اختیار کر
لیتا ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر
ہم ٹیگور اور ان کے فلسفیانہ خیالات کو
نہیں سمجھ سکتے۔ ٹیگور کی ہمہ گیر شخصیت ایک
پورے دور کی مالک ہے جو ماضی کے عقائد
سے رشتہ توڑے بغیر نئے رجحانات کو اپناتی
ہے اور قوموں کی وحدت کا ایک ایسا تصور
پیش کرتی ہے جو زرعی نظام کی پیدا کردہ
مشترکہ خاندان کے تصور سے ملتا ہے۔
میرا خیال ہے کہ جس طرح سے کوئی عہد لوٹ کر
نہیں آسکتا اسی طرح سے کوئی ادبی دور بھی
دوبارہ جنم نہیں لے سکتا۔ اسی لئے آج کے
میکانکی دور میں کوئی ادیب اور شاعر پورے
طور پر ٹیگور کی پیروی کرنے کا دعوی کرے
تو وہ کامیاب ادیب اور شاعر نہیں کہلایا
جاسکے گا۔ کیونکہ ٹیگور کے زمانے کا ماحول
آج کے ماحول سے بالکل جدا ہے جس میں ایک

[illegible]

[illegible] سے نکلتی ہے

اور کبھی یہ ٹکراؤ مقاصد اور مذاہب کے
تصادم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن کی
تہہ میں اقتصادی غلامی اور معاشی استحصال
کی کارفرمائی ہوتی ہے اور جب تک ان تضاد
کو دور نہ کیا جائے قومی یک جہتی کا تصور
بہت ہی دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم
اس پس منظر میں ٹیگور کے ادب اور ان کی
ہمہ گیر شخصیت کا جائزہ لیں تو پھر ان فلسفیانہ
خیالات کی ایک واضح تصویر ہمارے سامنے
ابھر کر آتی ہے اور اس میں قومی یک جہتی کا جو
پیام ٹیگور کی بین الاقوامیت سے بندھا ہوا
ہے اس کے سمجھنے میں ہمیں بھرپور مدد ملتی ہے
یہاں پر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مہاتما
گاندھی کی قیادت میں ہندوستانی عوام
نے عدم تشدد اور اپنے مخالف کو اپنا ہمنوا
بنا لینے کی جس بات پر زور دیا تھا اس کی تہہ
میں بھی ٹیگور کی وطن دوستی اور ان کی بین
الاقوامیت کا بڑا دخل ہے۔ اس نظریے کے
مابعد الطبیعاتی پہلو سے بھی قطع نظر کر لیا
جائے تب بھی اس بات میں شک کی کوئی
گنجائش نہیں ہے کہ گاندھی جی کا فلسفہ عدم
تشدد اور ٹیگور کی بین الاقوامیت نے ملک
میں ایک قومی جذبہ فرقہ وارانہ فسادات کے
خلاف اور ہندوستان کے مختلف گروہوں

[illegible]
اور ہندوستان کی قومی یک جہتی کو با[illegible]
اور مخالفوں کی مخالفت کو نرم تر بنا دیتے ہیں
یہ عوامل بڑی قیمت رکھتے ہیں۔ اس بات
کا ذکر کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ جب
ترک موالات کی تحریک اپنے مسلک سے ہٹنے
لگی تو ٹیگور نے اس کو پسند نہیں کیا تھا اور
گاندھی کو خط لکھ کر اس جانب توجہ دلائی
تھی کہ ان کی تحریک اپنے مسلک سے ہٹ رہی
ہے جس کی وجہ سے بین الاقوامیت کو دھکا
پہنچنے کا احتمال ہے جس کے ساتھ ہماری قومی
یک جہتی اور وحدت کا دامن بندھا ہوا
ہے۔ اس لئے ٹیگور کی شاعرانہ عظمت اور
انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ اور ہمیں اس
بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جب سیاسی اعتبار
سے ہمارا ملک غلام تھا تو اس فضا میں
بھی شاعر اعظم نے نہ صرف اپنے پاکیزہ
بلند اور رنگین تخیل کے چراغ کو روشن رکھا
بلکہ ہندوستانیوں کے دلوں کو دردمندی بخشی
اور لازوال روحانی اور ذہنی سرور و کیف کا
سامان مہیا کیا تا کہ ہم اپنی قومی یک جہتی کے
سہارے غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔
انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانیوں
کو ایک حیرت انگیز جذبہ حب الوطنی عطا
کیا جس میں انسان کو ہر طریقے اور ہر نہج
سے اوپر اٹھانے، روحانی عظمتوں کو حاصل

کرنے اور متحرک اجتماعی زندگی کی تعمیر و ترقی
کی جستجو اجدید لہر کا درس ملتا ہے جو شفق
کی نیلی جھیل کی طرح صاف شفاف اور گنگا
کے نرمل جل کی طرح شانت ہے جس میں
ہماری اجتماعی زندگی کے رنگین نقوش بھی
سموئے ہوئے ہیں اور جس سے حریت پسندوں
کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں
اور یہ دھڑکنیں بھرپور زندگی
کی جانب نشاندہی کرتی ہیں اور مسرت

[illegible]
[illegible]
اور نا ہمواری کو اپنی رنگین فراخ ظرفی حیثیت
بینی اور خیال آرائی سے ختم کر دیتی ہیں تاکہ
انسانوں میں بھائی چارہ کا جذبہ پیدا ہو اور
وہ حیات بخش عرفانی شعاعوں کی بارش
سے تازہ دم ہو کر اپنے اس فرض کو پورا کریں
جو انسانیت کا شیوہ ہے۔

▲▲

[illegible]

پچھلے ماہ کے رسالوں کی قابل مطالعہ تخلیقات

... ادبی رسائل کی ... میں۔ عالمی کی تعداد بھی اطمینان بخش ہے لیکن آج قاری کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہر تخلیق کا مطالعہ کرے۔ ہم نے اس خیال سے کہ قاری کم از کم اہم قابل مطالعہ تخلیقات سے محروم نہ رہ جائیں یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ آئیے ہم آپ کو چند منتخب تخلیقات بتاتے ہیں جو ہماری نظر میں ان پرچوں کی جان ہیں۔

آج کل جنوری ۱۹۷۲ء پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی
نظم: سونار بنگلہ: عمیق حنفی
فصیل شب ہجر سے۔ مخمور سعیدی
مضامین: غبار کارواں: وحید اختر
سورج روشنی اور توانائی کا منبع: قیصر سرمست۔

تحریک، فروری ۱۹۷۲ء، ۹ انصاری مارکٹ، دہلی ۲
غزلیں: شاہد ماہلی، عارف نقشبندی
نظمیں: اندھی جلوس: وہاب دانش
انتظار: صلاح الدین پرویز
افسانہ: کیچڑ میں لت پت چہرہ: قیام رفعت۔
کھیل۔ اروند گوکھلے/یونس اگاسکر
پرکٹا کبوتر: سلام بن رزاق۔

کتاب، شمارہ ۱۰۱ کپور مارکیٹ لکھنؤ ۳
غزلیں: میکش اکبرآبادی، زیب غوری

ندا فاضلی، محی الدین عادل، عمیق حنفی
مظفر حنفی، بانی، اختر اورینوی
نظمیں: شب ہجر سے۔ مخمور سعیدی
صحرا کے آگے: نشاط کلیم
کیمرہ، گرہ، سمندر۔ صلاح الدین پرویز
افسانہ: غم۔ اقبال مجید
رنگ و بو: جوگندر پال

شاعر جنوری ۱۹۷۲ء قصر الادب بمبئی ۸ بی سی
غزلیں: وامق جونپوری، غلام مرتضیٰ راہی
نظمیں: لہو کے پھول: نصر قریشی۔
ماں: سلیمان خمار۔
مضامین: اختر حسن: رشید الدین
افسانہ: صالحہ عابد حسین

شب خون، ۶۹، ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد ۳
غزل: وحید اختر، شہریار، غلام مرتضیٰ راہی۔
نظم: تشنگی: بلراج کومل
رباعی سے پہلے رباعی کے بعد: شہریار
تو شب آفریدی: ساجدہ زیدی
افسانہ: سیمیا: نیر مسعود۔

شمیم اختر جائسوی

کتب خانہ الاصلاح

دیسنہ پٹنہ

میں اپنی انگلیوں کے پوروں کو سہلاتے ہوئے کاغذی

دفن سے باہر جھانکتا ہوں۔ دور اور دو جلتی ہوئی نگاہوں

کے شعلے میری طرف لپکتے ہیں۔ میں گھبرا کے پیچھے ہٹتا

ہوں اور پھر تیزی سے میری انگلیاں دوڑنے لگتی ہیں

"ماں! میں جا رہا ہوں۔"

ماں کچھ بولتی نہیں

بول بھی تو نہیں سکتی۔

میرا بوڑھا باپ لاٹھی کے سہارے میرے نزدیک آتا

ہے۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ میں باہر آنگن

میں چلا آتا ہوں۔ میری بہن انہماک سے مہندی کے

پودے کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کتنے ہی

رنگ آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ اور میں ان رنگوں

کے بیچ حائل ہونا نہیں چاہتا۔ میں چپکے سے آگے بڑھ

جاتا ہوں لیکن مجھے اپنی پیٹھ پر جلن کا احساس ہوتا ہے

میں پیچھے مڑتا ہوں۔ دروازے سے لگی میری بیوی

مجھے گھور رہی ہے۔ میں اس کی جلتی ہوئی آنکھوں کی تاب

نہ لا کر جلدی سے گھر سے باہر نکل آتا ہوں۔

پھر میری انگلیاں دوڑنے لگتی ہیں۔ دوڑتی ہی رہتی ہیں

میں کب تک ان کا ساتھ دے سکتا ہوں۔ مجھے کچھ کرنا

اور

کر ہی پڑے گا ... ہاتھ ... کرتا ... اور پھر ان

انگلیوں کو کاٹ کر الگ کر دیتا ہوں۔ دور اور دو جلتی ہوئی

نگاہوں میں سے دو آنکھوں کی چبھن ختم ہوتی ہوئی سی

محسوس ہوتی ہے۔ اور میں کھلی شاہراہ پر چلا آتا ہوں۔

میرے قدم مختلف گلیوں کا طواف کرتے ہیں۔ کتنے ہی

تکیوں میں، میں الجھتا پھرتا ہوں۔ دھول اور دھوپ

سے اٹی ہوئی ہوائیں میرے وجود کو کھوکھلا کرتی جا رہی

ہیں۔ مہیب سناٹے اور تاریکیاں مجھے نگلنے کے لئے

بیقرار ہیں۔ میں ان سے سہما سہما، ڈرا ڈرا چھپتا پھرتا

ہوں۔ لیکن یہ دو جلتی ہوئی نگاہیں شعلہ بن کر میرا پیچھا

کر رہی ہیں۔ ان آنکھوں کی چبھن دن بدن لمحہ بہ لمحہ

بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

بڑھتی ہی جا رہی ہے!

اُف میں کیا کروں؟

میں نے دو آنکھوں کے کرب سے نجات پائی لیکن اب

ان دو آنکھوں کے حصار سے باہر نہیں آ سکتا۔ میں اس

سے آزاد ہونے کے لئے دائرے کے پورے محیط پر

گردش کر جاتا ہوں کہ کہیں بھی اسے کمزور پا کر توڑ سکوں

اور اسی منزل کی طرف پرواز کر سکوں جس کا حق دار

مجھے ضخیم کتابوں نے بتایا ہے۔ لیکن میری حالت اس

نقطہ کی طرح ہو جاتی ہے جو اپنے محور پر تمناؤں کا تابوت

لئے چکر کاٹ رہا ہے کہ کوئی بیرونی قوت اس میں ضم

ہو کر اسے اس قوت سے نجات دلائے جو صدیوں سے

اسے اپنے شکنجے میں کسے ہوئے ہے۔

...بہاؤں کی رُت ہے۔
موت کو گلے لگانے کی بہت بڑی کشش ہوتی ہے!
لہو کے بہاؤ میں ہمیشہ سرخ رنگ کی ہی فتح ہوتی ہے
چاہے یہ فتح لمحاتی کیوں نہ ہو! اور سرخ رنگ سے مجھے
ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں نے پہلے کبھی اس کا
اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اب خون تھوک کر اس
بات کی دلیل پیش کر رہا ہوں۔ میری بات کو منوانے
کے لئے میرا بوڑھا باپ بھی میرا ساتھ دے رہا ہے
لیکن وہ کب تک میرا ساتھ دے سکے گا۔ جلد ہی وہ
تھک جائے گا۔ اُسے اب آرام کرنا چاہیے۔ میری
آنکھیں کیوں نمناک ہوتی جا رہی ہیں۔ حقیقت کو جھٹلایا
نہیں جا سکتا۔

پھر ایسا ہوتا ہے کہ میں رات کے آخری لمحے میں گرمی
سے بچنے کے لئے آنگن میں چلا آتا ہوں۔ مہندی کے
جھاڑ کے پیچھے ایک سائے کو دیکھ کر چونک جاتا ہوں
قریب پہنچنے پر میں دیکھتا ہوں کہ میری بہن مہندی
کے جھاڑ کو دھیرے دھیرے کاٹ رہی ہے۔ میرے
ذہن میں ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں۔ اور جب

ذہن میں ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں اور جب
میں غور سے مہندی کے جھاڑ کی طرف دیکھتا ہوں تو
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مہندی کے سارے
پتے جلتی ہوئی آنکھوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور مجھے
گھور رہے ہیں۔ میں الٹے پاؤں واپس لوٹتا ہوں۔
اپنے باپ کے کمرے میں چلا جاتا ہوں جو مہینوں سے
ویران پڑا ہے۔ اچانک میری نظریں اُس کی لاٹھی پر
پڑتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے لاٹھی سانپ بن کر
مجھے ڈس لینا چاہتی ہے۔ میں گھبرا کر کتاب کھول
لیتا ہوں۔ لیکن وہاں بھی جلتی ہوئی آنکھیں......!
میں بھاگتا ہوں۔ بھاگ کر روحی کی بانہوں میں پناہ
لیتا ہوں۔ اُس کے ساتھ سمندر کی گہرائی میں اتر جانا
چاہتا ہوں۔ لیکن وہ تیار نہیں ہوتی۔ اُسے بھی سرخ
رنگ سے نفرت ہے۔ ہم دونوں تذبذب میں مبتلا ہیں
نہیں.....! ہاں.....! نہیں.....!!! ہاں!...ہاں!!! ہاں!!!
اور پھر اس کے ساتھ سمندر کی گہرائی میں اتر جاتا ہوں سکون
اور اطمینان کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہوں لیکن جلد
ہی مجھے اپنی پیٹھ پر جلن کا احساس ہوتا ہے۔ میں پیچھے کی
طرف مڑ کر دیکھتا ہوں۔ دو جلتی ہوئی نگاہیں مجھے گھور
رہی ہیں۔

کہانی

سوچتا ہوں
میں اگر
جادۂ زیست کے آخری موڑ پر
سرد کہرے کی وادی میں گم ہو گیا
کچھ مہکتے ہوئے ہونٹ — اور —
حجاب آلودہ نظروں کے پیغامبر —
جو
میرے تعاقب میں ہیں
گونگے ہو جائیں گے۔!
چھوڑ دیں گی مہکنا سمن وادیاں
تتلیاں باولی ہو کے رہ جائیں گی۔!
آہٹیں چلمنوں سے نکل آئیں گی۔!
اور — معصوم ننھے فرشتے مجھے
رہگزاروں میں ڈھونڈا کریں گے —
مگر میں نہ مل پاؤں گا۔!
اور پھر
گرم بستر میں کچھ تھرتھراتے سے لب
اک کہانی سنایا کریں گے انہیں۔!

غزل

بنا دیا ہے کسی نے پیمبروں کی طرح
پڑا تھا راہ میں پہلے میں پتھروں کی طرح
میں شہرِ جسم سے کب کا فرار ہو جاتا
کسی خیالوں نے روکا ہے لشکروں کی طرح
تمام خوابوں کو دل میں لپیٹ کر رکھ دو
جہات کے بچھا لینا بستروں کی طرح
کسی بھی یاد کی آہٹ نہ آئی مدت سے
تڑپ رہا ہوں میں سنسان مندروں کی طرح
میں اپنے جسم کی ندیوں میں تیرتا ہوں مگر
بہت سے راز چھپائے سمندروں کی طرح
تمام رات اجالا رہا ہے مقتل میں
لہو میں ڈوب کے چمکا ہوں خاوروں کی طرح
ہر ایک بات ہے گلریز میری شاہانہ
مزاج پایا ہے لیکن قلندروں طرح

شہزادہ گلریز
گونیا تالاب رام پور

عبداللہ کمال

بک امپوریم - بیکن گنج - کان پور - ۱

ہر اک سمت بے چارگی بہہ رہی تھی
لکیروں کے پیچھے مقدر دھواں تھا

عجب سلسلہ تھا زماں سے مکاں تک
نظر جو اٹھائی تو منظر دھواں تھا

کثافت آئینوں کا سفر لمحہ یہ ہے
کہ عکس تمنّا نظر پر دھواں تھا

کئی واسطوں کا تھا اک بُعد مجھ میں
مرے جسم پر ہی مرا سر دھواں تھا

کہاں تک تعاقب کوئی آنکھ کرتی
تھا جو کچھ بھی، اب میرے اندر دھواں تھا

غزل

کہاں ڈھونڈے گا اب کوئی مرا نام و نشاں مجھ میں
ہوا جاتا ہے سب کچھ لمحہ لمحہ رائیگاں مجھ میں

مکان و لامکاں کو میں خلا کی طرح گھیرے ہوں
سمٹ آئے ہیں جیسے یہ زمین و آسماں مجھ میں

کوئی طوفانِ خاک و باد اڑا لے جائے اسکو بھی
کھنچا ہے بے ضرورت اک حصارِ استخواں مجھ میں

حدِ احساس تک بڑھتی چلی جاتی ہے تاریکی
پریشاں ہے بہت بجھتے چراغوں کا دھواں مجھ میں

میں اس کو قتل کرکے کس قدر شرمندہ ہوں اس سے
وہ اپنی جان دے کر ہو گیا ہے جاوداں مجھ میں

محمد احمد رمز

بک امپوریم - بیکن گنج - کان پور - ۱

شمیم قاسمی

نورن گنج۔ سہسرام۔ بہار

کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں اس کے
باوجود بھی جانے کن راستوں سے وہ مجھے ایک
ایسے جزیرے میں لے گئی جس کی دو مقابل
سمتوں میں دو جھنڈے لہرا رہے تھے

"ایک سیاہ!"

"دوسرا سفید!"

اور بیچ سے نہ ختم ہونے والے راستے کا سلسلہ
تھا۔ یہ جزیرہ مجھے عجیب سا لگا
میں نے دیکھا —"

میں جس راستے پر چل رہا تھا اس کے بائیں
جانب انگاروں کے سلگتے ہوئے پودے
قطار در قطار کھڑے تھے اور جن کی چھاؤں
میں خوف زدہ چہروں کی پرچھائیاں لرزاں
تھیں۔ دائیں جانب ہیرے جواہرات سے
بنی ہوئی خوبصورت عمارتوں کا نہ ختم ہونے
والا سلسلہ تھا اور ان عمارتوں کے ستونوں
کے اطراف پودوں کے گملے سجے ہوئے تھے
ان کی خوشبوئیں عجیب سی تھیں۔ ان کی
اصلیت تک پہنچنا میرے بس کا روگ
نہ تھا۔"

میں یونہی بے خیالی میں کچھ دور چلتا رہا کہ مجھے
دودھ کی ایک نہر میں ایک کشتی نظر آئی —
میں یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا کہ دودھ
کی نہر میں جو کشتی تھی وہ بھی دودھ ہی کی طرح
سفید تھی۔ اور اس پر کے مسافر — آ وہ تو
سبھی دودھ ہی کی طرح سفید چادر لپیٹے
ہوئے تھے۔ ان کا وجود سراپا سفید تھا!

دودھ کی نہر کی تمام چیزیں سفید تھیں۔ تاحدِ
نظر سفید، سفید مجھے عجیب سا لگا —
کچھ لمحوں تک میں خود کو خود سے الجھاتا رہا
اور آخر میں نے اپنے بائیں طرف والے سے
پوچھ ہی لیا۔ اس نے مجھے عجیب نظروں
سے گھورا اور پھر بتایا کہ "یہ وہ جگہ ہے
جہاں انسان کی زندگی دوامی ہے۔ لوگ
یہاں مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ لیکن یہ جگہ
عام لوگوں کے لئے نہیں، یہاں صرف وہی
لوگ رہتے ہیں جو اپنے وجود سے پرے پہنچنے
والے لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے — ہر وہ
شخص جو سفید چادر کے قابل تھا اس پر وہ
اپنی چادر ڈال دیا کرتے تھے۔ حالانکہ اوڑھنے
والوں کا سراپا نہیں چھپتا تھا لیکن آج ان

[illegible]
سفید... سفید نہر نے جب
میری آنکھوں سے اپنا عکس لے لیا تو میں
ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں لال رنگ کی نہر
بہہ رہی تھی اور جس کے کنارے پر سیاہ
پرتیں جمی ہوئی تھیں ـــــ لال رنگ کی
نہر کا سرا فضا سے باتیں کر رہا تھا اور اس
کے کنارے پر ایک قطار سے سیاہ
صندوق رکھے ہوئے تھے۔ اور ان صندوقوں
سے عجیب طرح کی چیخیں، آہیں بلند ہو رہی
تھیں۔ اس وقت کا منظر ایسا ہی تھا جیسا
ڈوبتے ابھرتے سورج کا۔"

ہو لیکن تم [illegible] کر نہیں سکتے۔ کوئی بھی کچھ
کر نہیں سکتا کیونکہ سیاہ رنگ کو سفید
کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا مردذات کا
اولاد کو جنم دینا۔

لہٰذا تم اپنی سفید چادر کو اتنا ہی عزیز
رکھنا جتنا ایک ماں اپنے بچے کو عزیز رکھتی ہے۔

لیکن... میں تو...... م.... میں تو
....." میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ لیکن میری
آواز میرے سینے میں دم توڑتی ہوئی محسوس
ہوئی ـــ !!"

●●

میں چند لمحوں تک سوچوں کی گہری جھیل میں
ڈوبا رہا.... اور آخر اپنے بائیں طرف والے
سے پوچھ ہی لیا۔
اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا
چند لمحوں تک ساکت و جامد رہا اور لرزتی
ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ اس کی آواز نقرئی
صراحی سے گرنے والے پانی کے قلقل کے
مانند تھی۔
"یہ چیخیں اور آہیں انہیں لوگوں کی ہیں جنہوں
نے اپنی سفید چادریں سیاہ چادروں میں
تبدیل کر لی تھیں۔ اور اپنی آنکھوں پر ہر
وقت سیاہ نقاب ڈالے رہا کرتے تھے۔
ان لوگوں کی آہیں اور چیخیں تم بھی سن رہے
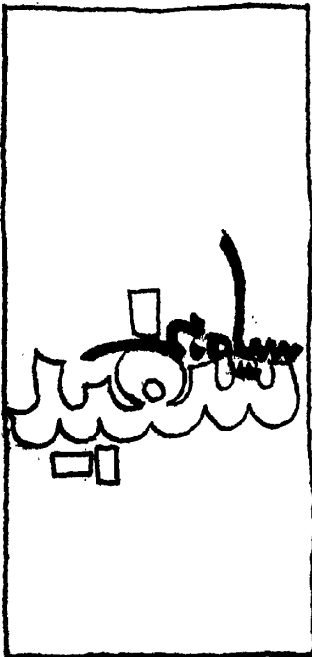
فرانس اور چیکوسلواکیہ سے فلمی تجارت متوقع!

پچھلے چند سالوں میں بننے والی ہندوستانی فلموں نے دنیا بھر میں بننے والی فلموں کے مقابلہ میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے —— ہندوستانی فلم انڈسٹری نے دنیا میں بننے والی فلموں کی تعداد کے مقابل اپنے آپ کو پہلے درجے پر پہنچا دیا ہے۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کی اس بڑھتی ہوئی شہرت کے پیش نظر عالمی فلمی منڈی میں کچھ ملکوں نے اس کی طرف نظر التفات کرنا شروع کر دیا ہے۔ فرانس، چیکوسلواکیہ ہندوستانی فلم انڈسٹری سے مشترکہ تجارت کی خواہش رکھتے ہیں چنانچہ فبروری کے آخری ہفتہ میں چیک فلموں کی ایک نمائش کے وقت چیکوسلواکیہ کے آئے ہوئے ایک وفد نے اس سلسلے میں پہل کرتے ہوئے انڈین موشن پکچرز ایکسپورٹ کارپوریشن کے چیرمن اے۔ یم طارق سے بات چیت کی۔

فرانس کے سفارت خانہ میں جنوری میں قائم شدہ "یونی فرانس" کے مستقل نمائندہ ڈاکٹر دوبرے نے بمبئی میں اے یم طارق صاحب سے ملاقات کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی فلمی صنعت اور فرانسیسی فلمی صنعت ایک دوسرے سے بلا کسی تیسرے رابطے کے مشترکہ طور پر تجارتی تعلقات قائم کریں۔ مشترکہ طور پر ایک دوسرے کی فلمیں درآمد و برآمد کریں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ فرانس میں نمائش کے لئے ہندوستان سے چار فلمیں منتخب کر چکے ہیں۔

جن میں ریشماں اور شیرا (۲) سمسکار (بنگالی) (۳) ایک ادھوری کہانی (۴) پہاڑ قابل ذکر ہیں۔
توقع ہے کہ فرانس اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کے تعاون سے فلم بین طبقے کو معیاری فلمیں دیکھنے کو مل سکیں گی۔

آر کے فلمز سے شنکر جے کشن غائب

اداکار، ہدایت کار، پروڈیوسر راجکپور نے اپنی آنے والی فلموں کی موسیقی اب شنکر جے کشن کی بجائے آر۔ ڈی۔ برمن اور لکشمی کانت پیارے لال کے حوالے کر دی۔ راج کپور کی اب تک بننے والی ہر فلم میں شنکر جے کشن ہی کی موسیقی ہوا کرتی تھی۔ اس تبدیلی سے پتہ چلتا ہے کہ آر کے فلمز شنکر جے کشن زوال کو تسلیم کرتا ہے۔

مدن موہن نے ریکارڈ کر لیا رشیکیش مکرجی کی فلم باورچی کے لئے پچھلے

دنوں مدن موہن نے دو گانے لتا کی آواز میں ریکارڈ کروائے جسے کیفی اعظمی نے لکھا ہے۔ اس فلم میں جیا بہادری کے مقابل راجیش کھنہ پیش ہو رہا ہے۔

نذیر حسین کا آنگن

مشہور کیرکٹر ایکٹر نذیر حسین اب ہدایت کار بن گئے ہیں۔ اس لحاظ سے آنگن انکی پہلی فلم ہے جو ان کی ہدایت میں بن رہی ہے۔

جھلکیاں

- مشہور ہدایت کار مرنال سین کی تازہ فلم انٹرویو کی کارلووی ویری فلم فیسٹول کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے۔
- ہدایت کار موہن کمار نے اپنی فلم "موم کی گڑیا" ایک دن میں مکمل کر لی ہے۔ اس فلم میں تنوجہ کے مقابل نیا ہیرو رتن چوپڑا پیش ہو رہا ہے موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کی ہے اور گیت آنند بخشی کے ہیں۔
- کارلووی ویری میں منعقد ہونے والے عالمی فلم فیسٹیول میں راجکپور شرکت کر رہا ہے یہ فیسٹیول جون میں منعقد ہوگا۔
- لتا منگیشکر کا ودتم جاویری میئر کی جانب سے احمد آباد میں شہری استقبال کیا گیا جس میں گورنر احمد آباد نے بھی شرکت کی۔
- گرودت فلمز کی "میم صاحب" بنگال اور پنجاب میں ریلیز کر دی گئی۔ ونود کھنہ یوگیتا بالی اور جانی واکر اس فلم کے اہم ستارے ہیں۔ کہانی اور مکالمے ابرار علوی کے ہیں۔
- کانپور میں فلم بے ایمان کی ایک ہفتے کی شوٹنگ کی گئی جس میں منوج کمار راکھی ناظمہ پریم چوپڑا اور پران نے حصہ لیا۔

دیوان ورما — بڑا کبوتر

ایلیزشوپرو ڈیوسر اور ہدایت کار دیوان ورما نے ۳۱ دن کی مسلسل شوٹنگ کے بعد اپنی دو تہائی فلم بڑا کبوتر مکمل کرلی۔ اس فلم میں اشوک کمار، ریحانہ سلطان، بیناہیرو، نگیش، دیویان ورما اور سیلین کام کر رہے ہیں۔

سازندوں کا مطالبہ

سنے میوزیشنز یونین نے اخراجات آمد و رفت اور دیگر اخراجات میں اضافہ کے لئے جو مطالبہ شروع کیا تھا اسے فلم سازوں نے مان لیا ہے۔

سریندر پرکاش کی کہانی

جدید کہانی کار سریندر پرکاش کی ایک کہانی مشہور ہدایت کار ناصر حسین کے بھائی طاہر حسین نے اپنی اگلی فلم کے لئے لی ہے (پہلی فلم کا رول) جیا بہادری اور امیتابھ بچن جس کے اہم ستارے ہیں۔ گیت مجروح کے اور موسیقی آر ڈی برمن کی ہے۔ مکالمے اور اسکرین پلے سریندر پرکاش کے ذمہ رہیں گے۔

- شکتی سامنت اپنی تین فلمیں لے کر ڈھاکہ روانہ ہوئے ہیں۔ انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن سے بھی ملاقات کی۔
- سورج فلمز کی اگلی فلم کے چار ریل مکمل ہو چکے ہیں۔ اس فلم میں سنجو کمار کے ساتھ نئی اداکارہ نیتا کام کر رہی ہے موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کی اور گیت آنند بخشی کے ہیں۔
- دیوآنند کی فلم "ہیرا پنا" کی شوٹنگ شروع ہو چکی ہے۔ اس فلم میں زینت امان بطور ہیروئن آ رہی ہے جبکہ موسیقی آر ڈی برمن کی اور گیت آنند بخشی کے ہیں۔
- ممتاز اور امیتابھ بچن، او پی رلہن کی فلم "بندھے ہاتھ" میں مرکزی رول ادا کریں گے جبکہ موسیقی آر ڈی برمن کی ہوگی اور گیت و مکالمے قمر جلال آبادی اور ہدایت رلہن کے اسسٹنٹ او۔ پی گوئل کے ذمہ ہوگی۔
- محمود پروڈکشنز کی فلم "بمبئی ٹو گوا" بمبئی میں ریلیز کر دی گئی ہے۔ اس فلم میں امیتابھ بچن، ارونا ایرانی، محمود اور شتروگھن سنہا ایک ساتھ آ رہے ہیں۔ موسیقی آر ڈی برمن کی اور گیت و مکالمے راجندر کرشن کے ہیں۔

"پیکر" گزشتہ ۱۴ سال سے
اپنی بساط بھر کوششوں کے ساتھ شائع
ہو رہا ہے۔ اس رسالے
کے اسٹبلشمنٹ کی راہ میں آمد و جرائد
کے دیگر مسائل کے علاوہ جو ایک
اور خاص دشواری درپیش
رہی وہ تھی "جدید طرزِ فکر" کی نمائندگی
اور یہ نصب العین "پیکر" کے روایتی جمود کی فضا
میں دوسری تمام تر دشواریوں
کی بہ نسبت زیادہ مزاحمت کن رہا۔ لیکن
کچھ ذہن اس جمود سے اکتا چکے تھے جن
کے عملی تعاون کے باعث پیکر اپنی جدوجہد جاری رکھ سکا
اب پیکر کے لکھنے اور پڑھنے والوں
کا ایک وسیع حلقہ بن چکا ہے تاہم ادارہٗ پیکر اپنے
نصب العین کو خواص سے عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے
پیکر کے مقصد کو تقویت پہنچانے کی
غرض سے حیدرآباد کے نئے قلم کاروں کی

تحریک پر "جشن پیکر" کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔
جشن کی کارروائی میں "جدید طرزِ فکر"
رکھنے والے قلم کار حصہ لیں گے۔ جشن کی دو روزہ
تقاریب ۱۵ اور ۱۶ اپریل کو حیدرآباد میں منائی جائیں گی
پہلے دن : افتتاحی اجلاس
اور شام افسانہ۔
دوسرے دن : بزنس سیشن، سیمینار اور
مشاعرے کا پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ
جشن محض جشن پیکر ہی نہیں بلکہ جدید طرزِ فکر کے حامل
قلم کاروں کا ایک اہم اجتماع ہوگا۔
یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ
جدید طرزِ فکر کے قلم کاروں نے جب
کبھی کسی کل ہند اقدام کی نیت کی تو اسے قیادت
کی ہوس رکھنے والے چند انتہا پسندوں
نے اختلافات کا نشانہ بنایا، ہنگامے کھڑے کیے اور

مخصوص کارکنوں کو مختلف دھاروں میں
بانٹ دیا، یہ تقسیم ہیں اتحادی طور پر سمندر کی سی
عظمت پانے سے محروم رکھنے کا باعث
بنی ہے لیکن اب ہم اس زہر کو مزید پھیلنے نہیں دیں گے
اس نے ہمارے اعضا کو جسم
سے الگ کر دیئے جانے کی صورت پیدا کر دی۔
ہم تمام نئے قلم کاروں کو انتہائی محبت اور
سنجیدگی کی فضا میں غور کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے
اُن سے گزارش گزار ہیں کہ
وہ جشنِ پیکر کی تمام تقاریب میں انتہائی فراخ دلی
اور وسیع النظری کے ساتھ شریک
ہو کر سب کے مشترک کاز کو آگے بڑھانے میں
اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔
اس جشن میں ہم مخالفتوں کا اظہار کرنے یا بحث
میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے
کی کوشش کرنے کے بجائے اپنے مسائل پر موجودہ حالات
کی روشنی میں غور کریں گے
اپنی دشواریوں کا حل تلاش کرنے
کی سعی کریں گے اور ایک لائحۂ عمل کھوج
نکالنے کی کوشش کریں گے۔
بیشتر نئے قلم کاروں نے جشنِ پیکر میں شرکت پر
رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔ مزید
چند احباب کا جواب آجانے پر پروگرام کی قطعی ترتیب
کا اعلان اپریل کے شمارے میں کر دیا جائے گا۔
مئی کا شمارہ جشن نمبر ہوگا جس میں
جشن کی ساری روئیداد تقاریر، مباحث اور
تخلیقات کے ساتھ شائع کی جائیگی۔
اُردو کے تمام بہی خواہوں سے ہم اس جشن کے
لیے نیک خواہشات کے متمنی ہیں۔

کنوینر: اکمل حیدرآبادی
تیاری کمیٹی: مجتبیٰ حسین ● تاج مہجور
رؤف خلش ● خان معین ● حسن فرخ ● ساجد اعظم
رفعت صدیقی ● انور رشید ● غیاث متین ● مسعود عابد
رؤف خیر ● علی الدین نوید ● اسلم عمادی ● علی ظہیر
باذل عباسی ● ہادی قریشی ● اعظم راہی

نگاہ

آر. اے صدیقی

اُپہار

کسی افسانے یا ناول کو فلمانا ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ کبھی فلم تو معیاری بن جاتی ہے اور نقادوں سے داد وصول کر لیتی ہے لیکن عام تماش بینوں کے سروں پر سے گزر جاتی ہے اور فلم سازوں کی ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ لیکن اُپہار دونوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہے۔ اپہار کی کہانی رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانی پر مبنی ہے جو دیہات میں پرورش پانے والی ایک شریر لڑکی (جیا بھادری) کے اطراف گھومتی ہے جسے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور گاؤں بھر میں دھما چوکڑی مچانے سے فرصت ہی نہیں۔ شہر میں تعلیم پانے والا لڑکا (سروپ دت) اُسے پسند کر لیتا ہے اور اس سے شادی کر لیتا ہے لیکن جیا بھادری میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور سروپ دت کی

کھٹن کر دیتی ہے۔ ہیروئن کے جذبات احساس کی نفسیات کو سمجھتا ہے لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ مجبوراً شوہر واپس لوٹ جاتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں ہیروئن نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس میں ذہنی بلوغت پیدا ہو جاتی ہے۔

جیا بھادری نے اس مشکل کردار کو بڑی مہارت سے ادا کیا ہے جو تماش بینوں پر ایک دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔ کامنی کوشل، ناندا بلیکر اور لیلا مشرا نے اپنے کردار بڑی خوبصورتی سے نبھائے ہیں۔ البتہ سروپ دت کچھ بجھا بجھا سا نظر آتا ہے۔ ڈائرکٹر سدھندو رائے نے بہت عمدہ ہدایت دی ہے۔ چھوٹی سی کہانی میں انہوں نے کہیں بھی واقعات کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا ہے۔ اس کے علاوہ دیہاتی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ آنند بخشی کے گیت کہانی کے مطابق اور دیہات کے ماحول میں رچے بسے ہیں۔ لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی اوسط ہے۔ تاثر میوزک بھی انہوں نے رابند را میوزک دی ہے۔ لیکن بعد میں برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔

...e take ... challenge
for
...ing-up a Highly Industrialised
Hyderabad